بسلسلہ ۱۵۰ سالہ تقریبات جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

تحریکِ آزادی میں اُردُو کا حصّہ

ڈاکٹر معین الدّین عقیل

مجلسِ ترقّیِ اَدب ○ لاہور

بسلسلہ ۱۵۰ سالہ تقریباتِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

ڈاکٹر معین الدّین عقیل

مجلسِ ترقّیِ ادب ۲ ـ کلب روڈ، لاہور

فون: ۶۳۶۸۲۱۸، ۶۳۶۴۸۲۴ـ ۰۴۲ـ فیکس: ۶۳۶۸۲۱۷

ای میل: majlis_ta@yahoo.com

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ ۔از ڈاکٹر معین الدّین عقیل

اشاعتِ اوّل: جون ۲۰۰۸ء/ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ ۔ تعداد: ۱۱۰۰

ناشر : شہزاد احمد
ناظم مجلسِ ترقیِ اَدب، لاہور

مطبع : علی پرنٹرز، ۱۹۔اے ایبٹ روڈ، لاہور

قیمت : ۴۵۰ روپے

یہ کتاب محکمۂ اطلاعات و ثقافت وامورِ نوجواناں، حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع ہوئی

عزیزم

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

کے نام

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

—— اقبال

فہرست

باب سوم: اُردو نثر ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

باب چہارم: اُردو شاعری ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

باب پنجم: اُردو نثر ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

۵-تحریک آزادی کا ادب

پیش لفظ، اشاعتِ اوّل

معروضات

ہر دور کا ادب جہاں عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے، اور جس میں کسی معاشرے اور قوم کے درد و آرزو، جہد و جستجو کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، وہاں وہ معاشرے پر اثر انداز بھی رہتا ہے۔ اگر ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کیا جائے تو تاریخ، عہد ماضی کے مزاج، کردار اور ہیجانات کا ایک مربوط سلسلہ پیش نظر ہوسکتا ہے۔ جہاں تک اُردو ادب میں اس نوعیت کے مطالعے کا تعلق ہے، حال ہی میں بعض مفید کوششیں ہوئی ہیں، لیکن تا حال معاشرے پر ادب کی اثر اندازی کے جائزے اور مطالعے کی کوششیں مفقود ہیں۔ اس نوعیت کا مطالعہ مختلف پہلوؤں سے ہوسکتا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ برِ عظیم کے مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی جدوجہد کے عظیم نتائج اور مراحل پر اثر انداز ہونے والے ہیجانات کے تاریخی پس منظر کو سمجھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اُردو زبان نے مسلمانوں کی ملّی تحریکات کے فروغ اور مسلمانوں میں ملّی شعور کو بیدار کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ دراصل راقم نے اس مطالعے کی ابتدا اپنے ایک مقالے ''تحریکِ پاکستان کا لسانی پس منظر'' کے ذریعے کی تھی۔ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ تحریکِ پاکستان کو اس کے لسانی پس منظر میں سمجھا جائے۔ اس میں برِ عظیم کے لسانی تنازعے، اس کے مسائل اور سیاسی پس منظر میں دکھایا گیا تھا کہ انگریزوں کی پیدا کردہ صورتِ حال میں اُردو کی جانب ہندوؤں کی معاندانہ تحریکوں کے نتیجے میں مسلمان اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کے تحفظ کی بابت سوچنے پر مجبور ہورہے تھے۔ ان میں دو قومی نظریے کا احساس، جو اُن میں ابتدا ہی سے موجود تھا لیکن یہ عام مسلمانوں میں خوابیدہ تھا، اب زیادہ قوی اور شدید ہوگیا۔ زیرِ نظر مطالعہ اس سلسلے کی اگلی کڑی ہے۔ اس مطالعے کو راقم نے اس نقطۂ نظر کے تحت پیش کیا ہے کہ ''برِ عظیم کی تمام اسلامی تحریکات دراصل ایک ہی سلسلے میں منسلک ہیں جن کی ایک انتہا تحریکِ پاکستان ہے، اور ہر تحریک کی بنیادی ضرورت اُردو زبان رہی ہے''۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری تھا کہ تحریکِ اسلامی کے بالکل ابتدائی زمانے سے آغاز کیا جائے اور آزادی کی پوری تاریخ میں

جو تحریکات اور عوامل کارفرما رہے ہیں، اُردو زبان کی اثر اندازی کے تحت انھیں مطالعے میں لایا جائے۔ ایک ایسے مطالعے کو جو اتنی طویل مدت اور متعدد پہلوؤں پر مشتمل ہو، جس کے ساتھ اس کا سیاسی، تاریخی اور ادبی پس منظر بھی ہو، بہت سخت پابندیاں عائد کرتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ تمام اہم مندرجات کو شامل کر لیا جائے جنھوں نے آزادی کے اہم مراحل کو متاثر کیا ہے یا ان میں وہ شامل رہے ہیں۔ بعض عنوانات اور موضوعات پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے، اس لیے کہ مقالے کے متعدد مباحث ان پر مرکوز ہیں۔ بعض عنوانات کے تحت محض اشاروں اور صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کے بعض مندرجات پر مؤقر تحقیقی کام ہو چکا ہے (اور بعض پر ہو رہا ہے) صرف ایسے محرکات اور ایسی شخصیات اور ان کا ایسا تصنیفی کام پیش نظر رکھا گیا ہے جو اس ضمن میں ضروری تذکرے کی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض مقامات پر تکرار سے کام لینا پڑا ہے، ورنہ بعض عنوانات تشنہ رہ جاتے اور بعض شخصیات اور تصانیف کا تذکرہ کسی ایک ہی عنوان کے تحت بھرپور اور مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

تالیف کی علمی اور تحقیقی نوعیت کے پیش نظر حواشی میں کسی بھی قسم کی دستاویزی شہادتوں کے اندراجات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ وہ اشعار یا نظم کے حصے جو مطبوعہ ہیں اور دست یاب بھی، حوالوں سے مستثنیٰ رکھے گئے ہیں۔ حواشی میں اسناد کے حوالے عام طور پر مصنفین کے مختصر اور معروف ناموں سے دیئے گئے ہیں۔ ان کی تصانیف کے متعلق ضروری معلومات ''فہرست اسناد محولہ'' سے حاصل کی جا سکتی ہیں جسے مصنفین کے مختصر اور معروف ناموں کے اعتبار سے اُردو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ حواشی میں یا فہرست اسناد محولہ میں ان تصانیف کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو ضرورتاً مقالے کے متن میں زیر بحث آئی ہیں، حواشی مین جہاں صفحات کے ساتھ ''وبعدہٗ'' تحریر ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ محولہ مضمون اس صفحے یا اس سے آگے کے صفحات پر بھی پھیلا ہوا ہے۔ جہاں کسی حوالے میں ''تصنیف مذکور'' لکھا گیا ہے، وہاں یہ مراد ہے کہ اس تصنیف کا ذکر فہرست اسناد محولہ میں موجود ہے۔

یہ مقالہ راقم نے استاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مشفقانہ اعانت اور رہبری میں کام کرتے ہوئے راقم کو اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کی آزادی حاصل رہی ہے اور مستقل حوصلہ افزائی ہمیشہ طمانیت کا باعث ہوئی ہے۔ استاذی پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب، استاذی ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی صاحب اور استاذی ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب مستقل اس مقالے کی تکمیل میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ان مشفق بزرگوں کی دلچسپی اور حوصلہ افزائی اس کام کی تکمیل کا سبب ہے۔

اس موقع پر کہ جب یہ مقالہ اشاعت کے مراحل طے کر رہا ہے، بیشتر حضرات نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ محترمی مرزا ظفر الحسن صاحب، معتمد ادارۂ یادگار غالب، برادرم مشفق خواجہ اور مخدومی ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنے بے پناہ خلوص سے مجھے نوازا ہے — اور اس کی اشاعت جناب اختر حسین صاحب، جناب جمیل الدین عالی اور دیگر کارکنانِ انجمن کی توجہ اور دل چسپی کے سبب ہے۔ میں ان حضرات کا ممنون ہوں۔ میرے لیے یہ مزید سعادت ہے کہ یہ مقالہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان کے زیرِ اہتمام "قائداعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کی تقریبات" کے سلسلے میں شائع ہو رہا ہے۔ اس ضخیم مقالے کی اشاعت محض دو ماہ کے عرصے میں انجام پا رہی ہے — جو یقیناً انجمن کی مستعدی کا اور قائداعظم اور ان کے مقاصد سے اس کے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ اپنے نامساعد حالات اور قلتِ سرمایہ کے باوجود کارکنان انجمن نے اپنے جس جذبے کا اظہار کیا ہے، اس پر وہ صرف راقم ہی کے نہیں پاکستان، اُردو اور قائداعظم کے تمام شیدائیوں کے شکریے کا مستحق ہیں۔

علمی تحقیق کے اس دور میں کسی مطالعے کو بھی حرفِ آخر کی حیثیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ آج علم کے نئے نئے گوشے اجاگر ہو رہے ہیں اور متعدد حقائق منظرِ عام پر آ رہے ہیں، چناں چہ کوئی بھی تحقیق اس لحاظ سے جامعیت کے دعوے کی حامل نہیں ہوسکتی۔ اس موضوع پر جو نقطۂ نظر میں نے اپنایا ہے اسے دست یاب شہادتوں اور مثالوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے ان پیش کردہ خیالات کی مکمل ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس مقالے کو پورے عجز و انکسار سے اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

۴۸۳/۵۱-بی، کورنگی، کراچی ۳۱

۹ر نومبر ۱۹۷۶ء

معروضہ

زیر نظر تصنیف اولاً قائداعظم کی صد سالہ تقریبات پیدائش کی مناسبت سے دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی اور اپنے اہم ترین موضوع پر اپنی نوعیت کا ایک جامعہ مطالعہ ہونے کے باوصف اس نے اپنی اشاعت کے فوری بعد اہل علم کی توجہ حاصل کر لی تھی اس لیے بہت جلد کمیاب بھی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ ہی عرصے بعد اس کی اشاعت ثانی کے تقاضے سامنے آنے لگے تھے، لیکن نظر ثانی کے بغیر اسے دوبارہ شائع کرنا مناسب محسوس نہ ہوا، کیوں کہ...... ۱۹۷۶ء کے بعد...... اس موضوع یا اس کے متعلقہ موضوعات پر جدید تر مآخذ و دستاویزات کے منظر عام پر آنے کے باعث نظر ثانی کا کام ایک کارِ محال نظر آیا اور پھر اس کی ضخامت (۱۰۱۶ صفحات) بھی کسی مزید اضافے کی متحمل نظر نہ آئی چناں چہ اس کی اشاعت ثانی کے شدید تقاضوں کی وجہ سے اب یہ محض ایک معمولی سے رد و بدل اور ممکنہ تصحیح کے بعد دوبارہ اشاعت کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

چوں کہ اس کا باب اول تحریکِ آزدی کے تاریخی و سیاسی پس منظر پر خود ایک جامع اور مکمل مطالعہ ہونے کے باعث بے حد پسند کیا گیا تھا اور اس کی علاحدہ مستقل کتابی صورت میں اشاعت کے مشورے بھی موصول ہو رہے تھے...... اور زیرِ نظر کتاب کی ضخامت کو بھی اس طرح کم کیا جا سکتا تھا، لہٰذا اسے موجودہ اشاعت سے حذف کر کے علاحدہ کتابی صورت میں شائع کرنا مناسب محسوس ہوا، جو اب ''آزادی کی قومی تحریک'' کے عنوان سے علاحدہ اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی یہ تازہ اشاعت ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات'' کی مناسبت سے منظر عام پر آ رہی ہے جو خود اس کا بھی مختلف عنوانات کے تحت ایک اہم موضوع ہے اور اس جنگ آزادی کے پس منظر و اثرات پر بھی محیط ہے۔ دراصل اسی کے تسلسل میں اولاً برطانوی استعمار سے آزادی اور پھر قیام پاکستان کی تحریک برگ و بار لاتی ہیں اور یہ ساری تحریکات اُردو زبان کو بطور وسیلہ استعمال کر کے کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہیں۔

یہ تازہ اشاعت مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کے اہتمام سے منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اس ضمن میں اس کے ناظم جناب شہزاد احمد صاحب کی جنابت سے اس کی اشاعت کی تحریک و اہتمام پر میں ان کا ممنون ہوں۔ عزیزم ڈاکٹر رفاقت علی شاہد نے اس کتاب کی طباعت کے مراحل میں بے حد سرگرمی سے کام لیا ہے، جس پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ محبِّ مکرم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اس کی کتابت اور اس کے جملہ مراحل میں بے حد دلچسپی لی اور زحمت فرمائی۔ میں ان کے اس کرمِ خاص پر ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

——— عقیل

پتہ: بی-۲۱۵/۱۵ گلستان جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

مقدمہ

نقطۂ نظر

انسانی زندگی کی تشکیل و تکمیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے قیام وارتقا میں انسان کی اخلاقی حس اور تصورِ عدل کا بڑا دخل رہا ہے۔ انصاف ایک مرکز ہے جس کے گرد سیاسی نظام کا دائرہ حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں اخلاقی احساس کا غلبہ اس درجے ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی اخلاقی حس کے منافی ہو تو جلد یا بدیر انقلاب واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل گئی۔ معاشرے کو استحکام اور صحت مند ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین اور قانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق رہے۔ اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس کے نظام فکر و عمل میں اس تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں کہ دین و سیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصولِ انصاف اور ضابطۂ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار صرف خدا کے لیے ہو جائے اور شرک ہر صورت میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم کو پیغام دیا کہ:

ان الحکم اِلّاَ لِلّٰہ۔ (یوسف: ۴۰) (سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے لیے نہیں۔

خدا کے فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ اسلام اللہ کی حاکمیت کے لیے آیا ہے، شرک، دوسروں کی غلامی اور باطل نظاموں کے تحت جزوی اصلاحات کے لیے نہیں۔

اسلام کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے اور اس کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو افراد اس دعوت کو قبول کریں وہ اپنا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری ختم ہو جائے اور خدا کی سلطنت میں صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ غلامی کی فضا میں اپنے دین کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اسلام پر اسی وقت پوری طرح عمل ہو سکتا ہے جب انسان ساری بندشوں کو توڑ کر صرف خدا کا مطیع ہو جائے۔ اسلام نے مسلمانوں کا جو مزاج بنایا ہے اس کے تحت وہ مجبور ہیں کہ باطل کے اقتدار کی، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، کھل کر مخالفت کریں اور اسے کسی صورت برداشت نہ کریں اور خدا کی حاکمیت کو سیاسی حیثیت سے عملاً قائم کرنے اور اس کے قانون کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہی کش مکش اور جدوجہد نظر آتی ہیں۔

برِعظیم میں سلطنت مغلیہ کے ختم ہونے تک صورت حال یہ تھی کہ گو مجموعی طور پر ملک کا نظام اجتماعی اسلام کے مطابق نہ تھا لیکن ایک طرف مسلم معاشرے میں ہماری ثقافت کی روایات بڑی مضبوطی سے جاگزیں تھیں اور دوسری طرف ساری خرابیوں کے باوجود ملک کا قانون شریعتِ اسلامی پر مبنی تھا۔ اس لیے اس وقت کے مسلمانوں کی کوششوں کا محور مزید اصلاح و تبدیلی اور نظامِ اجتماعی کی خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ مغربی سامراجیوں کی آمد نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا اور نئے حکمرانوں کی تمام قوت اس امر پر مرکوز ہوئی کہ مسلمانوں کی ملّی زندگی میں نظریاتی نقطۂ نظر سے جو زوال آ رہا تھا اس کی رفتار کو تیز کر دیں اور اسے اس کی انتہا تک پہنچا دیں تاکہ مسلمان سیاسی، مذہبی، تہذیبی ہر حیثیت سے غلام بن جائیں اور ان کا منفرد وجود باقی نہ رہے۔

برِعظیم کے مسلمانوں کے پیش نظر یہ مسئلہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بہت نمایاں ہو کر ابھرا، اس لیے کہ برطانوی سامراج کے ساتھ ساتھ اب ہندو بھی اس مقصد میں شریک ہو گئے تھے۔ ابتداءً ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ مقصد کو روکنے کی ایک مؤثر تحریک مجدد الف ثانی نے شروع کی تھی جس کے اثرات ایسی مزید تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ مسلمانوں نے برطانوی ہند میں اس نئی حیثیت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ محض ہندوستان میں بسنے والی ایک قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک

مسلمان کی حیثیت سے اپنے قومی وجود کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے متعدد مرتبہ بغاوت کی کوشش کی۔ مجدد الف ثانی نے ان کے ملّی وجود کو غیر قوموں کے ساتھ اشتراکِ مقصد سے روکا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی قومی حیثیت کی مزید فکری آب یاری کی۔ سیّد احمد شہید نے جہاد کا اعلان کیا اور تحریکِ مجاہدین نے ایک طویل عرصے تک دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا۔ فرائضی تحریک نے مشرقی ہند میں ان تحریکوں کی پیروی کی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مسلمانوں ہی کے دم قدم سے شروع ہوئی اور انھیں کے خون سے سینچی گئی۔ اس وقت مسلمانوں نے اپنی تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود اسلام کے اس مزاج کا بار بار اعادہ کیا کہ وہ غیر اللہ کی غلامی کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتے۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے سامنے وہ راہ پورے طور پر اجاگر نہیں ہوئی تھی جو ایک طرف انھیں غلامی سے نجات دلائے اور آزادی کو ان کے لیے مسخر کرے اور دوسری طرف ان کے رشتے کو ان کے مذہب اور ان کی تہذیب سے مستحکم کر کے ان تاریخی تقاضوں کو تکمیل کا موقع دے جن کے اظہار کے لیے برِ عظیم کی ملت اسلامیہ کا اجتماعی ذہن مضطرب اور بے چین تھا۔ اسی اضطراب اور بے چینی کے نتیجے میں مسلمانوں نے گاہے گاہے اسلام کے اس مزاج کا مختلف تصوراتِ آزادی اور ایک آزاد اسلامی ریاست کے تصورات کی شکل میں اظہار کیا۔ اس طرح فی الحقیقت مجدد الف ثانی سے لے کر تصورِ پاکستان تک ایک ہی فکر مختلف صورتوں اور مختلف تحریکوں میں کارفرما رہی اور اس سلسلے کی تمام تحریکات دراصل اسی ایک واحد مقصد کے تحت تھیں کہ مسلمانوں کے لیے غیر اللہ کی غلامی سے نجات اور حاکمیتِ الٰہی کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے تاکہ یہ ملک اگر کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔

ان تحریکات کے حلقۂ اثر میں سارا برِ عظیم اور ان کے مقاصد کے اعتبار سے، بالخصوص تمام مسلمان تھے۔ ہر تحریک کا اظہار و بیان زبان ہی کے سہارے ممکن ہے۔ برِ عظیم کی تمام تحریکات، مجدد الف ثانی سے لے کر تحریک پاکستان تک، اُردو زبان کے عام استعمال اور اس کے عروج و ترقی کے دور میں رونما ہوئیں۔ چوں کہ اُردو اٹھارویں صدی تک اپنے وسیع اور بسیط ماحول میں واحد ''لنگوا فرنکا'' کا درجہ حاصل کر چکی تھی، اس لیے ان تحریکات کے لیے اُردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اس زبان کا استعمال سارے برِ عظیم کے لیے بڑی حد تک کافی تھا۔ اس صورت حال میں اسلامی تحریکوں کے علاوہ دیگر قوموں کی تحریکیں بھی اُردو کو استعمال کرنے پر مجبور ہوئیں۔ مسلمانوں کی

آمد سے قبل اس زبان کو غیر مسلموں نے پرورش کیا تھا اور مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی غیر مسلموں کے شاندار کارنامے اس کا نمایاں حصہ ہیں۔ مسلمانوں نے من حیث القوم برِعظیم کی متعدد زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر زیادہ قناعت کی اور اسے اپنی پوری متاع سپرد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور موثر ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبان کی اپنی خوبیاں تھیں کہ اس نے بہت جلد ''لنگوا فرنکا'' کا درجہ حاصل کر لیا اور اس طرح دوسری قوموں کے لیے بھی، جہاں ان کا تخاطب عوام سے ہوتا، اس زبان کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ مسلمانوں کے لیے اُردو کو ہر موقع پر استعمال کرنا ناگزیر تھا چناں چہ ان کی ہر تحریک اسی زبان سے بارآور ہوئی۔

زیرِ نظر مقالے کا مقصد یہ جائزہ لینا ہے کہ اُردو زبان نے مسلمانوں کی ملی تحریکات کے فروغ اور مسلمانوں میں ملی شعور کو بیدار کرنے اور ان کی سیاسی تحریکات کو بارآور کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

باب اوّل

اُردو میں حُبِّ وطن کی روایت

۱۔ حُبِّ وطن پر مبنی قدیم ادب

برِعظیم اور اس کے باشندوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملّی اور وطنی شعور کو بیدار کرنے، اسے تقویت دینے اور سیاسی انتشارات کی مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حرارت سے آشنا کرنے میں اُردو زبان نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ ابھی تک پورے طور پر نہیں لگایا جاسکا ہے، جب کہ یہ زبان برِعظیم کی حیاتِ اجتماعی کی مظہر اور ایسا مجلّی اور مصفّٰی آئینہ ہے جس میں اس کی زندگی اور تہذیب کے خط و خال پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ چوں کہ ادب پورے طور پر معاشرے کے تمام تر پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے اس لیے اُردو ادب بھی برِعظیم کے ایک طویل دور پر محیط ہے۔ جب سے اُردو ادب کے وہ خط و خال اُبھرے ہیں، جن پر نگاہ پڑسکتی ہے، اس کا ادب برِعظیم کی ان تمام قومی تحریکات اور اجتماعی کوششوں کا اظہار کرتا ہے جو اس کی حیاتِ اجتماعی اور تہذیب کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ مسلسل سیاسی انتشارات کے نتیجے میں جب قومی تحریکات کا رُخ تحریکاتِ آزادی کی صورت اختیار کرتا گیا، اُردو نہ صرف ان تحریکات کی جدوجہد کو بیان کرتی ہے بلکہ عملاً خود بھی ان میں شریک نظر آتی ہے۔

اُردو ادب کے نمایاں خط و خال کے اُبھرنے سے قبل برِعظیم کے سیاسی انتشارات کے اظہار کی یہ تمام خصوصیات اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، فارسی ادب میں نظر آتی ہیں اور اس کا بہتر اظہار صنف ''شہر آشوب'' میں موجود ہے، جو اصطلاحاً ایسی نظم ہے جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی اور سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف طبقات کی مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ خصوصاً ہزلیہ یا طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو[1] فارسی شہر آشوب کی تاریخ میں آگہی خراسانی، وحیدی قمی، عشقی، حرفی اصفہانی، ذاتی لاری، مسعود سعد سلمان، طاہر وحید، نعمت خاں عالی، یکتا خوشابی[2]، غفور اچی، وحید الدین لسانی شیرازی، عزیزی قزوینی[3] کے شہر آشوبوں میں یا تو کسی شہر کا مدحیہ یا ہجویہ ذکر ہے یا کسی شہر کے

باشندوں کے مختلف طبقات کا حال کسی خاص مجلسی سرگرمی کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے۔[۴] امیر خسرو کی کئی تصانیف میں اہم معاشرتی اور تہذیبی عکاسی ہے۔ ان میں سے قران السعدین میں کیقباد اور اس کے والد کی ملاقات کی داستان ہے۔ مفتاح الفتوح میں جلال الدین فیروز خلجی کی چار فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔[۵] خزائن الفتوح علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت کے ایک حصے کی صحیح تاریخ ہے[۶] اور تغلق نامہ میں غیاث الدین تغلق کے عروج کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔[۷] اس کے علاوہ عشقیہ میں بھی، جو علاؤالدین خلجی کے بیٹے خضر خان اور دیول رانی کے رومان کی داستان ہے کچھ تاریخی مواد ہے،[۸] اور نُہ سپہر کو پڑھنے سے قطب الدین مبارک شاہ کے زیر حکومت سیاسی اور معاشرتی حالات کا اچھا ادراک ہوتا ہے۔[۹]

مطلع الانوار اور افضل الفوائد میں اس زمانہ کے اخلاق، آداب اور رسم و رواج بیان کیے گئے ہیں۔ حسن کی غزلوں میں جو خسرو کا ہم عصر تھا اور بدر چاچ کے قصائد میں، سیاسی واقعات موجود ہیں۔[۱۰] عصامی کی فتوح السلاطین میں محمد بن تغلق کے خلاف شورش کرنے والوں کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے اور بہمنی بادشاہت کے ظہور کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ دراصل حسن بہمنی کے دور تک سلاطینِ ہند کا منظوم تذکرہ ہے۔[۱۱]

اس دور میں ہندی ادب بھی پوری طرح اپنے ماحول کے سیاسی اور تہذیبی انتشار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندو مرکزیت ہرش وردھن کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان مختلف ہندو ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ان میں آئے دن خانہ جنگی رہتی تھی۔ اسی دور میں مسلمانوں کے حملوں کا زور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حملوں کا تذکرہ فارسی ادب میں دست یاب نہیں ہے البتہ سنسکرت کی کچھ تاریخی کتابوں میں ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ سانبھر، اجمیر اور آناراج پر مسلمانوں کے حملے ان سب میں کچھ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔[۱۲] اس وقت ہندوؤں کے لیے بادشاہوں کے جاہ و جلال یا سخاوت و ملک گیری کی تعریفیں کرنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ جنگ و جدل میں بہادروں کے حوصلے بڑھانے اور انھیں فتح کا یقین دلانے کا موقع تھا۔ اس طرح رزمیہ نظموں (ویرگا تھاؤں) کا دور شروع ہوا۔ ان رزمیہ نظموں میں حُبّ الوطنی کے پرخلوص جذبات ملتے ہیں۔[۱۳] اس وقت کے ہندو مصلحین کی نظمیں اور کتابیں نیز ملک محمد جائسی کی پدماوت اور اکھراوت بڑی معاشرتی اور ثقافتی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔[۱۴]

۲-دکنی ادب میں حُبِّ وطن اور فکرِ وطن کی روایات

دکن میں دبستان ادب کی بنیادیں پڑنے تک، امیر خسرو کے بعد شمالی ہند کے دبستان میں جو کچھ کام ہوا ہے، اس کا کوئی نمایاں حصہ دست یاب نہیں ہے۔ اس کے صرف چند نمونے کچھ شخصیات کے حوالے سے تاریخ ادب کا جزو ہیں، جب کہ دکن میں اُردو شاعری کا آغاز بہمنی عہد میں ہو چکا تھا لیکن اس دور کی شاعری کے بہت کم نمونے دست یاب ہیں۔ ان میں نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مثالی ہے۔ یہی صورتِ حال گجرات کی بھی ہے جہاں اُردو کو گجری یا گجراتی کا نام دیا گیا، چناں چہ دکنی شاعری کے ابتدائی نمونوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے مطالعے میں زیادہ تر وہ تخلیقات رہتی ہیں جو عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں عمل میں آئیں۔ ان دو سلطنتوں کے مراکز علی الترتیب بیجاپور اور گول کنڈہ میں اُردو شاعری اور ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

اس وقت تک دکن میں تقریباً سب ہی اصناف سخن کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، تاہم وہاں کی صورتِ حال کے مطابق ''مثنوی'' نے زیادہ فروغ حاصل کیا، جس کی تخلیق کے لیے ایسے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں امن و امان اور خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہوا اور یہ سازگار ماحول دکن میں میسر تھا۔ دکنی مثنویات موضوعات کے اعتبار سے رزمیہ، عشقیہ، اخلاقی، فلسفیانہ اور صوفیانہ ہیں۔ ان میں طبع زاد بھی ہیں اور دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ بھی۔ یہ مثنویاں زندگی کے تقریباً سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ شعرا کا خاص میلان واقعہ نگاری کی طرف تھا۔ مرثیہ، رزم نامہ، داستان گوئی ان کے خاص میدان تھے۔ سچے تاریخی رزم ناموں اور جنگ ناموں سے اُن کی دل چسپی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتے رہے۔ انھیں اپنے ارضِ وطن سے محبت تھی۔ حسن شوقی کا فتح نامہ وطنی عصبیت کا آئینہ دار اور جنگ نامہ عالم علی خاں ماحول سے گہرے تعلق کا قوی ثبوت ہے۔ دکنی شاعروں نے عشقیہ مثنویوں میں بھی جنگ، پیار سے منظر دکھائے ہیں[1] ان مناظر کے ساتھ ساتھ شعرا نے اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تہذیبی اور معاشرتی ماحول کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ کاتب کا ہے حُبّ الوطنی کا اظہار بھی نظم میں کرتا ہے:

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کون دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سرہور دکن تاج ہے
دکھن ملک بھو تیج خاصا اہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں اپنے ماحول سے دل چسپی اور لگاؤ کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ وہ اپنے ملک کو آباد اور خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اہل ملک کی ترقی و فارغ البالی کی دعائیں مانگتا ہے:

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر — رکھیا جوں توں دریا منے میں یا سمیع

حُبّ الوطنی کے جذبے کو طبعی نے اس انداز سے پیش کیا تھا:

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن — او مردا ہے پیرن ہے اس کا کفن
اگر کوئی غربت میں شاہی کرے — اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے
اپس کوں دیکھے کھول کر جوں آنکھاں — دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں
وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے — سفر ہے سو جوں باد باراں اہے

دکنی شعرا نے کلام میں اپنے ماحول کی سیاسی صورتِ حال کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ موضوع رزم ناموں میں ملتا ہے جو کسی حد تک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے کئی رزم نامے موجود ہیں جن میں دکن کی سیاسی تاریخ کے چند خاص ادوار یا اس صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسے رزم ناموں میں ایک حسن شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ ہے، جو مثنوی کے انداز میں لکھا گیا تھا[۲] حسن شوقی نے اسے دکن کی مشہور جنگ تالیکوٹ ۱۵۶۴ء کی فتح پر لکھا تھا، جو وجے نگر کے راجا رام راج اور ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ اوّل، حسین نظام شاہ اور برید شاہ کی متحدہ افواج کے درمیان ہوئی جس میں رام راج کو شکست ہوئی اور وجے نگر کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔[۳] حسن شوقی نے اپنے مربی حسین نظام شاہ کو فاتح تالیکوٹ قرار دیا ہے۔[۴] پھر وہ مختلف ملکوں کے نام و افراد کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں اور اوصاف بیان کرتا ہے اور ملک دکن کو سب سے افضل قرار دیتا ہے:

سو افضل میانا ہے ملک دکن — ہوئے یاں کے شاہاں جتے خوش لکھن

پھر سلاطین دکن کی تعریف و توصیف کے بعد ان کے آپس میں عہد و پیمان کرنے اور متحد ہو کر رام راج سے آمادۂ جنگ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔[۵] دوسری جانب رام راج کے دربار کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے اور اس کی جنگی تیاریاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔[۶] تاریخی اعتبار سے اس مثنوی کے واقعات کم و بیش وہی ہیں جو ہمیں اس دور کی مستند تاریخوں میں ملتے ہیں[۷] اور نظام شاہ کی جنگی تیاریوں اور حالات و عوامل کی وہ

بعض تفصیلات جو تاریخوں میں نہیں ملتیں وہ اس میں موجود ہیں۔

نصرتی کی رزمیہ مثنوی علی نامہ علی عادل شاہ کے عہدِ حکومت کے چند اہم واقعات پر مبنی ہے۔ اس کے ابتدائی دور میں سلطنت بیجاپور انتشار اور زبوں حالی کا شکار تھی۔ سرحدوں پر بغاوتیں برپا ہو رہی تھیں۔ اس پر اورنگ زیب کی چڑھائی اور بعض عادل شاہی امرا کا عدمِ تعاون مزید پریشانیاں پیدا کر رہا تھا۔ جب اورنگ زیب دکن کی مہم کو چھوڑ کر واپس آگرہ چلا گیا اور وہاں تخت نشین ہوا تو بیجاپور کو کسی حد تک سنبھلنے کا موقع ملا۔ علی عادل شاہ نے حکومت کو سنبھال لیا۔ وہ خود میدانِ جنگ میں آیا۔ شیواجی کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا۔ کرنول کے حبشی سرداروں کو شکست دی۔ راجا بدنور کی سرکوبی کی اور آخر میں مغلوں کے فوجی سیلاب کو جو راجا جے سنگھ کی سرکردگی میں بڑھتا ہوا آ رہا تھا، روکا۔ اس کے درباری شاعر نصرتی نے علی نامہ میں اس کی انھیں مہمات کو نظم کیا۔ اس سلسلے میں اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، احتیاط، اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بلکہ بعض باتیں ایسی بھی مل جاتی ہیں جو تاریخ میں عام طور پر موجود نہیں۔ واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستاں اور جنگ کا نقشہ بڑی صناعی سے پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے۔[۸]

نصرتی نے مثنوی کی ابتدا حمد سے کی ہے۔ پھر اس نے جشنِ تخت نشینی کا حال بیان کیا ہے اور علی عادل شاہ کی شان میں قصیدہ کہا ہے۔ جشن کے بعد نئے باب میں نصرتی دکن کی بادشاہت پر نظر ڈالتا ہے، اور لکھتا ہے کہ جب اس ملک میں کوئی نیا بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہوتا ہے تو سلطنت کی حالت بھی دگرگوں ہو جاتی ہے۔ دوست، دشمن، مخالف، موافق تاک میں رہتے ہیں اور بادشاہ کو بڑی مصلحت اندیشی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ کے تخت نشین ہونے پر ملک کی کیا حالت تھی۔[۹]

کہ القصہ یو بادشاہی کے کام	دوست ہوئیں لگ اور غنیماں تمام
نھنے ہور بڑے تھے سو سب بدنہاد	اچائے وہ چاروں طرف تھے فساد
مخالف تو آ کر منافق ہوئے	موافق بی کے ناموافق ہوئے
بڑی رنج کی شہ اپنے کم سن ملے	نوی بادشاہی نوے دن ملے
کبل تخت بازیانچ پڑنے لگیاں	بڑیاں شدتاں روز گھڑنے لگیاں
ولے شاہ ہمت سوں رکھ دی توی	نوے کام پر کر تردّد نوی

یک یک کام لگ مل سوں ساندن لگیا　　یک یک نہ تردّد سوں باندن لگیا
اگن پن وہ فتنے کی چوندھیر سوں　　اٹھی تھی وہ شمشیر کے نیر سوں
اسے یک طرف تھے بجاویں تلگ　　اٹھے بھی وہ دسرے رخن تھے سلگ

علی نامہ میں شیواجی کی فتنہ انگیزی کو اس طرح پیش کیا ہے:

اتا بات کوں کاڑموذی کا نام　　کہ قائم ہوا فتنہ جس تھے تمام
سیویا کر جو اک فتنہ انگیز تھا　　بڑا چور موذی و خون ریز تھا
دکن کی زمیں بیچ تخمِ فساد　　جو پریا سو اول یہی بدنہاد
رعیت جتا خوار اوس شوم تھے　　ہوا ملک ویرانہ تس بوم تھے
فرنگی تھے تھا کفر میں ات اشد　　کرے دین سوں دشمنی سخت بد

مثنوی میں گاہے گاہے تاریخی تسلسل کے ساتھ یورشوں اور جھڑپوں کی واقعہ نگاری بھی موجود ہے۔ ایسے کئی اشعار اس مثنوی میں ملتے ہیں جو نصرتی کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کی ذلیل ہے۔

کچا توڑنا خار بہتر دسے　　کہ چھوڑے تو ہو پختہ جنجر دسے

یعنی بغاوت کو ابتدا ہی میں دبا دینا بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے تو اس کا بجھانا دقت طلب ہوتا ہے۔[۱۰]

علی عادل شاہ کے مختلف محاربات و فتوحات کو پیش کرنے کے بعد اس نے مغلوں اور بیجاپوریوں کی باہمی جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے اور مغل افواج کو برا بھلا کہا ہے۔ مجموعی طور پر اس مثنوی میں اس نے علی عادل شاہ کے عہد کی سیاسی صورتِ حال اور مختلف جنگوں کے کوائف کو نظم کیا ہے۔ اس کی دوسری مثنوی تاریخ سکندری سکندر عادل شاہ کے عہد کے واقعات پر مبنی ہے۔ چوں کہ اس وقت صورتِ حال علی نامہ جیسی نہیں تھی اس لیے اس مثنوی میں پہلا سا جوش و جذبہ نہیں۔[۱۱]

۱۰۹۲ھ میں سیوک نامی شاعر نے جنگ نامہ کے نام سے فرضی داستان نظم کی اور اسی کے انداز پر ۱۰۹۵ھ میں غلام علی لطیف نے ظفرنامہ کے نام سے ایک رزمیہ داستان لکھی۔ رستمی کی خاورنامہ کی داستان بھی ان دونوں سے مشابہ ہے۔[۱۲]

سلطان محمد قلی کے زمانے میں شمالی ہند سے مغلوں کے حملے دکن پر شروع ہو چکے تھے۔ یورشوں کی روک تھام اور دکن کی آزادی، سلطنت گول کنڈہ کا مطمحِ نظر بنا رہا۔ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۶۶۵ء میں اور

ابوالحسن نے ۱۶۷۹ء میں مغلوں سے مقابلے کی کوششیں کیں[13] مغلوں کے حملوں کے نتیجے میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ بیجاپور کی عادل شاہی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت پر ۱۶۸۵ء تک یورشیں ہوتی رہیں، اور آخر کار یہ بھی مغلوں کی ایک باج گزار ریاست بن گئی۔[14] ابوالحسن کا دور تو مغلوں کے حملوں اور بالآخر سلطنت کے خاتمہ کی وجہ سے افسوس ناک ہے۔ اس عرصے میں دکن تہذیبی اور سیاسی طور پر ایسے انقلاب سے دو چار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کی بنیادیں ہلا دیں۔ اہل گول کنڈہ اور بیجاپور اس انقلاب سے اتنے متاثر ہوئے کہ پچاس سال تک سنبھل نہ سکے۔ ابوالحسن تانا شاہ کی شکست اور قید کے بعد اس شہر کی مرکزیت ختم ہو گئی، جس کی وجہ سے یہاں ادب فروغ حاصل کر رہا تھا۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کی تباہی کے بعد بیشتر ایسے شاعر اور ادیب یہاں سے نکل گئے جو قدر دانیِ کمال کی وجہ سے یہاں مقیم تھے۔[15] یہ دکن کے ادب کے لیے بھی ''دورِ انتشار'' ثابت ہوا، اس لیے کہ یکے بعد دیگرے دکن کی باقی سلطنتیں احمد نگر کی نظام شاہی، بیدر کی برید شاہی، برار کی عماد شاہی، ارکاٹ کی والا جاہی، مغلوں کے ماتحت آ گئیں۔[16] اس ''دورِ انتشار'' میں بے شمار شاعر حیدرآباد سے باہر نکل گئے اور کس مپرسی کے عالم میں روپوش ہو گئے لیکن بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہ جا سکے، وہ اپنے شہر کی تباہی اور اپنی لاچاری پر آخر وقت تک نوحہ کناں رہے۔[17] یہ فاتح شہنشاہ اورنگ زیب اور اس کے کارندوں کے ڈر سے اپنے جذبات و خیالات کو علانیہ ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے مرثیہ گوئی کو اپنایا۔ وہ اپنے وطن کے غم کو حضرت حسینؓ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ کر ظاہر کرتے رہے۔ یہ امر بطور خاص قابلِ ذکر ہے کہ اہل حیدرآباد اپنے بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے آٹھ ماہ تک محصور رہنے اور جرأت و شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کے شریفانہ عادات و تصوف و عرفان سے لگاؤ کی بنا پر اس کو حضرت حسینؓ مظلوم سے تشبیہ دینے لگے تھے۔[18] زوالِ حیدرآباد ہی کے غم کے نتیجے میں شعرا مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس امر کے اظہار کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس شہر کے اکثر مرثیہ گو سنی المذہب تھے۔ وہ طویل نظمیں یا مثنویاں نہ لکھ سکے کیوں کہ ان کے لیے اطمینان قلب اور فارغ البالی ضروری تھی اور دوسرے کسی قدر دانی یا قدر و منزلت کی توقع اور یہ سب باتیں اس ''دورِ انتشار'' میں مفقود تھیں۔ ایسے شاعروں میں سے سب سے زیادہ مشہور روحی تھا۔ اس کے متعدد مرثیے مختلف کتب خانوں کی بیاضوں میں موجود ہیں۔[19] اس نے غزلیں اور مخمس وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ ان میں اکثر مقامات پر درد و سوز نظر آتا ہے:

جلتا نہ پروانہ کہیں اس سوز کے آزار میں زاری نہ کرتے بلبلاں اس درد کے گلزار میں
گلشن محبت کا اگر بے خار ہوتا کاش کے

اس انداز کا سوز و گداز اس عہد کے دکنی شعرا کے نفسی رجحان اور ذہنی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔
ان شعرا نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کا آلۂ کار بنایا تھا۔ بعض مرثیوں میں محض ایک آدھ لفظ کی تبدیلی سے ان شعرا کا مقصد (یعنی تباہیِ وطن کی مرثیہ نگاری) ظاہر ہو جاتا ہے، جیسے روحی کے مرثیے کا یہ جزو:

آج غم ناک ہیں چمن کے گل بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں نرگس و لالہ یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں جل بجھے شمع انجمن کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھنا سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل
خوش لگے تجھے طبع سیں اے طبعی دل کے باغاں بنے سخن کے گل

اگر اس مرثیے کے پہلے مصرعے میں چمن کے بجائے دکن کا لفظ لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے حضرت حسینؓ کے ابوالحسن تانا شاہ کا مرثیہ بن جاتا ہے۔[۲۰] روحی کے علاوہ اس دور کا قابلِ ذکر شاعر مرزا ہے جو ابوالحسن کا درباری شاعر تھا۔ جب ابوالحسن قید ہوا اور حیدرآباد کو مغل فوجوں نے لوٹ لیا تو مرزا نے اس غم میں فقیری اختیار کر لی اور گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اسی گوشہ نشینی میں اس نے مرثیہ لکھ کر اپنا غم غلط کیا تھا۔ اس کے ایک مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں:

یہی نہ تنہا لباس نیلا ہے، بسب محباں نے تن میں غم تھیں
سیاہ پھیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کے نین میں غم تھیں
ملا تھا بلبل سوں میں سحر گہ سنا ہوں احوال گلستاں کا
نہیں ہے کوئی گل بغیر نرگس و لے ہے گریا۔ چمن میں غم تھیں
خطا کا احوال مشک کہتا ہے جب سوں پہنچتی ہے یہ خبر وہاں
ہوا ہے سودا سوں جل کے کالا لہو غزال ختن میں غم تھیں
خبر محباں کی اشک ریزی کی جب بدخشاں سوں گئی عرب میں
عقیق جتنے تھے سب لہو ہو کے بہ چلے ہیں یمن میں غم تھیں

یہ مرثیہ بوتراب سیتی قبول پائے تو کچھ عجب نئیں
کہ روح قادر کی زار روئے پڑے جو مرزا دکھن میں غم تھیں

قادر جس کا مقطع میں ذکر آیا ہے، خود بھی مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس کا بھی یہ ایک شعر سوز و غم کی صورتِ حال کو پیش کرتا ہے:

ختم کر یو مرثیہ، پایا وصال ہائے کیا غم، غم پہ غم ہے مستقیم

اس ''دورِ انتشار'' کا ایک اور بڑا شاعر بحری تھا، جس کی مثنوی من لگن بڑی ادبی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ گوگی کا رہنے والا تھا۔ اپنے وطن سے وہ بیجاپور اس وقت پہنچا تھا جب مغلوں نے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور آخر کار جب وہ اجڑ گیا تو وہ حیدر آباد چلا گیا لیکن مغل افواج نے اسے بھی تباہ کر دیا چناں چہ وہ حیدر آباد سے بھی کس مپرسی کے عالم میں نکل گیا۔ اس کا ان تباہیوں اور اپنی مجبوریوں سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ اس نے اپنے اس رقت آمیز تاثر کو من لگن میں درشکایت روزگار کے عنوان کے تحت رقم کیا ہے۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

اے بھائیو بارھویں صدی ہے نیکی کو دبا بدی بدی ہے
ہے آج تو قحط سال ست کا جھٹکیا ہے دھرم سوں دل جگت کا
اس دور منے جو ہے کسی کا دبلا ہے دیانت آدمی کا
انصاف گیا ہے صاف جگ تے ہور عدل کی دونچہ اِاف جگ تے
دھرتی پہ ادھرم ادک ہوا ہے امرت کی بجائے بک ہوا ہے
اس دور منے کیام نامی چوالا کرے دور کی غلامی
نا جائی کوں مائی کا بھروسا نا بھان کوں بھائی کا بھروسا
نا شرم کی خو ہے یک نین میں نا دھرم کی بو ہے یک بدن میں
دشمن کہیں لی دسیا نہیں گھٹ ہور دوست تو دشمنی کی لٹ پٹ
نا ایک کوں دوسرا قبولے گرچہ اوتے دوسرا قبولے
پورب کی طرف اگر چلے پیر تو جائے مرید اٹھ دکنا دھیر
سنسار میں ہے جو سرد ہور گرم سو پیر پہ سب دتے پراکرم
یعنی رہے جگ کے جنجع میں جھوم ان یوم جو اچھے تو ان توں معلوم

اس ہول میں تو ہوا ہے پیدا　　اس ڈول میں تو ہوا ہے پیدا
اب جیونے تے بھلا ہے مرنا　　بہتر ہے جو بے ازل گزرنا

دکنی دور کی اُردو شاعری کے سلسلے میں ایک بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ یہاں رزم نامے اور تذکرۂ احوال تو لکھے گئے لیکن شہر آشوبوں کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا ہے بلکہ دکنی سلطنتوں کے انحطاط کے بعد اُردو شاعری کی یہ رفتارِ ترقی بھی، جو رزم ناموں اور مثنویوں کے انداز میں ہو رہی تھی، بڑی حد تک متاثر ہوئی۔ طویل رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں کی تخلیق و ترجمہ کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اگرچہ مغلوں کے دورِ اقتدار میں بھی دکن میں مثنویاں لکھی گئیں لیکن یہ زیادہ تر صوفیانہ، اخلاقی یا عشقیہ موضوعات پر مبنی ہیں۔ مذکورہ دور کے اختتام پر سراج اورنگ آبادی کی بوستان خیال شمالی ہند کی ترقی یافتہ مثنویوں کے پائے کی چیز ہے۔[۲۱] اس کے علاوہ ایک مثنوی اور بھی ہے جو واقعاتی رزمیہ مثنوی ہے۔ یہ غضنفر حسین غضنفر کی جنگ نامہ عالم علی خان ہے جو نظام الملک آصف جاہ اور عالم علی خان کی جنگ کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس مثنوی میں صرف اس جنگ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو اورنگ آباد اور برہان پور کے درمیان ایک مقام بالا پور میں لڑی گئی تھی۔[۲۲] اس میں اس وقت کی سیاسی صورتِ حال کا تجزیہ نہیں ہے اور اس کا موضوع بھی نصرتی کے علی نامہ کے مقابلے میں محدود ہے۔

اس قسم کی مثالیں گوجری زبان میں بھی ملتی ہیں، جو اصلاً اُردو کا گجراتی روپ ہے۔ جب گجرات پر مغلوں نے حملے شروع کیے تو ان کے اثرات کے تحت مغلوں کے حملوں پر مبنی ظلم و ستم کو مصطفیٰ گجراتی نے اپنے ریختوں میں بیان کیا ہے۔ جس وقت وہ مغلوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہا تھا، اس نے یہ ولولہ انگیز ریختہ کہا:

ولے چوکیں جو کہیں برا ہوا　　ات دھل جو منیوں سیس پڑے
ہوا ولیوں لوں بھی بھی آئی آڑے　　ہم اس پتھر چالیں کھڑے کھڑے
جو پیو جی نہیں جوا　　ولے چوکیں جو کہیں برا ہوا

اس دور میں چند ایسے شاعر اور ادیب بھی گزرے ہیں جو اپنے زمانے کے سیاسی انقلابات کے تاثرات کو زائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں پہلا نام ضعیفی کا ہے۔ اس کی ایک مثنوی کے آخری باب کی تیسری فصل میں اورنگ زیب کی مدح اس طرح ہے جس میں حُبِّ وطن کے جذبات بھی روایتی انداز سے بیان ہوئے ہیں۔

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب — کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
دیا سر پو جو پن شہی کا وہ تاج — دلی ہور دکن کا ہوا ایک راج

بیجاپور کی تباہی پر ہجرت کرنے والوں میں بحری کی طرح ایک اور شاعر شاہ عبدالرحمان قادری تھا، جس نے برار کا رُخ کیا تھا۔ اس نے مثنوی باغ حسینی میں شہر بیجاپور کا ایک الم خیز مرثیہ لکھا ہے اور حُبِّ وطن کے جذبے کے تحت اورنگ زیب کی مذمت کی ہے:

جو اس وقت میں تھا بیجاپور شہر — سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر
خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا — اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگ زیب — کیے اس کو لینے کے تئیں کئی فریب
دیے بھیج فوجاں کو اوّل عتاب — جو جا کر کریں ملک سارا خراب
پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے — لیے شہر ہور ملک سب غصب

شمالی ہند میں اُردو شاعری کی باضابطہ ابتدا سے قبل کے دکنی دور کا آخری اہم شاعر ولی ہے۔ اس کا دور دراصل دکن کا دورِ انتشار تھا۔ چناں چہ اس دور کے اکثر دکنی شعرا بحری، آزاد، فراقی، وجدی، نوری، امامی وغیرہ مسلسل حرکت و ہجرت میں رہے۔[۲۳] ولی اپنے زمانے کے ماحول سے علاحدہ اور بے خبر نہ تھا۔ وہ بڑا ''جمال دوست'' شاعر تھا، اور اس کی زندگی جو بڑی حد تک سیر و سفر میں گزری، شاید اسی وجہ سے محبت کے موضوعِ سخن سے عبارت ہے۔ حسن و محبت، عشق و محبوب اس کی شاعری کے اہم موضوعات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں اجتماعی ماحول کی ترجمانی نمایاں نہیں۔ اس کا ثبوت خود اس کا یہ شعر ہے:

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جو نیہ کے کوچے میں ہے اس کو وطن سے کیا غرض

صرف کہیں کہیں سرسری اس نے اپنے ماحول پر نظر ڈالی ہے:

ملک ہرگز نہیں رہے آباد — تخت سیں جس نے شہریار گیا
ڈنکا فتح کا خوب بجایا دکن اوپر — اورنگ شاہ والی برجا ہوئے اتال
ملک دل کے خراب کرنے کوں — شاہ ہے، فوج ہے، نقارہ ہے

ولی کا وطن اورنگ آباد تھا۔ اورنگ زیب کی لشکر آرائیوں کی وجہ سے چوں کہ وہاں علم و ادب

کے لیے مرکزیت باقی نہ رہی تو ولی نے حصولِ علم کے لیے گجرات کا سفر اختیار کیا۔[۲۱] چوں کہ یہ اس کے عنفوانِ شباب کا دور تھا اس لیے وہ اپنی زندگی کے اس شگفتہ دور کو جو گجرات میں گزرا، بعد میں یاد کرتا ہے۔ اس نے گجرات کے فراق میں جو غزل لکھی تھی، اس کے چند شعر یہ ہیں:

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل — بے سینے منے آتش بہار دل
اس سیر کے نشے سوں اوّل تر دماغ تھا — آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز — عشرت کے پیرہن کوں کیا تارتار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں — ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں — پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

اس کی مشہور مثنوی شہر سورت کی تعریف میں ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

عجب شہراں میں ہے پر نور یک شہر — بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد ہر
اہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے [وہ] نور — اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

وہ غیر ملکیوں کا ذکر اس نفرت کے ساتھ کرتا ہے:

فرنگی اس میں آتے ہیں کلمہ پوش — عدو وہاں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش
وگران میں فرنگی بے عدد ہیں — کہ قول و فعل میں مکروہ بد ہیں

ولی کے کلام میں ناپائیداری و بے ثباتیِ دنیا کا احساس بھی جا بجا موجود ہے۔ گو کہ اس میں وہ شدت اور تلخی موجود نہیں جو دوسرے شاعروں کے پاس ابتر سیاسی حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ اس تعلق سے اس کے کلام میں اس قسم کے اشعار ہیں:

مفلسی، بے کسی کی فوجاں تے — شہر دل کوں کیا ہے ویران آ
زندگی جام عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
باعث رسوائی عالم ولی — مفلسی ہے، مفلسی ہے مفلسی
چمن میں دہر کے ہرگز نہیں ہوا معلوم — کہ کب ہے فصلِ ربیع اور کہاں ہے فصلِ خریف

مجموعی طور پر دکنی دور کے اس مرحلے تک کی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دکنی

شعرا نے اپنے کلام میں ماحول اور اس کے سیاسی اور سماجی پہلو کی عکاسی اپنے طور پر کی ہے، چاہے وہ حُبِّ وطن کے جذبات ہوں یا جنگ و پیکار کی خون آشامیاں یا سیاسی ابتری و انتشار سے گریز پائی یا اس قسم کے ماحول سے آزادی کا رجحان ان کی شاعری کے موضوعات میں شامل رہا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر دکنی ماحول کا سیاسی اور سماجی پس منظر اور پھر اس کے ہیجانات و اثرات بخوبی بیان ہوئے ہیں۔

۲- فارسی ادب میں حُبِّ وطن اور فکرِ وطن کا اظہار

شمالی ہند میں قومی اُردو شاعری کی ابتدا تک برِّعظیم کے فارسی ادب و شاعری میں قومیت اور اس کے مختلف عناصر اپنا اظہار کر رہے تھے۔ جس طرح اُردو کی قومی شاعری دکن میں اپنے خط و خال وضع کر چکی تھی، اسی طرح فارسی شاعری میں پیش کردہ خیالات، دکن، اس کی سیاسی صورتِ حال یا اس سے متعلقہ شخصیات کے بارے میں بہمنی سلطنت کے ایک وزیر خواجہ محمود گاواں، جس کے کارنامے بہمنیہ تاریخ کا تابناک باب ہیں۔ اس کے علمی کارناموں ریاض الانشاء اور مناظر الانشاء کو خاصی اہمیت حاصل ہے، وہ فنِ انشا اور ساتھ ہی دکن کی سیاسی معلومات میں بھی اضافہ کرتی رہیں گی۔ اس سے یہ شعر بھی منسوب ہے:

جائے آن دارم کہ آرم وبہ ہندوستان کہ شد
ہند رشک روم از عکس جمال انورش

جب دکن کی سلطنتیں زوال پذیر ہو رہی تھیں تو ہر طرف ذی اقتدار افراد سر اُٹھانے لگے تھے۔ یہ سرتابیاں محمد شاہ کے عہد سے شروع ہو گئی تھیں، اور محمود گاواں کا قتل ان بغاوتوں کی بنیاد تھا۔ دکن کی تاریخ میں محمد شاہ لشکری کی موت کو خرابیِ دکن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان شعروں سے اس کی تاریخ وفات نکالی گئی تھی:

شہنشاہ جہاں شاہ محمد کہ در بحرِ فنا ناگہ فرو شد
دکن چوں شد خراب از رفتنِ او خرابیِ دکن تاریخ او شد

۸۷۷ھ

برِّعظیم کے مذہبی شاعروں میں اس سرزمین سے وارفتگی اور فریفتگی کے جذبات جس خوبی کے ساتھ امیر خسرو کے کلام میں بیان ہوئے ہیں، وہ دیگر فارسی شعرا کے مقابلے میں نمایاں ہیں۔ ان کی تقریباً تمام منظوم تصانیف اس خصوصیت کو پیش کرتی ہیں۔ فتوح السلاطین کا شاعر عصامی اپنی منظوم

تاریخ میں جابجا ہندوستان کی تعریف وتوصیف کرتا ہے۔ یہ حسن گنگو بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اس نے فتوح السلاطین کے نام سے غزنویوں، خلجیوں اور تغلقوں کا ایک شاہنامہ لکھا تھا۔ آگے چل کر ہندوستان کے فارسی شعرا میں فیضی نے ہندوستان کی ہر چیز سے اپنے عشق کو بیان کیا ہے۔ پھر عرفی، نظیری، ابوطالب کلیم مشہور شعرا تھے، جنھوں نے مختلف پہلوؤں سے ہندوستان سے اپنی محبت اور لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔ اکثر شاعروں نے کشمیر کی دل کھول کر تعریف کی۔ بعض شعرا کے کلام میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے محبت پر کئی اشعار اور نظمیں ملتی ہیں۔ بدر چاچ، مطہر کڑہ، جان محمد قدسی، عبدالحمید لاہوری، ظفر خان احسن، مرزا محمد طاہر آشنا، ملا محمد صوفی، ملا شاہ لاہوری، منیر لاہوری، جعفر بیگ بینش، شیخ علی حزیں وغیرہ ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے بکثرت ہندوستان کے بارے میں اپنے جذباتِ محبت پیش کیے۔[۲]

بعض مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا آغاز عہد شاہ جہانی کے آخری ایام میں ہو چکا تھا۔ شاہ جہاں کے ضعیف ہوتے ہی تخت کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہو گئی تھیں جو بڑھتے بڑھتے باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہوئیں۔ یہ جانشینی کی وہ جنگ تھی جس میں بالآخر اورنگ زیب کو فتح حاصل ہوئی۔ ان جنگوں کا حال تاریخ کی کتابوں کے علاوہ بہشتی کی مثنوی آشوب نامۂ ہندوستان میں موجود ہے۔[۳] بہشتی اس مثنوی میں ہندوستان کے تیموری شہزادوں کی خانہ جنگی کا حال بیان کرتے ہوئے رعایا کے مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی اور مجلس اختلال کا موثر تذکرہ کرتا ہے۔ وہ پیشوں اور تذکروں پر جو برا اثر پڑا، اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس نے ''بےنوکری'' اور ''بیروزگاری'' کی عام شکایت اور اس سے جو تجارتی کساد بازاری پیدا ہوئی تھی، اس کا شکوہ کیا ہے۔[۴]

برِعظیم کی فارسی شاعری میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن میں وقت کے سیاسی انتشارات، ہیجانات اور سماجی محرکات کا بیان موجود ہے، یا کسی شخصیت کے کارنامے اور اس سے متعلق شعرا کی عقیدت وتوقع کا اظہار بھی نظر آتا ہے۔ یہ کیفیت اورنگ زیب کے بعد کے عہد میں شعرا کی اثر پذیری اور ان کے شدتِ احساس کا واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس ضمن میں شعرا کے یا تو وہ تاریخی قطعات ہیں جو اُنھوں نے مختلف اہم تاریخی واقعات پر کہے یا ایسے اشعار، غزلیں، رباعیاں، مثنویاں اور قصیدے جو سیاسی عوامل سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ اور جو شہرآشوب لکھے گئے، ان میں تو اس قسم کے کوائف کا بیان شدید ہے۔ اس قسم کی مثالوں میں بہشتی کا شہرآشوب نعمت خاں عالی کا قطعہ[۵] اور اس کا ''قصیدہ شہرآشوب''،[۶] یکتا خوشابی کی مثنوی جہان آشوب،[۷] بیدل کا وہ قطعہ جو اُنھوں نے

سادات بارہہ کے متعلق لکھا تھا،[8] اور ان کا نظام الملک سے متعلق، تاثراتی قطعہ،[9] سیّد عبدالجلیل بلگرامی کا ''مرثیہ حسین علی خاں''،[10] آنندرام مخلص کا وہ قطعہ، جو اس کی احمد شاہ ابدالی سے عقیدت اور مرہٹوں سے نفرت کو ظاہر کرتا ہے۔[11] پھر فضل علی خان، میر اولاد محمد ذکا بلگرامی، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تاریخی قطعات[12] بالخصوص میر غلام علی آزاد بلگرامی کی رباعیاں، تاریخی قطعات اور غزلیں اس ضمن میں بڑی نمایاں اہمیت رکھتی ہیں، جن میں اس زمانے کی تاریخ اور اس وقت کی سیاسی صورتِ حال موجود ہے۔ اُن کی وہ غزل خاص طور پر مشہور ہے جو اُنھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان آنے پر، جنگ پانی پت سے پیشتر، دکن میں کہی تھی۔[13]

اورنگ زیب کے بعد، فارسی اور اُردو دونوں میں شہر آشوب کا بڑا رواج رہا۔ اور اصل میں یہ حالات زمانہ کا تقاضا بھی تھا۔ اب سیاسی فضا کے ساتھ ساتھ عام شاعری اور بالخصوص شہر آشوب کا انداز بھی بدل رہا تھا۔ برِعظیم کے طول وعرض میں خانہ جنگی، بے روزگاری، مجلسی بے اعتمادی، معاشرتی گڑبڑ اور بے چینی اس قدر عام ہوگئی تھی کہ یہ احساس شدید تر ہوگیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں جابجا عسکری نظام کی شکست اور فن سپہ گری کے زوال کا ماتم کیا ہے۔[14] اس کے علاوہ شعرائے عصر نے اگرچہ حقائق کا اظہار پورے طور پر کھل کر نہیں کیا جس کی وجہ سے تاریخی و سماجی واقعات کی تفصیل ان کے کلام میں کچھ زیادہ نہیں ملتی، پھر بھی ان کا کلام عام سیاسی بے چینی اور بے قراری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس زمانے میں بیشتر ''عبرت نامے''، ''فلک آشوب'' اور ''شہر آشوب'' لکھے گئے، جو عبرت اور آشوب کے موضوعات پر مبنی ہیں[15] اور پھر جعفر زٹلی کی فریاد فائز محمد شاہی کا شہر آشوب، شفیق اورنگ آبادی کا شہر آشوب، کمترین دہلوی کا شہر آشوب اسی ہلاکت خیز دور کی یادگاریں ہیں۔ آگے چل کر نادر شاہ کے حملوں نے اس صورتِ حال اور اس کے مصائب میں اور اضافہ کیا۔ مغل صوبے داروں کے عساکر منتشر ہوگئے۔ بیروزگاری عام ہوگئی، شریف اور نجیب امیری کی مسند سے اتر کر فقیری اور گداگری کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ایسی صورت حال واس دور کے شہر آشوبوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

۴-شمالی ہند کا پہلا دور- ۱۷۵۷ء تک

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باقاعدہ رواج اورنگ زیب کی وفات کے بعد فارسی کے پہلو بہ پہلو بڑھنے لگا اور جب ایہام گوئی کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ

ہوا۔ اس کا اندازہ ان تذکروں سے ہوتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے۔ ۱۱۶۵ھ میں میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں ایک سو تین شعرا کا ذکر کیا ہے اور اس کے ایک سال بعد گردیزی نے اٹھانوے کا، جن میں سے پچیس کا ذکر میر کے تذکرہ میں موجود نہیں۔ ۱۱۸۸ھ میں قدرت اللہ قاسم نے اور میر حسن نے دوسو اٹھاسی شاعروں کا تذکرہ لکھا اور شورش نے ۱۱۹۳ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا ذکر کیا۔[1]

فائز کا دیوان دست یاب نہ ہونے تک یہ خیال عام تھا کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کا با قاعدہ آغاز ولی کے ۱۷۰۳ء میں دہلی جانے یا ان کے دیوان کے ۱۷۲۲ء میں دہلی پہنچنے پر ہوا۔ فائز کا دیوان دست یاب ہونے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولی کے دیوان کے دہلی پہنچنے سے قبل بھی ولی کا کلام شمالی ہند میں مقبول ہونے لگا تھا۔ ان شعرا کے کلام میں بھی، جو فائز اور اس کے معاصرین سے قبل شمالی ہند کی اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک علاحدہ باب کے حامل رہتے ہیں، حُبِ وطن کے جذبات یا سیاسی انتشار، معاشی زبوں حالی اور گریز پائی کے احساسات گاہے بہ گاہے نظر آجاتے ہیں، جیسے پنڈت چندر بھان برہمن کی غزل کے یہ چند اشعار، جو اس نے تارک الدنیا ہو کر بنارس میں کہی تھی، عام طور پر ملتے ہیں:

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح، یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے، نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے، نہ جمنا ہے، نہ ندی ہے، نہ نالا ہے

یا پھر شیخ محمد نور کی یہ مناجات جس میں شدید احساسِ محرومی اور درد و غم سے گریز کی التجا ہے، کچھ شعر یہ ہیں:

ڈوبا میں غم کے چاہ موں غفلت منی حیراں ہویا
زحمت مجھے مضطر کیا دیوو شما خود کرم کر

بختوں کے جس مارے ہوئے وہ بار تمکے آ کرے
مجھ اس لیے تجھ نام کی ہے درد دل میں جاں بہتر

قوت گئی مجھ صبر کی ہے بیقراری روز و شب
تم سیں طلب آرام کی بدو ہم مجھ کے دور کر

فائز سے کچھ قبل ایک اہم نام جعفرزٹلی کا ہے، جس کے کلیات کی موجودگی میں خود مسعود حسن رضوی ادیب کو فائز کے شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا زیادہ یقین نہیں ہے۔[۲] جعفر کے کلام کی مقبولیت کا کئی تذکروں میں اعتراف ہے۔[۳] اس کے اُردو کلام کا کافی حصہ اب تک موجود ہے مگر زیادہ تر ہجو اور فحش پر مشتمل ہے، اور بڑی حد تک اپنے دور کے معاشرتی ادبار اور اخلاقی ابتذال کا آئینہ دار بھی۔ وہ اورنگ زیب کے زمانے میں اپنے ماحول سے زیادہ متاثر ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اورنگ زیب، جس کی زندگی کے تقریباً پچیس سال دکن کی مہمات پر صرف ہوئے شمالی ہند کو اپنی غیر حاضری کے اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ نتیجہ ملک کی بدنظمی کے انداز میں نکلا۔ جعفر کی تحریروں میں اورنگ زیب کی دکن میں مہم جوئی اور اس کے عواقب کا گہرا احساس موجود ہے۔ وہ اخبار دیوان خاص کی تضمین میں بادشاہ کی بے بسی کا یوں اظہار کرتا ہے۔

......ظلِ شیطانی دیوان خاص فرمودند۔ وکیل زیب النسا بیگم عرض کرد کہ حضرت خود بدولت تماشائے ملک دکھن بسیار دیدند۔ حالا در ہندوستان مراجعت فرمایند۔ فرمودند کہ مثلہ:

ان نینوں کا یہی بسیکھ　　　یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ[۴]

جعفر کے ایک رقعے سے پتا چلتا ہے کہ دکن میں بادشاہ کی حالت ایسی تھی جیسے کسی بادبان شکستہ جہاز کے ناخدا کی ہوا کرتی ہے۔ اسے خود یہ احساس تھا کہ یہ مہم جوئی بھول بھلیاں ہے:

......ظل شیطانی ہر دو دیوان فرمودند۔ ترلینڈ خان بہادر عرض نمود کہ جہاں پناہ سلامت در ملک دکھن این قدر تلاش وتردد تا کجے؟ فرمودند کہ مثلہ　　یا تو بھینسا بھینسوں میں یا قصائی کے کھونٹے۔[۵]

کئی ایسی تضمینیں ہیں جن میں وہ بیان کرتا ہے کہ شمال میں بدامنی اور سرکشی کا دور دورہ ہو گیا تھا، اور اورنگ زیب جیسے بااصول بادشاہ نے عالم بے چارگی میں حالات کی اس رفتار سے گویا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جعفر لکھتا ہے:

...... عرض نمود کہ حضرت در تسخیر ملک دکھن چناں مشغول اند کہ از خرابی ملک ہند ہیچ خبر ندارند۔ فرمودند کہ مثلہ: اوکھلی میں سر دیا تو دھماکوں سے کیا ڈر۔[۶]

جعفر کے کلام میں سیاسی زوال، نظم ونسق کی خرابی، معاشرتی انتشار اور اخلاقی پستی کے مختلف رنگ موجود ہیں۔ معاشی بدحالی کے سلسلے میں اور معاشرتی اقدار کے تہ وبالا ہونے پر وہ اپنے ایک رقعے میں جس کا عنوان ''حسب حال زمانہ'' ہے، اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

سبحان اللہ حال زمانہ چہ پرکھن وچلن جہان چہ پرمحن است ہر کرا کردفر دزیب زاب جہ پرپیپ،

ٹاپ بیشتر میشد اور ادرد منو ہار بسیار می کنند و ہرٹر یون کہ از وصادر میشود مفلس موسیقار و نادرہ الادیار گویند و ریچھ وجہ بحاصل رابکار برند خواہ بانسل ایں دولد الکشف زدی الکٹراک وفی الحقیقت بی ادراک باشد مثلہ اندھا بگلہ کیچ کھائے از ہمیں جاست اگر صحیح الکتب والپردار فی الکچ پچ البرک والا دیار گرفتار آید ایک ہر لیڈی یو چی بخاطر پیش نیاوردو گلی کو چہ قرینش ندارند خواہ بذات نہایت سادھو و آہٹون گانٹھ جو ہر پاک اصیل باند مثلہ اندھا ملا پھوٹی میت۔

اہل دنیا جھک جھک بک بک قیل و قال
اوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بیتال ہے

جعفر کو اپنے دور کی خامیوں اور خرابیوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اس ماحول سے گریز بھی چاہتا ہے:

جس شہر میں دلبر نہیں اشراف کا آدر نہیں
قاضی شرع کا ڈر نہیں اوس شہر سے کہسار بہ

اس نے اپنے دور کی کسی شخصیت کو نہیں بخشا مگر اورنگ زیب کے متعلق اس نے کچھ نہیں لکھا، بلکہ وہ اس کے علم و فضل کا قائل نظر آتا ہے۔ اس کے انتقال کے بعد ہندوستان میں افراتفری اور انتشار کا دور دورہ ہوا۔ اس حالت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

اورنگ زیب مر گئے نیکی جگت میں کر گئے — تخت اور چھپر کٹ کو دھر گئے آخر فنا آخر فنا
موا خدا کی یاد میں رکھا اورنگ آباد ہے — خبریں گئیں بغداد میں آخر فنا آخر فنا
اعظم جو آیا دھائے کر اومرا ان کے آئے کر — روئی کھڑی سب دھائی کر آخر فنا آخر فنا
اعظم چلے جب خان کو چلنے جو ہندوستان کو — مجھ شوق ہے گھمسان کو آخر فنا آخر فنا

جعفر کے کلام میں اس قسم کی متعدد مثالیں ہیں جہاں وہ شہنشاہ پر قصیدے کے دوران ملکی حالات و واقعات پر بھی اظہار خیال کرتا ہوا نظر آتا ہے:[۸]

ہر سُو مار مار و دھاڑ دھاڑ است — او چل چال و تبر خنجر کنار است

اس کا وہ قطعہ جو ''دستور العمل در اختلاف زمانہ'' کے عنوان کے تحت درج ہے، اپنے عنوان کی بہتر تعبیر کرتا ہے۔[۹] اس کے دو شعر یہ ہیں:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نایاروں میں رہی یاری نہ بھاون میں وفاداری محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
معاشی زبوں حالی اور بے چینی کا احساس اس کے ہاں کچھ زیادہ ہی شدید نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی وہ نظمیں جو ہجو میں ''ہجو نوکری'' کے عنوان کے تحت اور قطعہ ''در بیان نوکری'' کلیات میں شامل ہیں، ایسے حالات کے ادراک کا بخوبی احساس دلاتی ہیں۔ علی الترتیب ان کے چند شعر یہ ہیں:

تنہا شدی اندر سفر کہہ جعفر اب کیسی بنی
افتادی اندر بحر و بر کہہ جعفر اب کیسی بنی
در بے کسی تا بودہ با درد و غم آلودہ
مفلس شدی و در بدر کہہ جعفر اب کیسی بنی
باعشرت و غم ساختی بامسکنت پرداختی
گو صاحبی و گو نفر کہہ جعفر اب کیسی بنی
دل کو ٹھکانے لاؤ اب مت جر کو پچھتاؤ اب
ہرگز مگو بار دگر کہہ جعفر اب کیسی بنی

ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھویں لاکڑی یہ نوکری کا حظ ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا حظ ہے
ہم نام کو انوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں
یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا حظ ہے

جعفر نے اپنے کلام میں سماج کے گھناؤنے اور ناپسندیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے اور اس ہیجان وانتشار کو مضمونِ شعر بنانے کا راستہ اختیار کیا۔ گو زیادہ تر اس کے ہاں یہ باتیں سوقیانہ، رکیک اور فحش انداز میں ہیں لیکن معنی اور بیان کے اس تجربے نے شمالی ہند میں اُردو شاعری کو اس کی باقاعدہ ابتدا ہی میں حقیقت و واقعیت کی راہ پر ڈال دیا۔

طوائف الملوکی اور انتشار کا یہ دور جو اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے شروع ہوتا ہے، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی شکست کو بھی اپنے میں شامل کرتا ہے۔ اس وقت تک بیرونی حملہ آوروں کی

تاخت وتاراج اور اندرونی نظام کی شکست وریخت نے ہندوستانی قوموں کو قطعی طور پر ضعیف و ناتوان کردیا تھا، اور اس نے انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے لیے راستہ ہموار کردیا تھا۔ اس عرصے میں مغلوں کے سیاسی نظام کا تانا بانا بکھر چکا تھا۔ پایۂ تخت دہلی اس پر آشوب ہول ناک اور عبرت ناک ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ داخلی انتشار نے خارجی حملوں کے لیے راہ صاف کی اور بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں اور اندرونی شورشوں اور بغاوتوں نے دہلی کے علاوہ اس کے اردگرد کے علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کو بھی منتشر کردیا۔ ان اَلم ناک حالات میں افراد کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جس کی تعداد اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن جس کا شعور واحساس بیدار تھا اور جو اُس سیاسی اور سماجی انتشار پر غور وفکر کرکے اس سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیریں بھی سوچ رہا تھا۔ علما میں حضرت شاہ ولی اللہ کی عظیم شخصیت اسی عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کی اصلاح وتجوید کے منصوبے بنارہی تھی۔ اس دور کے شعرا بھی اس صورتِ حال میں اپنی زندگی کے تلخ ایام گزار رہے تھے۔ لیکن ان کا حساس ذہن نہ صرف اپنے ہی دکھ درد کے احساس سے معمور تھا بلکہ اپنے ماحول اور معاشرہ کے اجتماعی انتشار اور اس کی زبوں حالی سے پوری طرح آگاہ اور متاثر تھا۔ اس آگہی اور تاثر نے اس دور کے شعرا کے کلام میں حزن ویاس اور درد وغم کے بے پناہ جذبات بھر دیے تھے۔ ان کے درد وغم میں اس قدر گہرائی ہے کہ اس میں معاشرہ کے ہر فرد کی قلبی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس انفرادی اور اجتماعی درد وغم نے مل کر اس وقت کی ''اُردو شاعری'' کی صورت اختیار کرلی تھی۔

اس عہد کے شعرا نے اپنے وقت کے سیاسی پس منظر کو مختلف اصناف سخن میں بیان کیا ہے۔ غزل، شہر آشوب، مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس وغیرہ لیکن غزل میں جو دیگر اصناف کے مقابلے میں درد وغم کے اظہار کی بہترین اور فطری صورت ہے، شعرا نے اپنے ماحول کے اثرات اور اس سے پیدا شدہ ردِ عمل کو پیش کیا۔ غزل کے بعد شہر آشوب تو محض اسی ایک مقصد کے تحت لکھے جاتے رہے۔ اس دور کے تقریباً ہر اہم شاعر نے مختلف قسموں کے شہر آشوب لکھے ہیں جس میں اُنھوں نے صراحت اور تفصیل سے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کو پیش کیا، یا پھر اس ماحول کے پروردہ مخصوص افراد پر تنقید ونکتہ چینی کی۔ بحیثیت مجموعی شہر آشوب اپنے وقت کی بہترین تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دو اصناف کے علاوہ شعرا نے مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی وغیرہ سے بھی حسب ضرورت اور مناسب کام لیا ہے۔

(ا) غزل

غزل میں اپنے زمانے کے ان حالات کا عکس اور اس کا ردِّ عمل صاف نظر آتا ہے جب مغلوں کی سیاسی قوت کے انحطاط، بیرونی حملوں اور اندرونی شورشوں کے نتیجے میں ملک اور عوام کو مسلسل مصائب و آلام میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔ شاعروں نے اس صورتِ حال میں جس موضوعِ سخن کو اپنایا تھا اس میں ان کی آپ بیتی بھی شامل ہے اور اہلِ دنیا کا تذکرہ بھی۔ اگر شاعرانہ علامات و رموز کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے عہد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اشارات میں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ جہاں گلستان، باغ، چمن اور آشیان و گل و بلبل، قفس و صیاد کی بات کرتے ہیں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کنایتہً اپنے ملک و وطن، اپنے احباب، اور گھر بار کا ذکر کر رہے ہیں۔ اسی طرح اُنھوں نے ظالموں، قاتلوں اور غارت گروں کو کبھی گل چین اور کبھی صیاد کا نام دیا یا وطن کے تلازمات کو غنچہ، گل و بلبل سے تشبیہ دی اور اسی طرح امن و سکون اور خوش حالی کے دور کو ''بہار'' سے اور دورِ انتشار و زبوں حالی کو ''خزاں'' سے موسوم کیا۔ ذیل کے چند شعر اس امر کا اظہار کرتے ہیں:

انجام، نواب امیر خان

اب یہی احسان ہے تیرا جو ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کر اے صیاد ہم

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

منہ تیرا تکتے تھے سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تیری فریاد ہم

دل تو ہے داغ غلامی میں تیری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سروسان آزاد ہم

آبرو، شاہ مبارک

دل کے اُپر بہار میں احوال سخت دیکھ دم مارتی ہے باغ میں رہ رہ اک کلی
بے وفا ہے بہار گلشن کی بلبل و گل کے حال پہ افسوس

آرزو، سراج الدین علی خان

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

رہا جوش بہار اس فصل گریوں ہی تو بلبل نے
چمن میں دست سے عجب رخ اس برس کھینچا
رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ناجی، محمد شاکر

نہ سیر باغ نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں
بلند آواز سے گھڑیال یہ کہتا ہے اے غافل
کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں جیتا

یقین، انعام اللہ خاں

فصل گل ہو چکی کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم
کچھ کر اے صیاد اب ہوتے نہیں آزاد ہم

فغاں، اشرف علی خان

اب کے چمن میں گل کا نے نام و نشاں ہے
فریاد بلبلاں ہے نا شہرۂ خزاں
تو رنگ گل کے اپر پھول مت کہ اے بلبل
پلک کے مارتے فصل بہار گزرے ہے
چمن خراب کیا ہو خزاں کا خانہ خراب
نہ گل رہا ہے نہ بلبل نہ تنہا
در و دیوار چمن آج ہے خوں سے لبریز
دہشت سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے
غنچے کہیں ہیں سر کو نوا کر چمن کے بیچ
یعنی نہیں ہے جائے سخن اس دہن کے بیچ
بیگانہ دیکھتا ہوں میں ہر گل کا رنگ و بو
ہم داغ اس چمن میں اگر ہے تو لالہ ہے

اُردو کے یہ اور دوسرے شعرا نے اپنے دور کے سیاسی کوائف اور سماجی حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور عام زندگی کے ردِ عمل کو بیان کیا ہے۔ غزل میں تو یہ باتیں مختصر طور پر کنایوں اور اشاروں میں ملتی ہیں البتہ شہر آشوب اور دیگر نظموں میں یہ موضوعات صراحت اور تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ سیاسی اور سماجی حالات کے بارے میں غزل گو شعرا کے اشعار، جن سے ان کے شعور و احساس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ایسے حالات میں ملکی و سماجی حالات کو سدھارنے میں اپنی فنی صلاحیتوں سے کتنا کام لیا ہے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے عام طور پر بادشاہوں، امیروں، وزیروں کے طرزِ عمل پر تنقید بھی کی ہے۔ اور عروج و زوال کے اسباب و نتائج سے آگاہ بھی کیا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے ''اشارتاً'' انھیں انتظام سلطنت درست کرنے کی تلقین کی ہے۔

آبرو:

آدمی درکار نئیں سرکار میں حیوان ڈھونڈ
کون پوچھے یاں سپاہی کے تئیں گھوڑا نئیں
میرزائی سے ہوئے نامرد دِلّی کے امیر
ناز کے مارے پھری جاتی ہے مژگاں کی پناہ
زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی امیر اس جگ کے ہیں سب شیرِ قالین

مصطفیٰ خان

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے راستی ہے گی دار کی صورت

تاباں، میر عبدالحیٔ

قفس میں تڑپے ہیں یہ عندلیباں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ اب یہ آشیاں اپنا
طرح اسکندر کے تاباں شاہ ہفت اقلیم ہو
گر ٹک اک جرأت کرے یہ خسرو ہندوستان
داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس
اگائیں باغ میں لالہ زمیں سے
ہوا خون شہیداں سے چمن سُرخ
دیکھ کر ان کے تئیں شاہ بھی مردی پکڑے
ہو شجاعت کا اگر جزو امیروں کے بیچ

فغاں

آج تو سنتا ہوں گلشن کے لوٹانے کی خبر
آہ کیوں کر لوں میں اپنے آشیانے کی خبر

حاتم

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیوں کر اداس
دیکھ کر احوال عالم اڑتے جاتے ہیں حواس
ایسی ہوا چلی ہے کہ چاروں طرف فساد
جز سایۂ خدا کہیں دارالاماں نہیں

دکان دار و خریداری ہوئی ہے سرد سودے کی
مگر اک گرم ہے تو موت کا بازار دنیا میں

دل ہو ویراں ہوں نہ گر بر جا حواس
بندوبست ملک سرداراں سے ہے

ایک دم کے بیچ ہو جاویں کئی لشکر تباہ
شاہ جو لیوے نہ اپنی کچھ خبر جب گاہ سے

کس کنے لے جائیں تیرے ظلم کی فریاد ہم
تجھ ہی سے تیرے ستم کی چاہتے ہیں داد ہم

کیا بیان کیجیے نیرنگِ اوضاع جہاں
کہ بہ یک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں

پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا افسوس
ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں

کان دھر بات کسی کی نہیں سنتا کوئی
آنکھ سے آنکھ ملانا تو یہاں کیا امکاں

گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے
کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آئے طوفاں

سیاسی انتشار اور عدم استحکام کا نتیجہ اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کے انداز میں نکلا۔ آئے دن کے حملوں اور عدم مرکزیت کی وجہ سے ملک کے معاشی نظام کا تار و پود بکھر گیا۔ اس صورتِ حال نے نہ صرف عوام کو بلکہ امرا کو بھی متاثر کیا۔ اقتصادی بدحالی کے نتیجے میں جو معاشی قباحتیں رونما ہوئیں، شعرا کے ہاں ان کا شدید احساس موجود ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بڑی حد تک درباروں پر انحصار رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ بھی معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح ان حالات کے سامنے بے بس و مجبور تھے۔ اُنھوں نے معاشی حالات کو جس طرح پیش کیا وہ اس عہد کی حقیقی تصویر کا اظہار ہے۔ معاشی بدحالی کی وجہ سے تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا جو انحطاط ہو رہا تھا اس کا انھیں احساس تھا۔ اور ان احساسات کا اظہار وہ شاعری میں کر رہے تھے۔ چند اشعار کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے:

تاباں

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے
اب میسّر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں گویا کہ آپس میں
نہ یار اپنا کبھو ہوتے سنانے روزگار اپنا

حاتم

بچاوے حق عذاب جوع سے اس دور میں حاتم
جدھر سنتا ہوں اب سب کی زباں پر روٹی روٹی ہے
گدا یا شاہ کوئی ہو موافق قدر ہر یک کے
لباس و قوت و مسکن سب کو ہے درکار دنیا میں
اگر طالع نہیں رکھ قابلیت طاق پر حاتم
پھریں ہیں تجھ سے بہتر اہل جوہر خوار دنیا میں
مفلسی اور دماغ اے حاتم
کیا قیامت کرے جو دولت ہو

محتاجگی سوں مجھ کو نہیں ایک دم فراغ حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

عام طور پر اخلاقی قدروں اور انسانی رابطوں میں تبدیلی کی صورت حکمران طبقے کی سیاسی خودغرضیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ حصولِ جاہ و منصب کی خواہشات کی وجہ سے نتائج و عواقب افراد کے پیش نظر نہیں رہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ملک اور معاشرے کی کمزوری اس کے جاہ و منصب کو زیادہ دیر تک سہارا نہیں دے سکتی۔ کیا ان حالات نے اُردو شاعری کو متاثر نہ کیا ہوگا؟ شعرا نے اس صورت کے المیے پر نہ صرف افسوس کا اظہار کیا ہے بلکہ مہر و مروت کے فقدان کے احساس کو بھی بیان کیا ہے۔ شاعروں نے اس عبرت انگیز حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا ہی موثر اور دلگداز ہے۔ اس تاثر سے اصلاح احوال کا احساس بھی ابھرتا ہے جو کسی اجتماعی تحریک کے نہ ہونے کی وجہ سے حسرت و ناامیدی تک ہی محدود رہتا ہے۔ ماحول کے ان کوائف میں ان کی اپنی زندگی کا المیہ اور اس کا ردِعمل پر مبنی تاثر بھی شامل نظر آتا ہے۔ چاہے یہ معاشی پہلو کے تعلق سے ہو یا تہذیبی و سیاسی۔

تاباں

آدمی اس پہ جو بیٹھا وہ خداوند ہوا کم نہیں تخت سے فرعون کے چھ مسند بھی

یکرنگ

ہوا معلوم یہ غنچے سے ہم کو جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے

حاتم

عجب احوال دیکھا اس زمانے کے امیروں کا — نہ ان کو ڈر خدا کا نہ ان کو خوف پیروں کا
عادت فیض و کرم اہل دول سے چھوٹ گئی — دست ہمت شل ہوا چشم مروت پھوٹ گئی
حاتم کسو میں گرمیِ صحبت نہیں رہی — دل دیکھ دیکھ سرد ہوا ہے جہاں کا رنگ
خیال دل میں کسی سے نہ رکھ بھلائی کا — جہاں سے فوت ہوا رسم آشنائی کا

یہ حالات ایسے تھے اور ان کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ باشعور ذہنوں میں کسی عملی اجتماعی تحریک کی عدم موجودگی میں زندگی کے منفی رجحانات پیدا ہوں اور دلوں میں بے ثباتیِ عالم کے احساسات جگہ پائیں۔ یہ احساسات کسی اجتماعی نصب العین یا اپنے تحفظ کے اطمینان کے نہ ہونے پر بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس صورت میں افراد اپنے ماحول اور اپنی زندگی سے دل برداشتہ ہوکر اپنے وجود میں فراریت کا رجحان پیدا کر لیتے ہیں۔ شعرا نے اپنے اشعار میں اس رجحان کے ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اس رجحان کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی زندگی ایک بے حقیقت اور موہوم وجود رکھتی ہے جس کی موہومی پر انسان کا دل دنیا سے بھر جاتا ہے اور اس پر یاسیت اور حزن و ملال طاری ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے اس قدر ناپائدار ہونے کے احساس کے نتیجے میں انسان صبر و قناعت کے ذریعہ زندگی کے چند لمحوں کو غنیمت جان کر سلیقہ مندی اور خدمت خلق کا مسلک اختیار کرتا ہے اور غم حیات میں مسرت و انبساط پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ ایک ایسی راہ ہے جو معاشرے کو دکھوں اور غموں سے نجات دلا کر اجتماعی فلاح و بہبود کی منزلوں تک لے جاتی ہے اور اسے صبر و قناعت کی تلقین کرتی ہے۔

آبرو

دلی میں درد دل کوں کوئی پوچھتا نہیں — مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

تاباں

زندگی ہے آدمی کے بحرِ تن میں جوں حباب — دم غنیمت جان تاباں آج ہے سو کل نہیں
غنیمت جان جینا آدمی کا — بھروسا کچھ نہیں اس زندگی کا
تاباں تو سدا سیر ہر اک گل کی کیا کر — اس گلشن ہستی کا نظارہ ہے غنیمت
اسباب جہاں کی تو دلا فکر نہ کر تو — حاصل نہیں کچھ اس میں بجز رنج و مشقت
مرد کہتے ہیں اسی مرد کو سب اہلِ تمیز — جو کرے زیست کو دنیا میں قلندر کی طرح

فغاں

اے ہم سفراں منزل ہستی سے عدم تک خاموش چلے جاؤ یہاں راہ نہ پوچھو
واماندگان راہ عدم گوش کیجیو بانگِ جرس نہیں یہ ہے فریاد رفتگاں

حاتم

ملک وملت عاریت پر اس قدر مت کر غرور کون لے جاوے گا دھر کر گور میں سر پر زمین
دم غنیمت جان ٹک چل اور گلوں کا دید کر
سیر گلشن کو تجھے حاتم بلاتی ہے بہار
حاتم یہی ہمیشہ زمانے کی چال ہے
شکوہ بجا نہیں ہے تجھے انقلاب کا
حاتم اُلٹ پلٹ سے زمانے کے غم نہ کھا
ہوتا نہیں جہاں کا کبھی کاروبار بند
حاتم خدا کے کام کو باطل نہ بوجھ تو
ناحق نہیں کرے ہے جو کچھ حق وہی ہے حق

اس دور میں جب کہ فکر وشعور کی پرانی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور سیاسی و معاشی نظام کی طرح ان میں بھی انحطاط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ بنگال کے خزانوں نے انگلستان میں صنعتی انقلاب تو پیدا کر دیا تھا لیکن ہندوستان میں ابھی معیشت نے کوئی واضح صورت اختیار نہیں کی تھی۔ نہ ملک میں ایسی بڑی تبدیلی ہوئی تھی جو اس کو مفلسی کے دائرے سے باہر نکال سکتی۔ اور نہ ہی عوام میں کوئی ایسا انقلابی شعور پیدا ہوا تھا جو ان کی حالت کو بدل دیتا یا ایک نئی دنیا کی تخلیق کر سکتا۔ گو نئی دنیا تخلیق کرنے اور آباد کرنے کا یہ ارمان اس دور کے شعرا کے یہاں کہیں کہیں بہت نمایاں انداز میں ملتا ہے۔ مثلاً آبرو کا شعر ہے:

مجھے ان کہنہ افلاکوں میں خوش رہنا نہیں آتا
بنایا اپنے دل کا ہم نے اور ہی ایک نو محلا

اس دور تک اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن غزل تھی۔ لیکن غزل کے علاوہ، شہر آشوب، مثنویاں و قصائد میں بھی شعرا نے مختلف النوع موضوعات پر اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں

غزل کے علاوہ دیگر اصناف کا ذخیرہ مقابلتاً کم لیکن اپنے موضوعات کی بنیاد پر بڑا اہم ہے، اس لیے کہ شاعروں نے جو باتیں غزل کے پیرایے میں غیر مربوط اور مختصراً بیان کیں، وہی ان مختلف نظموں میں مربوط اور مفصل شکل میں پیش کیں۔ چناں چہ اس تفصیل میں ہمیں اس دور کی سیاسی، تہذیبی اور سماجی کوائف، اور ان کے پس منظر میں اس عہد کے شعرا کے قلبی تاثرات اور ردِّ عمل کے احساسات سے آ گہی ہوتی ہے۔

(۲) شہر آشوب

اس دور میں شہر آشوب کا رواج پڑ چکا تھا۔ یہ اصل میں اس عہد کا تقاضا بھی تھا۔ اس وقت کے شعرا نے عام سیاسی بے چینی اور معاشرتی بے قراری کے اظہار کے لیے بیشتر ''عبرت نامے''، فلک آشوب'' اور شہر آشوب'' لکھے جو عبرت اور آشوب کے موضوعات پر مبنی تھے۔ اس دور کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی تھی۔

بے نوا

اُردو کے اس قدیم شاعر نے محمد شاہ کے عہد کی سیاسی بدنظمی، انتشار اور ابتری کو اپنے ایک مخمس میں بیان کیا ہے جس کے دو بند میر نے نکات الشعراء میں نقل کیے ہیں۔

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہرزہ نابکار　　مرّیخ پر جو تیز کی خنجر کی اپنے دھار
جوتے فروش مرد مسلمان دیندار　　مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگِ جفا سے چُور کیا لعل آبدار

کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرا دیا　　کتنوں کو جی بچا کے بہت بڑبڑا دیا
کاغذ پہ بے نوا نے یہ سن کر چڑھا دیا　　لگتے ہی مار جوتیوں طرّہ گرا دیا
تاحشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار

ان اشعار میں ۱۷۲۹ء کے ایک واقعے کی طرف اشارہ تھا۔ جب ایک وزیر قمرالدین خان کی موجودگی میں ایک شاہی دربار سے وابستہ جوہری قتل ہو جاتا ہے اور مذکورہ وزیر کچھ نہیں کر سکتا۔[1]

ناجی، شاکر

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے سے ہندوستان پر جو اثرات مرتب ہوئے تھے اور شاہانِ مغلیہ کا عسکری نظام کس قدر ابتر ہو گیا تھا نیز اس وقت دربار دہلی کا رنگ شرفا کی خواری اور امرا کی آرام طلبی و

نازپروری کو شاکرناجی نے اپنے مخمس شہرآشوب میں دکھایا ہے:

لڑے ہوئے نہ برس بیں اون کو بیتے تھے دعا کے زور سے دائی ددوں کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دوکان نہ غلہ و بقال

کمترین، پیر خان

کمترین نے جو شہرآشوب لکھا تھا، اس کے بارے میں قائم نے لکھا ہے کہ وہ سات سو شعروں پر مشتمل ہے،[۲] جن میں مختلف پیشہ افراد کی ہجو ایک ایک مختصر مثنوی میں کہی گئی ہے۔[۳]

حاتم

حاتم نے اپنے شہرِ آشوبوں میں اپنے عہد کی سیاسی، معاشی اور سماجی حالت پر تنقید کی ہے۔ ان کے شہرآشوبوں میں اس عہد کے سماجی اور تاریخی حالات کا بہت واضح منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ انھیں ایک خاص طور کے معاشرتی نظام میں انقلاب کا مرثیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے دو شہر آشوب ''بارہ صدی'' کے عنوان سے ایک قدیم بیاض میں شامل ہیں[۴] دونوں مخمس موضوع کے اعتبار سے شہرآشوب ہی ہیں۔[۵] حاتم کے پہلے شہرِ آشوب بعنوان ''بارہ صدی اوّل'' کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آیا تھا، اور جس کے نتیجے میں طبقاتی کش مکش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اور اعلیٰ متوسط یا متوسط طبقہ کے افراد اپنی اقتصادی پریشانیوں کے ساتھ ادنیٰ طبقہ کی ترقی کو حسد کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حاتم نے جن پیشہ ور اقوام کے عروج کا نوحہ کیا ہے وہ بھی اس دور میں پریشان حال اور پراگندہ روزی پھر رہے تھے۔ حاتم کا تعلق اونچے طبقہ سے تھا۔ اس لیے انھیں اس انقلاب کا زیادہ ہی احساس ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کو حاکموں، امیروں، منصب داروں کی بداخلاقی اور بداعمالی کی شکایت بھی تھی۔ ''بارہ صدی اوّل'' کے چند بند یہ ہیں:

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں

بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار
یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور یہاں سبھو نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں ہے مدار بغیر دار و مدار
حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے جو چور تھے وہ ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سو ان دنوں میں زور ہوئے جنھوں کو زور تھا سو اب مثالِ مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار
امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ تھے آفتاب پہ جو آ گئے زوال کے بیچ

جہاں میں صاحبِ خس خانہ گھاس والے ہیں محل جنھوں کے تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں

جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں عجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں کہیں جو ہوئے بھی شاید تو اب ہزاروں میں
کرے ہے چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتم تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم تو انتخابِ زمانہ کا غم نہ کھا حاتم

حاتم کی دوسری ''بارہ صدی'' بھی ایسے ہی کوائف پر مبنی ہے۔ چند بند یہ ہیں:

عجب یہ دور ہے شرفا کا کچھ نہیں رزگار بہت نجیب قسم زندگی سے ہیں بیزار
ہزار عہدے پڑے پھرتے ہیں خدائی خوار کہو تو کیسے طرح ہووے سپہ گری کا وقار
بہادر ہائے غضب ہیجڑے کہاتے ہیں
ہمارے دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا دلوں سے مہر گئی اب جفا و جور آیا
نجیب کیا کریں دنیا کا اور طور آیا کمینے پھیل گئے پاجیوں کا دور آیا

جو خانہ زاد تھے وہ منصوبوں سے کرتے ہیں راج
غنیم الٹے دیکھو بادشاہ سے لیں ہیں خراج

اس دور تک جن اصناف میں سماجی واقعات اور حالات پر شاعروں کی طبع آزمائی نظر آتی ہے، ان میں غزل اور شہر آشوب کے بعد "قطعہ" ہے۔

(۳) قطعہ

قطعہ واقعات و کوائف کے بیان میں غزل سے بہتر صنفِ سخن ہے، اس لیے کہ اس میں کسی مسئلے پر مسلسل اظہارِ خیال ہوسکتا ہے۔ اس دور میں شعرا نے اس صنف کو بھی اپنے خیالات کے اظہار و بیان کے لیے اپنایا تھا۔ پھر بھی اس دور تک یہ صنف زیادہ عروج حاصل نہ کرسکی۔ اور جو تھوڑا بہت اس کا سرمایہ ہے اس میں بیشتر کا موضوع عشق و جذبہ کا کوئی نہ کوئی پہلو ہے۔ کچھ اخلاقی موضوع پھر بھی ہیں اور چند ایک ایسے بھی مل جاتے ہیں جن میں ملکی حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ جیسے زمانہ سے گلہ، بے زری و بے روزگاری کی شکایت، بے ثباتی و ناپائداری کا احساس وغیرہ۔ اس قسم کے قطعات میں حاتم کا قطعہ ایک مثال ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

کیا بیان کیجیے نیرنگیِ اوضاعِ جہاں — کہ بیک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھریں ہیں جوتی کے محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — صبح سے شام تلک قوت کو ہیں گے حیراں
وہ جو ٹھڈے کو ترستے تھے سو اس دور میں آج — ہیں صاحبِ مال و محل و فیل و نشاں
پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا افسوس — ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں
جس کو دیکھوں ہوں سو ہے فکر میں غلطاں پیچاں — یعنی چہ میر و چہ نواب و چہ خاں
وہ جو بے کار ہیں ان کا تو خدا ہی حافظ — دے جو ہیں نام کو نوکر انھیں تنخواہ کہاں
کان دھر بات کسی کی نہیں سنتا کوئی — آنکھ سے آنکھ ملانا تو یہاں کیا امکاں
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے — کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آئے طوفاں
چشمِ عبرت سے نظر کیجو اولی الابصار — راست کہتا ہوں نہیں جھوٹ عیاں را چہ بیاں

(۴) مثنوی

۱۷۵۷ء تک شمالی ہند میں چند ہی شعرا نے مثنوی[1] اور قصیدہ[2] میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان میں اس وقت تک، موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق مواد دستیاب نہیں ہے، صرف مثنوی میں حاتم اور تاباں

کے نام لیے جاسکتے ہیں، جن میں حاتم کی چند مختصر مثنویاں، جشن بہار، حقہ اور قہوے کی تعریف میں ہیں۔ موخر الذکر دو مثنویاں محمد شاہ اور نواب عمدۃ الملک امیر خان کی فرمایش پر کہی گئی تھیں۔ ان میں مجلسی حالات کا کچھ پرتو ملتا ہے[۳] البتہ تاباں کی ایک بہاریہ مثنوی جو نواب امیر خاں، عمدۃ الملک کے دربار کی عشرت انگیزیوں اور اس کے الم ناک انجام پر روشنی ڈالتی ہے۔ تاباں نے ان دونوں کے تضاد کو نمایاں کر کے غم و الم کی جو فضا پیدا کی ہے وہ بڑی عبرت انگیز ہے۔ اس مثنوی میں شاعر فلک کی ستم رانی اور انقلابِ دوراں کا واقعہ بیان کرتا ہے جس میں وہ مثال کے لیے کسی ایسے دربار کا ذکر کرتا ہے جو عمدۃ الملک کے دربار سے مماثلت رکھتا تھا، لیکن وہ درہم برہم ہوگیا۔ وہ ساقی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اس مختصر عرصۂ حیات کو مختصر جان، فصل بہار کی قدر کر، ورنہ فلک اپنی ستم رانی پر مستعد ہے۔ اس لیے تو مجھے ایسی شراب پلا کہ میں دین و دنیا کے غم کو بھول جاؤں:

کیا اس فلک نے بڑا ہی ستم　　وہ عشرت کدہ سب ہوا جائے غم
نہ آیا اسے رحم کچھ ساقیا　　دیا خاک میں ویسے گھر کو ملا
ارے پھر کہاں ہے یہ فصل بہار　　خدا جانے پھر کب ہو وصل بہار
فلک اپنے کام پر ہے مستعد　　مبادا کہ ظالم کو آ جائے ضد
ابھی ایک دم میں جہاں اور ہے　　زمیں اور ہے آسماں اور ہے
مجھے چاہیے ایسی مے تو پلائے　　کہ دنیا و دین مجھ کو سب بھول جائے

غزل اور مختلف اصناف نظم کے مختصر جائزے سے اس دور کے شعرا کی سیاسی، معاشی اور سماجی بصیرت اور ان کے درد و غم اور احساسات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ گو کہ اس وقت کی شاعری میں اس قسم کے جذبات و احساسات کے اظہار کی نہایت ہی واضح صورتیں پورے طور پر موجود نہیں بلکہ پھر بھی اس قسم کے سرمایہ کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے شعرا اپنے دور اور اپنے ماحول کے محض ترجمان ہی نہ تھے بلکہ نقاد بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے ذمہ دار افراد کی کوتاہیوں، خودغرضیوں اور تنظیمی خرابیوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ کہیں کھلے لفظوں میں اور کہیں اشارات کی زبان میں۔ ان امور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شعرا اپنے ماحول سے کتنے قریب اور اپنے زمانہ کے حالات سے کتنے زیادہ باخبر اور متاثر تھے۔ اور پھر یہ بھی کہ وہ اپنے ملک اور معاشرہ کے دگرگوں حالات کو رُو بہ اعتدال لانے کی خواہش و آرزو رکھتے تھے۔ ہر چند کہ یہ آرزو اور خواہش انفرادی حدود تک تھی اور وہ اجتماعی شعور کی فضا نہ

ہونے کی وجہ سے ان حالات میں کوئی خارجی انقلاب رونما نہ کرسکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرسکتے تھے کہ وہ افراد کے قلب وذہن تک رسائی حاصل کریں اور ان میں داخلی انقلاب کی تحریک پیدا کریں (۴) اس وقت کے معاشرہ کو خارجی سے زیادہ اس داخلی انقلاب کی ضرورت تھی، جو کردار میں طہارت پیدا کرسکتا تھا۔ معاشرہ کو اس وقت جو نقصانات پہنچ رہے تھے وہ افراد کی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کی بدولت تھے۔ ورنہ ملک میں ذرائع ووسائل ہر طرح کے موجود تھے۔ صرف ان کے استعمال کے لیے صحت مند اور مناسب فضا ضروری تھی۔ اور یہ یقیناً مستحکم سیاسی تنظیم سے قائم ہوسکتی تھی۔ چناں چہ شاید انفرادی شعور کے ماتحت شعرا نے مہر ومحبت اور ایثار ومروت کے احساسات کو بیدار کرکے داخلی طور پر انسانی شرافتوں اور پاکیزگیوں کو ابھارنا چاہا تھا تاکہ افراد، اجتماعی زندگی میں، دورِ انحطاط کی پیدا شدہ معاشرتی قباحتوں کو ختم کرسکیں۔ اس طرح اس وقت (۱۷۵۷ء) تک ہر جگہ اور ہر موقع پر اُردو شعرا نے زوال وانحطاط کی وجوہات پر، جنھیں وہ زیادہ تر اخلاقی قدروں کے تنزل سے منسوب کرتے تھے، تنقید وتبصرہ کرکے نہ صرف اپنا فرض ادا کردیا بلکہ اپنے وقت کے معاشرہ اور ادب کو متاثر کیا اور اپنے بعد کے ادب وشعر کے لیے مفید، حقیقت پسندانہ نئے موضوعات دیے۔

(۵) تحریک احیائے دین اور اُردو ادب

مجدد الف ثانی کی تحریک احیائے دین سے قبل، گیارہویں صدی ہجری اور اس سے پہلے کی اُردو کی تاریخ تر [زیادہ] صوفیا ومشائخ کے اقوال وفرمودات سے مرتب ہے۔ یہ بزرگ اپنے اپنے زمانہ میں علم وادب کے رہنما بھی تھے۔ ان کے سلسلوں سے جو ادیب اور شاعر وابستہ رہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نتیجتاً ان کے افکار وخیالات، نظریات وعقائد شعر وادب پر اس حد تک اثر انداز ہوئے کہ انھیں روایت کا درجہ حاصل ہوا۔

صوفیا کرام ومشائخ عظام نے اصلاح معاشرہ اور احیائے دین کا کام روحانیت کی راہ سے شروع کیا تھا۔ اُنھوں نے اسلام کو باطنی رنگ میں بلکہ بڑی حد تک روحانی نظام کے طور پر پیش کیا۔ بعض بزرگوں نے قرآن حکیم کی آیات کو اُردوئے قدیم میں نظم کیا۔ حمد ونعت میں توحید ورسالت کے نکات بیان کیے۔ بعض نے ولولہ انگیز ریختے بھی کہے جن میں صبر وثبات، جوش وولولہ، عزم وعمل کے نہایت اعلیٰ جذبات ملتے ہیں۔ اُردوئے قدیم میں اس کی ایک بہتر مثال مصطفیٰ گجراتی کے ریختے ہیں۔

مجدد الف ثانی کی تحریک احیائے دین، اکبر کی حکمت عملی کے ردِ عمل میں شروع ہوئی۔ ان کی اس تحریک کی نوعیت سیاسی اثرات کی حامل ہے۔ اس کے ذریعہ اُنھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اس فرق کو، جو بڑی حد تک تصوف کی غیر اسلامی تعلیمات کے باعث مٹنے لگا تھا، واضح کیا۔ اکبر کی حکمت عملی کے طفیل ہندوؤں اور ان کی تہذیب سے مسلم معاشرہ کی سالمیّت کو جو خطرہ لاحق تھا، اس کی نشان دہی کی۔ ان کی تحریک کا اہم مقصد ہی یہ تھا کہ اسلامی عقائد کو ہندومت کے ساتھ اشتراکِ مقصد سے روکیں۔

سرہند کے بعد، اس تحریک کا مرکز دہلی قرار پایا۔ دہلی کے علمی اور ادبی ماحول پر تحریک احیائے دین، مجددیہ اور نقش بندیہ سلسلے میں جاری رہی۔ اس کے اثرات کی نشان دہی شیخ عبدالاحد سرہندی معروف بہ شاہ گل[۱] جو مجدد الف ثانی کے پوتے تھے،[۲] ان کے وقت سے کی جاسکتی ہے۔ مجدد الف ثانی کے صاحبزادوں میں خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم فارسی میں شعر کہتے تھے،[۳] ان کے خلفا میں سے خواجہ محمد صادق بدخشانی،[۴] خواجہ محمد ہاشم کشمی برہانپوری[۵] بھی فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان سے مستفیض بیشتر علما و مشائخ ادب و شعر سے نسبت رکھتے تھے۔ قاضی محمد عارف،[۶] ناصر علی سرہندی،[۷] عبدالحکیم حاکم لاہوری[۸] اسی سلسلے کے شعرا تھے جوجہاں سے مستفیض ہوئے۔ شیخ عبدالاحد، خواجہ محمد سعید کے فرزند تھے۔ وہ بھی ذوق شعری رکھتے تھے، اور وحدت ان کا تخلص تھا۔[۹] فارسی کا ایک دیوان وحدت ان سے یادگار ہے۔ سرہند سے وہ ترک وطن کر کے دہلی آئے۔ وہاں وہ علما و مشائخ کے اس حلقہ میں داخل ہوئے جہاں شاہ عبدالرحیم والد شاہ ولی اللہ اور چچا شیخ ابوالرضا محمد کا آنا جانا تھا۔[۱۰] ان کے ایک مستفیض حاجی محمد افضل تھے[۱۱] جن سے شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے بزرگ اور اُردو فارسی شاعر نے حدیث کا درس لیا تھا۔[۱۲] شیخ عبدالاحد کے ایک اور اہم قابل ذکر مرید شیخ سعداللہ تھے[۱۳] اُنھوں نے شاہ گل کی نسبت سے گلشن تخلص رکھا تھا[۱۴] اُردو میں شاعری کرتے تھے،[۱۵] انھیں شاہ ولی اللہ سے بھی نسبت تھی[۱۶] فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے؛ چناں چہ اکثر شعرا آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے ایک ضخیم فارسی دیوان کا ذکر کیا جاتا ہے۔[۱۷] انعام اللہ خاں یقین اُردو کے معروف شاعر مجدد الف ثانی کے خانوادے سے متعلق تھے[۱۸] مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ مرزا مظہر کو ان سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اپنے اشعار کو یقین کے نام سے منسوب کرتے تھے۔[۱۹]

اُردو شاعری کی تاریخ میں شیخ سعداللہ گلشن ولی کے مرشد کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ولی نے شاہ گلشن ہی کی ایما پر اپنا دیوان فارسی دواوین کی طرز پر مرتب کیا تھا،[۲۰] اس میں وہ مضامین

باندھے جو فارسی شاعری سے مخصوص تھے۔ ولی نے ان کے مشوروں پر عمل کیا۔[۲۱] اس وقت سے اُردو شاعری فارسی کے نقشِ قدم پر چلی اور اس طرح زبان پر فارسی کا اثر گہرا ہوتا گیا۔

شاہ گل کے پوتے، شاہ ولی اللہ اشتیاق ایک ممتاز اُردو شاعر تھے۔[۲۲] تفسیر فتح القرآن اور دیگر متعدد تصانیف ان سے منسوب ہیں۔[۲۳] شاہ گلشن کے ایک اور شاعر مرید خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے۔[۲۴] ایک ضخیم فارسی تصنیف نالۂ عندلیب ان سے یادگار ہے۔ ان کے دونوں بیٹے خواجہ میر درد اور خواجہ میر اثر اُردو کے نام ور شعرا ہیں، بلکہ درد تو شاہ گلشن کے خلیفہ بھی تھے۔[۲۵] یہ خاندان مجددیہ نقش بندیہ سلسلے کے اہل نظر افراد پر مشتمل تھا۔ شیخ بلاقی زر بھی شاہ گلشن کے سلسلے کے شاعر تھے۔[۲۶] فرحت کشمیری شاگرد شاہ گلشن فارسی شاعر تھا۔[۲۷] میمن خان کشمیری شاہ گلشن کا مقرب شاعر تھا۔[۲۸] محمد فقیہ دردمند شاہ ولی اللہ اشتیاق سے مستفید ہوئے۔[۲۹]

مرزا مظہر جان جاناں اپنے وقت کے انتہائی متبحر عالم تھے۔ نقش بندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور ساتھ ہی اُنھوں نے شاہ گلشن کے کئی خلفا سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔[۳۰] بڑے پُر اثر شاعر تھے۔ اُنھوں نے دہلی کے ادبی ماحول پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ شاعری کی تاریخ میں ابہام گوئی کے خاتم اور طریق جدید کے بانی قرار دیے جاتے ہیں۔ اپنے وقت میں جتنا اُنھوں نے اُردو شاعری کو متاثر کیا، اتنا کسی اور نے نہیں کیا۔ بے شمار شعرا ان کے فیض سے مستفید رہے۔ اُنھوں نے اپنے مریدوں کو تصنیف و تالیف کے کام پر بھی لگایا۔ ان کے مریدین اور تلامذہ میں یقین[۳۱] میر محمد باقر حزیں،[۳۲] خواجہ احسان اللہ خان بیان،[۳۳] یکرنگ،[۳۴] محمد فقیہ دردمند،[۳۵] تاباں،[۳۶] ہیبت علی خاں حسرت[۳۷] مشہور شاعر ہیں۔ شاہ حاتم بھی ان کی محفلوں میں شریک رہتے تھے۔[۳۸] خان آرزو نے بھی اس علمی ماحول میں پرورش پائی تھی جس میں شیخ مجدد کے کمالات علمی و روحانی کے اثرات موجزن تھے۔[۳۹] خلفا میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولوی غلام یحییٰ، شاہ غلام علی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ان میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت نام ور ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے فقہ کے مسائل کی کتاب مالابدمنہ اب بھی مستعمل ہے۔[۴۰] ان کی تفسیر مظہری سات جلدوں میں ہے۔ ان کی دوسری کتابیں اور رسالے تعداد میں تیس سے زیادہ ہیں۔[۴۱] مرزا صاحب کے ایک اور نام ور مرید شاہ غلام علی ہیں۔[۴۲] برِعظیم میں ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ دہلی میں ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کا مدمقابل سمجھی جاتی تھی۔[۴۳] سیّد احمد خان کے والد میر متقی اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد شاہ غلام علی

کے مرید تھے۔[۴۴] ان کے بزرگ خلفا میں ایک رؤف احمد رافت تھے جو مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے بھی تھے۔[۴۵] شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے۔ اُردو میں چھے اور فارسی میں ایک دیوان ان سے منسوب ہیں۔ مثنوی یوسف زلیخا بھی ان سے یادگار ہے۔ نثر میں ایک معراج نامہ اور ایک اُردو تفسیر بھی لکھی تھی۔[۴۶] شاہ شکور احمد شکور مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے،[۴۷] ان کے صاحبزادے خورشید احمد دہلوی اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ غالب اور مومن سے اصلاح لیتے تھے اور رؤف احمد رافت سے، جو اُن کے عم زاد برادر تھے، اور شاہ غلام علی سے بیعت تھے۔[۴۸] اب مصطفیٰ خان شیفتہ انھی کے خلیفہ شاہ عبدالغنی نقش بندی سے بیعت تھے۔[۴۹] یہ سب ممتاز خلفا صاحب تصنیف و علم و فضل تھے۔

تحریک احیائے دین کے تعلق سے یہ قابلِ ذکر امر ہے کہ جس وقت علمائے مجددیہ نقش بندیہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے، اس وقت وہاں صرف اُردو شاعری کا رواج شروع ہوا تھا۔ اُردو نثر کی ابھی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس تحریک کے تعلق کو محض نظم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اُردو شاعری پر اس تحریک کا نمایاں اثر یہ پڑا تھا کہ شاہ گلشن کی تجویز اور ولی کے ذریعہ سے اُردو شاعری کو نئے موضوعات فراہم ہوئے۔ پھر مرزا مظہر اور ان کے تلامذہ و ہم عصر اساتذہ نے ایہام گوئی سے اُردو شاعری کو پاک کیا۔ اس رجحان کی تہ میں، جو بیشتر تحریک اور اس کے متعلقین کی رہین منت ہے، غیر اسلامی عناصر جیسے ہندی دوہروں اور بھاشاپن کے خلاف ردِّعمل اور گریز اختیار کرنا تھا۔ اسی جذبہ کے تحت اُردو کو فارسی یا اسلامی تہذیب سے قریب تر کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

اس تحریک نے اہلِ دہلی کے علمی و ادبی ذوق میں سنجیدگی اور ستھرائی پیدا کرنے میں اہم حصہ لیا۔ بعد میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے بھی اس کام میں شرکت کی۔ اگر چہ سیاسی عدم استحکام اور طوائف الملوکی کے مختلف تلازمات کے نتیجہ میں دربار دہلی کا رنگ بہت بگڑ چکا تھا، اور عوام پر اس کا اثر بھی پڑ رہا تھا، لیکن یہ تحریک اپنی حد تک دربار اور امرا کے اثر سے آزاد رہ کر عوام کے مذاق کو پاک کرنے میں کوشاں رہی۔ اور بڑی حد تک دربار کے اثرات کو روکے رکھا۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ میں جو واضح اور نمایاں فرق ہے، وہ اس امر کا ثبوت ہے۔ دبستان دہلی کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اس تحریک کے اثرات کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس فوقیت میں مرزا مظہر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی اُردو شاعری میں اپنے زمانہ کے سیاسی حالات و کوائف کی بہت نمایاں جھلک ہے۔

مرہٹوں کے خلاف اہالیان روہیل کھنڈ کو آمادہ کرنے کے لیے جہاں ان کے معتقدین کی بڑی تعداد ہے، مرزا صاحب نے خود بھی متعدد مقامات کی مسافرت اختیار کی، جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا۔ وہ پہلے غزل گو شاعر ہیں جن کی شاعری میں سیاسی رنگ نمایاں کامیابی کے انداز میں موجود ہے۔ مسلمانوں کو جو مصائب درپیش تھے اور وہ جس نئی طاقت کے مسلط ہو جانے کی وجہ سے مجبوری اور غلامی میں مبتلا ہو رہے تھے، اس کے احساس اور آزادی کی حسرت میں وہ اپنے جذبات کا اظہار مختلف غزلوں میں کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس تحریک نے آگے چل کر اپنے مقاصد، نصب العین اور افادیت کے حصول کے لیے اُردو کو اپنایا۔ اور اُردو اس تحریک کے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور ترویج و اشاعت میں پورے طور پر مستعمل رہی۔ دراصل یہ اس نئی، پھیلتی اُبھرتی زبان کے ساتھ پہلا موقع تھا کہ اس سے ایک اجتماعی مقصد کی تکمیل کا کام لیا گیا۔ چناں چہ اُردو نے آگے چل کر زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی تحریکات میں حصہ لیا۔

❁　❁　❁

باب دوم

اُردو شاعری ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

اُردو شاعری میں ایہام گوئی کا دور جس کا موضوع زیرِ بحث کے تعلق سے گزشتہ باب میں جائزہ لیا گیا ہے، اپنے ماحول اور زمانے کا فطری تقاضا تھا۔ اس رجحان کا دور دورہ عہدِ محمد شاہ سے شروع ہوکر کم و بیش پچیس سال تک رہا۔ پھر اس کے خلاف ایک تحریکی انداز کا ردِ عمل بھی اُسی کے آخری دورِ حکومت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس رجحان کا ایک اہم ترین سبب خود محمد شاہی دور کی سیاسی اور تہذیبی زندگی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے ساتھ تخت نشینی کی کش مکش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تقریباً اٹھارویں صدی کے نصف اوّل تک جاری رہا۔ محمد شاہ کی شخصیت ان صلاحیتوں سے محروم تھی جو مغلیہ سلطنت کے بڑھتے ہوئے زوال کو سہارا دے سکتی۔ اس کو تو محض اتفاقات زمانہ نے برِ عظیم کی حکومت تفویض کردی تھی۔ امرا کی سازشوں اور صوبے داروں کی علاحدگی پسندی کا انسداد اس کی محدود صلاحیتوں سے بالاتر تھا۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو انتظامِ سلطنت میں کام نہ آسکیں شاہانہ اقتدار کے اظہار، عیش و طرب کی محفلوں کی آراستگی اور داد و دہش میں، جس کے لیے اس کا دور مشہور ہے، خوب نمایاں رہیں۔ اس فطرت نے جو زوال و انحطاط میں بھی عیشِ امروز کے اعتقاد کے ساتھ اپنے ذوقِ جمال کی تسکین چاہتی تھی، فنونِ لطیفہ میں بھی ایسے پیرائے کی ضرورت کا مطالبہ کیا جس میں پہلو دار اور مختلف المفاہیم اظہار ہو۔ لیکن پھر بھی، جیسا کہ گزشتہ باب میں جائزہ لیا گیا ہے، خصوصاً شعرا نے جو اپنے ماحول کے سیاسی اور تہذیبی ہیجانات سے مقابلتہً زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور بڑی حد تک ایک حقیقت پسندانہ مشاہدہ کا اظہار کرتے ہیں، اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی ہے اور اُنھوں نے ایہام گوئی کے رجحان کے باوجود، جس نے اُردو شاعری کو کافی حد تک شعریت، تغزل اور حقیقت سے عاری کر دیا تھا، اپنی شاعری کو بنیادی طور پر اپنے اجتماعی ماحول سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ اس میں یاس و حرماں، تلخی، داخلی گھٹن، ماحول سے گریز پائی اور زندگی سے بیزاری کے رجحانات بھی نظر آتے ہیں۔ محمد شاہی دور کے بعد حالات کی مزید ابتری کے زیرِ اثر شاعری میں ماحول سے کنارہ کشی اور زندگی کی بے ثباتی کا

احساس شدت اختیار کر گیا، جس کی بدولت اس دور کی شاعری کا مزاج مجلسی اور اجتماعی سے زیادہ داخلی یا انفرادی ہو گیا۔ اور غم و الم کے فطری جذبات ابھرے۔ گہرے فکری حقائق کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی مسائل بھی اس دور کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا دہلی پر حملہ محض سیاسی تاریخ ہی کا نہیں برِعظیم کے تہذیبی ماحول کا بھی ایک الم ناک سانحہ تھا، جس نے افراد کے جسم و روح پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔

پیام، اشرف علی خاں:

ایک عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

مرزا عسکری:

تو نادر شاہ ہے ملک پری رُویوں کا اے ظالم
جدھر بھر کر نظر دیکھے تو قتل عام ہو جائے

شعرا کے حساس ذہنوں پر اس کے جو نقوش مرتب ہوئے وہ آگے چل کر میر کی غم پسندی، سودا کی ہجونگاری، درد کے تصوف اور دیگر شعرا کی داخلیت کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یوں شاعری میں المیہ رجحانات اور ظلم و ستم سے آزادی کے جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔

برِعظیم کی اقتصادی حالت، سیاسی عدم استحکام کے سبب اورنگ زیب کے بعد بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ محمد شاہ کے عہد میں دہلی کو نادر شاہ کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر اس کے جانشینوں کے دور میں دہلی پر احمد شاہ ابدالی، جاٹ اور مرہٹے پے بہ پے حملہ آور ہوتے رہے۔ قتل و غارت، جنگ کا خوف اور اقتصادی ابتری نے امرا اور شعرا کو نقل مکانی پر مجبور کر دیا۔ مرکزی حکومت بائیس صوبوں سے سمٹتے سمٹتے آخر کار قلعہ معلّٰی میں سما گئی۔

سودا:

کہ ایک شخص ہے بائیس صوبوں کا مالک رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری سوں

اس نسبت سے حکومت کی آمدنی میں بھی کمی ہوتی گئی۔ شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں مغل حکمرانوں کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا۔ غلام قادر روہیلہ کا ظلم و ستم، مرہٹوں کی حکومت میں شرکت اور بالآخر لارڈ لیک کی فوج کشی، تاراجیِ سلطنت کا باعث بنے۔ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء تک یکے بعد دیگر شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ظفر فرمانروا ہوئے، لیکن انگریزوں سے نئے معاہدے نے

اقتدار کا بہت کچھ حصہ مغلیہ سلطنت سے چھین لیا تا آنکہ دہلی کا ''ریزیڈنٹ'' اصل حکمراں بن گیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال سے مسلم ہندوستان کے تہذیب وتمدن اور ذہن وفکر کے تمام شعبے براہ راست متاثر ہوئے۔ اس کا واضح نتیجہ اقتصادی زبوں حالی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ معاشی بدحالی سے پیداشدہ انتشار کا ردِ عمل افراد پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک گروہ نے اپنے ماحول سے کنارہ کشی اختیار کرکے انفرادی نجات کی فکر کی۔ دوسرے نے پہلے سے قطع نظر محض حیاتی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین میں پناہ ڈھونڈی۔ تیسرے نے حالات کے اس رخ کے خلاف احتجاج کیا اور چوتھے نے اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والی برائیوں کی طرف اپنے معاصرین کی توجہ منعطف کی اور نہ صرف اس پر احتجاج کیا بلکہ اصلاح احوال کی کوشش بھی کی۔

افراد کے جس گروہ نے اپنے منتشر ماحول کے خلاف اپنی استعداد اور صلاحیتوں کی حد تک احتجاج کیا وہ اہل قلم کا گروہ تھا۔ اس نے نثر اور نظم دونوں کی متنوع اصناف میں اپنے دور کے حالات پر اپنے پیرایے میں تبصرہ وتنقید کی اور افراد کو معاشرہ کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس قسم کی کوششوں کا کسی حد تک ذکر گزشتہ باب میں ہوا ہے۔ اس دور میں میر، سودا، نظیر[1] اور دیگر چھوٹے بڑے بے شمار شعرا اپنے طور پر یہ کام انجام دیتے ہیں۔ چوتھا گروہ علما کا تھا، جن میں شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندوں کو سب سے زیادہ اہمیت تھی اور ان کے بعد وہ علما تھے جنھوں نے کسی نہ کسی تعلق سے اسی خانوادے سے فیض حاصل کیا۔ اہل قلم کے طبقے میں سب سے اہم شعرا تھے، جن کا ان الم انگیز حالات میں شعور واحساس بیدار تھا، اور جو اس سیاسی اور تہذیبی انتشار پر غور کرکے اس سے عہدہ برا ہونے کی تدبیریں بھی سوچ رہے تھے۔ شعرا کی اس آگہی اور تاثر نے ان کے کلام میں حزن و یاس اور درد وغم کی اس حد تک شدت بھر دی تھی کہ عیش ونشاط کو ان کے لیے خواب وخیال بنا دیا تھا۔

سودا:

سودا جو بے خبر ہے کوئی وہ کرے ہے عیش — مشکل بہت ہے ان کو جو رکھتے ہیں آ ہی

شعرا کے اس احساس میں معاشرے کے اجتماعی غم کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا شعور معاشرے کے دیگر افراد کے مقابلے میں سیاسی انتشار، اقتصادی بدحالی، اخلاقی پستی کا زیادہ ہی احساس رکھتا تھا۔ وہ اس زوال پذیر سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال سے مضطرب تھے، اور اس کو روکنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے محض اپنے اطراف کے حالات کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ

ان کو اپنی تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے احساس و جذبہ کو مختلف اصناف سخن میں بیان کیا ہے۔ دورزیر بحث میں، مقابلتہً دور گزشتہ کے جس کا جائزہ لیا گیا ہے زیادہ اصناف ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال ہوئی ہیں: غزل، شہر آشوب، قصیدہ، مثنوی، مخمس، مسدس، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام اصناف میں غزل اس وقت بھی اُردو شاعری کی سب سے اہم اور مقبول ترین صنف سخن رہی۔ اس کا مخصوص مزاج ہر طرح کی واردات و کیفیات کے اظہار کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ اس مقام پر موضوع زیر بحث کا جائزہ تمام مذکورہ اصناف میں لیا جائے گا۔

(الف) غزل

گذشتہ باب میں غزل کا جائزہ ''دور ایہام گوئی'' تک محدود رہا ہے۔ ایہام گوئی کا رجحان ۱۷۵۷ء تک ختم ہو چکا تھا۔ شاہ حاتم نے اپنی ایک غزل ۱۱۷۱ھ کے مقطع میں کہا ہے:

ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش　　نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا

ایہام گوئی کے خلاف مرزا جانِ جاناں کی تحریک بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں غزل کو حقائقِ حیات سے روشناس کرنے میں اس تحریک کا نمایاں کردار ہے۔ اس وقت تک آبرو، مضمون، یکرنگ، احسن اللہ احسن، ناجی اور حاتم اس روش پر چل رہے تھے۔ مرزا مظہر نے ابتداءً خود اصلاح کی راہ اختیار کی، پھر دوسروں کو اس پر چلنے کی ہدایت کی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، اور ایہام گوئی کا زور آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا، اور بعد کی نسل کے شعرا کے لیے حقیقت سے قریب تر ایک نئی راہ نکل آئی۔

مرزا مظہر نے اپنے دور کے ادبی ماحول پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اُنھوں نے خان آرزو کی تحریک کو ایک قدم آگے بڑھایا جس کا مقصد شعرا کو اُردو میں شعر کہنے کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ خان آرزو کی تحریک اُردو زبان و شعر کی ترقی میں ایک اہم قدم ہے۔ ان کا ریختہ گوئی کی طرف ذاتی میلان ریختہ کا اعتبار بڑھانے کا سبب بنا[1] ان کے کہنے سے سودا نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیے تھے۔[2] اور پھر ان سے آگے بڑھ کر مرزا مظہر نے ایک تو اُردو کو ترقی دینے کے لیے دوسرے اس کی اصلاح کے لیے دو مثبت اصلاحی اقدامات کیے۔ ایک کا مقصد ایہام گوئی کو ختم کرنا تھا اور دوسرے کا مقصد ہندی اثرات کو اُردو ادب میں غالب آنے سے روکنا تھا۔ ان کی اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو اپنے ارتقا کے اس ابتدائی مرحلے پر ہی فارسی زبان و ادب کے اسالیب و عناصر سے قریب ہوتی گئی اور اس کا رشتہ اس ذریعے سے مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کے ساتھ برقرار رہا۔ برج بھاشا اور دکنی، ہندوستانی کی تقلید موقوف ہوگئی۔

شاعروں میں بہت سے شعرا ان کے شاگرد اور فیض صحبت سے مستفید تھے۔ خود بہت ستھرا اور نکھرا ہوا مذاقِ شعری رکھتے تھے۔ ابتداءً اُنھوں نے عام روایتوں سے ہٹ کر شعر کہنے شروع کیے، اور اُنھیں جذبات و کیفیاتِ قلب کا ترجمان بنایا۔ چوں کہ ہمہ گیر مصروفیات رکھتے تھے اس لیے نمونتاً اس طرز میں چند غزلیں کہہ کر اُنھوں نے شاگردوں کو اس کام پر متعین کیا کہ وہ اس تحریک کو آگے بڑھائیں۔ ان کے تلامذہ میں انعام اللہ خاں یقین، احسن اللہ خاں بیان، میر محمد باقر حزیں، مصطفیٰ خاں یکرنگ، محمد فقیہ دردمند، عبدالحیٰ تاباں مشہور شاعر ہیں۔ حاتم گو کہ ان کے شاگرد نہیں تھے لیکن ان کی محفلوں میں شریک رہتے تھے۔

مرزا مظہر کی اُردو شاعری میں ان کے زمانے کے سیاسی حالات کی بہت موثر جھلک ہے۔ مرہٹوں کے خلاف اہالیانِ روہیل کھنڈ کو تیار کرنے کے لیے[۳] اُنھوں نے مراد آباد، امروہہ، آنولہ، بریلی اور شاہ جہاں پور کے دورے کیے جن کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جن کی اُردو غزل میں سیاسی رنگ بڑی کامیابی سے ملتا ہے۔ مسلمانوں کو جو مصائب درپیش تھے اور جن کی بدولت مسلمانوں کو مجبوری اور غلامی کا منہ دیکھنا پڑا، اس کے احساس سے اور آزادی کی حسرت میں مرزا مظہر کا یہ شعر ان کے قلبی اضطراب کو بیان کرتا ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گُل اپنا باغباں اپنا

اس غزل کے چند اور متعلقہ مضمون کے شعر یہ ہیں:

قفس کے بیچ بلبل کس قدر حسرت سے کہتی ہے
کہ پھر بھی دیکھنا قسمت میں ہوگا بوستاں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

اب کوئی ساعت میں آ صیاد کرتا ہے ملول
ایک دم کو بلبلو کیوں بیٹھتی ہو پھول پھول

شعرا نے جس داستانِ حیات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا تھا اس میں ان کی آپ بیتی بھی شامل تھی اور جگ بیتی بھی۔ اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی داستان درد کی علامات و رموز، اپنے عہد کے جذبات واحساسات کی پوری کیفیت بیان کرتے ہیں۔ یہ شاعر جہاں گلستان، باغ، گلزار، چمن اور آشیاں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ اشاروں اور کنایوں میں ملک و وطن اور گھر کا ذکر کر رہے ہیں۔ اسی طرح ظالموں اور غارت گروں کو کبھی صیاد اور کبھی گل چیں کا نام دیتے ہیں اور چمن و آشیاں کے باسیوں کو غنچہ، گل، پھول اور بلبل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اسی نسبت سے امن و امان کے دور کو بہار اور انتشار و اضطراب کے دور کو خزاں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان علامات و رموز کو اپنے پیشِ نظر رکھ کر مرزا مظہر کے مندرجہ بالا اشعار کے جذبات و احساسات کی گہرائی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ دوسرے شاعروں کے بھی یہ شعر دیکھیے:

سودا:

لطف کیا رکھے اس باغ کی سیر اے سودا شاخ پر دیکھنے دے گل کو نہ گل چیں جس دم

خندۂ گل بے نمک فریادِ بلبل بے اثر اس چمن سے آہ جا کر کیا کریں گے یادِ ہم

بلبل کر اس چمن کو سمجھ کر تک آشیانہ صیاد لگ رہا ہے تری گھات بے طرح

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گل چیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا

ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا چمن چمن پڑی کرتی ہیں بلبلاں فریاد

پوچھے ہے پھول پھول کی خبر اب تو عندلیب ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

دامان شفق آج خون آلودہ میں دیکھا چلتی ہے ترے عہد میں شمشیر ہوا پر

درد:

اے گل تو رخت باندھ اُٹھاؤں میں آشیاں
گل چیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

گلستان جہاں کی دید کیجیو چشم عبرت سے کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار کس بات پر چمن ہوس رنگ و بُو کریں

میر:

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

سن اے بیدردگل چیں غارت گلشن مبارک ہے پہ ٹک گوش مروت جانب فریاد بلبل کر
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی
چمن کی وضع نے کیا ہم کو داغ کہ ہر غنچہ دل پہ آرزو تھا
گل پھول کوئی کب تک جھڑجھڑ کے گرتے دیکھے اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں رکا ہوں
سیر کر میر اس چمن کی شتاب ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

اس عہد کی اُردو شاعری میں انقلاب روزگار کا گہرا قلق اور افسوس موجود ہے۔ اپنے دور کی طرح شاعری بھی ہلاکت، بربادی اور انتشار سے عبارت ہے۔ محض تاریخ ہی میں نہیں، اس وقت کے ادب سے بھی ان امور کا اظہار ہوتا ہے، جن کے سبب برِّعظیم کی مسلم ملت اور فرماں روائی زوال پذیر ہوئی۔ سلطنت مغلیہ اور دہلی کی شکست وریخت اور نظام سلطنت کے انحطاط میں صرف بیرونی حملہ آوروں کی یلغاریں اور اندرونی بغاوتیں ہی روبہ عمل نہیں تھیں، اس دور کے ناعاقبت اندیش شاہوں، وزیروں اور امیروں کی نااہلی اور خودغرضی برابر کی شریک تھی۔ اورنگ زیب کے بعد تخت نشینی کی مسلسل خانہ جنگیوں میں مسلم ملت کا لائق اور دوراندیش طبقہ کاروبار سلطنت سے بے دخل ہو گیا۔ جو چند ایک باقی رہ گئے تھے اُنھوں نے دربار شاہی میں اپنے مقابل چھوٹوں کا اثر و رسوخ اور اقتدار دیکھ کر خود کو معاملات سلطنت سے کنارہ کشی پر آمادہ کرلیا۔ امرا اور وزرا کی بے حسی اور خودغرضی کے بند توڑنے کی سکت کسی ایسے ہاتھ میں تھی جو عوام میں پورے طور پر اپنا اثر و نفوذ رکھتا ہو۔ شعرا کو اس انقلاب دوراں کا شدید احساس اور رنج تھا۔ اُنھوں نے سیاسی کوائف کے ایسے ہی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے عام سیاسی اور معاشرتی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ایسے اشعار سے اُردو شاعروں کے بیدار شعور و احساس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جن میں اُنھوں نے اپنے عہد کے مذکورہ حالات کو سدھارنے میں اپنی صلاحیتوں سے کتنا کام لیا ہے، اور گاہے گاہے امرا کے طرزِ عمل پر تنقید اور زوال کے عبرت انگیز انجام سے آگاہ کیا ہے۔

سودا:

اُنھیں طبل و علم بخشا ہے چرخ سفلہ پرور نے صدائے کرنا جن نے بگوش فہم ہے پہلی
کیوں کر نہ ملک داری میں باہم ہو کشت وخوں یاں زندگی و مرگ کا حاصل زمین ہے

سکھ نیند زیر سقف فلک کیوں کہ سو سکوں ایدھر دُہل بجے ہے ادھر نوحہ و خروش

میر:

تھا ملک جن کا زیر نگیں صاف مٹ گئے تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
ہر کوئی اس مقام میں دس روز اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ
فرو آتا نہیں سر ناز سے اب کے امیروں کا اگرچہ آسماں تک شور جاوے ہم فقیروں کا
یہاں سرکشاں جو صاحب تاج ولوا ہوئے پامال ہوگئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنھوں کا جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

میر کا یہ شعر کھل کر اس کی ''اس غیر'' سے نفرت کو ظاہر کر رہا ہے جس کے استعماری قدم اس کے ملک پر تسلط جما رہے تھے:

غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کتے نے کر کے دلیری صید حرم کو پھاڑا ہے

شعرا عام طور پر ایسے ہی طبقے سے متعلق تھے جہاں معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت اور ان کے انقلاب کا احساس فوری ہو جاتا ہے۔ سیاسی طوائف الملوکی کے نتیجے میں معاشرتی طور پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں وہ رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھیں۔ چوں کہ شاعر اپنے مخصوص پیرایے میں زمانے کی رفتار کو بیان کرتے ہیں اور اس انداز میں جذبات و محسوسات بھی بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں اس لیے مذکورہ صورتِ حال کا اظہار و بیان یقیناً جذبات کی رقت کو ساتھ لیے ہوتا ہے۔ ان اشعار میں دیکھیے:

سودا:

جس سے پوچھا میں کہ دل خوش ہے کہیں دنیا میں
رو دیا اس نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں
دور ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشم پر آب
دیکھ سودا گردش افلاک سے کیا کیا ہوا

جو مرد ہیں شکل ان کی یوں سطح زمین پر ہے
تصویر ہو شیروں کی جوں قالی میں بافیدہ
کہوں کیا انقلاب اس وقت میں یارو زمانے کا
جسے سب عیب سمجھے تھے وہ نظروں میں ہنر ٹھہرا

درد:

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

میر:

کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر
اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں
تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط
مرمر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں
کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب وہاں عیاں نہیں
جن کے نشاں تھے فیلوں پر ان کا نشاں نہیں

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی
جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا ۔ ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں ۔ کچھ اس گلی میں ہم ہی نہیں خوار ایک دو
جن بلاؤں کو میر سنتے تھے ۔ ان کو اس روزگار میں دیکھا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ ۔ یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
اب خرابا ہوا جہاں آباد ۔ ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
اب شہر ہر طرف سے ویران ہوگیا ہے ۔ پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

سیاسی عدم استحکام اور امن و امان کے فقدان کا نتیجہ بے روزگاری اور معاشی زبوں حالی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس حالت میں ملک کے معاشی نظام کے تارو پود کا بکھرنا یقینی امر تھا۔ بدامنی

اور سیاسی انتشار کے اثرات شہر اور دیہات دونوں میں یکساں تھے۔ نادر اور ابدالی کے حملوں کے بعد ملک کے خزانے کو اس وقت شدید دھچکا پہنچا جب زراعت کی حالت مخدوش ہونے پر صوبے داروں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود سری اختیار کرلی اور مرکزی حکومت کو مالیہ دینا ترک کردیا۔ اس عمل نے فوج کے ساتھ ساتھ طبقۂ امرا کو بھی بے حد متاثر کیا۔ شاعروں کی اقتصادی حالت تمام طبقوں میں زیادہ غم انگیز تھی۔ درباروں کے تہ و بالا ہونے سے وہ زیادہ مفلوک الحال ہوگئے۔ چناں چہ بعض نے فقر و فاقہ اور گوشہ نشینی کی زندگی کو ترجیح دی اور بعض ہجرت کرکے دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ شاعروں کو صرف یہی نہیں بلکہ اقتصادی بدحالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی قباحتوں کا بھی بڑا احساس تھا۔ شعرا کے پیش نظر چوں کہ ایک مثالی زندگی کا تصور بھی ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی زندگی سے اس قسم کی قباحت و تنگ دستی کو ختم کرنا بھی ضروری خیال کرتے تھے۔

سودا:

کیا سپاہی کام پر آقا کے اب دیتا ہے جی — بھوک سے کرتا ہے ہوکر زندگی سے سیر جنگ
بے زری خلق کو ہے یہ کہ کسی کا کیسہ — کوئی کاٹے تو بکے کیسۂ دلال کے مول

میر:

اب سب کے روزگار کی صورت بگڑ گئی — لاکھوں میں ایک دو کا کہیں کچھ بناؤ ہے
اُڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں — سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم
ہے پُر غبار عالم جانا ہی یاں سے اچھا — اس خاک داں میں رہ کر کیا کوئی خاک پھانکے
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں — کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

درد:

شعر کی فکر بن آتی ہے اسی سے جس کو — درد کی طرح کبھو فکر نہ ہو روزی کی
عالم میں جتنے پاک گہر تھے سو ایک ایک — ادنٰی سے روزگار نے یونہی گھلا دیا

اس قسم کی غیر یقینی صورتِ حالات میں اس وقت کے شاعروں میں بے ثباتیِ عالم کے احساس کا پیدا ہونا کچھ غیر فطری نہیں تھا۔ اور اس صورت میں جب کہ اس قسم کی حالت کے دور کرنے کے لیے کوئی عملی اجتماعی تحریک بھی نہیں۔ چناں چہ زندگی کے منفی رجحانات بھی کسی کو متاثر کرسکتے ہیں۔ جب اس دنیا میں کوئی شخص اپنے مثالی معاشرے کے تصور کو محض خواب ہی کے طور پر دیکھتا رہے، اس کے برعکس زندگی کی تلخیاں اس سے کچھ اور ہی مطالبہ کرتی رہیں تو اس کا دنیا سے بیزار ہونا یقینی امر ہے۔ یا تو وہ

یہ چاہے گا کہ اس معاشرے کی اس حالت و کیفیت کو ختم کرے اور اگر وہ اپنی اس خواہش کو مکمل ہوتا ہوا نہ دیکھ سکے تو اس میں اس دنیا کی بے ثباتی اور کارِ دنیا کی ہیچ مقداری کا احساس جاگزیں ہو جاتا ہے۔ برِعظیم کا سیاسی زوال اور اس سے متلازمہ سماجی بحران شعرا میں اس قسم کے احساسات و تصورات کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا، اس لیے اُنھوں نے اس قسم کے احساس کی بھرپور ترجمانی کی ہے:

سودا:

خواہش جنھیں ہے ملک کی ان کو نہیں یہ فہم　　دو گز زمیں ندان تہِ سنگ ہے وسیع

آراستہ جو بزم ہوئی دور فلک میں　　واں جام بجز گردشِ ایام نہ آیا

سودا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا　　جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لیے

تلاش زیست میں اتنا نہ مر کہ ہستی کی　　خبر جنھوں کو ہے سمجھیں ہیں وہ عدم جینا

عرصہ تو زندگی کا نہیں اس قدر بھی یاں　　افسوس میں کسی کے کوئی ہاتھ مل سکے

ساقی ہے اک تبسم گل فرصتِ بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

درد:

اے درد جس کی آنکھ کھلی اس جہاں میں　　شبنم کی طرح جان کو وہ اپنی رو گیا

جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقشِ عبرت نے　　سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں

میر:

فکر تعمیر میں نہ رہ منعم　　زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام　　آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

دیوار و در بڑے تھے جہاں واں نشاں نہیں　　یاں خانوادوں کے رہیں آثار کب تلک

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر　　اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے　　کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں آگئے

قائم:

بناوے کوئی عمارت سو کس توقع پر　　پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا

دنیا میں ہم رہے تو کوئی دن پر اس طرح　　دشمن کے گھر میں جیسے کوئی مہمان رہے

(ب) شہر آشوب

اُردو شاعری میں سب سے مقبول اور مستعمل صنف سخن غزل ہی رہی ہے۔ اس میں شعرا اپنے ہر طرح کے جذبات بلا کم و کاست بیان کر دیتے تھے اور اجمال و اختصار کے ساتھ رمز و کنایہ میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار بھی کر جاتے تھے۔ موضوع زیر بحث سے متعلق مضامین غزل کی بہ نسبت شہر آشوب میں واضح اور نمایاں ملتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں رمز و کنایہ اور اجمال و اختصار سے قطع نظر کسی شہر یا ملک کی سیاسی یا اقتصادی بے چینی یا شہر کے مختلف طبقات کی تہذیبی زندگی کے کسی پہلو کا تذکرہ ہجو، ہزل یا طنز کے پیرایے میں کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس اور مسدس کسی صنف کا بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ دور میں شاہ حاتم تک شہر آشوب کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس دور میں سودا، میر، قائم اور نظیر کے شہر آشوبوں میں اپنے دور کے سیاسی اور تہذیبی حالات پر مقابلتہً بہتر تنقید اور تبصرہ نظر آتا ہے۔ اپنے دور کی بے کسی و بے چارگی کا نوحہ، گزری ہوئی عظمت و حشمت کا گہرا احساس، مغلوں کی عسکری قوت کا زوال و انحطاط، شاہوں اور امیروں کی نااہلی اور خود غرضی، نظام سلطنت سے ذمہ داروں کی بے گانگی، امن و امان کے فقدان خصوصاً معاشی بدحالی اور بے چینی مختلف پیشوں اور طبقوں کی زبوں حالی ان تمام شہر آشوبوں کا خاصہ ہے۔

سودا کے دو شہر آشوب دست یاب ہیں۔ ایک قصیدہ شہر آشوب، جس کا مطلع ہے:

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے　　دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

دوسرا مخمس شہر آشوب جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول　　پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول

قصیدہ شہر آشوب میں سودا نے مجموعی طور پر بے روزگاری اور معاشی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ ابتدا کے چند اشعار ہی سودا کے گہرے احساس اور حزن و یاس کو بیان کرتے ہیں:

اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت　　آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے

سن کے یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا　　اس امر میں قاصر تو فرشتہ کی زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے کی کئی شکل　　ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

سودا نے بیان کیا ہے کہ اب یا تو نوکری بالکل مفقود ہے یا اگر کسی کو مل بھی گئی تو تنخواہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

دوسرے پیشوں کی بھی یہی حالت ہے۔ کسی فن اور کسی پیشے میں امن و امان و اطمینان نہیں:

آرام سے کٹنے کا سُنا تونے کچھ احوال جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دُنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

اس شہر آشوب میں سودا نے مختلف مقامات پر محض مختلف طبقات اور پیشوں کی حالت زار کا تذکرہ ہی نہیں کیا، معاشی بدحالی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے سیاسی کوائف کی عکاسی بھی کی ہے۔ چناں چہ اس مخمس سے اس عہد کی سیاسی حالت، بادشاہوں، امیروں اور منصب داروں کی خود غرضیوں اور بدعنوانیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

سودا کے دوسرے مخمس شہر آشوب میں دہلی کی تباہی، وہاں کے لوگوں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شرفا کی کس مپرسی کا تذکرہ ہے۔ ابتداءِ بے روزگاری کا ذکر کرکے اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلے امرا اور جاگیردار سپاہیوں کو نوکر رکھا کرتے تھے۔ اب وہ جاگیریں ختم ہوگئیں چوں کہ ملک میں امن و امان موجود نہیں اس لیے معاشی انتشار پیدا ہوگیا ہے۔ خزانہ خالی ہے کیوں کہ زراعت بھی بدنظمی سے متاثر ہورہی ہے۔ چناں چہ ہر طرف مفلسی، بھوک اور بے زری کا دور دورہ ہے۔ اس شہر آشوب میں اس سلطنت کی گرتی ہوئی عمارت کا نقشہ سودا نے بڑے لطیف پیرائے میں کھینچا ہے۔ انتظامی امور میں کوتاہی، ذمہ دار شخصیتوں کی کاہلی اور تساہل اور اس کے نتیجے میں جو غنڈہ گردی شروع ہوگئی تھی اس کا من وعن بیان اس شہر آشوب میں مل جاتا ہے:

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف نکلے کہاں جو ہمیں دے کے ہوں اُنھوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار کی اُول

سودا نے بڑے سلیقے سے امرا کی کیفیت بیان کی ہے کہ اُنھوں نے اب صرف اپنی حیثیت آرام طلبی کی خاطر نمائشی رکھ چھوڑی ہے۔ ان کے پاس جھوٹی ظاہر داریاں تو ہیں لیکن وہ حقیقی صلاحیت جو ایک منصب دار میں ہونی چاہیے، مفقود ہے:

انھیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کاتی سمور

نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور جوان میں قافیہ داں تھے ہوئے وہ ان سے دور
قماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ٹھٹھول

اس صورتِ حال میں دہلی اور شرفائے دہلی کی بربادی، کس مپرسی اور پریشانی کی تصویر کھینچی ہے:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

اپنے اظہار بیان کے اعتبار سے یقیناً یہ شہر آشوب وطن کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

جعفر علی حسرت کا ایک شہر آشوب مخمس کی شکل میں دست یاب ہے، جو ''مخمس در احوال دہلی'' کے عنوان سے ان کے کلیات میں شامل ہے۔[2] اس کے مصنف کے بارے میں اختلاف رہا ہے۔ اس کو ہیبت قلی خاں حسرت کا شہر آشوب بھی قرار دیا گیا ہے۔[3] اسی شہر آشوب کو مولوی عبدالحق نے ''مخمس در احوال شاہ جہاں آباد'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔[4]

حسرت نے اس شہر آشوب میں دہلی کی تہذیبی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس سے معاشرے کے مختلف طبقات کی حالت زار کا اندازہ ہوتا ہے۔ سیاسی اختلال، ملکی انتشار، معاشی بحران، بے روزگاری اور عوام کے مختلف طبقات کی مفلوک الحالی کا ذکر اس میں موجود ہے۔ اس کے ابتدائی چند بندوں میں دہلی پر ابدالی کے حملے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے:

نہیں ہے مرثیے سے کم جہان آباد کا حال اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال
اگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال اگرچہ چرخ ستم گر یہ اس پہ لایا زوال
ہر ایک روئے ہے رکھ منھ پر ابر سے رومال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالت بستاں

نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں گزر گیا ستم افغان کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہوگیا یہ کشت سبز سب پامال
جہاں کی جان تھا یہ شہر جسم تھا عالم دیا اسی ہی کو عالم کا اس فلک نے غم
اب اس کے غم کی خرابی سے آہ مرتے ہیں ہم کدھر گئے وہ رفیق اور کدھر گئے ہمدم
کہ دور ہوتا تھا دیکھے سے جن کے رنج و ملال

پھر آگے چل کر حسرت نے مختلف طبقات کے افراد کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا بیان کیا ہے اور آخری بند میں اس تباہی اور بربادی کے اسباب پر بھی مختصر سی روشنی ڈالی ہے:

جہان آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ جو حسرت ایسے عمل کرتے ہم نہ نامہ سیاہ
پرائے مال پہ ناموس پر رکھیں جو نگاہ تو ان پہ کیوں کر نہ بھیجے بھلا غضب اللہ
ہمارے آگے ہی آئے ہمارے یہ اعمال

قائم چاند پوری کے صرف ایک شہر آشوب کا علم ہے[۵] جو کہ معرکۂ سکرتال ۱۷۷۲ء اور اس کے عواقب و اثرات پر مبنی ہے۔[۶] شاہ عالم نے مرہٹوں کے بھڑکائے جانے اور خفیہ طور پر اس کا ساتھ دینے پر، مرہٹوں کی معیت میں نجیب الدولہ کے پسر ضابطہ خان روہیلہ کو سکرتال کے مقام پر شکست دی تھی۔ لیکن روہیل کھنڈ کو شاہ عالم کے بجائے اپنے عین مقصد کے تحت مرہٹوں نے پے در پے تاراج کیا۔[۷] قائم اس وقت حصول معاش کی خاطر ٹانڈہ میں آکر مقیم تھے۔ ۱۷۷۲ء میں ٹانڈہ سکرتال کی بربادی کے نتیجے میں بری طرح متاثر ہوا۔ یہ شہر آشوب یہیں تخلیق ہوا تھا، جو اس طرح روہیل کھنڈ کا مرثیہ ہے۔ اس میں قائم نے مرہٹوں سے زیادہ شاہ عالم پر طنز کیا ہے اور اس کی سادہ لوحی کو اپنی ہجو کا نشانہ بنایا ہے کہ اس نے مرہٹوں کی سازش میں شریک ہوکر روہیلوں کی مستحکم قوت کو ختم کیا تھا۔ اس شہر آشوب کے کل ۳۴ بند ہیں، ان میں سے چند قابلِ ذکر ہیں:

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
لچا ایک آپ ساتھ لٹیری سپاہ ہے ناموس خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِ الٰہ ہے

لشکر میں مرہٹے کے جو کوئی رہے ہیں بند دیکھے ہیں ان کے ظلم کے سب پست اور بلند
اب نامِ فوج سن کے وہ بھاگیں ہیں جوں پرند سچ ہے کہ جس کو سانپ سے پہنچے بھی گزند
رسی کو جانتا ہے کہ مار سیاہ ہے

کفار کا بھی ملک جو لے ہے کوئی کہیں دے ہے امان خلق کو دشمن سے لے کہیں
بنیاد پر کسو نے یہ اب تک رکھی نہیں آثار کفر چست ہوں اکھڑیں ستون دیں
اے خانماں خراب یہ کیا رسم و راہ ہے

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلہ ڈوں دوش کس طرح سے میں ترتے میں بھلا
آخر گدھا پن ان کا ترا عذر خواہ ہے

کفار سے کیا ہے جو یہ آپ نے ملاپ حاصل تو کیا ہے اس سے مگر خلق کا شتاب
کیا آج پن سمجھتے ہو تم مرہٹوں کا پاپ پوجا کو کس گڈھ میں سدھاریں گے کل کو آپ
کہتے ہیں عنقریب ''گرو کا کڑاہ'' ہے

پر کیا کریں جو تنگی سے پہنچے یہ آگے کام دس دس دن ایک شخص کو مٹھی چنے حرام
گردش سے مثل بحر نہیں اک جگہ قیام جوں موج جو ہے پانوو سوجا تھپا تمام
جو سر ہے جوں حباب وہ یاں بے کلاہ ہے

مارے ہے جس سے ضابطہ خاں کی ادھر سپاہ آسوج کی تکیں ہیں مرہٹے ادھر سے راہ
بستی کے لوٹنے پہ روہیلوں کی ہے نگاہ ایک خلق ہے اسیر عجب مخمصے میں آہ
رہنے کا ہے مقام نہ جانے کی راہ ہے

مولوی عبدالحق نے لچھمی نرائن شفیق کے ایک شہر آشوب بعنوان ''حسب حال زمانہ'' کا حوالہ دیا ہے۔[۸] اس شہر آشوب میں جو اصلاً قصیدہ کے انداز میں لکھا گیا تھا، شفیق نے انقلاب زمانہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے محض یہ شعر دست یاب ہیں:

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سن ادھر کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ چھ صوبوں کے چھے تھے بادشاہ عادل اور فیاض صاحب عزم اور صاحب ہنر
ان کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے کیا رعایا کیا سپاہی کیا امیر نام ور
آسماں وو ہی اور وو ہی زمیں خلقت ہے وو پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

میر کے کلیات میں کوئی باقاعدہ شہر آشوب موجود نہیں۔ لیکن چند مخمس شہر آشوب کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ دو مخمسوں میں مجموعی طور پر لشکر کی ہجو کی گئی ہے۔ اس میں سپاہیوں کی مفلسی، بھوک اور بے

سرو سامانی کا ذکر ہے۔ لیکن معاشرے کی اقتصادی بدحالی اور درباری ماحول کی تصویر بھی نظر آ جاتی ہے۔ ایک کا عنوان ''در ہجو لشکر'' اور دوسرے کا ''در حال لشکر'' ہے۔ دونوں مخمسوں کے علی الترتیب چند بند ہی ایک زوال آمادہ سلطنت کے انتشار و انحطاط میں امرا اور سپاہ کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہیں:

جب کسی کو خدا کرے گمراہ　　آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس　　بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس　　چیتھڑوں بن نہیں کسی کے پاس
یعنی حاضر براق ہینگے سیاہ

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال　　کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال　　ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ وزیر سب قلاش

جے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر　　مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھ ٹکڑا اگر برابر ماش

چار بچے ہیں مستعد کار　　دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار　　لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار
سو بھی قند سیاہ ہے یا ماش

مجموعی طور پر سودا اور میر کے دور نے شہر آشوبوں کے اعتبار سے اپنے زمانے کی سیاسی صورت حال کی بہتر انداز میں عکاسی کی ہے۔ واقعات اور حالات کی عام تصویر اصل کے قریب نظر آتی ہے۔ اس دور سے قبل شہر آشوب اس قدر مکمل اور فنی خوبیوں کے ساتھ دست یاب نہیں۔ اس صنف کو توانائی اور اہمیت انھیں دو شاعروں کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں سودا کو یقیناً خصوصیت حاصل ہے۔ اپنے جوشِ بیان اور احساس کے لحاظ سے اس کے شہر آشوب دیگر شعرا سے ممتاز ہیں۔ اس کے شہر آشوب کا موضوع، ماحول اور منظر وسیع ہے۔ سودا نے ان میں حالات کے وہی اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے وہ خود بھی متاثر رہا ہے۔ اس خصوصیت کو اگر معیار سمجھ کر دیکھا جائے تو سودا کے

ساتھ ساتھ اس دور میں بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی ایک اور نام نظیر کا آتا ہے۔[9]

جرأت کا ایک مخمس جو ترجیع بند ہے، شہر آشوب کے موضوعات اور اس کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں شاعر نے زمانے سے گلہ کیا ہے کہ اپنے انقلاب سے اس نے امیروں کو فقیر اور مفلسوں کو امیر بنادیا ہے، اور یہی صورت شرفا اور کمینوں کے ساتھ پیش آئی ہے۔ مختلف مقامات سے اس کے چند شعر دیکھیے:

جنھوں کے گھر تھی امارت گھر ان کا ہے سونا
بنی گھر اس کے عمارت جو بیچے تھا سونا
لگا کے بیٹھے تھے جو خوانچہ کہائے ہے خان
بڑا گھر اس کا ہے بیت الخلا تھا جس کا مکان

معاملات میں اب اعتبار ان کا ہے
کہ جن کو کہتے تھے پدے کی ضامنی کیا ہے
جو بیچ کھاتے تھے کنجشک دام میں لاکے
کریں ہیں عرش پہ پرواز اب وہ چڑیا کے

ٹکڑ گداؤں کو دے چرخ منصب شاہی
جو گھس کھدے تھے وہ اوڑھیں دو شالۂ کاہی

شاہ کمال الدین کمال نے اپنے ''مخمس شہر آشوب'' میں اوائل اُنیسویں صدی کے لکھنؤ کی سیاسی حالت کو پیش کیا ہے۔[10] نواب وزیر علی خاں کی معزولی کے بعد ریاست اودھ جس قسم کے انقلابات اور حوادث کا شکار ہوئی تھی، اس شہر آشوب کا موضوع ہے۔ ساتھ ہی کمال نے اس میں انگریزوں کی سازشوں اوران کی ریشہ دوانیوں کو بیان کیا ہے۔ اہل وطن کی غداری کو بھی ظاہر کیا ہے اور مجموعی طور پر معاشرے کے اخلاقی انحطاط کو بھی نمایاں کیا ہے۔ شہر آشوب کافی طویل ہے۔ اس میں کمال نے ابتداء معاشرے کے مختلف طبقات کی معاشی بدحالی کو بیان کیا ہے۔ اور اس زبوں حالی کا پہلے زمانے کی خوش حالی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس انقلاب کے بعد مختلف طبقات پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے انھیں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس شہر آشوب کی ایک اہم خصوصیت جو دوسروں میں اس قدر واضح نہیں ہے، یہ ہے کہ اس میں کھل کر انگریزوں سے اپنی نفرت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اور صورتِ حالات کی تبدیلیوں، سیاسی زوال اور عدم استحکام و معاشرے کی مفلوک الحالی کا ذمہ دار انگریزوں ہی کو قرار دیا گیا

ہے۔ ریاست اُودھ میں اپنے قدم جمانے کے لیے سیاست کے میدان میں انگریزوں نے جو کچھ ریشہ دوانیاں کی ہیں، بڑی نفرت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ خاص خاص بند یہ ہیں:

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ　　کہ اپنے بخت سے رہتی ہے ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہے گرفتار یاں بہ قید فرنگ　　سکھ اور مرہٹوں نے وہاں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

ادھر تو قوم نصاریٰ ہے دائر و سائر　　ادھر ہیں دلّی میں سکھ اور مرہٹے کافر
سوائے کفر کب اسلام سے ہیں یہ باہر　　عدوئے دینِ محمد ہیں سب پہ یہ ظاہر
جو اہل دین تھے وہ سب ہو گئے ہیں اب بے کار

وہی یہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندوستان　　کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں　　نظر پڑے ہے بس اب صورت فرنگستاں
نہیں سوار رہے یہاں سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و شہنائی جھانجھ کی تھی صدا　　فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبا　　ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

کچھ ایسا ان پہ ہے غالب اب ان کا رعب و داب　　کہ نکلا پڑتا ہے دہشت سے ان کا بس پیشاب
یہ تھرتھراتے ہیں یوں دیکھ ان کو وقت عتاب　　کہ گاؤ کانپے ہے جوں دیکھ صورت قصاب
بڑے بڑے جو کہاتے ہیں یاں سپہ سالار

نہ ہوئے دیکھ کے کیوں کر دل اپنا اب مغموم　　ہو جب کہ جنے ہما آن آشیانہ بوم
وہ چھپ کے تو بس اس ملک میں ہیں سب معدوم　　فرنگیوں کے جو حاکم تھے ہو گئے محکوم
تو ہم غریبوں کا کچھ کیا ہے یہاں شمار و قطار

نظیر کے کلیات میں کئی مسدس اور مخمس شہر آشوب یا اس کی خصوصیات سے حامل ہیں۔ ایک طویل مخمس شہر آشوب کے عنوان سے ان کے کلام میں شامل ہے۔ یہ شہر آشوب نظیر کے عہد میں آگرہ کی اقتصادی بدحالی، معاشرتی بے چینی، خستہ حالی اور بے روزگاری کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس میں نظیر نے اپنے دور کے ان سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اس قسم کی صورتِ حال کا سبب تھے

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند　　رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند

دریا سخن کی فکر ہے موج دار بند ہو کس طرح نہ منہ میں زُباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو کاروبار بند

پھر آگے چل کر نظیر نے آگرے کے مختلف پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیر زادوں کی پریشان حالی تفصیل سے بیان کی ہے:

کیا چھوٹے کام والے کیا پیشہ ور نجیب روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
پیشہ وروں کی کثرت اور تعداد کے لیے نظیر نے چھتیس کا لفظ استعمال کیا ہے
چھتیس پیشہ والوں کا ہے کاروبار بند

عام پیشہ وروں کی معاشی بدحالی کے ذکر کے علاوہ نظیر نے سپاہ کی کس مپرسی اور امیروں کی زبوں حالی کو بھی بیان کیا ہے۔ آگرہ کے اقتصادی اداروں، کارخانوں کے بند ہونے سے بے روزگاروں میں جو اضافہ ہوا، اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ آخری بند میں شہر کی عمارتوں کی بربادی اور باغوں، چمنوں کی افسردگی پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان بندوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگرہ کی یہ اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری ملک کی عام معاشی ابتری ہی کا ایک نمونہ تھی:

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغبان سے ہر ایک باغ کا تباہ وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغبان ہو نہ مالک نہ خاربند

کیوں یارو اس مکان میں یہ کیسی چلی ہوا جو مفلسی سے ہوش کسی کا نہیں بجا
جو ہے سو اس ہوا میں دوانہ سا ہو رہا سودا ہوا مزاج زمانے کو یا خدا
تو ہے حکیم کھول دے اب اس کے چار بند

نظیر کے اس شہر آشوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طبقۂ امرا کے بجائے عام پیشہ وروں کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ عام طور پر اس سے قبل کے شہر آشوبوں میں انقلاب زمانہ کے تعلق سے طبقۂ امرا کے لاچار و بے بس ہونے، نااہلوں کے فروغ، شرفا کی ابتری اور سپاہ کی بدحالی کا بیان ہوتا تھا۔ یہ شہر آشوب اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اس میں نچلے اور متوسط طبقے کی زبوں حالی کا ذکر ہے۔ غالباً اُردو شاعری میں یہ پہلا موقع ہے کہ جہاں کسی نظام کی آسودہ حالی کا دارومدار ان دست کاروں اور پیشہ وروں پر رکھا گیا ہے جن کی تباہی دراصل پورے نظام معیشت کی تباہی ہے۔[۱۱]

نظیر کی کچھ اور نظموں میں بھی شہر آشوب کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک مخمّس بعنوان

''در بیان تماشائے دنیائے دُوں'' مخصوص انداز میں معاشرتی حالت کا ایک مرقع ہے۔ اس میں سیاسی قوت کے زوال اور انتشار سے متاثر معاشرے میں تہذیبی اقدار کی تبدیلیوں کی تصویر ہے:

جدھر کو دیکھو ادھر اک نیا تماشا ہے

عزیز تھے سو ہوئے چشم میں سبھوں کے حقیر حقیر تھے سو ہوئے سب میں صاحب توقیر

عجب طرح کی ہوائیں ہیں اور عجب تاثیر اچنبھے خلق کے کیا کیا بیاں کروں میں نظیر

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

نظیر کی شاعری کا ایک اہم موضوع اقتصادیات ہے جو ان کے کلام میں دوسرے موضوعات کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ اُنھوں نے اس موضوع پر نہ صرف مخصوص نظمیں لکھیں بلکہ اس موضوع کو بعض مناظر فطرت اور سماجی تقریبات پر مبنی نظموں میں بھی بیان کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر نے اپنے زمانے کے ہر پہلو کی عکاسی کی ہے۔ اس وقت چوں کہ سیاسی انتشار کے باعث معاشی بدحالی اور بے روزگاری انتہا کو پہنچ گئی تھی، نظیر نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے معاشرے کی اس حالت کو زیادہ اہمیت دے کر بیان کیا ہے۔ ان کی مختلف نظموں کے چند شعر یہ ہیں:

کیا تونگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بالکا سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں روٹی کے واسطے آپس میں خون کرتے ہیں روٹی کے واسطے

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانا کہ کچھ حرام جو جس سے ہو سکا سو کیا پیٹ کے لیے

(ج) قصیدہ

قصیدے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک مدح اور دوسرا ہجو۔ نفسیاتی اعتبار سے ایک فرد کے لیے وہ دور عجیب تضاد کا حامل تھا۔ اس میں سکون اور انتشار اور امارت وغربت کا فرق پوری طرح موجود تھا۔ شاعر جب دربار میں پہنچتا تھا یا کسی امیر کے آستانے پر حاضر ہوتا تھا تو قصیدے کے ذریعے اپنی احتیاجات کو بروئے کار لا کر ممدوح کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن چوں کہ ممدوح خود

زوال پذیر حالات کا شکار ہوتا اور وہ مدد نہ دے سکتا تو لامحالہ شاعر کو دربار سے آ کر زندگی کی ناہمواریوں سے متصادم ہونا پڑتا۔ اس طرح وہ خود کو زمانے کے زوال آمادہ رجحانات سے بلند و بالاتر تصور کر کے ان کو ہدفِ طنز بنانے پر مائل پاتا تھا۔ پھر اس ایذا رسانی کے جذبے نے بھی دو صورتیں اختیار کیں۔ ایک وہ جب شاعر اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی برتری کے احساس کو قائم رکھنے کے لیے شخصی سطح پر طعن و تشنیع کے عمل میں مبتلا ہوتا۔ اور دوسری وہ جب غیر شخصی سطح پر زمانہ کے زوال آمادہ رجحانات اور شکست و ریخت کے عمل کو طنز کا نشانہ بناتا۔ پہلی سطح پر جو ہجویات لکھی گئیں، عام اخلاقی معیار کے اعتبار سے قابلِ اعتراض ہیں اور دوسری سطح پر وہ ہجویات لکھی گئیں جو دراصل معاشرے کی ناہمواریوں پر بھرپور طنز کی حامل تھیں۔

سودا کے کلام میں ہجو کی یہ دونوں صورتیں موجود ہیں۔ موضوعِ زیرِ بحث کے تحت یہاں دوسری صورت ناقابلِ ذکر ہے۔ اس لحاظ سے سودا کا ایک قصیدہ ''در ہجو اسپ المسمّی بہ تضحیک روزگار'' خاصی اہمیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اس میں سودا نے معاشی بدحالی، حکومت کی بدانتظامی اور سپاہ کی کس مپرسی کا مذاق اڑایا ہے۔ اس میں سودا نے ''گھوڑے'' کو ایک خاص علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ''گھوڑا'' مغل فوجی نظام میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اگر گھوڑوں کی حالت اچھی ہوتی تو فوج کے اچھے ہونے کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی سے حکومت کی خوش انتظامی اور استحکام کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اس طرح خراب گھوڑے حکومت کے عدم استحکام کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ یہ قصیدہ فوجی نظام اور حکومت وقت کا مرثیہ ہے۔ شروع میں سودا نے ان افراد کا ذکر کیا ہے جن کے اصطبل میں عربی اور عراقی گھوڑوں کا شمار نہیں ہوتا تھا اور آج وہ کوڑیوں کے محتاج تھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اپنے ایک دوست کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ایک مردہ گھوڑا رکھ چھوڑا تھا، جن کو فوج سے سو روپے ماہ وار تنخواہ ملتی تھی۔ ایک دن سودا نے ضرورتاً ان سے گھوڑا طلب کیا تو اس نے سودا کو باز رکھنے کے لیے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ جس دن دہلی پر مرہٹوں نے حملہ کیا (۱۷۳۷ء) تو وہ بھی اس گھوڑے پر سوار ہوکر بدقت تمام میدان جنگ میں پہنچا لیکن جب مخالف کے مقابل گھوڑا ڈپٹاتا تو یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا آخر کار اسے گھوڑا بغل میں مار کر اور جوتیوں کو ہاتھ میں لے شہر کی طرف واپس بھاگنا پڑا۔

دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ　　　مجھ سے کہا نقیب نے آ کر ہے وقت کار
مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ　　　ہوکر سوار اب کرو میدان میں کار زار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین　　ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں　　دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ　　تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے تو بڑا اسے دکھلائے تھا سئیس　　پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا روبراہ　　ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار

جنگ کا منظر زیادہ عبرت انگیز تھا:

گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست وضیعف و خشک　　کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار
آتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس سے حریف پر　　دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں نے کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل　　لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف　　القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

سودا کے معاصرین میں میر نے بھی ہجو کے ذریعے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ میر نے خارجی حالات و واقعات کو داخلی جذبات اور احساسات کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ میر کے دو مخمسوں میں جو مختلف اشخاص کی ہجو میں ہیں، ملکی حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے، اور ان کا اہم عنصر معاشی بدحالی ہے۔ یہ دونوں مخمس دو سرکاری اہل کاروں کی ہجو میں ہیں۔ ایک بلاس رائے کی ہجو میں اور دوسرا ''شیخ جی'' کی ہجو میں۔ دونوں اشخاص نے کسی سلسلے میں میر کی کچھ رقم کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ میر جو فکر معاش میں پریشان تھے، بار بار ان افراد کے در پہ حاضری دیتے رہے، لیکن انھیں مایوس ہی رہنا پڑا۔ ان مخمسوں کے مطالعہ سے اس دور کی اقتصادی ابتری، نظم و نسق کی خرابی اور دفتری حالت میں لاپرواہی کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ چند بند قابلِ ذکر ہیں:

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری　　اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری　　فوج ہے بھی تو قحط کی ماری
کیوں یہ جس جا رہے ہیں واں تھا کال

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں　　لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

(د) قطعہ

شہر آشوب اور قصیدہ کی طرح قطعات میں بھی ملکی حالات پر مبنی موضوعات نظر آتے ہیں۔ ایسے قطعات جو غزل کے ضمن میں آتے ہیں، ان کا مضمون کم وبیش یکساں ہے۔ اس میں بھی وہی مضامین، جن میں زمانے کی شکایت، ملکی حالات کا بیان، معاشی بدحالی اور بے روزگاری کا اظہار ہو، نظر آتے ہیں۔ جیسے:

سودا:

میں نے یہ سودا سے کہا ایک دن غم تیرا کیا سینے میں گھر کر گیا
سن کے کہا جو کوئی آیا سو یاں سیر باندازِ دگر کر گیا
ایک جو مانند گل اس باغ سے خرم و خنداں ہو گزر کر گیا
کیا تجھے اب فائدہ اس ذکر سے ہر کوئی اک طرح بسر کر گیا

سودا کے دو اور قطعات "امور سلطنت کے بارے میں" اور "دربیان پہرہ" خصوصاً سیاسی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلے قطعہ میں سودا نے واضح طور پر حکایت کے انداز میں مغل حکمرانوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا ہے، جن کے ادا کرنے سے ملک کی صورتِ حال سنبھل سکتی تھی، جس میں ہر طرف نظم ونسق کی کمی وانتشار، بے چینی، اور اقتصادی بدحالی کا دور دورہ تھا:

امور ملک میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم گدانوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل پہ جس دم سریر آرا ہو ہر ایک خورد و کلاں میں برابری جانے
وہی ہو رائے مبارک میں اس کے گوشہ نشیں کہ جس میں عامہ خلقت کی بہتری جانے
ملازموں سے نہ لاوے یہ اس کو برسرکار کہ جس سے کارخلائق کی ابتری جانے
چمن ہے ملک ورعیت ہے گل انھیں کے لیے بسان ابر بسر سایہ گستری جانے
ہمیشہ جودوکرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر مساوی از امرا تا بہ لشکری جانے
بجا جو طرح سپاہی دے اس کو سمجھے مرد نہ یہ کہ مرنے کو بے جا سپہ گری جانے
جو شخص نائب داور کہائے عالم میں یہ کیا ستم ہے نہ آئین داوری جانے
سوائے ان سخنوں کے جو تاج زریں کو خیال اپنے میں سر دھر کے سروری جانے
یہ فخر تاج تو یوں نزد فہم ہے جس طرح خروس آپ کو سلطان خاوریٔ جانے

دوسرا قطعہ ملک کی عام بے چینی، انتشار، لوٹ مار، ظلم وستم، افراتفری، اور قتل وغارت گری کے

تدارک میں ''پہرہ'' کے نفاذ سے متعلق ہے۔ اس میں ''پہرہ'' کے عمل کو نشانہ بنا کر سودا نے اس وقت کی بدامنی، شورش اور بے اطمینانی کی حالت پر طنز کیا ہے:

کیا یہ پہرہ ہے کہ ہے سارا جہاں پہرے میں　　بے خطا پیر سے لے تا بہ جواں پہرے میں
اس زمانے کا جو دیکھا تو ہے الٹا انصاف　　گرگ آزادر ہیں اور ہوں شباں پہرے میں
سب جگہ قید گنہگار پہ ہوتی ہے ولے　　بے گناہوں کے تئیں دیکھا یہاں پہرے میں
ہاتھ خالی پڑے پھرتے ہیں سپاہی بیکار　　ڈھال تلوار گرو تیر و کماں پہرے میں
کیا کریں بیٹھیں نہ بے مارے دیے ہاتھ پہ ہاتھ　　جابجا بند ہے بازار دکاں پہرے میں
بیم و امید سے ہے اہلِ تجارت فارغ　　پڑ گئے ایک جگہ سود و زیاں پہرے میں
نہیں مقدور کوئی کھائی سے باہر نکلے　　بس کہ ہے شہر کا ہر خرد و کلاں پہرے میں
الغرض جو کوئی اس وقت میں ٹک دوڑ چلا　　اس کے حق میں ہے یہی حکم کہ ہاں پہرے میں

اس کا مقطع اس وقت کے حکمرانوں کے رویہ کو خوب ظاہر کرتا ہے:

آگے اب بولنا کچھ خوب نہیں ہے سودا　　کہ یہاں بولتے پڑتی ہے زباں پہرے میں

میر کا بھی ایک قطعہ ماحول سے پیدا ہونے والے احساس ناپائداری، بے ثباتی اور زمانے کی شکایت اور بے زری کے گلے کا حامل ہے:

بے زری کا نہ کر گلہ غافل　　رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے　　وقت رحلت کس کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال　　اک ازاں جملہ ایک سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں　　ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر　　چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا　　ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

قاضی غلام احمد جو ٹیپو سلطان کے زمانے میں درالسلطنت کے قاضی تھے، شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی ایک کتاب خلاصہ سلطانی عقائد و شریعت سے متعلق ہے۔ اس میں ایک مختصر قطعہ ٹیپو سلطان کی مدح میں ہے۔[1]

او شہ کہ جن کی فتح جہاں میں ہیں آشکار　　تیغ ان کی دشمناں کے یو سر کوں کرے شکار
روشن کیے ہیں دین کو توڑے ہیں کفر کو　　کفار ان کے عصر میں ہیں یوں ذلیل و خوار

ہیبت سوں ان کے شاہ فرنگوں کا دل جگر — ٹپکے کہ جیوں کہ شیشہ سیں یاقوت خام کار
شاہ جہاں ہے اور ٹیپو سلطان دین کے — عالم کو ان کے فیض سوں راحت ہے بے شمار

نشان حیدری کے مصنف سیّد حسین علی کرمانی المتخلص بہ حاکم نے جو ٹیپو سلطان کے مصاحب اور وقائع نگار تھے اور جن کی فارسی تاریخیں ٹیپو سلطان کے گنبد کی سنگین دیواروں پر کندہ ہیں، ٹیپو سلطان کا مرثیہ اُردو زبان میں لکھا تھا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اے فلک بس تو سفلہ پرور ہے — نیک بدخواہ و کینہ آور ہے

اس کے بعد دیگر شعر یہ ہیں:

حامیِ دین و اہلِ اسلام آہ — صاحب تاج اور افسر ہے
اس پر روتے ہیں سب زمین و زماں — پر الم کہتر اور مہتر ہے
جب اٹھا جگ سے وہ شہ باشرع — زندگی آج کس کو خوش تر ہے
نام پوچھا میں اس سے با تاریخ — کون یہ شاہِ نام آور ہے
بولے مجھ کو بہ نالہ سر کو پیٹ — ٹیپو سلطان شہید اکبر ہے

۱۲۱۳ھ

مذکورہ بالا نظمیں ٹیپو سلطان کی مدح میں لکھی گئی تھیں لیکن یہ اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان میں ایک عظیم اور جری شہنشاہ کا ذکر ہے اور دوسرے اس کے کارناموں کے تعلق سے شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً اوّل الذکر قطعہ جس میں شاعر نے کفار اور فرنگیوں کے مقابلے میں ٹیپو سلطان کی مساعی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ٹیپو سلطان نے فوجی تنظیم پر جو کتاب فتح المجاہدین مرتب کروائی تھی اس میں فوجی اصطلاحات اور جنگ کے طور طریق پر روشنی ڈالی گئی تھی اس کا مرتب زین العابدین شوستری تھا۔ اس میں فوجی نغموں کا تذکرہ بھی تھا، جن کے لیے وقت کی رعایت سے مختلف راگ مقرر کیے گئے تھے۔[۲] ان راگوں کے لیے جو گیت تجویز کیے تھے ان کی زبان اُردو تھی۔[۳] اس کے چند نمونے یہ ہیں:

ملک ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے
غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سیں تجھے
بارگاہ قدر کا دارا ترا دربان ہے

ہے وہی انسان کامل جس میں ہے معنی کو بو
نقش دیبائی وگرنہ صورت انسان ہے

فرنگ و زنگ تیری تیغ سے کیوں کر نہ لرزاں ہو
کہ جس کے خوف دم سے برق ہردم پابہ داماں ہو
دعا کرتا ہے ہر اک مور جس وادی سیں تو گزرے
کہ یارب یہ جہاں داور زمانے کا سلیماں ہو
اب ہر زرہ سے یہ لفظ نکلے ہے بصد آمیں
فلک پر مہر ہے جب تک زمیں پر ٹیپو سلطاں ہو

نظیر کا ایک قطعہ ''شہرآگرہ'' پر ہے۔ بظاہر تو نظیر کی ساری نظموں کا ماحول آگرہ سے متعلق تھا، لیکن اس وقت کے سارے برِعظیم کی حالت اس سے مختلف نہ تھی، جو آگرے میں تھی۔ نظیر کے اس قطعہ سے آگرے کی تاریخی اہمیت سے بڑھ کر اس کی اس حالت کا اندازہ ہوتا ہے جب وہ سیاسی جوڑ توڑ کے نتیجے میں، خصوصاً جاٹوں کے حملوں کے بعد زوال اور اقتصادی بحران کا شکار ہوا:

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ ۔۔۔ اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ
یاں کے کھنڈر نہ اور جگہ کی عمارتیں ۔۔۔ یارو عجب مقام ہے دل شاد آگرہ
شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو ۔۔۔ گر جانتا کہ ہووے گا آباد آگرہ
توڑے کوئی قلعہ کو کوئی لوٹے شہر کو ۔۔۔ اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ
ایک بارگی تو اب مجھے یارب تو پھر بسا ۔۔۔ کرتا ہے اب خدا سے یہ فریاد آگرہ

(ہ) مثنوی

مثنوی میں محض چند شعرا نے ملکی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے۔ اُردو مثنوی کی تاریخ میں، بنی ادب کی تاریخ سے قطع نظر، شمالی ہند میں مثنویوں میں سیاسی حالات کی ترجمانی کسی خصوصیت کی حامل نہیں رہی۔ دکن میں بھی پہلے جیسی صورتِ حال کے نہ ہونے کی وجہ سے مثنویوں میں سیاسی موضوعات کا اظہار ناپید ہے۔ دورِ زیرِ نظر میں ابتداءً ''سورنامہ'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں بھی فنی خوبیوں اور واقعات کی پیش کش کے اعتبار سے وہی مقام قابلِ ذکر ہے جس میں سراج الدولہ اور شوکت جنگ کی جنگ بلدیہ باڑی، کا منظر بیان کیا گیا ہے۔[1] درمیان کے چند شعر یہ ہیں:

پھر دیں کے اوپر فتوحان ہو لڑائی کے ہمان
سیام سندر نے توپیں ڈاکا بیچ منہاری کے میدان
پہلے چھوٹی چھوٹی توپیں تب توں چھوٹی بڑی کمان
گولی تیر تب چھوٹن لاگے لاگے جھوش اور کمان
گولی برسی بوند ساون تروار چلی گھمسان
میاں رشیدا تب کھیت موں کودا اور سپاجان چوں سورماں
تیر کمان تب ہاتھ کرلیا کھینچ کر مارا کر نشان
دانتوں اوپر کھاو بیٹھا سہری ڈوپا پھر پیکان
تس کے آگے نالہ آیا موت کا تھا وہ مکان
یک سلح میں زخمی ہووے شیخ جہاں یار ہادی خاں

یہی وہ جنگ تھی جس میں رام نرائن موزوں نے عظیم آباد کی فوج کے ساتھ سراج الدولہ کی مدد کی تھی۔ سراج الدولہ اور اس کے مقصد سے اسے بڑی لگن تھی۔ چناں چہ سراج الدولہ کی شہادت سے اس پر بڑا اَلم ناک اثر ہوا اور وہ اپنے ہوش وحواس کھوکر دیوانہ وار ویرانوں میں پھر کر یہ شعر پڑھتا رہتا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ایسے ہی ایک شاعر میر مدن بیتاب تھے۔ یہ سراج الدولہ کے میر بخشی تھے اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔[۲] تاریخی واقعات پر مبنی مثنویوں میں کچھ مثنویاں جنگ دوجوڑہ کے واقعہ پر لکھی گئی تھیں مثنوی معظم، جنگ نامہ تسلیم، نظم عبدو، نظم ضامن اسی سلسلے کی مثنویاں ہیں، جو اُردو میں کہی گئی تھیں۔[۳]

سودا نے اپنی مثنوی میں جو ہجو کے انداز میں لکھی تھی ''در ہجو شیدی فولاد خاں'' میں اس زمانے کے نظم ونسق پر پولیس کے تعلق سے طنز کرتے ہوئے ماحول کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو سودا کی دیگر مذکورہ ہجویات میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کی یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے، جس میں شیدی بدیع الزماں جس کو فولاد خاں کہا جاتا تھا، کوتوال شہر کی ہجو کی گئی ہے۔ سودا نے کھلے لفظوں میں اس کی بدانتظامی، بے ایمانی، رشوت ستانی، رہزن پروری کی مذمت کی ہے اور ساری بدنظمی کا ذمہ دار کوتوال ہی کو قرار دیا ہے:

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال سیّدی فولاد اب جو ہے کتوال
چور کب اس کا زور مانے ہے کالا بال اپنا اس کو مانے ہے
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
شام سے صبح تک یہی ہے شور دوڑیو گٹھڑی لے چلا ہے چور
آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے چور کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے
آسماں پر بھی مستعد ہے خواب کھلا رہتا ہے دیدۂ مہتاب

ٹیپو سلطان کے دور کے ایک شاعر حسین علی عزت نے فتح نامہ ٹیپو سلطان میں سلطان شہید کی ایک جنگ کا چشم دید حال لکھا ہے۔[۴] یہ جنگ انگریز، نظام اور مرہٹوں کی اتحادی افواج سے ہوئی تھی، جس کا نتیجہ صلح کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس مثنوی کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

عجائب سنو دوستاں داستاں کہ جس کے بیان میں ہے قاصر زباں
مرہٹہ، مغل فوج سب جمع کر خوشی سات سلطاں کے سن یہ خبر
کیے سب نے یوں شرط سوگند سات لیویں ملک جلدی یوں اب پانے ہات

ٹیپو سلطان ہی کے دور میں ایک اور اُردو مثنوی عروس المجالس لکھی گئی تھی۔ اس کا شاعر قاضی غلام قاسم تھا۔ یہ ٹیپو سلطان کی شہادت سے چار سال قبل ۱۲۰۵ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔[۵] اس وقت دہلی کے تخت پر ظفر شاہ غازی متمکن تھا۔ اور مرکز میں شدید بد نظمی پھیلی ہوئی تھی۔

سنہ ہجری تھی بارہ سو اوپر نو اتھا سلطان عادل ٹیپو خسرو
مظفر شاہ غازی کا زمانہ لکھا جب یو عروس جاودانہ
کہوں کیا اس کے فرزند گرامی ہوا ہے فتح حیدر جگ میں گرامی
رکاب اندر ظفر اس کے روا ہے فتح مندی اسی کی ہم عناں ہے

(۱) شعرا کا ماتم دہلی ۱۸۰۳ء تک

زیرِ نظر دور میں برِّعظیم کا مرکز سلطنت دہلی تھا۔ سلطنت کا مرکز اور محور اس کا دارالسلطنت ہوتا ہے۔ انتظام سلطنت کے تعلق سے ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور ثقافتی طور پر بھی یہ شہر دوسرے تمام شہروں کے مقابلہ میں مرکزی اور نمایاں حیثیت اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مغلوں نے اپنی خوش ذوقی کے طفیل فنِ تعمیر کے اعتبار سے دہلی کو ایک ''مرقع'' کی شکل دے رکھی تھی اور اپنی علم پروری، فن نوازی اور

حوصلہ افزائی کے باعث مختلف مقامات کے فن کاروں، ہنرمندوں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو یہاں جمع کرلیا تھا۔ مختصر یہ کہ محمد شاہ رنگیلے کے وقت تک دہلی کے جو ''کوچے'' گلزار کی ''روشوں'' سے خوب صورتی میں کسی طرح بھی کم نہیں تھے اور ہر ایک ''کوچہ''، ''دل آویز زلف'' کے مانند تھا اور جس کے ہر محلّہ میں ''بلبلوں'' کی ''شورانگیزی'' تھی۔ نادر شاہ کے حملے اور قتل عام کے بعد اسے ایسی نظر بد لگی تھی کہ ''زلف بتاں'' کے مانند پریشان حال تھا۔[1]

اس وقت تک دہلی کی بربادی کا ذکر مختلف مورخوں، ادیبوں اور شاعروں نے کیا[2] اس وقت کے ایک شاعر خواجہ برہان الدین عاصمی نے اس تاثر کا اظہار کیا تھا:

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور و غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغبان رو رو کے یہاں غنچہ تھا وہاں گُل تھا

نادر شاہ کا حملہ دہلی کے لیے پہلا بڑا اور سنگین حادثہ تھا اور پھر اس پر متواتر مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور افغانوں کے حملے ہوتے رہے۔ ہر حملہ کے بعد اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور یہ شہر مسلسل تباہیوں اور بربادیوں کا شکار نظر آنے لگا۔ اس صورت میں انتظام سلطنت کا درہم برہم ہونا، امن و امان کا مفقود ہونا اور اخلاقی ابتذال کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ روزگار کا سکون طبقۂ امرا کو حاصل نہ تھا تو دوسرے نچلے طبقات کا کیا مذکور۔ یہ صورت تو اس وقت تک برقرار تھی جب تک کہ سلطنت دہلی پر مغل حکمرانوں کا اختیار باقی تھا اور جب ۱۸۰۳ء میں یہ اختیار انگریزوں نے چھین لیا تو پھر بعد کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبۂ آزادی اور جذبۂ حُبّ الوطنی قدر مشترک کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ اس نے برِّعظیم کے وجدانی تصور کے واضح کرنے میں مدد دی۔ اس تصور کے لیے اس وقت دہلی علامت کے طور پر استعمال ہوسکتی تھی چناں چہ اُنھوں نے اپنے ملک کی محبت کو دہلی سے منسوب کردیا۔ اس دور میں لکھے جانے والے شہر آشوبوں میں جذبہ مرقوم ہے۔ دہلی کی تباہی کا مذکور مختلف شعرا کے کلام میں آیا ہے۔

میر کے کلام میں دہلی کی نوحہ خوانی دوسرے شاعروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ میر کے بارے میں مشہور ہے کہ اُنھوں نے غزلیں نہیں کہیں، دل اور دلی کے مرثیے کہے ہیں۔ یہاں کی ہر گلی ان کے لیے ''ہفت اقلیم'' تھی۔ اس شہر کو ''طلسمات'' اور یہاں کے کوچوں کو ''اوراقِ مصور'' کہتے

ہیں[۲۳] ان کی اس قبیل کے چند شعر یہ ہیں:

دلی تھی طلسمات کی ہر جاگہ میر ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا نہیں دیکھا
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے پھیلا تھا اس طرح کا ہے کو یاں خرابا
اب خرابا ہوا جہاں آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
جس جا کہ خس و خاک کے اب ڈھیر پڑے ہیں واں ہم نے ان آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے دل خرابا جیسے دلی شہر ہے
کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا یک بارگی
جہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں وہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

اور میر کا وہ مشہور قطعہ جو نہوں نے لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر نے ایک مسلسل غزل میں دہلی کا ایک انتہائی وحشت ناک منظر پیش کیا ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک کافر کا بھی گزر الٰہی ادھر نہ ہو
یک جا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ جس میں بجائے نقش قدم چشم تر نہ ہو
ہر اک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے ہاں یاں کوئی شہید محبت کا سر نہ ہو
چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدانِ عشق ہیں تیرا گزار تاکہ کسو نقش پر نہ ہو
لیکن عبث نگاہ جہاں کریے اس طرف امکان کیا کہ خون مرے تا کمر نہ ہو

سودا نے دہلی کی تباہی پر ایک قطعہ بند غزل میں مرثیہ کہا تھا۔ چند شعر یہ ہیں:

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے سوکھی پڑی ہیں روشیں خاک اڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس وخار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ تو گل ہنستا تھا اشک شبنم کے بھی قطرہ کا نہیں واں آثار

غزل کے علاوہ دوسری نظموں میں بھی دہلی کی بربادی کا نوحہ کیا گیا ہے لیکن یہ شہر آشوبوں کی شکل میں موجود ہے، ان کو پڑھ کر شعرا کے ان احساسات کو محسوس کیا جاسکتا ہے جو دہلی کی تباہی اور بربادی کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کا بڑی حد تک شہر آشوبوں کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں نموتاً سودا کا درج ذیل بند ان تمام کی نمایندگی کرسکتا ہے:

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھی کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

اُردو شاعروں نے دہلی کے زوال کو محض دیکھا ہی نہیں، اس کے عواقب سے وہ متاثر بھی ہوئے تھے۔ افغانوں، جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں، انگریزوں کے حملوں میں اُنھوں نے دکھ اٹھائے اور صدمے برداشت کیے تھے۔ وہ خود بے زری اور معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ مصحفی کا یہ شعر بڑا معنی خیز ہے:

کوڑی کوڑی بکتے ہیں گل کشور دہلی کے بیچ
حسن کے مالک جو تھے وہ ایسے ارزاں ہو گئے

میر کی طرح سے مصحفی نے بھی دہلی کے زوال کے اثرات کو بڑی شدومد سے بیان کیا ہے۔ ان کے ایک قصیدے کے یہ چند شعر دیکھیے:

اطراف میں دلی کے یہ لٹھ ماروں کا شور　　جو آوے ہے باہر سے وہ بہ شکستہ وہاں ہے
اب پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے　　باشندہ جو وہاں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے
اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم　　چوروں کی وہاں سیندھ سے ایک نگراں ہے
بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے وہاں کا　　ہر روز نیا قافلہ پُورب کو رواں ہے
ہر وقت تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں ان سے　　بس قلعہ کے نیچے ہی تک امن و اماں ہے
اس شہر کے باشندوں سے جاکر کوئی پوچھے　　جز خون جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے
بت خانہ و مسجد میں جو پھیلی ہے خرابی　　ناقوس کا نالہ نہ موذن کی اذاں ہے
احوال سلاطین کی لکھوں کیا میں خرابی　　یعنی یہ عید اب ان کو لب و ناں ہے
گل جائے زباں میری کروں ہجو گر اُن کی　　یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بیچاروں کے اوپر　　جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہ رمضاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک　　ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے

(۲) دبستانِ لکھنؤ

لکھنؤ نے اپنی تہذیب کی ارتقائی منزلیں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دورِ نیابت میں طے کیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور تک لکھنؤ کی تہذیب اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس تمام عرصہ میں دہلی کی سلطنت مغلیہ کے زوال میں ایک مستقل تسلسل قائم رہا۔ اطراف دہلی میں چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں دہلی کے افتادگان کے لیے پناہ گاہ ہو سکتی تھیں۔ چناں چہ شعرا کی اکثریت نے وہاں سے ہجرت میں عافیت سمجھی۔ بیشتر نے زیادہ خوش حالی اور قربت کی وجہ سے لکھنؤ کو منتخب کیا۔

خان آرزو، سودا، میر، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین، میر سوز مشہور مہاجر شعرا ہیں۔ ان میں خان آرزو، سودا، میر، دبستان دہلی کے نمایاں شاعر تھے۔ جرأت، انشا اور رنگین کی شاعری کی ابتدا اگرچہ دہلی میں ہوئی مگر انھیں عروج لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ ناسخ، آتش، اور مصحفی نے تو یہاں ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سے جو شعرا انقلابات زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کر لکھنؤ میں آباد ہوئے ان کے پیش نظر دہلی کی بربادی اور بدحالی کے تجربات تھے اور وہ جن شعری روایات کے حامل تھے ان میں داخلیت کا رجحان اور اس کے اسباب کی کسک زیادہ تھی۔ اپنی پختگی کی انتہائی حد پر اس مزاج کو بدلنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چناں چہ ابتداء تو لکھنؤ میں دہلی کے دبستان کی روایات محسوس ہوتی رہیں لیکن بعد میں خارجی زندگی کی دل کشی نے خصوصاً جرأت، انشا اور رنگین جیسے نوجوان شعرا کو لبھانا شروع کیا۔

اودھ کے حکمران، جنھوں نے بڑے بڑے شاعروں کو اپنے دربار میں جگہ دی سب ہی شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔[۱] آصف الدولہ صاحب دیوان شاعر تھا۔[۲] آصف الدولہ کا جانشین وزیر علی بھی شعر کہتا تھا، وزیر اس کا تخلص تھا۔[۳] نواب سعادت علی خان بھی گاہے گاہے شعر کہہ لیتا تھا۔[۴] غازی الدین حیدر مرثیہ و منقبت کا شاعر تھا۔[۵] نصیر الدین حیدر بھی شاعر تھا اور بادشاہ تخلص رکھتا تھا۔[۶] محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر نہیں ملتا لیکن واجد علی شاہ نے ان دونوں کی تلافی کر دی تھی۔[۷] اختر تخلص تھا اور کلام میں غزل، قصیدے، مثنوی، مرثیے، نوحے، سلام، رباعی، قطعات حتیٰ کہ ٹھمری، کبت، دوہے سب ہی موجود ہیں۔

یہ بات نہیں کہ ریاست اودھ ہمیشہ سیاسی طور پر مستحکم اور خود مختار رہی ہو اور وہاں سیاسی اور معاشرتی ہل چل پیدا نہ ہوئی ہو۔ آصف الدولہ کے دور تک انگریزوں کی نظریں اودھ پر مرکوز ہو چکی تھیں اور اُنھوں نے مختلف چال بازیوں کے ذریعہ آصف الدولہ، سعادت علی خان، غازی الدین حیدر کو اپنی

مرضی کا پابند بنالیا تھا۔ چناں چہ ایک مرحلہ پر سیاسی امور سے بڑھ کر اپنے نجی معاملات میں بھی اودھ کا حکمران ان کی دخل اندازی روکنے پر قادر نہ رہا۔ ان ریشہ دوانیوں سے قطع نظر اودھ کے نظام سلطنت میں خود بھی کمزوریاں پیدا ہوتی جارہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے عمال برسرِاقتدار آجاتے جو اہلیت سے عاری ہوتے اور محض سفارشات اور تعلقات کے بل پر منصب حاصل کرکے نظم ونسق کو زیروزبر کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ غداری، درباری سازشیں، رکیک سیاسی داؤ پیچ ایسے عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو بھی رفتہ رفتہ انتشار، بدحالی اور زوال کی طرف لے جارہے تھے۔ مہاجر شعرا پر اس تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حال کا ردِ عمل فطری تھا۔ اودھ کے حکمرانوں نے ان تباہ حال مہاجرین کی دل جمعی کی کوشش کی، ان کے لیے معقول مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے۔ دہلی میں تو استادِ شاہ کو پچیس روپے مشاہرہ ملتا تھا لیکن یہاں سودا کو پانچ سو روپے اور میر کو تین سو روپے وظیفہ ملنے لگا اور وقتاً فوقتاً انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔ پھر بھی ان کے لیے یہاں کے ماحول میں مدغم ہوجانا آسان نظر نہیں آتا تھا۔ دبستان لکھنؤ کے ابتدائی ماحول کے جو تاثرات ردِ عمل کے طور پر مہاجر شعرائے دہلی کے قلب وذہن میں پیدا ہوئے، ان سے ان کی بے دلی و بے اطمینانی اور یہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی کے چند پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے:

میر حسن:

ہوا آوارہ ہندوستان جب سے
قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پر بستا
کہیں اونچا ہے کہیں نیچا رستا

سوائے تودۂ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

میر:

خرابا دہلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

رحم آشنا کسو کو بستی میں نہ پایا
اسلامیوں کی یاں کے تکفیر ہے مناسب

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز

آباد اُجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود وباش

رنگینیِ زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھ
سو رنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میر

پھرا میں صورتِ احوال ہر یک کو دکھاتا یاں ۔۔۔ مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں

مصحفی:

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلی سے نکل کر ۔۔۔ کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

یا رب شہر اپنا یوں چھڑایا تُو نے ۔۔۔ ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تُو نے

میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت ۔۔۔ اے وائے یہ کیا کیا خدایا تُو نے

مصحفی لکھنؤ میں دلی سے ۔۔۔ آیا طے کر کے راہ دور دراز

لیکن اس خاک میں بھی اس نے کہیں ۔۔۔ کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز

دہلی کے شعرا کے ہاں غور و فکر کے عناصر مقابلتہً زیادہ ہیں اس لیے ان کی شاعری میں اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کی ترجمانی ہی نہیں صورتِ حال کو بہتر بنانے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ کسی حد تک لکھنوی شعرا بھی اپنے ماحول کے ترجمان ہیں لیکن ان کے کلام میں اس امر کا اظہار بھی موجود ہے کہ وہ ایک قفس میں ہیں جو انھیں بڑا عزیز ہے۔ وہ قفس سیلابِ عشرت میں بہ رہا ہے اور وہ بھی ایک بے بس تنکے کی طرح اس بہاؤ میں بہ رہے ہیں۔ ان میں یہ احساس اودھ کے سیاسی حالات کے عین مطابق تھا۔ آئے دن انگریز کی ریشہ دوانیاں جیسے جیسے اودھ میں تسلط جما رہی تھیں اس نے ہوش مند افراد کی نظروں میں آیندہ کی صورتِ حال واضح کر دی تھی۔ اس ماحول میں بھی چند شعرا کے ہاں انقلابِ زمانہ کی پیدا کردہ تلخیاں نظر آتی ہیں۔ جرأت نے اپنے انداز میں اس حالت پر بڑی معنیٰ خیز روشنی ڈالی ہے۔

سمجھے نہ امیر ان کو کوئی نہ وزیر ۔۔۔ انگریزوں کے ہاتھ اک قفس میں ہیں اسیر

جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں ۔۔۔ بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے امیر

اس بے بسی اور لاچاری کا احساس چند افراد ہی کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ جب عام ماحول کی یہی کیفیت ہو کہ جس کے نتیجے میں اس قسم کا احساس جگہ پائے، عام افراد بھی اس کی لپیٹ میں آتے ہیں۔

شعرا کو اس امر کا قلق تھا کہ حالات کی ستم گری کے سامنے اس وقت کے امیر حکمران خود بھی بے بس ہیں۔ بعض شعرا نے تو حقیقت اس حد تک بیان کر دی ہے کہ وہ امیروں ہی کی نااہلی کو ظاہر کرتی ہے۔ منیر شکوہ آبادی کے یہ شعر دیکھیے:

مسند جو دے خدا تو بھلے آدمی کو دے ۔۔۔ پھولے جو گاؤ تکیہ پہ اپنے وہ بیل ہے

زرد اروں کو سمجھتے تھے ہم دل میں آدمی ۔ دیکھا تو سامری کا یہ گوسالہ بیل ہے
بنتے ہیں کیوں کھرے وہ زرقلب کی طرح ظاہر میں پاک صاف ہیں پر دل میں میل ہے
دن رات آبرو کو جو روتے ہیں اہل علم نم دیدہ ان دنوں ورق بود لیل ہے
منعم کے آس پاس ہے ہر دم حریص زر مثل مگس مصاحب خوان طفیل ہے

شاعروں کو یہ احساس تھا کہ برِ عظیم کا حقیقی اقتدار انگریز کے ہاتھ میں چلا گیا ہے ان کے پیش نظر وہ تاجر تھے جو تجارت کی غرض سے آ کر ان پر حکومت کرنے لگے تھے۔ رسد و طلب کے سارے ذرائع پر اب ان کا تسلط تھا۔ استحصال بالجبر کے نتیجے میں یہاں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ملکی باشندوں کو ان کے اسباب کا احساس ہونے لگا تھا۔ مصحفی کے یہ شعر حقیقت کا اظہار ہیں۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی
افسوس کہ چھینی ہے نصاریٰ کے سگوں نے یوں ہاتھ سے اس فرقۂ اسلام سے روٹی
جا کہو عیسیٰ سے کیا تم مر گئے اپنے گدھے باندھو کھیتی چر گئے
لعنت ہے سکے اور زر چلانے میں سر کمپنی کا کٹ کے بکا سولہ آنے میں
کیا سستی قیمت ہو گئی پٹے کی راہ کی دو پیسے منڈی بکتی ہے لندن کے شاہ کی
ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں

سیاسی طور پر عدم استحکام کی وجہ سے لکھنؤ آئے دن بے کاری، بے روزگاری، بھوک افلاس کی آماجگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ سلاطین و امرا کسی نہ کسی طرح اپنی وضع داری نباہ رہے تھے۔ اس قسم کے گھرانوں کی اقتصادی بدحالی اور بے زری کی کیفیت انشا نے مخصوص انداز میں بیان کی ہے:

کہاں تک کروں میں زمانہ کا شکوہ مصیبت ہے یوں تو سب اہل ہنر پر
خصوصاً وہ جو وضع داروں میں ہیں یاں برشاہی افلاس ہے ان کے در پر
مکھا رام جانے روپیہ دے گیا لو کھڑا بنیا کہتا ہے اب ان کے در پر
سلیمانی تلوار تو لے چکا ہے لگائی ہے اب تاک شاید سپر پر
پڑا ہنہناتا ہے بن گھاس گھوڑا ہوئے چار فاقے ہیں پیہم نفر پر

یہی حالت مصحفی کے اس شعر سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

منیر شکوہ آبادی نے ایک مسلسل غزل میں اس عہد کی معاشی حالت کی ترجمانی کی ہے، اس سے معاشرے کے مختلف طبقات کی مفلوک الحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان بھر میں ہے ماتم معاش کا　　جس گھر میں دیکھتا ہوں یہی ہائے ہائے ہے

کعبہ کو شیخ بیچے جو گاہک کوئی ملے　　عید ہلال چشم برہمن میں گائے ہے

دعوت میں جو رئیس تکلف بہت کرے　　پینے کو آب گرم ہے یا سرد چائے ہے

اندھیر ہے تغافل حکام عصر سے　　گم کردہ راہ قافلۂ ہائے ہائے ہے

اس مفلوک الحالی کی شدت اور اَلم ناکی کا اندازہ انشا کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے:

کھاوے تلاش اپنے سے جو لقمۂ حلال　　ہے وہ تو آج حضرت لقمان بعینہٖ

اور مصحفی کے یہ شعر بھی اسی تعلق سے ہیں:

بھری آنکھیں کسی کی پوچھتے گر آستیں رکھتے　　ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اس دست خالی سے

غیر از خدا کی ذات میرے گھر میں کچھ نہیں　　یعنی کہ اب مکان میرا لامکاں ہوا

لکھنؤ کے شعرا نے اپنے ماحول کی اس سیاسی ہل چل کو محسوس کر لیا تھا جو بظاہر عیش و عشرت کی تہوں میں چھپی ہوئی تھی لیکن جس کے سنگین نتائج عام افراد، ملک و ملت کے لیے اَلم ناک ہو سکتے تھے۔ انشا نے اس عیش و عشرت کے خول کے پیچھے وارد ہونے والے انجام کا بخوبی اندازہ لگایا تھا:

ہے خوشی سب طرح کی ناحق کا　　خطرۂ انقلاب باقی ہے

دو ایک شاعروں نے اس صورتِ حال کا ذمہ دار انگریزوں ہی کو قرار دیا ہے۔

آتش:

ہشیاری رنج دیتی ہے قیدِ فرنگ کا　　دیوانگی نشانہ بناتی ہے سنگ کا

مہمان بہار باغ ہے دو چار روز کی　　چندے ہے دور دورہ شراب فرنگ کا

تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں　　رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا

مبارک کشتیاں مے کی بتان ہند کو ہوویں　　جہازوں میں فرنگستاں سے آب آتشیں آیا

جرأت:

بے وجہ نہ سمجھو یہ پڑتے اولے　　انگریز بڑا بول جو ناحق بولے

تو فوج ملائک نے فلک سے جرأت　　مارے گوروں کو گورے گورے گولے

ایسے اشعار کے علاوہ جن میں واضح طور پر انگریزوں کا ذکر کیا گیا ہے کئی شاعروں کے کلام میں سیاسی ہیجانات پر مبنی خیالات موجود ہیں۔ ان سے شاعروں کے احساسات اور اس وقت کی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

آتش:

آج ہی چھوٹے جو چھٹتا یہ خرابہ کل ہو ہم غریبوں کو ہے کیا غم یہ وطن کس کا ہے
قرار اس کو نہیں آتا ہماری بیقراری سے زمانہ آئینہ ہے اپنے احوال دگر گوں کا
کردیا ہے یہ حوادث نے دل عالم سرد آتش حسن سے بھی گرمیِ بازار نہ ہو
ہمارے مردے کو درکار ہے غسل آب آہن کا ستایا ہے نہایت انقلاب دہر نے ہم کو
اس زمانہ میں سپاہی نہیں بے کاری ہیں نہ تو تلوار بچی ہے نہ کٹاری تیار
ہوائے دہر اگر انصاف پر آئی تو سن لینا گل و بلبل چمن میں ہوں گے باہر باغباں ہوگا

ناسخ:

مے کدے میں ہے مزے پر انقلاب روزگار جام مے سیدھا ہوا شیشہ اگر واژوں ہوا
خبر نہیں جنھیں کچھ انقلاب گردوں کی غرور نیز اقبال و جاہ کرتے ہیں
ہجوم فوج عدو جہاں میں اے ناسخ سوائے قلعہ مرقد کہیں پناہ نہیں
تہلکہ ہے جان کو ہر آن زیر آسمان جلد نکلا چاہیے اس قصر بے بنیاد سے
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
ہے محبت سب کو اوس کے ابروئے خم دار کی ہند میں کیا آبرو باقی رہی تلوار کی
دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے رہنا بدن میں روح کا قید فرنگ ہے
گر جنگ سے گریز کرے کوئی بادشاہ تاج خروس ہے اس کی کلاہ سے

مصحفی:

سب ناظم ملک سو رہے ہائے دنیا کا نظام ہو چکا اب
غمگین کیوں ہوں اپنی نگوں طالعی سے ہم بوئے نشاط دیوے ہے رنگ انقلاب کا
گردوں پہ یہ شفق نہیں دیکھا تو مصحفی خون شہاں سے سرخ ہے رنگ اس بساط کا
ہیں مصحفی ہم اب تو پابند حادثے کے دیکھیں ٹلے ہے کس دن سر سے بلائے عالم

جرأت:

دم بدم یاں نیا ہی عالم ہے
خوب عالم کو غور کر دیکھا

قسمت نے ہم کو آخر لا دام میں پھنسایا
صیاد کے خطر سے گو آشیاں بدلا

گُل کو کیا روتی ہے تو اے بلبل
یہ گلستاں نہیں ہے رہنے کا

جرأت خزاں سے آہ چمن میں نہ کچھ رہا
اک رہ گئی زبان پہ گل اور سمن کی بات

تھا مضطرب جو مرغ گرفتار کل تلک
جنبش ذرا بھی اس کو نہیں زیرِ دام آج

وزیر، خواجہ محمد وزیر:

اگر دیکھے ادھر تنکے چنے برق
ہمارا اوس چمن میں آشیاں ہے

سامنا کیا کرے دل اس مژہ و ابرو کا
صاحب فوج نہیں صاحب شمشیر نہیں

بزم جہاں میں ہے کوئی دم یہ مئے سرور
ہے ساغر نشاط پیالہ حباب کا

وزیر، نواب وزیر علی:

جوں سبزہ رندے اگتے ہیں پیروں کے تلے ہم
اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم

روتے ہیں شب و روز اسی فکر سے یا رب
غنچے کی طرح باغ میں گل ہو نہ کھلے ہم

جس گُل پہ نظر کرتے ہیں آتا ہے نظر خار
گلشن کے پلے جاتے ہیں کانٹوں میں رلے ہیں

اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہیں
فریاد کریں کس سے یہ قسمت کے جلے ہیں

زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بھلائیں
رہتے ہیں وزیر ہی سے دن رات ملے ہم

صبا:

سختیِ گردش ایام ہے ساقی سر چوٹ
شیشہ ہے ہدف سنگ فلاخن کب تک

کیا خاک بن پڑے گا صبا اہل باغ سے
اک بار جھک پڑے گی جو فوج خزاں تمام

دو ہی دن میں گل و بلبل نہ دکھائی دیں گے
دور صیاد کا گل چیں کا زمانہ کب تک

غیر ممکن ہے رہے حال عناصر یکساں
چار دن کا ہے یہ زمانہ کب تک

بک گئے ہیں آپ تو غیروں کے ہاتھ
بندہ پرور اب غلام آزاد ہو

ثابت ہے انقلاب زمانہ سے اے صبا
قائم نہیں ہے چرخ جفا کار کا مزاج

رند:

دور ساغر یونہی رہنے دے ابھی تو چند سے
چین کر لینے دے اے گردش دوراں مجھ کو

ہر مرتبہ زمانے کو ہوتا ہے انقلاب　لاتی ہے سوانگ گردش دوراں نئے نئے
یہ سب سر زمیں فتنہ انگیز ہے　ہزاروں ہی اٹھتے ہیں یاں غلغلے

تراب:

جس کا اقبال ہو تنزل پر　وہ چڑھے فوج لے کے کابل پر

مذکورہ بالا اشعار میں بیشتر غزل کے ہیں۔ غزل کے علاوہ لکھنوی شعرا نے مختلف اصناف نظم میں بھی اپنے ماحول کی ترجمانی کی ہے بلکہ بعض نظموں میں کھل کر اُنھوں نے سیاسی ہیجانات اور ان کے قائم کردہ اثرات کی عکاسی کی ہے مثلاً رنگین کے شہر آشوب کا ابتدائیہ اپنے ماحول کی معاشی اور سیاسی بدحالی کے نتیجے میں ذہنی فرار کے رجحان کو پیش کرتا ہے۔

سنو بیان ایک میرا یارو　منصف ہو تو سن کے پرو دو
ایک دن مجھ کو یہ سوچ آیا　یعنی زمانہ نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے　چین نہیں مطلق ہے تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے　کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکر معیشت نے ہے مارا　کیجیے کس صورت سے گزارا
ہوا بہت سا جب میں مضطر　تب یہ کہا دل سے گھگھیا کر
کیوں اے دل کیا مرضی ہے تیری　فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
چیز بڑی ہے دنیا میں دولت　بن اس کے ہوتی ہے ذلت
کھیتی کر تو کرا یا تجارت　نوکری کر یا باندھ کے ہمت
سن کر دل نے یوں کہا مجھ کو　خاص میں کہتا ہوں تجھ کو
ہووے اگر امداد الٰہی　سب سے بہتر یاد الٰہی

صبر کی داد خدا ہی دے گا
دل کی مراد خدا ہی دے گا

جان صاحب مشہور ریختی گو شاعر نے بھی جس کا کلام بکثرت ابتذال اور سُوقیت سے پُر ہے اپنے مخصوص انداز میں اس وقت کے لکھنوی ماحول کا شہر آشوب لکھا تھا۔ نمونتاً اس کے چند بند دیکھیے:

کم نہیں قارون سے ہر اک خصلت آجکل　دفن مردے کی طرح گھر گھر ہے دولت آجکل

مردوں کی ہو گئی نامرد ہمت آج کل لکھنؤ میں شاد ہے سوموں کی خست آج کل
گور پر حاتم کے روتی ہے سخاوت آج کل
اینٹ سے اینٹ بجوائیں نہ ہرگز خوف کھائیں پیسے والے اک ٹکے کے واسطے مسجد کو ڈھائیں

رنگ یہ بدلا زمانے نے ہر اک حیران ہے مفلسی کے ہاتھ سے انسان بھی حیوان ہوا

ہوگئی راحت ہے دشمن رنج ہے بنو حبیب دور دولت ہو گئی کس طور ہو عشرت قریب
پاؤں جو پھیلا کے سوئے پھر نہیں جاگے نصیب جو غنی تھے پیسے والے اب وہ ہیں مفلس غریب
ان کے گھر مہمان رہتی ہے قناعت آج کل

(۳) شعرا کا ماتم لکھنؤ

الحاقِ اودھ کے وقت واجد علی شاہ حکمراں تھے۔ یہ ۱۸۵۶ء میں معزول کر دیے گئے اور بیشتر افراد جو اودھ کی حکومت سے توسل رکھتے تھے، بے روزگار، بے وقار اور بے وطن ہو گئے۔ لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت زوال پذیر ہوگئی۔ جس بنیاد پر اہل کمال دور دور سے یہاں آتے تھے اس کے ڈھے جانے پر یہ شیرازہ بکھرنے لگا۔ ایک سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی لڑی گئی جس میں لکھنؤ نے بھی شرکت کی۔ چناں چہ اس کے بعد لکھنؤ میں بھی وہ پہلی جیسی صورتِ حال اور رونق نہ رہی، ایک مختصر سی مدت میں یہ شہر ویرانی اور بربادی کی تصویر بن گیا۔ شعرا جو اپنی جذباتی فطرت کی وجہ سے اس سے لگاؤ اور انس رکھتے تھے اس کی تباہی اور ویرانی پر خاموش نہ رہ سکے۔ ان کے کلام میں اپنے وطن سے انسیت، فراق اور محبت کے جذبات کا جابجا اظہار ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نام واجد علی شاہ کا ہے۔ ان کا تخلص اخترؔ تھا۔ مذکورہ جذبات اور اس کی متنوع کیفیات ان کے کلام میں خوب موجود ہیں۔

دشوار ہوا اب تو جینا یا رب کیا سہل ہے موت کا قرینہ یا رب
وہ وطن یاد ہے غربت میں وہ سارے احباب ہائے کب مجھ سے ملیں گے مرے پیارے احباب
چمن سے پھینک دیا آشیاں کیا خوب نہال مجھ کو کیا آ کے باغباں کیا خوب
یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بار خدا پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہائے وطن دیکھوں تو شاداں ہو دل زار مرا یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعت خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حب وطن تنگیِ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یہی تشویش شب و روز ہے ہنگامہ میں لکھنؤ پھر دکھائے گا مقدر میرا

خصوصیت کے ساتھ ایک مثنوی حزن اختر تمام تر انھی جذبات کی حامل ہے۔ اس میں اُنھوں نے اپنے معزول ہونے کے بعد کی تفصیلات و جزئیات کو نظم کیا ہے۔ اس کی حیثیت اُن کی آپ بیتی کی ہے اور اس سے اس زمانہ کے حالات اور ان حالات میں ان کی ذہنی کیفیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ مختلف مقامات سے چند شعر یہ ہیں:

ہوا تک نہیں قید خانے میں آہ ہوا بے گناہ قید میں بادشاہ
عجب ہے یہ نیرنگ دنیائے دون زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں
فقط نام شاہی سے ہوں میں خراب کہاں میں کہاں قید کیسا عذاب
برس گزرا ہم کو جو اے خوش سیر یکایک جہاں میں اڑی یہ خبر
کہ بلوائی کچھ جمع ہونے لگے وہ لکھا مقدر کا دھونے لگے
ہوئی خوب برگشتہ انگریز فوج اُمنڈتی ہے جس طرح دریا کی موج
الٰہی مجھے قید سے دے نجات نکلتی نہیں غم سے اب منھ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا کر اس اخترِ زار کو تُو رہا

قفس میں بند ہوں بے بال و پر ہوں دل پھڑکتا ہے
سبب ہے کون سا صیاد اب میری رہائی کا

ان اشعار میں واجد علی شاہ نے صرف لٹنے، معزول ہونے اور حکومت کے مٹ جانے کا ماتم ہی نہیں کیا بلکہ عام انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے۔

مرزا برجیس قدر واجد علی شاہ کے چھوٹے شہزادے لکھنؤ کی تاراجی کے بعد اپنی والدہ حضرت محل کے ساتھ نیپال میں پناہ گزیں ہوئے تھے اور مدتوں وہیں خراب و خوار رہے۔ ایک غزل میں وطن سے دوری اور غربت کی بے کسی کے جذبات کو بڑے درد کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فرقت نصیب رہتا ہے جس نازنین سے دور یارب نہ کیجیے مجھے اس مہ جبیں سے دور
بلبل تو ہوں پر ایک گل یاسمین سے دور برجیس ہوں مگر بت زہرہ جبیں سے دور
تن خاک تیری راہ میں سربسر نذر ہے کس طرح جاؤں جان تیری سرزمین سے دور
مٹی خراب ہو گئی نیپال میں میری رہتا ہے کیوں مزار امام مبیں سے دور

واجد علی شاہ نے اس امر کا ذکر اپنی مذکورہ مثنوی میں بھی کیا ہے:

جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج　　اسے لے گئی جیسے دریا کی موج
وہ اب قبضہ مفسداں میں ہے آہ　　بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

برق لکھنوی نے ایک مسدس شہر آشوب میں واجد علی شاہ کی معزولی اور کلکتہ روانگی کے بعد لکھنؤ کی بے رونقی اور اداسی کی کیفیت کو بیان کیا ہے[1] برق اودھ کی معزولی کے بعد واجد علی شاہ کے مصاحب کی حیثیت سے ہی کلکتہ گئے تھے اور واجد علی شاہ کی فورٹ ولیم میں نظر بندی کے دوران ان کے ساتھ ہی رہے لکھنؤ کے انقلاب، اس کی تاراجی اور بربادی کے واقعات برق نے اپنے شہر آشوب میں بڑے پراثر انداز میں تحریر کیے ہیں۔

کل کے مذکور یہ ہیں اپنے بھی افسانے تھے　　رشک فردوس بریں شہر کے مے خانے تھے
تھالیاں ہیروں کی تھیں لعلوں کے پیانے تھے　　ماہ و خورشید رخ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جھرمٹ میں رہا کرتے تھے

قہقہے اُڑتے تھے جمگھٹ تھے پری زادوں کے　　میلے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سنتے تھے نہ ہرگز کبھی فریادوں کے　　کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے

جانتے تھے کہ اسی طرح گزر جائے گی　　چمن عیش میں ہرگز نہ خزاں آئے گی
آرزو نخل محبت سے ثمر پائے گی　　یہ نہ سمجھے تھے قضا رنگ نیا لائے گی
ایک بھی پیش نظر ان میں کوئی تصویر نہیں　　قدر دنیا میں نہیں خلق میں توقیر نہیں
جز اجل اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں　　تیر ہے دل کے لیے نالۂ شب گیر نہیں
غم نے داغوں سے کیا جسم مرصع اپنا
ہٹ گیا سامنے آنکھوں سے مرقع اپنا

منیر شکوہ آبادی نے اپنی مسلسل غزلوں سے شہر آشوب کا کام لیا ہے۔ ان کی غزلوں سے لکھنؤ کی معاشرت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ لکھنؤ کے عہد رفتہ کو بھولنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

پھر لکھنؤ میں آئی دوبارہ نہ آج تک　　جنت میں کیا بہار گئی عیش باغ سے

ذیل کی دو مسلسل غزلیں ان ہی جذبات وکوائف سے پُر ہیں۔ ان کے چند منتخب شعر یہ ہیں:

سینکڑوں کو لوٹ کر دو چار گھر بھر دے فلک — سب میں ماتم ہے اگر دس تہنیت خواں ہوں تو کیا
ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت — اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا
پڑ گئے پتھر جواہر پوشوں پر اے آسماں — کوڑیوں کے مول اب لعل بدخشاں ہوں تو کیا
بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب — اب چڑیلیں صاحبان قصر دیواں ہوں تو کیا
ہو گئے محتاج کفن مرمر گئے زریں لباس — خلعت زیبا نصیب شخص عریاں ہوں تو کیا
مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعہ ویران ہے — یادِ حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا
سخت جان و بے حیا دو چار ہم سے جو رہے — ہر گھڑی پابند خوف عزت و جاں ہوں تو کیا
روئے کس کس مزے کو یاد کر کے اے فلک — زخم دل پر سینکڑوں خالی نمکداں ہوں تو کیا

جس بزم جانفزا میں ابھی کل کی بات ہے — خالی سرور سے دل پیر و جواں نہ تھا
ارباب عیش کی کہوں کیا خوش سلیقگی — وہ کون تھے کہ ہمسر شائستہ خاں نہ تھا
فتنے کے عطر کو سرمو بھی نہ تھی جگہ — آشفتہ کوئی گیسوئے عنبر فشاں نہ تھا
وہ بزم دلفریب تھی ایسی کہ رات بھر — رنج و ملال کے لیے رستہ جہاں نہ تھا

امیر مینائی کے ہاں بھی اس نوعیت کے اشعار ملتے ہیں:

امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں کہاں ہوں گی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے — وہ میلے ہم کو قصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

فدا علی عیش نے ایک مسدس انقلاب لکھنؤ لکھا تھا[2] جس میں گزشتہ اور موجودہ لکھنؤ کا موازنہ کرتے ہیں۔ گزشتہ لکھنؤ کی چند جھلکیاں اس طرح پیش کی ہیں:

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان
اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشان
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ نہ وہ لطف و زباں
دیکھ لیں آنکھوں سے احباب عیاں را چہ بیاں

جابجا ڈھیر مکانوں کے جو آتے ہیں نظر کھینچ کر آہ بہ صد درد یہ کہتے ہیں بشر
تھا کسی وقت میں یہ شہر خوش تر شام تھی شام اُودھ صبح بنارس کی سحر
پہلے آباد تھا یہ ملک سلیماں کی طرح
اب تو الٹا ہوا ہے خطۂ یوناں کی طرح

عیش نے ایک مثنوی اشک مسلسل میں واجد علی شاہ کی معزولی اور اس کے بعد ان کی وفات تک کے حالات نظم کیے ہیں[۳] یہ مثنوی حزن اختر کے موضوع کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس میں بادشاہ کی زندگی کے آخری لمحات اور لکھنؤ کی بربادی کی کیفیت بڑے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔

شہر بار دگر ہوا ویران لکھنؤ ہوگیا ہے ہو کا مکان
جس قدر غم کریں بہت کم ہے شاہ واجد علی کا ماتم ہے
مٹ گیا نام سلطنت کیسا اب نہ اس گھر میں بادشاہ ہوگا
لکھنؤ میں تو تخت و تاج لٹا ہائے اب یاں ہمارا راج لٹا
جب سے کلکتہ ہوگیا مسکن پھر نہ دیکھی بہار صبح وطن
سلطنت ہند سے ہوئے راہی اب فقیروں کی رہ گئی شاہی

۴- دورِ آخر: ۱۸۵۷ء تک

یہ وہ دور ہے جب بر عظیم میں خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا تھا۔[۱] ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے سندھیا کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا اور شاہ عالم کو مرہٹوں کی زیردستی سے نجات دلادی۔ قلعہ معلّٰی کی حفاظت اور احکام نافذ کرنے کی ذمہ داریاں بھی انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۷ء کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا تو انگریزوں کو اپنے اقتداری رسیاں کچھ اور مضبوط کرنے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے شہنشاہ کو اپنی مرضی کا ولی عہد نامزد کرنے کی اجازت نہ دی اور وظیفہ میں اضافہ کی خواہش کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اکبر شاہ کے بعد ظفر شاہ مغلیہ سلطنت کے والی بنے تو انگریزوں کی طرف سے بادشاہ کو نذر پیش کرنے کی رسم بھی ختم کردی اور نامزد ولی عہد کے ساتھ آیندہ لقب شاہی موقوف کرنے اور وظیفہ کم کرنے کا معاہدہ بھی طے پایا۔ اب علامات ظاہر تھیں کہ انگریز مغلیہ اقتدار کی اس آخری نشانی کو بھی ہٹانے کے درپے ہیں۔ اس مایوس

کن سیاسی صورتِ حال میں فسردگی کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اکثر حساس افراد کے ذہن اس ماحول میں مفر کی کوئی صورت نہ پاتے تھے۔ شعرا کے کلام میں گہری المیہ حس کے ساتھ ساتھ بے چارگی و بے بسی کی کیفیات اوران کی ترجمانی ملتی ہے۔

بظاہر ۱۸۰۲ء کے انگریزی تسلط کے بعد سے ملک میں امن وامان بھی قائم ہوگیا تھا اور دہلی کے انتظامی امور کسی قدر رُو بہ اعتدال آ گئے تھے لیکن یہ سکون اپنے پس پشت اضطراب کا سیل بے پناہ لیے ہوئے تھا۔ افراد نے بحالت مجبوری انگریزی استعمار وتسلط کو برداشت کیا تھا۔ معاصر شہادتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ عظمت رفتہ کا احساس دلوں میں موجزن تھا اور وہ اپنی قوت واقتدار کے چھن جانے اور تہذیب و معاشرت کے مٹ جانے کے احساس سے مضطرب و بے چین تھے۔ انسانی احساس اپنے ماحول کی کش مکش سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کے نتیجہ میں فنا و بے ثباتی کے احساسات، تصوف کے اثرات اور فکر و فلسفہ کے عناصر ظہور میں آتے ہیں۔ امن وامان کے ظاہری قیام اور نظم ونسق کی بحالی نے افراد کو مسلسل بدامنی اور انتشار سے نجات دلا دی تھی۔ اس صورتِ حال نے ذہنوں کو اپنی حقیقت ماحول اور اقدار حیات، خیال اور حقیقت، انسانؑ اور کائنات ماضی اور حال پر غور وفکر کا ایک موقع دیا۔ اس غور وفکر کی بنیادیں تصوف اور مابعد الطبیعاتی مسائل سے بڑھ کر مادی حقائق پر استوار ہوتی تھیں۔ انھیں یہ احساس بھی تھا کہ اب ان کا ملک ان کا نہیں رہا تھا اور اب وہ ایک غیر قوم کے محکوم ہیں۔ چناں چہ مادی ضروریات زندگی اور ملکی سیاسی، معاشرتی و معاشی مسائل ان کے لیے تلخ حقیقت بن گئے تھے اور اب وہ بے بس تھے، قلب ونظر میں عظمت رفتہ کے احساسات و جذبات کا جو لاوا ابل رہا تھا اس نے غزل کے روپ میں بھی اپنا اظہار کیا ہے۔

شاہ نصیر:

کس کو ہے اس دور میں ساقی مے گلگوں نصیب — اور جو ہے بھی تو جام دیدۂ پُر خون نصیب
کیا نوا سنجی کریں اے ہم صفیرانِ چمن — آ گئی فصل خزاں گلشن سے سارے کھسکے پھول
برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی — اب تک کبھی ہمارے ہاتھ جام وسبو نہ آیا
جو صاحب عروج ہیں گردش نصیب ہیں — کس روز آسمان زمین پر نہیں پھرا!

ذوق:

ثابت کب ہے زمانہ کے عزوشان کے لیے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کے لیے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے — رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کے لیے
رنگین ہے آج کل کے گل نو بہار سے — اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے

مومن:

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
ستم ہائے گردوں مفصل نہ پوچھو — سر پھر گیا ماجرا کہتے کہتے
اس چمن زار کا حسرت سے نظارہ کرے — اے نگہ دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک

ظفر:

گرچہ ہم ضعف سے ہیں مثل ہلال باریک — اب بھی ہیں سر بفلک ہم کو حقارت سے نہ دیکھ
فوج حسرت میں میرے نالہ و آہ — بس یہی دو نقیب رہتے ہیں

غالب:

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا — جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ
غرۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ پوچھ — اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

عظمتِ رفتہ کے احساس اور انگریزی تسلط کی دو مختلف صورتوں نے مجموعی طور پر فرد کو ذہنی سطح پر شدید خلفشار سے دوچار کر رکھا تھا۔ ملک کے تمام ذرائع پیداوار پر انگریز قابض ہو چکے تھے اور اس تسلط کو مضبوط کرنے کے لیے اُنھوں نے اپنی حکمت عملی کا دور رس منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ وہ ایک طرف برِعظیم کی معیشت کو تباہ کر رہے تھے تو دوسری جانب عوام کو اپنے سابقہ تاج داروں سے متنفر کرنے کے

لیے مادی سہولتوں اور نجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ذرائع مہیا کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے معاشرے کے دانش ور طبقے کو روحانی اور جذباتی سطح پر اذیت پہنچائی اور اسے ذہنی افسردگی کا شکار بنا دیا۔ چناں چہ اس دور کا ہر سوچنے والا شخص ایک الجھن میں گرفتار نظر آتا ہے۔ شاعروں نے اس ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے ان کے قلبی تاثرات کو ہم معاشرے کی نمایندگی کا مقام دے سکتے ہیں۔ ان کے کلام میں جابجا اپنے سیاسی ماحول کی ترجمانی جھلکتی ہے۔

شاہ نصیر:

اے اسیران قفس ہمت نہیں ورنہ قفس
صاف اڑ جائے ہلاؤ تم اگر مل جل کے پر

جام پر جام میں اس واسطے پیتا ہوں آج
دور دیکھیے کل اے بادہ کشاں کس کا ہے

جلتا ہے کوئی اور کوئی غرق ہے نصیر
گردوں کے انقلاب کو آتش کہوں کہ آب

کاخ دنیا جو ہے بازیچۂ اطفال نصیر
کہ کبھی گھر یہ بنا اور کبھی ٹوٹ گیا

ذوق:

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

نہ پوچھ شغل اسیری میں ہم غریبوں کا
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

ذوق گل کوئی اور تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغ جہاں میں ہے دگر گوں چلتی

اے بلبل نالاں تیری فریاد غضب ہے
کر بات بھی آہستہ کہ صیاد غضب ہے

مومن:

اس لیل و نہار غم نے مارا
ہے روز سیہ سیہ تر رات

یاد ایام وصلِ یار افسوس
دہر کے انقلاب نے مارا

پامال ہم نہ ہوتے فقط جور چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

پانی کے بدلے برسے گی آگ آج ابر سے
اٹھتے ہماری خاک سے بھی کچھ بخار ہیں

اے حشر ہلا کر تہ و بالا زمیں کر
گر کچھ نہیں امید تو ہے انقلاب میں

مار ڈالا ہم کو جور گردش ایام نے
بڑھ گئی رات اپنی روزِ حشر کی تقصیر سے

ظفر:

باغ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط
اے ظفر چلتی ہوا یاں دم بدم ہے مختلف

ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی
رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم
تو برا کہہ یا بھلا ہم سے نہ ہو تیرا گلہ
اے ستم گر تیری ہر تقریر پر شاکر ہیں ہم
نہیں پرواز کی صیاد بال و پر میں جب طاقت
قفس سے ہم اسیروں کی رہائی گر ہوئی تو کیا
پھولے ہے تازہ شگوفہ چمن دہر میں روز
واہ دکھلائے ہے کیا گردش افلاک بہار
اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہد نہ نام سلطنت
جوں بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم
اے ہم دمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
نہ ہونا تندرستی کا کرے ہے مضمحل جاں کو
کہ ہے نقصان حاکم ملک کی بے بندوبستی میں
اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا
ملتے ہیں ہم سے پر ہیں دل میں عداوت رکھتے
جانتے ہم تو نہ ایسوں سے محبت کرتے
عہد و پیاں تھے مرے ساتھ تمھارے کیا کیا
ہو گیا کیا کہ جو سب تم کو فراموش ہوئے

غالب:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
مستعد قتل یک عالم ہے جلاد فلک　کہکشاں موج شفق میں تیغ خوں آشام ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا　　نے بھاگنے کی گون نہ اقامت کی تاب ہے
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے　　لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی
ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا
دل میں ذوقِ وصل و یاد یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

معروف:

معروف آپ روتے ہیں سیاح دیکھ کر　　سابق میں کر گئے تھے جو ہندوستاں کی سیر
کوئی اس گنبد گردون مینا نام میں یارو　　کبھی آرام سے یک جا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

غزل کے علاوہ شعرا نے دیگر اصناف سخن میں بھی موضوع زیر بحث پر اظہار خیالات کیا ہے۔ غزل میں تو بڑی حد تک اشارات و علامات کا سہارا لیا گیا ہے لیکن اصناف نظم میں یہ امر روانہ رکھا گیا بلکہ شعرا نے کھل کر اس وقت کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی کیفیت بیان کی ہے۔ اس دور میں بھی شہر آشوب ہی دیگر نظموں کے مقابلے میں مذکورہ کیفیت کے مظہر ہیں لیکن اس دور میں لکھے جانے والے بیشتر شہر آشوب دور ماقبل، یعنی ۱۸۰۳ء تک کے جائزے میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شہر آشوب ۱۸۰۳ء یا اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے حوادث سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے اور ان میں اس وقت تک کی صورتِ حال یا اس کے کسی پہلو کی عکاسی کی گئی تھی۔ اب تک دست یاب شدہ شہر آشوبوں میں محض ایک شہر آشوب راسخ عظیم آبادی کا ہے جو مثنوی میں لکھا گیا تھا، اس کا عنوان یہ ہے ''مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت فلک و مجملاً احوال مقیمان بلدہ عظیم آباد''۔ اس مثنوی کے کل ایک سو بیس شعر ہیں۔ راسخ نے اس میں اپنے شہر کی گزشتہ خوش حالی اور فراغت اور موجودہ بدحالی اور مفلسی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد مختلف النوع پیشہ وروں کی حالت زار بیان کی ہے۔ آخر میں افراد کی بداعمالی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے چند منتخب شعر یہ ہیں:

گزرتی تھی آرام سے بے تعب　　کہ تھے جمع اسباب عیش و طرب
کہیں مجلس عیش و بزم نشاط　　کہیں دوستوں میں بہم اختلاط
یہ گلزار اب ہوگیا خارزار　　خزاں ہوگئی ہائے اس کی بہار
کوئی اس چمن میں تونگر نہیں　　کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں

ہے اب خاک رہ ہائے اوران کا فرق
جو تھے سر سے پا تک جواہر میں غرق

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے
فقط مفلسی بر سر کار ہے

گدائی کا کاسہ لیے در بدر
ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر

ہنر مند کا ہے جگر ریش ریش
نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

یہ پٹنہ عجب دل کشا شہر تھا
طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا

اب اس شہر کا طور ہی اور ہے
مقیموں کا اس کے بُرا طور ہے

کوئی ان میں غماز و نمام ہے
کسو کا سخن چینی ہی کام ہے

بہت جانتے ہیں فریب اور دور
بہت بڑھ گیا حد سے فسق اور فجور

نہیں نیک نیت کوئی یاں و لیک
اگر ہے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک

(۵) شعرا کا ماتمِ دہلی ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اتنا اہم واقعہ تھا کہ اس نے برِعظیم کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو ہمہ گیر انداز میں متاثر کیا۔ اس کی ناکامی کے نتائج ملت اسلامیہ کے لیے بڑے مہلک اور خطرناک ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو دہلی کی سلطنت کے ساتھ مسلمانوں کی برائے نام سیاسی سیادت بھی ختم ہوگئی۔ دوسری طرف نئی حکمراں قوم نے مسلمانوں کو ہر اعتبار سے کچل دینے کا ثبوت دیا۔ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے لیکن الزام زیادہ تر مسلمانوں پر عائد ہوا اور بلا تخصیص مقام ان کو ہر جگہ جور و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔[1] یہ جنگ کچھ اس اضطراری حالت میں شروع ہوئی تھی کہ برسوں کا سلگتا ہوا آتش فشاں ایک لمحے میں پھٹ پڑا لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ تحریک کی مختلف قوتوں میں تنظیم کا فقدان تھا چناں چہ ابتدا کی شدت نے ناکامی کے بعد اسی حد تک شکست خوردگی، تباہی، بربادی، مایوسی اور افسردگی کے جذبات پیدا کیے۔ دہلی اب بھی مرکز نظر تھی۔ اس کے سقوط پر اکثر شعرا نے مرثیے، نوحے اور شہر آشوب لکھے اور اس کے سقوط کی کیفیت اور اپنے جذبات و احساسات کو بڑے دل دوز انداز میں مثنویوں، مسدسوں اور غزلوں میں نظم کیا۔[2]

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد لکھی جانے والی غزلوں، نظموں میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ ایک تو ذاتی رنج والم کا احساس، دوسرے دہلی کی سلطنت و عظمت کا ذکر، تیسرے جنگِ آزادی کا تذکرہ، تباہی کی داستان، دہلی اور اہل دہلی پر نازل ہونے والی مصیبتوں کا حال، جان و مال اور عزت

وآبرو کے تاراج ہونے کا ذکر، یہیں کسی کسی میں عوام کی فلاکت اور اقتصادی نظام کے درہم برہم ہونے کا مضمون بھی موجود ہے اور بعض نظموں میں گزشتہ شب و روز، فارغ البالی اور خوش حالی کے لوٹ آنے کی دعا بھی ہے اور کچھ میں اس قیامت کے اسباب وعلل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ذاتی رنج والم کا احساس

اس وقت ذاتی حسرت وغم کا جتنا شدید احساس بہادر شاہ ظفر کے کلام میں نظر آتا ہے وہ کسی اور کی شاعری میں نہیں۔ جن حالات سے بادشاہ گزر رہے تھے ان کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ ایک طرف دوستوں، حاشیہ نشینوں، حامیوں اور جلیسوں کا یہ خیال تھا کہ:

ملتے ہیں ہم سے پر ہیں دل میں عداوت رکھتے
جانتے ہم تو نہ ایسوں سے محبت رکھتے

اور:

بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے انھیں وہاں وہ بھی تو جاکے ان کے طرف دار ہو گئے

اور دوسری طرف انگریز اپنے برتاؤ اور سیاسی شکنجوں سے روز بروز بادشاہ کو بلندی سے نیچے اتار رہے تھے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جس طرح ان کے ساتھ برتاؤ ہوا وہ قابلِ شرم ہے۔ ذلت و خواری کے تمام اثرات کی بازگشت ان کے کلام میں جابجا ملتی ہے اور جن کی تلخی میں شدت جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد کے اشعار میں بڑھ گئی تھی۔

پھرے ہے پارۂ دل چشم اشک بار میں یوں
جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

امنڈ آتا ہے دل جس وقت کب رُکے سے رکتا ہے
مجھے رونے دو یارو میرے آنسو پونچھتے کیوں ہو

اس چمن میں کیا کرو گے میکشو ہنس بول کر
غنچہ ساں خاموش خون دل کو پی کے ہو رہو

ڈرتا ہوں جل نہ جائے کہیں خیمۂ فلک
اے آہ سوز ناک نہ ہو تو بلند بس

ظفر کے بیشتر اشعار کے پڑھنے سے سانحات کی پوری تصویر ذہن کے اندر سماتی چلتی جاتی ہے، جو اس

وقت کے برِّعظیم کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کے حالات کو ظاہر کرتی ہے جو لال قلعہ جنگِ آزادی اور اس کے بعد رنگون تک ظفر کے گرد و پیش موجود رہتے ہیں۔ محسوسات اور آپ بیتی سے مل کر یہ الفاظ ظفر پر بیتے ہوئے حوادث کو محو نہیں ہونے دیتے۔

نہ تنگ کیوں ہمیں صیادیوں قفس میں کرے — خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے
اے وائے انقلاب زمانہ کے جور سے — دلّی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی
میں وہ کشتہ ہوں کہ میری لاش پر اے دوستو — اک زمانہ دیدۂ حسرت سے تکتا جائے گا
شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے — ہڈی ہڈی میری اے سوز نہاں جلتی ہے
گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہ غربت میں — ہم آواز جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں
رفیق راہ محبت کدھر گئے یا رب — کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا
یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو — میرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو
گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے — کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے
پے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں — کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا — جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے — بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی — خوشی سے آئے تھے روتے اس انجمن سے چلے

دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون ادا سے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہم نے اس پھلواری میں
اب جو پھولے اس میں پھول اور ہی اس میں باسے ہیں

اتنا ہے کم نصیب ظفر دفن کے لیے — دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ظفر نے اس زمانے میں ایک شہر آشوب بھی لکھا تھا۔ اس کا ایک بند ان کی اس وقت کی حالت زار کو بیان کرتا ہے:

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں — ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زندان پہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات ہے وہ قید فرنگ میں

غالب نے بھی ''داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع'' کا ماتم کیا ہے اس کے احساسات اور تجربات کو اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے بڑی گہری مشابہت تھی:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
غم نہیں ہوتا ہم آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں　　سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

اور شیفتہ کے یہ شعر بھی اسی سلسلے کے ہیں:

ویرانے کے مانند کہیں دل نہیں لگتا　　ہر چند کہ ہے شیفتہ دلی وطن اپنا
گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا　　وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

دہلی کی عظمتِ رفتہ

شاعروں کے دل میں موجود دہلی (یا وطن، ہندوستان) کی محبت کا جذبہ بڑی شدت اور بڑے اثر کا حامل ہے۔ شعرا نے دہلی کے تعلق سے اپنے جذبات کو متنوع کیفیات، علامات اشارات میں بیان کیا ہے۔ جیسے:

عیش، آغا جان:

مریض غم کے لیے خانۂ شفا تھی وہ　　جہاں میں درد دل و جان کی دوا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ　　بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ
تھی اہل دید کو وہ فرح بخش جانوں کی
ہر ایک چیز میں اس شہر کی لطافت تھی　　اور اہل شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور لطافت تھی　　ہر ایک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی

محسن:

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں　　ہر ایک شخص یہاں تھا بجائے خود رضواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیِ غلماں　　دبیر چرخ کا ہم سر تھا یاں ہر ایک جواں

کامل:

مثالِ خلد بریں بے مثال تھی دہلی　　گُل کمال سے پُر یہ کمال تھی دہلی

سپہر اوج تجلی مآل تھی دہلی غبار غم سے صفا مہ جمال تھی دہلی

ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا ایک مکان عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہان عیش

ظہیر دہلوی:

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا
یہ وہ جگہ ہے زمیں جس کی زر اگلتی تھی
یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

سوزاں:

غریب پرور و کانِ کمال تھا یہ مقام عدیل اس کا نہ تھا جانتے ہیں خاص و عام
برآئی آرزو ان کی جو آئے یاں ناکام یہاں سے نام وہ پاتے جو ہوتے تھے گم نام
سند جہان کو تھی عالی مقام سے اس کے
یہ اعتبار تھا عالم کو نام سے اس کے

مبین:

یہاں کا روز تھا ہر روزِ عید جہاں یہاں کی شب تھی شب قدر ماہ نورفشاں
یہاں کی شام بھی جوں زلف عنبرین بتاں یہاں کی صبح تھی ہم نور عارض خوباں
یہ دہلی وہ تھی کہ جس سے جہان روشن تھا
یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نور مخزن تھا

سالک:

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد بس ان بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد

زمین پست یہاں کی تھی آسماں منظر ہر اک ذرہ یہاں کا تھا مہر کے ہمسر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر یہاں کے آب میں آب حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا اک مکان سرور ہر اک کوچہ یہاں کا تھا اک جہاں سرور
ہر اک دکان یہاں کی تھی اک دکان سرور غرض کہ شہر نہ تھا تھا یہ ایک کان سرور
جدھر کو دیکھیے آواز بربط و نے ہے
نہ جانتا تھا کوئی رنج و غم تو کیا شے ہے

داغ:

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
یہ شہر وہ تھا کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشکِ تجلّیِ طور تھا اس کا

تباہی کا المیہ

مختلف شہرآشوبوں میں جنگِ آزادی کے واقعات بھی ملتے ہیں اور اہل دہلی پر جو جو مصیبتیں جس انداز سے وارد ہوئیں شاعروں نے ان کو بھی بیان کیا ہے۔ دہلی کو پہلے باغی افواج نے لوٹا۔ پھر جب انگریزی فوج وہاں پہنچ گئی تو اس نے اسے تاراج کیا اور پھر جو کسر رہ گئی تھی آس پاس کے لٹیروں نے پوری کردی۔ تباہی کی یہ اَلم ناک داستان بیشتر شاعروں نے بیان کی ہے۔

کامل:

یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا آئی کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی
نہ دین دار تھی یہ اور نہ تھی یہ دین داری سیاہ رُووں کو آتی تھی بس سیاہ کاری

محسن:

گناہ گار ہوئی بے گناہ تھی دہلی مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خان کم بخت

تجمل:

کالے آئے تھے یہ کیا کالی بلا آئی تھی ہوگئے خاک بہ سر خورد و کلاں دہلی

سوزاں:

بلا یہ پوربیے میرٹھ کے جو یہاں آئے　　عمل ہمارے مجسم یہ سامنے آئے

افسردہ:

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی　　چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی　　فوج کیا آئی قیامت آگئی

آزردہ:

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آگئی　　کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آگئی

داغ:

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا　　یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

سالک:

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوپائی　　کہ فوج باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی

''فوج باغیہ'' شعرا نے کمپنی کی ان فوجوں کو کہا ہے جنھوں نے کمپنی کی حکومت ختم کرنے کے لیے جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ انگریزوں نے والیان ریاست کی حمایت حاصل کر کے اور دوسرے وطن دشمن عناصر کو ملا کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ دہلی کی نفیس اور شاندار عمارتیں گرا دی گئیں اور کئی مسجدیں شہید کی گئیں۔[۲] پھر قابض فوجوں اور ان کے ساتھ آنے والوں نے دہلی اور اہل دہلی کو خوب لوٹا اور قتل عام کیا۔ دہلی کے باہر لٹیروں اور میواتیوں کا یہ زور و شور تھا کہ شہر کے باہر قدم رکھا اور اُنھوں نے لوٹا[۳] شعرا نے اپنے اشعار میں ان ساری درد و غم کی حامل کیفیات کو شعر میں سمو دیا ہے:

کامل:

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا　　ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

سوزاں[۴]

اُنھوں نے آتے ہی دہلی میں قتل عام کیا

سالک:

تمام شہر کی خوب آ کے خاک اُڑوائی　　بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی

دراز دستیِ دیہاتیانِ بدانجام خدا دکھائے نہ صورت کبھی سنائے نہ نام
کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے جن کا کلام گریز پا جو نکل کر گئے لیے وہ تمام
لٹا لباس تمام آبرو بھی ہاں کھوئی
گرہ میں کچھ بھی نہ نکلا تو نقد جاں کھوئی

سوزاں:

یہاں کے جتنے تھے اوباش مل کے ان کے ساتھ کہا بنائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کے گھات
مگر یہ شرط ہے گر آئے کچھ ہمارے ہاتھ برائے نام نکالی یہ لوٹنے کی بات
جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اس پہ چڑھ جاتے
فرنگی اس میں ہیں یہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے

اکڑ کے پنجوں کے بل جو زمیں پر چلتے جو سیدھی بات کرے ان سے اس کو وہ دلتے
تفنگ و تیغ کو چمکاتے ہر گھڑی ملتے نشے میں لاف وہ کرتے تو سن کے سب جلتے

نہ تھی وہ قابلِ رحمت پڑے نہ اب پالا جہاں آباد پر اس فوج نے ستم ڈالا

داغ:

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ مبین کیے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین
رَوا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا

اہل دہلی انگریز اور باغی افواج کی لوٹ مار کو برداشت نہ کر سکے۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دن بھر شہر سنسان رہتا۔ رات کو انگریز سپاہ لوٹنے کے لیے نکلتیں، دکانیں سب بند رہتیں۔ دوسرے شہر سے غلہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ لوگ بھوک پیاس سے مرنے لگے یا پھر شہر چھوڑ کر جانے لگے۔[۵] شعرا نے عوام و خواص کے ہر طبقہ کی مختلف پہلوؤں سے بربادیوں کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے بعض جو شہر آشوب میں بیان ہوئی ہیں، مفصل ہیں۔ جیسے ظہیر دہلوی، سالک اور داغ کے کلام میں اور غزلوں میں ظفر اور غالب کے ہاں اس قسم کے مناظر نظر آتے ہیں۔

ظفر:

وہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو ان پہ کیسی جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دے پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
و لے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے
نہ دبایا زیر چمن انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
کیا کس نے یارو دفن انھیں بے ٹھکانہ ان کا مزار ہے

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل　　یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل
اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے　　جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے　　فقط حال دہلی سنانے کے قابل

غالب:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنۂ خون ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو　　آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں　　کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں
ایک اہل درد نے سنسان دیکھا جو قفس　　یوں کہا آتی نہیں کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے　　یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

شہر آشوبوں میں دہلی اور اہل دہلی کی بربادی پر بڑی تفصیل سے اظہار خیال ملتا ہے۔ اس کے چند نمونے یہ ہیں۔

کامل:

اس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ — کہ ہم سے ہو نہیں سکتی گفت گو مت پوچھ

عیش:

یا انھیں باغوں میں ہیں چار طرف خاک کے ڈھیر — اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

آزردہ:

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد — لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد

ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد — پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دلی آباد

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے — مصطفا خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

محسن:

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر
نشان نقش قدم ہو گیا ہر اک پامال
دیار ہند سے سب اٹھ گئے ہیں اہل کمال

مبین:

پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہائے کیا — غم آئے یاد نہ کیوں کر جناب اصغر کا

یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہے دہلی — پدر کو لاش پسر پر رلاتی ہے دہلی

بجائے آب ملے اشک رونے کی جا ہے — غذا ہے غم کی شب و روز حال ایسا ہے

نہ شیر خواروں کو ملتا ہے شیروائے غضب — زبان پھیرتے معصوم ہیں لبوں پر آپ

پہلے محشر سے قیامت آ گئی — حشر کی سر پہ مصیبت آ گئی

لب پہ گردوں کی شکایت آ گئی — جان پر افسوس آفت آ گئی

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ظہیر دہلوی:

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سرو سامان　　وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں　　وہ دار و گیرِ سپاہ شریر بے ایمان

نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے　　گُل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے　　کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرش گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں

سالک:

رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت آہ
کچھ اور ہوگئی سارے جہاں کی صورت آہ
یہ انقلاب ہے یا ہے قیامت صغرا　　کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا　　بنا ہے ہُو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد
کسی کے لب پہ فغاں ہے کسی کی چشم ہے تر　　کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر

بجائے زمزمہ ہر جائے شیون غم ہے
محل عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے
مکان شکستہ ہیں مانند خاطر مایوس　　اجاڑ کوچے بسان دل الم مانوس

یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دیکھے دور سے کوئی تو عبرت آئے

نہیں کس جائے ڈھیر مُردوں کا نہیں کس لب پہ نالہ پیہم
نہیں تل دھرنے کی زمین میں جگہ مردے کا دفن ہے اگرچہ اہم

داغ:

رہی نہ آدھی یہاں سنگ وخشت کی صورت بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت
عجیب شکل گل و گلستان نظر آئی پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی

وہ گل رخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے

اس سلسلے کا ایک گیت بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہے کہ اسے اُنھوں نے رنگون میں قید خانہ کی دیوار پر لکھ دیا تھا۔[۲]

ہند میں کیسو پھاگ مچو ری، جورا جوری
ہند کا تختہ گلشن بنا تھا کیسر کی سی کیاری
گرم ہی نندھنی کے جو نکسے لٹ گئی باگ بہاری
ہند میں کیسو پھاگ مچو ری، جورا جوری
گولن کے کمکے بنائے توپن کی پچکاری
سینے کھائی دی مکھ ماری
ایسی ہوئی کھلائی شور دنیا میں مچو ری
ہند میں کیسو پھاگ مچو ری، جورا جوری

ان تمام واقعات کا نتیجہ عام بھوک، اقتصادی نظام کی بربادی اور عوام کی تباہ حالی کے انداز میں نکلتا تھا۔ ان شہر آشوبوں میں اس مضمون پر بھی اظہار خیال ہے لیکن چوں کہ ساری ہی سلطنت بربادی کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی اور تہذیب ہی ختم ہو رہی تھی چناں چہ ان بڑے المیوں نے اس پہلو کو زیادہ شدت سے محسوس نہ کرنے دیا۔ اس سے قبل جیسا کہ مثالیں دی گئی ہیں شاہی خاندان اور طبقہ امرا کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تاراج ہونے کا جو اثر ان شعرا کے دل پر تھا اس کا اظہار جابجا اُنھوں نے کیا

ہے۔ اس اظہار کے پیچھے موجود فقر و فاقے اور اقتصادی نظام کی بدحالی کا غبار زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

سالک:

وہ لوگ کھایئے جن کے نشان کی قسمیں　　　پڑے ہیں طالعِ ناساز گار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یا اب پڑے ہیں محبس میں　　　نہ تاب ہے دل میں نا طاقت جان بے کس میں

جو تشنہ لب ہوں تو آب دم سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود
الٰہی کیا ہوئے اجناس رنگ رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گل و خشت و چوب و سنگ کے ڈھیر

کنور بشن پرشاد دہلوی:

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے
کوئی بے کسی میں اداس ہے کوئی رنج و غم سے بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانے میں وہ الم سے زار و نزار ہے
ہے کوئی قلق سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے، نہ شمار ہے

داغ:

جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے　　　بجائے ابر کرم مفلسی برستی ہے
یہ تنگ جینے سے ہیں ایسی تنگ دستی ہے

تجلی:

مال مستی سے جنھیں ہوش نہ تھا دنیا کا
فاقہ مستی میں ہیں وہ عشرتیان دہلی

اس موضوع پر لکھی جانے والی غزلوں نظموں میں دہلی کی سابقہ عظمت اور جنگ آزادی کے بعد اس کی بربادی کے متعلق جو اظہار جذبات و تاثرات شعرا کے ہاں ملتا ہے فنی خوبیوں اور تاثیر کے اعتبار سے اس قسم کی نظموں کا بہترین حصہ ہے۔ دہلی کی بربادی کے تاثرات ہر شاعر کے ہاں مختلف ہیں۔ متاثر سب ہوئے، غم سب کو ہے لیکن غم کا پہلو اور اس کی نوعیت میں فرق ہے۔ چناں چہ دہلی کی

بربادی کے متعلق ہر شاعر کا زاویۂ نگاہ مختلف ہے۔ کسی نے دہلی کی مجلسی زندگی کے ختم ہونے پر آنسو بہائے ہیں۔ کسی نے اہل کمال کے غم کو بیان کیا ہے۔ کسی کو دہلی کے آثار و عمارات اور اس کی خوب صورتی کے مٹ جانے کا افسوس ہے۔ کوئی قتلِ عام پر رو رہا ہے اور کوئی احباب کے غم میں آنسو بہا رہے ہیں۔ اس قسم کی حامل مجموعی کیفیات و تاثرات کو اشعار کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تجلّی:

پھر بندھا دل پہ خیال دہلی　　پھر ہوا رنج و ملال دہلی
صرف اک نام کو باقی ہے نشان دہلی　　نہ وہ رفعت ہے نہ وہ شان دہلی

احسن:

غم بربادی دہلی میں بجائے مے ناب　　خون دل پیتے ہیں اب بادہ کشان دہلی

کامل:

اس کی رونق بازار چار سُو مت پوچھ　　کہ ہم سے ہو نہیں سکتی ہے گفت گو مت پوچھ

سالک:

یہ شہر کس لیے برباد ہوگیا یا رب　　لگی کسی کی یہ کیا ایسی بددعا یا رب

مجروح:

ذکر بربادیِ دہلی کا سُنا کر یا رب　　نشتر زخم کہن پر نہ لگانا ہرگز
آب رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا　　دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
اب یہ شہر ہے اک قالبِ بے جان ہمدم　　کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز
رہی یاران گزشتہ کی کہانی باقی　　یہ تو بھولا ہے نہ بھولے گا فسانہ ہرگز
صوت بلبل طرب انگیز سہی پر ہمدم　　درد افسردہ دلوں کو نہ سنانا ہرگز
جمع ہے مجمع احباب فضا میں تیری　　اے تصور یہ مرقع نہ ہٹانا ہرگز

حالی:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک　　دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو　　اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

صورتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی　　کوئی دل چسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

ایسی نظموں میں کہیں کہیں کسی شاعر نے دہلی کی بربادی کے اسباب وعلل پر بھی روشنی ڈالی ہے، کسی نے قلعہ معلیٰ کی نااہلی کو اس کا باعث قرار دیا اور کسی نے اپنے ہی اعمال کو اس کا سبب بتایا۔ کچھ شاعروں نے حالات کا تجزیہ کر کے اس حادثے کو اقتصادی بدحالی، طبقاتی امتیازات، اخلاقی بے راہ روی اور بداعمالیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جیسے

آزردہ:

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی　　ان کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی

مبین:

بے سبب کاہے کو دیتی ہے یہ گردش تقدیر
یعنی ہر جرم گزشتہ کی عیاں ہے تعزیر

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے　　شکر نعمت نہ کیا ہم سے بداقبالوں نے
ہائے کیا کیا نہ زمانے نے کیے مکروہات　　ناچ اور رنگ میں دن رات گزاری اوقات
عشق میں محو رہے بھول گئے صوم و صلات　　زر کی الفت میں ادا ہی نہ کیے حج و زکات

ظلم گوروں نے کیا اور نہ کیا کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ظاہر، رام پرشاد:

کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب　　اپنے اعمال ہوئے آفت جان دہلی

۶- تحریک شاہ ولی اللہ کا شعری ادب

شاہ ولی اللہ کی تحریک نے برِعظیم کی ملّت اسلامیہ پر گہرے اور وسیع، علمی، فکری، تہذیبی اور سیاسی اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی تحریک برِعظیم کی سلطنت اسلامیہ کے زوال اور معاشرتی نظام کی فرسودگی کا نتیجہ تھی اور یہ فرسودگی خود معاشرے کی اخلاقی گراوٹوں کا سبب تھی۔ یہ صورت دہلی پر نادر شاہ کے حملے اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کی غارت گری اور برِعظیم کے سلاطین و امرا کی خود غرضانہ کوتاہ بینی سے روز افزوں رہی۔ اس وقت کا شعوری احساس جو شاہ ولی اللہ جیسے متبحر اور دور اندیش عالم میں جاگزیں تھا، اخلاقی احیا کی غرض سے ایک تحریک کا اجرا چاہتا تھا جو اس وقت کی بنیادی ضرورت تھی۔

اخلاق اور معاشرے کے زوال کا تصور اس شخص پر بڑی گرانبار ذمہ داری عائد کرتا ہے جو اپنی قوم کے اسباب وانحطاط کو دور کرنا چاہتا ہو۔ شاہ ولی اللہ نے اتنے زبردست کام سے پہلوتہی نہیں کی اور اسے غیر معمولی کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سیاسی انحطاط کے سیلاب کو روک نہ سکے مگر اُنھوں نے اپنی قوم کو اس قابل بنادیا کہ وہ اپنے عظیم ماضی سے مستقبل کی تعمیر کا عزم اخذ کرسکے۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ اُنھوں نے اسلامی فکر اور جدوجہد کے بہت سے میدانوں میں نمایاں اثرات چھوڑے۔ وہ جانتے تھے کہ اس امر کا بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان کے بعد برِعظیم کے مسلمانوں کی اخلاقی وسیاسی احیا کا لائحہ عمل جو اُنھوں نے ترتیب دیا تھا جاری رہ سکے۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے اپنے صاحبزادوں اور ایسے علما کی ایک جماعت ترتیب دی جس نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو وسعت دی۔ اس کی متعدد صورتیں تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے تابعین نے ان کی تصانیف کے مطابق تعلیمات اسلامی کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ اس طرح اس تحریک کے مقاصد کی حامل بے شمار اُردو تصانیف منظر عام پر آ ئیں۔

تحریک شاہ ولی اللہ کا اُردو شاعری سے بھی بڑا قریبی تعلق رہا۔ خود شاہ صاحب فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی غزلیں اور رباعیاں بڑی تعداد میں ان سے یادگار ہیں۔[۱] ان کے عربی دیوان کو ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے جمع کیا تھا اور اسے شاہ رفیع الدین نے مرتب کیا تھا۔[۲] شاہ عبدالعزیز خلف شاہ ولی اللہ فارسی میں شعر کہتے تھے[۳] اُردو زبان پر عبور رکھتے تھے۔ ذوق کا ان کی زبان دانی سے مستفید ہونا مسلّم ہے۔ شاہ نصیر سے اختلاف کے بعد ذوق نے شاہ عبدالعزیز سے رجوع کیا تھا۔[۴] خود اس خاندان میں اور اس کے متعلقین میں کئی شاعر گزرے ہیں۔ غلام مصطفیٰ شاہ شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے تھے۔[۵] میر قمرالدین منت کے شاہ عبدالعزیز سے قریبی تعلقات تھے۔[۶] بعد میں اُنھوں نے جب شیعہ مذہب اختیار کیا تو شاہ صاحب نے تحفۂ اثنا عشریہ لکھی۔ منت نے فخرالدین دہلوی سے بیعت کی تھی[۷] فخرالدین دہلوی شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے اور آپس میں مجلسی تعلقات رکھتے تھے۔[۸] میر غلام حسین یاد[۹] میر نظام الدین ممنون[۱۰] اور میر باقر علی جعفری[۱۱] میر قمر علی منت کے صاحبزدگان تھے۔[۱۲] شاہ قدرت اللہ شاہ عبدالعزیز کی اولاد میں سے تھے۔[۱۳] ابتداً میر شمس الدین فقیر سے اصلاح سخن لی۔[۱۴] جو خود فخرالدین دہلوی سے مستفیض تھے۔[۱۵] فقیر نے بعد میں مرزا مظہر جان جاناں سے استفادہ کیا۔[۱۶]

خانوادے احباب اور متعلقین کے علاوہ ایسے بھی شاعر تھے جو کہ خاندان شاہ ولی اللہ کے حلقہ اثر میں رہے۔ رنگین نے شاہ ولی اللہ کے ایک وصیت نامہ کو جس میں بچہ کی پیدائش سے مرنے کے بعد تک کے مراسم کا رد اور بیان ہے تصنیف رنگین کے نام سے منظوم کیا ہے۔[۱۷] اور شاہ عبدالعزیز کے اکثر واقعات کو اخبار رنگین میں رقم کیا ہے[۱۸] رؤف احمد رافت کا سلسلہ مجدد الف ثانی سے ملتا ہے[۱۹] علوم ظاہرہ شاہ عبدالعزیز سے حاصل کیے تھے[۲۰] اور شاہ غلام علی شاگرد مرزا مظہر سے بیعت تھے۔[۲۱] شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے[۲۲] حکیم عبدالحق سکندر آبادی شاہ عبدالعزیز کی خدمت کیا کرتے تھے[۲۳] نواب ضیاءالدین احمد نیر رخشاں غالب کے شاگرد تھے۔ علم تفسیر وحدیث شاہ عبدالقادر کے شاگرد مولوی کریم اللہ سے اور فلسفہ منطق مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کیے تھے[۲۴] محمد حبیب الرحمٰن انصاری بیدل حاجی احمد علی محدث سہارنپوری کے صاحبزادے تھے جو مولانا شاہ محمد اسحٰق کے نام ور شاگردوں میں گزرے ہیں، بیدل غالب سے مشورۂ سخن لیتے تھے[۲۵] میر قاسم علی قاسم فخر الدین دہلوی سے عقیدت رکھتے تھے[۲۶] میر محمد علی بیدار کو بھی ان سے عقیدت تھی۔[۲۷] خواجہ احسن اللہ خان بیان شاگرد مرزا مظہر ان کے مرید تھے۔[۲۸] میر شاہ علی درویش،[۲۹] میر بشارت علی بشیر[۳۰] محمد قمرالاسلام جنون[۳۱] مرزا جیون رضا[۳۲] میر ابوالمعالی رغبت[۳۳] میر نجم الدین سیادت[۳۴] مرزا اشرف علی شرافت[۳۵] میر صادق علی صفدری[۳۶] فدا حسین فدا[۳۷] میر روشن علی خان فروغ،[۳۸] شیخ حسن علی مضطر لکھنوی،[۳۹] میر مکھون خان مظفر،[۴۰] شیخ عبدالرحیم مفتون،[۴۱] محمد صدرالدین مجہور،[۴۲] مرزا غلام محی الدین اشکی،[۴۳] امہر اللہ خان غیور،[۴۴] میر نظام الدین ممنون کے شاگرد تھے اور میر سعادت علی تسکین[۴۵] مرزا محمد حفیظ نعمت،[۴۶] فقیر اللہ فقیر،[۴۷] میر یعقوب علی عیاش،[۴۸] میر قمرالدین منت کے شاگرد تھے۔ نصر اللہ خان وصال حکیم ثناء اللہ خان فراق کے صاحبزادے،[۴۹] جو خود درد کے شاگرد تھے،[۵۰] مرزا اسد اللہ بیگ رفیق ثناء اللہ فراق سے مشورۂ سخن لیا کرتے تھے۔[۵۱] میر فرید الدین مقبول،[۵۲] اور آفاق[۵۳] بھی فراق کے شاگرد تھے۔ مرزا قادر بخش صابر کو شاہ عبدالعزیز سے خاص عقیدت تھی،[۵۴] غلام مصطفیٰ خان شیفتہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے اور شاہ غلام علی کے خلیفہ شاہ عبدالغنی نقش بندی سے بیعت تھے۔[۵۵] انھوں نے جوانی میں شاہ محمد اسحٰق کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔[۵۶] مومن کو شاہ عبدالعزیز سے عقیدت تھی۔ ان کا خاندان شاہ ولی اللہ سے عقیدت رکھتا تھا۔[۵۷] شاہ عبدالعزیز نے مومن کے کان میں اذان دی تھی۔[۵۸] مومن نے شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کی تھی[۵۹] صدرالدین

آزردہ نے علم نقلیہ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر شاہ محمد اسحٰق سے حاصل کیا تھا۔[۶۰] محمد ضیاالدین خان نیر نے علم تفسیر و حدیث مولوی کریم اللہ سے حاصل کیے تھے، جو شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔[۶۱] غلام جیلانی رفعت شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں تھے۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے جنگ نامہ افاغنہ و انگریز منظوم ان سے یادگار ہے۔[۶۲] میر ملھو سرور[۶۳] اور ناصر خان[۶۴] ان کے شاگرد تھے۔ میر فرزند علی موزوں[۶۵] میر غلام علی اظہر،[۶۶] مرزا بچو ذرہ،[۶۷] طالب علی عاشق،[۶۸] مرزا ابو اعلیٰ ہاتف[۶۹] وغیرہ شمس الدین فقیر سے مستفید تھے اور حفیظ[۷۰] نسیم اللہ نسیم[۷۱] شاہ عبدالحق نعمت،[۷۲] الٰہی بخش نشاط[۷۳] بھی خانوادہ شاہ ولی اللہ سے نسبت رکھتے تھے۔[۷۴]

یہ شاعر گو کہ اس تحریک کا متعلقہ فکر ان کے اشعار میں دست یاب نہیں، مجلسی زندگی میں اپنے حلقۂ اثر کو متاثر ضرور کرتے رہے ہیں۔ تحریکِ مجاہدین بھی اسی تحریک کے زیرِ اثر پیدا ہوئی تھی اور اس کی پیروکار بنی لیکن یہاں فکر کے جس پودے کی آب یاری شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے کی تھی، اس نے عمل اور جدوجہد کے میدان میں سرگرمی اور مستعدی پیدا کر دی۔

۷- تحریکِ مجاہدین کا شعری ادب

تحریکِ مجاہدین کا زیادہ تر کام نثر میں کیا گیا۔ چوں کہ یہ تحریک جہاد کے مقصد کو پیش نظر رکھے ہوئے تھی، اس لیے اس قسم کی تحریک سے یہ توقع رکھنا کہ وہ، خصوصاً شاعری کی حد تک مجلسی زندگی کے شعرا پر اثر انداز ہو سکے گی، نتائج کے اعتبار سے زیادہ خوش آیند نہیں ہو سکتا تھا۔ اس تحریک کے مقاصد کی بجا آوری کے لیے رجزیہ شاعری کی ضرورت تھی، جو تخلیق ہوئی، تاہم اس قسم کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس تحریک نے مجلسی زندگی کے شعرا کو بھی متاثر کیا اور اُنھوں نے اپنے طور پر تحریک کا ساتھ دیا۔

شاہ ولی اللہ جس مقصد کی تکمیل چاہتے تھے، ان کے بیٹوں نے اپنی تمام زندگی باپ کے بلند اصولوں اور افکار و تعلیمات کی نشر و اشاعت میں گزار دی۔ اُنھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر مبنی تھیں اور ان کی زبان ایسی تھی کہ انھیں معمولی درجے کی تعلیم کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا۔[۱] شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کا بامحاورہ اور لفظی ترجمہ کیا تاکہ جو لوگ فارسی نہیں جانتے، اس کے معنی اُردو میں سمجھ سکیں اور اس طرح سے اس تحریک کی نشر و اشاعت ہو سکے۔ سیّد احمد بریلوی نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے لائحہ عمل کی زیادہ سے زیادہ ترویج کے لیے، بیشتر افراد کو اُردو میں لکھنے اور شعر کہنے کی ترغیب دی۔[۲] سیّد احمد خود بھی شعر کا ذوق رکھتے تھے۔ اور اکثر اوقات

اشعار پڑھا کرتے تھے۔[۳] ان کے قریب ترین رفیق شاہ اسمٰعیل، جنھوں نے نثر میں کئی کتابیں لکھی تھیں، شعر بھی کہتے تھے۔ کچھ منظومات فارسی میں، ایک نعتیہ قصیدہ، سیّد احمد بریلوی کی مدح میں ایک قصیدہ، ایک مثنوی ''سلک نور'' فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں ان سے یادگار ہیں۔[۴] لشکر مجاہدین میں دو شاعر مولوی خرم علی بلہوری اور قاضی علاؤالدین بگھروی نمایاں تھے۔ خرم علی بلہوری نے تحریک کے مقاصد کے تحت کئی کتابیں تصنیف و ترجمہ بھی کیں اور ایک جہادیہ رزمیہ مثنوی لکھی تھی، جو لشکر میں جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی۔[۵] اس نظم میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھانے، ان میں جوش اور جذبات پیدا کرنے کے لیے جہاد کی اہمیت، اس کا مقصد اور اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ پھر معاشرے کے مختلف طبقات کے افراد کو جہاد کے لیے اکسایا ہے۔ اس کے چند منتخب اشعار یہ ہیں۔[۶]

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار ۔۔۔ اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار
جس کے پیروں پہ پڑے گردِ صفِ جنگ جہاد ۔۔۔ وہ جہنم سے بچا نار سے ہے وہ آزاد
جو مسلمان رہ حق میں لڑا لحظہ بھر ۔۔۔ روضۂ خلد بریں ہوگیا واجب اس پر
اے مسلمانو سنی تم نے جو خوبیِ جہاد ۔۔۔ چلو اب اس کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے ۔۔۔ غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے ۔۔۔ اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو ۔۔۔ سیّد احمد کو ملو جلد سے کافر مارو
بارہ سو سال کے بعد ایسے ارادے والا ۔۔۔ ہوا پیدا ہے مسلمانو کرو شکرِ خدا
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو ۔۔۔ وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو
اے جوانان اسد حملہ و رستم قوت ۔۔۔ کام کس دن کو پھر آوے گی تمھاری جرأت
دوستو جب تمھیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا ۔۔۔ پھر تو بہتر ہے کہ جان دیجیے در راہ خدا

اور آخری شعروں میں خدا سے یہ مناجات کی گئی ہے:

اے خداوندِ سماوات و زمیں رب عباد ۔۔۔ اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد
اپنا دے زور مسلمانوں کو زور آور کر ۔۔۔ وعدۂ فتح جو ہے ان سے اسے پورا کر

ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

اپنے رسالہ نصیحۃ المسلمین کے آخر میں مولانا خرم علی بلہوری کے رسالہ کی تصنیف کے مقصد اور اس کے موضوع کے مطابق ایک مختصر نظم بھی تحریر کی تھی جو رسالہ کی طرح خالص اصلاحی مقصد رکھتی تھی۔

قاضی علاؤالدین بگھروی ممتاز عالم تھے۔ یہ سیّد صاحب کی ایما سے اسلامی مسائل کو نظم کر رہے تھے، تاکہ عام خواندہ مسلمان انھیں بآسانی از بر کر لیں۔ وہ اس پر شاہ اسمٰعیل سے اصلاح لیا کرتے تھے[۷] ان دو کے علاوہ چند اور افراد کے نام ملتے ہیں جو اس تحریک سے متعلق تھے اور اس کے مقاصد کے تحت شعر کہتے تھے۔ مولوی نصیرالدین نے سانحۂ بالاکوٹ کے بعد اس تحریک کو استقامت بخشی تھی۔ ان کا شمار تحریک کے اہم شرکا میں ہوتا ہے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی شعر گوئی تحریکی مقاصد کی حامل ہے۔ ان کی ایک نظم[۸] کے یہ چند منتخب شعر ہیں۔

کر دے مسلمان سے شرک کی باتوں کو دور شوق ہو توحید کا عمر ہو اس میں بسر
بدعت و کفر و نفاق ان کو تو جلدی سے کھو اوج ہو اسلام کا شرع ہو بازیب و فر
پھوٹ مسلمانوں سے اے مرے رب دور کر اور انھیں ایسا بنا جیسے ہوں شیر و شکر

مولانا یحییٰ علی، انبالہ کے مقدمہ میں ماخوذ تھے، جس کے نتیجے میں انھیں انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔[۹] کبھی کبھی شعر کہتے تھے:

دریائے عشق خالق ہر دو جہاں میں ہم نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ جوگی ہوئے ہیں محرمِ اسرار کے لیے

مولانا ابوالحسن جو سیّد احمد بریلوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اُنھوں نے سیّد صاحب پر ایک قصیدہ لکھا تھا[۱۰] اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

کیا کروں قافلہ سالار کا اس کے میں بیان جس کے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر
سیّد احمد و عالی حسب و فخر زماں رہبر راہ شریعت خلف پیغمبر
رکن الدین مولوی عبدالحئی و شاہ اسمٰعیل فیض سے تیرے ہوئے کاملوں کے سردفتر
جس میں راضی ہو خدا ہے وہی ان کو منظور آبرو کا نہ انھیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر

عبدالحق آروی مجاہد بھی تھے اور عالم بھی، شعر بھی کہتے تھے۔ اُنھوں نے جنگ امبیلا کے واقعات پر ایک طویل بحر میں مثنوی درمقال' لکھی تھی[۱۱] حکیم عبدالحمید صادق پوری، مولانا احمد اللہ[۱۲] کے بیٹے اور مولانا یحییٰ علی[۱۳] اور مولانا عبدالرحیم[۱۴] کے بھتیجے تھے۔ اُنھوں نے ایک مثنوی شہر آشوب میں اپنے

خاندان کی تباہی کا حال لکھا تھا[15] امین اللہ پیام، سیّد احمد بریلوی کے لشکر میں شامل تھے۔ اُنھوں نے فرضیت جہاد میں ایک رسالہ عربی زبان میں تصنیف اور پھر اس کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ میر قاسم علی قاسم سادات بارہہ سے تھے لیکن مذہب تشیع سے دل گرفتہ ہو کر شاہ اسمٰعیل شہید کے ہاتھ پر توبہ کی[16] اور راہ تسنن اختیار کی، اور انھیں کے ساتھ جہاد میں شہید ہوئے۔ ان سے اُردو اشعار منسوب ہیں۔[17]

مولوی محمد حسین فقیر نے شاہ اسمٰعیل شہید کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا[18] اس کے چند شعر یہ ہیں:

پوچھیے نام تو ہم نام ذبیح اللہ تھے ۔۔۔ بو عمر تھے وہ اگر پوچھیے ان کی کنیت
عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا ان کے ہو بیان ۔۔۔ علما کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت
ہر جگہ دینِ محمد کا رواج ان سے ہوا ۔۔۔ ظلمت دہر میں روشن ہوا نورِ سنت
غازی ایسے تھے کہ کیا ان کی غزا کا ہو بیاں ۔۔۔ آب شمشیر کو پیتے تھے وہ مثل شربت
ان کی شمشیر کا زہراب ملا دیتا تھا ۔۔۔ فوج کفار کے دریا میں عجب سمّیت
یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا ۔۔۔ سکھ سے پھر رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت
مال سے ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا ۔۔۔ تھا تو یہ کام تھا عال ہو یہ دین و ملت

رسالہ تسعہ میں رجز ''جہادیہ'' کے علاوہ ایک اور منظوم رسالہ بھی ہے۔ اس کا نام حادق الاشرار ہے۔ اس میں ۲۵۶ خمسے ہیں، جن میں مختلف موضوعات ہیں۔ توصیف جہاد، شاہ اسمٰعیل کی شجاعانہ جنگ، دھوکے باز پیروں اور باطل مرشدوں کی مذمت وغیرہ۔[19]

اس تحریک کے متعلقہ افراد نے تحریک کے مقاصد کے تحت لکھی جانے والی کتب نثر و منظوم بھی کیا تھا۔ عقائد نامہ شیخ عبدالحق کو حیدر حسن نے اور عبدالرحیم نے رسالہ گناہ کبیرہ و فتح اللہ نے رسالہ مشارق الاشرار کو نظم کیا تھا۔[20] تحریک کے متوسطین میں شاہ نور محمد،[21] حاجی امداد اللہ[22] مولانا شیخ محمد تھانوی،[23] مولانا محمد یعقوب نانوتوی، جو حاجی امداد اللہ سے بیعت تھے،[24] نام تخلص رکھتے تھے اور ان کا مختصر کلام بیاض یعقوبی ہے[25] محمد قاسم نانوتوی، جو مولانا مملوک علی، صدر الدین آزردہ اور شاہ عبدالغنی سے مستفیض تھے،[26] شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ شاعری میں ان سے قصائد قاسمیہ یادگار ہے[27] مولانا محمد احسن نانوتوی جو شاہ عبدالغنی سے بیعت تھے[28] اور جن کے حلقہ احباب میں حاجی امداد اللہ، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی

وغیرہ شامل تھے[۲۹] شعروشاعری سے دل چسپی رکھتے تھے۔[۳۰]

کچھ اور شاعر جو اس تحریک میں شامل تو نہ تھے لیکن براہ راست اس تحریک یا اس کے شرکا سے متاثر رہے، جیسے مولانا عبداللہ علوی، جنھوں نے شاہ اسمٰعیل شہید سے علم حاصل کیا تھا اور سیّد صاحب کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی تھی[۳۱] کبھی کبھی اُردو میں شعر کہہ لیتے تھے[۳۲] سیّد احمد حسن عرشی عربی، فارسی، اُردو کے بلند پایہ شاعر اور غالب کے شاگرد تھے[۳۳] وہ سیّد اولاد حسن قنوجی کے صاحبزادے تھے جو سیّد احمد شہید کے شریک جہاد رہے۔[۳۴] سیّد عبدالرزاق حسینی متخلص بہ کلامی نے فتوح الشام کو صمصام الاسلام کے نام سے نظم کیا تھا۔ اُنھوں نے سیّد احمد شہید سے اپنی عقیدت کو مناقب میں بیان کیا ہے[۳۵] اس کے منتخب شعر یہ ہیں۔

شہِ اصفیا سیّد احمد بنام　　سپہر ہدایت کے ماہ تمام
وہ تھے نور چشم امام رسل　　وہ تھے عاشق خالق جزو کل
فنا عشق مولا میں وہ ہوگئے　　ہیں دونوں جہاں ان کے قدموں تلے
ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم
وہ تھے ہادی و رہنمائے الم

مفتی صدرالدین آزردہ اور ذوق دونوں شاہ عبدالعزیز سے مستفیض اور اس تحریک سے متاثر تھے۔ ذوق کے کلام میں اس تحریک کا اثر کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ مومن کے کلام میں اس تحریک کے اثرات بہت نمایاں اور واضح ہیں۔ عرفی کے طرز میں کہے ہوئے سیّد احمد شہید کی مدح میں دو فارسی قصیدے ان سے یادگار ہیں[۳۶] شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین سے مومن کے خاندانی تعلقات تھے۔[۳۷] مومن نے شاہ عبدالقادر سے عربی سیکھی تھی[۳۸] شاہ عبدالعزیز کا مومن کے کان میں اذان دینا اور نام تجویز کرنا ان کے اثر و رسوخ کو ظاہر کرتا ہے۔[۳۹] اکثر شاہ عبدالعزیز کا وعظ سن کر مومن بعینہ اسی طرح ادا کردیتے تھے[۴۰] جوانی میں سیّد احمد شہید کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انھی کے پیرو و متبع رہے شاہ عبدالعزیز کے انتقال پر اُنھوں نے تاریخ کہی تھی۔[۴۱]

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہوگئے　　فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

مومن کے کلام میں تحریک جہاد پر مبنی کئی اشعار، قطعات اور منظومات ہیں، جن میں وہ سیّد احمد کی مدح اور ان کے مقاصد کی تحسین کرتے ہیں اور خود بھی جہاد میں شریک ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس

موضوع پر ان کے یہ چند منتخب اشعار ہیں۔

وہ کون امام، امام جہانیاں احمد　　کہ محض مقتدی سنت پیغمبرؐ ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد　　جو کوئی اس سے مقابل ہے سو کافر ہے
جو سیّد احمد امام زمان و اہل زمان　　کرے ملاحد بے دین سے ارادۂ جنگ
خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا　　لبوں پر دم بنا ہے جوش خون شوق شہادت کا
نہ کر بیگانۂ مہر امام اقتدا سنت　　کہ انکار آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے　　جلد مومن نے پہنچ اس مہدیِ دوران تلک

مومن نے خرم علی بلہوری کی طرح جہاد پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس مثنوی جہادیہ کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال　　کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جان نثاری کروں　　کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجام الحاد کا　　نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیوں کر ہوں اس کام میں ناشکیب　　ظہور امام زمان ہے قریب
وہ خضر رسول طریق خدا　　کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و مہ
رہے سیّد احمد قبول خدا　　سر امتحان رسول خدا
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات　　ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے　　سر قتل کفار آیا اسے
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک　　کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
جو داخل سپاہ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیب حبیب خداوند ہے　　خداوند اس سے رضا مند ہے
امام زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لیے جان نثاری کرو
عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو　　حیات ابد ہے جو اس دم مرو

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　　عروج شہید اور صدیق دے
میں گنجِ شہیدان میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

بنی نرائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے اہم اور مشہور مصنف اور شاعر تھے۔ ان کے مسلمان ہونے اور سیّد احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ذکر ملتا ہے[۴۳] آخری دور کے شاعروں میں ابو سلیمان فضلی کا نام اہم ہے۔ یہ شاہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے۔ اُنھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر و ادب ورثہ میں چھوڑا ہے۔[۴۴]

۸- جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور اُردو شاعری

شاعروں نے ہر موقع پر اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔[۱] بیشتر سیاستدان اور حکمراں شاعر بھی گزرے ہیں۔ اُردو شاعری میں شاہ عالم ثانی،[۲] جس کا تخلص آفتاب تھا، مرزا جواں بخت جہاں دار،[۳] نواب آصف الدولہ آصف،[۴] نواب غازی الدین خان،[۵] عمدۃ الملک ممتاز،[۶] اور بہادر شاہ ظفر اور شہزادگان میں مرزا احسن بخت[۷] مرزا سلیمان شکوہ،[۸] مرزا فرخندہ بخت جہاں شاہ قمر،[۹] مرزا رحیم الدین ایجاد،[۱۰] شاعری کے ذوق کا اظہار کرتے تھے۔

بہت سے درباری شعرا اپنے سلاطین اور حکمرانوں کے ساتھ انگریزوں کے معتوب رہے۔ جیسے مرزا جان طپش جو نواب شمس الدولہ کے مصاحب تھے۔ جب انگریزوں کے خلاف سازش کے الزام میں شمس الدولہ کو وزیر علی خاں کے ساتھ قید کر دیا گیا تو طپش بھی اس الزام میں ملوث ہوئے۔[۱۱] جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے بیشتر شعرا کو اس الزام کے تحت انگریزوں نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ بعض کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور بعض کو بغاوت کے الزام میں پھانسی دی گئی اور بیشتر جنگِ آزادی میں حصہ لے کر شہید ہوئے۔

مفتی صدرالدین آزردہ فارسی، اُردو کے بلند پایہ شاعر اور فارسی، عربی کے تبحر عالم تھے،[۱۲] جنگِ آزادی کے دنوں میں دہلی کے صدر الصدور تھے۔ اس وقت انھیں بادشاہ کی طرف سے حکم ملا تھا کہ اس وقت تک فوجی مقدمات کی سماعت کریں، جب تک انگریزوں پر فتح حاصل ہو[۱۳] جہاد کے مشہور فتویٰ پر علمائے دین میں ان کے بھی دستخط تھے۔[۱۴] چناں چہ سقوطِ دہلی کے بعد ان پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا اور وہ گرفتار ہوئے۔

امام بخش صہبائی اپنے وقت کے ممتاز عالم اور فاضل تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اُردو شاعری کو اُنھوں نے بڑا متاثر کیا تھا۔ اس وقت کے بڑے بڑے شعرا ان کے مصاحبین میں تھے اور کئی شاعر ان کے شاگرد تھے۔[۱۵] دہلی پر انگریزوں کے غلبہ کے بعد دوسرے باشندوں کی طرح اور اپنے خاندان کے اکیس (۲۱) افراد کے ساتھ[۱۶] بالکل بے گناہ اور بے قصور شہید کیے گئے۔[۱۷]

مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے زمانے کے بڑے پایہ کے عالم تھے۔ سیّد احمد خاں کے دوست غالب اور مومن کے شاگرد تھے۔ جنگِ آزادی کے شروع ہونے پر شیفتہ اپنے ہم رشتہ نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کے ہمنوا اور انگریزوں کے مخالف بن گئے۔ شیفتہ کے ذمہ بادشاہ سے خط و کتابت تفویض تھی۔ جنگ شروع ہونے پر ولی داد خاں، رئیس مالا گڑھ نے جس کی معیت میں شیفتہ سرگرم تھے، بڑی سرگرمی دکھائی لیکن سقوط دہلی کے بعد ہر ایک قابلِ تعزیر قرار دیا گیا۔ شیفتہ کو بھی سات سال کی قید ہوئی[۱۸] جاگیر ضبط ہوئی لیکن درخواست کرنے پر رہا ہوئے[۱۹] ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ان کا بہت سا کلام اس ہنگامہ میں تلف ہو گیا۔[۲۰]

بہادر شاہ ظفر نے اپنی عمر اور مزاج کے تقاضوں کی وجہ سے انقلابیوں کا پورا پورا ساتھ نہ دیا۔ پھر بھی اُنھوں نے اپنی سکت کی حد تک انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ منشی جیون لال کے روزنامچہ ۲ راگست ۱۸۵۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے دربارِ عام میں اپنے چند اشعار سنائے جن میں انگریزوں کی شکست کی دعا مانگی گئی تھی۔ یہ اشعار بعد میں سپہ سالار بخت خاں کو بھیج دیے گئے۔[۲۱]

لشکر اعداء الٰہی آج سارا قتل ہو　　گورکھا گورے سے لے کر تا نصاریٰ قتل ہو
آج کا دن عید قرباں جبھی جانیں گے ہم　　اے ظفر تہ تیغ جب قاتل تمھارا قتل ہو[۲۲]

ظفر سے یہ شعر بھی منسوب ہے:[۲۳]

ایران نے کیا نہ کیا شاہ روس نے　　انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

اس موقع پر منشی محمد غلام علی مشتاق نے دو قطعات تہنیت کہے تھے:[۲۴]

عید ہر سال تمھیں تہنیت آمیز رہے　　غرق خون جان عدو خنجر خون ریز رہے
قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر　　نام کو بھی نہ جہاں میں سر انگریز رہے

نصرت و فتح کا ایک دھوم سے لشکر آیا　　دل سے جب نام ظفر سب کے زباں پر آیا

عید پر عید خوشی پر خوشی آج نہیں لو مبارک ہو کہ دشمن تہ خنجر آیا

وی ڈی ساورکر نے اپنی اہم تصنیف[۲۵] میں انقلابیوں کا زور کم ہونے پر طنزاً کہے جانے والے شعر کو نقل کیا ہے۔

دمدمے میں دم نہیں خیر مانگو جان کی اے ظفر ٹھنڈی ہوئی تلوار ہندوستان کی

ظفر نے اس شعر کا یہ منظوم جواب دیا تھا:[۲۶]

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی تب تو لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

جب جنگِ آزادی ناکام ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو بہادر شاہ پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ لیکن بہادر شاہ نے مقدمہ کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا اور آخر میں ایک بیان دیا جس میں جرم سے انکار کیا۔ اس کے نتیجہ میں فوجی عدالت نے فیصلہ کیا کہ بہادر شاہ نے غداری کی اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ انھیں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ ان کی قبر کے سرہانے کتبہ پر آخر میں یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے۔[۲۷]

چودہ جمادی الاوّلین جمعہ کا روز وقت عصر
حالت قید و بے کسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے ظفر جلاوطن

بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مرزا خضر سلطان بھی شاعر تھے اور صلاح سخن غالب سے لیتے تھے[۲۸] بہادر شاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن اپنے بڑے بھائی مرزا مغل اور بھتیجے مرزا ابوبکر کے ساتھ گولی مار کر ہلاک کیے گئے۔[۲۹]

منیر شکوہ آبادی نے جنگِ آزادی میں عملی حصہ لیا تھا۔ وہ اس وقت باندہ میں نواب علی بہادر خاں کے مصاحب تھے۔ انھیں انگریزوں کے غلبہ کا احساس تھا۔ جب ہنگاموں کا آغاز ہوا تو اُنھوں نے علی بہادر خاں کو مشورہ دیا، جس سے وہ انقلاب میں شریک ہوگئے۔[۳۰] بندیل کھنڈ کے علاوہ ہر طرف انقلابیوں کی حمایتی تھی۔ رانی لکشمی بائی تانتیا ٹوپی اور نانا راؤ علم آزادی بلند کر چکے تھے۔ قریبی ریاستوں کو بھی جنگِ آزادی میں شرکت کا پیغام دیا گیا۔ نواب علی بہادر خان نے اس میں شرکت کے فیصلے کے مطابق اوّلاً راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا[۳۱] اس موقع پر منیر نے تہنیت

میں یہ شعر بھی کہا تھا:

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو　　سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں

جب انگریز دوبارہ باندہ پر قابض ہوئے تو اس موقع پر منیر اور مرزا ولایت حسین امداد لینے کے لیے روانہ ہوئے لیکن یہ دونوں فرخ آباد میں گرفتار کر لیے گئے[32] مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی[33] ان کا دیوان نظم سنیر اس قید کی تکلیفات کے ذکر سے بھرپور ہے۔ اس کی ایک نظم ''فریادِ زنداں'' شہر آشوب کے موضوع پر ہے۔ اُنھوں نے اپنی سات سالہ قید کے حالات ایک طویل قطعہ میں نظم کیے ہیں۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

کوٹھری تاریک پائی مثل قبر　　تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں　　نان گندم تھی سوا مسکیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب　　خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ کمبل اوڑھنا　　گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

ان حالات کو اُنھوں نے اپنے ایک قصیدے میں بھی بیان کیا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

رخ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض پنہائی
صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

مفتی سیّد احمد بریلوی نے جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا۔ نواب خان بہادر خان ناظم روہیل کھنڈ کی حکومت میں مفتی کے عہدہ پر سرفراز تھے۔[34] بریلی میں انگریزوں کے تسلط کے بعد انھیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہاں مصایب و آلام سے متاثر ہو کر اُنھوں نے ایک منظوم عرضداشت بحضور رسالت مآب لکھی تھی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:[35]

نہ سنتا تھا جو کچھ وہ سب کچھ سنا　　نہ ہونا تھا جو کچھ وہ سب کچھ ہوا
لٹا گھر دیار وطن بھی چھٹا　　چھٹے سب کے سب دوست آشنا
اسیری اب اس پہ بہت شاق ہے　　یہ سیّد رہائی کا مشتاق ہے

ایوب خاں کیفی نواب مجدالدین احمد عرف مجو خاں مرادآبادی کے مختار تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے مرادآباد پر قبضہ کر لیا تو ایوب خان کیفی کے لیے بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔[36]

مرزا آغا جان دہلوی خوش نویس[37] اور شاعر تھے[38] ایام جنگ آزادی میں انگریزوں کی

گولیوں کا نشانہ بنے[۳۹] مرزا غلام محی الدین اشکی، میر نظام الدین ممنون اور آزردہ کے شاگرد تھے[۴۰] یہ سقوط دہلی کے بعد شہزادوں کے ساتھ شہید کیے گئے[۴۱] مرزا احمد بیگ احمد دہلوی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔[۴۲] اپنے والد مرزا عاشور بیگ کے ساتھ انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔[۴۳] مرزا عاشور بیگ خود بھی شاعر تھے، شنائی تخلص تھا[۴۴] جس دن انگریز دہلی پر حملہ آور ہوئے اُنھوں نے انگریزوں کا مقابلہ دو مختصر پلٹنوں کی مدد سے کیا، لیکن شہید ہوئے۔[۴۵] عبدالحکیم بسمل دہلوی، امام بخش صہبائی کے بھتیجے تھے۔ اور اصلاح سخن بھی انھیں سے لیتے تھے۔[۴۶] امام بخش صہبائی کے ساتھ شہید کیے گئے۔[۴۷] نواب ظفر یار خاں راسخ شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ بھی لیا تھا۔ اس جرم میں انگریزوں نے انھیں پھانسی کی سزا دی[۴۸] مولانا فیض احمد بدایونی نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا،[۴۹] شاعر بھی تھے اور رسوا تخلص رکھتے تھے۔ جنگِ آزادی کے خاتمہ پر انگریزوں کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ مرزا پیارے رفعت دہلوی نام ور اور خوش فکر شاعر تھے۔[۵۰] امام بخش صہبائی سے مشورۂ سخن لیا کرتے تھے۔ انگریزوں سے دلی نفرت تھی۔ جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو مرزا رفعت الور چلے گئے جہاں وہ ایک سو آٹھ قیدیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ انھیں دہلی لایا گیا اور گولی مار کر شہید کیا گیا۔[۵۱] منشی اکرام الدین، امام بخش صہبائی کے ماموں زاد بھائی تھے، شاعری میں رند تخلص تھا۔[۵۲] صہبائی کے ساتھ ہی شہید کیے گئے۔ غضنفر حسین خان، فرخ آباد کے نواب تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان سے اُردو اشعار بھی منسوب ہیں، تخلص سعید تھا۔ ان کے تمام خاندان نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ ان پر مقدمہ چلا اور پھانسی دی گئی۔[۵۳] مرزا عزیز الدین سرور، بہادر شاہ ظفر کے داماد اور ذوق کے شاگرد تھے[۵۴] انھیں موضع بہادر گڑھ میں گرفتار کیا گیا اور دہلی میں لا کر پھانسی دی گئی۔[۵۵] مولوی عبدالکریم دہلوی صہبائی کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ علم و فضل میں یکتا اور شاعری میں مثالی سمجھے جاتے تھے[۵۶] سوز تخلص تھا۔ اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے۔ مرزا بختاور، مرزا الٰہی بخش کے داماد تھے۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ تخلص شاکی تھا[۵۷] جنگِ آزادی میں مرزا مغل اور بخت خان کے زیر کمان تھے۔ شاہزادوں کے ساتھ گرفتار ہوئے اور گولی سے شہید کیے گئے۔[۵۸] مرزا قمر الدین شیدا، بہادر شاہ کے داماد تھے[۵۹] جنگِ آزادی کے بعد انھیں پھانسی دی گئی۔ حکیم محمد حسین ضیا شاہ جہاں پوری عربی، فارسی، اُردو، پشتو میں شاعری کیا کرتے تھے۔ کئی نثری تصانیف بھی ان سے منسوب ہیں۔ مختلف فنون لطیفہ سے بھی ذوق رکھتے تھے۔[۶۰] جنگِ آزادی کے وقت دہلی میں تھے۔ ناظم شاہ جہاں پور کے ہمنوا بن گئے تھے، اور اُن کے ساتھ جنگِ آزادی میں شریک رہے۔ اور بالآخر شہید ہوئے۔[۶۱] منشی

گھنشیام رائے دفتر شاہی میں ملازم تھے، شاعر تھے اور تخلص عاصی تھا۔ اصلاح شاہ نصیر سے لیا کرتے تھے۔ جنگِ آزادی میں انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔[۶۲] مرزا حالی بخت، مرزا فیروز بخت کے صاحبزادے تھے۔ شاعری میں عالی تخلص کرتے تھے۔ ان سے ایک دیوان منسوب ہے۔ جنگِ آزادی میں شہید ہوئے۔[۶۳] مرزا عباس بیگ کہنہ مشق اور پرگو شاعر تھے۔ شاعری میں آتش اور ناسخ سے مستفیض تھے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

مشاعروں میں غزل کیا چمکتی اے عباس　　جو فیضِ آتش و ناسخ کام کر جاتا

انگریزوں سے شدید نفرت تھی۔ سیاست میں والیِ باندہ علی محمد کے ہمنوا تھے۔ یہ ان کے ساتھ جنگِ آزادی میں شامل رہے۔[۶۴] انگریزوں کے خلاف ان کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے:

اختر جھک گئے ترے خالوں کے سامنے　　گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

اس شعر کو بغاوت پر محمول سمجھا گیا تھا۔ پھانسی پر چڑھنے سے قبل یہ شعر پڑھا[۶۵]

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے　　چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

صہبائی کے صاحبزادوں میں مولوی عبدالعزیز بھی شاعر تھے اور عزیزؔ ہی تخلص بھی رکھتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے۔[۶۶] مرزا خدا بخش قیصر شاہ عالم کے نواسے اور مومن کے شاگرد تھے۔ انھیں اس جرم میں کہ جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا، شہید کیا گیا۔[۶۷] میر جیون قربان سپاہی پیشہ تھے۔ لیکن شعر گوئی سے بھی شغف رکھتے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔[۶۸] ایک موقع پر انگریزوں کے خلاف لڑائی میں شہید ہوئے۔[۶۹] مولوی کفایت علی مجاہدین مراد آباد میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔[۷۰] انگریزوں نے جب دوبارہ مراد آباد پر قبضہ کیا تو دیگر محبانِ وطن کے ساتھ گرفتار ہوئے اور پھانسی پر چڑھائے گئے۔ نعتیہ شاعری میں مہارت رکھتے تھے۔ کافی تخلص تھا۔ اپنے دور کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ جب پھانسی کے لیے انھیں قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو جو غزل وہ پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے تھے[۷۱] اس کے چند شعر یہ ہیں:

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بیجان پر خاکی کفن رہ جائے گا

نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہیں
حشر تک نام و نشانِ پنجتن رہ جائے گا

بدرالاسلام عباسی بدایونی نے جنگِ آزادی کے موقع پر ایک نظم لکھی تھی، جس کا ایک مصرعہ تھا ؎

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنے میں

اس نظم کے کہنے پر انھیں سزائے موت دی گئی۔[۷۲] خان بہادر خان، حافظ رحمت خان کے پوتے تھے۔ اُنھوں نے جنگِ آزادی میں بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا، اور وسیع پیمانے پر تحریک پیدا کی تھی۔[۷۳] اُردو میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے اور تخلص معروف تھا۔ انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی۔ میر محمد حسین خوشنویس تھے اور شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔[۷۴] دہلی پر انگریزی قبضہ کے بعد بے گناہ شہید ہوئے مولوی نسیم اللہ نسیم فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے[۷۵] جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا[۷۶] نتیجتاً گرفتار ہوئے اور شہید ہوئے۔ مولوی اشرف علی بدایونی نے بھی جنگِ آزادی میں بڑی سرگرمی سے شرکت کی تھی[۷۷] بعد میں انھیں انگریزوں نے شہید کر دیا۔ بڑے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ تخلص نفیس تھا، اُردو و فارسی اور عربی میں صاحبِ دیوان تھے۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو انتخاب دہر ان سے منسوب ہے۔[۷۸] حافظ غلام احمد، صہبائی کے قریبی عزیز اور شاعر تھے، تخلص نگہت تھا۔[۷۹] صہبائی کے ساتھ ہی شہید ہوئے۔ ان کے ساتھ شہید ہونے والوں میں محمد یعقوب نسیم[۸۰] اور حافظ فردوس علی خلش بھی، جو صہبائی کے ماموں زاد بھائی تھے شامل تھے۔[۸۱] مولانا امام الدین نے جنگِ آزادی میں شاہزادہ فیروز شاہ کا ساتھ دیا۔ فیروز شاہ نے نواب رام پور کو شکست دے کر کچھ دنوں کے لیے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جب مراد آباد پر قبضہ کر لیا تو اس وقت مولوی امام الدین گرفتار کر لیے گئے اور انھیں پھانسی دی گئی۔[۸۲] وہ فنِ شعر میں حسن کمال رکھتے تھے اور ہادی تخلص تھا۔[۸۳]

جنگِ آزادی کے مجاہدین نے عوام میں جوش جہاد پیدا کرنے اور لشکر میں ولولہ اور عزم بڑھانے کے لیے شاعری کا بھی سہارا لیا تھا۔ نظم و نثر دونوں میں اشتہارات کی تقسیم کا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی نے جب الٰہ آباد میں جہاد کی قیادت سنبھالی تو اُنھوں نے دو اشتہارات ایک نظم اور ایک نثر میں تقسیم کیے تھے۔ جو اودھ، الٰہ آباد اور دوسرے مقامات پر پہنچے گئے تھے۔[۸۴] پہلا اشتہار اس جہادیہ کے ابتدائی اشعار پر مبنی تھا جسے مولوی خرم علی بلہوری نے تحریک جہاد کے لیے لکھا تھا۔ اس رجزیہ سے اشتہار میں صرف ابتدائی ستائیس اشعار لیے گئے تھے۔[۸۵]

باب سوم

اُردو نثر ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

(ا) افسانوی ادب میں آزادی کا رجحان

اُنیسویں صدی کے نصف تک اُردو کا نثری ادب داستانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس امر کی کئی وجوہات نظر آتی ہیں۔ ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کے روز افزوں تسلط کے سبب ہندوستانیوں کے قومی کردار میں مایوسی اور پھر تن آسانی اور سہل پسندی نے جگہ پیدا کر لی تھی۔ اس وقت تک شاہ ولی اللہ اور سیّد احمد بریلوی کی تحریکات کا حلقۂ اثر بڑا محدود رہا۔ داستانوں کے موضوعات اس معاشرے کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ پھر بھی حکومت کا نشہ اور عظمت پارینہ کے خواب ذہنوں میں محو نہ ہو سکے تھے۔ ایسے خوابوں کی تعبیر، بہر طور داستانوں میں نظر آ جاتی تھی، اور ان میں ایسی بادشاہت اور شان و شوکت کا بیان ہوتا تھا جو تاریخ کے عظیم الشان سلاطین کو بھی میسر نہ تھیں۔ چناں چہ اس وقت کے مایوس ذہن اپنے ماحول کی ناخوشگواریوں سے پناہ لینے کے لیے خود کو داستانوں میں مصروف رکھتے تھے۔ جہاں ذہن بغیر کسی عملی جدوجہد کے صرف تخیل کے زور پر تمام ہفت خوان طے کر لیتا تھا۔ اس وقت کے ماحول کے معاشرتی آزار سے قطع نظر داستانوں میں سننے یا پڑھنے والوں کے دل جن چیزوں کے خواہش مند ہوتے تھے، وہ سب مل جاتی تھیں۔ مثلاً غیر معمولی شجاعت زبردست دشمنوں کی زیرباری، بدی کی شکست اور نیکی کی فتح، عشق کے معاملات، وصل کی لذتیں، غیر معمولی حسن اور مثالی ماحول، ہر طرح کا عیش و آرام اور دولت و حشمت یہ سب خیال ہی خیال میں میسر آ جاتی تھیں۔ مجموعی طور پر اس زمانہ کا سیاسی ماحول اور اس کی معاشرتی حالت بڑی حد تک داستانوں کے عروج اور ان کی مقبولیت کی ذمہ دار ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ان کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا۔ اور یہ صورت اس وقت تک رہی جب تک کہ ناولوں کا دور شروع نہیں ہو گیا، اور مختلف تحریکات کے نتیجہ میں افراد کی زندگی مقصدیت کی حامل ہوتی گئی۔

قدیم ادب پر یہ الزام کہ وہ اپنے ماحول کا صحیح ترجمان نہیں، محض سطحی نوعیت رکھتا ہے۔ بہ نظر غائر

مطالعہ اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ جہاں تک داستانوں کا تعلق ہے، جن پر یہ الزام بڑی شدومد سے چسپاں کیا گیا ہے، اس میں بھی عظمت رفتہ کے بعض پہلوؤں کے تابناک مرقعے نظر آتے ہیں۔ ان میں اُنیسویں صدی کے برِّعظیم خصوصاً لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب کا شکوہ ہے۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، سرورش سخن، طلسم حیرت اور داستان امیر حمزہ میں اس نوع کا قابلِ قدر سرمایہ ہے[1]

داستانوں میں خیروشر مسلسل متصادم نظر آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک مستقل جہاد ہوتا ہے۔ ایسی داستانوں کی ایک خصوصیت عام ہے کہ ان میں تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے[2] قصوں میں عقائد اثباتی نوعیت کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے[3]

میر امن نے جو ''دلی کے روڑے تھے'' دہلی کا دربار دیکھا تھا۔ چوں کہ وہ وہاں کی تہذیب کے ہر شعبہ سے واقف تھے، اس لیے اُنھوں نے اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ قصوں کے مقامات برِّعظیم کے باہر کے ہیں لیکن تہذیب عہد مغلیہ کی دہلی کی پیش کی ہے اور قصہ بھی اسلامی روایات پر مبنی ہے[4] ان قصوں میں ہر صفحہ پر قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملتی ہیں جو اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کی تشریح کرتی ہیں[5] اس میں بعض جگہ مذہبی جوش اور ظلم کی کارستانی اس طریقہ سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصے کسی قدر خلاف قیاس معلوم ہوتے ہیں[6] یہ عدم توازن محض میر امن کے ہاں ہی نہیں نورطرز مرصع میں بھی یہ سب بیانات اسی طور پر ہیں[7] بحیثیت مجموعی باغ و بہار ایسے لہجے میں لکھی گئی ہے جو بیک وقت اس رنج وافسردگی کا مظہر بھی ہے جو گزرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد سے بلا ارادہ پیدا ہوتی ہے اور احساس برتری کا ترجمان بھی جو ایسے لوگوں کی زندگی کا آخری سہارا ہوتا ہے، جن سے قسمت اور زمانہ نے یہ اچھے دن چھین لیے۔ وہ گزری ہوئی زندگی کو حسرت سے یاد بھی کرتے ہیں، اور اس کی دی ہوئی نشانی کو دنیا کی سب سے بڑی دولت جان کر اس پر فخر و مباہات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔[8]

رجب علی بیگ سرور نے اپنی بعض تصانیف میں اپنے زمانہ کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی جو معلومات جمع کی ہیں اس کی وجہ سے انھیں سیاسی اور سماجی مورخ قرار دیا جاسکتا ہے[9] سرور کی تقریباً ہر کتاب میں عصری، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اور اس عہد کے تاریخی اور سیاسی حالات کی طرف مجمل اشارے اور بعض صورتوں میں مفصل بیانات ملتے ہیں قصہ کے مافوق الفطرت اجزا میں حقیقی زندگی کے مشاہدات اور تجربات سرور سے پہلے کسی اور داستان گو نے اتنے بڑے پیمانے

پر شامل نہیں کیے تھے۔ فسانۂ عجائب میں زیادہ اور شگوفۂ محبت وغیرہ میں کم تر درجہ پر لکھنؤ کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی صحیح اور دلکش فضا ملتی ہے[10] فسانۂ عجائب کا دیباچہ مجموعی طور پر ایک گزرتی ہوئی تہذیب کی اجمالی تاریخ ہے۔ اس کے مختصر صفحات لکھنؤ کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی بڑی صحیح اور دلکش عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ان صفحات میں مواد کی حقیقت اور صداقت اور بیان کے مبالغہ اور شعریت کا ایسا امتزاج ہے جو اُردو کے پورے افسانوی ادب میں اور کہیں نہیں ملتا۔[11]

سرور کی ایک اور داستان شرار عشق مقابلۃً دوسری داستانوں سے مختلف ہے۔ اس کے پورے قصہ کی بنیاد اخلاقی اور اس کے لیے انداز واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ قصے میں عشق کی بلاخیزیوں کی زنجیر اخلاقی مضامین کے ایک سلسلہ سے جا ملتی ہے۔ اور داستان گو واعظ و ناصح بن کر نادانوں کو دانائی کے سبق سکھاتا اور انھیں دور بینی و دور اندیشی کی راہیں دکھاتا ہے اور پند و نصیحت کی ایسی باتیں کر جاتا ہے جنھیں آدمی گرہ میں باندھتا چلے تو زندگی کے سفر میں قدم قدم پر جن سختیوں اور آزمائشوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان کا جھیلنا آسان ہو جائے[12] اس داستان میں سرور کو جہاں جہاں موقع ملا ہے زندگی کی اہم اخلاقی اقدار کی طرف واضح اشارے کیے ہیں اور ہر جگہ ان کے معاشرتی رنگ کو ابھارا ہے۔[13]

کچھ اور داستانوں میں جیسے نہال چند لاہوری کی مذہب عشق میں ضیافت اور شادی کے موقع پر اسلامی شرفا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے[14] فخر الدین سخن کی سروش سخن جو فسانۂ عجائب کی صدائے بازگشت ہے، اس میں فسانۂ عجائب کے خطوط صاف دکھائی دیتے ہیں[15] جعفر علی شیون کی طلسم حیرت میں بھی لکھنؤ کی معاشرت کا مختصر بیان ہے۔ اس میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل ٹھگ اور پنڈاریوں کی وجہ سے دیہات اور راستوں کا مخدوش ہونا اور سفر میں جان و مال کے ضیاع کا جو اندیشہ تھا اس کی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سرجن سنگھ راجپوت قزاق کی وجہ سے ایک چھوٹی حکومت کا عاجز آ جانا بالکل حقیقت کے مطابق تھا اور یہ ہماری داستانوں کے لیے نئی باتیں تھیں۔[16]

معاشرتی عکاسی کی بنیاد پر داستان امیر حمزہ کو لکھنوی تہذیب کی قاموس قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس سے ساحری اور عیاری نکال دی جائے تو باقی لکھنؤ کی معاشرت ہی بچتی ہے[17] یہ داستان انتہائی طویل ہے اور چھیالیس جلدوں پر محیط ہے[18] اور اس کے تعلق سے اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ایک خواب کی دنیا ہے۔ اس کا ماحول اس قید و بند، مجبوری و افلاس، محرومی و ناکامی سے آزاد ہے، جو اس دور کا خاصہ تھی۔ بلکہ اس میں زندگی آزاد اور پُرکیف ہے۔ یہاں اولوالعزمی کا میدان ہے۔

جرأت و ہمت و طاقت کی آزمایش ہے۔ امن و امان کے بدلے خطروں سے مسابقت ہے۔ اپنی ہمت اپنی قوت کے مطابق ہر شخص مشکل، خطرناک مہمیں سر کر سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی شجاعت و طاقت آزماتا ہے اور صلہ پاتا ہے۔ ملک و مال کسی کی خاص ملکیت نہیں۔ اگر کوئی نااہل ہے تو بہت جلد وہ اپنی حکومت اور اپنا اقتدار و ملک کھو بیٹھتا ہے۔[۱۹] دوسری داستانوں کی طرح اس میں بھی زندگی کی تنگی وسعت سے اور مجبوری آزادی سے بدل جاتی ہے۔ اس داستان کے خالق اپنے ماحول کے تجربات میں بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت کے بدلے بہتر ترتیب، بہتر نظم، تناسب و موزونیت کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ افراد قصہ کے ماحول میں ان کی امنگیں، تمنائیں اور اولوالعزمیاں کھلنے سے پہلے مرجھا نہیں جاتیں۔[۲۰] داستان گو جس زندگی سے واقف تھے وہ اپنی خامیوں اور بدحالیوں کی وجہ سے طمانیت کی حامل نہیں تھی۔ اس لیے ان کے تخیل میں ایک حسین و کامل زندگی کا تصور موجود ہے۔[۲۱]

ان نامور داستانوں کے علاوہ اور بھی ایسی مختصر اور کم مشہور داستانیں ہیں، جن میں اسلامی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی ہے۔ اس قبیل میں کچھ قصے تاریخی ہیں۔ ان کا مرکز خلیفہ ہارون رشید کی شخصیت ہے۔ تاریخی کہانیاں عراق اور مصر کے بارے میں ہیں۔ ان میں عربی تہذیب اور اسلامی شوکت کا جو قرار واقعی اور ستھرا بیان ہے وہ اُردو کے دوسرے افسانوں میں نہیں۔[۲۲]

(۲) تحریکِ شاہ ولی اللہ کا نثری ادب

شاہ ولی اللہ کی فکری اور علمی تحریک نے اُردو شاعری کی طرح اُردو نثر کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی تبلیغ و اشاعت کے لیے اس تحریک نے اُردو شاعری سے بڑھ کر نثر کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان میں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور پھر شاہ عبدالغنی کے صاحبزادے شاہ اسماعیل اور شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ محمد اسحاق، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے کچھ اُردو نثر میں تھیں[۱] اور باقی بیشتر کے ترجمے اُردو میں کیے گئے۔ یہ ترجمے نہ صرف تحریک کے ابتدائی دور میں ہوئے بلکہ دورِ حاضر تک بھی ہوتے رہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے پیروؤں نے ان کی تفسیر کے مطابق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا جو اصطلاحی کم اور عام فہم زیادہ تھی۔[۲] شاہ ولی اللہ کی کتاب وصیت نامہ کا ترجمہ سعادت یار خان رنگین نے تصنیف رنگین کے نام سے منظوم کیا، جس کے شروع میں ایک مختصر منثور دیباچہ بھی تھا۔[۳] شاہ صاحب کے خطبات کا نظم و نثر میں

ملا جلا ترجمہ مجموعۂ خطب کے نام سے مولوی عبدالحیٔ فرنگی محلی نے کیا تھا[۴] محمد عبدالرزاق نے شاہ صاحب کی کتب سرور المحزون کا ترجمہ گوہر محزون کے نام سے کیا تھا[۵] منشی انشاء اللہ نے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کا ترجمہ شائع کروایا[۶] اور ان کے رسالہ حسن العقیدۃ کا اُردو ترجمہ مولوی عبدالقادر مولف وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) نے بھی کیا تھا[۷] چہل احادیث کا ترجمہ اُردو میں مولوی عبداللہ نے کیا۔[۸]

شاہ عبدالعزیز نے متعدد کتابیں لکھی تھیں، جو شاہ ولی اللہ کے افکار و تعلیمات پر مبنی تھیں۔ ان کی کئی کتابوں کے ترجمے اُردو میں ہوئے۔ ان کی تصنیف سر الشہادتین کا ترجمہ معہ تشریح شاہ سلامت اللہ کشفی نے تقریر الشہادتین کے نام سے کیا۔[۹] ان کی فارسی تفسیر تفسیر عزیزی کے اُنیسویں پارے کا ترجمہ کان پور سے شائع ہوا اور تیسویں پارے کا ترجمہ دہلی میں محمد حسین رام پوری نے کیا۔[۱۰]

ایسی تصانیف کے علاوہ اُردو میں اہم دینی خدمت قرآن کے اُردو ترجمے تھے۔ شاہ رفیع الدین نے اُردو میں قرآن کا ایک لفظی ترجمہ کیا۔[۱۱] شاہ عبدالقادر نے قرآن کا ترجمہ بامحاورہ اُردو میں کیا تاکہ جو لوگ فارسی سے واقف نہیں، اس کے معنی اُردو میں سمجھ سکیں۔[۱۲]

شاہ رفیع الدین کی ایک تصنیف راہ نجات اُردو میں تھی، باقی تصانیف میں سے جن کی تعداد انیس کے لگ بھگ ہے، بیشتر کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔[۱۳] ان کی فارسی تصانیف قیامت نامہ کا اُردو میں ترجمہ داب الاخرت کے نام سے عبداللہ بن بہادر علی نے کیا۔[۱۴] ان کی ایک اور کتاب تنبیہ الغافلین کے بعض ترجموں کا ذکر ملتا ہے۔[۱۵] بنی نرائن جہاں کا ترجمہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔[۱۶]

مولانا محمد اسحاق نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ کا ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔[۱۷] خود شاہ محمد اسحاق کے مشہور رسالہ مسائل اربعین کا ترجمہ رفاہ المسلمین کے نام سے سعدالدین عثمانی نے کیا۔[۱۸] شاہ محمد اسماعیل نے اپنی عربی تصنیف رد الاشراک کا ترجمہ تقویۃ الایمان کے نام سے کیا۔[۱۹] مولانا مملوک علی، شاہ ولی اللہ کی تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے۔[۲۰] شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کرنے کے بعد تحریک کا انصرام ان کے سپرد ہوا۔ ان کے خاص شاگردوں میں مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علما تھے۔[۲۱] عربی، اُردو، فارسی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے تھے۔[۲۲] اُنھوں نے تحریری اقلیدس اور سنن ترمذی کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا[۲۳] حبیب الرحمٰن انصاری بیدل، حاجی احمد علی محدث سہارن پوری کے

صاحبزادے تھے جو مولانا شاہ محمد اسحاق کے نام ور شاگرد تھے۔ بیدل شاعر تھے۔ اُنھوں نے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ مثلاً مسند امام ابو حنیفہ، تاریخ تیموری، مقامات بدیع ہمدانی، مطبوعہ ہیں۔ ایک رسالہ فضیلت علم بھی تحریر کیا تھا۔ جو سلسلہ وار رسالہ دبدبۂ آصفی میں چھپتا رہا۔ رتن ناتھ سرشار کی وفات کے بعد کچھ دن تک دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام کی ادارت بھی کرتے رہے[۲۴] مولانا محمد احسن نانوتوی، خاندان شاہ ولی اللہ سے مستفیض تھے۔ اُنھوں نے مولانا مملوک علی کے علاوہ شاہ عبدالغنی سے بھی تعلیم حاصل کی تھی[۲۵] ان سے شاہ ولی اللہ کی کئی کتابوں کی ترتیب، اشاعت اور ترجمے یادگار ہیں۔ اُنھوں نے شاہ صاحب کے رسالے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف کا اُردو ترجمہ کشاف کے نام سے[۲۶] رسالہ عقدالجید فی احکام الاجتہاد والتقلید کا ترجمہ سلك مروارید کے نام سے کیا[۲۷]۔ ان کے علاوہ حجة الله البالغه، ازالة الخفاء اور قرة العینین فی تفضیل الشیخین کی ترتیب و تصحیح کی۔[۲۸]

اس سرسری جائزہ سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ تحریک شاہ ولی اللہ کی تبلیغ و اشاعت میں اُردو نے بڑی حد تک موثر کردار انجام دیا۔ تحریک شاہ ولی اللہ یہیں تک محدود نہیں رہتی، تحریکِ مجاہدین اور بعد میں مختلف اسلامی تحریکات اس کے نتیجہ میں پیدا ہوئیں۔ بعد کی دیگر تحریکات میں اُردو کا حصہ زیادہ نمایاں اور موثر نظر آتا ہے۔

(۳) تحریکِ مجاہدین کا نثری ادب

اس وقت کی بیشتر اسلامی تحریکات کے مقابلہ میں تحریکِ مجاہدین کا ادب زیادہ تر اُردو نثر پر مبنی ہے۔ اس تحریک کی نشر و اشاعت کے لیے بڑے پیمانے پر اُردو نثر کی ترویج ہوئی۔ اُردو ادب کی تاریخوں میں تحریکِ مجاہدین کی تصنیفی اور اشاعتی سرگرمیوں کو اُردو نثر کی تقویت کا باعث بتایا جاتا ہے[۱] اس تحریک نے ایسا کثیر ادب پیدا کر دیا تھا۔ جو انگریزوں کی حکومت کے زوال کی پیش گوئیوں سے پُر اور ضرورت جہاد کے لیے وقف تھا۔ ان میں سے بعض کتب تو اس قدر اشتعال انگیز تھیں کہ بعض مسودات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی تھیں اور ان میں بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی[۲] اس تحریک کے تحت لکھا جانے والا ادب تعداد اور کیفیت و اثر کے اعتبار سے نہایت مہتم بالشان ہے۔

اس میں سرِفہرست شاہ اسماعیل کی تصنیف ردالاشراک ہے، جس کا ترجمہ خود اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان کے نام سے عربی سے اُردو میں کیا[۳] جس کے اثرات اس وقت کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر نمایاں مرتسم ہوئے۔ یہ تصنیف رَدِ بدعت پر مبنی تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو شاہ اسماعیل کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا حصہ ان کی وفات کے بعد محمد سلطان خان نے ترتیب دیا[۴] اس کا نام تذکرۃ الاخوان تھا، اور اس کا بھی اُردو میں ترجمہ ہوا[۵] لیکن اس ضمن میں ان کی سب سے اہم تصنیف صراط مستقیم ہے جو اصلاً فارسی میں لکھی گئی تھی اور کلکتہ سے ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ بعد میں اس کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا اور چوتھا باب شاہ اسماعیل نے تحریر کیا تھا اور دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالحیٔ نے لکھا تھا۔[۶] یہ اس سلسلے کی سب سے اہم تصنیف تھی جسے ہنٹر نے وھابی تحریک کا قرآن سے تعبیر کیا ہے[۷] شاہ رفیع الدین کی تصنیف تنبیہ الغافلین جو سیّد احمد بریلوی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اس کے اُردو میں کئی ترجمے ہوئے۔[۸] ایک ترجمہ بنی نرائن جہاں نے کیا[۹] جس کے مسلمان ہونے اور سیّد احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی روایت موجود ہے[۱۰] اور ایک ترجمہ مولوی سیّد عبداللہ نے کیا۔[۱۱]

مولانا شیخ محمد تھانوی جو سیّد احمد بریلوی سے بیعت تھے، ان سے اُردو میں ایک رسالہ ارشاد محمدی منسوب ہے۔[۱۲] مولانا حیدر علی رام پوری، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور سیّد احمد کے مرید تھے۔ ان سے ایک کتاب حیانت الناس اُردو میں یادگار ہے۔[۱۳] مولوی کرامت علی جونپوری نے بنگال میں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ وہ سید صاحب سے بیعت تھے۔ اُنھوں نے کئی کتابیں مختلف ضرورتوں کے تحت مختلف النوع مسائل پر تحریر کی تھیں۔[۱۴] اُنھوں نے زیادہ کام اُردو میں کیا۔[۱۵] مولانا ولایت علی نے جہاد میں سرگرم حصہ لیا تھا اور سیّد صاحب کی شہادت کے بعد اس مقصد کو جاری رکھا۔ علاوہ فارسی اور عربی کے اُردو میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں ...

شرک، رسالہ عمل بالحدیث، رسالہ دعوت، رسالہ تبیان المشرک، رسالہ بدعت، اربعین فی المهدئین، رسالہ تیسیر الصلوۃ، رسالہ شجرۃ بانمرہ اُردو میں ہیں۔[۱۶] مولانا عنایت علی کا ایک رسالہ بت شکن مولانا عبدالرحیم کے شائع کردہ رسائل تسعہ میں موجود ہے۔[۱۷]

رسالہ تسعہ جو نو رسالوں کا مجموعہ ہے، ان میں مولانا عنایت علی اور مولانا فیاض علی نے مختلف موضوعات پر لکھا تھا۔ ان میں سے کچھ اُردو میں ہیں اور کچھ فارسی میں، جن کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

تھا۔ ایک عربی میں ہے[18] مولانا ولایت کے رسالہ ردشرک کا ترجمہ الٰہی بخش بڑاکری نے کیا تھا، دونوں کے متن پہلو بہ پہلو ایک ہی صفحہ میں ہیں۔[19] مولانا ولایت علی کے دوسرے رسالے عمل الحدیث کا ترجمہ بھی الٰہی بخش بڑاکری نے کیا تھا اور یہ بھی بعینہٖ ردشرک کی طرح سے شائع ہوا تھا۔[20] مولانا ولایت کا رسالہ اربعین فی المھدئین عربی میں تھا اور اُردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔[21] رسالہ منبع الفیوض جسے مولانا فیاض علی نے لکھا تھا، اس کا اُردو ترجمہ بھی الٰہی بخش بڑاکری نے کیا تھا۔[22]

مولانا اولاد حسن قنوجی، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر سے مستفیض تھے۔ سیّد صاحب سے بیعت بھی کی تھی اور جہاد میں شریک بھی رہے تھے۔[23] اُنھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں سے حل المتین، راہ سنت، رسالہ درمنع برافروختن چراغان برقبور اُردو میں تھیں[24] سیّد صدیق حسن، سیّد اولاد حسن قنوجی کے صاحبزادے تھے۔ عربی، اُردو، فارسی میں کتب کثیر کے مصنف تھے۔ ان کی تعداد تقریباً دو سو بائیس تھی۔[25] ان میں سے ترجمان القرآن تفسیر، ۱۵ جلدوں کے علاوہ ایک سو تین کتابیں اُردو میں ہیں۔[26] سیّد احمد حسن عرشی بھی سیّد اولاد حسن قنوجی کے صاحبزادے اور معروف شاعر تھے۔ شاعری میں غالب سے اصلاح لیتے تھے[27] اُنھوں نے مذہبی مناظرہ پر ایک کتاب شہاب ثاقب بھی لکھی تھی۔[28] مولوی محمد حسین بٹالوی کی تصنیف رسالہ اشاعت السنہ بھی اُردو میں تھی۔[29]

نواب قطب الدین خان دہلوی، شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے۔ شاہ محمد اسحاق دہلی میں تحریکِ مجاہدین کے امور کے سربراہ تھے۔[30] قطب الدین خان نے اُردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھی[31] اور ظفر جلیل کے نام سے حصن حصین کا ترجمہ کیا[32] اسی ترجمہ کو درست کر کے خیر متن کے نام سے مولانا محمد احسن نانوتوی نے شائع کیا۔[33] مولانا احسن نانوتوی نے تحریکِ مجاہدین سے متعلقہ بیشتر کتب کا یا تو ترجمہ کیا یا انھیں اپنے مطبع ''مطبع صدیقی بریلوی'' سے شائع کرایا۔[34]

مولانا خرم علی بلہوری کی تصنیف نصیحۃ المسلمین اُردو میں تھی اُنھوں نے ساتھ ہی ردالمختار کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا[35] مشارق الانوار کا ترجمہ بھی انھیں سے منسوب ہے۔[36] ان کی نامکمل تصنیف کتاب الاذان کو غایۃ الاوتار کے نام سے مکمل کر کے مولانا احسن نانوتوی نے طبع کروایا۔[37] مطبع صدیقی کے علاوہ سیّد عبداللہ سیرام پوری کے مطبع نے خصوصاً اس تحریک کی نشر و اشاعت میں بڑی معاونت کی[38] اور مولانا بدیع الزمان بردوانی[39] ظہیرالدین احمد بریلوی کے مطابع نے بھی خاندان شاہ ولی اللہ اور تحریکِ مجاہدین کی تصانیف کی طباعت میں سرگرم حصہ لیا۔[40]

اس تحریک کے بارے میں معلومات کا ایک اہم ماخذ تذکرہ صادقہ ہے جسے مولانا عبدالرحیم صادق پوری نے اُردو میں لکھا تھا[۴۱] بعض اور کتب بھی دست یاب ہیں جو اُردو میں تصنیف ہوئی تھیں، لیکن ان کے مصنفین کے نام معلوم نہیں۔ یہ مختلف مسائل جیسے ادائے عبادات، نکاح بیوگان، رد بدعت، جہاد وغیرہ پر لکھے گئے تھے۔ مثلاً رسالہ نماز، نماز بامعنی، تفسیر سورۂ فاتحہ، رسالہ جہادیہ، رسالہ نکاح بیوگان وغیرہ''[۴۲]

بعد کے اکابرین نے اس تحریک کی انتہا تک، جو بیسویں صدی کے وسط میں بھی اپنی موجودگی ظاہر کرتی ہے[۴۳]، اُردو میں تصنیف و تالیف کی اور اس کے مقاصد کی تکمیل کی۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ، شاہ نور محمد اور مولانا محمود الحسن جیسے اہم نام ہیں۔ اگر اس سلسلے کو علمائے اہل حدیث کے ساتھ منسلک کیا جائے یا اس کے تعلق کو تسلیم کیا جائے تو اس طبقہ کی علمی خدمات کو جو بڑی حد تک اُردو میں ہیں، سراہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے اہم افراد خود اپنی اہمیت کی بنیاد پر انفرادی توجہ کے مستحق ہیں۔ چناں چہ ان کا ذکر اپنے مناسب مقام پر آیندہ صفحات میں آئے گا۔[۴۴]

(۴) تحریک ردعیسائیت اور اُردو: دورِ اوّل

مسلمانوں میں تحریک ردِعیسائیت اُنیسویں صدی کی نہایت اہم تحریک تھی۔ انگریزی حکومت کے معاشی اقتدار کے نتیجے میں پست اور تباہ حال ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں کو اپنی مذہبی اور اخلاقی قدریں عزیز تھیں، جن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے، لیکن برطانوی حکمت عملی نے آہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ برِعظیم میں عیسائیت کی تبلیغ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہو چکی تھی اور پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی مشنریاں بڑے جارحانہ انداز میں تبلیغ کر رہی تھیں[۱] ملک کے گوشے گوشے میں کلیسا قائم ہو رہے تھے اور یہاں کی مختلف زبانوں کے سہارے عیسائیت کی برتری ثابت کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ مختلف مشن اپنے اپنے تعلیمی ادارے قائم کر رہے تھے اور مفلس ہندوستانی مختلف قسم کی مراعات کے لالچ میں عیسائیت قبول کر رہے تھے۔[۲] انگریز عہدیداروں نے فوجوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی حوصلہ افزائی کی اور کمپنی کے ملازم مسیح کے سپاہی بن کر مذہبی جہاد میں مصروف رہے۔ فوجوں میں عہدوں کی ترقی کا انحصار بڑی حد تک تبدیلی مذہب پر رہ گیا۔ اُنیسویں صدی کے نصف اوّل کمپنی کے دیوانی اور فوجی حکام میں تبلیغی جوش و خروش عام تھا[۳] وہ ان عزائم سے

متاثر تھے کہ اگر اس وسیع علاقہ کو مسیح کے لیے فتح نہ کیا گیا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے گا[۴] عیسائی مبلغین کے طریقہ کار سے علانیہ ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کی اعانت ان کو حاصل تھی[۵] سرکاری مدرسوں میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی۔ بعض قوانین کا مقصد صرف یہ تھا کہ عیسائیت قبول کر لینے والوں کی مدد کی جائے۔ مثلاً ۱۸۵۰ء کے قانون ۲۱ کے مطابق مذہب تبدیل کر دینے کے بعد بھی ایک شخص موروثی جائداد میں حق دار رہتا تھا[۶] جب ۱۸۳۳ء میں قانونی اعتبار سے مشنریوں کو خود مختاری دے دی گئی[۷] تو ان کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ عیسائی مبلغ بازاروں، شفاخانوں، جیل خانوں میں جس جگہ موقع ملتا تبلیغ کرنے لگتے۔[۸] ان کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی اجتماعات اور جلسوں میں چلے جائیں اور سامعین کے سامنے کھڑے ہو کر گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ان کی مذہبی، ''غلطیاں'' ظاہر کرنے لگیں[۹] اخباروں اور رسالوں میں جو بڑی حد تک کمپنی کے اختیار میں تھے، اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملے کرنے کی روایت پڑ گئی تھی۔ مسلمان عیسائی مبلغین کے اختیار کیے ہوئے ان طریقوں سے خوش نہیں تھے۔ ان کی جانب سے ابتدا ہی سے جا بجا کسی نہ کسی شکل میں ردِعمل کا اظہار ہوتا رہا۔[۱۰]

مسلمانوں میں تحریک ردعیسائیت گو کسی مرکزی تنظیم کے تحت نہیں تھی مگر اس کی وسعت پذیری اور موثر جدوجہد قابلِ تعریف تھی۔ اُنھوں نے علمی اور فکری پہلوؤں سے عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور ان کے حملوں کے رد پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ ردِعیسائیت کی جدوجہد میں وہ تحریری اور تقریری مناظرے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو علمائے اسلام اور عیسائی مبلغین کے درمیان ہوئے لیکن یہ دور ۱۸۵۷ء تک زیادہ وسیع پیمانے پر نہ ہو سکے تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ خود عیسائی تبلیغی مشنریاں کمپنی کے ماتحت تھیں اور اس کی تبلیغی سرگرمیوں میں اس کی مصلحت اور حکمت عملی دخل انداز تھی۔ ان کے اس طریقہ کار میں ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ شدت پیدا ہو گئی جب سارا ملک ہی ان کے زیرِ نگین آ گیا اور وہ اس کے مختارِ کل ہو گئے۔ اس سے قبل تک ایک حد بہر حال موجود رہی تھی۔ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک کوئی ایسی ہمہ گیر اور موثر تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی جو مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ساتھ قومی شعور بھی پیدا کر سکتی اور وہ اس شعور کے ساتھ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنے کی کما حقہ کوشش کرتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو مسئلہ یہ رہ گیا تھا کہ مسلمان صورتِ حال کو مزید خرابی سے کس طرح بچا سکتے ہیں۔ اس مرحلہ پر اپنے قومی تشخص کے احیا کا خیال فطری امر تھا۔ چناں چہ بعد میں

عیسائیت کی کوشش نے ایک مربوط تحریک کی صورت اختیار کی جو وسیع بھی تھی اور موثر بھی۔

بیشتر عیسائی مبلغین نے اپنے تبلیغی مقاصد کے تحت یہاں کی مقامی زبانوں کا سہارا لیا۔ اس طرح اس دور میں عیسائیت پر اُردو میں کتابوں کا ایک معتدبہ ذخیرہ وجود میں آ گیا۔[11] کئی عیسائی مبلغ اپنی تصنیفی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تبلیغی جوش وخروش میں عیسائیت کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں ایسی کتابیں تصنیف کیں کہ ردِ عمل میں علما نے بڑی وقیع تصانیف کا اضافہ کیا۔ پادری سی جی فنڈر اپنی فارسی تصانیف میزان الحق، طریق الحیات، ثمرات شجرالحیات اور مفتاح الاسرار کی وجہ سے ایران اور ہندوستان میں کافی مشہور ہوا۔ اس کی اول الذکر تصنیف کا اُردو ترجمہ بھی خود اسی سے منسوب ہے۔[12] جب ۱۸۳۹ء میں فنڈر کی تصانیف کلکتہ میں اپنے مخصوص مقاصد کے تحت پھیلا دی گئیں تو مسلمان بہت مشتعل ہوئے اور علما عیسائی مبلغین سے مناظروں پر اتر آئے۔[13] یہ بات صرف کلکتہ تک محدود نہ رہی بلکہ مسلمان علما کی جانب سے ہر جگہ عیسائی مبلغین کو مناظرے کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ علما نے عیسائی مبلغین کی مخالفت میں اچھا خاصا ادب تیار کرلیا اور اسے ہر گوشے میں پھیلا دیا۔[14] چناں چہ عیسائی مشنریوں کا مسلمانوں میں کام کرنا مشکل سمجھا جانے لگا۔[15]

عیسائیت کے لیے ۱۸۵۷ء سے قبل بھی تقریری اور تحریری مناظروں کے لیے اُردو زبان ناگزیر رہی۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں تحریری مناظرے زیادہ تر تو فارسی ہی میں ہوتے رہے لیکن تقریری مناظروں کے لیے فارسی زیادہ موثر نہیں رہی تھی۔ ان مناظروں کے سلسلے میں جو تحریریں اب دست یاب ہیں ان میں سے کچھ اُردو میں ہیں۔ بعض علما نے تحریروں کے لیے جو عیسائی مبلغین کے جواب میں لکھی گئیں، اُردو کو ترجیح دی تھی۔ بیشتر خطوط کے مجموعے اور کتابیں جو اس سلسلے میں لکھی گئیں، اس وقت کے اُردو نثر کے ذخیرہ میں معتدبہ اضافہ ہیں۔

اس دور کے بیشتر علما جن سے اُردو کی خدمات مختلف حیثیتوں سے وابستہ ہیں، عیسائی مبلغین سے مناظرے کرتے تھے۔ گو مناظروں کے موضوع پر ان میں سے بعض سے کوئی اُردو تصنیف منسوب نہیں ہے لیکن دیگر موضوعات پر اُنھوں نے اپنی مساعی کو ظاہر کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے عیسائیوں سے باضابطہ مناظروں کی ابتدا کی[16] مولانا محمد ہادی نے ایک عیسائی سے مناظرہ کیا تھا اور اسے مسلمان بنایا تھا۔[17] مولانا آل حسین نے پادری فنڈر کے ساتھ ۱۸۴۴ء میں پہلا تحریری مناظرہ کیا تھا۔[18] بعد میں اس کی پاداش میں انھیں گرفتار ہونا پڑا۔[19] عیسائیت کے سلسلے میں تاریخی اہمیت کا کام رحمت اللہ کیرانوی نے کیا۔ انھیں

عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ آزادیِ وطن کے شیدائی تھے اور حسب موقع جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔[۲۰] عیسائیت کے ابتدائی دور میں عیسائی مبلغین سے مناظروں میں ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ اُنھوں نے فنڈر اور دوسرے عیسائی مبلغین کے ساتھ تاریخی مناظرے کیے، اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرتے ہوئے انھیں لاجواب کیا۔ پادری فنڈر کے ساتھ ان کے دو مناظرے ہوئے۔ پہلا تحریری مناظرہ مارچ ۱۸۵۴ء میں اور پھر تقریری مناظرہ اپریل ۱۸۵۴ء میں۔[۲۱] ڈاکٹر وزیر خان نے ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر سے تحریری مناظرے کیے تھے[۲۲] اُنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، ولایت گئے تھے اور انجیل اور توریت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے ہی کی غرض سے عبرانی اور یونانی زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور ولایت سے واپس آتے ہوئے انجیل اور توریت کے مختلف نسخے، شرحیں، تفسیریں وغیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔[۲۳] وہ مناظروں میں رحمت اللہ کیرانوی کے شریک کار رہے۔[۲۴] مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خان سے خصوصی تعلقات رکھتے تھے۔[۲۵] اُنھوں نے فنڈر کے ساتھ مناظرہ میں ڈاکٹر وزیر خان کی مدد کی تھی۔[۲۶] یہ وہ علما تھے جنھوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل تک عیسائیت کے اثرات کو مسلمانوں میں پھیلنے سے حتی المقدور روکے رکھا۔ ان کی یہ کوششیں ایک حد تک کامیاب ہوئیں۔ اُردو میں پہلی مطبوعہ کتاب جو ردِ عیسائیت کے سلسلے میں لکھی گئی، خلاصہ صولة الضیغم علی اعداء ابن مریم تھی۔ اس کے مصنف مولوی عباس علی تھے۔ یہ کتاب مطبع سنگین میں ۱۲۵۸ھ میں چھپی۔ اس کی ضخامت ۱۰۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ اصل کتاب، جس کا یہ خلاصہ تھی، بہت ضخیم تھی اور ۱۲۴۸ھ میں لکھی گئی تھی[۲۷] یہ پہلی کتاب تھی ورنہ اس سے قبل نہ تحریری مناظروں کا رواج تھا نہ ردِ عیسائیت میں تصانیف کا دور۔ اس کتاب کے مصنف نے اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا وہیں اس نے عیسائی مبلغین سے مناظرہ میں بھی پہل کی۔ کئی عیسائیوں کو مسلمان بنایا اور علما کو ردِ عیسائیت کی طرف متوجہ کیا۔[۲۸] اس مطبوعہ کتاب سے قبل تحریر ہونے والی ایک قلمی کتاب بھی ہے، جو ۱۲۴۵ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف اکرام الدین شاہ جہاں پوری تھے یہ ۱۵۸ صفحات پر مشتمل تھی اور مدراس کے ایک پادری کے رسالہ عیسوی کا جواب الجواب ہے جو اس نے ایک مسلمان عالم نعمت علی کے سوالات کے جواب میں لکھی تھی۔[۲۹]

ردِ عیسائیت میں لکھی جانے والی کتابوں میں مولانا آل حسن کی تصنیف استفسار زیادہ اہم شمار کی جاتی ہے۔ اسے مولانا حسن نے پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق مطبوعہ ۱۸۴۳ء اور پادری اسمتھ کی کتاب تحقیق دین مطبوعہ ۱۸۴۳ء کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کتاب میں نہ صرف عیسائیوں

کے اعتراضات کے جواب دیے گئے تھے بلکہ استفسار کے نام پر خود عیسائیوں پر اپنے اعتراضات بھی کیے تھے۔ یہ کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۲۵۹ھ میں چھپی۔[30] پادری فنڈر کی تصانیف خصوصاً میزان الحق کے جواب میں اُردو، فارسی میں اور کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کا ایک جواب محمد ہادی علی لکھنوی نے کشف الاستار مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں دیا۔ یہ وہی کتاب تھی جس کا جواب فنڈر نے حل الاشکال میں دیا ہے[31] اور حل الاشکال کا جواب مولوی مؤید الدین نے استبشار در جواب حل الاشکال در نصاریٰ کے نام سے دیا۔ یہ کتاب ۱۲۶۷ھ میں مطبع منعمیہ اکبرآباد سے شائع ہوئی۔[32] استبشار کے نام سے حل الاشکال کا جواب رحمت اللہ کیرانوی نے بھی دیا تھا[33] میزان الحق اور فنڈر کی دیگر کتابوں کے جوابات میں ۱۸۵۷ء کے بعد بھی معتد بہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ لیکن عام طور پر ردِ عیسائیت ہی علما کا رجحان رہا تھا۔ مختلف پہلوؤں سے انھوں نے اس ضمن میں تصنیفی کام کیا۔

ابوالمعین نے تشخیص المقال و تنقیح اقوال کے نام سے اپنی کتاب میں ابطال الوہیت مسیح وغیرہ پر بحث کی تھی۔ یہ کتاب مطبع مصطفائی، دہلی سے ۱۲۷۱ھ میں چھپی۔[34] ...الدین نے بست... مطبوعہ قاسمی پریس لدھیانہ ۱۲۶۶ھ میں عیسائیوں کی الٰہیات اور ان کے عقائد کی حقیقت بیان کی۔[35] شیخ حیدر علی قریشی نے سیف المسلمین ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ اس کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔[36] محمد ہادی لکھنوی کی کتاب رد نصاریٰ ۱۲۴۲ھ کے قلمی نسخے بھی کتب خانوں میں موجود ہیں[37] اور دوسری کتاب سوالات گذوین لکھی جو ۱۲۴۲ھ میں مشن پریس، لدھیانہ سے چھپی۔[38]

رحمت اللہ کیرانوی نے ردِ عیسائیت میں معتد بہ تصانیف لکھیں۔ اس موضوع پر ان کی جو تالیفات ۱۸۵۷ء سے قبل تحریر ہوئیں یہ ہیں۔ بروق لامعہ ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔[39] ازالۃ الشکوک دو جلدوں میں عیسائیوں کے ۳۹ سوالات کا جواب ہے۔ یہ ۱۸۵۴ء میں بہادر شاہ ظفر کی خواہش پر لکھی گئی تھی۔ اس کا ۱۲۶۹ھ کا قلمی نسخہ کتب خانہ محمد علی کان پور میں تھا۔[40] اعجاز عیسوی ۱۲۶۹ھ میں لکھی گئی۔ اور مطبع رضوی، دہلی سے چھپی۔[41] رحمت اللہ کیرانوی نے ڈاکٹر وزیر خان کے ساتھ مل کر البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف کا خلاصہ لکھا تھا۔ یہ ۱۲۷۰ھ میں قمر المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب فارسی میں شائع ہوئی تھی لیکن حافظ عبداللہ اکبرآبادی نے اُردو میں اس کے خلاصہ کا ترجمہ کیا جو اسعد الاخبار میں بھی شائع ہوا۔[42] یہ پوری کتاب رحمت اللہ کیرانوی اور فنڈر کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا مجموعہ ہے۔ مکمل کتاب فارسی میں تھی اور مغل شہزادہ فخرالدین کے ذاتی مطبع، فخر المطابع دہلی میں شائع ہوئی اور انھیں کے حکم پر ہندوستان سے

مختلف گوشوں میں تقسیم کی گئی۔[۴۳] اس کتاب کے آخر میں ایک قدیم فتویٰ تحریر تھا جس پر مختلف علما کے دستخط ثبت تھے اس کا اُردو ترجمہ بھی اسی مطبع سے چھپا تھا اور اسی کتاب کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔[۴۴]

ڈاکٹر وزیر خان نے ردِعیسائیت میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ پادری فنڈر سے ان کا تحریری مناظرہ کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس سلسلے مین جو خط و کتابت دونوں میں ہوئی ان کا مجموعہ فارسی اور اُردو میں مباحثہ مذہبی کے نام سے اکبر آباد سے ۱۲۷۱ھ میں طبع ہوا۔ فارسی کے صفحات ۱۸۸ اور اُردو کے ۲۰۴ تھے۔[۴۵] ڈاکٹر وزیر خان کے خطوط کا ایک اور مجموعہ خطوط کے نام سے ۱۸۵۶ء میں مطبع نورافشاں، آگرہ سے چھپا۔ ان خطوط میں اس مناظرے کی تفصیل ہے جو ڈاکٹر وزیر خان اور فنڈر کے درمیان آگرہ میں ہوا تھا۔[۴۶] اس سلسلے کا ایک خط جسے فنڈر کے نام مفتی نوراللہ گوپامئوی نے تحریر کیا تھا، ۱۸۵۵ء میں مطبع النور آگرہ سے چھپا تھا۔[۴۷]

اس دور میں لکھی جانے والی بعض کتابیں، جن کے مصنفین کا نام معلوم نہیں ہے، یہ ہیں:

الٰہیات نصاریٰ مطبوعہ ۱۲۶۶ھ اعظم سٹیم پریس حیدرآباد دکن، اس کتاب میں عیسائیوں کی الٰہیات کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔[۴۸] تصدیق المسیح مطبوعہ ۱۲۶۸ھ مطبع رحمٰن بنگلور تنبیہ المخالفین مطبوعہ دہلی، ۱۲۶۰ھ وغیرہ۔[۴۹]

جس طرح عیسائی مشنریوں نے برِعظیم میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہر وہ ذریعہ اپنایا تھا جو ان کے کام میں مدد دے سکتا تھا، چناں چہ اخبارات و رسائل ان کے مذہب کی تبلیغ کے عام ذرائع تھے، اسی طرح مسلمانوں نے اخبارات و رسائل کے ذریعہ محض یہی کام نہیں کیا بلکہ دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے عیسائی مشنریوں کے الزامات کے جوابات دیے۔ بعض اخبارات نے تو خاص طور پر یہ فرض ادا کیا تھا۔ دہلی اُردو اخبار انگریزوں اور عیسائیت کے خلاف حقارت اور نفرت کے جذبے کو بڑی ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ ابھارتا تھا اور انگریزوں کے مکروفریب کو بے نقاب کرتا تھا۔[۵۰] سراج الاخبار اور قطب الاخبار ردِعیسائیت میں مشہور تھے۔[۵۱] بنارس اخبار جو ہندی دیوناگری اور اُردو میں شائع ہوتا تھا، عیسائی مشنریوں کی مخالفت اور ہندو مذہب کی حمایت کرتا تھا[۵۲] شملہ اخبار اور نور علی نور بھی عیسائیت کے لیے مخصوص تھے اور ان میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا جاتا تھا[۵۳] مارتند اخبار اُردو کے علاوہ چار زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ یہ بھی ردِعیسائیت میں اپنی حد تک کوشاں رہتا۔[۵۴]

(۵) جنگِ آزادی اور اُردو ادب

جنگِ آزادی میں علما و مشائخ اور اُردو ادیبوں نے بڑا موثر کردار ادا کیا تھا۔ اس سے قبل، تحریک جہاد میں علما و ادیب بھی شامل رہے تھے۔ تحریک کے بیشتر علما جنگِ آزادی میں بھی نمایاں رہے۔ اور اس میں حصہ لینے والوں میں ایک موثر طبقہ سیّد احمد شہید کے افکار و نظریات سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔[۱] سپہ سالار بخت خان کو، جنھیں دہلی میں سالارِ اعظم بنایا گیا تھا، بہادر شاہ کے مقدمہ کے دوران ''وہابی العقیدہ'' بتایا گیا ہے۔[۲] بخت خان نے علما سے جس قسم کے تعلقات رکھے تھے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیّد احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔[۳] جس وقت وہ تحریک میں حصہ لینے کے لیے دہلی پہنچے تھے، سو علما ان کے ساتھ تھے۔[۴] جنگ کے دوران میں وہابی علما کی جماعت ٹونک سے ان کے پاس آئی تھی۔ اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار اور آگرہ سے بھی کافی علما آکر ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔[۵] بخت خان عام طور پر بادشاہ کے علاوہ ان علما سے تخلیہ میں مشورہ لیا کرتے تھے۔[۶] دہلی میں جو جہاد کا فتویٰ مرتب ہوا تھا، اس میں بخت خان کی کوششیں مقدم تھیں۔[۷] مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی بھی اسی مکتبِ خیال کے مجاہد معلوم ہوتے تھے۔ ان کے شائع کردہ دو اشتہارات سیّد احمد شہیدؒ کے طرزِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پہلے اشتہار میں تو اس جہادیہ میں سے ابتدائی اشعار دیے گئے تھے جو مولوی خرم علی بلہوری سے منسوب ہے اور جسے مجاہدین میدانِ جنگ میں پڑھتے تھے۔[۸] اس اشتہار میں صرف ابتدائی ستائیس اشعار لیے گئے تھے اور چوبیسویں پچیسویں اور چھبیسویں شعر میں ترمیم کر لی گئی تھی۔[۹] دوسرے اشتہار میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا۔

مولانا عنایت علی صادق پوری نے انگریزوں کی فوجوں میں دعوتِ جہاد کا انتظام کیا تھا۔ ان کی کوششوں سے مردان میں پیادہ فوج نمبر ۵۵ نے بغاوت کر دی تھی۔[۱۰] اور اس سے قبل ۱۸۵۳ء میں دیسی پیادہ فوج کی چوتھی رجمنٹ، مقیم راولپنڈی کو منحرف کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سیّد احمد شہید کے خلیفہ اور اپنے بھائی مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ ان سے اُردو کا ایک رسالہ بت شکن منسوب ہے۔[۱۱]

مولانا عبدالجلیل شہید گڑھی نے علی گڑھ میں انگریزی افواج کا دلیرانہ مقابلہ کیا تھا۔ سیّد احمد شہید کے خلفا میں سے تھے اور شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحٰق سے فارغ التحصیل۔[۱۲] ان سے ایک فتویٰ جہاد بھی منسوب ہے۔[۱۳]

مولانا مظہر، شاہ عبدالغنی اور مولانا مملوک علی سے مستفیض تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا رشیدالدین شاگرد شاہ عبدالعزیز سے فنون کی بعض کتابیں اور شاہ محمد اسحٰق سے بخاری پڑھی تھی۔[۱۴] آپ نے جنگِ آزادی میں شرکت کی اور شاملی کے محاذ پر پیش پیش رہے۔[۱۵] ''مدرسہ مظہرالعلوم'' کے بانی بھی تھے۔[۱۶] مولانا مظہر کی ہدایت پر مولانا محمد احسن نانوتوی بھی شریک جہاد ہوئے۔[۱۷] مولانا احسن کثیر التصانیف تھے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں موجود ہے۔ مولانا محمد منیر نے بھی شاملی کے جہاد میں حصہ لیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے شریک رہے تھے۔[۱۸] ان سے فوائد عربیہ اور امام غزالی کے رسالہ منہاج العابدین کا اُردو ترجمہ سراج السالکین وغیرہ تصانیف منسوب ہیں۔[۱۹] جہاد شاملی کے ایک شریک مولانا محمد قاسم تھے۔[۲۰] یہ مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ، مولانا محمد منیر، حافظ محمد ضامن اور مولانا گنگوہی کے مرشد تھے۔ حاجی صاحب تھانہ بھون کے امیر شہر مقرر کر لیے گئے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے تھانہ بھون میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ ان کے مذکورہ دونوں مرید اُن کے شرعی مشیر تھے۔[۲۱] ان مجاہدین نے تھانہ بھون اور شاملی کے میدان میں بڑی دلیرانہ جرأتوں کا مظاہرہ کیا۔[۲۲] ان علما سے اُردو کی نسبت کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

مولانا یحییٰ علی، مولانا ولایت علی کے شریک کار رہے۔ ان پر بعد میں انگریزوں کے خلاف بغاوتِ انبالہ کا مشہور مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔[۲۳] مولوی واعظ الحق بہار میں بغاوت کی تمام خفیہ سازشوں میں شریک تھے۔[۲۴] پٹنہ کے متبحر عالم اور تحریک شاہ ولی اللہ کے خاص رہنما شمار ہوتے تھے۔ سیّد محمد امین غازی، سیّد احمد شہید کے ساتھ جہاد میں شریک تھے۔ اُنھوں نے جنگِ آزادی میں بھی شرکت کی تھی۔[۲۵] خود شاہ محمد اسحٰق اور ان کے معتقدین نے جنگِ آزادی میں سلطان دہلی کی طرف داری کی تھی اور سقوط کے بعد حجاز ہجرت کر گئے تھے۔[۲۶] یہ حضرات اُردو میں اپنے خیالات کا جس انداز پر اظہار کرتے رہے، اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ تحریکِ مجاہدین یا تحریک شاہ ولی اللہ سے متعلقہ یا اس سے فیض یافتہ دیگر افراد بھی جنگِ آزادی میں شامل رہے۔ جیسے مولانا محمد جعفر تھانیسری، تحریکِ مجاہدین کی نمایاں شخصیت تھے۔ ان سے سوانح احمدی اور تاریخ عجیب یادگار ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دس مریدوں کے ساتھ جنگِ آزادی میں شرکت کی تھی۔[۲۷]

دیگر علما و مشائخ نے بھی، جہاں تک حالات نے مساعدت کی، پوری دلیری کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مولانا احمد اللہ شاہ نے جنگِ آزادی میں شدید قوت پیدا کی اور مختلف مقامات پر بادشاہ،

امرا، درباریوں اور عوام سب سے تعلقات پیدا کر کے انھیں جہاد پر آمادہ کیا۔[۲۸] ان کی تقریروں اور وعظ میں زبردست مجمع ہوتا تھا۔[۲۹] مولانا فضل حق خیرآبادی اپنے زمانے کے ذی حیثیت عالم شمار کیے جاتے تھے۔ مختلف محرکات کی وجہ سے جنھیں اُنھوں نے اپنی تصنیف الثورۃ الہندیہ میں بیان کیا ہے[۳۰] ان پر انگریزی تسلط کی خرابیاں ظاہر ہوئیں۔ جنگِ آزادی کی ابتدا کے وقت وہ الور میں تھے۔ وہ وہیں نشر و اشاعت کرتے رہے۔[۳۱] دہلی میں آنے کے بعد اُنھوں نے حالات کا گہرا مشاہدہ کیا۔ اور فتویٰ دہلی کے مرتب ہونے پر دستخط کیے۔[۳۲] اس فتویٰ کی بنیاد پر مولانا کے خلاف مقدمہ بنا اور گرفتاری کے بعد حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی گئی۔[۳۳]

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔[۳۴] مولانا کیرانہ میں مجاہدوں کی فوج کے سالار تھے۔[۳۵] فتویٰ دہلی پر اُنھوں نے بھی دستخط کیے تھے[۳۶] مناظرہ پر مبنی کئی کتابیں اُردو فارسی دونوں زبانوں میں ان سے یادگار ہیں۔[۳۷] ڈاکٹر محمد وزیر خان نے مولانا رحمت اللہ کے ساتھ ردِ نصاریٰ میں معاونت کی تھی۔[۳۸] اور خود بھی مناظرے کرتے تھے۔ مناظروں پر مبنی خطوط کا ایک مجموعہ فارسی اور اُردو میں مطبوعہ ہے۔[۳۹] ردِ نصاریٰ کی کوششوں کو بنیاد بنا کر اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شرکت کا الزام لگا کر ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔ چناں چہ وہ دہلی آئے اور وہاں کی تمام سیاسی تحریکوں میں شامل رہے۔[۴۰] بخت خان نے انھیں اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاں اُنھوں نے انگریزوں کا شدید مقابلہ کیا جس سے انگریز قلعہ بند ہو گئے۔[۴۱] سقوطِ دہلی کے بعد وزیر خان حجاز ہجرت کر گئے۔ مولانا فیض احمد بدایونی، مناظرہ، ردِ نصاریٰ اور جنگِ آزادی میں ڈاکٹر وزیر خان کے شریک رہے تھے۔[۴۲] اور انھیں کے ساتھ دہلی گئے، جہاں نظمِ جہاد کا شیرازہ منتشر ہوا تو بخت خان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ پھر احمد اللہ شاہ کے ساتھ شریک رہے۔ شاہ جہاں پور، بریلی اور بدایوں وغیرہ میں جہاد کرتے رہے۔[۴۳] صاحبِ تصنیف اور صاحبِ دیوان تھے۔[۴۴]

مولانا کفایت علی کافی نے مرادآباد میں جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ہنگامہ کی ابتدا میں جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ اُنھوں نے نشر و تبلیغ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔[۴۵] جنگِ آزادی میں بھی بڑے سرگرم تھے۔[۴۶] ان سے کئی تصانیف یادگار ہیں۔[۴۷] عظیم اللہ خان اپنی قابلیت اور صلاحیتِ تنظیم کی وجہ سے جنگِ آزادی کے عظیم کردار قرار دیے گئے ہیں۔[۴۸] ان سے ایک اخبار پیامِ آزادی

منسوب ہے جو ۱۸۵۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس میں انقلابی سرگرمیوں کے متعلق نہایت اہم دستاویزات شائع ہوتی تھیں۔[۴۹] اسی نام کا ایک اخبار مرزا بیدار بخت سے بھی منسوب ہے،[۵۰] جس میں وہ خود بھی پر جوش مضامین لکھتے تھے۔[۵۱]

مولانا مرزا مہدی صالح صاحبِ تصنیف شخص تھے۔ ان کی تصانیف جنگِ آزادی کے دنوں میں ضائع ہوگئیں۔ لکھنؤ میں انگریزوں کا مقابلہ کیا اور کئی انگریز قتل کیے۔ ان سے کئی حکایتیں منسوب ہیں[۵۲] مفتی عنایت احمد کاکوری کے قرب و جوار میں جہاد کی تلقین کے لیے وعظ کرتے تھے اور خود بھی لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔[۵۳] یہ کثیر التصانیف عالم تھے۔[۵۴]

یہ اور ان جیسے لاتعداد علما اپنے خلوص، حُبّ الوطنی اور سرفروشانہ جذبات میں یقیناً بے مثال تھے۔ ان کی انگریز دشمنی میں ذاتی رنجشوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ ان میں حُبّ الوطنی کا جذبہ غیر ملکی اقتدار سے نفرت اور انگریز کی تبلیغی کوششوں کا شدید ردِّ عمل موجزن تھا۔ اگر تحریک کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک عوام میں بے چینی، اضطراب پیدا کرنے کا تعلق تھا، اس کا زیادہ تر سبب علما ہی تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ یہی کام اپنی حد تک شاعروں اور ادیبوں نے بھی انجام دیا تھا۔ شاعروں کے تعلق سے تحریک کا جائزہ گزشتہ صفحات میں لیا جاچکا ہے۔ اس تحریک میں بہت سے ادیب یا تو شامل رہے، یا کسی نہ کسی پہلو سے ان کا تعلق قائم رہا۔

غالب کی تحریروں میں دہلی کی تباہی اور بربادی کے بارے میں بڑی مفصل معلومات ملتی ہیں۔[۵۵] وہ جنگِ آزادی کے دوران میں دہلی میں مقیم اور حالات کے ظلم و ستم برداشت کرنے پر مجبور رہے۔[۵۶] ان کی فارسی تصنیف دستنبو صرف اسی واقعہ سے متعلق ہے اور ان کے مکاتیب اس کے اثراتِ مابعد کے عکاس ہیں۔ دستنبو میں شروع سے آخر تک یا تو ان حالات کا ذکر ہے جو جنگِ آزادی کے دوران غالب پر گزرے یا ان واقعات کا ذکر ہے جو ان کے سننے میں آئے تھے۔[۵۷] دستنبو کے ساتھ ساتھ انقلاب دہلی کے حالات و واقعات اور دہلی کی تباہی کے بارے میں غالب کی اُردو تحریر بعنوان تباہی شہر دہلی ہے۔ اسے غالب نے ''دہلی سوسائٹی'' کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۱ راگست ۱۸۶۵ء میں پڑھا تھا اور یہ رسالہ دہلی سوسائٹی کے شمارہ اوّل بابت ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔[۵۸] سقوط دہلی کے بعد اہل دہلی، شاہی متوسلین اور دوسرے لوگوں پر جو ظلم و ستم ہوئے ان کے بیان میں غالب نے تامل نہ کیا[۵۹] دستنبو کے علاوہ یہی باتیں ان کے خطوط میں جو نسبتاً زیادہ آزادی

و بے تکلفی سے لکھے گئے، زیادہ نمایاں ہیں۔[۶۰] اُنھوں نے دوسرے شعرا کی طرح کوئی طویل نظم یا شہر آشوب تصنیف نہیں کیا۔ لیکن ان کے خطوط میں انگریزوں کی زیادتیوں اور سختیوں کی طرف بڑے معنی خیز اشارے موجود ہیں، جب کہ اُنھوں نے ایسے اشارے بھی ڈر ڈر کے لکھے ہیں:

مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس و دارو گیر میں مبتلا ہیں۔[۶۱]

غالب کے اُردو مکاتیب اگر چہ بہت مجمل ہیں لیکن بے حد درد انگیز عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں اِس دوران اپنا احوال اس طرح بیان کرتے ہیں:

"میں مع زن و فرزند ہر وقت اس شہر قلزم خون کا شناور ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔"[۶۲] حکیم نجف کو لکھتے ہیں:

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔[۶۳]

پھر ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں، زیادہ اس سے تم نہ لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔[۶۴]

حالات کی غیر یقینی پر ۹ر جنوری ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

جو دم ہے غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔[۶۵]

۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں اپنے ہندو دوست ہرگوپال تفتہ کی دوستی کو ایک ایسے جنم سے تعبیر کرتے ہیں جو اب لٹ چکا تھا:

وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے ... ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط[۶۶]

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

واللہ ڈھونڈ ھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہلِ حرفہ۔ اگر ہیں تو ہنود۔ البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔[۶۷]

انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کے بعد عام دارو گیر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس تعلق سے غالب نے لکھا ہے

مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔[۶۸]

اسی مکتوب میں شہر کی ویرانی اور انگریزی پہرہ کا حال لکھتے ہیں:

گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔[۶۹]

غالب کے مکاتیب میں دہلی کی تباہی اور بربادی کے بارے میں جتنی مفصل معلومات مجروح کے نام خطوط میں ہیں، دوسرے خطوط میں نہیں ملتی۔[۷۰] ۲ر دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔''[۷۱] ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''دلی واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، نہ قلعہ ہے نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔''[۷۲]

یہی مضمون نواب علاؤالدین خان علائی کو لکھتے ہیں:

''یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے..... ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہندو۔''[۷۳]

مجروح کو ایک خط مورخہ ۲ر فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں، انھیں ڈھادو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنادو...... آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں۔ وہ شہر میں آتے ہیں۔''[۷۴]

مجروح ہی کو ایک خط میں اپنی حالت زار بتاتے ہیں:

''کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔''[۷۵]

اس وقت کے حالات کے نتیجہ میں گرانی پیدا ہوئی ہوگی، اس کا شکوہ غالب نے ایک خط میں

اس طرح کیا ہے:

''غلہ گران ہے، موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے...... ترکاری مہنگی ہے۔''[۷۶]

جنگِ آزادی کے بعد صورتِ حال کے تقاضوں اور انگریزوں اور ہندوؤں کے رویوں اور ان کے مشاہدوں نے غالب کو مسلمانوں کی الگ حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غالب کے احساسات اور تجربات کو اس دور کے سیاسی اور تہذیبی حالات سے بڑی مشابہت تھی۔ غالب کے دور میں نثر نگاری اُردو میں وسیع پیمانے پر مروج نہیں تھی۔ اور سیاسی مسائل پر تو تحریروں کی تعداد محدود ہے۔ پھر بھی چھ ادیبوں نے جو دراصل اُردو نثر نگاری کے علاوہ کسی اور نسبت سے اپنی ایک حیثیت اور مقام کے حامل تھے، جنگِ آزادی سے متعلق رہے۔ ایسے بیشتر شعرا جو کسی اعتبار سے بھی جنگِ آزادی سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے، نثر میں بھی ان سے تصانیف یادگار ہیں۔ صہبائی نے اُردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی تھی۔ آثار الصنادید اور گلستان سخن ان کے مشوروں کا نتیجہ ہیں۔[۷۷] مشہور شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا تھا، جس میں شعرا کے حالات زندگی اُردو میں تحریر کیے تھے۔[۷۸] منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق البلاغت کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔[۷۹] اور اُردو صرف ونحو پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔[۸۰] منیر شکوہ آبادی کی تصانیف میں رسالہ اعلان حق، سراج المنیر تنبیہ انشاء متین الفضائل الثقلین، امام المومنین عن مکائد الشیاطین وغیرہ شامل ہیں۔[۸۱] مولوی اشرف علی نفیس بھی اُردو میں صاحب تصنیف بزرگ تھے۔[۸۲] ان سے ایک تذکرہ شعرائے اُردو انتخاب دہر یادگار ہے۔[۸۳] صدرالدین آزردہ نے علمائے دین کے مشہور فتویٰ جہاد پر دستخط کیے تھے۔[۸۴] اُردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی تحریر کیا تھا، جو مطبوعہ ہے۔ شیفتہ نے ابن جوزی کے مولد محدث کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا جو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

(۲) جنگِ آزادی اور اُردو زبان

ادیبوں، شاعروں کے علاوہ خود اُردو زبان نے جنگِ آزادی میں عملی حصہ بھی لیا تھا۔ اس کا یہ کردار بادشاہ اور دیگر والیان ریاست کے فرامین، مکاتیب، فتاوائے جہاد، مجاہدین اور باغیوں کے اعلانات و اشتہارات کے انداز میں ہے۔ ان میں سے بیشتر اب دست یاب نہیں۔ چند محفوظ ہیں جن کی نقول متعدد تصانیف میں شامل ہوئی ہیں۔

فرامین میں اہم تو بہادر شاہ کے وہ احکام ہیں جو اُنھوں نے جنگِ آزادی کے ایام میں بعض درخواستوں اور مراسلوں پر تحریر کیے تھے اور جن کو بہادر شاہ کے مقدمہ میں بطور ثبوت ان کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ یہ فرامین بیشتر اُردو میں تھے[1] برجیس قدر والیِ اودھ کا ایک اُردو فرمان اُردو اور دیوناگری رسم الخط میں تھا[2] اس فرمان میں عوام کو انگریزوں کے خلاف مختلف پہلوؤں سے غلامی کا احساس دلا کر بغاوت پر ابھارا گیا تھا۔

سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں۔ اوّل دین و دھرم، دوسرے عزت و آبرو، تیسرے جان اپنی اور اپنوں کی۔ چوتھے مال و اسباب۔ اور انگریز لوگ ان چار چیزوں کے بیری ہیں۔ اس واسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین و دھرم اور عزت و آبرو، ناموس، جان اپنی اور اپنے لوگوں کی اور اپنے مال و اسباب کا جس کو منظور ہو وہ انگریزوں سے لڑنے پر باتفاق فوج سرکار مستعد رہے اور ہرگز ان کے فریب میں نہ آوے۔ سرکار سے ان کی پرورش اور تخفیف ہوگی[3]

اسی طرح کے احکام اُردو میں سپہ سالاریوں اور فوج کے اعلیٰ حکام کی جانب سے اپنے ماتحتوں کو بھیجے گئے تھے۔ جیسے:

......تم کو لکھا جاتا ہے کہ اس وقت حکم حضور پُرنور کا آیا کہ جو پلٹن اور رسالہ و توپخانہ مورچہ کو سر کریں گے اُس پلٹن اور رسالہ کو تنخواہ بموجب سرشتہ تنخواہ دیگر افواج کے زیادہ ملے گی اور تنخواہ کے سوائے انعام بہادری کا ملے گا...... جو شخص کہ لڑائی میں جوجھ جاوے گا اس کے وارثان حقیقی کی بخوبی پرورش ہوگی[4]

بالکل اسی انداز کا ایک حکم نامہ صوبیدار محمد عظیم جمعدار اور بھارگو مصرا کی جانب سے بھیجا گیا تھا:

......تم لوگوں کو لکھا جاتا ہے کہ جو شخص فتح یاب اوپر پہاڑی کے ہوگا۔ مال و اسباب پوری پہاڑی کا سوائے مال میگزین و اسپان توپخانہ کے بالکل ان لوگوں کو سرکار فیض آثار سے ملے گا اور معاف ہوگا، چاہیے کہ وہ پہاڑی فتح کرنے میں دل و جان سے کوشش و جاں نثاری کریں اور کمر ہمت کی خوب مضبوط کر کے باندھیں اور سوائے اس کے انعام بہادری درجہ بدرجہ وارثانِ حقیقی ان کے کو، جو لوگ لڑائی میں شہید یا جوجھ جاویں گے سرکار سے ملے گا اور مضمون اس حکم کا تمام شہر دہلی خاص و اطراف و جوانب و پلاٹن توپخانہ ہائے جنگی میں مشتہر منادی کرادی جائے اور سب لوگ ہر چہار طرف سے ہندو مسلمان پہاڑی کے اوپر دھاوا کریں کس واسطے کہ یہ لڑائی دین کی ہے ملازم و غیر ملازم پر کچھ ختم نہیں ہے۔ سب کو ہمت و جوانمردی اور شجاعت کے اسباب میں کرنا چاہیے۔[5]

ایک حکم نامہ سبحان خان کمانڈر رسالہ سوئم کی جانب سے اپنے ماتحتوں کو بھیجا گیا تھا:

......حکم حضور والا صادر ہوا ہے کہ ہندو کو گائے اور مسلمان کو سور کے لحاظ کر کے اور دین اور دھرم کو سمجھ کر بسکہ میری مرضی اور زندگی تم کو منظور ہے تو دیکھتے ہی اس حکم نامہ کے پلاٹن و رسالہ وتو پخانہ سب تیار کر کے اور کشمیری دروازے کے حاضر ہو کر مخالفان ناہنجار و بدافعال پے (پر) دھاوا کرو۔ اس بات میں ایک لحظہ کا تامل و تغافل نہ کر (و)......اور چاہیے کہ تم اس تخت کی شرم رکھو اور جو دین او ایمان پر آئے ہو تو اس کا لحاظ کرو......[۶]

مکاتیب کے ذریعہ والیان ریاست نے باہم جنگِ آزادی کے سلسلے میں مفید پیغام رسانی کی تھی۔ اس قسم کے مکتوبات دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ نانا صاحب کا ایک خط دست یاب ہے۔[۷] اس میں ان کے جنگِ آزادی کے عزم کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

......جان یک روز بھی جائے گی پر اس طرح عزت کھو کر کیوں مرنا اور ایسے اور ہم سے لڑائی و فساد جنگ...... جب تک رہے گا ہم چاہے ماری جائیں چاہے قید ہوں چاہے یہاں سے جو لکھا ہو گا سو ہو گا اور ہم سے جو کچھ ہو گا سو تلوار سے ہو گا......[۸]

قلعہ دھار سے انقلابی سپاہیوں نے شہزادہ فیروز شاہ کو فوری امداد کے لیے ایک خط بھیجا تھا۔ اس خط کو نواب جاورہ کے آدمیوں نے پکڑ لیا، جو کمپنی کے ماتحت تھے۔ خط درج ذیل ہے:

ہمارے اور برطانویوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے، جس میں ہم ہار گئے۔ ہم نے قلعہ دھار میں پناہ لی ہے۔ ہمیں دو ہزار سے لے کر تین ہزار فوج کی مدد دیجیے تا کہ ہم فتح حاصل کر لیں۔ خدارا خط دیکھتے ہی امداد بھیجیے تا کہ ہم شہنشاہ کی عظمت کر سکیں اور ہم کیا لکھیں، ہماری شکست آپ کی شکست ہے۔[۹]

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے لیے سب سے مؤثر جہاد کا فتویٰ ہو سکتا تھا۔ چناں چہ بخت خان نے اپنے اختیارات اور اثر و رسوخ کے ذریعہ اس وقت کے علما سے ایک جہاد کا فتویٰ مرتب کروایا۔[۱۰] فتویٰ کے اجرا کے بعد مسلمانوں میں جنگِ آزادی کے لیے مذہبی جوش اور ولولہ کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ فتویٰ اُردو میں مرتب ہوا تھا اور اخبار الظفر دہلی میں شائع ہوا تھا۔[۱۱] پھر اس کی نقل انھی دنوں صادق الاخبار دہلی، مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی۔[۱۲]

استفتا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ جو انگریز دلی پر چڑھائی اور اصل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں۔ اور اور پر لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں۔

جواب ـــ درصورت مرقومہ فرض عین ہے...... اس شہر والوں پر طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب اثرت اجتماع افواج کی اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالے کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کی فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر پہلے فرض عین ہو جائے گا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے ساری اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا...... [۱۳]

جہاں تک اعلانات و اشتہارات کا تعلق ہے، انقلابیوں اور مجاہدوں کے علاوہ یہ ذریعہ علما نے بھی استعمال کیا تھا۔ مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی کی اس ذیل میں کوششوں کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ان کے ایک اشتہار کے اقتباسات درج ذیل ہیں جس میں مسلمانوں کو جہاد آزادی کے لیے مدعو کیا گیا ہے:

......جو مدعات ظلم و ستم فساد ساری سلطنت ہندوستان میں خصوصاً ضلع الٰہ آباد میں کفر و فخر و نصاریٰ علی العلوم اوپر ہر ایک مومنین اسلام کرام کے از قبیل غارت گری و آتش زدگی و قتل و پھانسی و کندیدگی مکان و چھاپہ زنی و خون ریزی علما و مشائخان و احراق کلام اللہ و احادیث و کتب فقہ وغیرہ ہو رہا ہے۔ اظہر من الشمس ہے۔ اس صورت میں ہر ایک مومنین مخلص کو لازم ہے کہ مستعد جہاد ہو جائیں...... سو یہ دلائل کامل براہین مدلل کمر بندی اوپر دفاع اس قوم نصاریٰ طاغی و باغی کے ہے۔ مناسب ہے کہ جو بھائی مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنے وہ فوراً مستعد ہو کر کمر ہمت جہاد پر باندھیں اور تا شہر الٰہ آباد تشریف لائیں۔ اور قلعہ بند کفار نابکار کو قلع قمع کر کے بہ زور تیغ اپنی خاک میں ملا دیں اور باقی ماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں...... [۱۴]

اس قسم کے مزید اشتہارات انقلابی فوجیوں نے بھی شائع کیے تھے۔ ان اشتہارات میں عام طور پر پس منظر کے لیے اس وقت انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والی صورتِ حال، استحصال اور مذہبی اشتعال کا احساس دلایا جاتا اور پھر عوام اور مسلمانوں کو جنگِ آزادی یا جہاد کے لیے مستعد کیا جاتا۔ اس طور پر دہلی کے انقلابی سپاہیوں نے جو اعلان کیا تھا اسے بھوپال میں اگست ۱۸۵۷ء میں پکڑا گیا تھا: [۱۵]

......اب لازم یہ ہے کہ...... رعایا اور فوج ہر مقام کی ایک دل ہو کر ہمت کریں۔ تخم ان کافروں کا باقی نہ رکھیں...... اور جو لوگ اس وقت میں بھی نامردی کریں گے یا ان دغابازوں کا فریب کھا کر ان کے قول پر اعتماد کریں گے عنقریب اپنے کیے پر پشیمان ہو کر کفِ افسوس ملیں گے...... اور جہاں تک

ہو سکے نقل اس اشتہار کی کر کے ہر مقام پر روانہ کرنا لازم ہے تاکہ سب مسلمان خبردار ہوشیار ہوں اور مقام نمود اس کو آویزاں کرنا چاہیں اور اشتہار کے مشتہر کرنے میں بہت احتیاط لازم ہے.... تاکہ یہ کسی پر کھل نہ جائے اس اشتہار کی اشاعت خدا کی راہ میں تلوار کا پہلا وار ہے.....[16]

دو اشتہارات حیدرآباد دکن کے انقلابیوں نے مشتہر کیے تھے۔[17] ایک میں مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی۔

......اگر جو شخص کہ مسلمان ہو کر......ارادہ قتل کرنے میں اس کافر دین یعنی فرنگی میں تامل کرے گا اس پر طلاق اور وہ دھیڑ اور چمار گدھے کتے اور سور کے ہیں۔ بلکہ نسل یزید اور شمر کی اور بیٹا فرنگی کا ہوگا......اور جو کوئی شریک ہو کر اپنے کو سرخ رو کرے گا البتہ وہ غازی اور قاتل کفار کہلائے گا اور جو شخص کہ مارا جاوے گا انشاء اللہ تعالیٰ پس تحقیق داخل ہوگا وہ بیچ مجلس سید الشہدا اور شریک ہوگا مجلس میں مصطفیٰ کی بے شک واسطے اس کے بہشت الٰہی ہے.... کیوں تامل اور ڈھیل کر رہے ہو یہ وقت فرصت کا ہے اس وقت کبھی نہیں میسر ہوگا اور کیوں غافل ہو تم لوگ[18]

اور دوسرے اشتہار میں امرا کو مخاطب کیا گیا ہے اور انھیں جہاد نہ کرنے، انگریزوں سے تعاون کرنے کے طعنے دیے گئے ہیں:

......یہاں کے جتنے امیر ہیں سو سب نصاریٰ کی اولاد ہیں حیدرآباد کے جتنے ہیں چھوٹے اور بڑے سب پر جو ہے سات پشتیں تک اور وہ مخوش کی اولاد ہیں اور طلاق ان سب پر سات پشتوں تک، نہ نکلیں واسطے جہاد کے.... تو وہ اولاد سور کی اور کتے کی اور گدھے کی اور اُلو کی غرض واسطے خدا کے جہاد کرو کہلاؤ شہید پھر ایسا وقت قابو میں نہیں آئے گا[19]

اسی مضمون کا ایک طویل خط انقلابیوں کی طرف سے راجاؤں اور نوابوں کے نام بھیجا گیا تھا:[20]

......اس صورت میں ہم پوچھتے ہیں کہ بچانے دھرم اور جان اپنی کے تم نے کیا تجویز کی ہے اور جو تمھارا ایک عندیہ ہو تو تھوڑی محنت میں اُن کو مارلیں تو دھرم بھی بچے اور ملک بھی رہے ہندو تو گنگا تلی رام کی اور مسلمانوں کو خدا تعالیٰ اور قرآن کی دے کر لکھتے ہیں کہ دونوں کے بیچ میں دشمن انگریز ہیں اور ان کو مارنا ہندو اور مسلمانوں کو بہت بہتر ہے[21]

❁ ❁ ❁ ❁

۳-صحافت

(ا) ۱۸۵۷ء سے قبل کی سیاسی صحافت

متفقہ طور پر جام جہاں نما اُردو کا پہلا اخبار ہے[۱] اُردو جام جہاں نما اگرچہ فارسی جام جہاں نما کا ضمیمہ تھا مگر اس کی حیثیت ایک مستقل اخبار کی تھی۔ فارسی میں اس کا اجرا ۱۸۲۱ء میں ہوا۔ اس کے دوسرے ہی سال اُردو کا ضمیمہ بھی نکلنا شروع ہوا[۲] اس اخبار میں طبع زاد مواد شائع نہیں ہوتا تھا بلکہ کلکتہ کے انگریزی اخبارات کے ترجمے ہوتے تھے۔ کچھ ہندوستانی عدالتوں کے فیصلے اور عدالتوں کی خبریں ہوتی تھیں۔ خبروں کا معیار بھی بہت بلند نہیں تھا۔ مدیر تمام خبریں منتخب کر کے اپنے انداز میں شائع کرتا تھا۔ سرورق پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا نشان پابندی سے شائع ہوتا تھا جو کمپنی کی حمایت و سرپرستی کو ظاہر کرتا تھا۔ کلکتہ کی یورپین آبادی کے علاوہ کمپنی کے مرکزی دفتر مفصلات کے سرکاری افسر بھی اس کی سرپرستی کرتے تھے[۳] ابتدا میں تو یہ اخبار کچھ عرصہ انگریزی تجارتی کوٹھی کی ملکیت رہا۔ لیکن بعد میں راجا رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون لکھنے پر کمپنی اس اخبار سے ناراض ہوگئی اور اس سے قطع تعلق کر لیا[۴]

اس اخبار کے مطالعہ سے اس دور کے دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کی بوالعجبیوں اور عیش پرستوں کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس دور کے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کا بھی انکشاف ہوتا ہے[۵] اس کے ایک دست یاب شمارے سے اودھ کے حکمران یا نواب کے اس دور میں اختلافات کا اندازہ ہوتا ہے اور ۱۸۲۶ء کے معاہدے کی رو سے انگریزوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت کا علم بھی ہوتا ہے جو بادشاہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ہوا تھا۔ اس معاہدہ کا ترجمہ ۲۷ مئی ۱۸۲۶ء کے جام جہاں نما میں شائع ہوا تھا۔

> اودھ کے بادشاہ اور کمپنی انگریز بہادر سرکار سے ہمیشہ صلح و دوستی سے رہے گی[۶]
>
> ......سب دعویٰ اس عہد نامہ کے وسیلے سے اودھ کے بادشاہ نے چھوڑ دیے اور آئندہ اودھ کے بادشاہ کو اس ملک سے کسی طرح کا علاقہ نہ رہے گا۔
>
> اس واسطے کہ سرحد میوانے کے فساد سے دونوں ریاستوں میں قضیہ بکھیڑا نہ ہو خاص اراکان

امڑی اور چڈویا اور سانڈولے ارکان کا ملک سے کمپنی بہادر کے اختیار میں آیا۔ اودھ کے بادشاہ کا دعویٰ ان جگہوں سے جاتا رہا......

......اودھ کے بادشاہ نے اے اور ٹپا اور مرگولی اور نانامریم کا ملک سب جزیروں سمیت جو اس ملک کے تابع تھے کمپنی بہادر کی سرکار میں حوالے کیا۔[۷]

اس دور کے اخبارات میں کسی سیاسی مسئلہ پر بحث مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مقامی حکومتوں کے احکام کی حمایت بھی شاذ ہی کی جاتی ہے۔ عوام کے سیاسی خیالات کے ترجمان کی حیثیت سے یہ اخبارات نسبتاً عاری ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انتہائی احتیاط جو دیسی فطرت کا تقاضا رہا ہے، ان اخبارات کے مدیروں کو ان میدانوں میں جو خطرہ سے خالی نہیں ہیں، گامزن ہونے سے روکتی تھی۔[۸] پھر بھی بعض اخبارات بے باکی سے اپنے حُبّ الوطنی کے جذبات کا اظہار کردیتے تھے۔ فارسی کے سلطان الاخبار اور اس کے مدیر مولوی رجب علی لکھنوی کا ذکر اس تعلق سے اہم ہے۔ یہ بے باک، نڈر اور حق گو تھا کہ صحیح رائے زنی سے نہ چوکتا اور ظلم کی مذمت کرتا تھا، ظالم کو برا کہتا۔[۹] دراصل یہ اخبار اس وقت کے مغل دربار کا ترجمان تھا اور بہادر شاہ ظفر کی زیرہدایت قلعہ معلیٰ سے شائع ہوتا تھا۔[۱۰] قران السعدین پنڈت دھرم نارائن نے نکالا تھا جو امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔[۱۱] اس اخبار میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی تھی۔[۱۲]

دہلی اُردو اخبار میں جسے مولانا محمد باقر نے ۱۸۳۶ء سے نکالنا شروع کیا تھا، خاص طور پر دہلی کی مجلسی، سیاسی اور تمدنی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اس کے مستقل عنوان ''حضور والا'' اور ''صاحب کلاں'' تھے۔ ''حضور والا'' کے تحت بادشاہ دہلی کے شغل اشغال اور قلعہ معلیٰ کے حالات درج ہوتے تھے ''صاحب کلاں'' کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران، گورنر اور دربار کے حالات لکھے جاتے تھے۔ غیر ممالک کی خبریں زیادہ ہوتی تھیں۔ ہندوستانی ریاستوں اور دہلی سے دیگر خبروں کے ساتھ ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ مدیر کے قلم کی زد میں کمپنی کے حکام بھی آجاتے تھے۔[۱۳] ۱۲ دسمبر ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں انگریزوں کے خلاف کابل کے عوام کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ پہلے خبر دی گئی ہے اور پھر اس پر تبصرہ دیا گیا ہے۔ ''اس طرف کے لوگ گورنمنٹ سے مذہبی اور ملکی دونوں طرح کا کینہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کافروں نے اس ظالم بادشاہ ''شاہ شجاع'' کو ہمارا حاکم بنایا ہے۔[۱۴]

اس میں گاہے گاہے انگریزی عملہ کی بدعنوانیاں، پولیس کی نااہلی و غیر ذمہ داری، ان کی مجرموں سے ساز باز اور اسی طرح کے دوسرے عنوانات کے تحت سیاسی انتشار اور بے چینی کو ظاہر کیا جاتا تھا۔[۱۵] اس زمانہ میں ہندو مسلم قومیت کے علاحدہ علاحدہ تصورات نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ اور اسی بنا پر فسادات اور تنازعات بھی جنم لے رہے تھے۔ انگریزوں نے ہر موقع پر اس قسم کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ چناں چہ اس موقع پر ان کی کارگزاریوں کو اس اخبار کی متعدد اشاعتوں میں برملا بیان کیا گیا تھا۔ اس اخبار نے کبھی کبھی اپنی اشاعتوں میں دہلی اور لکھنؤ کے ارباب حکومت کی غفلت شعاری اور غیر ذمہ داری کو بے نقاب کیا ہے۔[۱۷] اور ایسے حکمرانوں کی تحسین کی ہے جو رعایا پرور اور مستعد تھے۔ اسی بنا پر اس نے کنور نونہال سنگھ والیِ پنجاب کو دوسرے حکمرانوں پر فوقیت دی۔[۱۸]

فوائد الناظرین ماسٹر رام چندر نکالتے تھے۔ اس میں سائنسی، معاشرتی، تاریخی، تہذیبی اور سیاسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میں زمانہ کے سیاسی حالات سے متعلق خبریں بھی چھپتی تھیں۔ جیسے نومبر ۱۸۴۸ء کے شمارہ میں برطانوی اقتدار کی ان کوششوں کی خبر بھی ہے کہ جس کے تحت وہ سکھوں کی حکومت پنجاب کو توڑ کر شمالی و مغربی ہند میں اپنا تسلط مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا تھا۔[۲۰] اس شمارہ میں پنجاب، دہلی، ملتان اور پشاور کی خبریں یہی منظر دکھاتی ہیں۔[۲۱]

کشف الاخبار بمبئی سے منشی امان علی لکھنوی نکالتے تھے۔ اس میں خبروں کے علاوہ مقامی واقعات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ اور یہ حکومت کے مختلف محکموں کی بدعنوانیوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتا تھا۔[۲۲]

اس دور کا ایک اہم اخبار طلسم لکھنؤ ہے۔[۲۳] اس دور کے بعض دوسرے اخبارات کی طرح یہ بھی اپنے عہد کے حالات سے نہ صرف غیر مطمئن تھا بلکہ نئے دور کی محکومی کو بھی، تلخ حد تک محسوس کر رہا تھا۔[۲۴] یہ ۲۵ر جولائی ۱۸۵۶ء کو نکلنا شروع ہوا تھا اور اس کے ۸ر مئی ۱۸۵۷ء تک کے شمارے دست یاب ہیں۔[۲۵] یہ اخبار سقوطِ اودھ اور سقوطِ دہلی کی درمیانی مدت میں جاری ہوا تھا جب کہ سلطنت اودھ کے خاتمہ کے بعد باشندگان اودھ غیر ملکی اقتدار کی تلخیوں سے دوچار ہو رہے تھے۔ اس ہفتہ وار اخبار میں لکھنؤ اور ہندوستان اور غیر ممالک کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جہاں تک لکھنؤ کا تعلق تھا، وہاں کی خبریں چشم دید کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس اخبار میں اودھ کے خاص و عام پر اور لکھنؤ کی آبادی پر خصوصاً واجد علی شاہ کی معزولی کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے، بہ آسانی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ خواروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا، وظائف روک دیے

جانے سے ان کا حال پتلا ہو گیا......[۲۶]

طلسم لکھنو کی طرح لکھنؤ سے ایک اور اخبار سحر سامری اسی دور میں ۱۷ر نومبر ۱۸۵۶ کو جاری ہوا۔[۲۷] اس کے موضوعات اور مضامین اور انداز بیان طلسم لکھنؤ سے مختلف نہ تھے۔ سقوط اودھ کے بعد کی صورتِ حال اس میں بھی چشم دید نظر آتی ہے۔

''ان دنوں غلّہ کی گرانی ہے...... بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا...... ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا...... حاکم اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں۔''[۲۸]

عام طور پر اخبارات محتاط روش اختیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی بے باک مدیر کھل کر حکومت کی حکمت عملیوں اور بدعنوانیوں پر تبصرہ کر دیتا تھا۔ چناں چہ ریاض نور کے مدیر منشی مہدی حسین کو ملتان کے ایک تحصیل دار کے خلاف توہین آمیز مضمون چھاپنے پر دو ماہ قید کی سزا دی گئی۔[۲۹] پنجاب میں اس قسم کا رویہ عام تھا۔ اور مدیروں کے خلاف کارروائی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ کوہ نور کے مدیر منشی ہرسکھ رائے کو بھی اس قسم کے ایک جرم کی پاداش میں تین سال قید کی سزا دی گئی۔[۳۰]

جنگِ آزادی سے قبل کئی اخبارات عیسائی تبلیغی مشنریوں کی مخالفت اور رد میں مخصوص تھے۔[۳۱] ایسے اخبارات مختلف پہلوؤں سے ان کی مخالفت اور تردید کرتے تھے۔ اپنی کوششوں میں ان اخبارات کی ایک مستقل اور قابلِ قدر حیثیت ہے۔

مجموعی طور پر ۱۸۵۷ء سے قبل تک اخبارات کا رویہ اور انداز بظاہر غیر سیاسی نظر آتا ہے لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کی گہرائی میں غم و غصہ کے دبے ہوئے جذبات کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے اخبارات میں اس لحاظ سے سلطان الاخبار، دہلی اُردو اخبار، طلسم لکھنؤ اور سحر سامری خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

(۲) جنگِ آزادی اور اُردو صحافت

جنگِ آزادی کی باضابطہ ابتدا ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ہوئی لیکن اُردو اخبارات میں سیاسی ہلچل اور ہنگاموں کا اظہار پہلے ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور جو عزم جنگِ آزادی کا سبب بنا تھا وہ اخبارات میں بھی موجود نظر آتا ہے۔ سلطان الاخبار جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، ایک اہم اطلاع دیتا ہے

...... ان دنوں جتنے راجا ہیں سب نے بالاتفاق چٹھی اس مضمون کی تحریر کی ہے، جرأت کی تقریری ہے کہ جو سرکار کمپنی خلاف عہود و مواثیق روسائے ہندوستان کی ریاست ضبط کرتی ہے (اس سے

ایک تو خلقت بیکاری سے مرتی ہے دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کیے دیتی ہے۔ اس باعث سے ہم لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیان اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سر میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے۔[1]

ہندوستان کے باشندے جب مایوسی کی انتہا تک پہنچ چکے تھے اور اُنھوں نے ابھی جنگِ آزادی کی ابتدا نہیں کی تھی، ایسی باتوں کے منتظر تھے جو انھیں ایسی صورتِ حال سے نجات دے سکتی تھیں۔ ابتدائے ۱۸۵۷ء میں دہلی میں یہ خبر گرم تھی کہ شاہ ایران عنقریب ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جامع مسجد دہلی پر ایک اشتہار چسپاں دیکھا گیا۔[2] خبر ایسی تھی کہ باشندگان دہلی اس پر بڑے پُر امید ہو سکتے تھے۔ چناں چہ جہاں وہ متوقع ہوئے، ان کے عزم اور ولولے میں اضافہ بھی ہوا۔ اس خبر کا اعلان دہلی کے صادق الاخبار نے بڑی مسرت سے کیا تھا کہ وہ ہندوستان فتح کر کے شاہ دہلی کو تاج بخشی کرے گا۔[3] وہ اپنی اشاعت میں اس اشتہار کا تذکرہ کرتا ہے:

ایک اشتہار نام نہاد شاہ ایران دہلی میں گزر گاہوں پر آویزاں کیا گیا ہے...... خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اہل اسلام کو نصاریٰ کی مدد و معاونت سے پرہیز کرنا واجب اور مناسب ہے کہ حتی المقدور مسلمانوں کی نیک خواہی میں مساعی اور عرق ریزی رہیں۔ انشاء اللہ قریب ہے کہ میں سریر ہند پر جلوہ گر ہوتا ہوں اور وہاں کے بادشاہ و رعیت کو خرسند و شادماں کرتا ہوں جیسا کہ انگریزوں نے ان کو نان شبینہ سے محتاج کیا ہے...... مجھ کو کسی کے مذہب سے غرض نہیں[4]...... پس واجب ہے کہ بوڑھے جوان، ادنیٰ، اعلیٰ، عقل مند، کم فہم، کسان اور سپاہی سب کے سب بے پس و پیش اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ہتھیار باندھ لیں۔ علم اسلامی بلند کریں اور اپنے ہم قوموں کو بھی راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت پہنچائیں۔[5]

یہی مضمون کسی حد تک تبدیلی کے ساتھ خلاصۃ الاخبار کی اشاعت مورخہ ۱۲/اگست ۱۸۵۷ء میں شامل ہوا تھا۔[6] اس زمانہ میں آئے دن یہ خبر عام ہوتی جارہی تھی کہ شاہِ ایران ہندوستان فتح کرنے ایران سے آرہے ہیں اور ان کی فوجیں ہندوستان کی سرحد میں پہنچ گئی ہیں۔ آج کی تاریخ سے ایک ماہ بعد کشمیر پر حملہ ہوگا۔[8] ایرانی فوجیں اٹک پہنچ گئیں ''وہ فوج'' درہ بولان اور بی بی مری پر آگئی ہے۔[10] ان دنوں اخبارات میں ایران یا روس کے بارے میں جتنے مضامین چھپتے تھے، ان کا انداز تحریر اور لہجہ انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی تھا۔[11]

جنگِ آزادی کے اسباب کے سلسلے میں قلعہ معلّٰی اور صحافت کے درمیان سازش کے کارفرما ہونے کا خیال موجود تھا۔ اس وقت اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا گیا تھا کہ اخبارات نے آنے والے انقلاب کے لیے زمین ہموار کی تھی۔[۱۲] چناں چہ یہ امر مسلم تھا کہ جنگِ آزادی سے قبل ہی مقامی اخبارات نے خبروں کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔[۱۳] اس اعتبار سے صادق الاخبار زیادہ اہم ہے، جسے دہلی سے سیّد جمیل الدین خان نکالتے تھے۔[۱۴] یہ دہلی کا سب سے بڑا اخبار تھا، جو نہ صرف دہلی میں پڑھا جاتا تھا بلکہ باہر بھی بھیجا جاتا تھا۔[۱۵] اس کے مدیر ایک اور اخبار جاری کرنا چاہتے تھے اور بہادر شاہ ظفر نے اس کی اجازت بھی دے دی تھی۔[۱۶] اس وقت دہلی سے جتنے اخبار جاری ہوتے تھے ان کی اجازت بہادر شاہ ظفر دیتے تھے۔ اُنھوں نے ایک جنگِ آزادی کے خفیہ اخبار کی اجازت بھی دے دی تھی۔[۱۷] خود بہادر شاہ کی سرپرستی میں سراج الاخبار نکلتا تھا، جو دربار معلّٰی کا روزنامچہ ہوتا تھا۔[۱۸] دہلی سے چونی نامی شخص ایک قلمی اخبار نکالتا تھا،[۱۹] جس میں عمومی دل چسپی کے تمام موضوعات پر مضمون درج ہوتے تھے۔ بعض مواقع پر اس نے کارتوسوں کے مسئلہ پر اور اس پر فوج کے باغیانہ ردِّ عمل کے جذبہ کی طرف اشارے بھی کیے۔[۲۰]

جنگِ آزادی کے آغاز کی سن گن اخباروں میں بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ دہلی اُردو اخبار اس منظر کو بیان کرتا ہے جب فوجوں میں بغاوت کے جذبات ابھر رہے تھے۔

> ......ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی کرنی شروع کر دی ہے۔ چناں چہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹنیں پھر گئی تھیں، ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا...... پلٹن گورکھا نمبر ۱۶ مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل درآمد کارتوس سے انکار کیا...... ازروئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوس کی قواعد سے ٹکراتے ہیں۔ اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں۔ لوگوں کے دل کا شک ابھی بالکل رفع نہیں ہوا۔[۲۱]

دوسری چھاؤنیوں میں بھی جو حالات بگڑ رہے تھے ان کی عکاسی بھی اپریل اور مئی کے اخبارات میں موجود ہے:

> ...... بجائے وبائی چپاتیوں کے جو قبل اس سے تقسیم ہوئی تھیں۔[۲۲] اب ہنگامہ وبائی آتش زنی کا گرم ہے...... ۴ تاریخ (مئی) بارہ بجے رات کے ڈاک بنگلہ (پھلور) کسی نے آگ لگا دی۔[۲۳]

ایسے واقعات دیناپور، بارک پور، لکھنؤ، میرٹھ وغیرہ میں بھی رونما ہوئے تھے اور سپاہیوں نے

اپنے باغیانہ جذبات کا اظہار مختلف انداز سے کیا۔ ان کی روداد اخبارات میں محفوظ ہے۔[۲۴] اس وقت تک محض کارتوس اس جذبہ کے اظہار کا سبب بنے تھے لیکن......

......علاوہ کارتوس سپاہ کے دل میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ آٹے میں پسی ہوئی ہڈیاں ملائی جاتی ہیں......[۲۵]

چناں چہ اس جذبہ میں شدت پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اور جب بغاوت بھڑک اٹھی تو دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں رونما ہونے والے واقعات دست یاب اخبارات میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن میرٹھ کے بعد دہلی میں جو واقعات رونما ہوئے وہ دیگر اخبارات[۲۶] کے علاوہ دہلی اُردو اخبار مورخہ ۱۷ رمئی ۱۸۵۷ء میں مرقوم ہیں۔[۲۷] ساتھ ہی اس شمارہ میں انبالہ، میرٹھ، سہارنپور، روڑکی کے حالات بھی درج ہیں۔[۲۸] اس کے بعد ۲۴ رمئی کے شمارہ سے دہلی کے تفصیلی اور دیگر شہروں کے اجمالی حالات کا علم ہوتا ہے۔ اوّلاً اس میں محمد حسین آزاد کی طویل نظم بعنوان ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' تحریر ہے۔[۲۹] اس کے آخری شعر یہ ہیں:

کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے　　حیران ہیں سب آئینہ صفت پشت بہ دیوار

حکام نصاریٰ کا بہ دین دانش و بینش　　مٹ جائے نشان خلق میں اس طرح سے یک بار

اس واقعہ کی پائی یہ آزاد نے تاریخ

دل نے کہا قل فاعتبروا یا اولی الابصار

پھر ہندوستان کے مختلف شہروں بلند شہر، کان پور، لکھنؤ، آگرہ، جھجھر، سکندرہ، غازی آباد، بلب گڑھ، میرٹھ کے بعد دہلی کے حالات لکھے ہیں۔ جنگِ آزادی جیسے جیسے سارے برِ عظیم میں پھیلتی جارہی تھی، ہندوستانیوں کے جذباتی ہیجان میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اور وہ ہندوستانیوں کی فتح کے لیے پُر امید ہورہے تھے۔ صادق الاخبار اپنی اشاعت ۳ راگست ۱۸۵۷ء کے اداریہ میں لکھتا ہے:

گورے ہزاروں سب اطراف سے کھنچ کر آئے، فرنگیوں نے لاکھ تدبیر تسخیر دہلی کی کی، مگر نہ گوروں کی شجاعت یہاں کام آئی اور نہ تقدیر کے آگے کچھ تدبیر پیش گئی۔ جہاں تہاں وہ کفار گاجر کی طرح کاٹے اور ہر ایک کھیت پر مولی کی مانند چھانٹے گئے۔ باقی جو قدرے قلیل میدان علی پور میں ہیں، ان کو بھی عنقریب سن لیں گے کہ جاروب قہر الٰہی سے خس کم جہاں پاک ہوئے اور شاہ گیتی پناہ کا تسلط تمام ہندوستان میں ہوگیا۔[۳۰]

اسی اشاعت میں سرورق پر تین قطعات درج ہیں جن میں فتح کی دعا کی گئی ہے۔[۳۱] اور ایک خبر دہلی کے ایک مورچہ کی تحریر ہے، جس میں انگریزوں کی شکست اور دیسی افواج کی فتح کا مژدہ ہے:

......سنا گیا ہے کہ نویں تاریخ ماہ سعید عید قربان کو افواج ظفر امواج نے مخالفین دین سے بوقت نواخت نو گھنٹہ روز کے باوٹہ پر خوب مقابلہ و مقاتلہ کیا۔ دیر تک کشت و خون مردمان طرفین ہوتا رہا۔ من بعد باران رحمت الٰہی نے نزول کیا، گورے بھاگ نکلے...... کہتے ہیں کہ گورے اس روز کی لڑائی میں بہت کام آئے...... غرض کہ بہادران نیمچہ نے سب گوروں کو قتل کیا۔ اگلے دن اور سپاہ جنگی دشمنوں سے لڑتی گئی اور اک بارگی دھاوا کر کے پہاڑی پر چڑھ گئی۔ کفار نگوں سار میں سے جو سامنے پڑا ہلاک کیا...... واقعی یہ فوج ظفر موج ایسی جری ہے کہ آج تک نہ چشم فلک نے دیکھی اور نہ گوش زمانہ نے سنی ہوگی۔[۳۲]

دہلی اُردو اخبار کا نام آخری دنوں میں بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی مناسبت سے اخبار الظفر تجویز کیا تھا۔[۳۳] اس نام سے دہلی اُردو اخبار کے دس شمارے دست یاب ہیں۔ آخری شمارے میں یہ قابلِ ذکر خبر ہے:

...... چار دن سے خوب لڑائی توپ و تفنگ کی ہو رہی ہے۔ کفار نے کئی مورچے نئے بنائے ادھر سے بھی کئی مورچے جدید بنے...... مجملاً اتنا بس ہے کہ انشاء اللہ صبح و شام تائید ایزدو قہار اور قدرت قادر ذوالجلال سے فتح اسلام و ہلاکت کفار نمایاں ہوتی ہے۔[۳۴]

مشہور فتویٰ جہاد اسی اخبار کی ایک اشاعت میں چھپا تھا۔[۳۵] اور اس کی نقل صادق الاخبار ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔[۳۶] اسی اشاعت میں صادق الاخبار نے اس معرکہ کی تاریخ رستخیز بیجا چار عدد کے تخرجے سے نکالی تھی۔[۳۷]

بحیثیتِ مجموعی یہ امر حقائق پر مبنی ہے کہ بہادر شاہ کے زیر سایہ دہلی کے اخبارات نے انگریزوں کی کامیابیوں کے باوجود آخر دم تک مجاہدین اور ہندوستانیوں کے حوصلے بلند رکھنے کی کوششیں کیں۔ مرزا بیدار بخت سے بھی ایک اخبار پیام آزادی منسوب ہے جس نے جنگِ آزادی کے دوران نمایاں خدمات انجام دیں۔[۳۸] اسی نام سے ایک اخبار انھیں مقاصد کے تحت عظیم اللہ خان نے بھی نکالا تھا۔[۳۹]

جنگِ آزادی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اس وقت جو ادب ضروری سمجھا گیا اس کی اشاعت کے لیے مطابع کے قیام کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جیسے مولوی قطب شاہ نے بریلی میں مطبع بہادری قائم کیا تھا۔[۴۰] خاندان بہادر خاں کے تمام سرکاری و غیر سرکاری اعلانات و اشتہارات یہیں طبع ہوتے تھے بلکہ بہادر شاہ اور شہزادہ فیروز بخت کے اعلانات بھی اسی مطبع میں چھپتے تھے۔[۴۱] جملہ مطبوعات پر ناشر

اور طابع کی حیثیت سے مولوی قطب شاہ کا نام چھپتا تھا۔[۴۲]

اُردو کے علاوہ فارسی اخبارات نے بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی روش اپنائی۔ دوربین، سلطان الاخبار اور گلشن نوبہار اس قبیل کے اخبار تھے۔ انگریزی میں فرینڈ آف انڈیا، بمبئی ٹائمز، بنگال ہرکارو حقیقت پسند اخبار تھے۔[۴۳]

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس قسم کی صحافت کا خاتمہ ہوگیا۔ باغی اخباروں کے خلاف سخت کارروائی ہوئی۔ جہاں تک دیسی باشندوں کے خلاف اشتعال انگیزی کا تعلق تھا، انگریزی اخبار کاملاً آزاد تھے۔[۴۴] دیسی اخباروں کے لیے قوانین زبان بندی اور شدید کردیے گئے۔ پشاور میں مرتضائی کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں قید کر کے اخبار بند کردیا گیا۔[۴۵] ملتان کے ایک دیسی اخبار کی اشاعت بھی روک دی گئی۔[۴۶] باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دوربین، سلطان الاخبار کے مدیران پر مقدمہ چلایا گیا۔[۴۷] گلشن نو بہار کا مطبع ضبط کر کے اخبار بند کردیا گیا۔[۴۸] دہلی اُردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر کو گولی ماردی گئی اور ان کی جائداد ضبط کرلی گئی۔[۴۹] اس اخبار کے آخری دنوں میں اس پر طابع و ناشر کی حیثیت سے محمد حسین آزاد کا نام چھپتا تھا۔[۵۰] مولوی محمد باقر کی شہادت کے بعد ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، اور گرفتار کرنے والے کو پانچ سو روپے کا انعام مقرر ہوا۔[۵۱] صادق الاخبار کے مدیر جمیل الدین خاں پر مقدمہ چلا کر انھیں تین سال قید کی سزا دی گئی۔

❁ ❁ ❁ ❁
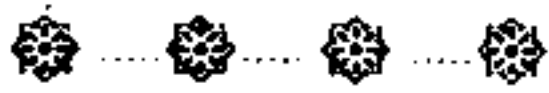
۴-متفرقات

سیاسی اور قومی موضوعات پر مشتمل ادب

اس دور میں موضوع زیر بحث کے تعلق سے اُردو میں سیاسی ادب بہت کم دست یاب ہے۔ ضمناً کہیں کہیں، جہاں تک تاریخی موضوعات کی تصانیف کا تعلق ہے سیاسی مباحث و واقعات نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی تصانیف میں سے اکثر ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اُردو نثر میں لکھی جانے والی تمام دست یاب کتب تواریخ میں قصہ و احوال روہیلہ قدیم ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ ہے[1] اس کتاب کو سیّد رستم علی بجنوری نے لکھا تھا۔ اس قصہ و احوال روہیلہ میں حافظ رحمت خان کی شہادت کے بعد کے واقعات میں صرف شجاع الدولہ کی وفات اور آصف الدولہ کے مسند وزارت پر فائز ہونے اور دربار دہلی سے خطابات پانے تک کے واقعات ہیں[2] اور اس کو مصنف نے محض سیاسی کش مکشوں اور جنگی کارناموں تک محدود رکھا ہے[3] پھر بھی آداب معاشرت اور معاشی حالات پر بھی ضمناً روشنی ڈالی ہے۔ دہلی کے سپاہیوں بالخصوص کلاہ پوشوں اور سینہ داغ والے رسالوں کی معاشی پریشانیوں کا بیان بالکل شہرِ آشوب کے انداز میں کیا ہے[4] اس کتاب میں مصنف نے قوموں اور گروہوں کے عروج و زوال کے چند بنیادی اسباب و محرکات بھی پیش کیے ہیں[5]

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل چند اور تاریخی تصانیف اُردو نثر میں دست یاب ہیں۔ سرحمۂ تاریخ فیروز شاہی، مطابق ۱۲۲۰ھ[6] تاریخ ہندوستان اس میں ۱۱۹۵ھ کی لڑائیوں کا ذکر ہے۔[7] بہادر نامہ تصنیف ۱۲۱۲ھ[8] حیدر نامہ ٹیپو سلطان کے بارے میں تھی حملہ نامہ تاریخ سرنگاپٹن[9] وغیرہ۔ فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد لکھی جانے والی تصانیف میں تاریخی اور سیاسی مباحث تقریباً ناپید ہیں۔ نصف صدی کے لگ بھگ کہیں اس قسم کی کچھ کتابیں ملتی ہیں۔ جیسے مجمع تواریخ ہندوستان کی تاریخ پر مبنی تھی۔ یہ ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔[10] کتاب حالات دہلی، دیہاتی طبقات اور ان کے مسائل، رسوم و قوانین سے متعلق تھی۔ جمیل الدین نے اسے ۱۸۵۰ء میں لکھا تھا۔[11]

فتح گڑھ نامہ تاریخ فتح گڑھ پر مبنی تھی جسے کالی پرشاد رائے نے لکھا تھا اور ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی تھی۔[۱۲] تاریخ رشید الدین خانی ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی تھی، اسے امام خان نے لکھا تھا۔[۱۳] اس کتاب کے مقدمہ میں راجگانِ ہند کے حالات دفتر اوّل میں سلاطینِ دہلی کے حالات، دوسرے دفتر میں اسلامی سلاطینِ دکن کا ذکر ہے۔ آخر میں انگریزوں کا دکن میں آنا اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے ان کی جنگوں کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں۔[۱۴]

دیگر اصناف نثر میں جن میں سیاسی مباحث ملتے ہیں سعادت یار خان رنگین کی تصنیف اخبار رنگین ہے جسے روزنامچہ آپ بیتی اور اپنے زمانہ کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا آئینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ رنگین نے یہ تصنیف باندہ میں ۱۲۴۹ھ میں مکمل کی تھی۔[۱۵] اس تصنیف میں ۹۳ حکایات ہیں۔ ان میں ذاتی حالات کے علاوہ اس دور کے چشم دید واقعات و کوائف ہیں جن سے اس دور کے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی ماحول کی بڑی حد تک حقیقی عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں موجود حکایتوں سے دہلی کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سپاہیانہ زندگی، امرا کی حالت اور مصالحت اس کے مفید اور مضر اثرات، امرا کی عیاشیاں اور عوام کی مشکلات، حقائق سے چشم پوشی، عمل سے اعراض، اُمرا و رؤسا کی محفلوں کا ذکر، پیشہ وروں اور عمال کا حال، ان حکایات کا موضوع ہیں۔[۱۶] ان میں اس وقت کے سیاسی انتشار اور اس کے نتیجہ میں چھوٹی بڑی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کا ذکر بھی آتا ہے۔[۱۷] اس وقت دہلی میں مرہٹوں کا عمل دخل اور اس کے پیدا کردہ اثرات جنھوں نے مغلیہ سلطنت کو بڑا نقصان پہنچایا تھا اور اس نقصان کو دور کرنے کے لیے افراد کی جدوجہد بھی حکایتوں سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

> خیر گزری کہ پانٹ کی لڑائی میں نواب احتشام الدولہ مرزا اسمٰعیل بیگ خان نے سندھ پٹیل مرہٹے سے شکست کھائی تو سعادت یار خان رنگین بھی ان کے رفیق تھے۔ تمام مال و اسباب کھو کر لکھنؤ میں افلاس کی حالت میں آئے۔[۱۸]

> خیر گزری کہ بھرت پور کا قلعہ انگریز سے ایسا لڑا کہ کچھ بیان میں نہیں آتا اور مدت تک لڑ کر کس طرح بچ رہا، یہ دھیان میں نہیں آتا کیوں کہ انگریز لوگ جس طرف لڑنے جاتے ہیں ادھر سے منہ نہیں موڑتے...... راجا رنجیت سنگھ جاٹ کہ مالک بھرت پور کا تھا، اس میں کچھ وصف تو نہ تھا مگر یہ تو نموز رکھتا تھا کہ رعیت کو اپنے سے خوشنود رکھتا......[۱۹]

خودنوشت سوانح عمری میں جنگِ آزادی سے متعلق ایک داستان غدر ہے، اسے ظہیر دہلوی

عرف نواب مرزا دہلوی نے طراز ظہیری عرف داستان غدر کے نام سے لکھا تھا۔ ظہیر دہلوی بہادر شاہ کے داروغہ ماہی مراتب تھے اور راقم الدولہ کا خطاب تھا۔ اپنی خودنوشت میں اُنھوں نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر قلعہ کی ملازمت، الور، جے پور اور ٹونک کی ملازمت کے حالات لکھے ہیں اور دہلی کی جنگِ آزادی کا مختصر حال بھی بیان کیا ہے۔ ان کی تصنیف ان ہی ایام کی رُوداد ہے، جب جنگِ آزادی جاری تھی یا ناکام ہو چکی تھی۔ ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی میں وہ ایک خاموش تماشائی تھے۔ اُنھوں نے نہ تو انگریزوں کی خیرخواہی کی نہ انگریزوں کا ساتھ دیا بلکہ جابجا انقلابیوں اور اپنے دامن کو بے داغ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس بنا پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بغاوت کی کچھ نہ کچھ ضرور حمایت کی ہوگی۔ ورنہ اپنی پاک دامنی پر اس قدر زور نہ دیتے۔[20] اس کتاب میں یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اس میں بہادر شاہ ظفر کا ذکر اور ان کا نام عقیدت و احترام سے آیا ہے۔ دوسرے مورخوں کی طرح ان کی مذمت نہیں کی گئی۔[21]

متفرق اصناف کے تحت دو اور کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن کے موضوعات سیاسی تو نہ تھے لیکن ان میں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی تھی اور انھیں اپنی اور قومی اصلاح کی جانب متوجہ کیا گیا تھا جن میں سے ایک نصیحت نامۂ مسلمانان ہے جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی تھی۔[22] اور دوسری راد غریب تھی جو مسلمانوں کی ہدایت کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۳ء میں چھپی۔[23]

❋ ❋ ❋

اُردو شاعری ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

۱۔ علی گڑھ تحریک، اس کے متعلقین اور اس کا ادب

۱۸۵۷ء کے بعد صورتِ حال مسلمانوں کے لیے نازک اور خطرناک تھی۔ وہ دشمن طاقتوں کی معاندانہ سرگرمیوں اور اپنے سیاسی زوال اور معاشرتی ابتری کی وجہ سے ہر طرف سے خطرات اور مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں ان نامساعد حالات کے باجود اپنی انفرادیت کا احساس اور آزادی کا جذبہ موجود تھا۔ اسلام کی تعلیمات مسلمانوں کو محکومی پر آمادہ نہیں رکھتیں۔ چناں چہ ان میں یہ جذبہ شدید تھا۔ وہ انگریزی عہد میں کبھی مطمئن نہ بیٹھ سکے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتائج کے لحاظ سے مسلمانوں میں طرزِ فکر کے اعتبار سے دو گروہ بن گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے اثر نے اور ہندوؤں کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو بہت متاثر کیا۔ اس تاثر نے اس میں یہ احساس پیدا کیا کہ ان کی موجودہ ذلت، پستی اور ناکامی کی وجہ انگریزوں سے دشمنی اور عداوت ہے۔ انھیں اپنے اختلاف کے اس رویے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں، جس کے عوض انھیں حکومت میں عہدے اور مناصب مل سکیں گے۔ اس احساس نے مسلمانوں کے اس گروہ کو جنگِ آزادی کے محاذ سے ہٹا کر ایک دوسرے محاذ پر لا کھڑا کیا، اور جس نے اپنی مصلحت بینی اور دور اندیشی سے مسلمانوں کے لیے، اپنے نقطۂ نظر سے، عافیت کا ایک راستہ تلاش کیا جب کہ دوسرا گروہ اس کے برعکس، اپنے قدیم طرزِ فکر اور رویے پر قائم رہا۔ اس کی علانیہ ہر ممکن کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں میں احیائے اسلام کا جذبہ برقرار رہے۔ وہ انگریزوں کے سامنے وقتی طور پر ہی سہی، سپر ڈالنے کے بجائے اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں میں ہر قسم کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتا رہے۔ مسلمانوں میں اپنی تہذیب اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے، حکومت کے اثرات سے بے نیاز، وسیع اور ملک گیر تحریک شروع کی۔ اس تحریک نے پہلے "دیوبند" اور بعد میں "ندوہ" جیسی جماعتی شکلیں اختیار کیں۔ اور ان کے زیرِ اثر ملک کے گوشے

گوشے میں مختلف مکاتیب، مدارس، انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے۔ یہ ایک ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا اقدام تھا کہ اس سے قوم میں اپنی آزادی اور سربلندی کا احساس و جذبہ کم نہیں ہوا۔

پہلے گروہ نے جدید تعلیم کے زیر اثر حاصل شدہ احساس کی مدد سے انگریزوں اور ہندوؤں کے مشترکہ خطرے کو محسوس کیا۔ مصلحت اور انگریزوں سے تعاون و اشتراک کے ذریعہ حالات کے مقابلے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس کا طریق کار انگریزوں سے تعاون و اشتراک کے ذریعہ بظاہر یہ یقین دلانا تھا کہ وہ انگریزوں کا دشمن اور مخالف نہیں، بلکہ حکومت کا وفادار اور اس کا معاون ہے۔ اسے اس کے صلے میں حکومت کے نظم ونسق میں کچھ حاصل کرنا تھا۔ اس قسم کا طرزِ عمل اس وقت کے حالات کے تقاضے میں کچھ غیر فطری نہ تھا۔ کیوں کہ ڈیڑھ سو سال تک مسلمانوں نے جو جنگ آزادی جاری رکھی تھی، اس میں پیہم ناکامیوں اور نقصانات سیاسی ابتری اور معاشی زبوں حالی کی وجہ سے یہ طریق عمل فطری معلوم ہوتا ہے۔ اس انداز سے مسلمان جو کبھی انگریزوں کے خلاف متحد اور منظم تھے، طرز فکر اور طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے تقسیم ہو گئے، اور آزادی کے لیے دونوں نے الگ الگ راہیں منتخب کیں۔ پھر بھی دونوں میں جو قدر مشترک تھی وہ ان کا قومی وجود اور تہذیب وتمدن کے تحفظ کا جذبہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے طریق کار ضرور مختلف تھے، لیکن منزل ایک ہی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے مسلم معاشرے کی وحدت متاثر ہوئی۔ ان دونوں گروہوں نے اپنے اپنے طرز احساس اور خلوص کے مطابق ضروری خیال کیا کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں اپنی قوم کو نبرد آزما کرنے کے لیے، قوم کو جدید حالات کے تقاضوں کے مطابق تیار کیا جائے۔ اس احساس کے تحت، دوسرے گروہ نے ''دیوبند'' اور ''ندوہ'' جیسے اداروں کے قیام سے قوم کو اپنی عظیم روایات، تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کی طرف راغب کیا، تاکہ قوم ان کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکے۔ پہلے گروہ نے دوسرے گروہ کے مقابلہ میں مراجعت پسندی اور روایت پرستی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کو زیادہ اہمیت دی اور انگریزی علوم کی تدریس اور جدید نظریات کی تحصیل کو قوم کے لیے مفید قرار دیا۔ چناں چہ علی گڑھ تحریک اور اس قسم کے طریق فکر کا اجراء، انگریزوں اور ہندوؤں کے مشترکہ خطرے کا احساس اور اس سے آزادی کے جذبے کا اظہار تھا۔

اس قسم کے طرز فکر کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی اصلاح وترقی کی ایک ہمہ گیر تحریک، جس نے برِّعظیم کے اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنے حلقۂ اثر میں لے کر ان میں ایک

ذہنی انقلاب پیدا کر دیا، سیّد احمد خان کی (علی گڑھ) تحریک تھی[1] سیّد احمد خان مسلمانوں کی کمزوریوں اور صلاحیتوں دونوں سے واقف تھے۔ ان کی حکمت عملی اور ان کے سیاسی افعال اس غالب خیال کے ماتحت رہے کہ حکومت بہت زیادہ مضبوط ہے اور اسے مسلمانوں کی جدوجہد سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مشترک ہیں، کیوں کہ وہ ایک ہی سرزمین کے باشندے ہیں، اس لیے آغاز کار میں ان کی حکمت عملی بعض مشترک مقاصد کے حصول کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہتر تعلقات اور تعاون پر ان کا یہ عقیدہ مدت العمر تک رہا۔ لیکن جب ہندوؤں نے کھل کر ایسی حکمت عملی اختیار کی جو مسلمانوں کے ساتھ تعاون کے جذبات پر مبنی نہیں تھی[2] تو لسانی تنازعہ کے بعد ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی[3] اور یہ تبدیلی ان کی زندگی کے آخر تک رہی۔ کانگریس کی تشکیل، گئو پتی کے تہوار اور ذبیحہ گاؤ کے خلاف شورش نے انھیں نہ صرف دوقومی تصور کا شعور دیا بلکہ اسے تقویت بھی بخشی۔ مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کانگریس کے مقاصد کو سمجھا تھا۔ کانگریس کے خلاف دیے گئے ان کے بیانات کو اس وقت برِعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے۔[4] اس خیال پر کہ مسلمان انگریزی عہد کے جدید ہندوستان میں انگریزی زبان میں اور جدید مغربی سیاسی نظریات سے واقفیت کے بعد ہی اپنے منفرد وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں، سیّد احمد خان کی شدید مخالفت ہوئی۔ لیکن اس امر کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کی حیثیت محکوم آبادی کے ایک فرد کی تھی۔ وہ مختار نہیں تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کی سطح تک پہنچا دیں۔ کسی وقت خود سیّد احمد خان نے برِعظیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے میکالے کی تجویز کی مخالفت کی تھی لیکن بعد کی صورت حال کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی رائے کو قطعاً بدل دیا۔[5] انھوں نے مسلمانوں کی صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر ان کے لیے بتدریج ایک حکمت عملی وضع کی جس میں تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو سنبھلنے اور ترقی کرنے کے لیے مغرب کے علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے "باشندگانِ ہند کی تعلیمی ترقی" کے متعلق باشندگان ہند کے نام ایک پیغام میں اس امر پر زور دیا کہ مغربی علوم کو اُردو تراجم کے ذریعہ برِعظیم کے باشندوں میں مقبول عام بنایا جائے۔ ان کی قائم کردہ "سائنٹی فک سوسائٹی" کا یہی مقصد تھا۔[6] لیکن وہ تعلیمی میدان میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے، یہ سوسائٹی اس کا محض ایک جزو تھا۔ انھوں نے ابتداءً (۱۸۵۹ء) میں مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔[7]

پھر غازی پور میں ایک سکول قائم کیا جو علی گڑھ منتقل ہو کر کالج کے معیار تک پہنچ گیا۔ ان کا خواب دراصل یہ تھا کہ ایک ایسی جامعہ قائم کی جائے جو برِعظیم کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو، جو مغربی علوم اور اسلامی اقدار کا گراں بہا امتزاج پیدا کرے، اور اس میں رہ کر طلبہ کردار کی ان خصوصیات کو ترقی دیں جنھوں نے سلطنتیں تعمیر کیں۔ ۱۸۶۹ء میں سیّد احمد خان اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ انگلستان گئے اور وہاں سے نئی تہذیب و تعلیم کی ترویج کا ایک نیا جوش و ولولہ اور اصلاح و ترقی کا ایک نیا منصوبہ لے کر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔[۸] دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ''کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند'' بنائی، جس نے اسلامی درسگاہ کا خاکہ مرتب کیا۔ مدرسۃ المسلمین کی تاسیس اور فراہمی زر کے لیے ایک کمیٹی ''خزینۃ البضاعت'' قائم کی۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں نئے مدرسے کا افتتاح ہوا۔[۹]

یہ ان کے خواب کی جزوی تعبیریں تھیں، کیوں کہ اُنھوں نے مسلمانوں کا ایک ایسا تعلیمی مرکز قائم کرنے کی خواہش کی تھی جہاں کام کر کے مسلمان اپنا علمی مقام حاصل کر سکیں۔[۱۰] اس کالج نے مسلم ملت کی تشکیل میں ایسے وقت پر ایک اہم کردار ادا کیا جب وہ روبہ زوال تھی۔ اس نے قوم کو ایک نئی امید دی اور ایک نئے مقصد کا فہم دیا۔ اس نے مسلمانوں کو مایوسی سے نکال کر بارآور سرگرمیوں کی دعوت دی۔ اس نے ایسے مسلمانوں کی ایک نسل تیار کی جو اسلام کے ساتھ اپنی بنیادی وفاداری کو خراب کیے بغیر دنیا کے جدید حالات اور نظریات سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے برِعظیم میں ایک سالم و متحد مسلم ملت کے خیال کو زندہ رکھا۔ اس طرح یہ بیک وقت تعلیمی ادارہ بھی تھا اور ایک تحریک بھی۔

قومی تعلیم کی تحریک کو ہندوستان بھر میں پھیلانے اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ۱۸۸۶ء میں ایک غیر سیاسی، تعلیمی، اصلاحی و تعمیری انجمن ''محمڈن ایجوکیشنل کانگریس'' کے نام سے قائم کی۔[۱۱] جس نے بعد میں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے ایک موثر مرکزی ادارے کی صورت اختیار کر لی۔ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں کئی لحاظ سے ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کالج سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں کانفرنس ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔[۱۲] سیّد احمد خان جس ورنیکلر یونی ورسٹی کو قائم کرنا چاہتے تھے، اس کانفرنس نے ہی اس کام کو آگے بڑھایا۔[۱۳] جدید تعلیم کے طفیل مسلمانوں نے جدید مغربی نظریات سے واقفیت حاصل کی۔ سیاست میں بھی اُنھوں نے جدید رجحانات کو قبول کیا اور ان

کے زیر اثر برِ عظیم کی سیاسی زندگی میں اپنی حیثیت و اہمیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر سرگرمیاں دکھائیں۔ بعد میں پیدا ہونے والی تحریک آزادی میں ایک نمایاں اور امتیازی حصہ لیا۔ اور نہ صرف انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی بلکہ ہندوؤں کے مقابلے میں بھی خود کو ممتاز رکھا۔ سیّد احمد خان کی حکمت عملی اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف مغربی تعلیم کے لیے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی تحریک تھی۔[۱۴] قوم نے سیّد احمد خان کا مشورہ قبول کر کے ناگزیر حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ نئی تعلیم ان کے استقرا کے لیے تھی۔ لیکن اجنبی حکومت کے ساتھ وفاداری ملت کی سیاسی حکمت عملی کا جزو کب تک رہ سکتی تھی۔ ابتداءً انگریزوں کے اس احساس کے نتیجے میں کہ مسلمان وفادار نہیں اور اس خیال کی بنا پر مسلمانوں کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑی تھیں، سیّد احمد خان ان کی طرف سے لاپرواہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اسباب بغاوت ہند، سرکشی ضلع بجنور، رسالہ خیر خواہان مسلمانان کی اشاعت اور ان کے ذریعہ اس امر کا اظہار کہ تمام مسلمان باغی نہیں تھے اور اس لیے بلا امتیاز پوری قوم کے خلاف معاندانہ حکمت عملی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ سیّد احمد خان کی اس تکلیف کا ثبوت ہے، جو مسلمانوں پر انگریزی مظالم کے نتیجے میں پہنچ رہی تھی۔ رسالہ تحقیق لفظ نصاری کی تصنیف کا مقصد بھی انگریزوں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ انجیل کی تفسیر تبئین الکلام کی تحقیقی کاوش کا مقصد بھی یہی تھا کہ تعصب یا جہالت کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو باہمی نفرت پیدا ہوگئی ہے، اسے دور کیا جائے۔ اپنے پس منظر میں دیکھا جائے تو سیّد احمد خان کی تمام قومی خدمات اور خود علی گڑھ تحریک کی بنیاد، قومی ہمدردی کا وہ شدید جذبہ تھا، جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہول ناک نتائج سے ان کے دل میں ابھرا۔ اس جذبے کے خلوص اور اپنی سیاسی دور اندیشی کی بدولت اُنھوں نے قومی بقا و ارتقا کی ایک محفوظ راہ ڈھونڈ نکالی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی سلامتی اور سربلندی کے لیے انگریزی حکومت سے سازگاری اور مفاہمت اس تحریک کا پہلا بنیادی مقصد تھا۔

ہندوؤں کی مختلف سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کے جواب میں یہ امر نظری تھا کہ سیّد احمد خان بھی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک خالص مسلم جماعت ''محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف انڈیا'' کی تنظیم کرتے۔ ان کے یہ تصورات کہ ہندوستان ایک ملک نہیں برّعظیم ہے، ہندو اور مسلمان ایک نہیں، دو علاحدہ علاحدہ قومیں ہیں۔ علاحدگی بہرحال لازمی ہے اور مسلمان ایک اکثریتی ووٹ سے قائم کردہ نظام حکومت میں نہ مدغم ہو سکتے ہیں نہ انھیں کیا جانا چاہیے۔ سیاست میں مسلمانوں کی

علاحدگی پسندی اور مطالبہ پاکستان کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔[15]

دراصل سیّد احمد خان اس نتیجے پر بھی پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے منصوبوں سے مستفید کرنے اور انھیں اپنے ساتھ تعاون کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے مطمح نظر میں انقلاب برپا کریں۔ اس مقصد کے تحت اُنھوں نے اپنا رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا اور اس کے ذریعہ کوشش کی تھی کہ ایک وسیع محاذ پر ایک اصلاحی لائحہ عمل کو بروئے کار لائیں۔ ان کے جوش وخروش سے کوئی پہلو نہیں بچا۔ عام معنوں میں وہ مذہبی مفکر نہیں تھے،[16] نہ اُنھوں نے دینیات کے کسی نظام کی تخلیق کی، نہ کوئی نیا دبستان کھولا۔[17] زندگی کے متعلق جس مطمح نظر کو وہ غلط سمجھتے تھے اس سے لے کر اسلام کے بارے میں خود اپنے فہم و ادراک تک جو کچھ تھا سب کو اُنھوں نے قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی تحریروں کی تہ میں ایک عمیق مقصد پوشیدہ تھا۔ وہ اس حقیقت کو اپنی ملت کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ جدید سائنس حقیقی اسلام کی تخریب نہیں کرتی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو مذہب وحی کے ذریعہ آتا ہے وہ حقیقتاً خدا کا قول ہوتا ہے۔ اس لیے قوانین فطرت کی، جو خدا کی تخلیق ہیں، خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔[18] یہی وہ اصول ہے جسے ان کی تصانیف متعلق بہ اسلام کا موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے مذہبی شعور کی بنیاد سائنسی عقلیت اسلامی فکر کی حرکیت اور اس کی ارتقا پذیری پر ہے۔[19] وہ تجدید اور اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے تاکہ زمانے کے انقلابات کے ساتھ زندگی کے ارتقا کی نئی نئی راہیں کشادہ ہوں۔[20] فی الحقیقت اُنھوں نے مسلمانوں کے ذہن کو ان تفاسیر سے ہٹانے کے لیے جو یونانی فلسفے کے زیر اثر مرتب کی گئی تھیں سب سے پہلے رہنمائی کی تھی۔ اور قیاسی فکر کی جگہ فطری علوم کے عینی مشاہدات کی مدد سے قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کی فکر کو سمجھنے کی کوشش کی۔[21] وہ ایک انسان تھے اس لیے سہو وخطا سے مبرا نہیں ہوسکتے ہیں۔ اس بنا پر ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں مگر ان کی تفسیر کے بنیادی تصورات نامعقول نہیں ہیں۔ اُنھوں نے ایک ایسی راہ دکھائی جس پر چلنے سے برِعظیم کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کو کافی ترقی ہوئی۔[22] علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقاصد کی تکمیل مذہبی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ سیّد احمد خان نے ابتدا ہی میں یہ محسوس کیا تھا کہ معاشرتی اصلاح کی مہم میں مذہبی تنگ نظری، اوہام اور تعصبات کے سنگ گراں قدم قدم پر حائل ہیں۔[23] اُنھوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کے لیے سب سے پہلے مذہبی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی غرض سے رسالہ احکام طعام اہل کتاب، تبئین الکلام اور تحقیق لفظ نصاریٰ جیسی کتابیں

تصنیف کیں۔ اس سب کے باوجود بھی علی گڑھ تحریک مذہبی تحریک نہ تھی۔ مذہبی احیا اس کا مطمح نظر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ پر مذہبی رنگ خاص طور پر نمایاں نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک تعلیمی، سیاسی اور تہذیبی تحریک تھی، اور اس کا مقصد اولی قوم کی معاشرتی پستی کو دور کرنا تھا۔ اس کا مفید نتیجہ ایک یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے خوابیدہ ذہن کو مسلم قومیت کا تصور و شعور عطا ہوا۔ مسلم ملت میں ترقی کا خیال اور ماضی کے مقابلے میں مستقبل کی اہمیت کا احساس بھی اسی تحریک کے اثرات کا ثمر ہے۔ اس نے اپنی زبان اور ادب کو سربلند کرنے اور سنجیدہ علمی اور عملی کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ اس نے آگے چل کر تحریک آزادی میں ایک تو جان ڈال دی اور دوسرے اس کو بڑے بڑے فعال اور پرخلوص، نڈر اور باوقار رہنما بھی دیے۔ یہ رہنما سیّد احمد خان کے فیض صحبت سے مستفیض تھے اور انھیں تہذیب الاخلاق اور کالج نے ایک دوسرے کا شریک بنایا تھا۔ سید احمد خان جس تحریک تجدید فکر کے لیے کوشاں تھے، اس میں ان کے رفقا کی تائید و حمایت شامل تھی۔ متعدد مواقع پر اس حقیقت کا اظہار بھی ہوا ہے کہ سیّد احمد خان اپنے تجدیدی خیالات میں جس انتہا تک پہنچ گئے تھے، اس کو ان کے قریبی رفیق اور دوست پسند نہ کرتے تھے۔ پھر بھی بنیادی اصول اور خیالات میں سب کا اتفاق تھا۔

سیّد احمد خان کے خاص رفیقوں کے علاوہ ان کی تحریک سے وابستہ دیگر افراد کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس میں نمایاں شخصیتوں کے نام یہ ہیں:

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک اور عبدالحلیم شرر وغیرہ پہلے دور میں۔

نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، خان بہادر حبیب اللہ خان، مولوی محمد مقتدا خان شیروانی، مولوی عبدالحق، محفوظ علی، طفیل احمد منگلوری خان بہادر شیخ عبداللہ، مولانا اکرم اللہ خان ندوی، مولانا ظفر علی خان، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث، مولانا احسن مارہروی، خیرالدین فراہی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، عزیز مرزا، مولوی عنایت اللہ، عظمت اللہ خان، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، اقبال سہیل، مولانا بشیر الدین وغیرہ۔ دوسرے دور میں۔

خواجہ غلام السیدین، عبدالماجد دریا آبادی، عبدالرحمٰن بجنوری، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عابد حسین، ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، رضا علی، حکیم احمد شجاع، قاضی تلمیذ حسین، الیاس برنی، باری علیگ وغیرہ۔ تیسرے دور میں۔

اس فہرست میں مزید ناموں کا اضافہ ممکن ہے۔ مذکورہ فہرست میں ایسے نام ہیں، جو علی گڑھ کے مخالف تحریکوں سے بھی متعلق تھے۔ چوں کہ ایسی تحریکیں علی گڑھ تحریک کے ردِ عمل میں اٹھی تھیں، اس لیے دراصل یہ بھی ''اسی دریا کی ایک موج'' قرار دیے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ نام علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے کا سبب بنے ہیں۔ برِ عظیم کے کئی علاقے شمالی ہند کے ان خاص اثرات سے بے حد فیضیاب ہوئے، جن کا سر چشمہ علی گڑھ سے پھوٹا۔ جدید زمانے میں نہ صرف دکن بلکہ پنجاب کا بیشتر علمی کام ان افراد نے انجام دیا جن کا علی گڑھ تحریک سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا۔[۲۴]

سیّد احمد خان اور محسن الملک میں بڑے گہرے اور قریبی تعلقات تھے[۲۵] ان دونوں کے خیالات میں بھی بڑی حد تک یکسانیت تھی۔ ابتدائی تعلقات کے وقت تو انھیں سیّد احمد خاں کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف رہا بلکہ وہ ان کے سیاسی اداروں کے متعلق بھی کچھ حسن ظن نہیں رکھتے تھے۔ تبئین الکلام کی اشاعت کے بعد دوسرے علما کی طرح محسن الملک نے بھی اس پر اعتراضات کیے لیکن جب ان کی ملاقات سیّد احمد خاں سے ہوئی اور پھر ملنے کے مواقع حاصل ہوتے رہے تو ان کا اختلاف رفع ہو گیا۔ حتیٰ کہ اکثر معاملات میں بالخصوص سیاسی طرز فکر میں کامل یک جہتی پیدا ہو گئی۔ البتہ زندگی کے آخری دور میں چند جزوی مذہبی اُمور میں اختلاف نظر آتا ہے۔ افہام و تفہیم کا سلسلہ عرصہ دراز تک بطور خط و کتابت جاری رہا۔ اس خط و کتابت کا مجموعہ مکاتب الخلاف کے نام سے مطبوعہ ہے۔ اس میں سیّد احمد خاں کے خیالات سے بعض جزئیات میں تو اختلاف نظر آتا ہے لیکن بڑے بڑے مسائل میں ان کی یک جہتی اور اتحاد بڑا مستحکم اور ثابت شدہ ہے[۲۶] وہ دینی افکار کے سلسلے میں پرانی روایات و معقولات سے سند حاصل کرتے تھے۔[۲۷] ان کی تصنیفات میں آیات بینات اور کتاب المحبت الشوق اصلاحی عقائد پر مبنی ہیں۔ وہ مذہب میں تجدید کے قائل تھے اور چند تقاضوں کے مطابق ایک نئی تفسیر کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔[۲۸]

محسن الملک ۱۸۶۴ء میں سائٹیفک سوسائٹی کے رکن بنے تھے اس کے لیے اُنھوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ خطبات احمدیہ کی تصنیف میں سیّد احمد خان کی خاص مدد کی اور اپنے مضامین کے ذریعہ تہذیب الاخلاق میں علی گڑھ تحریک کی حمایت مختلف پہلوؤں سے بڑے موثر انداز میں کی۔ سیّد احمد خان کے ہر کام میں شریک ہوتے، انجمن خواستگان تعلیم مسلمان ''خزینۃ البضاعت۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے اور اس کے جلسوں میں اپنی عالمانہ تقریروں سے متاثر

کرتے۔ سیّد احمد خان کی طرح سے وہ بھی انقلاب کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور انھیں اقرار تھا کہ صرف تعلیم ہی اب مسلمانوں کے لیے ایک امید ہے۔[۳۰] وہ حقیقی معنوں میں سیّد احمد خان کے معتمد نائب تھے۔ سیّد احمد خان کے انتقال کے بعد ان ہی کی خواہش کے مطابق ان کے صاحبزادے سیّد محمود علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بنے لیکن اس وقت پیش آنے والے واقعات کے تقاضوں میں[۳۱] نظر انتخاب محسن الملک پر پڑی اور پھر انھیں کالج کو چلانا پڑا۔ اُنھوں نے ''میموریل یونی ورسٹی فنڈ'' کا آغاز کیا جو کالج کو یونی ورسٹی میں ترقی دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ''جداگانہ انتخاب'' کے مطالبے کے لیے مسلمان رہنماؤں کا جو وفد شملہ گیا تھا اس کی تنظیم اُنھوں نے کی تھی۔[۳۲] اُنھوں نے بھی مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کی مخالفت کی اور مسلمانوں کے لیے علاحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی۔[۳۳] لارڈ منٹو کی پیش کیے جانے والے مطالبات کا مسودہ عماد الملک سیّد حسین بلگرامی نے تیار کیا تھا۔[۳۴] وفد میں وہ بھی شامل تھے۔[۳۵]

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُنھوں نے عام مسلمانوں کے دلوں میں علی گڑھ تحریک کے متعلق اختلافات بہت کم کر دیے۔[۳۶] اپنے جلسوں میں اور قومی تقریبات میں مختلف الخیال علما کو شریک کر کے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصے سے چلی آتی تھی اسے دُور کیا۔ اور اس طرح بڑی حد تک تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔[۳۷] لسانی تنازعہ نے ان کے زمانے میں شدت اختیار کر لی تھی۔ محسن الملک نے اُردو کے تحفظ اور اس کی حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی اور اس میں پرجوش حصہ لیا لیکن کالج کی مصلحتوں کے پیشِ نظر انھیں اس کام میں مزید شرکت سے باز رہنا پڑا۔[۳۸]

علی گڑھ تحریک میں محسن الملک کا زمانۂ قیادت ٹھوس کاموں کے لیے ممتاز ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ وہی کیا جسے قوم کے صحیح مفاد کے لیے ضروری خیال کیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج اور قوم کو جن مسائل سے سابقہ پڑا تھا، ان کے حل کرنے کے لیے ایسی تدابیر اور فہم و فراست کی ضرورت تھی جو ان کی شخصیت میں مجتمع تھی۔ مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو سیّد احمد خاں کی سیاسی منزل کا ایک سنگِ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں نواب وقار الملک کی کوششیں براہِ راست ہیں جو محسن الملک کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری منتخب ہوئے، انھی کے عہد نظامت میں مسلم یونی ورسٹی کی تجویز منظر عام پر آئی۔[۳۹] محسن الملک کے زمانے میں کالج کا انگریزی عملہ مختار کل بن گیا

تھا اور انتظامی معاملات میں سیکرٹری یا ٹرسٹی بے دست و پا تھے۔ وقارالملک نے اختیارات لیتے ہی ٹرسٹیوں کی حالت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس بنا پر پرنسپل اور انگریزی عملے نے متفقہ طور پر مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ یوپی کے گورنر نے انگریزی عملے کی تائید کی اور خاصی نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ وقارالملک نے ٹرسٹیوں کو ہم رائے بنا کر فیصلہ کرایا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی عملہ انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا، وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چناں چہ اُنھوں نے بڑی دانش مندی، تدبر اور استقامت سے اس معاملے میں کوششیں کیں یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل ڈالی اور عملہ وقارالملک کی مرضی کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ پہلے ہی سے کالج میں انگریزی عملے کی موجودگی کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی کامیاب کوشش تھی۔[۴۰] وقارالملک ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ایک مدرسہ مفید الخلائق قائم کیا۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے بعد سے اس کے مستقل مضمون نگار بن گئے۔ سائنٹی فک سوسائٹی اور اس کے مطبع اور تہذیب الاخلاق کا انتظام سیّد احمد خان نے انھیں کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج میں مستقل دل چسپی لیتے تھے۔ قوم کی اصلاح اور ترقی کے لیے سیّد احمد خان کی تعلیم سے متعلق حکمت عملی کو پسند کرتے تھے۔[۴۱] لیکن بعض مقامات پر اُنھوں نے سیّد احمد خان سے اختلاف رائے بھی کیا ہے۔[۴۲] سیاست میں سیّد احمد خان کے نقطۂ نظر سے متاثر تھے اور مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک مسلم سیاسی انجمن کی ضرورت محسوس کرتے تھے اُنھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کی تجویز بھی پیش کی۔ چناں چہ اس ضمن میں اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک اجلاس بھی منعقد کیا اور اس کی حمایت و تائید کے لیے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ مسلمانوں کے مطالبات کے لیے آغا خان کی سربراہی میں شملہ جانے والے وفد میں اُنھوں نے امروہہ کے مسلمانوں کی نمایندگی کی تھی۔[۴۳] ان کی یہ کوششیں مختلف حیثیتوں سے مسلم لیگ کے قیام تک جاری رہیں۔[۴۴] ان فوری واقعات کے بعد جو مسلم لیگ کے قیام کا سبب بنے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۶ء منعقدہ ڈھاکہ کی ایک سیاسی نشست بصدارت وقارالملک مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں وقارالملک نے خطبۂ صدارت پڑھا۔[۴۵] وہ اور محسن الملک دونوں اس اجلاس میں مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔[۴۶] لیکن جب محسن الملک کے انتقال کے بعد کالج کے سیکرٹری ہوئے تو

مسلم لیگ کا عہدہ چھوڑ دیا مگر اس کے حامی و معاون رہے، ہر وقت قومی و مذہبی تحریک و خدمت میں حصہ لیتے رہے۔ جنگ بلقان وطرابلس کے سلسلے میں مجروحین طرابلس کے لیے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے روپیہ چندہ میں دے دیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، کان پور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام، ایران میں روس کی مداخلت جیسے واقعات پر بڑی آزادی و دلیری کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد اُنھوں نے جو مضمون بعنوان ''ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ حالت'' علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا، اسے مسلمانوں کی آیندہ حکمتِ عملی کا سنگ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے [۴۷] سیاسی یا اصلاحی مقصد کے تحت ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن ایک انگریزی تصنیف کا اُردو ترجمہ ''نپولین بونا پارٹ'' کے نام سے سائینٹفک سوسائٹی کے لیے کیا تھا۔[۴۸]

حالی نے سیّد احمد خان سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ قوم کی اخلاقی، روحانی اور ادبی اصلاح میں بڑا حصہ لیا ان میں سیّد احمد خان کی سی وجاہت اور انتظامی قابلیت تو نہ تھی لیکن قومی درد اور بے غرضی میں شاید سیّد احمد خاں سے بھی آگے تھے۔ سیّد احمد خان کے حلقۂ احباب اور رفقا میں بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام افراد موجود تھے لیکن حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تر تھی۔[۴۹]

سیّد احمد خان سے حالی کی ملاقات سب سے پہلے ۱۸۶۸ء میں شیفتہ کے پاس ہوئی [۵۰] اور پھر حالی عمر بھر سیّد احمد خان کے مداح رہے۔[۵۱] تہذیب الاخلاق کے اجرا نے بھی حالی کو ان تمام جدید مسائل سے روشناس کرایا جنھیں سیّد احمد خان ایک عرصے سے محسوس کر رہے تھے۔ سیّد احمد خان نے اس وقت تک جو کچھ کیا تھا، حالی نے اپنے طور پر ان کے کاموں اور ان کی تحریک کا جائزہ لیا اور اس پر اپنی رائے پیش کی [۵۲] ان کے اور سیّد احمد خان کے درمیان سیاسی، مذہبی اختلاف کی خلیج بہت تنگ تھی۔ وہ مذہب میں ضرور سیّد احمد احمد خان سے اختلاف رکھتے تھے [۵۳] لیکن یہ اختلاف زیادہ اثر انداز نہ ہوسکا، بلکہ اُنھوں نے اپنے خلوص سے ایک مضمون بعنوان ''سیّد احمد خان اور مذہب'' سیّد احمد خان کے مذہبی خیالات کی تشریح کر کے ان کی جانب سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہی کوشش حیات جاوید میں بھی نظر آتی ہے۔[۵۴]

۱۸۷۲ء میں حالی کو ملازمت کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا یہاں وہ انگریزی ترجموں کے ذریعہ انگریزی ادب سے روشناس ہوئے اور یہیں ان کے شعر و ادب کے قدیم مذاق و تصور میں ایک زبردست انقلاب آیا [۵۵] اور پھر جب انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں کا انعقاد ہوا تو حالی کی شعری

صلاحیتوں کو سیاسی اور سماجی مقاصد بھی ملے۔ ۱۸۷۹ء میں اُنھوں نے مسدس مدوجزر اسلام لکھی۔[۵۶] قومی اصلاح کے سلسلے میں مسدس نے جو کام کیا تھا وہ علی گڑھ کالج کے قیام سے کچھ کم نہیں ہے۔[۵۷] اُردو شاعری کی اصلاح میں حالی کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔ اُنھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری اور شاعرانہ تنقید کے اصول اور نظریے وضع کیے۔ جدید شاعری میں قومیت کے جذبات شامل کیے اور قومی اصلاح اور ترقی کے مضامین بڑے پُر اثر طریقے سے ادا کر کے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کی۔ شاعری کے علاوہ اُردو نثر میں مفید اضافے کیے۔ علمی تنقید کی ابتدا کی۔ مقدمہ شعر و شاعری کی تصنیف میں مشرقی و مغربی ماخذات سے زیادہ[۵۸] سیّد احمد خان کے خیالات تھے جو ان کے دل و دماغ پر مسلط تھے بلکہ ان کی نثر کا بیشتر حصہ بھی انھیں کی رہبری کی غمازی کرتا ہے۔[۵۹] مقدمہ کی تصنیف کے بعد اُردو شاعری اور تنقید میں بلاشبہ ایک نمایاں انقلاب رونما ہوا اور اُردو شاعری کے موضوعات اور مقاصد میں افادیت اور مقصدیت بھی نظر آنے لگی۔ حالی نے دوسری علمی خدمات بھی سیّد احمد خان کی ترغیب و تشویق اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے انجام دیں۔ نثر میں تنقید کے علاوہ سوانح نگاری نے ان کو امتیاز خاص بخشا ہے ان کی سوانح نگاری کا سرچشمہ تحریک جذبۂ احیائے قومی ہے اُنھوں نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں وہ بزرگوں اور نام وروں کی یادگار کے بجائے قوم کی ترقی کے خیال سے لکھی تھیں۔ غالب کی سوانح اس لیے لکھی کہ غالب کی خوش طبعی اور ظرافت سے قوم میں زندہ دلی اور شگفتگی پیدا ہو۔ حیات سعدی اور حیات جاوید کا نصب العین بھی یہی ہے۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ بعد کے سوانح نگاروں کی نظر اشخاص پر اشخاص کی حیثیت سے کم پڑتی ہے، ان کے قومی اور ملّی کارناموں کے اس حصے پر زیادہ پڑتی ہے جس سے احیائے قومی کے لیے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔[۶۰] حالی کی تصانیف میں حقیقت نگاری اور مطلب نویسی بہت حد تک سیّد احمد خاں کی رفاقت اور محبت کے زیر اثر ہے۔[۶۱]

باوجود یہ کہ حالی ابتداءً سیّد احمد خان سے متعلق نہ تھے۔[۶۲] لیکن قومی پستی اور زوال کا احساس انھیں سیّد احمد خاں کی ملاقاتوں سے پہلے بھی تھا۔[۶۳] جس چیز نے انھیں سیّد احمد خان سے قریب کیا اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ رکھا وہ اس کی تعلیمی تحریک تھی جسے وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ سیّد احمد خان کے اس خیال کو تسلیم کرتے تھے کہ پرانے علوم وفنون پر جو جمود و انحطاط کے عالم میں تھے ان کی تحصیل سے موجودہ دور میں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن جدید

انگریزی تعلیم اور یونی ورسٹی کی تعلیم حالی کے نزدیک اصل مقصد نہیں تھا۔ عملی قوت اور ''سلف ہلپ'' کا مادہ ان کے خیال میں صرف آزاد پیشوں کی تعلیم ہی سے پیدا ہوسکتا تھا۔[۶۴] وہ چاہتے تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام کریں جو خود ان کے حق میں اور پھر قوم و ملک کے لیے مفید ہوں۔[۶۵] اُنھوں نے تہذیب الاخلاق اور دوسرے رسالوں میں ایسے مضامین لکھے جن کا مقصد مسلمانوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کرنا اور ترقی کا حوصلہ بڑھانا تھا۔[۶۶] وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ وہ مسلمانوں کو مغربی جمہوریت کے خلاف تنبیہ کریں۔ ورنہ مغربی جمہوریت کے سایہ میں وہ اس ملک میں اجنبی بنا دیے جائیں گے اُنھوں نے اس خیال کو برملا ظاہر کیا کہ مسلمان ہر حیثیت سے ایک علاحدہ قوم ہیں۔[۶۷]

حالی نے علی گڑھ تحریک میں سیّد احمد خان کی محض قلمی معاونت ہی نہیں کی ان کے ساتھ عملی جدوجہد میں بھی مصروف رہے۔ سیّد احمد خان کے ساتھ چندے کی فراہمی کے لیے دور دراز کے سفر بھی کیے۔ اپنے شہر اور ضلع سے خود بھی چندہ جمع کر کے بھیجتے رہے۔ ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے تمام فرائض بخوبی ادا کرتے رہے۔[۶۸] مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ایک سال کے لیے اس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔

شبلی پہلی مرتبہ ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ گئے تھے۔ سیّد احمد خان سے وہاں پہلی ملاقات ہوئی۔ علی گڑھ آنے سے قبل بھی شبلی سیّد احمد خان اور ان کی تحریک سے روشناس تھے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ سیّد احمد خان کے ہم خیال اور حامی تھے[۶۹] اور ان کے چھوٹے بھائی مہدی حسن ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔[۷۰] شبلی نے سیّد احمد خان کی مدح میں ایک قصیدہ عربی زبان میں لکھا تھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت میں ۱۵ر اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔[۷۱] سیّد احمد خان نے شبلی کی علمیت کا اندازہ لگا کر ان کا تقرر یکم فروری ۱۸۸۲ء کو کالج میں فارسی اور عربی کی اسسٹنٹ پروفیسری پر کردیا۔[۷۲] ساتھ ہی سیّد احمد خان نے قرآن کا درس بھی ان کے سپرد کر رکھا تھا۔[۷۳] علی گڑھ آنے سے قبل تک شبلی نے مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور مولانا ارشاد حسین مجددی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے مذہبی علوم اور عربی فارسی میں اکتساب کیا تھا[۷۴] علی گڑھ آنے کے بعد ان کے ذوق وفکر میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ دراصل ان کی رسائی ان کتابوں تک ہوگئی جنھیں سیّد احمد خان نے قیام انگلستان اور اس کے بعد جمع کیا تھا۔[۷۵] اس طرح انھیں یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی ہوئی۔[۷۶] اُنھوں

نے سیّد احمد خان کے اصلاحی اور تعمیری منصوبوں میں اپنے لیے کشش محسوس کی۔ انھیں کی تحریک پر شبلی نے تاریخ اسلام کا مطالعہ نئے انداز سے شروع کیا اور بدلے ہوئے حالات میں نئے ذوق تحقیق کے مطابق تاریخ اسلام کی تدوین کا کام شروع کیا، ابتدائی چند سالوں ہی میں وہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، کتب خانۂ اسکندریہ وغیرہ کی تصنیف کر چکے تھے۔ مزید یہ کہ کالج میں پڑھانے کی وجہ سے عملے کے انگریزی ارکان سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا تھا اُنھوں نے مشہور مستشرق آرنلڈ سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ علی گڑھ کا ایک نمایاں اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ انگریزی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ چناں چہ علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد اُنھوں نے اپنے شہر اعظم گڑھ میں ایک انگریزی سکول قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔[۷۷] چناں چہ جون ۱۸۸۳ء میں شبلی نیشنل سکول کی بنیاد رکھی گئی۔[۷۸] وہ تقریباً سولہ سال تک علی گڑھ سے منسلک رہے۔ اس طویل عرصے میں انھیں سیّد احمد خان سے قریب رہنے کا جو موقع ملا اس کے اثر نے ادبی اور علمی انقلاب کے مواقع فراہم کیے۔ سیّد احمد خان نے نہ صرف شبلی کو قومی تاریخ سے روشناس کرایا، ان سے قومی تاریخ پر کتابیں لکھوائیں بلکہ شبلی کے موضوعات شاعری میں بھی انقلاب پیدا کر دیا اور اس سے قبل تک وہ روایتی شاعری کرتے تھے لیکن اب قوم وملت کا احساس ان کی نظموں کا موضوع بن گیا۔

علی گڑھ اور سیّد احمد خان نے شبلی پر جو اثرات مرتب کیے، شبلی ان کے معترف تھے۔[۷۹] وہ اس تحریک میں خلوص نیت سے شریک ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زبان وقلم سے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ جب تک وہ کالج میں رہے سیّد احمد خان کے شریک ومعاون رہے۔ قرین قیاس ہے کہ ان کی تفسیر میں جن پر ان کی توجہ ان دنوں مبذول تھی۔ شبلی نے ان کی مدد کی ہوگی بلکہ تفسیر اور دیگر کلامی کوششوں میں دونوں کے اشتراک کی معاصرانہ شہادتیں بھی ملتی ہیں[۸۰] شبلی نے کالج میں ایک مذہبی فضا قائم کرنے میں سیّد احمد خان، سیّد محمود اور کالج کے نیک خیال طلبا کی خاصی مدد کی۔[۸۱]

سیّد احمد خان کی وفات کے بعد بھی شبلی کالج سے متعلق رہے محسن الملک جب سیکرٹری بنے تو علی گڑھ تحریک سے شبلی کے تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ شبلی اور محسن الملک کے تعلقات میں ایک غیر معمولی ارتباط اور یگانگت نظر آتی ہے۔[۸۲] وہ مستقل طور پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ ڈھاکہ کی اس کانفرنس میں جس کے اختتام پر مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی وہ شریک تھے۔[۸۳] کالج سے مستعفی ہونے کے بعد وہ کالج سے بے تعلق نہیں ہوئے۔ محسن الملک سے ملاقات

کے علاوہ کالج کی دینیات کمیٹی میں شریک اور بعض معاملات میں منتظمین کے ہاتھ بٹاتے رہے۔[۸۴] اس طرح کے روابط سے بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ علی گڑھ میں ضم ہو جائے گا۔[۸۵] البتہ محسن الملک کی وفات کے بعد شبلی کے تعلقات علی گڑھ سے کسی قدر کم ہو گئے تھے لیکن پھر بھی جو تحریک کالج کو یونی ورسٹی میں منتقل کرنے کی شروع ہوئی اس میں پورے جوش وخروش سے شریک ہوئے۔ یونی ورسٹی کے قواعد وضوابط بنانے کے لیے جو کمیٹی بنی تھی یہ اس کے رکن تھے اور اپنی طرف سے اس کے چندے میں دس ہزار روپے کی رقم پیش کی اور ایک رکن کی حیثیت سے چندہ جمع کرنے کے لیے وفد کے ساتھ لاہور تک گئے۔[۸۶]

سیّد احمد خان کے زیر اثر اور حالات کے تقاضے میں اُنھوں نے جو خیال اخذ کیا تھا کہ ہمارا ایک عظیم ماضی تھا اور ہم ایک عظیم تر مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کا بہتر اظہار اُنھوں نے اپنی علی گڑھ کی زندگی میں ہی پیش کر دیا۔ المامون، النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، تراجم، کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ اور الفاروق، علی گڑھ ہی میں مکمل ہوئی تھیں۔ یہ دور اُن کی تاریخ نگاری کا عہد زریں قرار دیا جا سکتا ہے[۸۷] اور اس دور کے بعد اُنھوں نے قیامِ حیدرآباد میں الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر تصنیف کیں اور پھر اعظم گڑھ میں لکھی جانے والی کتابوں میں شعرالعجم اور سیرت النبیؐ ہیں ان میں موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم کے علاوہ دیگر تمام تصانیف مذکورہ خیال کے تحت لکھی گئی تھیں۔

شبلی نے علی گڑھ سے جو ایک اثر قبول کیا وہ مذہب میں عقلیت پسندی کا رجحان تھا۔ اس ضمن میں ان پر مولانا فاروق چڑیا کوٹی کا اثر بھی نظر آتا ہے جو اپنے زمانے میں معقولات کے امام تھے۔[۸۸] یہاں ان کے خیالات سیّد احمد خان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ سیّد احمد خان کی تفسیر میں شبلی کی معاونت کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ خیال بھی موجود ہے کہ سیرت النبیؐ کا تخیل سیّد احمد خان کے خطبات احمدیہ سے پیدا ہوا تھا۔[۸۹] شبلی نے اپنی اکثر تحریروں میں اس امر پر زور دیا کہ اسلام و جدید علوم اور تمدن سے مطابقت دی جائے۔[۹۰] اس موقع پر ان کے اور سیّد احمد خان کے نظریے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔[۹۱] فرق صرف اس قدر ہے کہ سیّد احمد خان تمدن اور زندگی میں نئے رجحانات کی تائید ماضی سے حاصل کرتے ہیں جب کہ شبلی جدید رجحانات کی تاویل سے قدیم عقائد کی تائید حاصل کرتے ہیں۔[۹۲]

شبلی کا یہ خیال کہ مسلمانوں میں عقائد اختلاف اکثر سیاسی اسباب سے پیدا ہوا ہے، خود ان پر

اور سیّد احمد خان کے بعد کے تعلقات پر صادق آتا ہے۔ ان جزوی اختلافات کے بعد جو قیام علی گڑھ میں بھی کبھی نمایاں نہ ہوئے، علی گڑھ میں وہ علمی اور قومی معاملات میں سیّد احمد خان کے دست راست تھے۔ بعض سیاسی اور جزوی اختلاف نے انھیں مکدر ضرور کیا تھا۔ لیکن ان کے مقاصد بھی وہی تھے جو سیّد احمد خان نے اختیار کر رکھے تھے۔ صرف تعلیمی مسئلے پر دونوں میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔[۹۳] لیکن بحیثیت مجموعی ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے نئی قومی زندگی پیدا کرنے اور اس کو صحیح تاریخی اور ماضی کی بنیادوں پر استوار کرنے میں بڑا حصہ لیا، قدیم علوم سے دل چسپی پیدا کی اور روایات تاریخ کو نئے ماحول میں پیش کرتے ہوئے ایک علمی تحریک کی بنیاد رکھی۔

سیّد احمد خان کے رفقا میں جس طرح شبلی کا یہ کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے اسلامی تاریخ کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر تاریخ کا ایک معقول تصور قوم کے سامنے رکھا تو ان کے ایک اور رفیق مولوی نذیر احمد کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اُنھوں نے قوم کے سامنے مجلسی زندگی کا ایک معقول اور مثالی نمونہ پیش کیا۔ ان کا بنیادی وصف ان کے تصورات کی معقولیت ہے چوں کہ مجلسی اور خانگی مسرت قومی ترقی اور خوش حالی میں بڑی معاون ہوسکتی ہے اس لیے نذیر احمد کی یہ خاص خدمت ہے کہ اُنھوں نے اپنے تصورات کی معقولیت کو گھروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوش حالی اور مسرت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔

مولوی نذیر احمد دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اگرچہ اُنھوں نے پرانے مروجہ نصاب کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی سعادت علی اور پھر دیگر اساتذہ جیسے مولوی نصر اللہ خان اور مولوی عبدالخالق سے حاصل کی تھی۔[۹۴] جہاں انگریزی سے ان کا کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔ لیکن خیالات سے روشناسی اور اپنے لیے قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک معتدل مسلک عمل یہیں سے اخذ کیا[۹۵] اور یہ امتزاج و اعتدال ہمیں نذیر احمد کے مذہبی اور سیاسی رجحانات میں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔[۹۶] وہ اپنے زمانۂ ملازمت میں سیّد احمد خاں سے متعارف ہوئے[۹۷] اور تعلقات کا یہ سلسلہ آخر دم تک قائم رہا۔[۹۸] حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں ایک مخلص اور پُرجوش رکن کی طرح کام کرتے رہے۔

اگرچہ نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سے پہلی مرتبہ خطاب کیا تھا لیکن وہ اس تحریک میں آغاز ہی سے سیّد احمد خان کے مددگار رہے۔ جزوی اختلاف کے باوجود انھیں سیّد احمد خان کے خلوص پر کامل اعتماد تھا، اور ان کی تحریک کو بحیثیت مجموعی قومی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے

تھے۔[۹۹] اور جنگ آزادی کے بعد سیّد احمد خان کی قومی خدمات کو وہ ''جہادِ اکبر'' سے تعبیر کرتے تھے۔[۱۰۰] نذیر احمد بھی سیاسی نقطۂ نظر کے اعتبار سے سیّد احمد خان کی طرح سے یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دنیوی فلاح وترقی کا راستہ صرف یہ ہے کہ انگریزوں کے ساتھ مصالحت و یگانگت کے رشتے استوار کیے جائیں۔[۱۰۱] کانگریس کی تشکیل کے بعد وہ بھی یہ محسوس کررہے تھے کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس برِعظیم میں نہیں رہ سکیں گے۔ ان کے یہ خیالات سیّد احمد خان کے ان خیالات کی تائید کرتے ہیں جو اُنھوں نے لسانی تنازعہ اور ہندوؤں میں قومیت کی پیدا شدہ تحریکوں اور کانگریس کی تشکیل کے نتیجے میں ظاہر کیے تھے۔ نذیر احمد نے اپنی تقریروں میں دوقومی نظریے کے حق میں معقول دلائل پیش کیے۔[۱۰۲]

جس ماحول میں ڈپٹی نذیر احمد کی پرورش ہوئی تھی اس کا فطری تقاضا تو علی گڑھ تحریک کے ردِ عمل کی صورت میں پیدا ہونا تھا۔ لیکن دہلی کالج کی تعلیم نے انھیں اس قسم کے جملہ تعصبات سے آزاد کردیا تھا اور اسی تعلیم وتربیت کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ مغربی علوم کا قدر شناس ہونے کے باوجود ان کے دل میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا احساس کبھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ نذیر احمد نے اپنی قوم کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت محسوس کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اوّلین فرصت میں اُنھوں نے انگریزی سیکھ کر اپنی تعلیم کی کسر پوری کرلی۔ نذیر احمد علی گڑھ تحریک کی بنیاد، سائنٹی فک سوسائٹی کے قیام سے پہلے ۶۰-۱۸۵۹ء میں تراجم کی مہم میں شریک ہوچکے تھے۔ ان کی ابتدائی تصانیف اور پہلے تین ناول (مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح) بھی اسی تعلیمی تحریک کا نتیجہ ہیں۔ جب علی گڑھ کالج قائم ہوگیا تو اس کے تعمیری منصوبوں میں متعدد مواقع پر خطیر رقمیں چندہ میں دیں۔[۱۰۳] یہ رقمیں سالانہ چندوں کے علاوہ تھیں۔[۱۰۴] ۱۸۸۸ء کے بعد اُنھوں نے علی گڑھ اور جدید تعلیم کے حق میں پُرجوش تقریریں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ اصل تعلیم وہ ہے جو اہلِ مغرب کی طرح ہنرمند موجد اور صناع بننے میں مدد دے۔ ان کے نزدیک مروجہ انگریزی تعلیم محض تعلیم کی تمہید ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنی تقریروں میں فنی تعلیم کی طرف لوگوں کو ترغیب دی۔[۱۰۵] اور ہمیشہ تعلیم کے افادی اور عملی پہلوؤں پر زور دیتے رہے۔[۱۰۶] یہاں نذیر احمد اور سید احمد خاں میں کسی قدر اختلافِ خیال موجود ہے۔ سید احمد خاں فنی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے خیال میں ذہنی شائستگی پہلے ضروری تھی۔ ایک اور معمولی اختلاف میں اشتراک کے پہلو اس قدر زیادہ نظر آتے ہیں کہ جہاں تک تحریک کے مقاصد کا تعلق ہے، مذہبی اصلاح کے معاملے میں انھیں سید احمد خاں کا مؤید ومعاون کہا جاسکتا ہے۔ اس امر کا

اظہار موجود ہے کہ وہ ابتدا ہی سے سیّد احمد خان کے خیالات سے مستفید و متاثر ہوتے رہے ہیں۔ سیّد احمد خاں کی مذہبی تصانیف خصوصاً تفسیر کا اثر بھی ان کی مذہبی تصانیف اور ان کے خطبات میں نمایاں ہے۔ وہ بھی اسلام کو دین فطرت، امن و سلامتی کا داعی اور دینوی سلامتی اور دینوی فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں۔ اور تجدید و اجتہاد اور علما کی منفی تعلیمات کے مخالف نظر آتے ہیں۔[۱۰۷] اس ضمن میں وہ جس قسم کے خیالات رکھتے تھے، سوائے شبلی کے رفقائے سیّد احمد خاں میں اور کوئی ان سے قریب نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کے مسلک میں ایک بنیادی فرق تھا کہ سیّد احمد خاں کا رجحان انتہا پسندی اور مشابہت کی طرف تھا اور نذیر احمد اعتدال اور حقیقت پسندی کی طرف مائل تھے۔[۱۰۸] وہ بھی سیّد احمد خاں کی طرح آزادی رائے اور عقل کی اہمیت پر خاص زور دیتے تھے۔ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ سائنس اور مذہب کا آپس میں کوئی تعرض نہیں ہے۔ تقدیر، توکل، خیر و شر وغیرہ کے متعلق ان کا وہی نظریہ تھا جو سیّد احمد خاں کا تھا۔ ان کی قابل ذکر مذہبی تصانیف میں ترجمہ قرآن مجید اور الحقوق والفرائض ہیں۔ موخر الذکر دراصل مفصّل فقہ اسلامی ہے، جسے جدید اصول پر مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت کے متعلق خاص اسلامی نظریۂ حیات سے بحث کی گئی ہے۔ ترجمہ قرآن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے الفاظ کے سطحی مفہوم کے بجائے معانی کی مختلف تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب اجتہاد مذہبی حقائق کی تشریح اور عقائد کی اصلاح کے بارے میں ہے۔ اس میں اُنھوں نے ادبی اجتہاد سے کام لے کر مذہبی مسائل کو مکالمے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ مطالب القرآن موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے آیاتِ قرآنی کی تفسیر پر مبنی تھی۔ اس کا صرف ایک حصہ ہی مکمل ہو سکا۔[۱۰۹] مذہبی تصانیف کے علاوہ نذیر احمد کی جو کتابیں اہم ہیں ان میں ایک مصائب غدر ہے۔ یہ ولیم ایڈورڈس کے انگریزی روزنامچے ۱۸۵۷ء کا ایک اُردو ترجمہ ہے، جو اُردو نثر اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ و ادب میں ایک اضافہ ہے۔ ان کا ایک اور ترجمہ تاریخ دربار تاج پوشی یکم جنوری ۱۹۰۳ء کے جشن تاج پوشی کی رُوداد پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی وہ تصانیف جو اخلاقیات کے سلسلے میں آتی ہیں، منتخب الحکایات، چند پند سود مند، مبادی الحکمت ہیں۔ اپنے اندازِ تحریر، اسلوب اور موضوعات تصنیف کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نذیر احمد نے سیّد احمد خاں کے دوسرے رفقا کے مقابلہ میں ایسا ادب تخلیق کیا جس نے خواص سے زیادہ عوام کو متاثر کیا۔ دوسروں کے مقابلے میں ان کا دائرہ خطاب ان سب سے زیادہ

وسیع اور اپنے زمانے کے نثر نگاروں میں ان کی مقبولیت زیادہ رہی۔

مولوی چراغ علی، سیّد احمد خاں سے ملاقات سے مذہبی مناظروں اور تحقیقِ مذہبی میں مصروف رہتے تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے پادری عمادالدین کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب تعلیقات کے نام سے لکھا تھا، جس میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی ترجیح کے اسباب پیش کیے تھے اور تاریخ محمدی کے مآخذ کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد بھی کی تھی۔[110] اُنھوں نے اس وقت تک اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ اور ان کے مضامین لکھنؤ کے رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔[111] سیّد احمد خاں نے ان کی ذہانت اور علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انھیں تہذیب الاخلاق میں لکھنے پر آمادہ کیا اور پھر انھیں علی گڑھ بلا کر انگریزی اور عربی کی مستند کتابوں کے مطالعے اور ان کے تراجم میں لگا دیا۔[112] اُنھوں نے اپنے تحقیقی مضامین میں وہ فلسفیانہ بحثیں اٹھائیں اور انھیں اس طرح حل کیا کہ سیّد احمد خاں کو ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہوگئی تھیں۔ یہ تہذیب الاخلاق کے مستقل مضمون نگار تھے اور اُنھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں سیّد احمد کے خیالات کی خوب اشاعت کی۔

مولوی چراغ علی نے زیادہ تر انگریزی میں لکھا۔[113] تعلیقات کے علاوہ اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ، تعلیق نیاز نامہ، ایام الناس ان کی اُردو کتابیں ہیں۔[114] ان کی ایک انگریزی کتاب "PROPOSED POLITICAL LEGAL AND SOCIAL PERFORMS UNDER MUSLIMS" کا اُردو ترجمہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۱۰ء میں اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے نام سے کیا۔ اس کتاب میں اُنھوں نے ریورنڈ مائیکل کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مذہب اسلام ترقی کا مانع ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اسلام ہر زمانے کی معاشرت کے مطابق تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "CRITICAL EXPOSITION OF THE POPULAR JIHAD" کا بھی اُردو میں ترجمہ تحقیق الجہاد کے نام سے ہو گیا تھا۔ ان کی تحریروں پر سیّد احمد خاں کا اثر بہت نمایاں ہے۔[115] بڑی حد تک سیّد احمد خاں کی طرح ان کا خیال تھا کہ حدیث کی عقیدتاً ضرورت نہیں، اسلامی قوانین کے بعض حصے ازسرِ نو مرتب ہونے چاہئیں۔ مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں۔ اسلام میں رائے کی آزادی ہے۔ غلامی، جنگ و جدل اور جہاد کا اسلام میں کوئی ذکر نہیں (یہ صرف مدافعت ہی میں جائز ہے) اسلام نے عورت کی حیثیت کو بہت بلند کیا ہے۔[116]

مولوی ذکاء اللہ تحریک سیّد احمد خاں کے اہم اور نام ور رکن تھے۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل تھے، اور مولوی نذیر احمد کے قریبی دوست۔ جب دہلی کالج میں مغربی علوم کی نشر و اشاعت کی تحریک شروع ہوئی تو نذیر احمد کی طرح ان کا ذہن بھی اسی فضا میں تیار ہوا۔[۱۱۷] چوں کہ دہلی کالج میں سیّد احمد خاں عام طور پر جاتے رہتے تھے اور وہاں کے اساتذہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔[۱۱۸] نذیر احمد کی طرح ذکاء اللہ بھی وہیں سیّد احمد خاں سے متعارف و متاثر ہوئے۔ اس طرح سیّد احمد خاں کے رفقا میں نذیر احمد اور ذکاء اللہ دو افراد ایسے تھے، جو اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں اس جادہ و منزل سے آشنا ہو چکے تھے، جس کی طرف علی گڑھ تحریک کا کارواں ایک مدت بعد روانہ ہوا۔[۱۱۹] قدیم دہلی کالج کی تعلیم نے انھیں جملہ تعصبات سے آزاد کر دیا تھا۔ اور اسی تعلیم و تربیت کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ مغربی علوم کا قدر شناس ہونے کے باوجود ان کے دلوں میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا احساس کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اگر چہ وہ سیاسی حیثیت سے دو قومی نظریے کے حامی اور ہندوستانی قومیت کے تصور کے خلاف تھے لیکن ہمیشہ مذہبی رواداری کی تلقین کرتے رہتے تھے۔[۱۲۰] وہ جدید تعلیم ہی کو مسلمانوں کی جملہ حقیقی سیاسی اور معاشرتی ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنی قوم کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر انھیں سخت اذیت پہنچتی تھی۔[۱۲۱] مغربی علوم کی کشش ہی تھی جس نے انھیں زمانۂ طالب علمی ہی میں سیّد احمد خاں سے متاثر کر دیا۔[۱۲۲] چناں چہ زندگی بھر ان کا یہی خیال رہا کہ مسلمانوں کی فلاح کے لیے جدید تعلیم ناگزیر ہے۔ ان کا وہ طرزِ عمل ان کی شخصیت کو متعین کرتا ہے جو اُنھوں نے ہندوستانی تعلیم کو جدید اصولوں پر لانے کے سلسلے میں اختیار کیا۔ وہ ان افراد میں تھے جنھوں نے فراخ دلی کے ساتھ جدید نظریے کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تھا۔ خصوصیت سے ان کی خواہش تھی کہ جدید سائنس کی تعلیم کو درجۂ کمال تک پہنچایا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ان کا اصرار یہ بھی تھا کہ ذریعۂ تعلیم اپنی مادری زبان ہی ہو نہ کہ انگریزی۔[۱۲۳] علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے اُنھوں نے بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں، اور اپنی تمام سرکاری اور ادبی مصروفیات کے باوجود اس تحریک میں دل چسپی لی۔[۱۲۴] ورنیکلر یونی ورسٹی کے حامی اور مؤید تھے۔[۱۲۵]

ذکاء اللہ تہذیب الاخلاق کے نام ور مقالہ نگار تھے۔ اپنے مقالات میں قومی، معاشی، علمی اور تہذیبی مسائل پر قلم اٹھاتے تھے۔ اپنا زیادہ تر وقت سائنس، ریاضی اور تاریخ کی کتب کے ترجمے میں صرف کرتے۔ تاریخ میں تاریخ ہندوستان ان کی اہم تصنیف ہے، جو دس جلدوں پر محیط ہے۔ فرہنگ فرہنگ اہل یورپ کی تہذیب کے حالات پر ہے۔ سوانح میں آئین قیصری ملکہ وکٹوریہ پر اور

ایک کتاب مولوی سمیع اللہ خاں پر تصنیف کی۔ ان کی تصانیف اور تراجم کی تعداد ۱۴۳ شمار کی گئی ہے۔[126] اُنھوں نے تراجم کے ذریعہ سائینٹفک سوسائٹی کے کام میں خوب حصہ لیا۔[127] خصوصاً ریاضی، سائنس اور جغرافیہ پر ان کے تراجم کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے وہ علی گڑھ تحریک کے فعال رکن بن گئے تھے۔ وہ علی گڑھ کالج کے زمانے ہی سے ٹرسٹیوں میں شامل تھے، اور آخردم تک اس کے رکن رہے۔[128] کالج میں سیّد احمد خاں کے بعد پیش آنے والے بحران کو ختم کرنے کے سلسلے میں ان کی دردمندانہ کوششیں مؤثر ہیں۔[129]

عمادالملک، سیّد حسین بلگرامی سیاست میں سیّد احمد خاں کے مؤید تھے۔ خود سیّد احمد خاں ان کو ان کی نیکی اور امتیازی اور علم و فضل اور مدرسۃ العلوم کی حقیقی خیرخواہی اور خیراندیشی کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔[130] اور عمادالملک کے دل میں سیّد احمد خاں کی جو عظمت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے سیّد احمد خاں کی کوششوں اور ان کی شخصیت کو مثالی سمجھتے تھے۔[131]

عمادالملک کانگریس کے نقطۂ نظر کے مخالف تھے۔ جب سیّد احمد خاں نے کانگریس کی مخالفت کی تو اُنھوں نے اس مخالفت کی تائید میں ایک پُرزور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔[132] مسلمانوں کی جانب سے لارڈ منٹو کو پیش کیا جانے والا آئینی مطالبات کا مسودہ اُنھوں نے سیّد علی امام اور شاہ دین کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔[133] ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کی جانب سے نمایندگی کے لیے وزیر ہند کی کونسل میں منتخب ہوئے۔[134] ۱۹۰۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی صدر منتخب ہوئے تھے، جس کا اجلاس اس سال رام پور میں منعقد ہوا تھا۔[135]

نواب عمادالملک کو اُردو زبان و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ حیدرآباد سے اُنھوں نے ایک رسالہ مخزن الفوائد جاری کیا تھا، جس میں زیادہ تر سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ وہ سیّد احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے مؤید تھے اور ان کا خیال تھا کہ ذریعۂ تعلیم اُردو ہی ہونا چاہیے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار اُنھوں نے متعدد مواقع پر کیا تھا۔[136] انجمن ترقی اُردو کے کاموں میں خاص دل چسپی رکھتے تھے اور اپنے طور پر اس کی اعانت بھی کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔[137] حیدرآباد میں کئی علمی اور ادبی اداروں کا قیام ان کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ خود تصنیف و تالیف کا شوق رکھتے تھے۔ زیادہ تر انگریزی میں لکھا سوانح سالار جنگ جو انگریزی میں تحریر کی تھی، اس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں ان کی ایک کتاب رسائل

عماد الملک کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں مضامین و مقالات ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے تہذیب الاخلاق کے ادبی ماحول میں تربیت پائی تھی۔[138] سیّد احمد خاں کی تحریروں نے ان پر بڑا اثر ڈالا تھا۔[139] اُردو میں سیّد احمد خاں، حالی اور شبلی کی تصانیف ہی کو بہتر سمجھتے تھے۔[140] شرر انشائیہ نگار، نقاد، عالم، معلم، صحافی، ڈراما نگار، ناول نگار، مورخ، ماہر تعلیم اور سیاست دان سب کچھ تھے۔ سیّد احمد خاں کی تحریک کے حامی اور علمی مؤید تھے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعہ ان خیالات کی تبلیغ کے کام میں مصروف تھے جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی اساس تھے۔ شرر سیّد احمد خاں کو مسلمانوں کا ہادی، رہبر اور نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔[141] سیاسی اور قومی نقطۂ نظر سے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے حامی تھے، جس کا مظہر ان کا رسالہ اتحاد ہے جو اپریل ۱۹۰۴ء کو جاری ہوا تھا۔[142] یہ اُن کی اضطراری کوشش تھی، ورنہ اس سے قبل ہندو اور مسلمانوں کے اضلاع کے تقسیم کر لینے اور ان کی آبادیوں کے علاحدہ کر لینے پر رائے ظاہر کر چکے تھے۔[143]

شرر بحیثیت ناول نگار قومی فرض سمجھتے تھے کہ وہ اپنے ناول کو اچھے خیالات کی تبلیغ اور اصلاح احوال و اخلاق کا ذریعہ بنائیں جس سے مسلمانوں میں تاریخ کا صحیح ذوق پیدا ہوتا کہ ان کی رگِ حمیت اسلام جوش میں آئے، اور ان کے قومی خون میں جوش پیدا ہو اور وہ ترقی کی راہ پر چلنے کا تہیہ کر لیں۔[144] ان کی سوانحی تصنیفات کا بھی یہی مقصد ہے اور ان کے مضامین میں بھی جا بجا مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں کی اصلاح کی خواہش کا اظہار نظر آتا ہے۔ جو کام سیّد احمد خاں، حالی اور ان کے رفقا نے اپنی تحریروں سے کیا تھا اور جو فضا ان کی تحریروں کی وجہ سے بن چکی تھی، شرر نے اپنی تحریروں سے اس کو مزید ترقی دی اور سیّد احمد خاں کے ایک رفیق کی حیثیت سے ان کے مقصد کے تحت کام کیا۔[145] اور بیسویں صدی میں ان کی معاشرتی اصلاح کی فعال حکمت عملی کو جاری رکھا۔[146]

مولانا وحیدالدین سلیم، سیّد احمد خاں اور حالی سے مستفیض تھے۔ حالی نے انھیں سیّد احمد خاں سے ملایا تھا۔[147] سیّد احمد خاں نے انھیں ۱۸۹۰ء میں اپنے علمی مددگار کی حیثیت سے رکھ لیا تھا۔ وہ تصنیف و تالیف میں سیّد احمد خاں کے لیے عربی کتابوں سے مواد فراہم کرتے تھے۔[148] اور ساتھ ہی تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ سیّد احمد خاں کے انتقال کے وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد، محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کے مدیر ہو گئے۔[149] وقار الملک کے زمانہ تک یہی کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں جب لکھنؤ سے مسلم گزٹ نکلا، جس نے مسلمانوں

کی سیاسی بیداری میں خاص حصہ لیا، تو مولانا شبلی کے مشورے سے وہ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔[۱۵۰]
اس سے قبل علی گڑھ سے اور پھر پانی پت سے معارف نکالتے تھے۔ کوئی مستقل قومی اور سیاسی تصنیف
ان سے منسوب نہیں ہے۔[۱۵۱] وضع اصطلاحاتِ علمیہ، اصول اصطلاحات پر ہے اور افاداتِ سلیم مختلف
ادبی موضوعات پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ قومی اور علمی تاریخ میں اپنے سیاسی اور قومی مضامین اور مختلف
قومی اور علمی جرائد کی ادارت کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ سیّد احمد خاں کی تحریک اور اس کے
ماحول میں تربیت ہوئی تھی اس لیے آخری دور تک ان کی تحریروں میں اس کے مقاصد نظر آتے تھے۔

بعد میں جن افراد نے علی گڑھ تحریک کے مقاصد اور نصب العین کو اپنی تحریروں کے ذریعہ عام کیا
ان میں نمایاں اور اہم ادیب، شاعر اور صحافی شامل ہیں۔ چوں کہ یہ طبقہ خاموش تماشائی نہیں رہتا بلکہ
اپنے محسوسات، تاثرات اور ماحول کے اثرات کو بلاواسطہ یا بالواسطہ ظاہر کر دیتا ہے، اس لیے اس کے
اظہار کی مختلف شکلیں تاریخ اور ادب میں باقی رہتی ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے متاثر ادیب، شاعر اور
صحافیوں میں ایک تو وہ افراد ہیں، جو اس کے طبقۂ اوّلین میں شامل ہیں اور جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں
آیا اور دوسرے وہ افراد جو اس کے دورِ اوّل میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے اور پھر اس تحریک کے
اثرات کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے ظاہر کرتے رہے۔ چوں کہ علی گڑھ کالج اور بعد میں مسلم یونی ورسٹی
بھی اپنے ملک کے عام ماحول کی طرح سے مختلف سیاسی ہیجانات اور انقلابات کی آماجگاہ بنی رہی ہے
اس لیے یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ مختلف اوقات میں مختلف انقلابات کے اثرات کا اظہار کرتے
رہے۔ چوں کہ ان انقلابات کے ساتھ ساتھ ان کا ذہن، طریقہ کار اور نصب العین بھی تبدیل ہوتا رہا،
اس لیے وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے تبدیل شدہ ذہن اور طریقۂ کار کو اسی انداز سے پیش کرتے
رہے۔ یہاں اب ایسے افراد کا ذکر مقصود ہے جو سیّد احمد خاں اور ان کے خاص رفقا کے زمانے میں علی
گڑھ کالج سے فارغ التحصیل اور مستفید ہوتے رہے۔ اور پھر بعد میں اپنی تحریروں اور علمی کوششوں سے
ذریعہ سے مسلمانوں کی اصلاح معاشرت، قومی ترقی اور آزادی کے لیے کوشاں رہے۔

فی الحقیقت علی گڑھ تحریک سے فیضیاب افراد نے برِعظیم کے ادب، معاشرت اور سیاست میں
حرکت و عمل کی نئی زندگی پیدا کی۔ دراصل بیسویں صدی کا سیاسی ہندوستان بڑی حد تک ان کے
کارناموں سے عبارت ہے۔ مولوی عزیز مرزا نے علی گڑھ تحریک کو زبان و ادب اور قومی خدمت کے
دائرے میں تقویت بخشی۔ اپنے دور میں کالج کے نمایاں طالب علم تھے۔[۱۵۲] فارغ التحصیل ہونے کے

بعد حیدر آباد میں اہم ریاستی اور تعلیمی شعبوں سے متعلق امور میں خدمات انجام دیتے رہے۔ وہاں رہ کر بھی علی گڑھ کالج کی ترقی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے بڑی سرگرمی سے مساعی کرتے رہے۔ ۱۸۸۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے کے انعقاد میں سرگرم رہے۔ اس میں خود سیّد احمد خاں اور محسن الملک شریک ہوئے تھے اور ۱۸۹۲ء میں عزیز مرزا کی طلب پر دوبارہ علی گڑھ کالج کے لیے وفد لے کر حیدر آباد گئے تھے جہاں سے انھیں چندہ میں خطیر رقم حاصل ہوئی۔[153] حیدر آباد میں مولوی عزیز مرزا نے جو قومی اور سماجی خدمات انجام دیں اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ وہ وہاں کی مختلف قومی اور سماجی انجمنوں کے سرپرست رہے۔ ''ینگ مینس امپرومنٹ سوسائٹی'' کے چھ سال تک مسلسل صدر رہے۔[154] انجمن مواخاۃ المسلمین جس کا مقصد قومی اتحاد، صنعتی اور تجارتی ترقی اور قرآنی تعلیم تھا، ''انجمن ترقی نسواں''، ''انجمن سرمایۂ تعلیمی''۔ یہ انجمن تعلیمی غرض سے چندہ جمع کرتی تھی، اور نادار طلبا کو علی گڑھ بغرض تعلیم بھیجتی تھی، ''انجمن اتفاق دکن'' جو دکن میں مختلف طبقات و اقوام کے مابین محبت و ارتباط بڑھانے کے لیے قائم ہوئی تھی، ''انجمن اصلاح تمدن'' اور ''انجمن ترقیِ اُردو'' میں ان کی اعانت اور سرپرستی شامل رہتی تھی۔[155] حیدر آباد کی تمام قومی ملکی اور تمدنی تحریکوں کی روح رواں تھے۔[156] حیدر آباد سے واپسی کے بعد مسلم لیگ کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے برِّعظیم کے مختلف صوبوں میں دورے کر کے اس کے دائرے کو وسیع کیا۔[157] مسلم یونی ورسٹی کے لیے مسلسل کوششیں کیں۔ ریاست میں سیّد احمد خان کے پیرو اور علی گڑھ تحریک کے مقاصد کے علم بردار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کُل ہند مسائل میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے، مسلمانوں کے مخصوص قومی و تہذیبی مسائل میں اپنی جدوجہد کی راہ علاحدہ رکھے۔ مسلم لیگ کے مقاصد کی صراحت پر ایک کتابچہ اُردو اور انگریزی میں لکھ کر ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔[159] تصنیف و تالیف میں کئی علمی و ادبی کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ مولوی مہدی حسن نواب فتح جنگ کے انگریزی سفرنامۂ انگلستان کا ترجمہ گلگشت فرنگ کے نام سے کیا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں یورپی اور اسلامی تہذیب کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ سیرۃ المحمود، محمود گاواں مدبر اور وزیر سلاطین بہمنیہ کی سوانح اور اس کے کارناموں پر مبنی ہے۔[160] وکرم اروسی، کالیداس کے سنسکرت ڈراما کا ترجمہ ہے اور خیالاتِ عزیز، تاریخی مذہبی، معاشی، جغرافیائی، ادبی، فلسفیانہ، سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے۔

مولوی سیّد طفیل احمد منگلوری نے علی گڑھ سے انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا تھا اور وہیں سب

رجسٹرار ہو گئے تھے۔[۱۶۱] قومی کاموں میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی تھی۔[۱۶۲] ان کی عمر کا ایک حصہ ''علی گڑھ کالج اولڈ بوائز'' کو متحد کرنے اور ان کی ڈائرکٹری مرتب کرنے میں صرف ہوا۔ انھیں یقین تھا کہ علی گڑھ کے سابق طلبا ہی سیّد احمد خان کے مقصد کی تکمیل کر کے مسلمانوں کو ہندوستان میں ان کا مقام دلا سکتے ہیں۔ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی، مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے رکن اور اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور بارہ سال تک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد اعزازی رہے۔ مختلف مقامات میں اسلامیہ کالج قائم کرانے کے علاوہ خود علی گڑھ کالج میں غریب طلبا کے لیے مسلم یونی ورسٹی ہائی سکول قائم کیا جو مسلم یونی ورسٹی کے تحت چلتا رہا۔ چار سال تک صوبہ متحدہ کے رکن رہ کر عملی سیاست کا تجربہ بھی حاصل کیا۔[۱۶۳] بعد میں ان کا رجحان جمعیۃ العلمائے ہند اور کانگریس کے حامی قوم پرست علما کی طرف ہو گیا تھا۔[۱۶۴] اپنے انھیں نظریات کے مطابق مسلمانوں کی سیاست پر ایک مشہور کتاب مسلمانوں کے روشن مستقبل لکھی تھی۔ اور بعد میں اضافہ جدید کے ساتھ اس کا خلاصہ روحِ روشن مستقبل تحریر کیا۔ ان کی ایک اور کتاب حکومت خود اختیاری مذکورہ کتابوں سے قبل شائع ہوئی تھی۔ ایک رسالہ سود مند بھی نکالتے تھے، جس کے ذریعہ مسلمانوں کو کفایت شعاری، روپیہ کے کاروبار اور تجارت کی طرف راغب کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ سیّد احمد خان، محسن الملک، حالی اور دیگر زعمائے تحریک سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا مولوی چراغ علی کی اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام اور تحقیق الجہاد کے ترجموں سے کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی عملی سیاست کے بجائے اُردو کی دفاعی جدوجہد کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس جدوجہد کے لیے ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تھامس آرنلڈ اس کے پہلے صدر اور شبلی اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔[۱۶۵] ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک عملی طور پر شبلی ہی سیکرٹری رہے لیکن ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک حبیب الرحمٰن خان شیروانی یہ کام کرتے رہے۔[۱۶۶] ۱۹۱۰ء میں مولوی عزیز مرزا اور پھر صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق کو اس کا سیکرٹری بنایا[۱۶۷] جو اپنی تمام عمر یہ فرض ادا کرتے رہے۔ اُنھوں نے اپنی جدوجہد میں دور دراز علاقوں کا سفر کیا، انجمن کی متعدد شاخیں قائم کروائیں۔ اُردو مکتب، مدرسے، کتب خانے، مطابع قائم کروانے۔ جابجا جلسے، مناظرے اور مباحثے ہوئے، متعدد کتابیں تحریر کیں۔ کئی رسالے جاری کیے۔ زبان کا قدیم قیمتی سرمایہ تلاش کیا۔

زندگی بھر اُردو کے تحفظ، اس کے فروغ اور نفاذ کے لیے سرگرداں رہے۔ اس طور پر اُنھوں نے سیّد احمد خان کے اس مشن کو پورا کرنے کی سعی کی جس کے تحت وہ ورنیکلر یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔

انجمن ترقی اُردو کی تنظیم، توسیع، سرمائے کی فراہمی، کتابوں کی تصنیف و تالیف، ان کی طباعت و اشاعت کا اہتمام انجمن کے تحت اُردو، سائنس، تاریخ و سیاسیات، قومی زبان، ہماری زبان جیسے رسالوں کا اجرا اور تحقیق و تصنیف ان کی زندگی کے عام مشاغل رہے۔ جامعہ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ کے قیام میں ان کی کوششیں زیادہ وقیع ہیں۔ ان کی کوششوں سے انجمن نے ایک مستقل قومی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان مجموعی کوششوں کے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثرات نے اُردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمولیت کے قابل بنایا۔ اپنی دفاعی کوششوں کے باوجود اُنھوں نے ہندوؤں کی بعض اہم سیاسی مقاصد کی حامل لسانی تحریکوں کو، جو ہندوؤں کے قومی مفاد میں تھیں بڑی حد تک ناکام بنایا۔[۱۶۸] فی الحقیقت علی گڑھ تحریک سے متعلقہ افراد میں سے اکثر مختلف حیثیتوں سے بیسویں صدی کی سیاست اور آزادی کی تحریک کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ مذکورہ شخصیات اس تحریک کے اہم پیشرو ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دیگر اور بہت سی شخصیات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں سے زیادہ شخصیات، آیندہ عنوانات کا موضوع ہیں۔ بیشتر افراد جو اس کے دورِ تاسیس سے فعال رہے، اپنی تحریروں، تقریروں سے اس کے مقاصد کی بجا آوری کرتے رہے۔ اور ان میں سے کئی نے اپنا مخصوص سیاسی کردار بھی وضع کیا اور اس سے مسلمانوں کی سیاست کو متحرک اور متاثر کرنے میں اپنی بے پناہ مساعی وقف کیں۔ ان افراد نے یا ان سے متاثر ہونے والوں نے اپنی تحریروں، تقریروں کے ذریعہ انھیں مقاصد کو روبہ عمل رکھا۔ اس تحریک میں بعض ایسے افراد بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں جو تحریری جدوجہد سے قطع نظر علمی جدوجہد سے سیاست کو قومی مقاصد کی نہج پر لانے کے لیے کوشاں رہے۔ ایسی شخصیات اور ان کی جدوجہد کا مطالعہ زیرِ نظر صفحات کا موضوع نہیں ہے۔ وہ شخصیات جنھوں نے تحریر و تقریر کی مختلف شکلوں میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی نشر و اشاعت اور توسیع کی، ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔

صحافت میں مولانا محمد علی، حسرت موہانی، خان بہادر بشیر الدین، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں، سیّد طفیل احمد منگلوری، مقتدیٰ خاں شیروانی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر شیخ عبداللہ، خواجہ غلام الثقلین، رشید احمد صدیقی، الطاف علی بریلوی وغیرہ۔

جنھوں نے تاریخ، تہذیب و سیاست کو اپنا موضوع بنایا تھا، ان میں حبیب اللہ خاں، طفیل احمد منگلوری،

الیاس برنی، سیّد حسن برنی، عباس خاں شیروانی، ڈاکٹر سیّد محمود، ہارون خان شیروانی، ہاشمی فرید آبادی، الطاف بریلوی، خواجہ احمد عباس، باری، حیات اللہ انصاری، خواجہ غلام السیدین، عنایت اللہ دہلوی۔

تعلیم، مذہب، سوانح میں سر ضیاء الدین، آفتاب احمد خاں، سر رضا علی، حمید الدین فراہی، حبیب الرحمٰن شیروانی، عبدالرحمٰن بجنوری، قاضی عبدالغفار، عظیم بیگ چغتائی، اکرام اللہ خاں ندوی، سیّد نواب علی، الیاس برنی، احمد سعید خاں چھتاری، سر راس مسعود، ذاکر حسین، سیّد سلیمان اشرف، رشید احمد صدیقی، غلام السیّدین، حکیم احمد شجاع، خواجہ احمد عباس، عبدالرزاق کان پوری وغیرہ۔

مضامین، مقالات، خطبات، افسانوی ادب اور طنز و مزاح میں سیّد محفوظ علی، عظیم بیگ چغتائی، ظفر علی خاں، غلام الثقلین، اقبال احمد خاں سہیل، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، عبدالرحمٰن بجنوری، سلطان حیدر جوش، غلام السیدین، سجاد انصاری، آغا حیدر حسن، خواجہ احمد عباس، حکیم احمد شجاع، رشید احمد صدیقی وغیرہ اور شاعروں میں حسرت، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، خوشی محمد ناظر، فضل حق آزاد، امجد علی اشہری، وحید الدین سلیم، رضی الدین بسمل، نظامی بدایونی وغیرہ۔

یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے بجاطور پر اپنی تحریروں اور عملی سیاسی جدوجہد سے برِّعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کو مثبت بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کے سیاسی، مذہبی، قومی، تعلیمی اور تہذیبی شعور کو فروغ دیا۔ ان کی تہذیب و معاشرت کی اصلاح اور ان کی زندگی اور ان کے ادب کو مقصدیت اور حقیقت کا حامل بنایا۔[۱۶۹]

مجموعی طور پر اس تحریک نے اپنی قوم کے مطمحِ نظر میں بڑی نمایاں اور دوررس تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ انھیں قرونِ وسطیٰ کے عہد سے نکال کر عہدِ جدید میں داخل کیا۔ اس راستے پر لگایا جس پر چل کر وہ تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس تحریک کے متعلقین اپنی قوم کی سیاست، ثقافت، ادب اور مذہبی فکر پر اپنا مستقل اثر چھوڑ گئے ہیں۔ سیّد احمد خاں کے بعض ایسے عقائد کی نئی تفسیر نے، جنھیں اس وقت تک مختلف طریقے پر سمجھا جاتا تھا، ان کے تعلیمی لائحۂ عمل کی مخالفت پیدا کر دی، جو ان کی تحریک کی بنیاد تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب کوئی قدیم تہذیب نئی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو ضرور ایسی صورتیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر پر جو مذہب کی نئی تفسیر اور مغربی تعلیم کی خوبیوں پر تھا، اعتراض ممکن ہے۔ ان دونوں کا امتزاج اصل میں وہ تعلیم تھی جو سیّد احمد خاں قوم کو دینا چاہتے تھے۔ ان میں بعض فطری نقائص یقیناً موجود تھے۔ اور جس

سے خود ماہرین تعلیم بھی واقف تھے۔ ان کے رفقا میں شبلی، نذیر احمد، حالی اور وقار الملک اور بعد میں ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس میں تبدیلی کی ضرورتوں کو محسوس کیا تھا۔ کالج میں دی جانے والی تعلیم زیادہ غیر فطری تھی اور ماحول کے حقائق سے اس کا زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ وہ اس قدر لادینی تھی کہ عوام کے اخلاقی تعلقات سے بھی اس کا کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ پھر سیّد احمد خاں کی سرگرمیوں کے متعدد پہلو ایسے بھی تھے جنھیں بعض حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا۔ یہ عناصر مختلف گروہوں میں، ردِعمل پیدا کرنے کے لیے، جمع ہو گئے۔ ان کے ردِّعمل کا بہت سا حصہ تخریبی تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے قوم کے سامنے بعض حدود استوار کر کے کہ جن سے تجاوز قومی زندگی کے لیے مضرت رساں ہوسکتا تھا، ایک تعمیری کردار بھی ادا کیا۔ اُنھوں نے برِّعظیم کے مسلمانوں کو مغرب کی غلامانہ نقالی اور اپنی روایات کے ضیاع سے بچا لیا۔

خود علی گڑھ تحریک کے شرکا میں ایسے نام بھی ہیں جن کو علی گڑھ کی مخالف تحریکوں سے متعلق بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً شبلی، جو تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے ایک علاحدہ مسلک فکر رکھتے تھے۔ ان کی تمام سنجیدہ اور باقاعدہ علمی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ ہی رہا۔ ان کی بنیاد پر ان کے تلامذہ اور ان کے دارالمصنفین کو بھی علی گڑھ تحریک ہی کی ایک ذیلی تحریک قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا حمید الدین فراہی اور دیگر زعما کا تذکرہ بھی اسی ذیل میں ممکن ہے۔

❁…❁…❁…❁
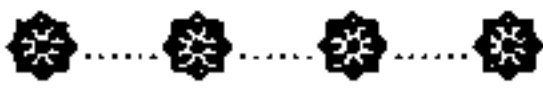
۲-علی گڑھ تحریک کی معاصر تحریکات

ندوہ، دیو بند-متعلقین اور ادب

(ا)-ندوۃ العلما

۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی شکست اور تہذیبی انتشار کے نتیجے میں مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے تھے، اور دونوں نے ایک حد تک پسپائی اور مراجعت کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ ان میں سے ایک نے تعلیمی اور تہذیبی میدان میں مسابقت کو اوّلیت دی اور ذہنی اور فکری میدان میں مصالحت اور سمجھوتے کی روش اختیار کی مگر فکری سطح پر کسی ربط اور سمجھوتے کو قبول نہ کیا۔ مقصد، مزاج، حکمت عملی، قیادت کے فرق نے دونوں رجحانات کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ ان دونوں متبادل روایات کے بُعد کو کم کرنے کی ایک کوشش ندوۃ العلما کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ دو فکری انتہاؤں کے اس بُعد میں قدیم نظام تعلیم اور جدید نظام تعلیم کے فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی دعوت مقابلہ کے نتیجہ میں شبلی اور بعض علما کے ذہن میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا خیال پیدا ہوا جہاں ضرورت زمانہ کے مطابق قدیم اور جدید نصاب کی تدریس ہو سکے۔ چناں چہ ۱۸۹۲ء میں ایک ''مجلس ندوۃ العلما'' اور ۱۸۹۴ء میں ''دار العلما'' کی تشکیل کی گئی۔[۱]

جن اکابرین نے علما کی نئی مجلس کی ضرورت والی دستاویز پر دستخط کیے ان میں مولانا محمد لطف اللہ، شاہ محمد حسین، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا محمود الحسن دیو بندی، شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولوی عبدالحق دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولوی خلیل احمد دیو بندی شامل تھے۔[۲] یہ وہ علما تھے جنھوں نے دیو بند اور علی گڑھ دونوں سے اس وسطی نقطۂ نظر کی طرف رجوع کیا تھا۔ ایک قدامت میں کچھ عنصر جدید کا شامل کرنا چاہتا تھا اور دوسرا جدید کو قدامت کا کچھ پابند بنانے کی فکر میں تھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس نے علما کو اجتماعی زندگی میں قیادت کی دعوت دی۔ اس کے محرک مولوی عبدالغفور تھے اور سیّد محمد علی اور مولانا اشرف علی اس کے تاسیسی اجلاس میں شامل ہوئے تھے۔[۳]

مولانا شبلی اور عبدالحق حقانی نے اس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔[4] اس کا مقصد عربی مدارس کا فروغ، اشاعت اسلام، مختلف الخیال علما کا رفع نزاع باہمی، سماجی اصلاح اور قوم کا مجموعی مفاد قرار پایا۔[5] اس کے تحت لکھنؤ میں دارالعلوم کے ابتدائی درجے شروع کیے گئے۔[6] پھر اس کی شاخیں مدراس اور شاہ جہاں پور میں قائم ہوئیں۔[7] نصاب کو ''زیادہ روشن خیال'' بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا،[8] جو آٹھ سال میں مکمل ہوسکتا تھا۔ مضامین میں دینیات کے علاوہ انگریزی، جغرافیہ اور ریاضی رکھے گئے تھے۔[9] اور بعد میں اس میں ترامیم بھی ہوتی رہیں۔ ۱۹۰۵ء میں شبلی اس کے معتمد تعلیمی منتخب ہوئے تو انگریزی کی تدریس تین سال کے لیے رُک گئی۔ ۱۹۰۸ء میں یوپی حکومت نے اس کے لیے پانچ سو روپے کی امدادی رقم منظور کی تو دوبارہ انگریزی کی تدریس میٹرک تک کے لیے شروع ہوئی اور اسی سال سنسکرت اور ہندی بھی نصاب میں شامل کی گئیں۔ لیکن شبلی کے ندوہ چھوڑنے پر اس ادارہ میں تعطل رونما ہوا اور جب دوبارہ تدریس شروع ہوئی تو نصاب تبدیل ہو چکا تھا لیکن یہ اب درس نظامیہ سے قریب تھا۔[10]

ندوہ کے قیام کا اکابرین علی گڑھ، بالخصوص سیّد احمد خاں، محسن الملک اور وقارالملک نے خیر مقدم کیا تھا۔[11] شبلی علی گڑھ اور ندوہ کے درمیان رابطہ کی ایک کڑی تھے۔ محسن الملک نے ندوہ کے مقاصد کی حمایت کی اور اس کی مماثلت میں علی گڑھ کا نقطہ نظر پیش کیا۔[12] شبلی ۱۹۱۳ء میں بعض اراکین انتظامیہ سے اختلاف کے سبب ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہوئے۔[13] لیکن علاحدہ ہونے کے باوجود اُنھوں نے اس میں دل چسپی برقرار رکھی۔ ایک ''انجمن اصلاح ندوہ'' قائم ہوئی۔ شبلی، ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں اس میں فعال رہے۔[15]

شبلی نے ندوہ کے لیے نصاب تیار کرنے، امداد حاصل کرنے کے علاوہ بعض اچھی علمی روایات قائم کیں اور زیادہ اہم کام قلم سے کیا۔ اعظم گڑھ میں ایک بڑی اہمیت کا تحقیقی ادارہ دارالمصنفین قائم کیا۔ وہ اگست ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک الندوہ کے مدیر رہے۔[16] جس میں ان کے اور دیگر علما کے وقیع قومی، سیاسی، علمی اور ادبی مضامین شائع ہوئے۔ اس کام کے ساتھ شبلی ندوہ ہی سے اشاعت اسلام کی تحریک کو چلانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے اس کے لیے منصوبے بنائے، انھیں پھیلایا۔[17] اور ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں کو اس تنظیم کا صدر مقرر کیا جس کے ذریعہ وہ اشاعت اسلام کا کام کرنا چاہتے تھے، اور اس کا مرکز ندوہ قرار دیا۔[18] لیکن وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے۔

اس وقت کے بعض اہم رہنما اور علما اس ادارہ سے متعلق رہے، جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم

اجمل خاں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا عبدالباری، اس میں دل چسپی لیتے تھے۔ مولانا عبدالحئی اور نواب علی حسن خاں ڈاکٹر سیّد عبدالعلی اس کے منتظمین میں رہے۔[19] مولانا ابوالکلام، شبلی سے ۱۹۰۴ء میں ملے تھے اور پھر پانچ سال تک ان دونوں کے درمیان خط و کتابت رہی۔ انھیں شبلی سے بڑی عقیدت رہی۔[20] شبلی کے اصرار پر وہ الندوہ کے مدیر ہو گئے تھے۔[21] ابوالکلام نے اپنے اخبار الہلال میں ندوہ اور اس کے مقاصد پر متعدد بار لکھا۔ اس کی انجمن اصلاح کے رکن رہے اور ندوہ کی اصلاح پر الہلال میں کئی مضامین تحریر کیے۔ حکیم اجمل خان ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ تک مسلسل ندوہ کے رکن رہے۔ ۱۹۱۰ء میں اس کے اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر بھی منتخب ہوئے[22] ندوہ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کی اصلاحی انجمن میں بھی سرگرم تھے۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی الندوہ کے مدیر رہے۔ شبلی سے بہت قریب تھے۔ ان کے ساتھ ندوہ کی مجلس نصاب کے رکن بھی تھے۔ متعدد مواقع پر شبلی کی مدد بھی کی۔

ندوہ کے ذیلی ادارہ تحقیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے مذہبی تاریخی کتب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت میں مثالی کردار ادا کیا۔ اس کے تحت پہلے الندوہ اور پھر معارف، علمی، مذہبی، تاریخی اور قومی موضوعات پر اعلیٰ درجہ کے مضامین شائع کرنے والے رسالے ہیں جسے ندوہ کے سابق طلبا مرتب کرتے ہیں۔

یہاں سے فارغ التحصیل طلبا میں بعض بہت مشہور ہوئے، اور ان میں سے بیشتر نے قومی تاریخی اور ادبی ماحول میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی، شبلی کے خاص شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ تحریکِ خلافت سے لے کر آزادی تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں میں شامل رہے۔ ان کی یہ شرکت مستقل رہی، تحریکِ خلافت کے دوران خلافت کے مسئلہ اور اس کی اہمیت پر کئی مقالات تحریر کیے۔ اور تحریکِ خلافت میں شروع سے آخر تک سرگرم رہے۔ مسلم لیگ کی تحریک کے مخالف تھے۔ اعظم گڑھ میں انھیں کی کوششوں سے کانگریس کمیٹی قائم ہوئی تھی اور وہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کے صدر رہے۔[23] ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ انگلستان سے واپس آئے تو تحریک ترکِ موالات میں بھرپور حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ندوہ کو ملنے والی سرکاری امداد بھی واپس کر دی۔[24] ان کے سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کا قلم بھی مصروف رہا۔ شبلی کی نامکمل سیرۃ النبیؐ کے تین حصوں کو مکمل کر کے شائع کیا۔ ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد کی دعوت پر ۱۹۲۹ء میں جو خطبات دیے، ان کا مجموعہ عرب و ہند کے تعلقات کی صورت میں طبع ہوا۔ یہ کتاب اپنی تحقیق و تدقیق، حجت و استدلال کے اعتبار سے مثالی ہے۔ اسی طرح عربوں کی جہاز رانی، ارض القرآن، خطبات مدراس، سیرۃ

عائشہ، خیام، حیات شبلی وغیرہ بھی اسی انداز کی کتابیں ہیں۔ اپنے زمانہ کے حالات و مسائل سے متعلق کئی مضامین الندوہ، معارف، الہلال اور دیگر رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کی تصانیف کا مقصد بھی مسلمانوں کی گمشدہ روایات اور ورثے کی بازیافت تھا۔

مولوی مسعود علی ندوی تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے دوران سلیمان ندوی کے ساتھ رہے۔ ان کے دور میں دارالمصنفین کے مہتمم تھے۔ اعظم گڑھ میں کانگریس کمیٹی کے قیام میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ اور یہ اس کے نامزد سکریٹری رہے۔ انگریزی مال کے مقاطعہ کی تحریک کے دوران اعظم گڑھ میں ایک لاکھ روپے کے غیر ملکی سوت کا مقاطعہ کیا۔ ۱۹۳۱ء کے آخر میں نمک کی ستیہ گرہ کے موقع پر ڈاکٹر انصاری نے اپنی گرفتاری کے وقت مولوی مسعود علی کو اپنا ''ڈکٹیٹر'' نامزد کیا۔ اعظم گڑھ میں سول نافرمانی کی تحریک میں ایک ہزار رضا کاروں نے ان کی قیادت میں حصہ لیا۔ اور جب گیا میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس پر سب سے پہلے انھیں کے دستخط ہوئے۔[۲۵]

مولانا ریاست علی ندوی، اعظم گڑھ میں ضلع کانگریس کمیٹی کے سرگرم عہدہ دار رہے۔ اور پھر جمعیت العلمائے ہند سے بھی متعلق تھے۔ مولانا نجیب اشرف ندوی نے تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات میں عملی حصہ لیا۔ مولانا ابوالحسنات ندوی نے تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات میں اپنی قلمی قوتوں سے شرکت کی۔ مولانا یحییٰ کاظمی نے شاعری کے ذریعہ سے سیاسی اور قومی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ دوسرے متعلقین میں بھی ایسے افراد تھے جو قومی اور سیاسی جذبہ سے سرشار تھے۔ ان میں سے کچھ نے علمی شرکت اختیار کی اور کچھ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے نہ صرف اپنے وقت کی قومی اور سیاسی تحریکوں کو تقویت بخشی بلکہ شبلی کے تصنیفی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی تکمیل کی کوششیں کیں۔ چوں کہ شبلی کے کام میں غالب پہلو تاریخ کا تھا، اس لیے دارالمصنفین اور اس کے متعلقین نے شبلی کی روایات کے اس مرکزی حصہ کو برقرار رکھا، بلکہ ترقی دی۔[۲۶] اس سلسلے میں بعد کے ایک عالم ابوالحسن علی ندوی، نے اپنے تبحر علمی اور تصنیفات کے ذریعہ سے اس مقصد میں، کسی قدر تبدیلی کے ساتھ زیادہ بہتر خدمات انجام دیں۔

شبلی کے خیالات سے ان کے شاگردوں کا متاثر ہونا فطری امر تھا۔ علی گڑھ سے وابستگی کے باوجود شبلی نے اس کی روح کو کبھی پوری طرح وقعت نہیں دی۔ اور وہ تحریک کے ان مقاصد سے بھی دور ہوگئے جن کے متعلق کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انھیں قابل قدر سمجھتے ہیں۔ وہ سیّد احمد خان کی حامیِ

سرکار حکمت عملی کو ناپسند کرنے لگے اور جب مسلم لیگ وجود میں آئی تو اس پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ چناں چہ ان کے شاگردوں اور ان کے حلقہ اثر کی اکثریت قوم پرست تھی اور مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے حق میں نہیں رہی۔

(۲) دیوبند

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی ان مجاہدین علما کے جذبات کو ختم نہ کرسکی جو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کی تحریک فکری و سیاسی سے مستفیض تھے۔ جنگ آزادی میں شاہ عبدالعزیز اور جماعت مجاہدین کے جن پیروؤں نے سرگرم حصہ لیا تھا ان میں حاجی امداداللہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی زیادہ نمایاں تھے۔ جنگ آزادی کے ناکام ہونے پر ان علما کا ایک گروہ حاجی امداداللہ کے ساتھ ہجرت کر کے حجاز چلا گیا اور دوسرے گروہ نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سرکردگی میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ دہلی کے انداز پر، جو جنگ آزادی کے دوران بند ہوگیا تھا، ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اسے اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی تعلیم و تلقین کا ذریعہ بنایا۔[۱]

ابتدا بہت معمولی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی شروع سے اس کے سرپرست رہے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن، ملا محمود اور دوسرے کئی علما اس میں درس دیتے تھے۔ اس کا ہفت سالہ نصاب تعلیم، مستقل نظام عمل اور اساسی قواعد مولانا نانوتوی نے بنائے، جس میں بعد میں ترامیم ہوتی رہیں[۲] مولانا قاسم نانوتوی کی کوششوں سے اس طرز پر ایک مدرسہ سہارن پور میں اور ایک مراد آباد میں بنا، جو مدرسہ دیوبند ہی کی شاخیں تھیں۔ سہارن پور میں مدرسہ مظہرالعلوم کے ناظم مولانا مظہر نانوتوی تھے،[۳] جو خود مسلک شاہ ولی اللہ سے مستفیض تھے اور جنگ آزادی میں شرکت کر چکے تھے۔ ان شاخوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ گئی تھی۔[۴]

مدرسہ دیوبند کے قیام کا ایک اساسی اصول یہ تھا کہ حزب ولی اللہ کی صحبت اور فیض اور مدرسے کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علما تیار ہوں، وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کی پوری استعداد رکھتے ہوں۔ وہ درسی کتابوں سے فارغ ہوکر اساتذہ کی صحبت میں رہیں اور ان سے حکمتِ ولی اللہی اور سیاسی اصول سمجھیں۔[۵]

مولانا قاسم نانوتوی کے انتقال کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی اس کے سرپرست ہوئے۔ ان کے انتقال ۱۳۲۳ھ پر مدرسہ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے۔ اس چالیس سالہ دور میں اس کا

نمایاں کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت تھا۔ اس عرصہ میں دیو بند کی علمی تحریک اطراف ہند سے نکل کر افغانستان و ترکستان اور حجاز اور قازان تک پہنچ گئی۔[۶] یہاں سے فارغ التحصیل طلبا میں سے جن بزرگوں نے زیادہ شہرت حاصل کی ان میں مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا سیّد انور شاہ کشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، سیّد محمد میاں، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مفتی محمد شفیع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیو بند علی گڑھ کالج سے کچھ سال قبل قائم ہوا تھا۔ یہ دونوں ادارے ایک ہی مسلکِ روحانی فیض کے تحت قائم ہوئے تھے۔[۷] ندوہ سے قطع نظر دیو بند نے نصاب تعلیم میں محض مراجعت کو مدِ نظر رکھا۔[۸] اس سلسلے میں یہ خیال رہا کہ جو جدید مغربی علوم سیکھنا چاہے، یہاں کی تعلیم ختم کر کے دوسرے اداروں میں حاصل کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے تو دونوں ادارے ایک دوسرے کی انتہا پر تھے ہی لیکن سیاسی نظریوں کے فرق نے بھی انھیں ایک دوسرے سے بہت دور ہی رکھا۔ دیو بند کے بانی جنگ آزادی میں اپنے سیاسی مقاصد کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ ان کے قائم کردہ مدرسہ نے عملی حیثیت سے سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھا لیکن وہ اس جذبہ آزادی کو جو اس کے بانیوں نے اس کے قیام میں مضمر رکھا تھا، اپنی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی طبقہ میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔[۹]

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خیالات بڑی حد تک رشید احمد گنگوہی جیسے تھے، جنھوں نے علی گڑھ سے کسی قسم کے تعلق کو گوارا نہ کیا تھا۔ ان کے خیال میں سیّد احمد خاں مسلمانوں کے لیے پُرخلوص ہوسکتے تھے۔ لیکن ان کے مذہبی نظریات اسلام کے لیے سم قاتل ہیں۔ جہاں اُنھوں نے سیّد احمد خاں کے تمام خیالات کو قبول نہیں کیا وہیں ان کے سیاسی مطمح نظر کو بھی رد کیا۔ یہ اصل میں ایک دیو بند عالم کی جانب سے اعلان تھا کہ وہ مسلمانوں کی شرکتِ کانگریس کو اہمیت دیتے ہیں۔[۱۰] جب سیّد احمد خاں نے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں ''انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' قائم کی تو ۱۸۸۸ء میں علمائے لدھیانہ کی تحریک پر ہندوستان کے مختلف حصوں، مدینہ منورہ اور بغداد کے تقریباً سو علما نے فتویٰ جاری کیا کہ جس میں مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی گئی اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں شریک ہونے سے منع کیا گیا۔ ان حامیانِ کانگریس میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن اور دوسرے مدرسین بھی شامل تھے۔[۱۱] یہ فتوے نصرۃ الابرار

میں مرتب کیے گئے۔[۱۲] ان علما نے اس لسانی تنازع کے پس منظر اور عواقب کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی، جس کے نتائج بڑے قبیح نکلنے والے تھے جنھیں سیّد احمد خاں نے محسوس کرلیا۔ اس دور میں منظر عام پر آنے والی وہ تحریریں بھی شاید ان کے لیے قابل توجہ نہیں تھیں، جن میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ اس ملک کو پہلے کی طرح سے عظیم دیکھنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ ایک قوم میں ضم ہو جائیں۔[۱۳] اس فتوے کے جاری ہونے کے صرف پانچ سال بعد تِلک اور دوسرے ہندوؤں کی جانب سے شروع ہونے والی متحدہ قومیت کی تحریکیں بھی شاید انھیں متنبہ نہ کرسکیں۔[۱۴]

اس سے فارغ التحصیل طلبا کا ایک کثیر طبقہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا معتقد رہا۔ اور ربع صدی بعد اپنے اسی نظریہ کے ساتھ عملی طور پر تحریک آزادی کا رکن بن گیا۔

مولانا محمود الحسن اپنے پیش روؤں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے جانشین تھے۔ ان کی سرپرستی سے مدرسہ دیوبند کا دوسرا دور اور عملی سیاست کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ دیوبند کے پہلے طالب علموں میں سے تھے اور مولانا قاسم کے عزیز شاگرد۔ طالب علمی کے آخری سالوں میں وہاں تدریس بھی شروع کی۔ ۱۹۰۵ء میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ اپنے اساتذہ کے جذبہ حُبّ الوطنی کے بھی وارث تھے۔ بلکہ اُنھوں نے عملی ثبوت بھی بہم پہنچائے۔ دیوبند کی رہنمائی کے ابتدائی دنوں ہی میں اپنے مخلص اور سمجھدار شاگردوں کا ایک حلقہ جمعیۃ انصار کے نام سے تشکیل دیا۔ جس کے معتمد مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔[۱۵] اس کا پہلا جلسہ ۱۵/ ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو ہوا۔[۱۶] جمعیۃ الانصار کے قیام سے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان جو کشیدگی تھی وہ بڑی حد تک دور ہوگئی۔ اس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے۔ اس کا علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ علی گڑھ کالج کے انگریزی خواندہ وہ طلبا جو مذہبی تعلیم حاصل کرنا چاہیں، دیوبند میں حاصل کریں اور دیوبند کے مذہبی تعلیم یافتہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو علی گڑھ جاسکیں۔[۱۷] اس کے ذریعہ مولانا محمود الحسن نے، جو ایک ہمہ گیر سیاسی تحریک چلانا چاہتے تھے، علی گڑھ کے انقلابی عنصر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔[۱۸] قوم پرور مسلمانوں میں ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری سے اور انقلابی جماعتوں کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔[۱۹]

ان کی سیاسی جدوجہد کا آغاز طرابلس اور بلقان کے اَلم ناک واقعات کے وقت سے ہوتا ہے۔

اُنھوں نے کچھ دنوں کے لیے دارالعلوم دیو بند بند کر کے ان ممالک کے مظلوم مسلمانوں کی خاطر امداد جمع کرنے کے لیے اپنے شاگردوں کے وفود اطراف و جوانب ملک میں روانہ کیے۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے شامل ہونے کے بعد جمعیۃ الانصار اور اپنی مجتمع طاقت کو دولت عثمانیہ کی تائید میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔[20] اُنھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کو پہلے دہلی روانہ کیا کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اپنی تحریک کی تبلیغ کریں اور پھر ۱۹۱۵ء میں کابل روانہ کیا جہاں پہلے ہی سے بڑی تعداد میں دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا اور سیّد احمد شہید کے باقی ماندہ پیرو موجود تھے۔[21] وہ مولانا محمودالحسن کی سرکردگی میں ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے تھے۔[22] اس زمانے میں انگریزوں نے مولانا عبدالحق حقانی سے فتویٰ دلوایا کہ انگریز اور ترکوں کی جنگ مذہبی نہیں ہے۔ جب اس فتوے کی توثیق کے لیے مولانا محمودالحسن سے کہا گیا تو اُنھوں نے انکار کر دیا۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ انگریز انھیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس ارادے سے کہ مکہ جا کر حج کریں اور پھر استنبول پہنچ کر تحریک انقلاب کے لیے حکومت ترکی کی مدد حاصل کریں گے، سیر پر روانہ ہوئے۔[23] اُنھوں نے مکہ معظمہ میں قیام کر کے ترکوں سے رابطہ قائم کیا۔ شریف حسین والیِ مکہ نے ایک فتویٰ مرتب کرایا تھا جس میں ترکان آل عثمان کی تکفیر کی گئی تھی۔ مولانا محمودالحسن سے بھی اس پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا۔[24] اور ان کے انکار پر انھیں گرفتار کر کے مصر اور مالٹا پہنچا دیا گیا۔[25] جہاں وہ فروری ۱۹۱۷ء سے مارچ ۱۹۱۰ء تک محبوس رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جنگ کے خاتمہ پر مع رفقا کے رہا کر دیے گئے۔ مئی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور یہاں کی سیاسی اور قومی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ یہ وقت گاندھی کی عدم تشدد کی تحریک کا تھا۔ اور قوم پرور مسلمان ایک سال پہلے جمعیۃ العلما اور خلافت کمیٹی کی نیم سیاسی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ مولانا محمودالحسن ہمیشہ اس بات کے خواہش مند رہے کہ برِّعظیم سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کی محکومی کو وہ برطانوی حکمت عملی کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ اور دوسری طرف وہ ابوالکلام آزاد جیسے قوم پرور مسلمانوں کی طرح سے ہندوؤں کے آگے غیر مشروط طور پر مسلمانوں کے جھکنے کے خلاف تھے۔[26] اس کے باوجود جمعیۃ العلما کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کانگریس کی عدمِ تعاون کی تحریک پر مہر تصدیق ثبت کر کے اس خیال کو، جو باہر کی مدد پر بھروسہ کرتا تھا، خود پر اعتماد کے ساتھ، اسے مشترک قومی تحریک سے منسلک کر دیا۔[27] چناں چہ کانگریس سے بہت قریب ہو گئے۔[28] تحریک ترکِ موالات کی حمایت میں اُنھوں نے طلبائے علی گڑھ کے استفتا

کے جواب میں ایک فتویٰ بھی دیا۔[۲۹] اس فتوے کی وجہ سے جامعہ ملّیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا سنگ بنیاد بھی مولانا محمود الحسن نے رکھا، جو ''علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ایسی آزاد درس گاہ تھی، جس کا تمام تر نظام عملی اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی تھا''۔[۳۰] اور جوانی کوتاہیوں کے باوجود علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان مل کر کام کرنے والوں کا ایک بڑا مرکز ثابت ہوئی۔

مولانا عبیداللہ سندھی مولانا محمود الحسن کے خاص شاگرد تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے مولانا محمود الحسن نے انھیں جمعیۃ الانصار کا معتمد بنایا تھا۔ مولانا سندھی نے بعض مشکلات اور تبلیغی مقاصد کے تحت اپنی سرگرمیوں کا مرکز دہلی منتقل کیا، جہاں نوجوانوں میں تبلیغ کرتے رہے۔ یہیں ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم کیا جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے روشناس کرایا جائے۔ اس کی سرپرستی میں مولانا محمود الحسن کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک بھی شریک تھے۔[۳۱] مولانا محمود الحسن کے ذریعہ مولانا سندھی اس کے اہم اکابر سے متعارف ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر انصاری، ابوالکلام اور مولانا محمد علی کے توسط سے مسلمانانِ برِعظیم کی سیاست کا وقوف حاصل کیا۔ مولانا محمود الحسن نے مولانا سندھی کو افغانستان بھیج دیا تاکہ امیر حبیب اللہ خاں والیِ افغانستان کو اپنی سرگرمیوں میں شریک کریں۔ افغانستان اس وقت جرمنی، ترکی اور ہندوستانی انقلابیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ چناں چہ وہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں دہلی چھوڑ کر پہلے بہاول پور بعدازاں سندھ پہنچے۔ اس اثنا میں راستے کے انتظامات بھی کرتے رہے اور اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کر لیا۔ وہاں سیّد احمد شہید کے باقی ماندہ پیرووں پر مشتمل لشکر سے ملنے کے بعد کابل پہنچ گئے۔[۳۲] وہاں اُنھوں نے ترکی، جرمن مشن سے، جو افغانستان کو دول وسطیٰ کے ساتھ شرکت کی دعوت دے رہا تھا، رابطہ پیدا کیا۔ باہمی کوششوں سے وہاں ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ عارضی حکومت کی جانب سے روس، جاپان، ترکی مشن بھیجے گئے۔ مولانا سندھی ان کی تجویز و ترتیب میں شریک رہے۔[۳۴] افغانستان ہی میں خدام خلق کی ایک جماعت بنائی جس کا نام جنود اللہ رکھا۔[۳۵] کابل میں اُنھوں نے اپنے آپ کو کانگریسی ظاہر کیا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے اُنھوں نے کانگریس کے لیے بھی کام کیا اور کانگریس کی ایک شاخ قائم کی جس کے یہی صدر بھی ہوئے۔[۳۶] ۱۹۲۳ء میں افغانستان سے نکل کر ماسکو گئے اور پھر استنبول ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور ۱۹۳۹ء میں واپس ہندوستان آئے۔[۳۷]

مولانا سندھی ابتدا ہی سے سیّد احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے اور اسی نہج پر اپنے لیے سیاسی عمل تجویز کر لیا تھا۔[۳۸] تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی یہ مقصد پورا کیا۔ اُردو زبان ہی کو عام طور پر اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، کابل میں سات سال، خطبات و مقالات ان کی مخصوص کتابیں ہیں۔

دیوبند کے ان علما کا یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا کہ سلطان ترکی، جو یورپی حکومتوں کا مقابلہ کر رہے تھے، ان کی مدد کی جائے۔ اُنھوں نے ترکوں سے رابطہ کی بابت اس وقت سوچا تھا جب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ برِّعظیم میں مسلمان دوبارہ اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ برطانیہ کی حکمت عملی دنیائے اسلام کی آزادی کے خلاف ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دنیائے اسلام پر دباؤ کی یہ حکمت عملی ہندوستان پر برطانوی تسلط کو تقویت پہنچانے کے لیے اختیار کی جا رہی ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو دنیائے اسلام پر یہ دباؤ نہیں رہے گا۔[۳۹] مولانا محمود الحسن کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی ملک سے باہر تھے۔ ایسے وقت علمائے دیوبند کی نمایندگی مولانا حسین احمد مدنی کے سر تھی۔ ان کے دور میں، جو ایک طویل عرصہ پر محیط ہے، وقت کی سیاست اور اس کے تقاضوں کے فرق کی وجہ سے ان علما میں دو طبقہ فکر بن جاتے ہیں۔ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے خیال کا مؤید رہ کر حامیِ کانگریس جماعت جمعیۃ العلمائے ہند کے ذریعہ جدوجہد آزادی کو مقدم سمجھتا ہے۔ اور دوسرا ہندوؤں سے اشتراک عمل کے بجائے مسلم لیگ اور اس کی مخصوص تحریک آزادی کا شریک بن جاتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی ابتدائی زندگی کا ایک حصہ مولانا محمود الحسن کی رفاقت میں گزرا تھا۔ ان کی تحریک کے ایک اہم رکن تھے جو مدینہ میں رہ کر ان کے کاموں کی تکمیل کر رہے تھے۔ انھیں ۱۹۱۳ء میں حجاز بھیجا گیا تھا۔ ان کے ذمہ ممالک اسلامیہ سے رابطہ اور حجاز کو اغیار کے اثرات سے محفوظ رکھنا تھا۔[۴۰] جب شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تو یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے اور مولانا محمود الحسن کے ساتھ مالٹا میں اسیر کر دیے گئے۔[۴۱] ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کر جب ہندوستان واپس آئے تو مولانا محمود الحسن کے سیاسی امر میں شریک رہے۔ ان کے انتقال کے بعد دیوبند کے ناظم مقرر ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں جمعیۃ العلما کے صدر۔[۴۲] ترکِ موالات کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اس کی حمایت میں نکلنے والے مشہور فتویٰ پر دستخط اور اس سلسلے میں ایک تقریر کے سبب علی برادران کے ساتھ گرفتار ہوئے[۴۳] دو سال کی سزا ہوئی۔ تحریکِ خلافت، جمعیۃ العلما اور کانگریس کی سرگرمیوں میں

مصروف رہے۔ ۱۹۳۲ء میں ستیہ گرہ کی تحریک میں شمولیت پر کچھ دنوں کے لیے دوبارہ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۴۵ میں آزادی کے لیے مدنی فارمولا پیش کیا جسے سر اسٹفرڈ نے سراہا۔[۴۴]

مولانا مدنی جنھیں، سات سال تک ہندوستان سے باہر رہنے کا موقع ملا تھا، عرب قومیت اور ترکی قومیت کے تصورات سے متاثر تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر کچھ زیادہ ہی زور دیا۔ ان کے خیال میں زمانے کے موجودہ تقاضے قومیت کے جغرافیائی تصور کے بجائے مذہبی یا کسی اور تصور کی تکذیب کرتے ہیں۔ کانگریس اپنے زمانہ قیام ہی سے سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے پیش نظر ایک متحدہ ہندوستانی قومیت ہے اور کانگریس کی حمایت سے ہی انگریزوں سے آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔[۴۵] ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان آزاد مسلم ریاست کی مخالفت میں اُنھوں نے کئی بیانات دیے۔ ان کی تمام تر جدوجہد اسی نکتہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کی تصانیف میں اہم ''متحدہ قومیت اور اسلام'' اور متعدد جلسوں میں پڑھے جانے والے خطبات ہیں، جس میں اُنھوں نے اپنا سیاسی نقطہ نظر واضح کیا۔

علمائے دیوبند میں مولانا مدنی کا طرز فکر رکھنے والے دیگر علما میں حفیظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیۃ العلما اور کانگریس کے مشہور رہنما تھے۔ سیاست میں کافی دل چسپی لیتے تھے، عملاً شریک ہوتے۔ پہلی مرتبہ رولٹ ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے۔ پھر نمک کی ستیہ گرہ کے سلسلے میں جیل گئے۔ ترکِ موالات کے سلسلے میں جاری ہونے والے فتویٰ پر ان کے بھی دستخط تھے۔[۴۶] ۱۹۳۰ میں جمعیۃ کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں کانگریس کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد جمعیۃ کے معتمد، یوپی پراونشل کانگریس کمیٹی کے نائب صدر اور دستور ساز اسمبلی میں اقلیتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔[۴۷] مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کانگریس کے لیے کام بھی کرتے رہے۔[۴۸] متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں اسلام کا اقتصادی نظام اہمیت رکھتی ہے۔

مفتی کفایت اللہ کی زندگی کا سیاسی دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ حج کے لیے گئے اور مولانا محمود الحسن کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ وہاں سے واپسی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ کے اجلاس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۳۹ء تک صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ تحریکِ خلافت میں عملی دل چسپی لیتے رہے۔[۴۹] ترکِ موالات کے سلسلے میں علما کا متفقہ فتویٰ انھیں کے اہتمام سے منظر عام پر آیا تھا۔ اس پر ان کے دستخط بھی تھے اور فتوے کے آخر میں مسلمانوں سے ایک عرضداشت بھی تھی۔[۵۰]

مولانا محمد علی کی طرف سے بلائی گئی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوکر جمعیۃ کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی۔[۵۱] اور اس پر جو تقریر کی اس پر انھیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔[۵۲] مولانا شبیر احمد عثمانی کے توسط سے قائداعظم سے بھی ملے تھے۔ جہاں وہ اس بات پر راضی ہوگئے تھے کہ کانگریس سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔لیکن ان کی بعض خواہشات کو قائداعظم تسلیم نہ کر سکے۔[۵۳]

مولانا احمد سعید جمعیۃ العلما کی تشکیل کے لیے سرگرم تھے اور پھر اس کے صدر بھی رہے۔ مفتی کفایت اللہ کے زمانہ صدارت میں اس کے معتمد منتخب ہوئے۔ تحریک ترکِ موالات، تحریکِ خلافت اور تحریک آزادی میں سرگرم رہے۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔[۵۴] کانگریس کی حکمت عملی کی طرف قوی رجحان تھا۔ سیاسی مسلک میں مفتی کفایت اللہ کے قریب تھے۔ جب ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں تو یہ ہندوؤں سے دل برداشتہ ہوگئے تھے۔[۵۵] کئی کتابیں اور ترجمہ قرآن ان سے منسوب ہے۔

مولانا محمد میاں انصاری، مولانا محمود الحسن کے سیاسی امور میں شریک رہے۔ ان کے پیغام کو لے کر حجاز سے افغانستان گئے۔ پھر کابل سے روس گئے اور وہاں افغانستان کے سفیر بنے۔[۵۶] جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم تھے۔ ان کی تمام سیاسی سرگرمیاں ہندوستان سے باہر رہیں۔[۵۷] تصنیف و تالیف میں حکومت الٰہی، احساس انقلاب، سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر وغیرہ ہیں۔

مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا رشید احمد گنگوہی اور محمود الحسن سے مستفیض تھے۔ وسعت علمی کی نادر مثال قرار دیے جاتے تھے۔[۵۸] دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اپنے زمانہ کی تحریکات میں بہت سرگرم رہتے تھے۔ سیاست میں مولانا محمود الحسن کے ہمنوا تھے۔ اور ابوالکلام کے نظریہ قومیت کے مؤید۔[۵۹] جمعیۃ کی تشکیل کے وقت سے اس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ تحریک کشمیر میں مجلس احرار کے معاون تھے۔[۶۰] جمعیۃ کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۷ء منعقدہ پشاور کے خطبۂ صدارت میں اپنے وطن قومیت کے نظریہ کو بالوضاحت بیان کیا۔ ان کا یہ خطبہ علاحدہ صدارت میں اپنے وطن، قومیت کے نظریہ کو بالوضاحت بیان کیا۔ ان کا یہ خطبہ علاحدہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔ کثیر التصانیف عالم تھے۔

مولانا محمد میاں دارالعلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ جمعیۃ کے سرکردہ کارکنان میں رہے جمعیۃ اور کانگریس کی تحریکوں میں شریک ہوکر کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔[۶۱] برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد پر دو مفصل کتابوں علمائے ہند کا شاندار ماضی اور علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے کے مصنف ہیں۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری، جمعیۃ کے فعال کارکن تھے۔ اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کی سیاست میں کم وبیش حصہ لیتے رہے۔ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت میں خاصے سرگرم تھے۔ کبھی کبھی مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی شریک ہوجاتے تھے۔[۶۲] اور اس کے اجلاس امرتسر دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجلس استقبالیہ کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔[۶۳] کثیر التصانیف عالم تھے۔ تفسیر ثنائی اور آیات متشابہات مشہور کتابیں ہیں۔

علمائے دیوبند کا دوسرا گروہ جس نے تحریک آزادی میں شامل ہوکر نظریہ پاکستان کی حمایت کی اور مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک عمل کیا، بعض نمایاں، اہم شخصیات پر مشتمل ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی علمائے دیوبند میں خاصا اثر رکھتے تھے۔ ان میں وہ ایک عالم اور صوفی کی حیثیت سے ممتاز رہے۔ اُنھوں نے تحریک ترکِ موالات کی مخالفت کی تھی۔ ایک فتویٰ بھی دیا جس میں اس امر پر زور دیا کہ کانگریس کی تحریک ترکِ موالات اور سول نافرمانی اگر ہندوؤں کے اشتراک سے کی جائے تو مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی زندگی کے لیے مضرت رساں ہے، اور مسلمانوں کی ان میں شرکت شرعاً حرام و ناجائز ہے۔[۶۴] وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندو قائدین کے پیچھے چلیں۔ اور ان کا یہ خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کبھی صحیح اتحاد قائم نہیں ہوسکتا کیوں کہ ان دونوں میں ہمیشہ اختلاف رہے ہیں۔ اور یہ تاریخ کے ایک طویل دور میں کبھی متحد نہ رہ سکے۔[۶۵] اگر انگریز اس ملک سے چلے گئے تو اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ چلا جائے گا جو مسلمانوں کے لیے زیادہ اندوہ ناک ہوسکتا ہے۔[۶۶] وہ مستقل کانگریس کی مخالفت کرتے رہے۔ جب ہندو مسلم تعلقات کے سلسلے میں اُنھوں نے اپنے نظریات میں کوئی تبدیلی نہ کی اور وہ مستقل مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حامی رہے تو ان کے تعلقات جمعیۃ العلما کے اراکین اور علمائے دیوبند سے بہتر نہ رہ سکے۔ اس لیے اُنھوں نے نہ صرف اس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا بلکہ دیوبند سے بھی علاحدگی اختیار کرلی، جس میں وہ ایک طویل مدت تک شامل رہے تھے۔[۶۷] جب مسلم لیگ نے انھیں شمولیت کی دعوت دی تو اُنھوں نے قدرے ابہام و تذبذب کے بعد اسے قبول کیا اور پھر اس کی حمایت علانیہ شروع کردی۔ مسلم لیگ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے تبلیغی وفود بھیجے، لوگوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے ہموار کیا، تقاریر کیں اور فتوے جاری کیے۔[۶۸]

مولانا تھانوی کثیر التصانیف عالم تھے اور ان کی تصانیف اسلامی معاشرتی نظام کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔[۶۹]

مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبند کے ممتاز مدرس تھے۔ سیاست میں مولانا تھانوی کے مسلک سے متعلق تھے۔ مفتی کفایت اللہ اور قائد اعظم کے درمیان مفاہمت کے لیے ملاقات ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔[۷۰] تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں سرگرم رہتے تھے۔[۷۱] شروع ہی سے جمعیۃ کے رکن رہے اور اس میں فعال حصہ لیتے تھے۔[۷۲] لیکن وہ زیادہ عرصہ کسی ایسی تحریک یا جماعت کو پسند نہ کر سکے جس میں ان کے ساتھ ہندو بھی شامل ہوں۔ ساتھ ہی وہ کانگریس اور اس کے نظریہ سے بھی شدید اختلاف رکھتے تھے۔ انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ جمعیۃ کا کانگریس سے تعاون رہے۔ چناں چہ اُنھوں نے جمعیۃ سے علاحدگی اختیار کر لی۔[۷۳] اور اس کے مقابلہ میں جمعیۃ العلمائے اسلام کی تشکیل کی۔ اس کا اصل مقصد ان قوم پرست علما کی مخالفت تھا جو دیوبند سے متعلق تھے یا ان جیسے خیالات رکھتے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کی صدارت میں کلکتہ میں اس کی تشکیل ہوئی۔[۷۴] مسلم لیگ کے ساتھ تعاون اور شرکت سے قبل ہی مولانا شبیر احمد عثمانی ایک متبحر عالم اور خطیب کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے سخت مخالف تھے اور جب مولانا مدنی نے اس نظریہ کو پیش کیا تو اُنھوں نے بھی اس کی رد میں پر زور دلائل دیے۔[۷۵] مسلم لیگ کے مقاصد سے متفق تھے چناں چہ اس کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ اس کے ایک اجلاس منعقدہ میرٹھ ۱۹۴۵ کی صدارت بھی کی جس کے خطبۂ صدارت میں اُنھوں نے مسلمانوں کو آنے والے انتخابات کی اہمیت جتائی کہ وہ برِّ عظیم میں مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ نظریۂ پاکستان کی مفصل وضاحت کی اور اس کے حصول کی اہمیت سمجھائی۔ ان ہی دنوں اُنھوں نے پاکستان کے لیے صوبہ سرحد میں رائے شماری میں کامیابی کی غرض سے کوششیں کیں۔[۷۶]

مولانا عثمانی دارالعلوم کے مجلّہ القاسم میں عام طور پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ خود ایک رسالہ المحمود کی ادارت بھی کی۔ اعجاز القرآن ایک بسیط مقالہ ہے۔ اور ایک تفسیر عثمانی نامکمل ان سے منسوب ہے۔ حدیث میں فتوح العلم بھی نامکمل ہے۔[۷۷] شاعری سے بھی شغف رہا اور اُردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔

مفتی محمد شفیع فضلائے دیوبند میں ایک ہمہ جہتی امتیاز رکھتے ہیں۔ فراغت تعلیم کے بعد دارالعلوم میں مدرس ہوئے۔ سیاست میں دل چسپی تھی۔ چناں چہ بھرپور حصہ لینے لگے۔ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مل کر کانگریسی علما کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ خیال تھا، جس کا وہ برملا اظہار کرتے تھے

کہ تحریک پاکستان کی مخالفت اصل میں اسلام کے مقاصد کی مخالفت ہے۔ اُنھوں نے دوقومی نظریہ کی بھرپور حمایت کی اور صوبہ سرحد کی رائے شماری میں شبیر احمد عثمانی کے ساتھ جدوجہد کی۔[۷۸]

مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ فیض سے متعلق رہے۔ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے دوران یہ بھی کانگریس کے ساتھ مل کر کسی بھی جدوجہد کو غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ پاکستان کے لیے رائے شماری میں کانگریسی علما کے خلاف کام کیا۔[۷۹] یہ اس وفد میں شامل تھے جسے مولانا تھانوی نے قائداعظم سے گفت گو کے لیے بھیجا تھا۔[۸۰] جمعیۃ العلمائے اسلام کے قیام میں سرگرم عمل رہے۔[۸۱] اور مسلم لیگ کی جدوجہد میں شامل رہ کر دورے کیے، تقاریر کیں۔[۸۲] یہ برِعظیم میں پاکستان کو اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے تھے اس لیے اس کے حصول کی تحریک میں شمولیت کو مذہبی فریضہ قرار دیتے تھے۔[۸۳]

تصانیف میں تلخیص البیان، خلاصہ بیان القرآن، ترجمہ الدرالمنثور، حمیۃ القدس، القول المنصور وغیرہ کے علاوہ اور بھی کتب تحریر کیں۔

مولانا مظہرالدین بجنوری، دارالعلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ اور دہلی سے رسالہ الامان نکالتے تھے۔ جمعیۃ کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ دوقومی نظریہ کے حامل تھے۔ اور کانگریس کے ساتھ اشتراک کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ جب ہندوؤں نے شدھی کی تحریک شروع کی تو اس کی سخت مخالفت کی۔ مسلم لیگ کے پرجوش مؤید اور کارکن بن گئے تھے۔ ان کا رسالہ ہندوؤں کے خلاف اسلام کی تحریکوں کے لیے وقف تھا۔[۸۴] اسی طرح شائق احمد عثمانی دیوبند کے فاضل تھے۔ کلکتہ سے عصر جدید نکالتے تھے، اور مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے۔

مجموعی طور پر علمائے دیوبند نے، چاہے وہ کسی رجحان کے حامل رہے ہوں، تحریک آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور عام مسلمانوں میں آزادی کا شوق اور اس کے لیے جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی ایسی کوششوں سے کانگریس کے مقاصد کو بڑی حمایت حاصل ہوئی اور دیوبند کے قیام کا مقصد کہ وہ مسلمانوں میں علمی اور سیاسی شعور پیدا کرے، بڑی حد تک پورا ہوا۔

* * * *

۳-مذہبی وسیاسی تحریکات اور اُردو ادب-علما کا حصہ

(۱) تحریک ردِّ عیسائیت-دورِ دوم

اس دور میں برطانوی حکومت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں اور ان کے مذہبی ادب میں برطانوی حکومت کی اطاعت اور عدم اطاعت، فرضیت جہاد، جدید تعلیم اور جدید تہذیب کے جواز اور عدم جواز پر بھی مناظروں کا اضافہ ہوا۔ برطانوی حکومت کے استحکام کی وجہ سے چوں کہ مشنریوں نے زیادہ رعائتیں حاصل کر لی تھیں اور اب ان پر کچھ مزید ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں، اس لیے ان آزادانہ سرگرمیوں سے برِّعظیم میں اسلام کے علاوہ اور مذاہب بھی بلاشبہ خطرہ میں تھے لیکن مذکورہ ماقبل اسباب کے سبب اسلام زیادہ زد میں تھا۔[۱] انگریزوں نے ہمیشہ ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے عیسائیت مستحکم ہوتی رہے اور ہندوستانیوں میں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، باہمی رواداری ختم ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے اس قدر متنفر ہوں کہ اپنی بقا اور سلامتی کو محض انگریزوں سے منسوب کر لیں۔ اس طرح کے انتشار میں برطانوی حکومت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ انتشار زیادہ تر ان مناظروں سے واقع ہوا جو تمام مذاہب میں اور بالخصوص عیسائی اور مسلمان مبلغین کے درمیان ہوئے۔ چوں کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے بہت کم گنجایش رہ گئی تھی، اس لیے ان کی ساری توجہ ایسے مناظروں پر مرکوز ہو گئی۔ اس وقت مسلمانوں کو جو خطرات درپیش تھے ان میں سے ایک یقیناً مشنریوں کی طرف سے تھا، جو اس توقع میں تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی زوال بھی شروع ہو جائے گا اور وہ حکومت کے ساتھ عیسائیت کو بھی قبول کر لیں گے۔ دوسرا ان غلط فہمیوں کی طرف سے تھا جو عیسائیوں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، اور وہ اسلام کو عقل کا دشمن، اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع سمجھ رہے تھے۔ تیسرا خطرہ ان شکوک و شبہات کی طرف سے تھا جو مشنریوں اور عیسائی مصنفوں کی کتابوں سے پھیل رہے تھے۔[۲]

اس سلسلہ میں سیّد احمد خان کی مساعی مثالی ہیں۔ اُنھوں نے مناظرانہ طریقوں کے مطابق باقاعدہ مشنریوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ ان کی یہ کوششیں ایک تو ان کے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند میں نظر آتی ہیں، جس میں وہ عیسائی مشنریوں کی کوششوں کو "ہندوستانیوں کی بغاوت" کی ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ بجاطور پر عیسائی مشنریوں اور ان کی سرگرمیوں پر یہ سیّد احمد خان کا مؤثر اور مدلّل اعتراض تھا[۳] اُنھوں نے تمام عمر مشن سکول اور کالجوں کی مذمت کی۔ ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے کلکٹر مراد آباد کے روبرو، ہر جگہ اُنھوں نے مشن سکولوں اور مشنری اشاعتِ عیسائیت کے طریقوں کی مخالفت بے باکی سے کی۔[۴] سیّد احمد خان نے اپنی تصانیف کے ذریعے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جو اس وقت اسلام کو درپیش تھے۔ ان کی تفسیر انجیل، تبئین الکلام کی تصنیف کا یہی مقصد بظاہر سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ سیّد احمد خان عیسائیت اور اسلام کے درمیان موجود بُعد کو کم کرنا چاہتے تھے لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس کی تصنیف کے پس پشت یہ مقصد بھی تھا کہ مسلمان مبلغین جو محض ماخوذ معلومات کے ذریعہ سے عیسائی مشنریوں سے مباحثہ کرتے ہیں۔ اس کی موجودگی میں، جو عیسائی علما کی مختلف معیاری تفسیروں کی مدد سے مرتب کی تھی، زیادہ مستند اور بہتر دلائل دے سکیں گے۔[۵] اس میں ان تمام اعتراضات کے جوابات خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر دیے گئے تھے، جن کے ذریعے مشنری مسلمانوں کو مرعوب کرتے تھے۔[۶]

سیّد احمد خان کی ایک اور اہم کوشش خطبات احمدیہ ہے جو سر ولیم میور کی LIFE OF MAHOMET کے اعتراضات کے جواب میں بڑی دقتِ نظر اور جانفشانی کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ سیّد محمود سے کرواکر شائع کیا۔ اس میں سیرت النبیؐ کے اصول سے عالمانہ بحث کی گئی ہے اور دوسرے مباحث (مثلاً انجیل کی بشارتیں وغیرہ) بھی موجود ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اعتراضات کا جواب عام طریقے کے بجائے تحقیقی انداز سے دیا گیا ہے۔ ہر مسئلہ پر بحث یہ حاصل ہے، اور اس کا طریق استدلال بہت زیادہ مؤثر ہے۔ خطبات احمدیہ کی تصنیف کے ساتھ ساتھ سیّد احمد خان نے گاڈفرے ہیگنس کی کتاب جو اس نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی، اور اس وقت نایاب تھی، مولانا محمد احسن نانوتوی سے ترجمہ کرواکر حمایت الاسلام کے نام سے شائع کیا۔[۷] اور لندن ہی میں جان ڈیون پورٹ کی کتاب Apology for Mohammad and Quran کو جو اس نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی، شائع کروایا۔ اُردو میں اس کے دو ترجمے شائع

ہوئے۔ ایک مولوی عنایت الرحمٰن خان نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا۔[8]

عیسائی معترضین کا جواب سیّد احمد خان نے محض اپنی متعدد تصانیف ہی میں نہیں دیا بلکہ ان کے اس مقصد کو رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا سے بھی بڑی مدد ملی۔ تہذیب الاخلاق کی تحریک سے بہت سے مصنفین ان اعتراضات کو دیکھ کر جو اسلام اور مسلمانوں پر کیے گئے تھے، جوابی مضامین لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ متعدد مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے اور اس کے لکھنے والوں نے کئی کتابیں اُردو اور انگریزی میں تصنیف کیں، اور ساتھ ہی اس رسالہ نے مسلمان مبلغین کو مذہبی مناظرہ کا سلیقہ بھی سکھایا۔[9]

سیّد احمد خان کے ساتھیوں میں حالی نے پادری عماد الدین کی کتابوں تاریخ محمدی اور تحقیق الایمان کا رد تریاق مسموم کے نام سے لکھا[10] اور ان کے دو رسالے، ایک تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے[11] اور دوسرا شواہد الالہام[12] بھی ردعیسائیت میں ہیں۔ پادری عماد الدین ہی کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب مولوی چراغ علی نے تعلیقات نامی کتاب میں دیا،[13] جس میں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی ترجیح کے اسباب پیش کیے۔ اور تاریخ محمدی کے مآخذ کو ناقابل اعتبار قرار دیا۔[14] دوسری کتاب اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام ریورنڈ ملکم مائیکل کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ اسلام مانعِ ترقی ہے[15] یہ کتاب فارسی میں تھی، جس کے بارہ صفحات کا ترجمہ خود اُنھوں نے کیا اور باقی کتاب کا ترجمہ مولوی عبدالحق نے کیا۔ اُنھوں نے ایک اور کتاب پادری عماد الدین کی ہدایت المسلمین کے جواب میں بشارت مثیل موسیٰ بھی تحریر کی تھی۔[16] ہدایت المسلمین کا ایک اور جواب آگرہ کے سیّد محمد عباس نے دیا تھا، جس میں اُنھوں نے بڑی محنت سے ایام جہالت کے شعرا کے کلام سے نوعیسائی پادری عماد الدین کی تردید میں اسناد جمع کی تھیں، اور فرداً فرداً ہر اعتراض کا بڑی عرق ریزی سے جواب دیا تھا[17] مولوی چراغ علی اپنے معاصرین میں تحقیق و استدلال کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مرزا غلام احمد نے، جو اس زمانہ میں مناظر کی حیثیت سے مشہور تھے، اپنی وقیع تصنیف براہینِ احمدیہ کی تالیف میں مولوی چراغ علی سے مدد لی تھی۔[18]

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سے ردعیسائیت کا کام لیا۔ اس ضمن میں لن کا ناول فلورا فلورنڈا مثالی ہے، جس میں اُنھوں نے پادریوں اور کلیساؤں کی زندگی کے تاریک پہلو اُجاگر

کیے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب مسیح و مسیحیت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے[19] مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس دور میں بھی مناظرے کیے۔ اور ردِعیسائیت میں تصنیف و تالیف جاری رکھی۔ ازالۃ الاوہام پہلے اُردو میں لکھی تھی پھر خود اس کا فارسی میں ترجمہ کیا[20] احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث میں دلائل عقلیہ و نقلیہ سے تثلیث کو باطل قرار دیا۔[21] معدل الموجاج المیزان پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کا ایک اور جواب ہے۔[22]

علمائے دیوبند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے عیسائیوں سے کئی مناظرے کیے۔[23] اور مناظرہ میں مباحثہ شاہ جہاں پوران کی کتاب ہے[24] مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی مناظروں سے دل چسپی تھی۔ اور اُنھوں نے فنِ مناظرہ میں بڑا ملکہ پیدا کرلیا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں عیسائیوں سے مناظرے کر چکے تھے۔[25] کئی کتابیں تحریر کیں۔ الخطاب العلم فی تحقیق المہدی و مسیح اور کثرت الازواج الصاحب المعراج اس ضمن میں ان سے منسوب ہیں[26] اور علما میں مولانا احمد سعید اور مفتی کفایت اللہ عیسائیوں سے مناظرے کرتے تھے اور یہ دونوں اس سلسلے میں ایک دوسرے کی معاونت بھی کرتے تھے[27] مولانا ثناء اللہ امرتسری ان سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ردِعیسائیت پر بڑی تعداد میں قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔ پادری ٹھاکردت کی کتاب عدم ضرورت قرآن کے جواب میں تقابل ثلاثہ لکھی۔ اور پھر توحید، تثلیث اور راہ نجات، جوابات نصاری اور اسلام اور مسیحیت تحریر کیں۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس ضمن میں احسن الحدیث فی ابطال التثلیث تحریر کی تھی۔ حافظ محمد گوندلوی نے پادری عبدالحق کے جواب میں اثبات التوحید بابطال التثلیث لکھی۔ ابواسلم احمد دین گکھڑوی نے پادری فنڈر کی میزان الحق کے جواب میں برہان الحق تصنیف کی۔

مرزا غلام احمد نے پادریوں سے مناظرے بھی کیے تھے اور ان کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں بھی تصنیف کیں۔ براہین احمدیہ، اسلامی اصول کی فلاسفی، آئینہ کمالات اسلام، تشحیذ الاذہان میں ردِعیسائیت کے دلائل موجود ہیں۔[28]

مولانا محمد علی مونگیری، ندوۃ العلما سے متعلق تھے۔ تحریک خلافت کے سرگرم کارکن رہے۔ قومی اور مذہبی امور میں بڑی دل چسپی لیتے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ردِعیسائیت میں صرف ہوا۔ اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام احمدیہ تھا۔[29]

مولانا اشرف الحق عبرانی اور یونانی زبانوں سے واقف تھے۔ ان سے انھیں مناظروں میں بڑی مدد ملی۔ رحمت اللہ کیرانوی سے مستفیض تھے۔ انھی سے مناظروں کی روایت اپنائی[۳۰] دافع البہتان به تنزیه الرحمن، استیصال دین عیسوی بمقابله دین محمدی کے علاوہ ان مناظروں کی روداد یں بھی ترتیب دیں جس میں اُنھوں نے حصہ لیا تھا۔[۳۱]

محمد رکن الدین نے لکھنؤ سے عیسائیت کی رو سے رسالہ اصول بطلان مذہب عیسی شائع کیا تھا[۳۲] جس میں فن مناظرہ کی تعلیم دی گئی تھی اور اسے مبلغوں کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس دور میں ردعیسائیت کا کام بیشتر اخبارات و رسائل میں بھی انجام دیا جاتا رہا۔ ایسے موضوعات بیسویں صدی کے اوائل تک عام نظر آتے ہیں۔

مرزا فتح محمد بیگ نے رام چندر کی کتاب دجال مسیح کے جواب میں ایک محققانہ تبصرہ کیا اور ساتھ ہی عیسائی مبلغوں کے اَدھ کچرے علم کی خوب دھجیاں اڑائیں[۳۳] اسی کتاب کا جواب مولانا ابوالمنصور ناصر نے دیا تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف عیسائیوں سے مناظرے کیے بلکہ واعظین کو اصول مناظرہ سکھانے کے لیے دارالامامت بھی قائم کیا۔ پادریوں کی کئی کتابوں کے جوابات تحریر کیے تھے۔[۳۴]

مولانا سیّد عبدالباری نے جنگ روم اور روس ۱۸۷۷ء کے دوران جب ترکی مصائب میں گرفتار ہوا تو اس کی امداد کے لیے بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔ عبرانی زبان سے واقف تھے اور مناظروں میں حصہ لیتے تھے۔ اس سلسلے میں اعلام الاحیا ان کی تصنیف ہے۔[۳۵] مولوی محمد علی، سیّد احمد خان کے مخالفین میں تھے۔ اور اپنے اخبار نورالافاق میں ان کی مخالفت میں مضامین اور شذرات لکھتے تھے۔ اس اخبار میں عیسائیوں سے مناظرے بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے دو کتابیں اینڈرسن کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھیں۔ ایک ظفر مبین ہے[۳۶] اور دوسری سوط الجبار علی متن الکفار ہے۔[۳۷] مولوی الفت حسین مناظر تھے اور جواب بالصواب ان کی تصنیف ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حکیم محمد حسن نے پندرہ کتابیں تحریر کی تھیں اور مناظروں میں مولانا اشرف الحق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔[۳۸]

مولانا محمد عثمان فارقلیط مشہور صحافی تھے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کے اخبار الجمعیۃ سے متعلق رہے۔ اخبار مدینه، زمزم اور رسالہ فاران بھی مرتب کرتے رہے، عیسائیوں سے مناظرے کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عیسائیت کے خلاف انجمن اصلاح المسلمین بھی بنائی جس کے تحت باضابطہ مختلف

مذاہب کے علما سے مناظرے ہوتے تھے۔[۳۹] ازابلا کے نام سے تاریخی اور مذہبی داستان لکھی جس میں اسلام کی صداقت اور عیسائیت کے بطلان کے دلائل بیان کیے۔

ردِ عیسائیت کی مساعی صرف مناظروں اور تصانیف ہی میں نہیں بلکہ تعلیمی اداروں انجمنوں، مساجد اور مکاتب میں بھی یہ کوشش ہوتی رہی۔ اداروں میں خاص طور پر دارالعلوم دیوبند اور اس کی متعدد شاخوں، انجمن حمایت الاسلام اور اس کی شاخوں، انجمن تبلیغ اسلام، حیدرآباد دکن، مدرسۂ امینیہ دہلی وغیرہ[۴۰] و نیز متعدد اخبارات و رسائل اس جدوجہد کے لیے کوشاں رہے۔ بعض میں دیگر مضامین کے علاوہ ردعیسائیت کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

ان میں منظور الاخبار، امین الاخبار، کشف الاخبار، پنجابی اخبار، قاسم الاخبار، خیرالمواعظ، رہبر ہند، ناصر الاخبار، مہردرخشاں، دبدبۂ سکندری، صحیفہ، ضیاء الاسلام، افتخار الاسلام، نورالاسلام، منشور محمدی، نسیم، نورالانوار، قیصر اخبار، نورالآفاق، حشمہ علم، رفیق ہند، مواعظ حسنہ، اشاعت اسلام، البیان، ریویو آف ریلیجنز، آستانہ، دین و دنیا، المنبر، منادی وغیرہ ایسے اخبار و رسائل تھے جن میں عام طور پر عیسائیت کا رد کیا جاتا تھا۔[۴۱]

ردعیسائیت پر علما نے جس قدر کام کیا، مناظروں میں حصہ لیا اور تصنیفی جدوجہد کی، اس کا احاطہ کرنا تفصیلات کا متقاضی ہے۔ اُنھوں نے اپنے مذہبی اور قومی جذبے اور حمایت کے تحت جو کچھ ردعیسائیت میں کیا اس کا ایک بڑا حصہ اُردو زبان میں ہے۔[۴۲] ان کے مناظروں اور تحریری جوابات میں اُردو کا استعمال ان کے لیے ناگزیر رہا۔ اس بنا پر وہ اپنے خیالات کو عوام تک مؤثر اور وسیع پیمانے پر پہنچانے میں کامیاب رہے۔ اس کا ایک نتیجہ بعد میں اٹھنے والی قومی اور سیاسی تحریکوں کی کامیابی کی صورت میں نمودار ہوا۔

(۲) تحریک اتحادِ اسلامی

خلافت عثمانیہ کے توسط سے مسلمانانِ برعظیم کا ترکی سے تعلق قدیم تھا۔ سلطنت مغلیہ کے وقت تک ایک مرکزی خلافت کا تصور برعظیم میں فی الحقیقت موجود تھا۔[۱] ٹیپو سلطان نے عثمانی خلفا سے درخواست کر کے اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا تھا۔[۲] بعد میں باضابطہ مسجدوں میں، خطبوں میں خلیفہ کا نام شامل کیا جانے لگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ترکی کی قسمت برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی اہمیت اختیار کر گئی۔ برعظیم میں اتحادِ اسلامی کے جذبات اُنیسویں صدی کے آخر میں واضح نظر آتے ہیں۔

اور یہ اس وقت سے جب کہ سلطان عبدالحمید دوئم نے عیسائیت کے اثرات کے خلاف احتجاج شروع کیا، اور اپنے نمایندے دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان بھی بھیجے تا کہ اپنے منصب خلافت کے ساتھ ساتھ اتحادِ اسلامی پر مسلمانوں کو مدعو کر سکیں اور ان کا تعاون حاصل کر سکیں۔ یہ تحریک ترکی میں ردِ عیسائیت کے لیے شروع ہوئی تھی اور اس کا مقصد یورپی عیسائی جارحیت کے مقابلے میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا اتحاد تھا[۳] جس کے ذریعہ سے اسلام اور اسلامی تہذیب کا تحفظ ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کی بہتر تعبیر جمال الدین افغانی کے اس خواب میں موجود تھی جس میں اُنھوں نے ایک مسلم جمہوریہ کو دیکھا تھا، جس میں مرکزی ایشیا کی اشتراکی جمہورتیں، افغانستان اور برِعظیم کے شمال مغرب کے مسلم اکثریت والے علاقے شامل تھے۔[۴]

اصل میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کوئی مسلم مملکت تنہا کسی یوروپی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے سب کو متحد ہو کر تحفظ اور ترقی کی مشترکہ کوششیں کرنی چاہییں۔ چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم مملکتیں یوروپی ممالک کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیں۔[۵]

برِعظیم کے مسلمانوں میں تحریکِ اتحادِ اسلامی کی قبولیت کے بڑے امکانات موجود تھے۔ ان میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل بھی یہ رجحان موجود تھا، خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے پاس، جو آفاقی خلافت پر شدید اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا تھا، اور ہندوستان میں ابھی اسلامی حکومت قائم تھی۔ اسلام کی مرکزی خلافت پر سلاطینِ عثمانیہ کا قابض ہونا ایک ایسی مسلّم و معروف بات تھی جو نہ صرف شاہ ولی اللہ بلکہ علمائے ہند کے علم و اعتقاد میں بھی رہی ہے۔ اُنھوں نے تفہیماتِ الٰہیہ میں دو جگہ سلاطینِ روم کا ذکر کیا ہے۔[۶] ان کے فیض یافتہ اور راسخ العقیدہ پیروؤں نے بھی خلافتِ عثمانیہ میں دلچسپی لی۔ اس گروہ نے معتدل حالات میں تو برطانوی سیاسی مصالح سے غیر جانبداری کو اپنا مسلک بنایا لیکن یہ طے پایا کہ جب بھی دولتِ عثمانیہ اور برطانیہ میں لڑائی ہوئی تو اس وقت یہ غیر جانبداری ختم کر دی جائے گی۔[۷] شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسحاق نے ترکی کی خلافت سے اشتراک ضروری سمجھا۔ وہ اپنی تحریک کا مرکز حجاز لے گئے۔[۸] اور وہاں پوری آزادی سے عرب تحریکوں سے علاحدہ رہ کر، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوست اور ترکوں کی مخالفت میں تھیں، دولتِ عثمانیہ کی سیاسی حکمتِ عملی میں تعاون شروع کیا۔[۹] یہی وجہ ہے کہ برِعظیم میں تحریکِ شاہ ولی اللہ سے مستفیض علمائے دیوبند اور ندوہ نے خلافتِ عثمانیہ کو ہندوستان میں مذہبی اہمیت دلانے میں نمایاں حصہ لیا۔

برطانوی حکمت عملی نے بھی کریمیا کی جنگ ۱۸۵۴ء-۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۶ء تک برِعظیم کے مسلمانوں اور ترکی کے تعلقات کی بابت حوصلہ افزائی کی تھی۔ اور برِعظیم کے مسلمان بھی برطانوی حکمت عملی کا رخ ترکی کی جانب پھیرنے کی کوشش کرتے رہے۔[10] روس اور ترکی کی جنگ ۱۸۷۷ء پر برِعظیم کے مسلمانوں نے مختلف شکلوں میں اپنے احتجاجی جذبات کا اظہار کیا۔ اُردو صحافت میں ان دنوں ان جذبات کا عام طور پر اظہار ہوتا تھا۔[11] مسلمانوں نے ترکوں کی امداد کے لیے خطیر چندے جمع کیے۔[12] مجاہدین کے جتھے بھی بھیجے گئے تھے۔[13]

سیّد احمد خان ترکی کے مسائل میں اس وقت تک دل چسپی لیتے رہے جب تک کہ یہ برطانوی حکمت عملی کے مطابق تھے۔ ترکی کے مصائب پر وہ متاسف رہتے تھے۔ سلطان عبدالعزیز خان کی معزولی کا انھیں بڑا قلق تھا۔[14] ۱۸۷۰ء میں ان کے تخت نشین ہونے پر مبارک باد پیش کی تھی اور انھیں محافظ تخت خلافت قرار دیا تھا۔[15] ترکی میں تنظیمات اور اصلاحات کی تعریف کی تھی۔[16] تہذیب الاخلاق کے ایک ایسے مضمون میں سلطان محمود، سلطان عبدالحمید اور سلطان عبدالعزیز کو ایسے مصلح قرار دیا جن کی پیروی ہندوستانیوں کے لیے ضروری سمجھی۔[17] کریمیا کی جنگ کے تعلق سے ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی حمایت کرنے پر انگریزوں کا مشکور ہونا چاہیے۔[18] اُنھوں نے رشید پاشا کے مذہبی خیالات کی، جو روشن خیالی پر مبنی تھے، تعریف کی۔[19] وہ اپنے متعدد مضامین میں ترکوں سے ہمدردی کے جذبات ظاہر کرتے تھے۔[20] ان کے مضامین اور خطوط جہاں کہیں اُنھوں نے ترکی کا ذکر کیا ہے، وہاں ان کی محبت اور انسیت کے جذبات علانیہ نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ اُنھوں نے کالج کے طلبا کے لیے مغربی کے بجائے ترکی لباس پسند کیا تھا۔[21] لیکن ان کے پاس اپنے ہم وطنوں کا بھی غم تھا۔ اس دور میں، جب اُنھوں نے کام شروع کیا، ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے زمانہ کے بدلے ہوئے تیور سمجھ لیے ہوں۔ اگر وہ اپنے اصل سے ہٹ کر کوئی دوسرا کام کرتے تو وہ اہم کام، جو ان کی زندگی کا بھی مقصد بن گیا ہو، دھرا رہ جاتا۔[22] برطانوی حکومت سے مصالحت ان کی حکمت عملی کا ایک جزو تھا۔ انھیں ایسی کوئی بات گوارا نہ تھی، جس سے ان کے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات اُن سے بگڑ جائیں۔ اُنھوں نے اس خیال سے ایسے مضامین لکھے، جن میں ترکی کے معاملات پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کی مخالفت کی۔ اور ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار رہنا چاہیے نہ کہ کسی اور کا۔[23] اس صورت میں بھی کہ

برطانوی حکومت ترکی کی مخالفت ہی کیوں نہ ہو[۲۴] سیّد احمد خان کے اس نظریہ کو اس وقت کے عام مسلمانوں نے رد کر دیا۔ اور ان کے ان خیالات کی مخالفت بڑی شد و مد سے ہوئی۔[۲۵]

برِّعظیم کے مسلمانوں کی ناراضگی ۱۸۷۷-۱۸۷۸ء میں روس کے مقابلہ میں ترکوں کی مؤثر حمایت نہ کرنے پر برطانیہ سے بڑھتی گئی۔ ان کی ہمدردیوں میں اتحادِ اسلامی اور خلافت عثمانیہ کی بابت اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے سیّد احمد خان کے مشورہ کو رد کر کے حکومتِ وقت کی فرمانبرداری کے بجائے اتحادِ اسلامی اور سیاسی جدوجہد کو پسند کیا۔ اُنھوں نے نہ صرف جمال الدین افغانی کے نظریۂ اتحادِ اسلامی کو قبول کیا بلکہ ان کے اس سیاسی مطمحِ نظر کو بھی کہ سلطان ترکی سب مسلمانوں کا خلیفہ ہے۔ جمال الدین افغانی، جو سیاسی اور مذہبی نظریات میں سیّد احمد خان کی ضد تھے جب ہندوستان آئے تو انھیں بڑی قبولیت ہوئی[۲۶] اور وہ یہاں کے مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی کی علامت بن گئے۔

سیّد احمد خان کے برعکس ان کے ساتھیوں میں شبلی، علی گڑھ سے علاحدگی کے بعد، اتحادِ اسلامی کے بڑے پکے حامی ہو گئے تھے۔ وہ بھی اپنی علی گڑھ کی زندگی میں سیّد احمد خان کی طرح سے خلافت کو محض خلافت راشدہ کے دور تک محدود سمجھتے تھے[۲۷] اور برِّعظیم میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے اس مرحلہ پر عبدالحمید دوم کی خلافت کے مسئلہ پر بحث کی ضروری خیال نہیں کرتے تھے اُنھوں نے اپنے ایک سلسلۂ مضمون میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ سلطان ترکی کی خلافت ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے کبھی تسلیم نہیں کی۔[۲۸] علی گڑھ سے علاحدگی سے قبل ہی شبلی اتحادِ اسلامی پر غور کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے سفرِ مصر، روم اور شام کے دوران اسلامی ملکوں کے حالات کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ مصر میں ان کی ملاقاتیں محمد عبدہ سے ہوتی رہیں، جو جمال الدین افغانی کے قابل ترین شاگرد تھے، اور عرب کی ان تحریکوں سے تعلق رکھتے تھے جو انگریزی استعمار کے خلاف سرگرمِ عمل تھیں۔[۲۹] جب قسطنطنیہ پہنچے تو یہاں بھی ان پر مسلمانوں کی مجبور و محکوم حالت کا اظہار ہوا۔ سفرنامہ میں جابجا ان کی ترکوں سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔[۳۰]

ترکی کے مصائب دیکھ کر اور عالمِ اسلام پر آنے والی مصیبتوں کا خیال کر کے ان پر جو اثر ہوا اس کا اظہار اُنھوں نے اپنی بعد کی نظموں میں بھی پُر درد انداز میں کیا، جو اُردو زبان کے سیاسی ادب میں ایک تاریخی مقام رکھتی ہیں[۳۱] جب ترکوں کی امداد کے لیے ایک طبی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں بلقان گیا، تو اس کو الوداع کہنے کے لیے شبلی بھی گئے تھے اور اس وقت ان کے جو احساسات

تھے، وہ اس وفد کی واپسی پر خیر مقدمی جلسہ میں اُنھوں نے جو نظم پڑھی تھی، ان کے جذبات کو خوب ظاہر کرتے ہیں۔

سیّد احمد خان کے ساتھیوں میں وقارالملک بھی اتحاد اسلامی کے حامی تھے، ویسے تو نواب محسن الملک، جن کے دور میں شبلی اور ابوالکلام نے مسلمانوں میں ترکی کے لیے جوش وخروش پیدا کر دیا تھا، وقتی رجحانات کا ساتھ دینے اور جذبات کے آگے مصلحتوں کو دبانے پر مجبور ہو گئے۔ مسلم یونی ورسٹی کے لیے جو چندہ جمع ہوا تھا اس میں سے ایک ہزار روپیہ اُنھوں نے حکومت ترکی کے تمسکات خریدنے میں لگا دیا۔[۳۲]

مولوی چراغ علی کا بھی ایک حد تک خلافت کے مسئلہ پر سیّد احمد خان سے متضاد نظریہ تھا، اُنھوں نے شیعہ ہونے کے باوجود ایران کے بجائے ترکی کے مسائل میں دل چسپی لی۔ اس کے انتظامات اور بے تعصبی کی تعریف کی اور آرمینیا کے مسئلے پر ترکی کی حمایت کی۔ اُنھوں نے بلنٹ کے اس خیال کی مخالفت بھی کی کہ قریش عرب کو خلافت منتقل کر دی جائے[۳۳] مولوی چراغ علی نے اپنی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی تجویز میں، ایران سے قطع نظر ترکی کو ایک مثالی ریاست کے طور پر منتخب کیا تھا۔[۳۴]

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے عالم اسلامی کے مسائل سے پوری اور گہری دل چسپی لینے لگے تھے۔ ان کے مطالعے سے مصر کے علمی اور انقلابی رسائل اور اخبارات گزر چکے تھے[۳۵] محمد عبدہ کی کتاب التوحید اور دیگر مضامین پڑھ چکے تھے۔ المنار میں تفسیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ نئی قسم کی تاویلات کی بعض کتابیں بھی نظر سے گزر چکی تھیں۔ محمد عبدہ اور دیگر مشاہیر مصر وشام کے حالات سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔[۳۶] جب وہ عراق گئے تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال کے دوستوں سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ ''نوجوان ترکوں'' کی جماعت سے بھی ملے اور اس کے چند رہنماؤں سے دوستی پیدا کر لی[۳۷] اس وقت جب کہ ہندوستانی سیاست کے اندر وہ حد سے زیادہ نہیں الجھے تھے، اتحاد اسلامی کے حامی تھے۔ اُنھوں نے اپنے ان خیالات کو ایک پُر جوش خطبہ میں بالتفصیل بیان کیا۔[۳۸] ان کا خیال تھا کہ جو تحریک صرف برِّعظیم تک محدود ہو، مقامی مسلم ملت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ وہی تحریک مفید ہو سکتی ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنے میں سمیٹ لے۔[۳۹] صرف جہاد کے ذریعہ ہی تمام دنیا کے مسلمان عیسائی دنیا کے خطرہ سے محفوظ رہ سکیں گے اور یہ جہاد تمام دنیا کے مسلمانوں کو مشترکہ طور پر کرنا چاہیے۔ یہ جہاد صرف آزادی حاصل

کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ ''حق'' کے لیے ہونا چاہیے۔[40] ان کا اُردو مجلّہ الہلال ان کے ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے چوں کہ انھیں تحریر میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اس لیے پہلے الہلال اور پھر بعد میں البلاغ کے ذریعہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن اُنھوں نے کوئی عملی جدوجہد اس سلسلے میں نہیں کی۔ ان کی سیاسی عملی جدوجہد کا آغاز اصل میں تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں سے سمجھنا چاہیے۔

مولانا محمد علی بھی تحریک اتحاد اسلامی کے لیے سرگرم رہے۔ ان کی سیاست، جہاں ایک طرف مادرِوطن سے وابستہ تھی، اور وہ مسلم ملت کی جداگانہ ہستی کو ابھرتی ہوئی ہندوستانی قومیت میں ضم کردینے کے حق میں نہیں تھے، وہاں وہ دوسری طرف اسلام کی عالمی ملت کا بھی ایک جزو تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک عالمی اسلامی اخوت دنیا کے تمام مذاہب کے تسلط سے مسلمانوں کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔[41] اُنھوں نے کامریڈ اس لیے جاری کیا تھا کہ ''ان نظریوں کا اظہار کرے اور مسلمانوں کو اس کے لیے تیار کرے کہ وہ اپنی ماورائی ملکی ہمدردیوں کے اس جوش وخروش میں، جو اسلام کی روح ہے، ذرہ برابر کمی کیے بغیر ملکی وطن پرستی میں مناسب حصہ لیں۔[42] کامریڈ کے ذریعہ اُنھوں نے اپنے اتحاد اسلامی پر مبنی خیالات کی بڑے پیمانے پر تبلیغ شروع کردی۔ ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ مل کر ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے مقامات مقدسہ مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچائے۔ اور اس کام کے لیے وقت ضرورت مسلمانانِ عالم کو متحد کرے۔[43] اس انجمن کے قیام سے ماورائی ملکی مسلم سیاست کا ایک اور انداز ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال نے، جنھوں نے ایک ہندوستانی قوم پرست کی حیثیت سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا، پختگیِ رائے کے بعد اپنے خیالات کو یکسر تبدیل کردیا تھا۔ اُنھوں نے دنیائے اسلام کے ناقابل تقسیم ہونے کے اصول پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانوں کو ترکوں، عربوں ایرانیوں، افغانیوں اور ہندوستانیوں کے گروہوں میں منقسم نہ ہونا چاہیے کیوں کہ اس قسم کا تصور اسلام میں نہیں ہے[44] ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا کوئی خاص وطن نہیں ہے جسے زمان ومکان میں محدود کیا جاسکے۔ اُنھوں نے تصور خلافت کو بھی پورے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس کے لیے ضروری نہیں کہ یہ ایک فرد پر مرکوز ہو۔ یہ ایک مجلس مشاورت یا جماعت کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے[45] اُنھوں نے جمال الدین

افغانی کے اس تصور کو قبول کیا کہ مکہ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز رہے گا۔ ساتھ ہی اُنھوں نے جدید حالات کے مطابق عالمِ اسلام کے لیے الماوردی کے نظریات کے مطابق ایک مرکز پر بھی غور کیا[۴۶] ان کے، دنیائے اسلام کے نا قابلِ تقسیم ہونے کے خیالات نے اتحادِ اسلامی کی اس تحریک کو تقویت پہنچائی، جو پہلے ہی برِّعظیم کے مسلمانوں میں پھیل رہی تھی۔ اس وقت اس کا ایک سبب شبلی اور ابوالکلام کی تحریریں تھیں۔ الہلال، کامریڈ اور زمیندار اس تحریک کو خوب فروغ دے رہے تھے اور دوسری طرف وہ بین الاقوامی واقعات تھے جو مسلمانوں کو مضطرب کر رہے تھے۔ اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر جو مصائب طاری تھے، ان سے ہر ذی شعور مسلمان متاثر تھا۔ ان کے جذبات تو اسی وقت سے مشتعل ہونا شروع ہوئے تھے جب روس اور ترکی کے درمیان ۱۸۷۷ء میں جنگ چھڑی تھی اور پھر یونان اور ترکی کی جنگ ۱۸۹۷ء نے انھیں مزید مضطرب کر دیا تھا لیکن اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ترپیولی میں اٹلی کی جارحیت اور بلقان جنگوں نے تمام مسلم مملکتوں کو احتجاج پر مجبور کر دیا۔ پھر جب پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے شمولیت اختیار کی تو برِّعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں بھی ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ برطانوی حکومت سے اپنے تعلقات کی بابت معاندانہ انداز سے سوچنے پر مجبور ہوئے۔

(الف) تحریکِ ریشمی رومال

تحریکِ اتحادِ اسلامی کے تعلق سے مولانا محمود الحسن اور ان کے دیوبند سے فارغ التحصیل طلبا اس سلسلے میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے عملی جدوجہد کی۔ اپنی ایک خفیہ تحریک کے ذریعہ سلطان عبدالحمید سے، جو اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت کو استعمال کرنا چاہتے تھے، تاکہ مغربی طاقتوں کے استعمار کا مقابلہ کر سکیں، روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے عزیز شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ کیا تاکہ وہ افغانستان اور آزاد قبائل سے ترکوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور افغانستان کو ترکی جرمنی اتحاد میں شامل کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ جہاں پہلے ہی ترکی اور جرمن مشن کام کر رہے تھے[۱] مولانا سندھی ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے۔ وہاں جرمنوں اور ترکوں کے وفود پہنچے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ کچھ ہندوستانی افراد بھی موجود تھے[۲] وہاں ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا، تاکہ وہ امیر حبیب اللہ خان کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے[۳] لیکن انگریزوں کی ایک چال سے یہ منصوبہ ناکام رہا[۴] عارضی حکومت کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی مشن بھیجے گئے جس کی تجویز اور ترتیب میں مولانا سندھی شریک تھے[۵] افغانستان میں

اُنھوں نے خدام خلق کی ایک جماعت بنائی جس کا نام ''جنود اللہ'' رکھا۔ افغانستان کے انقلاب کے بعد مولانا سندھی ماسکو، استنبول ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے، وہ جہاں بھی رہے، اپنے پیغامات ریشمی پارچوں پر تحریر کر کے مولانا محمود الحسن کے پاس بھیجتے تھے۔ ان میں سے بعض پیغامات غلط ہاتھوں میں پہنچ گئے چناں چہ یہ تحریک منکشف ہوگئی۔

مولانا محمود الحسن اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک لائحہ عمل تیار کر چکے تھے اور اُنھوں نے اس پر عمل کرنے کی کوشش اس وقت شروع کر دی تھی، جب برِعظیم میں سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ وہ بالخصوص ہندوستان اور ترکی کے واقعات کو اہمیت دیتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے چھڑنے اور اس میں ترکی کے شمولیت اختیار کرنے پر جو واقعات پیش آ رہے تھے، اُنھوں نے مولانا محمود الحسن کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کوششوں میں کچھ اور آگے بڑھیں، اس عرصہ میں اُنھوں نے انگریزوں کی خواہش سے نکلنے والے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ اور ترکی کی حالیہ جنگ مذہبی نوعیت کی نہیں ہے[6] وہ مولانا سندھی کو افغانستان بھیج چکے تھے۔ پھر وہ خود بھی حجاز روانہ ہوئے۔ اس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کے گورنر تھے۔ اُنھوں نے غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اور ان سے مسلمانانِ برِعظیم کے نام اور انور پاشا کے نام تحریریں حاصل کیں[7] لیکن انور پاشا خود حجاز پہنچ گئے چناں چہ مولانا محمود الحسن نے ان سے بھی ملاقاتیں کیں۔ انور پاشا نے، جو وزیر حربیہ ترکیہ تھے ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد میں ترکی کی طرف سے مدد کا یقین دلایا۔ اور اُنھوں نے بھی عربی، فارسی میں کچھ تحریریں دیں[8] غالب پاشا کی پہلی تحریر میں مسلمانانِ ہند کی طرف سے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جہاد تھا جس میں ترکی کی جانب سے شرکت کی یقین دہانی تھی۔ اس کے ضروری حصہ میں کہا گیا تھا کہ ''ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدائے قیوم و قادر کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنانِ اسلام پر غالب آ گئے ہیں۔ اس لیے اے مسلمانو، اس عیسائی حکومت پر حملہ کر دو، جس کی قید میں تم پڑے ہو۔ بہت جلد عزم صمیم سے ایسی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لیے وقف کر دو اور ان سے نفرت اور دشمنی کو ظاہر کرو''[9] یہ تحریر غالب نامہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسے برِعظیم میں مولانا محمد میاں انصاری کے ذریعہ بھیج دیا گیا اور ہندوستان اور سرحدی قبائل میں خفیہ طور پر تقسیم کیا گیا[10] لیکن انگریزوں کے ہوشیار رہنے کی وجہ سے اس اعلان جہاد کی صرف کچھ نقلیں تقسیم ہو سکیں۔

مولانا محمود الحسن اور ان کے شرکائے تحریک آپس میں پیغام رسانی کے لیے ریشمی پارچے استعمال کرتے تھے جن پر پیغام تحریر ہوتا تھا۔ اس لیے ترکی کی امداد اور ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے پیغام رسانی کی یہ کوشش "تحریک ریشمی رومال" کہلائی [۱۱]۔ اس کے دو بنیادی مقاصد تحریک کے خفیہ رہنے کے باوجود، مناظر عام پر آئے۔ ایک تو ہندوستان کے لیے کامل آزادی کی جدوجہد اور اس میں حکومت ترکی کی امداد کا حصول، اور دوسرے افغانستان کو انگریزوں کے خلاف ترکی اور جرمنی کے ساتھ وفاق میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔

اس قسم کی کسی تحریک کا رونما ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی، کیوں کہ مسلمانوں کے خلاف سلطنت برطانیہ کی سرگرمیوں نے اگر ایک طرف برِّعظیم کے مسلمانوں میں برطانیہ کی مخالفت کے رجحان کو تقویت بخشی تھی تو دوسری طرف ملت اسلامیہ کی وحدت اور اخوت کو توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ یہ دراصل تحریکِ خلافت کی شروعات تھیں، جو تحریک اتحاد اسلامی کے جذبات کا نقطۂ منتہا ہے۔

(۲) تحریکِ خلافت

پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے ممالک وسطی کے ساتھ اتحاد کرنے پر مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیل گیا تھا۔ ان کے جذبات کو اس وقت تک شبلی، ابوالکلام، مولانا محمد علی، ظفر علی خان اور اقبال نے اپنے ہیجانی مضامین، زور خطابت اور شاعری کے لطیف انداز میں متحرک کر دیا تھا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے بہت سے علاقے نکل چکے تھے۔ برِّعظیم کے مسلمان مغربی شہنشاہیت کی اس تباہی کو، جو اس نے ممالک اسلامیہ میں مچائی تھی، بچشم خود دیکھ سکتے تھے۔ دنیائے اسلام کی سیاسی قوت کا آخری قلعہ سلطنت عثمانیہ تھی جو اب اپنے دشمنوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی۔ برِّعظیم کے مسلمان اگر خود سیاسی حقوق کھو چکے تھے تو کم سے کم یہ دیکھ کر دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ ایک آزاد اسلامی قوم موجود ہے جسے خلافت کے خرچ طلب بار اٹھانے کا امتیاز بھی حاصل ہے اور یہ ادارہ ان کے ذہن میں اسلامی دنیا کی عزت کے لیے ضروری تھا۔ چوں کہ مسلم جذبہ شدت کے ساتھ ترکی کے حق میں تھا اور جو اتنے طویل عرصہ تک اتحاد اسلامی کے خواب دیکھ رہا تھا، ترکی کو مصائب میں دیکھ کر اسے سخت تکالیف پہنچی تھی۔ بعد میں جو واقعات ترکی میں رونما ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے الم ناک بھی تھے اور مایوس کن بھی۔ جنگ کی صلح کا اعلان ہوا۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر ظالمانہ فوجی قبضہ کیا۔ موصل پر جارحانہ اقدام کیا اور ۱۹۲۰ء میں ترکوں پر معاہدۂ سیورے عائد کیا گیا جس نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی کے حصے بخرے کر دیے۔

سلطنت عثمانیہ کے اس زوال نے برِعظیم کے مسلمانوں میں اس حد تک ہیجان پیدا کر دیا اور ان کے جذبات کو اس قدر مشتعل کیا کہ اس کی کوئی مثال برِعظیم کی کسی تحریک میں نہیں ملتی۔ وہ تقریباً پونے دوسو سال سے انگریزوں کی محکومیت میں مبتلا تھے، اس لیے اس کی مضرتوں اور مصائب سے واقف تھے۔ برطانوی حکومت کے وعدوں پر اعتماد کر کے اُنھوں نے پہلی جنگ عظیم میں اس کی پوری مدد کی تھی[۲] وہ سارے جذبات جو ایک عرصہ سے ضبط کے حدود میں تھے ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ نکلے جس نے، دوسری تمام تحریکوں سے بڑھ کر، برِعظیم میں حکومت برطانیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں نتائج سے بے نیازی اور مصائب و آلام سے انتہائی بے پروائی کا ثبوت دیا۔

اب تک تحریک ریشمی رومال اور انجمن خدام کعبہ کے توسط سے عام علما سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ خلافت کمیٹی کے قیام سے قبل انجمن خدام کعبہ کے توسط سے ترکی کے حالات پر احتجاج کیا جاتا تھا[۳] اسی کے ذریعہ مولانا عبدالباری علما کے ایک وسیع حلقہ میں متعارف رہے۔ اور اُنھوں نے اکابر علما کو اس انجمن میں شرکت کی دعوت دی[۴] لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں اس خیال پر گفت گو بھی ہوئی کہ خلافت کے لیے کوئی مستقل انجمن ہونی چاہیے۔ بالآخر کانفرنس میں اس مفہوم کی قرارداد منظور ہوئی اور ''آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی'' قائم ہوگئی[۵] اس میں مولانا عبدالباری، علی برادران، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، ظفر علی خان، وغیرہ زیادہ سرگرم رہے۔ یہ برِعظیم کے مسلمانوں کا نمایندہ طبقہ تھا، جو سمجھ دار بھی تھا اور اپنے جوش اور جذبہ کے طفیل زورِ خطابت اور زورِ قلم سے کام لینا بھی خوب جانتا تھا۔

مولانا محمد علی کو خلافت کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ امرتسر ۱۹۱۹ء میں خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کے نقطہ نظر سے برطانوی حکومت کو واقف کرانے کے لیے ایک وفد لے جانے کے لیے منتخب کیا گیا[۶] وہ اس وقت ''ترکوں کا انتخاب'' لکھنے پر اپنے مطبع اور کامریڈ دونوں سے ہاتھ دھو کر جیل کاٹ کے سیدھے امرتسر پہنچے تھے[۷] وفد انگلستان لے جانے سے قبل اُنھوں نے ایک دوسرے وفد کے اراکین کے ساتھ وائسرائے چیمسفورڈ سے ملاقات کی۔ میرِ وفد ڈاکٹر انصاری تھے[۸] وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا، اس لیے یہ بالکل فطری امر تھا کہ مسلمان مجوزہ وفد انگلستان بھیجنے کی تدابیر اختیار کریں۔ مولانا محمد علی نے بڑی متانت اور بے باکی سے وزیر ہند اور پھر وزیر اعظم کے سامنے مسلمانوں کے جذبات پیش کیے لیکن اُنھوں نے مسلمانانِ ہند کے مطالبات منظور کرنے سے صاف

انکار کر دیا۔[9] آٹھ مہینے تک محمد علی اور وفد کے دیگر اراکین یورپ میں مقیم رہے، شہر شہر گھومے، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تقریریں کیں، مقالات لکھے، لیکن انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔[10] پھر اُنھوں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور مسلمانوں کے سامنے مسئلہ رکھا۔ بہت جلد اس تحریک نے انتہائی وسعت اختیار کر لی۔ خلافت کمیٹی نے ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کے جواب پر یوم غم منانے کا اعلان کیا، جس میں مسلمانوں کو روزہ رکھنے، دعائیں کرنے، جلسے اور عام ہڑتال کے لیے کہا گیا۔ ان جلسوں کے لیے مولانا شوکت علی نے ایک قرارداد شائع کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر شرائط صلح منظور کرنے کے قابل نہ ہوئیں تو مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ تاج برطانیہ سے اپنا رشتۂ وفاداری منقطع کر لیں۔[11] پھر خلافت کمیٹی نے ترکِ تعاون اور ترکِ موالات کے فیصلے کی توثیق کی۔[12] عدمِ تعاون کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی منتخب کی گئی جس میں علی برادران بھی شامل تھے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے لکھنؤ میں عدمِ تعاون کے جلسے منعقد کیے۔ ایسے جلسے بعد میں مستقل ہوتے رہے۔ مولانا محمد علی نے ان جلسوں میں پُر زور تقاریر کیں جن میں ترکِ موالات، عدمِ تعاون اور حصولِ آزادی کی ترغیب دیتے رہے۔ ان کی صدارت میں ۱۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا، جس میں اُنھوں نے پُر زور تقریر کی اور سول نافرمانی اور کامل آزادی کی ایک قرارداد بھی پیش کی۔ اسی جلسہ میں ترکِ موالات کا فتویٰ پڑھ کر سنایا گیا جس پر ۴۷۹ علما کے دستخط تھے۔[13] حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔[14] مولانا محمد علی کو ان کی تقریر پر دیگر رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ اس دوران میں خلافت کانفرنس اور کانگریس کا لائحہ عمل بالکل ملا جلا رہتا تھا۔ سول نافرمانی کے لیے دونوں کے رضا کار باہم مل کر کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے اس قدر سرگرمی دکھائی کہ چند مہینے میں سول نافرمانی کے اسیروں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔[15]

مولانا ابوالکلام آزاد اسی تحریک کے توسط سے عملی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ محض ایک خطیب اور صحافی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اس وفد میں شامل تھے جو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے سے ملنے گیا تھا۔[16] خلافت کانفرنس میرٹھ کے اجلاس میں عدمِ تعاون کی حمایت میں تقریر کی اور گاندھی کی تحریک کو غیر مشروط طور پر تسلیم کیا۔[17] اس کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، اس کے رکن منتخب ہوئے۔[18] اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے آزاد نے مختلف شہروں کے دورے بھی کیے اور بیشتر وقت گاندھی کے ساتھ ساتھ رہے۔[19] تحریک میں شمولیت

کے سلسلے میں ایک سال کے لیے گرفتار ہوئے۔[20]

کچھ عرصہ صوبائی خلافت کمیٹی کے رکن بھی رہے[21] خلافت کانفرنس منعقدہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کے صدر منتخب ہوئے[22] اس سے قبل وہ صوبہ متحدہ میں تین اور بنگال میں ایک صوبائی کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے[23] ان میں ان کے خطبات ہیجانی ہوتے تھے اور وہ ان جذبات کو متہیج کرتے رہے جو مسلمانوں میں پہلے ہی سے کبھی خوابیدہ نہیں رہے تھے۔ ان کی تحریریں بھی مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرتی تھیں۔ اپنے جس نظریہ کے تحت اُنھوں نے ملّت کے جذبات میں ہل چل پیدا کی، اس کو سمجھنے کے لیے ان کی کتاب مسئلہ خلافت مفصل اور جامع ہے۔ اس میں آزاد نے تفصیل اور تحقیق کے ساتھ خلافت، اس کی تحریک، تاریخ اور پھر اس دور میں اس کی اہمیت بیان کی ہے۔ یہ کتاب مسئلہ کی اہمیت سے واقف بھی کراتی ہے اور اس کے قیام اور بقا کی کوششوں کے لیے ترغیب بھی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر اس میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی، عالم گیر اخوت، جماعتی نظام اور تنظیم، امامت کی ضرورت اور نوعیتِ نظام امر اور شورائیت کی خصوصیات اور اسلام کے بین الاقوامی پیغامات پر سیر حاصل بحث ہے۔

مولانا عبدالباری ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈال چکے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جانے سے بچائے اور وقت پڑنے پر مسلمانوں کو متحد کرے[24] اس کے ذریعہ وہ مختلف خیالات وعقائد کے علما کو متحد بھی کرنا چاہتے تھے تاکہ باہمی مناظرات و مباحثات میں کمی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں میں مذہبی جوش قائم رہے اور انھیں ملکی کام کرنے کی مشق ہو[25] وہ بہت جلد قابل علما کا گروہ اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے[26] آگے چل کر اُنھوں نے برِعظیم کی سیاست میں نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیا۔ مولانا عبدالباری بیسویں صدی کے اوّلین علما میں تھے، جنھوں نے ملکی سیاست میں حصہ لیا۔ ان کی سرگرمیاں تحریکِ خلافت کے دنوں میں زیادہ نمایاں رہیں۔ قسطنطنیہ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد برِعظیم میں جابجا احتجاجی جلسے ہوئے، ان میں سے ایک قابلِ ذکر لکھنؤ میں "آل انڈیا مسلم کانفرنس" کا جلسہ منعقدہ ۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء تھا۔ مولانا عبدالباری لکھنؤ میں اس کے بڑے داعی تھے[27] اُنھوں نے اس کی صدارت بھی کی۔ اس میں خلافت، حرمین اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے کسی مستقل نظام کی بابت غور کیا گیا۔ چناں چہ ایک قرارداد کے ذریعہ مجلس خلافت قائم ہوئی۔ بعد میں اس کی تمام سرگرمیوں میں مولانا عبدالباری مستعدی سے حصہ لیتے رہے۔ شروع ہی سے اس کے ممتاز رکن تھے، لہٰذا اس کی حکمت عملیوں میں ان

کی رائے بھی شامل ہوتی تھی۔ مولانا محمد علی کی ملک سے غیر حاضری میں اُنھوں نے مولانا شوکت علی کے ساتھ سندھ کا دورہ کیا۔ عدمِ تعاون کی تحریک میں بھی سرگرم رہے[۲۸] علی برادران کو ان سے بڑی عقیدت تھی[۲۹] جب دونوں جیل میں تھے تو ڈاکٹر مختار انصاری، حکیم اجمل خان اور دیگر زعما ان سے درپیش مسائل میں مشورے کرتے تھے[۳۰] خدام کعبہ کے علاوہ سیاسی مقاصد کے لیے ان کے ذہن میں علما کی ایک علاحدہ مستقل انجمن کا خیال موجزن تھا چناں چہ جمعیۃ العلمائے ہند کے قیام میں ان کی کوششیں رُو بہ عمل آئیں[۳۱] اس کے اجلاس خلافت کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے[۳۲] اور اس نے مجلس خلافت کے کئی فیصلوں کی توثیق کی[۳۳] مولانا عبدالباری علمائے فرنگی محل سے تھے، علمیت میں صاحب فضل و کمال تھے۔ ان سے تالیفات میں آثار الاوّل اور تفسیر القرآن منسوب ہیں۔

سیّد سلیمان ندوی، ندوہ کی علمی اور تاریخی تحریک سے وابستہ تھے۔ اپنے دور کی کئی تحریکوں میں بھی سرگرم رہے۔ تحریکِ خلافت کے مستعد اور فعال کارکن تھے۔ ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں جو وفد وائسرائے سے ملا تھا، اس میں شریک تھے[۳۴] مولانا محمد علی کی سرکردگی میں انگلستان جانے والے وفد میں بھی شامل تھے۔ اُنھوں نے برِعظیم کے علما کی نمایندگی کی تھی[۳۵] وفد کے دیگر شرکا کے ہمراہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے یورپ کے مختلف ممالک اور ترکی کا دورہ کیا، تقاریر کیں اور مختلف اخبارات میں مضامین لکھے[۳۶] واپسی پر مجلس خلافت کے فیصلہ کے مطابق عدمِ تعاون میں حصہ لیا۔ ۸رمئی ۱۹۲۶ء کو خلافت کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت بھی کی۔ موتمر عالم اسلامی اور سلطان ابن سعود کی دعوت پر جانے والے وفد کی قیادت کی[۳۷] کثیر التصانیف عالم، مورخ اور ادیب تھے۔ مسئلہ خلافت پر متعدد کتابچے تحریر کیے۔ ان میں خلافت اور ہندوستان[۳۸] خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام[۳۹] خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار[۴۰]، خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف[۴۱] خاص ہیں۔

مولانا حسرت اچھے غزل گو اور بے باک صحافی کے ساتھ ساتھ پُر جوش قومی کارکن اور سیاسی رہنما بھی تھے، متعدد مرتبہ گرفتار ہوئے۔ خلافت کانفرنس کے جلسوں میں باغیانہ تقاریر ان کا مشغلہ تھا۔ خلافت کمیٹی کے تحت عدمِ تعاون کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے والی کمیٹی کے نامزد رکن تھے[۴۲] انھیں کی کوششوں سے خلافت کمیٹی کا صدر دفتر جو بمبئی میں تھا، دہلی منتقل ہوا[۴۳] تحریکِ خلافت میں ان کی مثالی اور انتہائی پُر جوش سرگرمیوں کی بنا پر ان کے ساتھی رہنما بھی ان کے معترف تھے۔[۴۴] ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس، احمد آباد کے صدر منتخب ہوئے۔[۴۵]

مولانا ظفر علی خان جنگ بلقان کے دوران ترکی کی امداد کے لیے بھرپور کوششیں کرتے رہے۔ اتحاد اسلامی کے زبردست مؤید تھے۔ اس کے مشہور مصری رہنما عبدالعزیز شویش سے ان کے تعلقات تھے۔[۴۶] اپنے اخبار زمیندار میں ترکی کی حمایت اور برطانوی حکمت عملی پر تنقید میں سخت مضامین لکھتے رہے۔ ان دنوں ان کے اخبار کا دفتر تمام تحریکات کا مرکز اور صوبہ بھر کے قائدین اور کارکنوں کا مرجع تھا۔[۴۷] خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریکوں کے دوران سرگرم حصہ لیا، پرزور تقاریر کیں اور کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔[۴۸] سیّد سلیمان ندوی کی قیادت میں حجاز جانے والے وفد میں یہ بھی شامل تھے[۴۹] بعد میں بعض افسوس ناک معارضہ کے نتیجہ میں جب پنجاب خلافت کمیٹی، آل انڈیا خلافت کمیٹی سے علاحدہ ہوگئی تو اس کی سربراہی اُنھوں نے ہی کی۔[۵۰] اس تحریک کے دوران متعدد نظمیں اور شذرات تحریر کیے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا محمد علی کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ ہمدرد سے متعلق رہے۔ تحریکِ خلافت کے سربرآوردہ رہنماؤں میں شامل تھے۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں بھی برابر شریک رہتے تھے۔ تحریکِ خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ اس کے ایک اجلاس منعقدہ لکھنؤ، فروری ۱۹۲۷ء میں استقبالیہ کمیٹی کے صدر رہے، اور پُرجوش خطبہ پڑھا[۵۱] اُنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ بھی مسئلہ خلافت پر اظہار خیال کیا۔[۵۲] تفسیر ماجدی، قصص و مسائل، سفر نامہ حجاز، حیوانات قرآن، جغرافیہ قرآن، اعلام القرآن، سیرۃ النبیؐ قرآن کی روشنی میں، اکبرنامہ، محمد علی، ذاتی ڈائری ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

مولانا فاخر الہ آبادی بڑے مستعد سیاسی کارکن تھے، تحریکِ خلافت میں بھی سرگرم رہے اور عدمِ تعاون کی تحریک میں شرکت کی پُرجوش تقاریر کیں[۵۳] گرفتار ہوئے[۵۴] خوش ذوق شاعر تھے۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ جذبات بے ریا اور زندۂ جاوید تصانیف ہیں۔

دیگر افراد میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، تحریکِ خلافت کے ابتدائی دور میں نہایت سرگرم رہے۔ ان کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا۔ ان دونوں کی وجہ سے اس تحریک کو بڑی تقویت ملتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری پہلی جنگ عظیم کے دوران اپنی قیادت میں طبی وفد لے کر بلقان گئے تھے[۵۵] واپس آکر بھی وہ ترکی کے لیے مختلف اوقات میں امدادی خدمات انجام دیتے رہے اور پھر تحریکِ خلافت میں سرگرم رہے۔ حکیم اجمل خان تحریک کے شروع ہونے سے قبل ہی اس مقصد کے لیے مستعد رہتے تھے۔ مسلم لیگ کے ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے مسئلہ خلافت اور مسلمانانِ عالم کو درپیش

مسائل سے مسلمانوں کو آگاہ کیا[۵۶] بعد میں ڈاکٹر انصاری نے بھی مسلم لیگ کے ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ایسے ہی موضوعات پر گفت گو کی۔[۵۷]

مولانا آزاد سبحانی، عبدالماجد بدایونی، خواجہ حسن نظامی، مشیر حسین قدوائی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، عبدالمجید سالک، مفتی کفایت اللہ، حسین احمد مدنی وغیرہ بھی اس تحریک میں فعال حصہ لیتے رہے۔ ان میں سے اکثر سیاسی اور قومی رہنما تھے اور بعض نے اپنی تحریروں کے ذریعہ بھی اپنی جدوجہد کو مزید مؤثر بنایا۔ ان میں بعض مسلم لیگ سے متعلق تھے اور بعض جمعیۃ العلما سے۔ اُنھوں نے ان جماعتوں کی اپنی جدوجہد میں اس مسئلے کو بھی شامل رکھا اور اس کے ذریعہ سے اپنے طور پر تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی۔ علما میں ندوہ اور دیوبند سے متعلق بعض علما کی تحریکِ خلافت میں خدمات کا ایک حد تک ذکر گزشتہ صفحات میں آیا ہے۔ مولانا محمود الحسن اس کے ابتدائی رہنماؤں میں سے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بھی ان کے لیے اوّلین اہمیت کا حامل تھا۔ اتحادِ اسلامی کے زبردست حامی تھے۔ اور اپنی ذاتی کوششوں کے علاوہ اپنے شاگردوں کے ذریعہ باضابطہ اور تحریکی بنیادوں پر ترکوں کی حمایت کے لیے کوشاں رہے۔ اُنھوں نے ریشمی خط کے ذریعے سے دنیا کے مسلمانوں کو اتحادیوں خصوصاً برطانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی، اور ترکی کے سپہ سالار غالب پاشا سے جہاد کا اعلان حاصل کرلیا تھا، جسے برِعظیم بھیج دیا گیا لیکن انگریزوں کی ہوشیاری سے یہ تحریک ناکام رہی۔ ان کے شاگردوں اور دیوبند سے فارغ التحصیل طلبا میں عبیداللہ سندھی بابِ عالی سے روابط پیدا کرنے کی کوشش میں اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ ملک سے باہر تھے۔ ثناءاللہ امرتسری، کثیر التصانیف عالم، شروع ہی سے تحریکِ خلافت سے وابستہ رہے۔[۵۸] اس کے بعد جلسوں میں شریک رہتے، تحریک عدمِ تعاون میں حصہ لیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کے مقاصد کی انجام دہی میں کوشاں رہے۔ اس ضمن میں رسالہ خلافت ان کی تصنیف ہے[۵۹] مولانا حسین احمد مدنی برابر اس کی سرگرمیوں میں شامل رہے، تحریک عدمِ تعاون میں شریک ہوئے۔ اس کے مشہور فتوی پر دستخط بھی کیے۔[۶۰] خلافت کانفرنس کراچی کے جلسہ میں تقریر کی بنا پر گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھیوں میں مفتی کفایت اللہ، مولانا نثار احمد، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمان، مولانا محمد میاں وغیرہ ان کے ساتھ جدوجہد میں شامل رہے۔ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کی کوششوں سے جمعیۃ العلما کی سرگرمیاں بھی خلافت کے حق میں ہوتی رہیں۔ علمائے دیوبند کے

دوسرے گروہ میں خود مولانا اشرف علی تھانوی اس تحریک کے پرجوش حامی تھے لیکن اس تحریک میں ہندوؤں کی شمولیت کو پسند نہیں کرتے تھے[61] اور تحریک ترکِ موالات کے مخالف رہے۔ اس بارے میں فتویٰ بھی دیا۔[62] یہی خیالات مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھی تھے لیکن اُنھوں نے تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات میں عملی اور فعال حصہ لیا۔

تحریکِ خلافت کے دوران اس مسئلہ پر اُردو میں بڑا وقیع ادب تخلیق کیا گیا۔ القاسم، الندوہ، معارف، الجمعیة، ہمدرد، زمیندار، الہلال، مخزن، عالمگیر، نیرنگِ خیال وغیرہ میں عام طور پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ اور خود خلافت کمیٹی کا جاری کیا ہوا خلافت (بمبئی) اس مقصد کے لیے وقف رہا۔ شاعری کا ایک معتدبہ حصہ خلافت کے جذبات پر مبنی ہے۔ اس کے مختلف جلسوں میں خطبات دیے گئے، وہ تقریباً سب اسی دوران طبع ہوئے۔ بحیثیت مجموعی اس دوران تخلیق ہونے والا ادب آیندہ صفحات کا موضوع ہے۔ اس نے مسلمانوں میں ایک عالمگیر اسلامی اخوت کا احساس مضبوط کیا کہ وہ ہندوستانی ہوتے ہوئے ہندوستان کے غیر مسلموں کے مقابلہ میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے زیادہ گہرے دینی رشتے میں جڑے ہوئے ہیں۔ وہ پہلے مسلمان ہیں پھر کہیں ہندوستانی۔

تحریکِ خلافت کو بڑے مدوجزر دیکھنے پڑے تھے۔ چناں چہ وہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ معاہدۂ سیورے اور معاہدہ لوزان کے بعد ترکی کی وہ حیثیت نہیں رہی تھی کہ خلافت کے عالمگیر منصب کا بار اٹھا سکے۔ برِعظیم کے مسلمانوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی کے نئے دور کا خیر مقدم کیا تھا لیکن مصطفیٰ کمال کو اتحادِ اسلامی پر اعتماد نہیں تھا چناں چہ جب قوم پرست افواج قسطنطنیہ پر قابض ہوئیں تو سلطنت منسوخ کر دی گئی اور پھر ۱۹۲۴ء میں خلافت بھی منسوخ کر دی گئی۔ اس کے باوجود جزیرة العرب سے غیر مسلم غلبہ اور تسلط کا اخراج خلافت کمیٹی کا محرک رہا[63] لیکن حجاز پر سعودی حملہ کے بعد پیش آنے والے واقعات[64] نے خلافت کمیٹی کے کرنے کے لیے کوئی کام نہ چھوڑا۔ ۱۹۲۵ء میں اعلان کیا گیا کہ خلافت کمیٹی مسلمانوں کی بھلائی کے لیے کام کرے گی[65] اپنی ناکامی کے باوجود اس تحریک نے برِعظیم کے مسلمانوں اور ان کی تحریک آزادی کو بہت کچھ دیا[66] اس تحریک کے دوران مسلمانوں کے جوش وخروش نے برِعظیم کی سیاسی جدوجہد میں ایک نئی زندگی دوڑا دی۔[67] اس سے برِعظیم کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت مضبوط ہوا۔ اُردو زبان دور دراز علاقوں میں استعمال کی جانے لگی اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں نے خود پر اعتماد کرنا سیکھا اور ان کے

ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنی جدوجہد اب ان مقاصد کے لیے کی جائے جن پر فیصلہ کا اختیار خود کو ہو۔ اور اب اُنھوں نے اس خیال کو ترک کر دیا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا برطانیہ کے بھروسہ ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ عددی اعتبار سے وہ اب ایک سیاسی اقلیت تھے۔ فطری طور پر ان کو آزادی کی جدوجہد میں اپنا مخصوص موقف مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

(۴) تحریک آزادی

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس نے مسلمانوں کے جذبات کو جو پہلے ہی اتحاد اسلامی کے خیال سے موجزن اور اپنے زعما کی خطابت شاعری کے سبب متہیج تھے اور زیادہ مشتعل کر دیا تھا۔ اب یہی فضا پورے برِ عظیم پر مسلط ہوگئی کہ ہر قیمت پر پہلے انگریزوں کو نکالا جائے۔ چناں چہ مسلمان اور ہندو مل کر پوری قوت سے اس جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ خلافت کمیٹی جو اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ مؤثر اور فعال جماعت ہوگئی تھی، مع جمعیۃ العلمائے ہند، انگریزوں کے اخراج کے لیے کانگریس کی شمولیت میں خود پورے جوش و خروش سے سرگرم عمل تھی۔ تمام قابل ذکر علما اس جدوجہد میں پوری طرح شامل تھے۔ علما کی کوئی الگ سیاست نہ تھی۔ ویسے مولانا محمود الحسن اور ان کی تحریک، جس کا انکشاف ہو چکا تھا، ان کے لیے ایک مثال تھی۔ جمعیت مولانا عبدالباری کی کوششوں سے وجود میں آئی تو اس محاذ کو دینی حیثیت سے تقویت دینے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس کے موقع پر مجلس شوریٰ میں یہ طے پایا تھا کہ مذہبی و سیاسی امور میں علمائے کرام مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کریں اور بالاتفاق یہ امر قرار پایا کہ جمعیت العلمائے ہند قائم کی جائے اور اس کا آیندہ اجلاس مسلم لیگ کے ساتھ امرتسر میں ہو۔ جمعیت کے مستقل صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید منتخب ہوئے۔ امرتسر کے جلسہ کی دعوت مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا داؤد غزنوی نے دی[1] اس کے پہلے اجلاس کی صدارت مولانا عبدالباری نے کی[2] اور دوسرا اجلاس مولانا محمود الحسن کی صدارت میں ہوا۔[3]

اس وقت مسلمانوں کے ذہن پر سب سے زیادہ جو جذبہ حاوی تھا وہ یہی تھا کہ کسی طرح انگریز نکالے جائیں۔ یہ سوال کہ ان کے جانے کے بعد ملک کی حکومت کس نہج پر ہوگی؟ ذہنوں میں مغلوب تھا۔ حالات نے مسلمانوں کے سوچنے کا ڈھنگ بھی کچھ ایسا کر دیا تھا کہ طرز حکومت سے متعلق مسلم یا غیر مسلم حکومت کی اصطلاح میں سوچنے کے بجائے وہ ملکی اور غیر ملکی کی اصطلاح میں سوچنے لگے تھے۔

حالات کا دباؤ کچھ ایسا تھا کہ مولانا محمود الحسن کی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں کا تسلط ختم کرنے کی بجز اس کے کوئی راہ نظر نہ آتی تھی کہ مشترکہ جدوجہد ہو، اور پھر مشترکہ حکومت قائم ہو۔ اس وقت سمجھ لیا گیا تھا کہ ایسی حکومت اس اعتبار سے بہتر ہوگی کہ اوّل تو سارے عالمِ اسلام میں انگریزوں کا زور ٹوٹ جائے گا، دوسرے مسلمانوں میں اتنی جان ہے کہ وہ ہندوؤں سے نمٹ لیں گے۔ اور بہرحال ہندوؤں نے بدعہدی اور دشمنی کی تو وہ اتنے قومی دشمن نہ ثابت ہوں گے جتنے انگریز ہیں۔

مختلف تحریکوں میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل تو کیا لیکن ہندوؤں کی جانب سے کچھ ایسی حرکتیں رونما ہوئیں جن کے سبب اُنھوں نے مشترکہ جدوجہد کا جو تجربہ کیا وہ ناکام ہورہا تھا۔ پھر ہندوؤں کی اس خواہش کے بارے میں بھی مسلمانوں میں قوی شکوک پیدا ہوگئے تھے کہ وہ واقعی انگریزوں کو نکالنا چاہتے تھے[۴] ۱۹۳۶ میں محمد علی جناح نے لیگ کو نئے اور عوامی قالب میں ڈھالنے کا عزم کیا، اس کے لیے فضا ہموار کی۔ مولانا شوکت علی نے علما کے ساتھ تنظیمی دورے کیے[۵] کانگریس سے پھر گفت گوئیں ہوئیں اور ایسا ماحول تیار ہوا کہ باہمی مفاہمت سے انتخابات لڑے جائیں۔ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقائے جمعیت بھی لیگ کی حمایت پر آمادہ ہوئے۔ لیگ اور قائداعظم کی تائید میں تقریریں ہوئیں لیکن جب انتخابات میں کانگریس کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی تو اس نے لیگ سے مفاہمت یا اس کے وجود کو تسلیم کرنے ہی سے گریز شروع کردیا۔ اور ایسی شرائط پیش کیں جو لیگ کے لیے قابلِ قبول نہ ہوسکتی تھیں[۶] چناں چہ لیگ کانگریس مشترکہ وزارت کے امکانات ختم ہوگئے۔ کانگریس کے ساتھ ہی مولانا حسین احمد مدنی معہ اپنے رفقا کے لیگ کی حمایت سے کنارہ کش ہوگئے[۷] چوں کہ یہ افراد جمعیت کے سرکردہ تھے اور انھیں کانگریس کے وسائل حاصل ہوگئے تھے اس لیے ان کا پورا محاذ لیگ کی مخالفت میں سرگرم ہوگیا اور اس تحریک کو جو قومیت کی بنیاد پر شروع ہوئی تھی، اب ہندوستانی قومیت کے تصور کی تاویلات کے زیرِ اثر آنا پڑا۔ اور یہی جمعیت کا سرکاری مؤقف بن گیا۔

قوم پرست علما کی بڑی کوششیں کانگریس اور ہندوؤں سے اتحاد کے حق میں رہیں[۸] مولانا ابوالکلام نے تحریکِ خلافت میں کانگریس کی شرکت کے ''نمونۂ اتحاد'' کو متحدہ قومیت کے تصور میں اخذ کرلیا تھا۔ الہلال، البلاغ اور تحریکِ خلافت کی شخصیت ابوالکلام کو اب کسی اور سیاسی میدان کا فرد ظاہر کرتی ہے۔ اس کے بعد کی شخصیت جو اتحادِ اسلامی کی علم بردار تھی، متحدہ قومیت اور کانگریسی لادینی

نظریہ سیاست کی منبع ہے[9] گاندھی سے بہت متاثر تھے۔ مستقل کانگریسی تحریکوں میں شامل رہے۔ اس کے اہم ارکان میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے[10] آزادی کی تحریکوں میں شرکت کی بنا پر متعدد بار گرفتار ہوئے۔ تقسیم ملک اور پاکستان کے شدید مخالف تھے[11] متعدد مواقع پر کانگریس کی حکمت عملی پر اثر انداز ہوئے۔[12]

ابوالکلام کے تصورات کی دینی تشریح کا کام حسین احمد مدنی نے انجام دیا تھا۔ اور یہی جمعیت العلمائے ہند کا مقصد و مدعا بن گیا۔ جب اس کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس کے مقاصد میں غیر مسلم برادان کے ساتھ ہمدردی اور اتفاق کے امور شامل کیے گئے تھے[13] چناں چہ اس کے کارکن ایک طرف تو ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد کرتے تھے اور دوسری طرف وہ کانگریس کے ملک کی ترقی کے کاموں میں پورے اعتماد عمل کا ثبوت دیتے تھے۔ اس کے اجلاس ۲ جنوری ۱۹۲۴ء میں جو تجاویز منظور ہوئی تھیں ان میں ایک طرف بلووں میں ہندوؤں کی زیادتیوں کی شکایت تھی تو دوسرے طرف ان سے سمجھوتے کے لیے قرارداد منظور کی گئی تھی[14] لیکن ۱۹۲۶ء کے اجلاس کے دوران، جس کی صدارت سیّد سلیمان ندوی نے کی تھی، ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے جمعیت اور کانگریس کا اتحاد عمل نہ رہا تھا۔ اس میں جو تجویز منظور کی گئی اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوؤں کے مخالفانہ طرزِ عمل کی بنا پر مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بَل پر ملک کو آزاد کرائیں[15] اور اس کے اگلے اجلاس بصدارت مولانا سیّد انور شاہ کشمیری میں محمد علی جناح کے چودہ نکات کی تائید کی گئی تھی[16] اور نہرو رپورٹ کو نامنظور قرار دیا تھا[17] برِعظیم میں مسلمانوں کے بہتر مستقبل کے لیے کامل آزادی اس کا مطالبہ رہا[18] چناں چہ جب کانگریس نے کامل آزادی کا اعلان کر دیا اور نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تو جمعیت نے کانگریس سے دوبارہ اشتراک کر لیا[19] اشتراک عمل کے بعد کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا گیا اور ۱۹۳۱ء کے سہارن پور کے اجلاس میں ''مخلوط انتخاب'' کی قرارداد کو بھی منظور کر لیا۔[20]

یہ حقیقت ہے کہ جمعیت کو جو حیثیت بھی حاصل رہی، اس میں کانگریس کا بڑا دخل رہا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان یہ زیادہ سرگرم نہیں رہی۔ اس عرصہ میں اس کا جو اثر تھا، وہ محض دہلی اور صوبہ متحدہ تک محدود رہا[21] ۱۹۳۷ء تک تو یہ جداگانہ انتخاب کی حامی اور سندھ کو علاحدہ صوبہ بنانے کے بھی حق میں تھی[22] قرارداد پاکستان کے بعد سے یہ مستقل پاکستان کی مخالفت کرتی رہی۔ جمعیت کی نیابت میں ''آزاد مسلم کانفرنس'' منعقدہ اپریل ۱۹۴۰ء نے متحدہ قومیت کی تحریک کو مزید ابھارنے کی کوشش

کی[۲۳] لیکن وہ عام مسلمانوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کی پیش کش کے لیے جواب میں فوری مکمل آزادی کے لیے کانگریس کی ہمنوائی اختیار کی اور صوبوں کی مکمل خودمختاری کا مطالبہ کیا[۲۴] جمعیت کے تمام فیصلوں کا بڑی حد تک اختیار مولانا حسین احمد مدنی اور پھر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید کو رہا، جو اس کے مختلف عہدوں پر نامزد رہے۔ ان کا جو مطمح نظر رہا وہی اس سے قریب تر دوسرے علما کا بھی رہا۔

مولانا عبیداللہ سندھی، جو ۱۹۳۹ء میں حجاز سے ہندوستان واپس آئے تھے، اپنے خطبات میں اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے تھے کہ وہ تمام مذاہب و ملت کے ہندوستانیوں کو ایک نظام میں متحد ہوکر اجنبی تسلط کے خلاف جدوجہد کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کو صرف کانگریس نکال سکتی ہے۔ جب تک وہ حیات رہے جمعیت اور کانگریس کے نصب العین کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی۔ اور جمعیت کے لیے اپنا طریق کار وضع کیا[۲۵] وہ ''جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی'' کے نام سے ایک نئی جماعت تشکیل دینا چاہتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ عدم تشدد کی پابندی کے ساتھ کامل آزادی حاصل کی جاسکے[۲۶] اُنھوں نے ۱۹۲۲ء میں آزاد ہندوستان کے لیے ایک سیاسی منصوبہ بھی تیار کیا تھا[۲۷] جس میں وہ وحدانی یا مرکزی حکومت کے بجائے برِ عظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعہ متحد رکھنا چاہتے تھے۔

علمائے دیوبند نے جس نظریۂ قومیت کو اخذ کیا تھا، دوسری جماعتوں کے بیشتر علما بھی اسی نظریے کے حامی تھے۔ ''مجلس احرار'' اپنے نظریاتی اور سیاسی مطمح نظر کے اعتبار سے جمعیت سے قریب تر تھی۔ یہ تحریکِ خلافت کے دوران، اختلاف رائے کی بنیاد پر پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان کی کوششوں سے ۱۹۲۹ء میں چودھری افضل حق کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے قیام میں ابوالکلام آزاد کی مشیت اور تائید دونوں شامل تھے[۲۸] ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک یہ جماعت مسلسل ہنگاموں اور تحریکوں میں الجھی رہی۔ اس کے پہلے صدر سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ ان کے ساتھیوں میں مولانا داؤد غزنوی، مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی، چودھری افضل حق، مولانا اظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، اس مجلس میں فعال رہے۔ یہ جماعت سیاسی امور میں کانگریس کے دوش بدوش سرگرم عمل رہی[۲۹] اور مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی ترغیب دینے اور انھیں اس کا رکن بنانے کو مدِ نظر رکھا[۳۰] سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن اس کے پرزور خطیب تھے۔ اس سلسلے میں انھیں سزا بھی برداشت کرنی پڑی۔

تحریر میں یہی کام چودھری افضل حق نے کیا۔ پہلے پولیس میں ملازم تھے لیکن تحریک ترکِ موالات کے دوران مستعفی ہوکر قومی تحریکوں میں حصہ لینے لگے تھے[۳۱] عطاء اللہ شاہ بخاری متحدہ قومیت کے حامی علمائے دیوبند سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ انھیں مولانا انور شاہ کی تحریک پر امیرِ شریعت چنا گیا تھا[۳۲] قراردادِ پاکستان کے بعد اس مجلس نے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت اور مسلم لیگ سے علاحدگی کی ترغیب دی۔[۳۳]

خدائی خدمت گار، جس کے بانی خان عبدالغفار خان تھے، اس سے متعلقہ علما بھی پورے طور پر کانگریسی نظریہ قومیت کے حامل تھے[۳۴] اُنھوں نے ہر موقع پر کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا[۳۵] شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، جس کا مقصد مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ تھا۔ مسلم لیگ کی مخالف رہی[۳۶] متحدہ قومیت کے نظریہ پر اس کا یقین تھا اور وہ کانگریس کے حق میں رہی۔[۳۷]

یہ بات اپنی جگہ حقیقت رکھتی ہے کہ تحریک آزادی کے آخری مراحل میں علما کی اکثریت ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھی لیکن عوام کی اکثریت بالقوۃ لیگ کی حامی تھی[۳۸] اور ۱۹۴۶ء کے انتخابی نتائج ظاہر کر رہے تھے کہ یہ حمایت قوت سے فعل میں آ رہی ہے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ صرف لیگ ہی ان کے مخصوص اور مستقل حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔ قوم پرست مسلم جماعتوں اور ان سے متعلقہ علما کے جو کچھ بھی خیالات ہوں۔[۳۹] ایک اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔[۴۰]

(۵) تحریک پاکستان

قوم پرست علما کی تحریک کے سارے دور میں ممتاز علما کی صف میں مولانا اشرف علی تھانوی ایسے نمایندہ بزرگ تھے جنھوں نے ہندوؤں اور کانگریس کے ساتھ اس مشترکہ جدوجہد میں شرکت سے انکار کیا اور اسے مسلمانوں کے حق میں بہتر نہیں سمجھا۔ اُنھوں نے عملاً سیاست اور اجتماعی جدوجہد میں شرکت نہیں کی لیکن دینی اور روحانی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی امور پر بھی قوم کو مشورے دیتے رہے۔ ان علما میں آپ نمایاں امتیاز رکھتے تھے جنھوں نے دوقومی نظریے کی حمایت پر زور دیا، تقسیم ہند کا مطالبہ کیا اور پاکستان کی بھرپور تائید کی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے زیرِ اثر علما کی ایک بڑی تعداد نے تحریک پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ خود علمائے دیوبند میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے علما کی کوششوں سے تحریک پاکستان کو موثر تائید حاصل ہوئی۔

جب ہندوؤں کی جانب سے شُدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوئیں، راشٹریہ سیوک سنگھ قائم ہوئی، نہرو رپورٹ منظر عام پر آئی تو بیشتر مسلم زعما ہندوؤں کے اس طرز فکر سے مایوس ہو کر کانگریس اور اس کی تحریک سے کنارہ کش ہو گئے۔ جمعیت العلمائے ہند کے جلسوں میں بھی اس امر پر اختلاف ہونے لگے کہ کانگریس کا ساتھ غیر مشروط طور پر دینا چاہیے یا نہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ان افراد میں تھے جنھوں نے غیر مشروط تعاون کی سختی سے مخالفت کی۔ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے دیگر رفقا اپنے طریق فکر پر قائم رہے۔ نتیجتاً بہت سے علمائے جمعیت سے بددل ہو کر علاحدہ ہو گئے۔ اور جو لوگ جمعیت میں موجود رہے، کانگریسی وسائل کے ذریعہ وہ اس تنظیم کو تمام علمائے ہند کی نمایندہ تنظیم اور اس کی حکمت عملی کو تمام علمائے ہند کی حکمت علمی کی حیثیت سے اپنے مخصوص سیاسی نقطۂ نظر کو جمہور علما کے متفقہ مسلک کے انداز میں ملک کے سامنے پیش کرتے رہے۔

جو علما دو قومی نظریہ کے حامی تھے، بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود منظم نہ تھے[1] وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مسلم لیگ کے مؤقف کی تائید کرتے رہے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے بزرگ دارالعلوم دیوبند سے متعلق تھے۔ چناں چہ اسی بنا پر دارالعلوم میں نزاع شروع ہوا، جس کے نتیجہ میں ان حضرات نے اپنے بعض دیگر رفقا کے ساتھ دارالعلوم سے علاحدگی اختیار کر لی۔ مفتی محمد شفیع نے مولانا تھانوی کے ایما پر کانگریس کی مخالفت اور لیگ کی حمایت میں فتویٰ مرتب کیا، جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اسی زمانہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے دینی یا نظریاتی قومیت کے بجائے وطنی قومیت کی تبلیغ شروع کی۔ جب ان کی کتاب متحدہ قومیت اور اسلام شائع ہوئی تو نظریۂ قومیت علما میں پوری شدت کے ساتھ زیر بحث آیا۔ علامہ اقبال نے وطنی قومیت کے نظریہ کی بڑی مدلل اور پُر زور، مخالفت کی[2] ان کا یہ اختلاف اس قطعہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

عجم ہنوز نداند رموز دین ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر زمقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است[3]

اسلامی فکر کی تشکیل جدید اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وقت کے علمی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی مسائل کے بارے میں اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار متعدد نظموں، مضامین، تقاریر، بیانات اور خطوط کے ذریعہ کیا، جس کا بیشتر حصہ انگریزی میں

ہے۔[۴] نظریۂ قومیت پر مختلف اخبارات و رسائل میں مستقل مباحثے ہوتے رہے، رسالے مرتب ہوئے۔ اسی موضوع پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے مسئلہ قومیت کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تحریر کیا جو اپنے دلائل کی محکمی، زورِ استدلال اور زورِ بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مؤثر ہوا۔[۵] اس سلسلۂ مضامین نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی میں اسلامی تصورِ قومیت کو ایک دینی عقیدہ اور سیاسی مطمحِ نظر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی وہ تحریریں بھی جو ان کی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش میں شامل ہیں، اسلام میں متحدہ قومیت کے تصور کے خلاف بہترین جدید استدلال فراہم کرتی ہیں۔[۶] اسی قسم کی ایک اور کوشش ادارہ طلوعِ اسلام، دہلی کی جانب سے ہوئی۔ اور رازی کے تحریر کردہ واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان، سوراجی اسلام اور متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب نامی کتابچوں میں کانگریسی نظریہ قومیت کی مدلل تردید کی گئی، خاص طور پر ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

اس بحث سے یہ فائدہ ہوا کہ متحدہ قومیت کے نظریہ پر ضرب پڑی اور مسلمانوں کا جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ اور دوسرے یہ بحث محض ایک نظری بحث نہ رہی بلکہ اس کی زد کانگریس اور جمعیت کے پورے مؤقف پر پڑی۔ اس بحث میں غیر کانگریسی علما کی شرکت اسلامی محاذ کو مضبوط بنانے میں ممد ثابت ہوئی۔ خود مسلم لیگ نے اس امر کی کوشش کی کہ اس بحث کا مذہبی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے تاکہ عوام کانگریس کے نصب العین کو سمجھ سکیں، اور اپنے قومی تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ۱۹۳۹ء میں لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہر مقام پر علما سے کانگریس کے ساتھ تعاون کے نقصانات پر فتوے لیے جائیں اور ان کو مسلم لیگ کے اہتمام سے شائع کیا جائے۔

مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی قرارداد ۱۹۴۰ء تک علما اپنے مخصوص طرزِ فکر کی حکومت قائم کرنے کی ضرورت پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے اور حالات کے تقاضے سے طور پر ان کے عزائم سامنے آ گئے تھے۔ ان میں یہ رجحان راسخ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو ہر قسم کے غیر اسلامی اثرات سے خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، بچ کر خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے حکومت کے اختیارات ہونے چاہییں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی اپنی ''ریاست کے اندر ریاست'' یا ''جداگانہ ریاست'' ہو۔ اس نقطۂ نظر کے سب سے ممتاز علم بردار مولانا مودودی تھے۔[۷] مولانا مودودی کا اثر ایک تو

چھوٹی سی جماعت تک محدود تھا، لیکن ''متوافق قوموں کی ریاست میں مسلمانوں کی تہذیبی خود اختیاری'' یا ''جداگانہ مسلم قومیت'' کا شعور جو عام طور پر ''حکومت الٰہیہ'' کے نام سے مشہور ہوا، مذہبی خیال کے مسلمانوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے[9] اس کے علاوہ علامہ اقبال نے ایک ''آزاد مسلم ہندوستان'' کا تصور پیش کیا اور چودھری افضل حق نے ''اسلامی حکومت'' کا مطالبہ کیا۔ مولانا آزاد سبحانی نے ''خلافت ربانی'' کا خیال پیش کیا۔ اسلامی حکومت کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ خود یوپی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں جید علما اور مفکر پر مشتمل اسلامی نظام حکومت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے ایک مجلس تشکیل دی، اس میں سیّد سلیمان ندوی، مولانا مودودی، عبدالماجد دریابادی، مولانا آزاد سبحانی، وغیرہ شامل تھے[9] اپریل ۱۹۴۲ء میں لیگ کی کونسل میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ حکومت قرآن وسنت کی بنیاد پر قائم ہوگی[10] اس اعلان کے بعد ایک تو وہ علما جو کانگریس سے بددل ہوکر گوشہ نشین ہوگئے تھے، اب بڑی تعداد میں لیگ کی حمایت کرنے لگے۔ اور اُنھوں نے تحریک پاکستان میں پورا پورا حصہ لیا۔ اور اس کی تقویت کا باعث ہوئے اور دوسرے اس زمانہ میں اس خیال کے تحت کہ علما پوری قوت کے ساتھ تحریک میں شرکت کریں تاکہ اسے وہ قوت محرکہ مل جائے جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی، علما کو تحریک سے وابستہ کرنے کی کوششیں بڑے پیمانے پر ہوئیں۔ علما سے گفت گوئیں ہوئیں مذاکرات ہوئے اور انھیں تحریک میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس طرح پورے برِعظیم میں علما کی ایک بڑی جمعیت کا تعاون لیگ کو حاصل ہوگیا[11] بعض علما کی رائے کے مطابق علما کی ایک علاحدہ تنظیم کے قیام کو ضروری سمجھا گیا تاکہ اس تنظیم کے ذریعہ تحریک پاکستان کی حمایت کی جائے۔ اور ان علما کا تعاون حاصل کیا جائے جو لیگ میں باضابطہ شمولیت سے احتراز کرتے ہیں۔ یہ زیادہ قابل عمل اور موثر تجویز تھی۔ چناں چہ ۲۶ تا ۲۹ /اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ میں علما کے ایک بڑے اجتماع میں، جس میں برِعظیم کے دور دراز علاقوں اور ہر مکتبۂ فکر کے علما موجود تھے، جمعیت العلمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بہت بڑے محرک مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ انھیں کو جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا[12] اس کے پہلے ہی اجلاس نے اپنی قرارداد میں پاکستان کے موقف کی پرزور حمایت کی[13] بہت جلد اس کی صوبائی، ضلعی اور مقامی تنظیمیں قائم ہوئیں۔

جمعیت العلمائے اسلام کا قیام پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ اس کی جدوجہد سے پاکستان کے لیے فضا بڑی تیزی سے سازگار ہوئی، اس کے قیام کے وقت پاکستان بننے

یا نہ بننے کے متعلق فیصلہ کن انتخابات بھی قریب آ رہے تھے، جمعیت العلمائے ہند اپنی تمام توانائیاں کانگریس کے حق میں صرف کر رہی تھی۔ جمعیت العلمائے اسلام کے اراکین نے کانگریسی علما کا پورا پورا جواب دیا۔ علما نے جمعیت اور مسلم لیگ دونوں کے ذریعہ پاکستان کی پرزور حمایت کی اور تحریک کو تقویت پہنچائی۔ علما کا ایک طبقہ پہلے ہی لیگ سے وابستہ رہا تھا۔ ان میں مولانا عبدالماجد بدایونی اور جمال میاں فرنگی محلی جیسے علما شامل تھے۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان کے وسیع اثرات تھے، جو کانگریس کے مؤید تھے۔ پیر مانکی شریف کے قائداعظم سے مذاکرات اور مراسلات کے بعد، لیگ کے حامی ہو جانے سے مسلم لیگ کو صوبہ سرحد میں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ پیر زکوڑی شریف بھی شامل ہو گئے۔ ان کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقا کا دورہ، تقریریں صوبہ سرحد میں لیگ کی نمایاں کامیابی کا سبب بنیں، جو پاکستان کی تشکیل کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ یہی کچھ سلہٹ کی رائے شماری میں پیش آیا۔ اس علاقہ میں مولانا حسین احمد مدنی کے خصوصی اثرات تھے۔ یہاں ظفر احمد عثمانی نے اپنے رفقا کے ساتھ لیگ کی کامیابی کے لیے جدوجہد کی۔ وہاں بھی رائے شماری میں لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مفتی محمد شفیع جو اس دوران جمعیت میں شامل ہو چکے تھے۔ تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ انھوں نے اواخر ۱۹۴۶ء میں جمعیت کی صوبائی کانفرنس منعقدہ حیدرآباد سندھ کی صدارت کی۔

برعظیم میں جگہ جگہ جمعیت کی طرف سے جلسوں اور کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دور دراز مقامات پر اس کے زعما دورے کر رہے تھے، ملک کی تمام سیاسی فضا پر ان کا اثر بڑا گہرا تھا۔ علما کی شرکت سے تمام مسلم عوام، جن پر ہمیشہ علما کا اثر رہتا تھا، تحریک پاکستان کے ہمنوا بن گئے۔ نظریہ پاکستان زیادہ وضاحت سے منظرِ عام پر آیا۔ اور ساتھ ہی علما کی ایک بڑی تعداد کانگریس اور جمعیت العلمائے ہند سے کنارہ کش ہو کر مسلم لیگ اور جمعیت سے وابستہ ہونے لگی[14] تو قوم پرست علما کا اثر بڑی حد تک زائل ہو گیا اور تحریک پاکستان کو خاصی تقویت پہنچی۔ اسے مسلمانوں میں مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔

جمعیت العلمائے اسلام کے علاوہ علما کا ایک اور مکتب فکر بھی مسلم لیگ اور پاکستان کا مؤید تھا۔ اس گروہ کی قیادت مولانا احمد رضا خان بریلوی کر رہے تھے۔ یہ بھی سیاست میں ہندو مسلم تعاون و اشتراک کے مخالف تھے۔ ترک موالات کے لیے فتوے پر اسی بنا پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا[15]

اور اپنے نظریہ کے مطابق خود ایک فتویٰ جاری کیا۔ تحریک آزادی کے حامی تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے بعد اس مکتب فکر کی رہنمائی مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے کی۔ یہ بھی اس خیال کے حامی تھے کہ جمعیت العلمائے ہند کا موقف غلط ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کا حل یہ ہے کہ ان کی علاحدہ مملکت ہو۔[16] علما کا یہ گروہ تحریک پاکستان کے دنوں میں بہت فعال رہا۔ کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت بڑی سرگرمی سے کی۔

خاکسار تحریک علامہ مشرقی کی قیادت میں ایک نیم عسکری تنظیم تھی۔ اس کا کامل آزادی پر یقین تھا۔ اپنی جدوجہد میں تنہا رہی۔ مسلم لیگ یا کانگریس کسی کے ساتھ اشتراک نہیں کیا[17] پھر بھی کانگریس سے منحرف رہی[18] اور اس سے متعلق افراد صرف مسلم لیگ میں شرکت کی بات سوچ سکتے تھے[19] یہ بظاہر غیر سیاسی تحریک تھی لیکن دوسری طرف اس کا نعرہ تھا کہ خدمتِ خلق کے ذریعہ ہی اسلامی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔[20] اس کی ابتدا ۱۹۲۴ء میں ہوئی تھی لیکن ۱۹۳۷ء کے بعد سے فعال ہوئی[21] علامہ مشرقی تجدد پسند عالم تھے۔ ان کے افکار کو عام ذہن نے کبھی قبول نہ کیا لیکن ان کی تحریک کے مقاصد، عمل، حرکت، تنظیم اور جہاد کو کم تعلیم یافتہ افراد میں قبولیت حاصل ہوئی۔[22]

دیگر علما میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی کے قریب رہ چکے تھے۔ تحریکِ خلافت میں سرگرم رہے۔ بعد کی تحریکوں میں مسلم لیگ اور پاکستان کے ہمنوا تھے۔[23] اپنے اخبار الصدق کے ذریعہ اس کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ یوپی مسلم لیگ کی جانب سے اسلامی نظام حکومت کا خاکہ بنانے کے لیے کمیٹی میں نامزد ہوئے۔ مولانا بہادر یار جنگ نام ور اور مثالی خطیب تھے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم سے بڑی عقیدت تھی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کے پُرجوش حامی تھے۔ مسلم لیگ کے انداز پر حیدرآباد دکن میں اتحادالمسلمین کو فعال کیا۔ سارے برِعظیم میں اپنی پُرجوش اور موثر تقریروں اور عملی جدوجہد سے مسلم لیگ اور پاکستان کے موقف کی مقبولیت اور وسعت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ مولانا آزاد سبحانی نے مستقل طور پر تحریک پاکستان کی حمایت کی۔ اپنے علم و فضل اور علمی خدمات کی وجہ سے مسلمانوں میں معروف تھے۔ مسجد کان پور کے حادثہ انہدام کے سلسلے میں کافی شہرت حاصل کی۔ اور مولانا ابوالکلام کی برطرفی کے بعد کلکتہ کی امامتِ عید کے مراحل تک پہنچے[24] تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے دوران مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔[25] تحریکِ خلافت کے دوران مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کیم جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے اس امر پر

زور دیا تھا کہ لیگ کا مقصد محض حصولِ آزادی اور برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہونا چاہیے[۲۶] اسی طرح حسرت موہانی کی پیروی میں نہرو رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے، ڈومنین اسٹیٹس کو غلامی کا ایک دوسرا نام قرار دیتے تھے جسے اسلام سے کسی طرح مطابقت نہیں[۲۷] مولانا عبدالماجد بدایونی تحریکِ خلافت میں سرگرم تھے۔ مولانا نثار احمد کان پوری کے قریبی ساتھی تھے۔ پہلے کانگریس سے متعلق رہے، لیکن اس کے مقاصد سے واقف ہو کر اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تحریک تنظیم کے حامی بن گئے۔[۲۸] ان جیسے علما نے جو جمعیت العلمائے ہند سے منحرف ہو گئے تھے، اسی میں اپنا ایک علاحدہ گروہ جمعیت العلمائے ہند "کان پور" تشکیل دیا اور مولانا محمد علی کو اس کا صدر منتخب کیا تھا[۲۹] بعد میں مولانا عبدالماجد بدایونی مسلم لیگ سے متفق ہو گئے اور اس میں شامل ہو کر مصروف عمل رہے۔ مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابن حسن جارچوی، حافظ کفایت حسین، مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی وغیرہ بھی تحریک پاکستان میں شامل رہے اور اُنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کو اس کے مقاصد کی تکمیل کا موثر ذریعہ بنایا تھا۔

اس تمام عرصہ میں علما کی پوری تحریک مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں فعال رہی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہو چکا تھا۔ مولانا عثمانی میں قیادت کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیگ میں ان کا کافی اثر تھا۔ اس کی مجلس عاملہ میں اور ۱۹۴۶-۱۹۴۷ء کے سارے اجتماعات میں خصوصی دعوت پر شریک کیا جاتا رہا تاکہ تمام معاملات میں ان کے مشوروں سے استفادہ کیا جا سکے۔ اُنھوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ میرٹھ ۱۹۴۵ء کی صدارت بھی کی اور آیندہ انتخابات کی اہمیت بھی ظاہر کی۔ اپنے دیگر خطبات اور بیانات میں اُنھوں نے نظریۂ پاکستان کو بالوضاحت بیان کیا۔ بالآخر عوام کے درمیان علما کی اس جدوجہد سے پاکستان ایک تاریخی حقیقت کے طور پر ظاہر ہوا۔

❁ ❁ ❁ ❁

۴- جدوجہد آزادی کے شعرا

(ا) علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک سے قبل اُردو شاعری میں اجتہاد کی نئی تحریک ''انجمن پنجاب'' کے ذریعہ شروع ہو چکی تھی۔ جس نے سیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ لاہور میں، جہاں انگریزی عملداری مستحکم بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی، محکمہ تعلیم کے ''ورنیکلر'' نصابات کے لیے انگریزی طرز پر کچھ نئی نظموں کو فراہم کرنے کے مقصد نے جدید اُردو شاعری کی تحریک میں بنیاد کا کام دیا[1] دنیز ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لائٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور میجر فلر، ناظم سررشتہ تعلیمات پنجاب کی رہنمائی میں ''انجمن اشاعت علوم مفیدہ'' معروف بہ ''انجمن پنجاب'' قائم ہوئی۔ اس انجمن نے نئی تہذیب اور نئے علوم کی اشاعت کے لیے اخبار اور رسالے شائع کیے۔ ادب کی ترقی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کی غرض سے مذاکروں اور مقالوں کی مجالس کا اہتمام کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نئے طرز کا مشاعرہ منعقد کر کے اُردو شاعری میں اہم انقلاب برپا کیا[2] جدید شاعری کا آغاز ہالرائڈ کی کوششوں سے عمل میں آیا جو ۱۸۶۸ء میں مستقل طور پر پنجاب کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے تھے[3] اور انجمن پنجاب کے سرپرست رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد اس کے معمار تھے۔ اس وقت تک ان کی ادبی شہرت عام ہو چکی تھی۔ وہ مشاعرے، جن کا مقصد نصابات کے لیے نظمیں مہیا کرنا تھا۔ آزاد کی ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے اُردو شاعری کے لیے نیک فال ثابت ہوئے[4] اُنھوں نے انجمن پنجاب کے جلسہ منعقدہ ۱۵راگست ۱۸۶۷ء کو ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات''[5] اور پھر اپریل ۱۸۷۴ء میں اسی قسم کا خطبہ دیا[6] ان خطبوں میں آزاد نے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر اُردو شاعری کا محاسبہ کیا گو کہ ان کی شعری تنقید میں زیادہ گہرائی نہیں، پھر بھی اس نے جدید اُردو شاعری کی تحریک میں بنیاد کا کام دیا۔

اُردو شاعری کی اصلاح کی تحریک فی الحقیقت شاعری کو مقصدیت کی طرف لے جانے کی ابتدائی کوشش ہے، انجمن پنجاب کے ذریعہ آزاد کو یہ موقع میسر آیا تھا۔[7] ان کے ساتھ اس تحریک میں

حالی بھی دوش بدوش سرگرم تھے۔ آزاد تو یہ چاہتے تھے کہ اُردو شاعری انگریزی شاعری کی تقلید کرے اور اُردو میں انگریزی کی طرح با مقصد، مفید اور معیاری ادب کی تخلیق ہو۔ حالی نے آزاد سے بڑھ کر اُردو شعر و ادب کو انگریزی ادب کی تقلید پر آمادہ کرنے کے علاوہ مسلمانوں کی خراب و خستہ حالت کی طرف بھی توجہ دی۔ اُنھوں نے، جب تک لاہور میں رہے، مشاعروں میں چار نظمیں پڑھیں[۸] اور پھر دہلی چلے گئے۔ آزاد کی طرح حالی کی شہرتِ شاعری نے بھی اس تحریک کو وسعت دینے میں بڑی مدد دی۔ انجمن پنجاب سے ہٹ کر حالی نے زمانہ کے بدلتے ہوئے ہمہ گیر رجحانات کے احساس کو حیاتِ سعدی میں پیش کیا۔ اور ان کا مسدس اور مقدمہ ان کی جانب سے اُردو شاعری میں اجتہادِ شعری کا نقطۂ عروج تھا۔ ان کی یہ کوششیں عصر اصلاح کے تقاضوں کی آئینہ دار تھیں۔ حالی کو انقلاب زمانہ کا پورا پورا احساس تھا۔ سیّد احمد خان سے جو اثر اُنھوں نے قبول کیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ جس طرح زندگی کی دوسری قدروں میں اصلاحی میلانات کارفرما تھے اسی طرح شاعری کی اصلاح کا عزم کریں۔ اس کی اصلاح سے دیگر اصلاحی کاوشوں کو تقویت پہنچائی جاسکتی تھی۔ ان کا یہ خیال راسخ تھا کہ جو شخص شاعری کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا، ممکن نہیں کہ اس سے معاشرے کو کچھ فائدہ نہ پہنچے۔[۹] قومی اخلاق اور قومی مذاق پر غزل کے ہمہ گیر اثرات سے متاثر ہو کر اُنھوں نے غزل کی اصلاح کی طرف اپنی پوری توجہ صرف کی۔ وہ غزل کے موضوعات کو زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کے مطابق بنادینے کے لیے کوشاں رہے۔[۱۰] وہ جانتے تھے کہ شاعری اگر عمدہ اصولوں پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچاتی ہے۔[۱۱] اُردو شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہو گئی تھی، اس کی اصلاح کے طریقے بتانے کے لیے وہ ایک لمبا چوڑا مضمون لکھنا چاہتے تھے۔[۱۲] یہ خیال انھیں ۱۸۸۲ء میں ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں وہ متعدد مشرقی اور مغربی فن شعر و تنقید کے ماخذوں کے علاوہ سیّد احمد خان کے خیالات سے متاثر تھے۔[۱۳] مقدمہ شعر و شاعری اُردو شاعری کی اصلاح میں حالی کی انتہائی کوشش ہے۔ ان کے پیش نظر نفس اصلاحی دور کے تقاضے ہی نہ تھے بلکہ وہ آنے والے انقلاب آفریں عہد اور ہمہ گیر زمانہ کی جھلک بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی مساعی سے غزل نے اپنے دامن میں سیاسی میلانات کو سمیٹ کر ان کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ نظم نگاری کی تحریک بھی خوب مقبول ہوئی۔ نئی طرز کی نظموں کے علاوہ انگریزی نظموں کے ترجموں کی بھی ابتدا ہوئی۔ جس سال آزاد نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' ظاہر کیے۔ اسی سال اسمٰعیل میرٹھی نے انگریزی نظم کا پہلا ترجمہ کیا۔[۱۴]

اُردو شاعری کی اصلاحی کوششوں اور انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جدید شاعری کو خاصا فروغ دیا۔ اس طرح اُردو شاعری حیات و کائنات کے مسائل کی بھرپور ترجمانی کے قابل ہوسکی۔ شاعری کے موضوعات میں حُبّ الوطنی، محبت و مروت، محنت و کاوش، امن اور انصاف اور اخلاق و معاشرت شامل ہوئے۔ ان میں سب سے اہم حُبّ الوطنی کا تصور تھا۔ جو سیاسی اور قومی پس منظر کا حامل تھا۔ اس دور میں لکھی جانے والی نظموں میں قدیم تصورِ وطن کو محدود، انفرادی اور سطحی قرار دیا گیا۔ یہ خیالات مقتضیاتِ حال کے مطابق تھے۔ قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح جدید شاعری کا بڑا وصف ہے۔ اس دور کے تقاضوں کو نظم کی جدید تحریک نے زیادہ تر بالواسطہ پورا کیا اور اُردو شاعری پہلی مرتبہ اجتماعی تحریکات کی باقاعدہ ترجمان بنی۔ ان سب میں حالی پیش پیش تھے۔ جو لاہور سے جدید نظم کی روایت لے کر دہلی پہنچے اور بالآخر سیّد احمد خان کی تحریک کے ایک موثر، فعال، نام ور رکن بن کر جدید نظم کے ذریعہ اس تحریک کے اصلاحی نظریات کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔ زندگی کے برحق ہونے کا تیقن، عمل اور ترقی کی اہمیت، انسان اور اجتماع کا تمدنی اور معاشی رابطہ اور ان سب سے زیادہ عقل و دانش کی برتری وغیرہ، سیّد احمد خان کے نظریۂ ادب اور فن کے چند اصولی عقائد تھے[15] وہ ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کی تحریروں اور تہذیب الاخلاق کے مجموعی اثر نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانہ کی سیاست اور معاشرت سے مربوط کر کے اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل تجویز کرنا شروع کیا۔

سیّد احمد خان کی تحریک نے جو ادب پیدا کیا وہ کئی لحاظ سے اس ادب سے مختلف ہے جو ان سے پہلے موجود تھا۔ اس دور سے قبل کی شاعری اس منظم اجتماعی معاشرتی احساس کی حامل نہیں جو مثلاً حالی، شبلی کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ سیّد احمد خان سے متاثر افراد کی شاعری میں اجتماعی طور پر محسوس کیے ہوئے جذبات اور سوچے سمجھے افکار پائے جاتے ہیں۔ اور مسائل قومی کا بیان اور ان کا عقلی حل پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے پہلی مرتبہ ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک کے سلسلے میں ادب کی عمرانی، تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اُردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی۔ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا یہ رویہ اور مصنفین میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس علی گڑھ تحریک کے بعد اُردو ادب کی ہر صنف میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے[16] اُردو شاعری کے گزشتہ ادوار کے مقابلہ میں ملکی آزادی اور قومی اصلاح کے جذبات و احساسات زیادہ واضح اور کھل کر ادا کیے گئے۔ اجتماعی شعور کی یہ شکل اس سے

پہلے موجود نہ تھی۔ اس کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوا ہے۔ البتہ ابھی یہ اس تصور سے ذرا مدھم ہے جو سیاسی تحریکات کے زیرِ اثر بعد میں پیدا ہوا۔ سیّد احمد خان کی ہم نوائی میں اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اصلاحی تحریک کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ قومی بھلائی اور خیر خواہی کا جذبہ ہی تھا کہ مقصدی شعر و ادب کے ماتحت منظومات، مقالات، تاریخ و سوانح اور ناولوں کی تخلیق کی گئی۔ شاعری میں حالی زیادہ آگے رہے۔ شبلی نے عصری مسائل اور واقعات کے علاوہ منظوم تاریخ نگاری میں طبع آزمائی کر کے اُردو شاعری میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اسمٰعیل میرٹھی بھی علی گڑھ تحریک سے خاصے متاثر تھے۔ ان کے علاوہ آزاد، نذیر احمد، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی کے قومی کارناموں کو بھی اسی سلسلے میں شمار کیا جا سکتا ہے، یہاں علی گڑھ تحریک سے وابستہ اور منتشر نمایندہ شعرا کے شعری کارناموں میں سیاسی میلانات اور ان کے عام اثرات کا مختصر جائزہ مقصود ہے۔

(الف) الطاف حسین حالی

حالی کی شاعری میں حُبّ الوطنی کا تصور انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں میں پیدا ہو چکا تھا، اور ایک حد تک مسلمانوں کی حالتِ زار کا بیان اور ان کی پسماندگی کے مرثیے علی گڑھ تحریک سے وابستگی سے قبل بھی شروع ہو چکے تھے۔ ایسی نظموں میں وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو وطن اور اہلِ وطن کی محبت اور دوستی اور ہمدردی و خیر خواہی پر ابھارتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی نظموں میں قومی و سیاسی رنگ جھلکتا ہے۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں ۔۔۔ کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا ۔۔۔ وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا
ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد ۔۔۔ نوعِ انسان کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے ۔۔۔ قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو ۔۔۔ قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو ۔۔۔ اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر ۔۔۔ نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد ۔۔۔ شہر میں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

حالی کی ابتدائی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یورپ اور خاص طور پر انگلستان سے کتنے متاثر تھے۔ وطنیت کا جدید تصور انھیں کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ یہ اُردو شاعری کے لیے بھی نئی بات تھی۔ لاہور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد بھی حالی نے اس انداز کی نظمیں تخلیق کیں[1] لاہور کے زمانہ قیام ہی میں وہ سیّد احمد خان سے متاثر تھے۔ وہ دہلی ۱۸۷۴ء کے آخر میں پہنچے تھے[2] اور اُنھوں نے مضمون ''سیّد احمد خان اور ان کے کام'' ۱۸۷۱ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں اُنھوں نے گزٹ کے علاوہ تہذیب الاخلاق میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا اور اسی سال ان کے دل میں سیّد احمد خان کی سوانح مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا[3] ۱۸۷۷ء میں اُنھوں نے سیّد احمد خان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہا[4] ۱۸۷۹ء تک وہ سیّد احمد خان اور ان کے کاموں کی تائید میں کافی لکھ چکے تھے۔[5] اس سال وہ خود علی گڑھ گئے اور سیّد احمد خان کی نصیحت آموز گفت گو سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اسلامی عروج و زوال کی داستان کو نظم کرنے کا ارادہ کیا[6] اسی سال یہ نظم ''مسدس مدو جزر اسلام''، مکمل ہو گئی۔ اس میں بڑے مربوط انداز میں ظہور اسلام، اسلام کی وہ روشنی اور بیداری جو عرب میں پھیلی، اسلام کا عروج، اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظمت و شوکت اور اس کے باقیات الصالحات، ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مغلوبیت، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور ان کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے تجاویز، اس مسدس میں موثر انداز میں نظم ہوئے ہیں۔[7] یہ حالی کا فی الحقیقت ایک عہد آفریں کارنامہ تھا، جس نے سیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک بالخصوص اس کے تعلیمی پہلو کو مسلمانوں میں مقبول عام بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ بلاشبہ اس نظم نے تہذیب الاخلاق کی مجموعی کوششوں سے زیادہ مسلمانوں میں اپنا اثر قائم کیا، اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ تحریک کی کامیابی کے سلسلے میں راہ ہموار کرنا تھا۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قومی زوال کا تجزیہ نہ کیا جاتا اور زوال پذیر طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار نہ ہوتا، اصلاح احوال کی کوئی صورت پیدا ہونی مشکل تھی اور اس کے بغیر مسلمانوں کو عمل کی راہ پر ڈالا نہیں جا سکتا تھا۔ جہاں تک علی گڑھ تحریک کا تعلق ہے، مسدس اس تحریک کی ہمہ گیر مقبولیت اور کامیابی کا زینہ بن گئی۔ ایک خیال کے مطابق جس طرح بنکم چندر چٹر جی کی آنند مٹھ ہندو طرزِ فکر کی نمایندگی کرتی ہے جس میں

بنگالی مسلمانوں کے دورانحطاط کے دوران ہندو قومیت کے تصور نے جس طرح عروج حاصل کیا اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ہندوؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اسی طرح مسدّس اسلامی طرزِ فکر کی نمایندگی کرتی ہے اور یہ ان کے قومی اور ملی شعور کی علامت ہے۔[8] یہ ایک ایسا محرک ہے جس نے اسلام کے اندر جدید عصری مدرسۂ خیال کو تشکیل دینے میں مدد دی[9] حالی نے اس کے ذریعہ اسلام کے ماضی کی تجدید اور مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی کی طرف لوٹنے کی جو دعوت دی۔ اس کا انداز بے حد منفرد تھا اور عام روش سے قطعی مختلف ہے۔[10]

مسدّس کے علاوہ حالی نے جو نظمیں لکھیں ان میں بیشتر اسی موضوع کی ترجمانی کرتی ہیں اور بعض میں قومی اصلاح کے کسی نہ کسی پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس وقت کی صورتِ حال کے پیش نظر سب سے اہم اور فوری مسئلہ مسلمانوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا تھا اور اس مقصد کے لیے انھیں جدید تعلیم کے حصول کی طرف راغب کرنا تھا۔ حالی نے تعلیم اور معاش کی جدوجہد میں مسدّس کے علاوہ جو اہم نظمیں پیش کی ہیں ان میں ''مدرسۃ العلوم علی گڑھ''، ''مسلمانوں کی تعلیم''، ''علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے''، ''ننگ خدمت''، ''فلسفہ ترقی'' وغیرہ علی گڑھ کالج کی اہمیت، اس کی قومی و ملی خدمات، مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں جدید تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور سیّد احمد خان کی کاوشوں کی تعریف اور توصیف شامل ہے۔ معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں حالی نے عورتوں کے حقوق اور مسائل پر بھی بڑی مؤثر نظمیں تحریر کیں۔ مثلاً ''مناجات بیوہ''، ''چپ کی داد'' وغیرہ مسلمانوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں ''ننگ خدمت''، ''دولت اور وقت کا مناظرہ'' وغیرہ ان کی مثالی نظمیں ہیں۔ مسدّس کے علاوہ دوسری نظموں میں بھی اُنھوں نے مشرق کی جہالت اور غفلت پر تأسف کیا ہے اور مغرب کی ترقی کے گن گائے ہیں۔ ''فلسفہ ترقی'' میں اُنھوں نے یہی موضوع بیان کیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کا ایک مقصد بالعموم مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا۔ سیداحمد خان کا حقیقی مطمح نظر ہندوستان میں جداگانہ اسلامی قومیت کی تعمیر ہی تھا۔ لیکن ساتھ ہی ان کی اصلاحی تحریک کی سرگرمیوں اور اس کی اشاعت کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو دوسری قوموں سے جدا اور منفرد تصور کرنے لگیں۔ سیّد احمد خان کی زندگی میں اہم موڑ تو اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب وہ ہندوؤں کی احیائی تحریکوں سے دوچار ہوئے۔ اس کے جواب میں اسلامی تہذیب اور قومیت کے تحفظ کا طرزِ فکر اور طرز

عمل رفتہ رفتہ مسلمانوں کو جداگانہ قومیت کی طرف لا رہا تھا۔ یقینی امر تھا کہ حالی اس نقطہ نظر سے متاثر ہوں۔ ان کے ہاں سب سے پہلے اس کا اظہار مسدس میں ہوا۔ لیکن زیادہ واضح ''شکوۂ ہند'' میں نظر آتا ہے۔ اس نظم میں حالی نے برِ عظیم میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد، یہاں ان کی شان و شوکت لیکن آخر کار موجودہ خستگی کی حالت تک پہنچنے کی سرگزشت مؤثر طریقہ سے منظوم صورت میں بیان کی ہے۔

اس میں جداگانہ قومیت کا احساس اس طرح ظاہر ہوا ہے:

تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادت میں جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو ناآشنا

پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ
وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کردیا بالکل گدا
آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں
خاک میں آخر دیے اے ہند سب تو نے ملا

وہ ہندو مسلم اتحاد کے بروئے کار آنے کی طرف سے بڑی حد تک مایوس معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے آخری دور کی غزل میں اُنھوں نے اپنی مایوسی کا اظہار کیا تھا:

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

حالی کی شاعری کا محور تو زیادہ تر علی گڑھ تحریک تھی۔ لیکن اُنھوں نے سیاسی صورتِ حال پر حقیقت پسندانہ نظر بھی ڈالی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی محکومی و بے بسی کو شدید طور پر محسوس کررہے تھے۔ ''آزادی کی قدر''، ''کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان''، ''قوم کی پاس داری''، ''ہنگامۂ کان پور'' جیسے قطعات اسی احساس کو ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے ایک قطعہ ''تدبیر قیام سلطنت'' میں ہندوستان میں برطانوی حکمتِ عملی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پر بڑی متانت سے طنز کیا ہے۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح وہاں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو

اپنے سیاسی رجحان کا اظہار حالی نے بالواسطہ کے بجائے طنز اور ترغیب کے انداز میں کیا ہے۔ انھیں اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی محکومی کا تلخ احساس تھا، اور وہ اس محکومی کی حالت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ بعض نظموں میں اُنھوں نے اپنے جذبات کو کہیں ہندوستانیوں کو نصیحت کے انداز میں کہیں مشرق ومغرب کے موازنے کی صورت میں اور کہیں علاحدہ قومیت کے تصور کی شکل میں بیان کیا ہے۔

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
تعریف الاشیائے بالاضداد ہے قول حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

کہتے ہیں ہر فرد انسان پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کم زور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر اسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
(قانون)

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آ کر کرامت ہے یہ انگلستان کی
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندوستان بھی

آن کر آزاد یاں آزاد رہ سکتا نہیں

وہ رہے ہوکر غلام اس کی ہوا جس کو لگی

(انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی)

حالی، سیّد احمد خان کے مقابلہ میں کھل کر انگریزوں سے اپنی بدگمانی کو ظاہر کرتے ہیں:

ہے ان کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی

غیر ملکی حکومت سے انھیں آگے بھی کوئی بہتر توقع نہیں تھی:

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص

یاں ہے جلادو مسیحا بخدا ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیوں کر سلامت واعظ

ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

اُنھوں نے بعض مقامات پر بڑی بے باکی سے انگریزوں پر ان کے جرم عیاں کیے ہیں:

پاس انھیں گر اپنا ذرا ہو جان اپنی بھی ان پہ فدا ہو

کرتے ہیں خود ناانصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف

حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف

گر غور سے سنیے غل ہے یہی چار طرف

اِنصاف انصاف آہ انصاف انصاف

ہو چکی قوم مردہ پر جلاد

ابھی دُرے لگائے جاتا ہے

ان کی غزلوں میں بھی، جن میں اُنھوں نے ہر موضوع کا خیال باندھا ہے، سیاسی موضوعات کے اشعار نظر آتے ہیں:

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا

دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا

دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

غزلوں میں پیش کیے گئے خیالات سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی نظر اپنی قوم کی سیاسی بے کسی کے کسی گوشے سے بے خبر نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں سے بھی نظموں کا کام لیا ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں نظم معلوم ہوتی ہیں:

خاور سے باختر تک جن کے نشان تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں

روبہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت
تھی سہم ناک کل تک جو شیر کے بدن میں

نہ گلی چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں ہے یا قزاقی

(ب) شبلی نعمانی

شبلی کا زورِ سخن اُردو کے مقابلہ میں فارسی میں زیادہ تھا۔ ان کے مذاق شعر گوئی کی اصلاح ان کے استاد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے کی[1] ان ہی کی صحبت میں شبلی کی قدامت پسندی کو بڑی تقویت ملی[2] ان کی ابتدائی اُردو شاعری پر زیادہ اثر اودھ پنچ اور پیام یار کا تھا۔ ان میں چھپی ہوئی بعض طویل اُنھوں نے یاد کر رکھی تھیں، اور آخر عمر تک اپنے منتخب شاگردوں اور یاران طریقت کو سنایا کرتے تھے[3] وہ اودھ پنچ کو بڑی دل چسپی سے پڑھا کرتے تھے جس میں سید احمد خان کی اصلاحی تحریک اور حالی کی جدید شاعری کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ یہ اس طبقہ کا ترجمان تھا جس کا خیال تھا کہ ہندوستان بالخصوص لکھنؤ اور اودھ کی ہر ایک چیز بے عیب ہے اور اس میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی گنجایش نہیں[4] شبلی کا ابتدائی اُردو کلام کسی خصوصیت کا حامل نہیں۔ لیکن یہ بات ان کی فارسی شاعری

میں نہیں تھی۔ ان کے وہ اشعار اہم ہیں جو اُنھوں نے ۱۸۷۷ء میں جنگ ترکی و روس کے موقع پر لکھے۔ اس وقت شبلی کی عمر بیس سال تھی اور وہ اسی سال حج سے واپس آئے تھے۔ جہاں اُنھوں نے مقامات مقدسہ کی، جو ابھی سلطان ترکی کے زیر نگین تھے، زیارت کر چکے تھے۔ وہ اس لڑائی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اعظم گڑھ میں ترکوں کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے جو انجمن قائم ہوئی، وہ اس کے سکریٹری تھے۔[۵] اس کے علاوہ اُنھوں نے سلطان عبدالحمید خان کی تعریف میں فارسی اور اُردو میں قصیدے بھی لکھے۔

۱۸۸۱ء میں جب وہ اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے ساتھ، جو سیّد احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے،[۶] اپنے چھوٹے بھائی مہدی حسن سے ملنے کے لیے علی گڑھ گئے، جو وہاں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے، تو ایک عربی قصیدہ سیّد احمد خان کی تعریف میں پیش کیا جو ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا۔[۷] جس وقت شبلی علی گڑھ کالج سے متعلق ہوئے، ان کی نظم و نثر سے شعری اور ادبی خوبیاں عیاں تھیں، لیکن ان کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری عشقیہ غزلوں کے لیے گویا وقف تھی۔ علی گڑھ جانے سے یہ سب کچھ بدل گیا۔ عشقیہ شاعری کی جگہ غزلوں نے لے لی۔ اس لیے کہ علی گڑھ سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہونے اور سیّد احمد خان سے پوری طرح متاثر ہونے کا موقع انھیں یہاں ملا تھا۔ چناں چہ مسلمان کیا تھے، اور کیا ہوں گے؟ یہ احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔[۸] سیّد احمد خان سے ان کی عقیدت اور ان کی تحریک سے ان کا لگاؤ مثنوی صبحِ اُمید میں مؤثر انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ مثنوی ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہان کی — وہ تاج تھی فرق آسمان کی
گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے — ...... کو کنویں جھکا دیے تھے

تنزل کی تفصیلی حالت دکھا کر سیّد احمد خان کی تحریک کا ذکر کیا ہے:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے ایک صدائے جانکاہ
اس شان کی تھی وہ آہ دل گیر — پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اُتر گئی جگر میں

اس کے بعد سیّد احمد خان کا ذکر اور ان کی تحریک کا اثر بیان کیا ہے:

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر دشنام سنیں دعائیں دے کر
منظور جو قوم کا تھا اعزاز ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا ایک بار جو رخ پھرا ہوا کا
وہ دوڑے جو پا گل تھے آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے اخبار کہیں کہیں رسالے
اب تعلیم کے جابجا وہ جلسے گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بیتاب ہر ایک جزو کل تھا ہر بار ''بڑھے چلو'' کا غل تھا

علی گڑھ تحریک کے بارے میں شبلی کا موثر ترین اظہار فارسی کا وہ ترکیب بند ہے جو انھوں نے ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں ابتدا میں سید احمد خان کا ذکر بڑے پُر درد اور پُراثر طریقہ پر کیا ہے۔ پھر دوسرے بند میں قومی زوال اور انقلاب زمانہ کی پُر درد داستان بیان کی ہے۔ اور پھر سیّد احمد خان کی کوششوں کا تذکرہ ہے۔ آخری بند میں علی گڑھ کالج کی نسبت کہتے ہیں۔

تا بکے حسرتِ غرناطہ و بغداد خوری قدمے رنجہ کن و درحرم مدرسہ آ ئے

اسی طرح کا ایک اور ترکیب بند لکھا تھا، جب وہ روم و مصر و شام سے ۱۸۹۲ء میں واپس آئے تھے۔ پہلا بند سفر کے حالات پر مبنی ہے، پھر کالج کی تعریف شروع ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ایک مسدس تماشائے عبرت لکھا ہے، جو مسدس حالی کے موضوع پر تھا۔ شبلی نے اسے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر جب سیّد احمد خان نے تماشائے عبرت دکھایا تھا، اس میں پڑھا تھا۔

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب سے سنے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیوں کر

شبلی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں جو نظمیں پڑھی تھیں، وہ بڑے پُر جوش اور پُر درد انداز میں لکھی گئی تھیں، جن میں تاریخی واقعات کے حوالے سے مسلمانوں کو غیرت دلائی گئی تھی

اور انھیں ترقی کے حصول کی ترغیب دی گئی تھی۔ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۸ء لاہور میں اُنھوں نے جو نظم سنائی تھی اس کے آخری شعر یہ تھے:

ہاں کمربستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا
نوجوانو یہ زمانے کو دکھا دینا ہے اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیسا
قوم کے تازہ نہالانِ چمن ہو تم لوگ دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا

ایک اور نظم جو اُنھوں نے جلسہ منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۳ء میں پڑھی، اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

ضرورت اب ہے گر ہم کو تو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر
فقط باتیں نہیں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر
تمھیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل ہے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آسان سے ہیں آسان تر

شبلی کی شاعری کا وہ دور جب وہ علی گڑھ سے وابستہ رہے، اصلاحی تحریک کی متابعت میں ہے۔ اس دور میں کہی جانے والی نظمیں کچھ زیادہ نہیں۔ ان میں بھی اہم مثنوی ''صبح امید'' اور دوسری مسدس ''تماشائے عبرت'' ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا امتیازی دور بیسویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں کی سیاسی تحریکات سے متعلق ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا انقلابات سے دوچار تھی۔ مسلم لیگ کا قیام مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی جدوجہد، مسلمانوں اور حکومت کے درمیان حقوق کے لیے شدید اختلافات، کان پور کی مسجد کا الم ناک حادثہ، تقسیم بنگال کی تنسیخ، ترکی کے مصائب، طرابلس اور بلقان کی جنگیں، یہ ایسے واقعات تھے جنھوں نے شبلی کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ آئے دن کے واقعات کو نظم کرتے رہے۔[9] ان نظموں میں جوش بیان، قوت نظم اور مؤثر طنز مثالی ہے۔ اس دور میں ان کی نظمیں ہمدرد، مسلم گزٹ، الہلال اور زمیندار میں ''کشاف'' کے نام سے چھپتی تھیں۔[10] ان کی سیاسی نظموں میں ''شہر آشوب اسلام'' اور ''رفاہ عام'' لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھی گئی تھیں۔[11] یہ اُردو کی سیاسی شاعری میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

آگے چل کر ان لڑائیوں کو ملکی یا سیاسی ہی نہیں، مذہبی بلکہ صلیبی جنگوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ چند اشعار میں دشمنانِ اسلام سے خطاب ہے۔ ترکی کے خاتمہ کو اسلام کے خاتمہ سے تعبیر کیا ہے۔

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

ایک دوسری نظم بعنوان ''مذہب یا سیاست'' میں وہ دوسرے انداز سے اپنی قوم سے مخاطب ہوتے ہیں۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کردیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
یا کوئی جذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کردیے دم میں قوائے عملی سب بیدار

آپ دونوں سے کیے دیتے ہیں ہم کو محروم
نہ سیاست ہے نہ ناموس شریعت کا وقار

ایک اور نظم ''خطاب بہ احرار، ایک مرکز کی ضرورت'' کے بعض اشعار بھی اسی نوع کے ہیں۔

بت کدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد

اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توحیدِ خیال
نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشۂ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرے جس طرح سے ہوجاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا
یونہی ہوجائے گی پھر قوم بھی آخر برباد

مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء کے آخر اور ۱۹۱۳ء کے اوائل میں جو نظمیں لکھیں، ان کا ایک حصہ مسلم لیگ کے متعلق ہے۔ یہ نظمیں بڑی حد تک اصلاحی اور تنقیدی ہیں۔

۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے قوم میں طرابلس اور بلقان کی جنگوں سے

بھی زیادہ جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ اس المیہ پر شبلی نے جو نظمیں لکھی تھیں وہ پہلے سے کہیں زیادہ جوشیلی اور اشتعال انگیز تھیں۔ ایک نظم ''علمائے زندانی'' کے چند شعر یہ ہیں:

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سیّد سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کُشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کر محروم سعادت ہے

اسی حادثہ پر ایک دوسری نظم کے چند شعر یہ ہیں:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جان نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خردسال ہیں جو چپ تو ہیں مگر
بچپن یہ کہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر فتح و صور میں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

ایک نظم کا، جس میں ''حکومت سے خطاب'' تھا، آخری مصرعہ یہ تھا ؎

آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم

دوسرے انداز سے بھی اُنھوں نے حکومت اور نظامِ حکومت پر طنز کیا ہے۔

گزری ہے یہ جو کچھ کہ کاشت کاروں پر داستان الم ناک و غم فزا کہیے

امتحانات سول کے لیے لندن کی یہ قید
ہے یہ رفتار ترقی کے لیے سخت مخل
یہ جو پیدائش ارضی کا ہے اسی سالہ رواج
ملک کے حق میں ہے یہ زہر سے بڑھ کر قاتل

جو مناصب کہ ولایت کے لیے ہیں مخصوص
آج ابنائے وطن بھی تو ہیں اس کے قابل
صیغۂ فوج میں تخفیف مصارف ہے ضرور
سینۂ ملک پر افسوس کہ بھاری ہے یہ سل

شبلی نے ایسے ہی، جذبات پر مبنی ایک نظم ''جنگ یورپ اور ہندوستانی''، لکھی تھی جس پر حکومت نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن اس عرصہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۱۲] اس کے چند شعر یہ ہیں:

اک جرمن نے مجھ سے کہا ازراہ غرور
آسان نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل
آئین شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویِ غرور
دیوانہ تُو نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں

۱۹۱۳ء میں حکومت بنگال نے ایک اُردو مجموعۂ اشعار کو ضبط کیا تھا، جس میں شبلی کی بھی ایک نظم تھی۔[۱۳]

(ج) مولوی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد کی قومی شاعری کا آغاز اس طویل نظم سے ہوا جو ''مرثیۂ مبتلا'' کے عنوان سے ان کے ناول محصنات، مطبوعہ ۱۸۸۵ء کے آخر میں شامل ہے۔[۱] وہ قومی مسائل پر ایک مدت سے غور کر رہے تھے۔ حالی کے مسدس اور شبلی کی صبح امید سے متاثر ہو کر اُنھوں نے نظم کو بھی پیغام کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ ۱۸۸۸ء میں جب وہ پہلے پہل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں شریک ہوئے تو سید احمد خان کی فرمائش پر اُنھوں نے اپنے خطبہ کے بعد مذکورہ نظم سنائی۔[۲] اس وقت تک ان کی شاعری محض فرمائشی تھی۔ قومی جلسوں میں وہ نظمیں پڑھنے پر مجبور کیے جانے لگے۔ چناں چہ ان محرکات نے مولوی نذیر احمد کو بھی قومی شاعر بنا ڈالا۔ اگر چہ وہ ۱۸۸۸ء میں

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئے، لیکن وہ اس تحریک کے آغاز ہی سے سیّد احمد خاں کے معاون و مؤید رہے۔ خود اپنے ہی بیان کے مطابق وہ دہلی کالج کے زمانہ طالب علمی ہی میں سیّد احمد خاں سے متعارف ہوئے تھے[۳] ان کی تصانیف بھی، جن کا سلسلہ ۱۸۷۰ء سے چند سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اپنی اصلاحی و مقصدی نوعیت کے اعتبار سے اسی تحریک سے وابستہ تھیں۔

ان کے مجموعۂ کلام نظم بے نظیر[۴] میں شامل زیادہ تر نظمیں قومی جلسوں یا تعزیتی یا تہنیتی تقریبات کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کے موضوع اور ہیئت میں کچھ زیادہ تنوع نہیں، اور وعظ و نصیحت اور عقلی دلائل کے علاوہ شاعرانہ خوبیاں اور اثر و تاثر جیسی خصوصیات ان کے کلام میں کم ہیں۔ اس وقت کے سیاسی حالات میں ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے راہِ نجات صرف یہ تھی کہ حکومت وقت سے مفاہمت اور سازگاری پیدا کر کے اپنی ساری توجہ علوم مفیدہ کی تحصیل میں صرف کریں۔ نذیر احمد کی نگاہیں قومی انحطاط کے ظاہری اسباب و علامات کی تہ تک پہنچ گئی تھیں۔ اپنے خیالات کا اظہار اُنھوں نے مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ ان کی نظم ''اتمامِ حجت'' ان کے پیغام کی بہتر ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ　　　مت مستمند زندگی مستعار رہ
دنیا کا کاروبار کر اور دین دار رہ　　　امید وار رحمت پروردگار رہ

کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ
بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ

یہ علم گر نہیں ہے تو فضل و کمال ہیچ　　　منشی ادیب شاعر شیریں مقال ہیچ
داب منظرات و جواب و سوال ہیچ　　　تحقیق میر زاہد و ملا جلال ہیچ

ہم نے تو قیل و قال میں کی عمر رایگان
یورپ نے ہائے لوٹ لیا گنج شایگان

سیّد احمد خاں سے ان کی عقیدت اور خلوص کا اندازہ ان کی مختلف نظموں اور خصوصاً ان کے مشہور ''مرثیۂ سرسیّد'' سے ہوتا ہے۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

خردمندوں کی صف میں سب موخر تھے وہ اوّل تھا
غرض اسلامیوں کی فوج کا لیڈر تھا جنرل تھا

اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

حصولِ علم ہی انساں کو انساں بناتا ہے
یہی تو بادشاہ اور کنگ اور سلطاں بناتا ہے
یہی فرماں روا و حاکمِ دوراں بناتا ہے
یہی مفلس کو دولت مند باساماں بناتا ہے
ہند کو کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ دولت ہے
کہ دولت بھی تو دنیا میں ہنر ہی کی بدولت ہے

دوسری نظم میں، جو اُنھوں نے ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۵ء شاہ جہاں پور میں پڑھی تھی، سیّد احمد خان کی خدمات کا جائزہ لیا تھا۔

بچایا ڈوبنے سے کشتیِ دینِ محمد کو
الٰہی نوح کی سی عمر دے سرسیّد احمد کو

ایجوکیشنل کانفرنس کے گیارہویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۹۶ء میرٹھ میں دو نظمیں پڑھی تھیں جن کے مطالع درج ذیل ہیں:

کچھ نہ پوچھو آج ہم لکچر میں کیا کہنے کو ہیں
قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں
عزت نہیں، ہنر نہیں پلّے ٹکا نہیں
دنیا میں اب تو جینے کا مطلق مزا نہیں

علی گڑھ تحریک کے سلسلے کے شاعروں میں اور بھی متعدد شعرا تھے جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس تحریک کو وسعت اور مقبولیت دی۔ جن شعرا کا ذکر ہو چکا ہے وہ تحریک کے تشکیلی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُنھوں نے اس تحریک کے ابتدائی مرحلوں میں اس کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی تھی۔ اس دور میں نوجوان شعرا کی ایک ایسی ہونہار نسل بھی قومی شاعری کے میدان میں نمودار ہو رہی تھی، جس نے اپنے بزرگ شعرا کی پیروی کی اور آگے چل کر اپنے دور میں، برِّعظیم کے مسلمانوں کی مختلف اسلامی اور قومی تحریکات میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد اور نصب العین کے تحت، اپنی شاعری سے بھی مفید اور موثر کام لیا۔ ایسے شعرا میں وحیدالدین سلیم، فضل حق آزاد، خوشی

محمد ناظر، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خان وغیرہ نمایندگی کا مقام رکھتے ہیں، یہ شعرا سیّد احمد خان اور ان کے رفقا سے براہ راست مستفید تھے۔ ان کی تحریک کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں مستعد رہے، اُنھوں نے اپنے دور میں اٹھنے والی تمام اسلامی اور سیاسی تحریکات میں شمولیت اختیار کی اور علمی وتحریری کوششوں کے ساتھ ساتھ آزادی کی جدوجہد میں اپنی شاعری کو بھی ایک موثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات سے متعلق اور نئے مغربی سیاسی، علمی اور معاشرتی رجحانات سے متاثر تھے۔ ان سب باتوں کا عکس ان کی شاعری میں موجود ہے، جس کا جائزہ آیندہ صفحات میں لیا گیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے دوران ایسے شعرا بھی موجود تھے، جنھوں نے سیّد احمد خان اور ان کی تحریک سے اثرات قبول کیے۔ اس سے پورے طور پر متعلق نہ رہے، لیکن اس کے مقاصد سے متفق تھے اور اپنے طور پر انھیں کی بجا آوری کے لیے مستعد اور سرگرم رہے۔ ایسے شاعروں میں محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، اور عبدالحلیم شرر کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

(د) محمد حسین آزاد

آزاد نے اپنی شاعری (اور اپنے خطبات) میں جن خاص موضوعات پر زور دیا تھا، ان میں مناظرِ فطرت کے علاوہ حُبّ الوطنی، محبت و مروت، محنت و کاوش، امن و انصاف اور اخلاق و معاشرت قابلِ ذکر ہیں۔ چوں کہ ان کی نظموں کا بڑا مقصد نصابی ضرورتوں کی تکمیل تھا، اس لیے آزاد ان کے ذریعہ نئی نسل کے طالب علموں کو زندگی کی نئی ذمہ داریوں اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک یہ کسی خاص اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر نہیں لکھی گئیں، پھر بھی ان میں جدید اُردو شاعری کے وہ ابتدائی نقش و نگار پائے جاتے ہیں، جو بعد میں اصلاحی تحریکوں کی پیروی میں زیادہ واضح ہو گئے۔

آزاد اور سیّد احمد خان کے درمیان خاندانی روابط موجود تھے[1] وہ سیّد احمد کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی مثنوی ''خواب امن'' بھی بھیجی تھی، جس کی سیّد احمد خان نے بڑی تعریف کی اور آزاد کی اُردو شاعری میں اصلاحی کوششوں کو سراہا[2] وہ سیّد احمد خان سے اس حد تک متاثر تھے کہ عالم جنوں میں جب علی گڑھ گئے تو سیدھے سیّد احمد خان کے پاس پہنچے تھے۔[3]

آزاد کی شاعری کا اہم موضوع حُبِّ وطن ہے۔ یہ ان کی شاعری میں ابتداء ہی رونما ہو چکا تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران ان کی نظمیں، جن کا ذکر گزشتہ باب میں موجود ہے، ان کے اس احساس کا پتہ دیتی ہیں۔ جدید رجحانات اور انگریزی ادب سے کسی حد تک واقفیت نے آزاد کے تصور حُبِّ وطن میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ اپنی مثنوی ''حُبِّ وطن کا جدید تصور پیش کیا ہے اور انگریزی شعر وادب سے چند مثالیں دی ہیں کہ کس طرح یورپ کے افراد وطن اور اہلِ وطن کی بھلائی کی خاطر کسی بھی ایثار سے دریغ نہیں کرتے۔ اور ذاتی فائدے پر قوم کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔

آج اس کا آفتاب ہے اوج فرنگ پر — اور رات ہند کی ہے رخ تیرہ رنگ پر
حُبِّ وطن کی جس کا ہے قحط سال کیوں — حیران ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں

اس مثنوی میں آزاد ہندوستانیوں کو ہم وطنوں سے محبت والفت کا درس دیتے ہیں تا کہ ان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو، نئے علم و ہنر کی روشنی پھیلے اور ملک معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی حاصل کر سکے۔

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں
لبریز جوش حُبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

آزاد نے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کے عوام غلامی کے اثرات سے مایوس اور مضمحل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ باقی نہ رہا۔ چناں چہ اُنھوں نے قوم میں عزم وعمل بیدار کرنے کے لیے ایک تو حُبِّ وطن کو اہمیت دی تھی اور دوسرے عزم وعمل کو۔

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم — کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم — بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو
رکھو رفاہ قوم پہ اپنا مدار تم — اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم

(ہ) اسمٰعیل میرٹھی

اسماعیل میرٹھی اپنے عہد کے معاشرتی حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ جدید شاعری کی تحریک سے بھی وہ متاثر تھے۔ اور نئے علمی وادبی رجحانات سے بھی باخبر۔ ان کی نظموں کا بیشتر حصہ بچوں کے درس ونصاب کے لیے ہے، ان میں اخلاقی پند ونصائح کو بڑی سادہ اور شیریں زبان میں دل چسپ طریقہ سے نظم کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں مناظر فطرت کی کامیاب عکاسی بھی ہے۔ شاعری میں ان کا امتیاز نئی نسل کی ذہنی تعلیم وتربیت ہے۔ اُنھوں نے معاشرتی اصلاح کے اس پہلو پر کماحقہ توجہ صرف کی۔ جہاں ناصحانہ لہجہ اور شاعرانہ انداز میں بچوں کو معلومات، دل چسپی اور تسکین کا سامان فراہم کیا ہے، وہیں بڑے بڑے اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو سیدھے سادے اور مؤثر طریقہ پر بیان کیا ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر — تو وہ خوف وذلت کے حلوہ سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو — بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو
پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار — بہتے دریا کو پھیر لانا ہے دشوار
دشوار سہی مگر نہ اتنا جانا — بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

نئی نسل کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ اسمٰعیل میرٹھی نے اصلاحی تحریک کے سلسلے میں بھی کئی نظمیں لکھیں۔ سیّد احمد خان سے انھیں عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ اس قطعہ سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے سیّد احمد خان کی مدح میں لکھا تھا[1] علی گڑھ کالج کی امداد کیا کرتے تھے[2] قوم کی سیاسی اور معاشی زبوں حالی کا احساس ان کی نظموں میں عام طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے تمام علمی کارناموں کی غایت اصلاح قوم تھی[3] علمی طور پر سیاسی امور میں بھی دل چسپی لیتے تھے[4] ان کی کئی نظموں ''جریدۂ عبرت'' اور ''آثارِ سلف'' گہرے قومی درد کی آئینہ دار ہیں۔ اوّل الذکر میں شاعر کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہے۔ وہ ان کے مختلف طبقات کی بے راہ روی اور لاپرواہی پر نکتہ چین ہیں۔ مسلمانوں میں قومی احساس اور اجتماعی شعور کے فقدان کا گلہ ہے۔ اس میں آخر میں خدا تعالیٰ سے دعا کی ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں:

رہے نجوم میں جب تک زمین سیارہ — اور آفتاب رہے مثل نقطۂ پرکار
خدا ہر ایک مسلمان کو کرے روزی — معاش نیک و دل پاک و خوبیِ کردار

حصول علم و رہِ مستقیم و فہم سلیم جمال صورت معنی کمال عزّ و وقار

نظم ''آثارِ سلف'' عظمت رفتہ کی داستان اور زمانہ کی بےبسی اور بےچارگی کے ذکر پر مبنی ہے۔ اس میں شاعر نے نئی نسل کے نوجوانوں کو ابھارنے، مستقبل کے لیے ہمت و استقلال سے کام لینے، علم و ہنر سیکھنے اور خدمت قوم کی پُرجوش انداز میں دعوت دی ہے۔

ہاں قوم کے نوعمر نوجوانو ادھر آؤ ہے دیدہ بینا تو اسے کام میں لاؤ
آثار صنادید کی عینک کو لگاؤ عبرت کی نگاہوں کو پس و پیش پھراؤ

یہ نقش و نگار و در و دیوار شکستہ
دیکھو تمھیں دکھلاتے ہیں آیندہ کا رستہ
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلت سے بچاؤ
گوسالۂ غفلت کی پرستش کو چھڑاؤ

نوجوانوں کے علاوہ ان کا یہ خطاب اپنی قوم کے ذی شعور افراد سے بھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی وہ نظم قابل ذکر ہے جو اُنھوں نے ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۱ء دہلی میں سنائی تھی۔ اس کے منتخب شعر یہ ہیں:

یہ بچے جو پھرتے ہیں آوارہ جاہل گھسٹتے ہیں کانٹوں پہ گلہائے خنداں
یہی بننے والے ہیں ارکان قومی جو ارکان برے تو ایوان ویراں
انھیں پر ہے موقوف اعزاز ملت بناؤ انھیں جلد زیب دبستاں
زمانہ میں ہیں پیش ملکی مسائل کہ نظم و سیاست کا ہے دور دوراں
اٹھو قوم کی آبرو کو بچاؤ نہ بننے دو ہرگز غلام غلاماں
اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو تو پیدا کرو چشمۂ آب حیواں

(د) عبدالحلیم شرر

شرر مجموعی طور پر، مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں کی اصلاح چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش دلگداز کے اداریوں اور مضامین میں موجود ہے، جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔[۱] سیّد احمد خان کے بڑے معتقد تھے، اور سمجھتے تھے کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو سیّد احمد خان نے تباہی سے بچایا ہے۔[۲] ابتداءً شرر ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے لیکن بعد میں یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہندوؤں

کا طرزِ عمل اتحاد کے منافی ہے۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے رسالہ مہذب کی ایک اشاعت اگست ۱۸۹۰ء میں ہندو مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔[۳]

شاعر، ادیب، صحافی، مورخ سے زیادہ ناول نگار کی حیثیت میں شہرت پائی۔ مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیا کا خیال ان کی تحریروں کا محرک تھا۔ لیکن شاعری میں بھی جس میں اُنھوں نے زیادہ طبع آزمائی نہیں کی، یہی جذبہ موجزن تھا۔ حالی سے بھی متاثر نظر آتے تھے چناں چہ مسدس حالی کے طرز پر ایک مسدس زمانہ اور اسلام تحریر کیا تھا۔ جو نہ صرف بحر بلکہ موضوع کے اعتبار سے بھی حالی کی تقلید میں ہے۔ اپنے ناول فلپانا کو غیر مقفّیٰ نظم میں اپنے رسالہ دلگداز میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔[۴] ان کا زیادہ تر کلام دلگداز ہی میں طبع ہوا۔ قومی نظموں میں زمانہ اور اسلام ہی توجہ کے قابل ہے۔

(۲) علی گڑھ تحریک کے اثرات:

ا۔ شعرا کے سیاسی رجحانات ۱۹۱۱ء تک

علی گڑھ تحریک سے متعلق شعرا نے اپنی شاعری کو جدید رجحانات کے مطابق ڈھالا تھا۔ اُنھوں نے نظم کی تحریک کو فروغ دیا اور غزل کے نئے مزاج کی تشکیل کی اور ساتھ ہی ان سے سیاسی اور سماجی تحریکوں کے مقاصد کی ترجمانی کا کام لیا۔[۱] علی گڑھ تحریک کو عام قبولیت دینے میں ان کی مقصدی شاعری نے ایک اہم خدمت انجام دی تھی۔ اس وقت قومی مرثیہ گوئی وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اس قومی مرثیہ گوئی نے احساس فرض کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا۔

سیاسی اور سماجی اعتبار سے ملک جن حالات سے دوچار تھا، شاعری میں ان کے اثرات پورے طور پر جاگزیں تھے۔ قدیم موضوعات شاعری کے برعکس وطن اور حُبّ الوطنی کا جذبہ سیاسی محکومی کا احساس اور آزادی کا تصور، ایسے مضامین تھے جو اسلامی تحریک اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر شاعری میں بیان کیے جانے لگے۔ اس دور کے نئے اور پرانے شاعروں میں، جن کے خیال و فکر کو علی گڑھ تحریک، سیّد احمد خان اور حالی نے کچھ نئے خواب اور اندیشے دیے تھے، نئے دور کے آغاز کی بازگشت نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے جذبہ اور عقل و خیال و فکر کے امتزاج سے معاشرتی زندگی کو نئے حالات سے ہم آہنگ بنانے میں شاعری کا ذریعہ اختیار کیا۔ اس دور میں ہندوستانیوں کا سیاسی شعور کافی بیدار ہو چکا تھا۔ محکومی کا احساس بھی انھیں مضطرب کر رہا تھا۔ عالمی حالات و واقعات اس احساس

وشعور میں شدت پیدا کر رہے تھے۔ خصوصاً جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست نے ایشیائی برتری کے احساس کو جنم دیا تھا۔ اس واقعہ پر ہندوستانی ذہنوں میں وطن کی محبت نے ایک خاص سیاسی اندازِ فکر اختیار کر لیا تھا۔

حُبّ الوطنی کا تصور سرور جہاں آبادی کی شاعری میں بڑا پُر اثر نظر آتا ہے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو حُبّ الوطنی کی پُر خلوص ترغیب دیتے ہیں۔

دل سرد ہیں رگوں میں لہو نہیں ہے　　حُبِّ وطن کی ہم میں وہ آہ بو نہیں ہے
وہ ولولے نہیں ہیں وہ آرزو نہیں ہے　　گویا رہِ طلب میں وہ جستجو نہیں ہے
پروانوں کا تجھے غم اے شمعِ انجمن ہے　　قسمت میں آہ میری دلسوزیِ وطن ہے
پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں　　حُبِّ وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
مل مل کے ہم ترانے حُبِّ وطن کے گائیں　　بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں
سرور جس میں نہ حُبِّ وطن کا ہو احساس
وہ دل ہو چور کے بہتر ہے اس سے پارۂ سنگ

سرور کو انقلابات زمانہ کا شدید احساس تھا۔ انھیں اپنے وطن کے ماضی اور حال کا فرق معلوم تھا۔ چناں چہ ان کی شاعری میں ماضی کی محبت اور حال سے مایوسی اور اس کی محکومی کا انداز جھلکتا ہے:

ہم ستائے ہوئے ہیں گردشِ ایام کے آہ　　ہم کو یاروں سے نہیں شکوہ بیدادِ وطن
گیت گاتے تھے کبھی حُبِّ وطن کے ہم بھی　　وہ بھی دن تھے کہ چمن میں تھے ہم آزادِ وطن
ہم اسیری کے سزاوار نہ تھے اے صیاد　　تیرے دشمن تھے نہ ہم ازہ شمشادِ وطن
رحم کر رحم کہ صیاد قفس میں افسوس　　چیختا کب سے ہے اب مرغِ چمن زادِ وطن
چمن میں گیت انھیں آزادیوں کے گانے دے
وطن کے پھولوں پہ صیاد چہچہانے دے
آہ اے خاکِ وطن، اے دردمند بیقرار
آہ اے شوریدہ قسمت، اے پریشانِ روزگار
اُڑ گیا نورِ سحر تاریکیِ غم چھا گئی　　نیرِ اقبال ڈوبا شامِ ماتم چھا گئی
اُڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر　　سرنگوں ہے تری عظمت کا نشان اب خاک پر

سرور یہ چاہتے تھے کہ ان کا سا شعور و احساس ہندوستان میں پیدا ہو جائے اور وہ بھی دوسری قوموں کی طرح ترقی کر سکیں:

خوابِ گراں سے چونکو ہندوستان والو ۔ پستی میں کیوں پڑے ہو اونچے نشان والو
کب تک یہ آہ ذلت او عزوشان والو ۔ کب تک یہ خوابِ غفلت سونے کی کان والو

اٹھ کر ذرا تو دیکھو دنیا کا رنگ کیا ہے ۔ رفتار کیا جہاں کی قوموں کا ڈھنگ کیا ہے
ہے حفظ وضع کیا شے ناموس و ننگ کیا ہے ۔ ایثارِ نفس کیا ہے قومی امنگ کیا ہے
قوموں کی ہے ترقی کا کچھ تو راز آخر
حُبِّ وطن میں کر دو دل کو گداز آخر

ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے اور اس اتحاد کو وہ ہندوستان کی فلاح سے تعبیر کرتے تھے:

مئے نفاق ہے لبریز آبگینوں میں ۔ کہ جوش حُبِّ وطن اب کہاں مکینوں میں
کدورتیں ہیں دلوں میں عناد سینوں میں ۔ کہ تفرقہ ہے قیامت کا ہم نشینوں میں
نفاق و کینہ ہے ایمان قوم واویلا
کہ فرد فرد ہیں ارکان قوم واویلا

لیکن ان کی وطن سے محبت کا ایک انتہا پسندانہ انداز یہ تھا کہ اُنھوں نے بندے ماترم کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا۔[۲]

چکبست کی شاعری اپنے زمانہ کے اہم سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کی آئینہ دار ہے۔ سرور کی طرح ان کو بھی حُبِّ وطن کے فقدان کا شدید احساس تھا:

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے ۔ حُبِّ وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا ۔ دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشان ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا ۔ اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستان ہمارا
علم و عمل و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے ۔ بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مردہ طبیعتوں میں افسردگی مٹا دے اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چکبست کی شاعری میں بھی وطن کی محکومی اور اپنی بے بسی کا بھرپور اظہار موجود ہے:

ہیں باغباں کے بھیس میں گل چیں فرنگ کے نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو
چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا
یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے
جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

اس دور کے شاعروں میں حُبّ الوطنی کے تصور کو بعینہٖ اقبال نے بھی اپنا موضوع سخن بنایا تھا:

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس دور میں اقبالِ ہندو مسلم اتحاد کے بھی بڑے حامی تھے۔ ان کی نظمیں، ترانہ ہندی، ''نیا شوالہ'' اور ''تصویر درد'' اس سلسلہ کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان سے یہ چند اشعار درج ذیل ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

لیکن اقبال نے بہت جلد اس تصور وطنیت اور اتحاد کی خواہش کو ترک کر دیا۔ جدید وطنیت کے مطالعہ نے جسے اقبال نے یورپ میں جا کر کیا تھا بعد میں تحریک اتحاد اسلامی کے پیدا ہونے پر اُنھوں نے اپنا نقطہ نظر تبدیل کر دیا اور اس دور میں ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں ہو رہی تھیں اور جغرافیائی یکانگت کی بنیاد پر ذہنی یگانگت پیدا کرنے کی جو مساعی ہوتی رہیں، آگے چل کر بے کار ثابت ہوئیں اور تہذیبوں کا اختلاف ایک حقیقت تسلیم کیا گیا۔ اقبال کے نقطہ نظر کی تبدیلی کو ان کی بیشتر نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور میں اُنھوں نے اپنے طرزِ فکر کو اس طرح ظاہر کیا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے — قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

انھوں نے ترانۂ ہندی کے جواب میں ترانۂ ملّی تخلیق کیا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ اقبال کے اس دور کے کلام میں محکومی کا احساس اور آزادی کا جذبہ بھی جھلکتا ہے:

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ، یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

رُلاتا ہے ترا نظارا اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

نادر کاکوری کے کلام میں یہ بے بسی اور بے کسی دوسرے انداز سے ظاہر ہوئی ہے:

آہ اے اسلام تو اور یہ غریبی بے کسی — رونا آتا ہے ہمیں تیری یہ حالت دیکھتے
جس میں تو صدہا برس اجلاس فرماتا رہا — کاش ہم پھر وہ ترا ایوان شوکت دیکھتے
تیرے بندرگاہ پر یہ غیر ملکوں کے جہاز — جو اڑاتے ہیں پھریروں کی طرح سے اپنے مال
میری نظروں میں درِ دولت کے ہیں تیرے فقیر — اور پھیلائے کھڑے ہیں اپنے دامان سوال
یا خدا وہ دن دکھا محسود حاسد ایک ہوں — دوست دشمن ایک اخیار و مفاسد ایک ہوں
یوں لڑیں ہندو مسلمان ہو مگر جب بخت ملک — سب کے اغراض ایک اور سب کے مقاصد ایک ہوں

اس دور میں حسرت کی شاعری سیاسی رجحانات کے اعتبار سے نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے

کلام میں سیاسی جبر، محکومی اور غلامی کا شدید احساس موجزن ہے۔ اس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یونہیں شورش حُبِّ وطن تمام

سمجھے ہیں اہل شوق کو شاید قریب مرگ　　مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے　　حُبِّ وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے

تابکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب　　ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے

دولتِ ہندوستان قبضۂ اغیار میں　　بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم　　جبر بزیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے

حسرت آزاد پر جور غلامان وقت　　از راہ بغض و عتاب دیکھیے کب تک رہے

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر　　مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اٹھے ہیں جفا پیش گان مہذب　　ہمارے مٹانے پر تیار ہو کر

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو　　کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو　　نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر

حسرت نے اپنے رسالہ اُردوئے معلیٰ کے ذریعہ سے بھی یہ فرض خوب ادا کیا۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون مصنفہ سلیمان کی اشاعت پر انھیں پہلی مرتبہ دو سال قید کی سزا ہوئی[3] اس قید۔ زمانہ کے کلام کی یہ ایک جھلک ہے:

وہ جرم آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

خوشی سے ختم کر سختیاں قید افرنگ کی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانہ رنج دل آزاری

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

اکبر نے اسی زمانہ میں اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بکثرت سیاسی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ وہ فی الحقیقت معاشرے کے ایک مفکر شاعر اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کے ماحول کا

جائزہ لے رہے تھے۔ مسلمانوں کی پس ماندہ اور الم انگیز حالت ان کے پیش نظر تھی۔ اکبر کو سلطنت کے چھن جانے کا غم اور اجنبی حکمرانوں کے تسلط و اقتدار کا اتنا شکوہ نہیں تھا جتنا افسوس قدیم طرز معاشرت اور تہذیبی روایات کے زوال کا تھا۔ اس سے زیادہ وہ محکوموں کے احساس مرعوبیت پر متاسف تھے:

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس ہے ابتریِ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا ہے اپنے ہی میل معصیت کا افسوس

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پر مرتے ہیں

اکبر اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے کہ ان کے سامنے سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور فکری تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ انھیں سیاسی قوت کی برتری اور بالادستی کا بڑا احساس تھا:

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب گئی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم اُن کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

گو سانس چل رہی ہے خوں اب نہیں جہندہ
مشرق بہ دست مغرب مردہ بدست زندہ

غرور اتنا نہ کر قوت پر اپنی اے بت ترسا
ہمارے ہوش غائب ہیں مگر اللہ حاضر ہے

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں
اتنی آزادی بھی غنیمت ہے سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں

ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش یورپ کے لیے بس اک گودام ہے ہند
اس کا پیبجنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے یورپ نے ایشیا کو انجن پر رکھ لیا ہے

(الف) سودیشی تحریک

بیسویں صدی کے ابتدا ہی میں ہندوستان کی سیاست میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اُردو ہندی کش مکش کی انتہا، بنگال کی تقسیم، مسلم لیگ کا قیام اور پھر سودیشی تحریک پہلی دہائی کے واقعات ہیں، جو ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر بجا طور پر اثر انداز ہوئے۔

سودیشی تحریک کے ضمن میں ہندوستانیوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اخبارات اور رسائل میں اس تعلق سے مختلف سیاسی اور قومی رہنما اپنے خیالات ظاہر کرنے لگے تھے۔ شاعروں میں حسرت سب سے پہلے فرد تھے جنھوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی۔ عملاً حصہ لیا، ''سودیشی اسٹور'' کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دکان قائم کی اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں۔ ان کے اس کام میں نواب وقار الملک اور مولانا شبلی نے مدد کی[۱] تحریک کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو صرف ہندوستان کی مصنوعات استعمال کرنی چاہییں۔ اس طرح تجارت اور صنعت میں ترقی ہو سکتی ہے۔ اور غریبوں اور مزدوروں کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ اُردو شاعروں نے اپنی بساط کے مطابق اس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی، حسرت نے تو عملی حصہ لیا۔ شبلی نے ان کی مدد کی۔ حالی اور اقبال نے تحریری طور پر شرکت کی[۲] گو کہ شاعری میں یہ موضوع زیادہ استعمال نہیں ہوا لیکن کچھ شاعروں کا ایسا کلام نظر آ جاتا ہے جو اس تحریک کے ضمن میں لکھا گیا تھا۔ اکبر کے کلام میں اس قسم کی بہتر مثالیں موجود ہیں:

داخل میری دانست میں یہ کام ہے پُن میں	پہنچائے گا قوت شجر ملک کی بُن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر	کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں
کامیابی کا سدیشی پر ہر اک در بستہ ہے	چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے
کالج کے مفتیوں سے کل کہہ رہے تھے اکبر	بسکٹ سے باز آنا رہبانیت نہیں ہے
دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی	بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

(۳) تحریک اتحاد اسلامی

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے مسلمانوں کو روز بروز سیاست میں ملوث کر لیا تھا۔ اب وہ ان حادثات سے بھی متاثر تھے جو بلادِ اسلامی کو پیش آ رہے تھے۔ مغرب کی استعماری طاقتیں ہر جگہ ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں۔ ان سب مسلم دشمن

کارروائیوں میں اگرچہ انگریزوں کی سازش کی تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ مگر ان کی سازشیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں برِعظیم کے مسلمان جو پہلے تو اداس اور بیزار تھے لیکن اب بیدار ہو رہے تھے۔ ان کی بیداری میں ظفر علی خاں کا زمیندار، ابوالکلام کا الہلال، مولانا محمد علی کا کامریڈ زیادہ مؤثر تھے۔ اس وقت یہ اور دوسرے اخبارات میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ہونے لگا تھا۔ دوسرے اسلامی ممالک میں جمال الدین افغانی کی کوششوں سے غیر ملکی استعماریت سے نجات پانے اور نسل اور قوم اور وطن کے محدود تصورات سے بالاتر ہو کر اسلام کے ملی تصورات کو اپنانے اور تمام مسلم ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ تقسیم بنگالٰ کی تنسیخ اور کان پور میں مسجد مچھلی بازار کے حادثہ سے برطانوی حکومت کا اعتبار مسلمانوں کے دلوں سے اُٹھ گیا تھا اور جب برِعظیم کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے بالواسطہ یا براہ راست نقصان پہنچانا شروع کیا تو اخوت اسلامی کا جذبہ ہندوستان میں مضطرب ہونے لگا۔ سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرنے کے لیے ۱۹۱۱ء میں اٹلی اور بلقانی ریاستوں کی جارحانہ کارروائیوں نے جن کی پشت پر برطانیہ کا ہاتھ تھا، ترکوں کے ساتھ مسلمانانِ برِعظیم کی ہمدردیاں اتنی بڑھا دیں کہ برطانیہ اور اٹلی کے سامان کا مقاطعہ شروع ہو گیا اور ترکوں کی امداد کے لیے بڑی بڑی رقمیں جمع ہونے لگیں۔ وفود بھیجے جانے لگے جنھوں نے وہاں کے اعیان اور اکابر سے برِعظیم کے مسلمانوں کا رابطہ بھی قائم کیا۔ برِعظیم میں قومی رہنماؤں کے علاوہ شاعروں، ادیبوں، صحافیوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ان میں شبلی، ظفر علی خاں، اقبال اور حسرت، مولانا محمد علی، ابوالکلام پیش پیش تھے۔ ان کی تحریروں نے عام طور پر مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ان کی خود اعتمادی ختم ہو رہی تھی اسے بحال کیا اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔

شبلی اتحاد اسلامی کے بڑے پکے حامی تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعہ برِعظیم کے مسلمانوں میں دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردیاں پیدا کیں۔ انھیں ترکوں سے بہت زیادہ محبت تھی، ترکی کے مصائب نے انھیں شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ اس کا اظہار اُنھوں نے اپنی ایک پُر درد نظم میں کیا، جسے اُردو کی سیاسی شاعری میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے جب فلک نے کردیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ نظم شبلی نے لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں جو ترکی کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ہوا تھا، پڑھی تھی اے:

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تندباد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

شبلی مغربی طاقتوں کی ان جارحانہ کارروائیوں کو صلیبی جنگوں کی سی حیثیت دیتے تھے چناں چہ استعماری طاقتوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

پھر مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر ترکی مٹ گیا تو اسلام مٹ جائے گا:

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک
پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جب مولانا محمد علی کی کوششوں سے ڈاکٹر انصاری کی سربراہی میں ایک امدادی طبی وفد بلقان بھیجا گیا تو مولانا شبلی نے انھیں لکھنؤ سے وفور جوش و جذبات سے رخصت کیا[۲] اور جب وہ وفد واپس آیا تو وہ اس وقت بمبئی میں تھے۔ وہاں خیر مقدم کا جو جلسہ ہوا تھا، اس میں اُنھوں نے ایک نظم پڑھی، جس کا پہلا شعر یہ تھا:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری　　کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

ان کی ایک اور خیر مقدمی نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں:

تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کے قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈ اسٹوں بھی دیکھے ہیں
جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

اقبال نے، جنھوں نے، ایک ہندوستانی قوم پرست شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری میں ہندوستان کی تعریف میں ترانے لکھے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے اصول کی تلقین کی تھی پختگی رائے کے بعد اپنے خیالات کو یکسر بدل دیا۔ اُنھوں نے صاف الفاظ میں ہر قسم کی قوم پرستی کی مذمت کی اور دنیائے اسلام کے نا قابلِ تقسیم ہونے کے اصول پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مسلمان اپنے آپ کو ترکوں، عربوں، ایرانیوں، افغانیوں اور ہندوستانیوں کے گروہوں میں تقسیم نہ کریں:

نیست از روم و عرب پیوند ما　　نیست پابند نسب پیوند ما

وہ صرف ایک وطن اسلام پر زور دیتے رہے:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اُنھوں نے جمال الدین افغانی کے نقطۂ نظر کے مطابق مکہ معظمہ کو دارالاسلام کے مرکز کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا۔[۳] وہ اپنے دور کے اسلامی احساسات کے ترجمان تھے۔ اس دور میں پیدا

ہونے والے اتحادِ اسلامی کے جذبات ان کی شاعری میں بہت زیادہ نمایاں ہوئے۔

اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ ایشیا کے اتحاد کا مرکزی دستورالعمل اتحادِ اسلام سے تیار ہونا چاہیے۔ اس زمانہ میں تمام اسلامی ممالک سیاسی بحران میں مبتلا تھے۔ لہٰذا مسلمانانِ ہند کو ایشیا کی تمام اقوام کے ساتھ ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لیے اقبال نے فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا جسے متعدد مسلم ممالک میں پڑھا اور سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اُنھوں نے اُردو کو ترک نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں زمانہ کے اجتماعی جذبات منعکس ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پر لکھی تھی جو طرابلس میں مجاہدوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

ہے کوئی ہنگامہ تری تربتِ خاموش میں پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

ایک نظم ''حضورِ رسالت مآب میں'' کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

لیکن وہ اس عارضی غم کے جلد ختم ہونے کی امید ظاہر کرتے ہیں:

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

اُس دور میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے تھے اور برِعظیم سے لے کر افریقہ تک مسلمان جس انتشار اور ابتری میں مبتلا تھے، اس سے اقبال مضطرب رہے۔ اُنھوں نے اسی سال ۱۹۱۲ء میں ''شکوہ'' تحریر کیا۔ پھر مسلمانوں کے مرض کا علاج بھی اسی سال کے آخر ''جوابِ شکوہ'' میں بتایا۔ اس میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں درس وآگہی بھی دی ہے اور تسلی وتشفی بھی:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانہ میں سہارا تُو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تُو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دلآزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

اسی سال اُنھوں نے نظم "شمع وشاعر" تخلیق کی۔ اس میں مسلمانوں کو غم والم کے بجائے صبر وحوصلے اور جہد و عمل کی ترغیب دی۔ اور عالم اسلامی کے سیاسی وعمرانی مستقبل کے امکانات پر حوصلہ افزا روشنی ڈالی ہے:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تُو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوت رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

اقبال نے اپنی فارسی تخلیقات اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے ذریعہ اپنے نظریوں کی اشاعت زیادہ وسیع پیمانے پر کی۔ بانگ درا میں بھی اس کے متعلق جابجا ان کے پیغامات موجود ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی
مسلم خوابیدہ اُٹھ، ہنگامہ آرا تُو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرمِ تقاضا تو بھی ہو
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

یہ نکتہ سرگشت ملت بیضا سے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تُو ہے

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا ایک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

ظفر علی خاں نے بھی اپنی شاعری میں اتحاد اسلامی کی تلقین کی ہے۔ بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے، صحافت کی طرح سے ان کی شاعری کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان کی نثری تحریروں کی طرح سے ان کی شاعری نے بھی ایک نیا رنگ اختیار کیا جو مجموعی جذبات واحساسات کی ترجمانی پر مبنی ہے:

ترک کے طرہ طرار کا جھک جھک جانا
چاک داماں عرب تا بہ گریباں ہونا

خاک کا درنہ و طبروق کے سر پر اُڑنا
خوں میں مشہد و تبریز کا غلطاں ہونا

مصر کے سینۂ صدچاک کے پرزے اڑنا
ہند کے دیدۂ نم ناک کا طوفاں ہونا

صف ماتم ادھر ایران کے اندر بچھنا
اور مراکش میں ادھر حشر کا ساماں ہونا

یہ مسلمان ہیں اس جرم میں کردو انھیں قتل
دست بلقان میں یورپ کا یہ فرماں ہونا

بوئے تیغ آتی ہے پہلوئے فلسطین سے ہنوز
جو نے خون بہنے کو ہے قدس کے میدانوں سے

سونپ دیں پرچم تثلیث کو بغداد و دمشق
نہیں امید یہ کعبہ کے نگہبانوں سے

کور دبتی ہوئی آتی ہے حریفوں کی نظر
اک طرف ترکوں سے اور ایک طرف افغانوں سے

مصر بیتاب ہو یا ہند ہو آتش بجگر ہے یہ سب گرمیِ ہنگامہ مسلمانوں سے
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
وہی ہے رشتہ جس نے ترک کا افغان سے جوڑا وہی ہے ان کے اعدا کو جو کر سکتا ہے خوار اب بھی
دنیا کے گوشے گوشے میں ہے گرچہ آجکل امت تری رہین ستم ہائے بے حساب
لیکن میں پرستار نہیں خاک وطن کا دیتا نہیں اس بت کو کسی شکل میں تعظیم
عزت ملت بیضا کی حفاظت کے لیے دوش پر لاکھ بھی سر ہوں تو کٹاتے جاؤ

حسرت کے کلام میں بھی اتحاد اسلامی کے جذبات موجزن ہیں۔ ان کی نظم ''بیداریِ اسلام'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے اب تو انصاف اس ستم کا دست پیغمبر میں ہے
جور یورپ ہے بنا بیداریِ اسلام کی خیر ہے دراصل یہ با آنکہ شکل شر میں ہے
قلت افواجِ ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے

ہاشمی فرید آبادی نے بھی اس زمانہ میں اس موضوع پر کئی نظمیں لکھی تھیں۔ ان کی دو نظموں سے چند اشعار ان کے جذبات کا بھرپور اظہار کرتے ہیں:

تا بہ کے رخ زرد آنکھیں خونچکاں دل مضمحل
تا بہ کے ساز جنون مشتاق آہنگ عمل
دعویٰ ایمان رکھتا ہے تو اے مومن نکل
شمہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
بہت دن ذلتوں کو مصلحت جانا کیا لیکن
بس اب اے ہم نشیں میری طبیعت جوش پر آئی
لہو غیظ وغضب کا آنکھ کی رگ رگ سے بہ نکلا
گرا جب خاک پر کٹ کر مرا عثمانوی بھائی
میرے ہر سانس سے اک انقلاب حریت اٹھا
میرے اک ایک روئیں نے حمیت کی قسم کھائی
بس اب میں اپنے ملک نفس کا سلطانِ مطلق ہوں
بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی

مرزا ہادی عزیز لکھنوی قدیم رنگ تغزل کی علامت تھے لیکن ان کے کلام میں قومی نظموں کا بھی ایک معتدبہ حصہ موجود ہے۔[۲۲] اپنے زمانہ کے قومی مسائل اور مسلمانوں کی زبوں حالی، پستی، اور محکومی، ان کی قومی شاعری کے موضوعات ہیں۔ عالم اسلام میں پیش آنے والے سانحات سے متاثر ہوکر اُنھوں نے کئی نظمیں تحریر کیں۔ ان میں ان کے جذبات واحساسات پوری طرح موجزن رہے:

مگر اک وہ وقت آیا ہے اب اے اہل دل سن لو
کہ مجھ کو دوسری قوموں سے حاصل ہے نگوں ساری

ٹرکی کے زخمیوں کا نتیجہ نہ پوچھیے — یہ زخم ان کے دیکھیے کیا گل کھلائیں گے
سنتے ہیں آپ جنگ صلیبی کی شورشیں — آ کر یہ فتنہ گر ہمیں کب تک ستائیں گے
ظلمِ اٹلی پر ابھی روئے نہ تھے دل کھول کر — دل میں باقی تھا ابھی مظلوم ٹرکی کا اثر
مسلمانو خبر ہے کچھ تمھیں مشہد پہ کیا گزری — اک آوارہ وطن مظلوم کے مرقد پہ کیا گزری

آپ کے جد سے ہوا ہے عازم پیکار روس
فتنہ پرور اور جفاگستر غریب آزار روس

ظلم ایسے عہد میں ہوں کیا مصیبت یہ نہیں
آہ اے برٹش حکومت کیا قیامت یہ نہیں

اُنھوں نے متعدد مواقع پر، قومی جلسوں میں اور رسائل واخبارات میں جو نظمیں لکھی تھیں، قوم کو مخاطب کرکے انھیں بیداری اور اتحاد کا درس دیا ہے۔ زیادہ تر ان کا یہ خطاب نوجوانوں سے ہے:

غیروں میں ترقی کی اٹھی ہیں آندھیاں — بجھ نہ جائے ہاں مسلمانو، یہ اسلامی کنول
وہ قصر اتحادی ہرگز نہ تم گرانا — خون وفا سے کل تک جس کا بنا تھا گارا
باہمی جھگڑوں کو چھوڑ اے قوم کب تک یہ عناد — اتحاد الاتحاد الاتحاد الاتحاد

(الف) ہوم رول کی تحریک

مسلمانوں میں تحریک اتحاد اسلامی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی عام سیاسی زندگی میں اس وقت اور بھی اہم واقعات رونما ہورہے تھے۔ ایک تو پہلی جنگ عظیم کی ابتداء دوسرے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء اور تیسرے ان دونوں کے اشتراک میں تیار ہونے والا منصوبہ'' حکومت خود اختیاری'' طرابلس اور ترکی کے سانحات نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اضافہ کردیا تھا۔

جنگ عظیم کے شروع میں ان کے پُر جوش رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ دوسرے رہنماؤں نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کے اشتراک سے ''حکومت خود اختیاری'' کا مطالبہ کیا[1] ہوم رول یا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ فی الحقیقت اسی صورتِ حال کا نتیجہ تھا، جس نے برِعظیم کے نئے تعلیم یافتہ طبقے کو حاکموں کے نقش قدم پر چلنے کے لیے انھیں کے طرزِ عمل کا حامل کر دیا تھا۔ یہ طبقہ اب اس قابل ہو چکا تھا کہ حاکموں کے دیے ہوئے ہتھیاروں سے حاکموں کا مقابلہ کرے۔ ہوم رول کی تحریک نے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

اس تحریک کے آثار ۱۹۰۶ء ہی میں نظر آنے لگے تھے[2] لیکن یہ ۱۹۱۶ میں لوکمانیہ تلک[3] اور مسز اینی بسنٹ کی قائم کی ہوئی ہوم رول لیگ کی شکل میں ملک بھر میں پھیل گئی[3] پھر مسز بسنٹ کی گرفتاری نے اس پر بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا[4] جنگ عظیم میں حکومت کو ہندوستان کے تعاون کی ضرورت نے مسز بسنٹ کو رہا کرا دیا اور وزیر ہند مانٹیگو نے ملک میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کا وعدہ کیا[5] ہندوستانی رہنما مطمئن ہو گئے اور چند ماہ میں ہوم رول تحریک کا جوش سرد پڑ گیا لیکن اس مختصر سی مدت کی گرم جوشی نے ہندوستانیوں کے جذبہ و احساس میں اضطراب اور بیداری پیدا کر دی۔ اُردو شاعروں نے اس تحریک کے احساسات اور مقاصد کو اپنی شاعری کے ذریعہ سے عام کرنے میں بڑی تندہی دکھائی تھی۔

نادر کاکوروی نے اس تحریک سے بہت پہلے اس قسم کے خیالات و جذبات کا اظہار کیا تھا جو آگے چل کر تحریک میں بھی نظر آتے ہیں:

سائل سرِ عدالت اگر داد خواہ ہے حاکم کی رائے دے کہ نہ دے بادشاہ ہے
لیکن غریب پر ہے بغاوت کا جرم کیوں اپنے حقوق مانگنے میں کیا گناہ ہے

یا خدا وہ دن دکھا محسود و حاسد ایک ہوں
دوست دشمن ایک اخیار و مفاسد ایک ہوں
یوں لڑیں ہندو مسلمان ہو مگر جب بختِ ملک
سب کے اغراض ایک اور سب کے مقاصد ایک ہوں

خبر بھی ہے تجھے کیا عام رایوں کا خلاصہ ہے
کہ اس نظم و نسق سے انتظام جیل اچھا ہے

اکبر نے اپنے پیرایہ میں اپنے دور کے سیاسی نظام پر خوب طنز کیے ہیں:

رزولیشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

نیٹو رہے نمود کا محتاج — کونسل تو ان کی جس کا ہے راج
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے رہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں

حکومت خود اختیاری اور اس کی دل چسپیوں اور اثر کے متعلق بھی اکبر نے اسی طرح خیالات کا اظہار کیا ہے:

کام اس ملک میں ہو سلف گورنمنٹ سے کیا — زہر کو ہضم کرے کوئی پیپرمنٹ سے کیا
تقلیل غذا میں ہو پیپرمنٹ یہی ہے — کہ ضبط ہوس سلف گورنمنٹ یہی ہے
بھائی بھائی میں باتا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی
ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل — ہر در پہ یہ شور ہے چل چل

حسرت نے اس سلسلے میں مانٹیگو کے وعدہ اصلاحات کی حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس حقیقت کو اپنی شاعری میں بھی بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ نظم اس تعلق سے منفرد ہے

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویز رفارم مانٹیگو
مشہور زمانہ ہیں مسلّم — دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیار کامل — عمال پہ زور، زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی — گلہائے رفارم میں نہیں بو
کاغذ کے سمجھیے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈائنہ کا یہ قول — کس درجہ ہے دل پذیر و نیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ — ہم سب رہیں صف ایک تا بو
اے ہندی سادہ دل خبردار — ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو

ہوم رول تحریک کے زیادہ پُرجوش اور سرگرم شاعر چکبست تھے۔ ان کی شاعری نے اس تحریک کو عوام تک پہنچانے میں بڑی مدد کی۔ اس میں ہوم رول کا مطالبہ بڑی شدت سے جابجا آیا ہے:

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار — ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار — ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گل چیں نہ صبح و شام رہے نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے

دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے[۶]

چکبست نے صرف اس تحریک میں دل چسپی لی تھی بلکہ اس تحریک کے رہنماؤں سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی اپنی نظموں میں کرتے رہتے تھے۔

زمین ہند کے رتبہ میں عرش اعلا ہے یہ ہوم رول کی اُمید کا اجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے

(۴) تحریکِ خلافت

تحریک اتحادِ اسلامی فی الحقیقت تحریکِ خلافت کی شروعات تھی۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات خصوصاً سلطنت عثمانیہ کے بتدریج حصے بخروں اور ایران کے اختناق نے برِعظیم کے مسلمانوں کو، جو ایک طویل عرصہ سے اتحاد اسلامی کے خواب دیکھ رہے تھے، سخت تکلیف پہنچائی۔ دنیائے اسلام کی سیاسی قوت کا آخری قلعہ سلطنت عثمانیہ تھی جو اب اپنے دشمنوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے اُنھوں نے پہلی جنگ عظیم میں اس کی مدد کی تھی۔ اب تو ان کا یہ خواب بھی پریشان ہو رہا تھا کہ تمام مسلم ملت ایک ہی مملکت کی تشکیل کرے اور خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپ کے تسلط سے آزاد کرائے گی۔ علی برادران ۱۹۱۴ء سے نظر بند تھے۔ مختصر صفحات کے حامل چند اُردو اخبارات نکل رہے تھے جن پر زمانہ جنگ میں یہ پابندی عائد تھی کہ وہ ان مسائل پر کچھ نہ لکھیں جو جنگ سے متعلق ہوں۔ ان کی استطاعت سے یہ باہر تھا کہ ترکوں اور

خلافت کی حمایت میں برِعظیم کے مسلمانوں کے جذبات کا اظہار کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود جس اسلامی فکر کے تقاضے سے علی برادران، ابوالکلام، حسرت اور مولانا عبدالباری ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہوئے، وہی ہر مسلمان کے دل میں موجزن تھی۔

۱۹۲۰ء میں ترکوں پر جو "میثاقِ سیورے" عائد کیا گیا، اس نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی کی سیادت کو عملاً منسوخ کر دیا۔ اس واقعہ نے برِعظیم کے مسلمانوں کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ سارے جذبات جو ایک عرصہ سے دبے ہوئے تھے ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ نکلے جس نے برِعظیم میں سلطنت برطانیہ کی جڑوں کو ہلا دینے کے لیے وہ کردار ادا کیا جو آج تک اس سے قبل کی کسی اور تحریک نے نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں شریک ہو کر نتائج سے بے نیازی اور مصائب و آلام سے انتہائی بے پرواہی کا مثالی ثبوت دیا۔ اگرچہ اس وقت اس کو یہ نہ معلوم تھا، مگر ان کی قربانیاں تمام مسلمانوں کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئیں۔ انھیں قربانیوں نے انھیں بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کو منظم کرنے کے طریق کار کی تعلیم دی۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ان کی خود اعتمادی ختم ہو چکی تھی، اسے بحال کیا اور سب سے بڑھ کر ان میں سیاسی بیداری پیدا کر دی، جس کے بعد برِعظیم کے مسلم سیاست دان ایک مختلف زبان بولنے لگے۔ اُنھوں نے اس خیال کو ترک کر دیا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا برطانیہ کے بھروسہ ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اب وہ مقابلہ کے لیے تیسرے فریق کی حیثیت رکھتے تھے۔

بیشتر سیاسی اور قومی رہنماؤں کی عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ کئی شاعروں نے اپنی شاعری کو بھی اس جدوجہد کا ایک پہلو بنا دیا تھا۔

آزاد لکھنوی، رومانیت پرست شاعر تھے لیکن تحریکِ خلافت کے دور میں وہ بھی اس حادثہ سے متاثر نظر آتے ہیں جو زوالِ خلافت کا باعث بنا تھا۔ ان کے یہ شعر قابلِ توجہ ہیں جو ہمدرد مؤرخہ ۱۳ راگست ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئے تھے:

ملتان ہو کہ ایراں ترپولی یا مراکو　　اک وقت میں لٹا ہے ہر کارواں ہمارا
کیا کام اس شجر سے سرسبز ہو کہ سوکھے　　جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا
یا گھر میں بیٹھنا تک دشوار ہو گیا ہے　　یا ایک وقت میں تھا سارا جہاں ہمارا

انھیں دنوں مولانا محمد علی نے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں اپنا مشہور مضمون "ترکوں کا

انتخاب'' لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے برطانیہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مصر کے معاملہ میں ترکوں کی دل جوئی کر کے ان کے ساتھ مصالحت کر لے مگر اس مضمون کی وجہ سے حکومت کا عتاب ان پر نازل ہوا اور وہ قید کر دیے گئے۔ یہی واردات بعد میں ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی کے ساتھ پیش آئی۔ اکبر نے اس واقعہ پر[1] ایک پُر معنی غزل میں اپنے احساسات ظاہر کیے:

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
بیادِ رنج یارانِ نظر بند کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی خدا پر تو نہیں راہ خبر بند
بت مشرق نہیں محتاج ساماں کمر ہی جب نہیں کیسا کمر بند
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند

اسی واقعہ اسیری پر اقبال نے بھی ایک نظم تحریر کی تھی۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک ازفر چیز کیا ہے؟ ایک لھو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کہ نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام وقفس سے بہرہ مند

تحریکِ خلافت کی ابتدا میں مولانا محمد علی ایک وفد لے کر انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں کے ارباب اقتدار کو آمادہ کر کے خلافت عثمانیہ کو سہارا دیا جائے۔ لیکن اقبال نے اس خیال کی مخالفت کی تھی:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تُو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ خلافت کی کرنے لگا تُو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلمان کو ہے ننگ وہ پادشاہی

وہ اس خلافت کے خواہاں تھے جو ماضی کا حصہ تھی۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

مصطفےٰ کمال نے جب جنگ عظیم کے بعد انگورہ میں نئی حکومت قائم کی اور یونان کو شکست دی اور پھر مشرق تھریس وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم کی تو اقبال نے ان کوششوں کو سراہا تھا:

ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی

عروق مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مولانا محمد علی تحریکِ خلافت کے اہم رہنما تھے۔ اپنی بے پناہ سیاسی اور قومی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی شغف تھا۔ تحریکِ خلافت کے دنوں میں کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کے ایام میں اپنی شاعری کو اپنے جذبات کا ذریعہ اظہار بنایا:

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے ان کے آستانے سے

ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے
ہوئے برباد آشیانے سے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے
ذرا پر باندھنا صیاد کس کے

اذاں دی کعبے میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

حسرت کی شاعری میں بھی تحریکِ خلافت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ خود بھی اس تحریک میں مستقل فعال رہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص مزاج میں اس تحریک سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کو شاعری کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اس تاثر کے حامل ان کے چند شعر درج ذیل ہیں:

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس کا ہمت پیغمبر میں ہے

جورِ یورپ ہے بنا بیداری اسلام کی
خیر ہے دراصل یہ ہنگامۂ شر میں ہے

سب بند ہو گئے ایک حسرت باقی ہے ابوالکلام آزاد
درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا
غلبۂ کذب متحد معلوم حق ہے بے خوف کثرت فوج
کچھ مرے دل ہی سے موقوف نہیں لذت غم
خوش اسی حال میں جوہر بھی ہے آزاد بھی ہے
ترے فیض کرم سے دین کے دریا میں جوش آیا
تیرے یمن قدم سے باغ ایمان میں بہار آئی

تحریکِ خلافت کے زیادہ پُر جوش شاعر ظفر علی خاں تھے۔ زمیندار میں ان کی تحریریں اور ان کی عملی کوششیں ان کو اس تحریک کا ایک فعال رکن ویسے بھی ثابت کرتی تھیں۔ ان کی شاعری بھی ان کے ساتھ ساتھ اس اجتماعی شورش اور تحریک میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اسلامی ممالک پر دشمنان اسلام کا قبضہ دیکھ کر خلافت کے سلسلے میں ظفر علی خاں نے کہا تھا:

تیشۂ یورپ سے جڑ انصاف کی کٹ ہی گئی انقطاع رشتہ مہر و وفا ہو ہی گیا
خوش ہوا ے یورپ برآئی تیری صدیوں کی اُمید مکہ قسطنطنیہ سے آخر جدا ہو ہی گیا
خدایا تیرے گھر کی خاک اڑائی جا رہی ہے کیوں
قیامت وقت سے پہلے ہی آئی جا رہی ہے کیوں
بجائی جا رہی ہے اینٹ سے کیوں اینٹ کعبے کی
خلیل اللہ کی بنیاد ڈھائی جا رہی ہے کیوں
اڑائے جا رہے ہیں کس لیے پرزے خلافت کے
رسول اللہؐ کی دولت لٹائی جا رہی ہے کیوں

لیکن جب جنگ عظیم کے بعد ترکوں نے اپنی حالت درست کی اور مصطفےٰ کمال کی جدوجہد سے نئی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا:

ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا اس کی عزیمتوں نے بتائید ذوالجلال
جو سلطنت زمانہ کی سرتاج تھی کبھی اس کا وقار از سر نو کر گیا بحال
چرکے دیے صلیب پرستوں کو پے بہ پے لے کر بڑھا وہ ہاتھ میں جب خنجر ہلال

میانوں سے نکل آئیں تڑپ کر پھر وہ شمشیریں
پلٹ دی ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کی تقدیریں
پڑا ہے زلزلہ دنیا میں پھر لزبن سے پیکن تک
بلند ایک ساتھ ہوتی ہیں مسلمانوں کی تکبیریں
ادھر انگورہ و کابل ادھر بغداد اور دہلی
وہ سب رحمت پیمبر کی یہ سب اُمت کی تقصیریں
امان اللہ خان اور مصطفیٰ کو دیکھ لو جا کر
نہ دیکھی ہیں اگر اسلام کی غیرت کی تصویریں

خلافت عثمانی کے دم واپسیں پر برِعظیم کے مسلمانوں میں جو جوش و خروش تھا اُسے اُنھوں نے ''خروشِ مسلم'' کے عنوان کے تحت منظوم کیا ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

زمین تھرا گئی آوازۂ اللہ اکبر سے — خروش مسلم شوریدہ شرماتا ہے تندر کو
مسیحیت مسلمانی سے ٹکرائی تو ہے لیکن — کسی نے آج تک شیشے سے توڑا بھی ہے پتھر کو

اور جب سمرنا میں ترکوں کو کامیابی حاصل ہوئی تو ظفر علی خان نے مسرت اور غم کے ملے جلے جذبات کو اس طرح بیان کیا:

ایمان نے آ کے شعلہ و غیرت کو دی ہوا — روشن چراغ دودۂ عثمان کر دیا
عثمانیوں کے خنجر خارا شگاف نے — یورپ کے کافروں کو مسلمان کر دیا
دین مبیں کے مجدد شرف کے لزوم کو — تمہید عہد نامہ لوزان کر دیا
مشرق کو زندہ کر نہیں سکتا خدا بھی آج — مغرب کے اس عقیدے کا بطلان کر دیا

وہ بہت پُر امید تھے کہ ایک دن یقیناً خلافت دوبارہ قائم ہو جائے گی۔

بڑھا چاند گھٹ کر بڑھی ہے موج ہٹ ہٹ کر
اسی انداز سے ہوگا عروج اک دن خلافت کا
خلافت اقتدار اپنا زمانہ پر بٹھائے گی
مطاع دہر قسطنطنیہ کا مسند نشین ہوگا

تحریکِ خلافت کے دوران تحریک کی مقبولیت اور وسعت اور اس کے جوش و خروش کے ساتھ کئی

ایسی نظمیں زبان زدِ عام ہوئی تھیں، جن کے شاعر گم نام تھے۔ وہ محض تک بندی کی حیثیت رکھتی ہیں، جنھیں ''لوک گیت'' کہا جاسکتا ہے۔ ان میں جذبات اور سوز وگداز کا بے ساختہ اظہار تو تھا، لیکن فن کی کوئی اصولی پابندی ان میں نظر نہیں آتی۔ ان نظموں کو مقبولیت اور ان کا اثر تو اندازے میں آسکتا ہے لیکن ایسی زیادہ تر نظمیں محض زبانوں پر چڑھی رہیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ افراد کے حافظوں سے محو ہوتی رہیں۔ ان نظموں میں سے جو کچھ محفوظ ملتی ہیں، ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

میں جان دے دوں خلافت کے نام نامی پر — دعا قبول یہ رب الانام ہو جائے
کیا کروں یارب کوئی دلبر نظر آتا نہیں — بس خلافت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں
آسماں ٹوٹ پڑے اور زمین کھا جائے — جو خلافت کے مٹانے پر کھڑا ہو جائے
کیوں خلافت کے مٹانے پر کمر باندھی ہے — ہوش میں آ کہیں یورپ نہ فنا ہو جائے
خلافت کا جھگڑا اُٹھایا ہے جس نے — وہ مٹ جائے یہ التجا کر رہے ہیں
ہمیں قتل کردو یا اولاد کو تم — خلافت پہ ہم جاں فدا کر رہے ہیں

ایسی نظموں میں دو نظمیں بہت زیادہ مقبول و مشہور ہوئیں:

۱- کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
۲- بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

دوسری نظم کو جس کا عنوان ''صدائے خاتون'' رکھا گیا تھا زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ نظم بی اماں، والدۂ علی برادران کی زبان سے ادا کی گئی ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(الف) تحریکِ ترکِ موالات

جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر برطانوی حکومت نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جنگ میں ہندوستانیوں کی وفاداری کے صلے میں انھیں اپنے ملک کی حکومت کے اندر زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس ''رولٹ ایکٹ'' نافذ کردیا گیا[۱] جس میں حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جن افراد پر دہشت انگیز سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شبہ ہوا، ان کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے قید کردیا جائے۔[۲] یہ مسودہ قانون ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں کی شدید مخالفت کے باوجود منظور ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں گاندھی نے ''ستیہ گرہ'' کی مہم کا آغاز کیا۔[۳] اسی دوران امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک شدید المیہ پیش آیا۔ آخرکار امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس بیک وقت منعقد ہوئے یہاں ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان ایک مفاہمت ہوگئی جس نے انھیں اس قابل بنادیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک عام تحریک منظم کرنے میں باہم تعاون کرسکیں۔ اگست ۱۹۲۰ء میں حکومت سے عدمِ تعاون کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کی قرارداد کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں منظور ہوئی۔[۴] اس میں ہندوستانیوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات اور اعزازی عہدے واپس کردیں اور تمام سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے بھی انکار کردیں۔ جن تعلیمی اداروں کو خود حکومت چلاتی ہے یا جس کو مدد دیتی ہے، ان میں سے طلبہ کو بتدریج اُٹھا لیا جائے اور برطانوی عدالتوں، مجالس مقننہ اور ان کے انتخابات اور غیر ملکی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔[۵] اس اجلاس میں مسلم رہنماؤں کی بھی ایک معتد بہ تعداد شریک ہوئی۔[۶] اور اسے کثیر التعداد مسلم علما کے ایک مشہور فتویٰ میں بھی شامل کرلیا گیا تھا۔[۷]

اس تحریک کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں نے اس میں نمایاں اور بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ ان کی قربانیاں بھی ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ رہیں۔ علی برادران اور دیگر مسلم زعما گرفتار کرلیے گئے لیکن گاندھی کے ایما سے کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ تحریک معطل کردی۔[۸] رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک ختم ہوگئی۔ ہندوستانیوں نے اور بالخصوص مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر دل چسپی لی تھی۔ اس نے بجا طور پر سارے برِعظیم میں ایک سیاسی ہل چل اور آزادی کی اُمنگ پیدا کردی۔ اُردو شاعروں نے بھی عام طور پر اپنی شاعری میں اس تحریک کے متعلق اپنے جذبات و احساسات شامل کیے اور شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ قرار دیا۔

اکبر کے کلام میں اس تحریک کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ وہ اس سے متفق تو تھے لیکن اس تحریک کے رہنماؤں میں بڑی کوتاہیاں دیکھتے تھے۔

نئی روشنی کا ہوا تیل کم حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کسمپری میں تھے نہ آفس میں تھے نہ کری میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جایئے سیاسی کمیٹی میں پل جایئے
اس روشنی کا ہے بس یہ ظہور خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

ان کے خیال میں ترکِ موالات کو درجہ قبول صرف اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اس میں خودغرضی نہ ہو[9]

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم کہ دل کو طاعت حق سے یہ دُور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

چوں کہ وظیفہ یاب تھے اس لیے وہ اس تحریک میں کھل کر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اُنھوں نے طنزیہ انداز میں اپنی قوم کی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے پیش نظر ان کا یہ خیال موجزن ہے کہ اس صورت میں یہ تحریک کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے؟

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں
طواف ان کے گھروں کا ہے اُنھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں
سواری ہے انھیں کی راہ ان کی اور ڈاک ان کی
اُنھیں کی فوج ہے ان کی پلس ہے اور تاک ان کی
ہوا میں ائرشپ اُن کے سمندر میں جہاز ان کے
عمل ہم میں کیا کرتے ہیں نامعلوم راز ان کے
علوم ان کے زبان ان کی پریس ان کے دفعات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات ان کے

اکبر نہ گاندھی کے حامی تھے نہ مخالف، اُنھوں نے اس تحریک سے دور رہ کر ایک مفکر کے انداز میں اس تحریک پر اظہار خیال کیا ہے:

حکام سے نیاز نہ گاندھی سے ربط ہے اکبر کو صرف نظم حوادث کا خبط ہے

ہنستے نہیں وہ دیکھ کے اس کود پھاند کو دل میں تو قہقہے ہیں مگر لب پہ ضبط ہے

''گاندھی نامہ'' ترکِ موالات کے بارے میں اکبر کے نقطۂ نگاہ کا بہتر منظوم اظہار ہے۔ اس طویل نظم کو اُنھوں نے سات مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ''اعتراضات''، ''ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے''، ''گاندھی کا ساتھ بغاوت نہیں ہے''، ''ترکِ موالات کی توجیہ''، ''بے پروائی و بے تعلقی''، ''ظرافت''۔ گاندھی نامہ کے ساتھ ایک اور مختصر گاندھی نامہ بھی ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اکبر نے خیالات میں ربط پیدا کرنے اور شعروں کی وضاحت کے لیے نثر میں جملے بھی تحریر کیے ہیں۔

اکبر نے ''گاندھی نامہ'' میں تحریک موالات کو ''گاندھیت'' اور ''فتنۂ موجودہ'' کہا ہے۔ یہی وہ مذکورہ اندازِ فکر ہے، جو اس وقت بعض مسلم علما کا تھا۔ جیسے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع وغیرہ کی طرح اکبر مسلمانوں کی کسی ایسی تحریک میں شرکت کے مخالف تھے، جس میں ہندو بھی ان کے ساتھ ساتھ ہوں۔ اکبر نے اس طویل نظم میں تحریک ترکِ موالات کے مختلف پہلوؤں اور مسائل کو خاص و عام ہر ایک کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور موافق اور مخالف دونوں کے خیالات کو پیش نظر رکھ کر ان کی ترجمانی کی ہے۔ اس دور میں برِّعظیم کی سیاسی زندگی میں جو بے چینی اور اضطراب تھا۔ اکبر نے اس کو اس طرح پیش کیا ہے:

ادھر عزیمت گاندھی کی مشرقی کو تلاش
ادھر جلالت مغرب ہوا میں بم پاش
کہیں یہ شکوہ کہ انعام میں نہاں ہے فریب
کہیں یہ غصہ کہ شور و فغاں ہے سمع خراش
کہیں یہ طعن کہ یہ سامری ہے گاؤپرست
کہیں یہ شبہ کہ خنزیر کی یہ کھائے گا قاش
کہیں یہ فیصلہ یہ سب ہیں ملک و قوم فروش
کہیں یہ قول کہ یہ سب ہیں رند اور اوباش

اکبر ترکِ موالات کی تحریک کو زمانہ کی رفتار کا ایک رُخ سمجھتے تھے۔ اور وہ اس خیال سے مطمئن تھے کہ حالات خود بخود بدل جائیں گے۔

صاحب کی رفاقت ہو جو پسند آسام میں جا کر چائے چنو
اکبر کی جو مانو بیٹھے رہو جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

ہو تیزیِ انور کی جو ہوس ہنگامہ کرو توپوں سے بھنو
گاندھی کی جو حکمت خوش آئے چپ چاپ گزی کا تھان بنو

جب اس تحریک کے سلسلے میں تمام مسلم رہنما گرفتار ہوئے اور صرف گاندھی اس سزا سے بچے رہے تو اکبر نے اس موقع پر کہا تھا:

پوچھتا ہوں: "آپ گاندھی کو پکڑتے کیوں نہیں"؟
کہتے ہیں: "آپس ہی میں تم لوگ لڑتے کیوں نہیں"؟
پیچ قسمت کے تمھارے جب دکھائیں گے کجی
عادلانہ رنگ میں اُٹھ کر کریں گے ہمججی

تحریک کے بارے میں اکبر کے احساسات کے چند مزید پہلو درج ذیل اشعار میں جھلکتے ہیں:

نہ مولانا میں لغزش ہے نہ سازش کی ہے گاندھی نے
چلایا ایک رُخ ان کو فقط مغرب کی آندھی نے
بجھی جاتی ہے شمعِ مشرقی مغرب کی آندھی سے
اُمیدِ روشنی قائم ہے لیکن بھائی گاندھی سے

اس وقت شیخ جی کو گاندھی سے میل سوجھا
صاحب نے روک چاہی ان کو بھی کھیل سوجھا
دونوں نے آخر اپنی نکاس دیکھی!
اسکیم ان کو سوجھی اور ان کو جیل سوجھا

بھائی گاندھی کا نہایت ہی مقدس کام ہے
رام پوری ساتھ ہیں اور رام ہی کا نام ہے
سن لو یہ بھید ملک جو گاندھی کے ساتھ ہے
تم کیا ہو صرف پیٹ ہو وہ کیا ہے ہاتھ ہے

بھائی گاندھی خودسری کی آرزو کے ساتھ ہیں
اور صاحب لوگ غربی رنگ و بو کے ساتھ ہیں

مالوی جی سب سے بہتر ہیں مری دانست میں
یعنی مندر میں ہیں اور اپنی گئو کے ساتھ ہیں

ہوں مبارک حضور کو گاندھی
ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پٹیں خوب اور سر نہ اُٹھائیں
اور کھسک جائیں جب کہو کھسکو
لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی حاجت کچھ نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیے

اکبر کے علاوہ ظفر علی خان بھی تحریکِ ترکِ موالات کے اہم نمایندہ شاعر تھے۔ اس وقت گاندھی کے بڑے معتقد تھے۔ عملی طور پر تحریک میں شریک رہتے تھے۔ جب گاندھی نے یہ تحریک شروع کی تھی تو اُنھوں نے کہا تھا:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل کو حق سے دست و گریباں کر دیا
ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیِ حیات کا سامان کر دیا
دشمن میں اور دوست میں ہونے لگی تمیز
کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کر دیا
دے کر وطن کو ترکِ موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا
اوراقِ جبر و جور و جفا کو بکھیر کر
شیرازہ حکومت کا پریشان کر دیا
ظلم و ستم کی ناؤ ڈبونے کے واسطے
قطرے کو آنکھوں آنکھوں میں طوفان کر دیا

❁ ❁ ❁ ❁
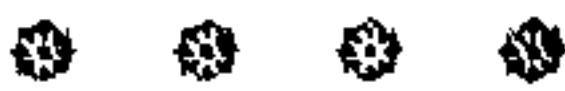
۵-تحریکِ آزادی

(الف) اکبر، چکبست کا دور

مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہنے کی وجہ سے ہندوستانی بالخصوص مسلمان اس قابل ہو چکے تھے کہ عوامی تحریکات کے طریقہ ہائے کار کو سمجھ سکیں۔ خاص طور پر تحریکِ خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش وخروش نے برِعظیم کی سیاسی سرگرمی میں ایک نئی زندگی پیدا کردی، اور اس کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کردیا تھا۔ بعد میں مسلمانوں کی جو حکمت عملی قرار پائی اس کی تشکیل میں مجلسِ خلافت کو نہیں بلکہ اس کی سعادت مسلم لیگ کو منفرداً اور دوسری جماعتوں کے ساتھ تعاون سے حاصل ہوئی۔ کانگریس کو بھی تحریکِ خلافت کی حمایت سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ تحریک عدمِ تعاون ختم ہوتے ہی ہندو مسلم تعلقات تیزی کے ساتھ خراب ہونے لگے۔ اس کا اثر کانگریس اور لیگ کے تعلقات پر بھی پڑا۔ اس کے بعد کے واقعات خود تحریکِ آزادی کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تحریک میں اپنی مخصوص حکمت عملی اور نصب العین کے ساتھ برِعظیم کے ہر طبقہ نے شرکت کی۔ اُردو شاعروں نے بھی اپنے جذبات آزادی کو کبھی مخفی نہیں رکھا۔ کسی نہ کسی انداز میں اسے ظاہر کردیا۔ بیشتر شاعروں نے کھل کر آزادی کے جذبات پیش کیے اور کئی شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے عوام میں آزادی کے جذبات کو بیدار اور مشتعل کیا۔ ان میں ولولہ، عزم اور اُمنگ پیدا کی۔

اکبر کی شاعری اپنے دور کی سیاسی ہیجانات کی بھی مظہر ہے۔ اپنے مخصوص لہجے میں اکبر نے برطانوی اقتدار اور اس کے اثرات کی مختلف صورتوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکات کے ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کو بھی واضح کیا ہے۔ اس میں شریک متضاد اور مختلف عناصر کے اندرونی اختلافات اور ذہنی رجحانات کو بھی واضح کیا ہے اور ایک حقیقت پسند مفکر اور صاحب بصیرت شاعر کی حیثیت میں اپنے احساسات اور جذبات بھی بیان کیے۔ انھیں یہ قلق رہا کہ وہ سرکاری ملازم ہیں ورنہ وہ بھی سرگرمی دکھاتے [1]

برطانوی حکومت اور اس کے اقتدار کے نتائج کے بارے میں اکبر جس قسم کے احساسات رکھتے تھے، اُنھیں ان کے درج ذیل اشعار ظاہر کرتے ہیں:

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتوں ہند کے دل کو لبھا لیتا ہے مِل کا افسوں
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں پائے کوہاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آواز مسلسل کبھی ایسی تو نہ تھی

تم نے دبا دبا کر اس ملک کو گھلایا مرزا پچک گئے اور گاندھی نے منہ پھلایا
فخر تھا اپنی چمک پر آپ کو دو ہی صدیوں میں ملمع کھل گیا
بلبلا اُٹھی رعایا ہر طرف عرش و کرسی تک فغاں کا غل گیا
بھاگ نکلے لوگ ہو کر بے قرار کوئی امریکہ کوئی کابل گیا

تمھارے فریادیوں کو دیکھا تمھارے عذرات بھی سنے ہیں
خفا نہ ہو جاؤ تو یہ پوچھیں کسی کا دل تم سے شاد بھی ہے

ہندوؤں اور مسلمانوں میں نظریاتی بُعد اور مفادات کی کش مکش جس انداز سے ہل چل پیدا کر رہی تھی، اکبر نے اس کا بھی مشاہدہ کیا تھا:

جونہیں مالوی اور شوکت علی لگے کرنے آپس میں سرگوشیاں
وہ بولے کہ کابل سے ہو گا گزند کریں گے ہم انگریز ہی کو پسند
یہ بولے کہ ہندو کا ہوگا جو رول ہم انگریز ہی کو کریں گے قبول

اس قسم کی صورتِ حال میں اکبر نے اس کے برے اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا، چناں چہ وہ ناصحانہ طریقے پر مخاطب ہوتے ہیں:

یہ سچ ہے کہ اصلاح ملی ہے فرض مگر سب سے ہے عاجزانہ یہ عرض
کہ تذلیل و توہین ملت نہ ہو جدائی جو ہو بھی عداوت نہ ہو
خواہ قہوہ ہو خواہ ہو انگور دونوں اب ہیں بہ قبضۂ لنڈور
قلمی جنگ گو ضروری ہے باہمی بغض بے شعوری ہے
تم دوسری مچان پہ بیٹھو نہیں ہے حرج بس اتنی بات ہو کہ نشانہ وہی رہے

انھیں اپنی قوم کی کم طاقتی کا احساس تھا، چناں چہ مایوسی کے ساتھ خاموشی کی تلقین کرتے ہیں:

زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ
کونسل میں سوال کرنے لگے قومی طاقت نے جب جواب دیا

یہ بت دل میں گھس آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
میرا تقویٰ کہاں تک ان کو روکے بلجیم بن کر

آزادی کا شور مبارک یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا عاقل کو خاموشی زیبا

چکبست کے تصورات میں زمانہ کی عام جھلک نظر آتی ہے۔ بر عظیم کی سیاسی زندگی میں پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد جو اہم سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں، چکبست ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور ہندوستان کے لیے کوئی بلند پیام تلاش نہیں کر سکے[2] وہ ہندوستانی عوام کے عام جذبات کی ترجمانی کرر ہے تھے۔ اس وقت ہندوستان انقلابات کی آماجگاہ بن رہا تھا اور چکبست اس کے ماضی اور حال کا مقابلہ کرر ہے تھے:

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار

اس وقت ان کی خواہش تھی کہ:

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے

مجموعی طور پر ان کی شاعری میں قومیت، معاشرتی اصلاح اور وطن پرستی ہی نمایاں ہیں۔ برطانوی حکومت سے ہوم رول حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ وہ حکومت کو اپنی وفاداری کا برابر یقین دلاتے اور کبھی کبھی دبی زبان سے حقیقتِ حال بھی بیان کردیتے تھے:

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک ستم گر نے
نہ میں ہندوستان کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

سیاسی جرأت کا اظہار ان کی شاعری میں بڑا محدود ہے:

زباں کو بند کریں مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے

ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ قومی رہنماؤں پر کہے گئے مرثیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں کہیں تو وہ حکومت برطانیہ کا تحسین آمیز انداز میں ذکر کرتے ہیں اور کہیں غیر ملکی حکومت کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جلیانوالہ باغ، امرتسر کے سانحہ پر ہندوستانیوں کے غم و غصہ کے جذبات کی بہتر عکاسی کی ہے:

اُنھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے
یہ رنگِ بے کسی رنگ جنوں بن جائے گا غافل
سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے
اُمیدیں مل گئیں مٹی میں دورِ ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

مولانا محمد علی جوہر کی بیشتر غزلیات چھندوارہ کی نظر بندی کے زمانہ کی تخلیق ہیں۔ وہاں سے وہ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہو کر امرتسر پہنچے تھے، جہاں کانگریس، لیگ اور مجلس خلافت کے جلسے ہو رہے تھے۔ شاعری کی طرف وہ مستقلاً کبھی متوجہ نہ ہو سکے۔ ان کی بے پناہ سیاسی مصروفیات اس کے لیے ہمیشہ مانع رہیں۔ نظر بندی اور ایام اسیری میں ان کی شاعری تخلیق ہوتی رہی اس لیے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ دلگداز سانحات کے اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ نظر بندی سے قبل ان کے کلام کا انداز یہ تھا، وہ سید احمد خاں کی یاد میں انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

جب چھندوارہ جیل میں نظر بند تھے تو اُنھوں نے اپنے جذبات کو جس طرح شاعری میں سمویا تھا، اس کا انداز یہ ہے:

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو　　ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد　　ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
ہے بدترین عذاب یہی اک شریف پر　　یا رب کرائیو نہ اطاعت لعین کی

خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

اور جب وہ جبل پور میں قید تھے، تو ان کے کلام کا انداز یہ تھا:

یوں تو ہے ہر سو عیاں آمد فصل خزاں
جور و جفا کی بہار دیکھیے کب تک رہے
رونقِ دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی
یوں ہی یہ اجڑا دیار دیکھیے کب تک رہے

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کرکے سب کے تنکے کیے برباد آشیانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے ذرا پر باندھنا صیاد کس کے
نشانِ آشیاں کیا جس چمن میں لگے ہوں ڈھیر ہر سو خار و خس کے
ملی ہے قید آزادی کی خاطر نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے

حیات کے علاوہ ان کی شاعری اپنے زمانہ کے حادثات و واقعات پر ان کے تاثرات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو دہلی میں جو سانحہ پیش آیا تھا، اس وقت وہ نظر بند تھے [۳] اس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے اپنے تاثرات کو اشعار میں پیش کیا تھا:

لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جورِ اغیار ہو زمانہ سے الگ طرز فغانِ دہلی
سرفروشی کے لیے پیر و جواں ہیں تیار آج رونق پہ ہے کس درجہ مکان دہلی
سنگ ریزوں سے زیادہ نہیں گولی چھرے لاکھ روکا نہ رکا سیل روان دہلی
حق کے آتے ہی ہوا کعبہ سے باطل رخصت چند دن اور ہیں دہلی میں بتان دہلی

(ب) اقبال، ظفر علی خاں، جوش کا دور

اقبال نے قوم پرستی کو، جسے وطنیت کا جدید نام ملا ہے، سب سے زیادہ تباہ کن اور مذہب کے منافی بتایا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ مسلم ملت اور دنیائے اسلام ناقابل تقسیم ہیں [۱] ساتھ ہی بے عملی اور جمود سے انھیں سخت نفرت تھی، وہ ایسے عقائد کے قائل نہ تھے جو اپنے آپ کو عمل میں منتقل نہ کر سکیں:

تا ز اسرار تو بنماید ترا　　امتحانش از عمل باید ترا

پختگی رائے اور ابتدائی دور کے جذبات کی ترجمانی کے بعد اقبال کی شاعری میں ایک مستقل مزاج پیدا ہوگئی تھی وہ سیاسی اور تہذیبی مسائل کو ایک مفکر شاعر کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ زمانۂ قیام یورپ کے مشاہدات نے ان کی فکر و نظر میں جو وسعت پیدا کی تھی، مسلم ممالک کے مسائل و حادثات سے ہم آہنگ ہونے کے بعد اس میں مفکرانہ گہرائی پیدا ہوگئی تھی اور وہ ملّی نقطہ نظر سے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر مستقبل کے امکانات پر تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے سیاست میں دل چسپی لینے لگے تھے[2] اور وہیں سے سودیشی تحریک کی بھرپور حمایت کی تھی[3] انگلستان سے واپسی کے بعد مستقل مسلم لیگ کے رکن رہے اور اس کی جانب سے وہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہوئے[4] کل ہند سیاست میں وہ بعض بنیادی مسائل میں اپنی فکر و رائے پر پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ جداگانہ انتخاب کو وہ مسلمانوں کی حیات قومی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ نہرو رپورٹ کے مخالف رہے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۹ء میں شرکت کی اور مسلم مطالبات کی ترتیب میں حصہ لیا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کی اور اپنا تاریخی خطبہ پیش کیا جس میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے حصول کو مسلمانانِ ہند کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ بعد میں ان کی ساری کاوشیں اسی امر پر مرکوز رہیں کہ ہندوستان کے آیندہ دستور میں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ موقف حاصل کیا جائے اور ان کے جداگانہ حقوق کا تحفظ کیا جائے[5]

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ جامد اور رجعت پسندانہ طرزِ فکر پر سختی سے تنقید کی ہے۔ وہ اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی بھی ضرورت سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے مغربی تہذیب پر نکتہ چینی اس لیے کی کہ اس میں ایسی بنیادی کمزوریاں موجود تھیں جو پے در پے جنگوں کا موجب ہوئی ہیں اور روحانی اقدار کی طرف سے یہ تہذیب روز بروز بے اعتنا ہوتی جارہی ہے۔ ایک قوم کی طرف سے دوسری قوم پر بے انصافی کی تمام برائیوں کے لیے اور ان جنگوں کے لیے جو بے گناہوں اور کمزوروں پر تباہی لاتی ہیں، قوم پرستی کو ملزم قرار دیا۔ اُنھوں نے اس اصول پر انتہائی زور دیا کہ مسلم ملت زمان و مکان میں محدود نہیں۔ چوں کہ قوم پرستی اور اسلام متناقص ہیں اس لیے مسلم ملت کو زمان و مکان میں محدود نہیں رہنا چاہیے، چناں چہ وہ ہر قسم کی، خصوصاً جغرافیائی پابندی کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی عبارت تھی

آزادی سے:

بندگی میں گھٹ کر رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

انھیں اپنی اور اپنی قوم کی غلامی کا شدید احساس تھا۔ ان کا یہ احساس یا جا بجا عیاں ہے:

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اور اپنی خوشی سے جانا
معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
میرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستان کا
وہ گل ہوں میں کہ ہر اک گل کی ہے گویا خزاں میری
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

تقسیم بنگال کی تنسیخ پر اقبال نے کہا تھا:

مندمل زخم دلِ بنگال آخر ہو گیا   وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آگیا   مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

''غرہ شوال یا ہلالِ عید'' کو بلندی پر دیکھ کر اُنھوں نے اپنی قوم کی پستی کا احوال اسے دکھانا چاہا تھا:

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے   اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے
دیکھ کر تجھ کو اُفق پر ہم لٹاتے تھے گہر   اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر   اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ

تحریکِ خلافت کے دوران جب مولانا محمد علی گرفتار ہوئے تو ان کی اسیری پر اقبال نے جو نظم لکھی تھی، اس کے چند شعر یہ ہیں:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک ازفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک ہو جاتی ہے ہوکر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند

اقبال نے کھل کر برطانوی اقتدار اور انگریزوں کو ملزم قرار دیا تھا:

پردہ اُٹھا دوں اگر عالم افکار سے   لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر   کہ جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے

جلیانوالہ باغ کے سانحہ پر اقبال نے کہا تھا:

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ   غافل نہ رہ جہاں میں تو گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم   تو آرزوؤں کا نخل نہ کر اس نہال سے

مستقبل سے بڑے پُر امید تھے۔ چناں چہ اقبال کہتے ہیں:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات کہہ نہیں سکتے مجھ نومید پیکار حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پہ مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اقبال کی شاعری کا زیادہ تر حصہ درس خود آ گاہی، آزادی اور پیغامِ عمل پر مشتمل ہے۔ وہ آزادی اور محکومی کے فرق کو جا بجا بیان کرتے ہیں:

آزاد کی ایک آن ہے محکوم کا ایک سال کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگِ سنگ محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگِ تاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک
موت ہے سخت تر جس کا غلامی ہے نام مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام

اور پھر آزاد انسان کی قدر و قیمت اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

شاہین کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاک چمنستان شرر آمیز
اس مرد خود آگاہ و خدامست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

چناں چہ اقبال محکوموں اور غلاموں کو اپنے مخصوص انداز میں آزادی کے حصول کا پیغام دیتے ہیں:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

اثر کچھ خواب کے غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری میں جدوجہد آزادی کے مختلف مراحل کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ یہ اپنے میں تمام تحریکات کے ہنگامی ہیجان و اضطراب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری کے جائزے سے ایک تو اس دور کی سیاسی صورتِ حال سے بھی واقفیت ہوتی ہے اور دوسرے ایک شاعر کی عملی رہنمائی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں مجموعی طور پر ایک تو مسلمان کی موجودہ زندگی کے ادبار و زوال کی طرف اشارہ، دوسرے مستقبل میں اس کے عروج و اقبال کا یقین اور اس کی پیش گوئی ملتی ہے:

لیکن یہ قوم آج زمانہ میں ہے ذلیل حالاں کہ تھی تمام زمانہ کا انتخاب
صدہا تیرے غلام نصاریٰ کی قید میں دن زندگی کے کاٹ رہے ہیں بصد عذاب
دنیا کے گوشے گوشے میں ہے گرچہ آج کل اُمت تیری رہینِ ستم ہائے روزگار

برطانوی حکومت سے وفاداریوں کے صلہ میں محکوم ہندوستانیوں کو جو کچھ ملا تھا، اُمیدوں اور آرزوؤں کا ماحصل، اس سارے پس منظر کو ظفر علی خاں نے اپنی ایک نظم "ڈیڑھ سو سال کی وفاداری کا صلہ" میں بیان کیا ہے۔ اس کے چند شعر ہی ان کے احساس و جذبہ کو بیان کر دیتے ہیں:

ہو کسی طرح مجھ سے خوش انگریز میری کوشش یہ انتہائی تھی
میں جو حاکم تھا خود بنا محکوم یہ بھی اک شان کبریائی تھی
آج میں ہوں اور اس کی ٹھوکر ہے کہ اسی تک میری رسائی تھی
آج روتا ہوں کہ کیوں میں نے اپنی بنیاد آپ ڈھائی تھی

برِعظیم کی سیاست میں جو انقلاب آتے رہے اور ہندوستانیوں پر جو بے حسی طاری رہی، اس کا انھیں جو دکھ اور افسوس تھا، اس کا اظہار اُنھوں نے اس طرح کیا تھا:

انسان سے چھین لی گئی آزادیِ ضمیر لیلیٰ کے ناقہ کے لیے محمل نہیں رہا
لندن کی عافیت کبھی جس سے ہوئی تھی تنگ زنداں میں اب وہ شور سلاسل نہیں رہا
آزادیِ حیات کی جس دل میں تھی تڑپ اب پہلوئے وطن میں وہی دل نہیں رہا

جلیانوالہ باغ کے خونیں سانحہ نے سارے ملک میں بیداری کی لہر دوڑائی تھی اور اس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاسی انقلاب کا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ چناں چہ ظفر علی خاں نے اس سانحہ کو

[ج]ش آمدید کہا تھا:

زندہ باد اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند
گرمیاں جس کی فروغِ مشعلِ جاں ہو گئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی تاریکیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں
جن بلاؤں سے گھرے رہتے تھے صبح و شام ہم
تیرے آتے ہی وہ انگریزوں کی درباں ہو گئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پر قرباں ہو گئیں

اسی سانحہ کے تعلق سے ایک اور نظم ''مظالمِ پنجاب'' بھی لکھی تھی، جس کے چند شعر یہ ہیں:

میں نے امرتسر میں ایک دن اپنے خواجہ سے کہا
پیٹ کے بل رینگ لیجیے بندہ پرور آپ بھی
بیسیے جا کر جیل میں اور کھائیے ارہر کی دال
میہماں رہیے ذرا سرکار کے گھر آپ بھی
پھر یہ کہیے مارشل لا حشر تک قائم رہے
ورنہ ہوں گے منکرِ جنرل اڈوائر آپ بھی

اسی سلسلے کی ایک دوسری نظم ''جنرل اڈوائر کی یاد میں'' ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں   بچارے نے نہتوں پر دیا کب حکم فائر کا
مسلمان اور ہندو کو بھی ہے ناز اپنے سینے پر   اسے گر غرہ ہے بارود گولی کے ذخائر کا

مختلف سانحات اور واقعات سے ہندوستانیوں میں بیداری کا جو شعور پیدا ہو چکا تھا، اس صورتِ حال میں ظفر علی خاں نے انھیں دعوتِ عمل دی، تاکہ وہ برطانوی استبداد سے نجات حاصل کر سکیں۔

اگر تم کو حق سے ہے کچھ بھی لگاؤ تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ
حکومت کو تو تم نے لیا آزما اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ
ہو تم جس کے ذرے وہ ہے خاک ہند چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ
ہمالہ بھی آ جائے گر راہ میں تو ٹھکرا کے آگے سے اس کو ہٹاؤ
کرے تم سے گنگا بھی گر بے رُخی پلٹ کر الٹ دو تم اس کا بہاؤ

ایک دور میں ظفر علی خاں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں وہاں تم مسلمان کا خون بہاؤ
زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار تو اس پر بساط اخوت بچھاؤ
بھریں گے یہ برسوں میں جاکر کہیں ۔ مسلمانوں کے پہلو کے گہرے ہیں گھاؤ

جب تحریک ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا تو اُنھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا:

آئی ہیں آسمان سے چل کر وہ قوتیں جو مسلم اور ہندو کو شیر و شکر کریں

اسی زمانہ میں انھیں گاندھی سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ اس کا اظہار اُنھوں نے متعدد نظموں میں کیا تھا:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کردیا باطل سے حق کو دست و گریباں کر دیا
ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک کر آزادیِ حیات کا ساماں کر دیا

وہ پیسے پیسے کا چند دن میں فرنگیوں سے حساب لے گا
لنگوٹی والا ہمارا گاندھی مہاتما بھی منیم بھی ہے

لیکن جب گاندھی نے واردھا کا تعلیمی منصوبہ تیار کیا تو ظفر علی خاں اس کے مخالف ہو گئے اور پھر شدھی اور سنگھٹن تحریکوں کے شروع ہونے کے بعد وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی بھی نہ رہے۔ بعد میں کانگریس کے عزائم کی تہ تک پہنچ کر اس سے علاحدگی اختیار کی اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور پھر ہر اس تحریک کی مخالفت کی جو ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف یا صرف اپنے ہی فائدے کے لیے شروع کی جاتی تھیں۔ چناں چہ جب واردھا سکیم کا منصوبہ گاندھی نے پیش کیا تو ظفر علی خاں نے کہا تھا:

پہلو میں ہو دل دل میں ہو یقیں سر پر کفن کف میں ہو سناں
جب جمع یہ اجزا ہوتے ہیں بنتا ہے قوام آزادی کا

گاندھی کی نظر یثرب کی طرف اُٹھ جاتی تو خیر ایک بات بھی تھی
یہ کیا ہے کہ سمجھے بیٹھے ہیں واردھا کو مقام آزادی کا

اے سامریِ وقت کہ گاندھی ہے تیرا نام
کہتے ہیں نصاریٰ کا تجھے بندۂ بے دام
ہندو کو مسلمان سے لڑانا ہے تیرا کام
ہم کو نظر آتا ہے جو ہوگا تیرا انجام، اے دشمن اسلام

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اُٹھتی آندھی ہے

اسی طرح جب ہندوؤں کی جانب سے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کی گئیں جن کا مقصد مسلمانوں کو "پاک" کرنا یا اپنے مذہب میں شامل کرنا تھا، تو ظفر علی خاں نے ان تحریکوں کی پُر زور مخالفت کی۔ خود ان تحریکوں کے نتیجہ میں ملک بھر میں جا بجا فسادات ہوئے۔ اس وقت ظفر علی خاں نے اپنے غم اور افسوس کی کیفیت کو اپنی شاعری میں متعدد نظموں کے ذریعہ پیش کیا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

فتنہ کہیں گیا جو ملیبار کا بپا پیدا کہیں پہ قضیۂ ملتان کر دیا
جان سنگھٹن سے ہوگئی خطرہ میں مبتلا شدھی نے بڑھ کے رخنہ در ایمان کر دیا

سنگھٹن اور شدھی کا جھمیلا یہ نہ سمجھے ختم ہوا
اور ابھی اس میں دیکھتے رہیے کتنے بکھیڑے پڑتے ہیں

ہندو کی آنکھ کاش زمانہ ہی کھول دے
مسلم تو اپنے فرض سے غافل نہیں رہا
جو کوشش آشتی کی ہوئی رائیگاں گئی
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا

کہیں مسلم بھی بن سکتا ہے کافر
کہیں مومن بھی ہو سکتا ہے شدھی
ملیبار سے تا بہ اقصائے خیبر
ضیا ریز ہے مالوی جی کا جلوہ

کوئی مالوی جی سے جا کر یہ کہہ دے ستائے ہوؤں کو اگر تم نے چھیڑا

تو نکلے گا بے اختیار ان کے منہ سے کرو غرق گنگا میں شدھی کا بیڑا
جہاں گیریِ دینِ برحق کی زد سے بچے گا نہ بھارت کا کوئی بھی کھیڑا
ہیں ہم تم سے خوش اور ہمارا خدا خوش اگر چھوڑ دو سنگھٹن کا بکھیڑا

جب کانگریس کے ہمنوا تھے، تو کئی نظمیں اس کی مدح میں لکھی تھیں۔ ایک نظم کا آخری شعر یہ ہے:

ہندوؤں کو ملاتا ہوں میں مسلمانوں سے کانگریس کی میں سفارت بھی کیا کرتا ہوں

اور جب اس سے منحرف ہوئے تو کہا:

ادب نماز کے اوقات کا وہ سیکھے گی میں کانگریس کو مسلمان بنا کر چھوڑوں گا

ظفر علی خاں بڑے پُر امید تھے کہ بہت جلد برطانوی اقتدار ختم ہو جائے گا اور ہندوستان کو آزادی حاصل ہو جائے گی:

پرانا ہوا دفتری اقتدار سمجھ لو بس اس کا بھی ہے چل چلاؤ
کسی روز خود غرق ہو جائے گی بہت بہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ

تمام اس ملک میں ہو کر رہے گا نورِ حق ایک دن
مہ نو لائے گا حجت میں اپنی ناتمامی کو

وقت آپہنچا کہ ہو برپا نیا ایک انقلاب
اور یہ نظمِ زندگی بار دگر منظوم ہو
وقت آپہنچا کہ ہو تقسیم قوموں کی نئی
اک نئی دنیا ہو اور اس کا نیا مقسوم ہو
وقت آپہنچا کہ پھر ہو زندہ آئینِ کہن
پھر بہارِ باغِ گیتی اُمتِ مرحوم ہو
پھوٹنے والی ہے آزادی کے سورج کی کرن
اُٹھ رہا ہے پردۂ شب ہائے تا بہ انقلاب
سر بکف میدان میں آپہنچے جوانانِ وطن
جن کی قربانی پہ ہے دار و مدار انقلاب
وقت آپہنچا ہے کہ یا مر جاؤ یا آزاد ہو
تخت یا تختہ ہے حکمِ تاجدارِ انقلاب

شہسوار آزادیِ کامل کا ہے اس میں نہاں
بیٹھتے ہی خود دکھا دے گا غبار انقلاب

ان کی شاعری حریت پسندی اور وطن دوستی کے جذبات سے مزین ہے۔ اس میں عملی کردار بھی ہے اور دعوتِ فکر اور درسِ عمل بھی۔

گر اپنے خون سے کر سکتا ہو تو اس کی حنا بندی
عروس ملک ہو سکتی ہے تجھ سے ہمکنار اب بھی
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
آزادیِ کامل کا علم ہاتھ میں لے کر
میدان میں جاتے ہوئے ایمان کا بگل بجاؤ

بڑی بے باکی و دلیری سے برطانوی حکومت کو ہندوستان کی محکومی کا مجرم اور اس کے ظلم و ستم کو بیان کرتے ہیں:

جب آئے ہم جیل میں تو ہم پر کھلا فرنگی ازل کے دن سے
دروغ گو بھی ہے، حیلہ جو بھی کمینہ بھی ہے لئیم بھی ہے
نہ سوویٹ سے نہ ایران کے کج کلاہ سے ڈر
مگر ستم زدہ ہندوستان کی آہ سے ڈر
الگ الگ رہے برسوں ملے ہیں اب آکر
دل اور عقل کی اس تازہ رسم و راہ سے ڈر
ہیں نئی روش کی عدالتیں، ہیں نرالے ڈھنگ کے فیصلے
نہ نظیر ہے نہ دلیل ہے نہ وکیل ہے نہ اپیل ہے
ہیں کسی کے پاؤں میں بیڑیاں تو کسی کے گھر کی ہیں قرقیاں
نہ نظیر ہے نہ دلیل ہے نہ وکیل ہے نہ اپیل ہے
پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ
اُمت مرحوم پر کیا کیا ہیں احسان فرنگ

زمانہ قید کا برطانیہ کے زندانی
مصیبتوں میں خوشی سے گزار دیتے ہیں

۱۹۳۵ء میں جب نیا قانونِ ہند نافذ ہوا تو ظفر علی خان نے کہا تھا:

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے ایک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لیے شمپیئن بھر لی جام میں ہند کے رندان دُرد آشام کو ٹھرا دیا
میوہ خوری کے لیے چننے لگے جب گول میز رکھ لیا خود مغز چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا

وہ آزادیِ کامل کے خواہاں تھے اور ان کی ساری جدوجہد اسی مقصد کے لیے وقف رہی۔ اپنی شاعری میں اُنھوں نے اپنی جدوجہد، جذبات اور عزائم بکثرت پیش کیے ہیں:

قسم ہے جذبۂ حب وطن کی بے پناہی کی
ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا
برطانیہ کی چھڑ گئی ہندوستان سے جنگ
حالاں کہ اس سے جنگ ہے سارے جہاں سے جنگ
میرے جیسے ہوں گے پیدا سینکڑوں اہل سخن
نکتہ نکتہ جن کی آزادی کی جاں ہو جائے گا
ہم کو سودا ہے غلامی کا کہ ہے آزادی کی دھن
چند ہی دن میں ہمارا امتحاں ہو جائے گا
ازل کے روز سے بار امانت کا ہوں میں حامل
خدا کا فضل بے پایاں ہے میرے حال کو شامل
مسلماں ہوں میرا مقصود ہے آزادیِ کامل
قسم ہے سرور کونینؐ کی جان گرامی کی
کہ اک جھٹکے میں توڑوں گا میں زنجیریں غلامی کی

جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے امتیاز رکھتے ہیں۔ اُنھیں انقلابی شاعری میں جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ جن تصورات کو اُنھوں نے اپنا موضوع بنایا تھا وہ اس وقت کے ہندوستان کے لیے مشترک اور عام تھے۔ مثلاً نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق کی مذمت اور معاشی جبر و استحصال کی مخالفت۔ اس کے علاوہ ان کی قادر الکلامی نے پورا اظہار کیا جن سے ان کی ہنگامی اور وقتی

موضوعات کی حامل شاعری کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ اُنھوں نے اپنی فطری اُپج کے ذریعہ ہمیشہ استعمار اور جبر و استبداد سے بغاوت کا اظہار کیا۔ آزادی کی قدر و قیمت اس طرح بیان کرتے ہیں:

سنو اے ساکنان خاک پستی ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

اشتراکیت کے حامی رہے، اس لیے استعماریت یا سامراجیت سے ان کی نفرت یقینی تھی۔ اُنھوں نے جابجا برطانوی اقتدار اور تسلط سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف متعدد نظمیں تخلیق کیں۔ ایسی نظموں میں ''وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام''، ''وفاق''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام''، ''دام فریب''، ''شکست زندان کا خواب''، ''نئے مہرے''، ''ہنٹر کو سلام'' زیادہ مثالی ہیں۔ مختلف نظموں سے ان کے چند منتخب شعر درج ذیل ہیں:

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر اے مفلسوں کے بادشاہ

دل کے دریا نطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں

آپ کے ہندوستان کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پر ایک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں

آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قوم نامراد
کھانے جاتا ہے اسے خدام عالی کا عناد

گرم ہے سوز بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی

آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی
ہندیوں کے سانس سے آتی ہے بو بارود کی

چونکیے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہوجانے کو ہے

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

سائمن کمیشن کی آمد پر نظم ''دامِ فریب'' میں کہتے ہیں:

لگی ہے گھات میں مدت سے تیری فرنگی کی نگاہ جادوانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ
برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

۱۹۳۵ء کے آئین کے نفاذ پر کہا تھا:

ہُشیار اہلِ ہند کہ پھر اس زمین پر گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

جب کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا گیا تو ایک نظم ''تشلیثی فریب'' میں اس کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا تھا:

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہلِ مشن شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں
جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلالِ شاہی سے حضور حضرت ویول جھکائے جاتے ہیں
بجا رہے ہیں بلندی پہ ساز آزادی ''وٹو'' کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں

اسی طرح کرپس مشن کی آمد پر لکھا تھا:

بڑی کاریگری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں
نئے دھوکے نئے حیلے نئے چکمے نئے جھانسے
ہزاروں تجربوں کے بعد اب یہ عقل آئی ہے
کسے تھپکے کسے گھُرکے کسے چھوڑے کسے پھانسے

جب تحریک آزادی میں شدت پیدا ہوگئی اور ہر طرف شورشیں اور ہنگامے برپا ہونے لگے اور علانیہ حکومت کی مخالفت شروع ہوئی تو جوش بڑے پُر امید تھے۔ اُنھیں سیاسی انقلاب کی آمد کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ان کا یہ احساس درج ذیل شعروں میں ظاہر ہوتا ہے:

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں
وہ سرنگیں کھد رہی ہیں الحفیظ و الامان
صرف انگلستان کیا یورپ سما جائے جہاں •

ان کی نظمیں ''مستقبلِ ہندوستان'' اور ''لیلائے آزادی'' بھی اسی احساس کی مظہر ہیں۔ ان کی ایک نظم ''وقت کی آواز'' سیاسی مسدس ہے۔ اس میں اُنھوں نے اس وقت کی سیاسی صورتِ حال پر مادرِ وطن کی زبان سے سیاسی صورتِ حال پر تبصرہ اور تنقید کی ہے۔ مادر ہند اس نظم میں اپنے بیٹوں کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ سے خطاب کرکے اُنھیں زمانہ کے حالات اور سامراج کی سازشوں سے آگاہ کرتی ہے اور باہمی اتفاق واتحاد پر آمادہ اور حصولِ آزادی کی جدوجہد پر اُبھارتی ہے:

اُٹھ اور ہلا کے رکھ دے یہ میدانِ ہست و بود اغیار کو پیام عدم دے ترا وجود
بڑھ اور طوق کاٹ دے زنجیر توڑ دے رختِ شہاں پر آگ کا دامن نچوڑ دے

جوش کا یہ انداز، جس میں وہ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کے حصول کے لیے اُبھارتے ہیں کئی نظموں میں موجود ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ
تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر
آرہی ہے دست استبداد سے باد سموم اور محکومی سمجھتی ہے نسیم خوشگوار

ہوشیار
اے مردِ غافل ہوشیار
غیر کی خدمت گذاری باہمی خون ریزیاں
دوپہر کی دھوپ سر پر اور یہ خواب گراں
حیف اے ہندوستان صد حیف اے ہندوستان
رعب تیموری، کہاں جاکر کروں تجھ کو تلاش
عزمِ گردان بھارت تجھے ڈھونڈوں کہاں

حیف اے ہندوستان صد حیف اے ہندوستان
گردنیں طوق غلامی سے ہوئی جاتی ہیں کج
اے کڑکتی برق گر اے جھومتے بادل گرج
تا کجا یہ خواب اے ہندوستان آ ہوش میں
آج بھی ہیں سینکڑوں ارجن تیری آغوش میں
آ رہی ہے کب سے رہ رہ کر صدائے انقلاب
زندہ ہے تو اے وطن دیتا نہیں پھر کیوں جواب
زندہ ہے تو میری ہمت کو پر پرواز دے
وہم ہوتا ہے مجھے آواز دے آواز دے
یہ اجل کی بے حسی ہے یا فقط خواب گراں
بول اے ہندوستاں ہندوستاں ہندوستاں

حسرت کی شخصیت ایک طرف تو جدوجہد کی پابند ہو کر اپنے ملک اور قوم کے لیے وقف تھی اور دوسری طرف اس ماحول کی تلخی سے بچ کر تخیل اور رومان کی دنیا کی متلاشی ہے:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

شاعری میں حسرت قدیم رنگ سخن کے حامل تھے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے ماحول کی تلخیوں، سیاسی پابندیوں اور غلامی کے احساس سے محبوب کی ذات میں گریز چاہتے ہیں۔ گویا یہ گریز پائی پریشان ذہن کے لیے ان کی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ ان کے فکر و عمل پر جو سیاست غالب تھی وہ ان کے تخیلات کی دنیا میں بھی موجود رہی۔ اس طرح ان کے کلام میں وہ شورشیں صاف نظر آتی ہیں جو اس وقت ان کے ماحول میں پیدا ہو رہی تھیں:

غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذاتِ خاص پر ناز کا اعتبار کر

ملک کی سیاسی اور اقتصادی ابتری کی وجہ سے حسرت نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے سیاسی اُمور میں پوری سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا:

تحریک حریت کو جو پایا قرین حق ہر عہد میں معاون تحریک ہم رہے

ابتداءً بال گنگا دھر تلک ان کا محبوب سیاسی رہنما تھا۔ اس سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے اور ان کے سیاسی نظریات بھی اس سے ہم آہنگ تھے۔ چناں چہ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار حسرت نے اس طرح کیا تھا:

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیِ بے باک کی تجھ سے اہل اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید و محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی تھے گرفتار غلامی ورنہ یارانِ وطن

حسرت آزادی کامل کے خواہاں تھے۔ ہمیشہ برطانوی حکومت کے مخالف رہے اور اسے اُنھوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس کے جبر، ظلم اور نظامِ حکومت کی مخالفت کرتے رہے:

غیر ممکن ہے ہم سے طاعت غیر
اے جفا کار، اے غریب آزار
ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے
روح آزاد ہے خیال آزاد
جسم حسرت کی قید ہے بیکار
باطن میں ہیں آزاد بظاہر نظر بند
ہیں دیدۂ دل باز یہاں دیدۂ سر بند
بیکار ڈراتے ہیں مجھے قید ستم سے
واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی
ہو جنھیں شوقِ شہادت اُنھیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ نرم اگر ہے درپیش
کچھ مرے دل ہی سے موقوف نہیں لذتِ غم
خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے

چوں کہ آزادیِ کامل کے طلب گار تھے اس لیے دستوری اصلاحات یا اس قسم کے کسی اور وعدہ پر مطمئن نہ رہے اور جب کبھی برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے کوئی دستوری اصلاح یا مراعات

تجویز کیں، حسرت نے مخالفت کی۔ مانٹیگو کی دستوری تجاویز پر کہا تھا:

کس درجہ فریب سے ہے مملو تجویز رفارم مانٹیگو
کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو جن میں نہیں نام کو خوشبو
اے ہندی سادہ دل. خبردار ہرگز نہ چلے تجھ پہ یہ جادو

دوسرے مواقع پر بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا:

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا خلق خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم جبر بہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے

اوائل بیسویں صدی میں جب مسلم یونی ورسٹی کے قیام کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا تھا، اس وقت اکابرین کی یہ کوشش بھی تھی کہ جب تک یونی ورسٹی آزاد نہ ہو یونی ورسٹی کے ''چارٹر'' کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حسرت بھی اس خیال کے حامی تھے، چناں چہ اُنھوں نے کہا تھا:

اربابِ فریب کی ہے یہ بھی ایک چال بیکار ہے ''بہترین و بہتر کا خیال''
گنجائشِ بہتری غلامی میں کہاں لاریب ہے اجتماع ضدین محال

تحریکِ خلافت کے دنوں میں حسرت، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلم محاذ سے قطع نظر اسلامی محاذ کے قائل ہو گئے تھے اور پھر بعد میں جب گاندھی سے اختلاف کر کے مسلم لیگ کے اجلاس میں آزادی کامل کی قرارداد پیش کی اور پھر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس ہو چکے تھے۔ بعد میں اس کی توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ تحریک آزادی کے آخری مرحلہ پر اُنھوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت شروع کر دی تھی۔

ان کی ساری سیاسی جدوجہد آزادیِ کامل کے لیے تھی۔ اُنھوں نے تین مرتبہ گرفتاری کے بعد حکومت کے جبر و ستم سے خوف محسوس نہیں کیا۔ ہر موقع پر یہی کہتے رہے:

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں پھیلے گی یونہی شورش حب وطن تمام
سمجھے ہیں اہل شرق کو شاید قریب مرگ مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

وہ بہتر مستقبل کی جانب سے پُر امید رہے۔ اُنھیں یقین تھا کہ یہ سیاسی غلامی اور غیر ملکی اقتدار جلد ختم ہو جائے گا۔ اس یقین کا اظہار اُنھوں نے متعدد پیرایوں میں کیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی — نہ حکام کا جور بے جا رہے گا
دستور کے اصول مسلم ٹھہر چکے — شاہی بھی رام غلبۂ جمہور ہو چکی
دولت ہندوستان قبضۂ اغیار میں — بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

ان کی شاعری میں پیغام عمل بھی ہے۔ چناں چہ وہ اہل وطن کو حصولِ آزادی کے لیے متحد اور منظم ہونے کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہل مغرب کی چالیں — مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بیکار ہو کر
ابھی ہم کو سمجھے نہیں اہل مغرب — بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی — نکل آؤ بے رحم و خون خوار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
غلبۂ کذب متحد معلوم — حق ہے بے خوف کثرت افواج
اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو — ہمت سربلند سے جس کا انسداد کر
خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار — فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ دار کر

حسرت کی شاعری کا سیاسی عنصر جذبہ حریت اور غلبہ اسلام کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے مذہبی اور سیاسی عقائد کے نقوش ملتے ہیں، جو اس امر کے گواہ ہیں کہ آزادی کی تحریک کن مراحل سے گزر رہی ہے۔ یہ خصوصیاتِ کلام عبدالمجید سالک کی شاعری میں بھی مجتمع ہیں۔ وہ بھی دیگر شاعروں کی طرح سے آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں جذباتی لہجہ اور مسلمانوں کے لیے دلسوزی کے تاثرات نمایاں ہیں۔ وطن کی غلامی کی خلش اضطراب کی صورت میں ان کی شاعری میں ظاہر ہوئی ہے:

اس انجمن میں یہ دستور کہ مرغان اسیر
قید میں رہ کے ہوا خواہِ صیاد کریں
کچھ ایسا چھایا ہے خوف صیاد اپنے گلشن کی انجمن پر
خموش بیٹھے ہیں ہم نوا سب کسی کو تاب سخن نہیں ہے

مٹی حکومت کے ساتھ ہی آہ اپنی وہ آن بان ساری
وہ شان زمزم نہیں سلامت وہ شور گنگ وجمن نہیں ہے
غلامی کے قفس میں اب تو دم گھٹنے لگا اپنا
چمن میں فصل گل آئی اسیروں کو رہا کر دے

لیکن ایسی صورت میں سالک کو مسلمانوں کے روشن مستقبل پر پورا ایمان ہے:

یہ زمان حال ہو جائے گا ماضی ایک دن
ایک عظیم الشان مستقبل ہے میرے روبرو
رشک شان دوش ہوگی شوکت فردائے قوم
جاگ اُٹھے گی عظمت دیرینۂ ہندوستان
وہ دن آنے کو ہے جب منقلب دور زماں ہوگا
مسلمانوں کے حق میں انقلاب آسماں ہوگا
صنم خانوں میں گونجے گی صدا اللہ اکبر کی
منورؔ نیرِ توحید سے ہندوستاں ہوگا
نہ اب تک دب سکا جو دین حق مغرب کی توپوں سے
دبائیں گی اسے کیا سنگھٹن والوں کی تقریریں

سالک کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اس کا درسِ عمل، ترغیب آزادی اور پیغامِ بیداری ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

صدا آئی سروش غیب کی کل گوش مسلم میں
کہ اے پابند زنجیر طلسم ہیچ مقداری
تزلزل ڈال دے ایوانِ استبداد میں ایسا
کہ استحکام حریت ہو اس گھر کی نگوں ساری
تابکے طوق غلامی میں رہے گی گردن
جس میں سودائے حکومت ہو وہ سر پیدا کر
آزاد ہو کے کس لیے یہ گل ہوا اے سروِ ناز باغ میں مشق خرام کر
مسلمانو جنوں کو تازہ کرلو پھر بہار آئی اگر منظور ہے کٹ جائیں محکوموں کی زنجیریں

سالک نے بجا طور پر اپنی عملی جدوجہد کے ساتھ شاعری کو بھی شریک رکھا تھا۔ خود بھی سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے اور زمیندار اور انقلاب کے ذریعہ بھی آزادی کے طلب گار اور ملت پرست شاعر کی حیثیت سے نمایاں رہے۔

اس دور میں ایسے شاعر بھی متعدد تھے جنھوں نے اگر سیاست میں اور تحریک آزادی میں عملی حصہ نہ لیا تو شاعری کے ذریعہ ضرور اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرتے رہے۔ جگر مرادآبادی اس دور کے منفرد غزل گو شاعر تھے۔ سیاست سے ان کا کوئی تعلق کبھی نہ رہا۔ خود اُنھوں نے کہا تھا:

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

لیکن معاشرے کے حساس فرد کی طرح وہ بھی ماحول اور اس کے سیاسی اضطراب سے متاثر تھے بلکہ انھیں یہ احساس بھی تھا کہ وہ سیاسی طور پر غلامانہ زندگی گزار رہے ہیں:

پرائے ہاتھ جینے کی ہوس کیا نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

ان کی شاعری میں سیاسی شوریدگی اور اس کے پیدا کردہ اثرات موجزن تھے۔ فطرتاً رومان پرست تھے لیکن قوم اور وطن سے بھی انھیں محبت تھی۔ چناں چہ اپنے تصورات میں اُنھوں نے ایسے موضوعات کو بھی جگہ دی جو انھیں ان کے سیاسی ماحول اور اس کے انقلاب نے دیے تھے:

بھری بہار میں تاراجیِ چمن مت پوچھ خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے
جنھیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گزرے

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ جگر اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

تعمیر کے پردے میں یہ انداز حکومت تخریب۔ عنوان دگر دیکھ رہا ہوں
اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں
بیداری و آزادی و اخلاص و محبت اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

جگر کی طرح اختر شیرانی بھی رومان پرست شاعر تھے اور اس لحاظ سے وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے زمانہ اور ماحول کے انقلابات سے وہ بھی خاصے متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں بھی سیاسی ہل چل اور ہنگامے اپنا اثر جماتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بحیثیت شاعر سیاسی بیداری کا اظہار اختر کے کلام میں بھی ہوا ہے۔ اُنھوں نے وطن کی آزادی کو بھی موضوع

سخن بنایا اور خالص رومانی انداز اس وقت بھی موجود رہا:

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے　　عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی　　لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

رومان پرست ہونے کی وجہ سے امن وسکون اور رومان کی ایک نئی دنیا تخلیق کرنا ان کی عین خواہش تھی۔ اس ماحول میں جہاں انھیں امن وسکون اور آزادی حاصل نہ ہو کسی طرح طمانیت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہر قسم کے جبر وستم اور پابندی سے حصول آزادی کی خواہش موجود نظر آتی ہے۔ اس صورت میں وہ ''ساقی'' کو بھی ''تلوار'' اُٹھانے پر آمادہ کرتے ہیں:

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثار آزادی جاں میری فدائے آزادی
اُٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لے ہاتھوں سے گوئے آزادی

وہ بلبلۂ یلغار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

غیرت کہ عدو کے نرغے میں ہے خاک وطن بستان وطن
ناپاک قدم سے غیروں کے آلودہ نہ ہو میدان وطن
یہ عمر جواں گل کار وطن، یہ عشق حسیں قربان وطن

پھر ولولۂ پیکار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

اُنھیں اپنی نئی نسل سے بھی بڑی توقع تھی کہ وہ حصول آزادی کی جدوجہد کر کے وطن کو آزاد کرائے گی:

وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اُٹھائے گا　　وطن کے دشمنوں کو کنج تربت میں سلائے گا

اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا　　وطن کا پاسباں ہوگا، میرا ننھا جواں ہوگا

ایسے ہی شاعروں میں سیماب اکبرآبادی نے بکثرت سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ وہ سیاسی شعور اور سماجی احساس ضرور رکھتے تھے لیکن اُنھوں نے سیاست کو بطور جدوجہد آزادی اختیار نہیں کیا۔ سیاست سے ان کی وابستگی ایک باشعور اور حساس وطن پرست شاعر کی حد تک تھی۔ وطن پرستی،

ہندوستان کی غلامی، حکمرانوں کے مظالم اور ملک کی آزادی بھی ان کے موضوعاتِ شاعری تھے:

الغرض ناشاد ہوں برباد ہوں تاراج ہوں تاج کل تھا میرے سر پر آج میں محتاج ہوں

اے ہند نہ جانے تیری تقدیر میں کیا ہے کیا تجھ کو ہوا ہے

بدلی ہوئی ذہنیت قومی کی ہوا ہے کیا وقت پڑا ہے

فرزند وطن سے کوئی کہہ دے رہے ہشیار ہشیار خبردار

ان کے کلام میں مختلف سیاسی موضوعات پر کثیر التعداد نظمیں موجود ہیں۔ ان میں ''اے جوانانِ وطن''، ''اے وطن والے وطن''، ''اے اسیرانِ وطن''، ''خواتین وطن''، ''پیامِ فردا''، ''میرا وطن''، ''گل نافرمان''، ''اے ہندوستان''، ''جاگ اے ہندوستان''، ''چراغانِ وطن''، جذبہ حُبّ الوطنی کے متعلق ان کے مخصوص احساسات کی حامل ہیں۔

سیماب کے پیش نظر اس وقت کے سیاسی مسائل اور سماجی تغیرات بھی تھے۔ ان کے اثرات سے ان میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ اسے ملک کی آزادی کے لیے وقف کرتے ہیں:

میں غفلت میں سونے والوں کی نیند اُڑانے آیا ہوں
دنیا کو جگا کر چھوڑوں گا دنیا کو جگانے آیا ہوں

ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

آہ اے ہندوستاں یہ تیری پستی اور شباب
کچھ تیری تقدیر میں ہی فطرتاً ہے انقلاب

وہ بہاریں وہ چمن وہ گلشن ایجادی کہاں
اے غلام آباد اب وہ تیری آزادی کہاں

بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرے ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

وہ انقلاب پسند طبیعت رکھتے تھے۔ ملک میں آئے دن کی بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال میں بڑی آس لگائے ہوئے تھے کہ یقیناً متوقع انقلاب ضرور آئے گا:

ارتقا انگڑائیاں لیتا ہے اس اقلیم میں — آئینے خورشید بن جانے پہ قادر ہیں یہاں

انقلاب نو بدلنے کو ہے رُخ تقویم کا — ایشیا پھر "تاج" بن جائے گا ہفت اقلیم کا

برہم نظامِ عالمیاں دیکھتا ہوں میں — یہ کیا تغیرات یہاں دیکھتا ہوں میں

ان خاکیوں کو جن پہ بساط زمیں ہے تنگ — دوش ہوا پہ رقص کناں دیکھتا ہوں میں

جب کانگریس نے ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو 'یومِ آزادی' منانے کا اعلان کیا تو سیماب نے اپنی مسرت کا اس طرح اظہار کیا:

جدھر دیکھو ادھر ورد زباں ہے یومِ آزادی — ضرب افزائے ہر پیر و جواں ہے یومِ آزادی

بعد میں بھی وہ آزادی پر اظہارِ خیال کرتے رہے:

میں پیامی ہوں تمہارے مسلک آزاد کا — روح آزادی ہے ہر ٹکڑا مری روداد کا

میں اب مطلعِ ہند پر چھا رہی ہوں خبر دَور آزادی کی لا رہی ہوں

اندھیروں کو دنیا کے چمکا رہی ہوں اُجالا زمانہ میں پھیلا رہی ہوں

کانگریس کی وزارتوں کے قائم ہونے پر کہا تھا:

اب ہے نیا نظام — اب ہے نئی صبح و شام

پھینک ہی دیں توڑ کر — بیڑیاں ہم نے تمام

شاد ہیں آزاد ہیں — اب ہیں کہاں ہم غلام

زندہ باد

اضطراب زندہ باد — انقلاب زندہ باد

وہ اپنے ہم وطنوں کو ترغیبِ عمل بھی دیتے ہیں:

یہ میدان عمل کی جولانگاہ ہے دنیا — جو خود بیکار ہیں ان کے لیے بیکار ہے دنیا

غلامی کی فضاؤں میں نیا پھونکا فسوں میں نے — کیا اعلان آزادی بہ انداز جنوں میں نے

سوچ لو آزاد ہو جانے کی تدبیریں تمام — جمع کرلو ذہن میں رفعت کی تنویریں تمام

پھینک دو ہاتھوں سے مایوسی کی تصویریں تمام — کھول دو پائے وطن سے آج زنجیریں تمام

توڑ دو بند غلامی اے غلامانِ وطن اے جوانانِ وطن

متحد ہو جاؤ پہلے راہِ سعی و جہد میں — اور پھر دو راہ آزادی میں کچھ قربانیاں

وحشت کلکتوی نے ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت اور نام وری حاصل کی تھی لیکن غزلوں کے علاوہ قومی نظمیں اور سیاسی و ملّی موضوعات پر اشعار بھی تحریر کیے۔ ان میں حُبّ الوطنی اور حُرّیت و قومیت کے جذبات تمام تھے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی غزل کے مزاج اور پیرایہ میں اُنھوں نے آزادی کی خواہش اور بیداری کا پیغام دیا:

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی　　کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لیے

کیا رنگِ انتقام خزاں کا ہو دیکھیے　　ڈرنے لگے ہیں جوش بہار و خزاں سے ہم

جگر لاؤں کہاں سے جو میں تاراج خزاں دیکھوں
اُنھیں آنکھوں سے گُل رنگینیاں دیکھی ہیں گلشن کی

نہایت رنج ہے صیاد کی بے جا توقع کا
قفس میں ہو تو کیوں کر ہو نوا سنجی نشیمن کی

وحشت کی سنجیدگی ان کی قومی شاعری میں بھی برقرار رہی ہے۔ اپنی ایک نظم "فغانِ مسلم" میں قوم کی بدحالی، غیر مسلموں کی ناانصافی اور غیر ملکیوں کے استبداد کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کیا ہے:

اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہور جہاں　　محفل دشمن میں زیب داستاں ہوتے ہیں ہم

شادمان و کامراں ہوتے ہیں اپنے سب حریف　　خستہ تن افسردہ دل آزردہ جاں ہوتے ہیں ہم

صدمہ ہائے تازہ سے ہے چشم مسلم خوں چکاں　　آج پھر وحشت نوا سنج فغاں ہوتے ہیں ہم

اسی موضوع کو دوسرے مقامات پر بھی نظم کیا ہے:

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی مذلت کا
ہوئی ہے مبتذل اس دور میں یوں قوم کی حالت

بنایا ہم نے زیب طاق نسیاں نقش خودداری
یقین آتا نہیں اپنے گذشتہ عہد زریں کا

پسے جاتے ہیں ہم زیر قدم اقوام عالم کے
اور اپنا حال یہ ہے ہم سے کچھ بھی ہو نہیں سکتا

حریف غفلت ہستی نہیں تحریک بیداری
نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا گو سُنی بانگِ درا میں نے

ان کی شاعری میں جو پیغام ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو

واپس لانے اور اُنھیں ایک سربلند قوم کی حیثیت سے دیکھنے کے متمنی تھے:

کام مل جُل کر کرو تنظیم کا رکھو خیال ۔۔۔ حل مشکل کا ہے ضامن اتحاد المسلمین
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے ۔۔۔ کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
کامیابی کے وسائل پر بھی ڈالی ہے نظر ۔۔۔ قابلِ الزام خود تو ہے اگر ناکام ہے
اسی کا حق ہے جو ثابت کرے زور بازو سے ۔۔۔ یہ لفظ دل فریب خلق معنی سے معرا ہے
سوچ کے تم غفلتوں کی نیند سے اب ہوشیار ہو ۔۔۔ ہے ہماری کوششوں کی منتظر فتح مبیں

حفیظ جالندھری رومانیت پرست شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں ماحول کے انقلابات کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے منظر نگاری اور رومانیت کے ساتھ اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ لیکن اس کی انتہا ''شاہ نامۂ اسلام'' پر ہوئی، جس میں رجزیہ انداز میں ''تاریخ اسلام'' کے واقعات اور مشاہیر کے ذریعہ شجاعتوں کا ذکر ہے۔ اُنھوں نے سیاسی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں لیکن یہ موضوع ان کی شاعری میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو سیاسی ماحول، برطانوی اقتدار کے استبداد اور آزادی کی تحریکوں سے الگ رکھ کر فطرت کے قریب لاتے ہیں:

ہیں زمین و آسمان آزاد ۔۔۔ تیر آزاد ہے کمان آزاد
ہیں وحوش و طیور سب آزاد ۔۔۔ آتش و خاک و نوز سب آزاد
آب آزاد ہے ہوا آزاد ۔۔۔ بندے آزاد ہیں خدا آزاد
بلبل آزاد اور گل آزاد ۔۔۔ یعنی فطرت کا جزو کل آزاد

پھر بھی اپنی سیاسی محکومی اور غلامی کے احساس کو دبی زبان میں بیان کرنے پر خود مجبور پاتے ہیں[۶]

میری جوانی ہندوستانی ۔۔۔ بے چاری مجبور جوانی
قوم و وطن کے درد میں شامل ۔۔۔ آزادی سے دور جوانی

چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار ۔۔۔ راہ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار
کوئی یہ نغمے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں ۔۔۔ جنگ آزادی میں اب تک محو ہیں اہل زمیں
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلح جنگ جو ۔۔۔ آب جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہو
یہ لہو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا ۔۔۔ راہِ آزادی میں تازہ گل کھلاتا جائے گا
تا بکے آتش سے کھیلے گی کرائے کی یہ فوج ۔۔۔ قلزم جمہور میں جاگی ہے آزادی کی موج

فطرتِ انساں کو ہے طوقِ غلامی ناپسند حریت اُٹھی ہے لے کر پرچم آزادی بلند

پھر وہ جہد و عمل کی ترغیب بھی دیتے ہیں:

معرکہ آراؤ ہاں آگے بڑھو بڑھتے چلو غاصبوں پر تند شیروں کی طرح چڑھتے چلو

تلوک چند محروم کی شاعری میں بھی آزادی کے جذبات اور جدوجہد اور عمل کی لگن ہے۔ اپنے سیاسی ماحول اور احساسِ غلامی سے وہ بھی متاثر تھے۔

وطن جس کا ہو پابند الم وہ شادماں کیوں ہو
قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو

غلاموں کا وطن تیرا وطن اے نوجواں کیوں ہو
جہاں آزاد ہے ہندوستان تنگِ جہاں کیوں ہو

جے ہند کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے
جے ہند کی عالم میں صدا گونج رہی ہے

یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک

وہ بولتے ہوئے سیاسی حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انھیں حصولِ آزادی کا یقین تھا۔ اس یقین کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے اُنھوں نے اپنے ہم وطنوں کو اُبھارنے کی بھی کوشش کی ہے۔

وہ سامنے آزادیِ کامل کا نشاں ہے مقصود وہی ہے وہی منزل کا نشاں ہے

درکار ہے ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور

یہی انداز عرش ملسیانی کی شاعری میں بھی ہے۔ وہ بھی اپنے عام انداز سے ہٹ کر اس قسم کی شاعری کی طرف اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں

نشاط و عیش چھوڑ کر رباب و چنگ چھوڑ کر شباب اور شباب کی ہر ایک امنگ چھوڑ کر

عدوئے آبرو ہو جو وہ عذر لنگ چھوڑ کر عمل فریب بزدلی و بے درنگ چھوڑ کر

بڑھے چلو دلاورو - دلاورو بڑھے چلو

مولانا اقبال احمد سہیل کی شاعری میں بھی جدوجہد آزادی کے مختلف مراحل موجود ہیں۔ صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی تحریریں قومی اور اصلاحی موضوعات پر مبنی

ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو بھی ان مقاصد کا حامل رکھا تھا۔ اُنھیں اپنی سیاسی غلامی کا جو احساس تھا وہ ان کی مختلف نظموں میں عیاں ہے۔ اپنی متعدد نظموں میں جذبہ آزادی اور خواہش آزادی کو پُراثر طریقہ پر بیان کیا ہے:

ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر

گائیں گے ہم آزادی گلشن کا ترانا بے کار ہے اے برق بلا ہم کو ڈرانا

سر مشہد آزادی و اقبال پہ صدقے کر دیں گے اسے اپنے پر و بال پہ صدقے

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے اسیر غم اب تو چھوٹ جائے

چمن کو لوٹا ہے باغباں نے آ کے گل چیں بھی لوٹ جائے

بلا سے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کو لوٹ جائے

اُچک لے شاہین تو غم نہیں ہے قفس تو کم بخت ٹوٹ جائے

حصولِ آزادی کے لیے اپنے عزم کو بھی وہ بیان کرتے ہیں:

مانا کہ نشیمن سے ہے بجلی کی عداوت مانا کہ مری سعی کا انجام ہے حسرت

پھر بھی مری کوشش نہیں جانے کی اکارت بازو تو ہیں اس مشق سے آجائے گی قوت

ہے معرکہ ہر چند سہل اہل جفا سے جاں باز وطن ڈرتے ہیں کب اہل جفا سے

ہٹنے کو نہیں منزل تسلیم و رضا سے جو کچھ بھی گذرنی ہے گذر جائے بلا سے

جب تحریک آزادی عروج پر تھی اور ملک کو آزادی حاصل ہونے والی تھی تو اُنھوں نے اپنے تاثرات، خیالات اور جذبات کو اس طرح بیان کیا تھا:

وہ دور مسرت آنے دو قومی پرچم لہرانے دو

جاتی ہے غلامی جانے دو صدیوں کا دلدر جاتا ہے

جس نے یہ چمن برباد کیا مشرق کو غلام آباد کیا

وہ قہر مجسم جاتا ہے وہ سحر مصور جاتا ہے

لالے کو دبایا سنبل سے قمری کو لڑایا بلبل سے

جاتا تو ہے اب صیاد مگر گلشن کو مٹا کر جاتا ہے

از ساحلِ جاوا تا بہ حلب ہر سمت بپا ہے بزمِ طرب

ایران و فلسطین مصر و عرب خوش ہیں کہ ستم گر جاتا ہے

محمد حسین محوی لکھنوی کی شاعری میں بھی بیداری اور آزادی کے جذبات اور خیالات موجزن ہیں۔ اُنھوں نے تحریک آزادی کے ابتدائی دنوں اور تحریکِ خلافت کے دوران اپنی شاعری کے ذریعہ سیاسی بیداری اور آزادی کے تصورات کو نظم میں پیش کیا تھا۔ سیاسی محکومی کے احساسات ان کے کلام میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

ہماری بے زبانی ہمت افزائے ستم ٹھہری
کہ چپ رہنے پہ بھی ملتا ہے اب الزام غداری
شہیدوں کا تڑپنا لوٹنا دیکھا نہیں جاتا
مگر ممنوع ہے اس دور میں اظہار غم خواری

آزادی کی خواہش ان کی شاعری میں ایک عزم کے ساتھ موجود ہے:

حکومت ہم پہ ہو سکتی ہے دل پر ہو نہیں سکتی
کوئی روکے تو کیوں کر چشم دل کی گریہ و زاری
یہ جینا بھی کوئی جینا ہے اَے جویائے آسائش
بس اب خواب گراں سے چونک ہے یہ وقت بیداری
تری بربادیاں دیکھی نہیں جاتی ہیں اب ہم سے
خدا کے واسطے اُٹھ اور ہو آزاد اس غم سے

یہی انداز اور موضوع محمد مصطفےٰ خان احمق پھپھوندوی کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ وہ کھل کر ہندوستان کی سیاسی غلامی اور پستی کا مجرم برطانوی اقتدار کو ٹھہراتے ہیں:

یہ سچ ہے کہ اپنی حماقت کے باعث بہت جلد مٹ جائیں گے ہند والے
مگر یہ بھی سچ ہے کہ مٹنے سے پہلے وہ کر دیں گے تم کو قضا کے حوالے

۱۹۳۵ء کو نافذ ہونے والے قانون کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ:

مغربی کاغذ تراشوں نے کم و بیش اک صدی
صرف کی ہے تب بنا پایا ہے یہ خوش رنگ پھول
جان بل صاحب ہیں کتنے شکریہ کے مستحق
دے دیا ہندوستانی وحشیوں کو "ہوم رول"
ملک والوں سے حکومت کی ہے یہ اک دل لگی
آج اس کو حق بھی ہے اس کا کہ ہے "اپریل فول"

دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر کہا تھا:

مژدہ اے ہندوستاں کے بےبس و بے پر غلام آ ادھر سُن جنگ کے خونیں فرشتے کا پیام
صبر کر یاں ہند میں بھی انقلاب آنے کو ہے غیب سے تیری دعائے مستجاب آنے کو ہے

آزادی کے حصول کے لیے اُنھوں نے عزم و عمل کی ترغیب بھی دی تھی:

نہیں سہل آزادیِ ہند یارو ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا
ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
کھنچو گے ابھی تختۂ دار پر تم ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا

نکہت شاہ جہاں پوری نے بھی سیاسی موضوعات پر کافی نظمیں لکھیں۔ غلامی کا احساس، آزادی کی خواہش اور پیغام جدوجہد ان کی شاعری کے بھی موضوعات تھے۔ ان موضوعات پر ان کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

یہ فضا اور یہ ہنگام ہے لیکن سب ہیچ دلِ انسان ہو جب روح غلامی کا فرار
یہاں کے چپہ چپہ پر غلامی ہی غلامی ہے یہاں کی گردنوں میں طوق و زنجیر جہالت ہے

جذبۂ آزادی کا اظہار ان کی شاعری میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ذوق آزادی کے دیوانے ہمیں کیونکر نہ ہوں شمع حریت کے پروانے ہمیں کیونکر نہ ہوں
آخر اس طوق غلامی کو کہاں تک جھیلیے
آہ ظالم ذوق حریت کو پھر بیدار کر لعنت اس بدبخت پر جس کا غلامی ہو شعار
ہم اپنے بل پہ اب دنیائے آزادی بسائیں گے غلاموں کو چھڑا کر اک نیا عالم بسائیں گے

کوکب شادانی نے بھی اس دور میں سیاسی، انقلابی اور اصلاحی نظمیں کثیر تعداد میں تصنیف کی تھیں۔ ان کا خطاب زیادہ تر نوجوانوں سے تھا۔ ان کی شاعری کا زیادہ اہم مقصد سیاسی بیداری کا احساس پیدا کرنا تھا۔ حُبّ الوطنی، سیاسی غلامی اور مسلمانوں کی زبوں حالی ان کی شاعری کے موضوعات تھے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حصولِ آزادی کے جذبات کھل کر ظاہر کیے۔ اپنے وطن کی غلامی کا انھیں شدید احساس تھا:

وہ جب کہ ہر چھوٹا بڑا دل شاد تھا آباد تھا
وہ ہر طرف آزادیاں ہندوستان ہندوستان

محرومیاں ناکامیاں مجبوریاں لاچاریاں
اب ہے یہ تیری داستاں ہندوستان ہندوستان
یہ خستہ حالی تابکے یہ پائمالی تا کجا
کب تک یہ رنج بیکراں ہندوستان ہندوستان
حکمرانی ہے جہاں پر جبر و استبداد کی
اور مظلوموں کو رخصت تک نہیں فریاد کی
دیکھیے کب چھوٹتا ہے دل سے ناکامی کا داغ
دیکھیے کب کے گئے ہیں نوجوانانِ وطن

وہ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی اہمیت اور اس کے حصول کا درس دیتے ہیں اور انھیں جدو جہد پر آمادہ کرتے ہیں:

دنیائے اسیری کی ہر دائمی عشرت سے بہتر ہے حقیقت میں اک سانس کی آزادی
دنیائے غلامی میں بے کیف سی چیزیں ہیں مہتاب کی شب تابی تاروں کی ضیا باری
اُٹھو اور اُٹھ کے غلامی کی بیڑیاں کاٹو خدا کے سامنے دو امتحان آزادی
اگر ہے دعویٔ تحصیل حریت لب پر تو پھر عمل ہی ہو حسب بیان آزادی

اس دور میں تحریک آزادی کے ایک منفرد شاعر محمود اسرائیلی تھے۔ اُنھوں نے قومی، ملی اور سیاسی موضوعات پر بکثرت نظمیں تخلیق کیں۔ اپنے دور کے ہر اہم سیاسی واقعے اور تحریک کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ قوم میں آزادی اور اس کے حصول کا جذبہ پیدا کرنا ان کی شاعری کا اہم اور بنیادی مقصد نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے حب الوطنی اور اپنے دور کے سیاسی مسائل اور غلامی کے اثرات و احساسات کو اپنی زیادہ تر نظموں میں جگہ دی تھی۔ واقعاتی اور ہنگامی شاعری کے لحاظ سے اُنھیں اس دور کے چند نمایاں شاعروں کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ غلامی کے احساس اور وطن کی زبوں حالی کو انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اُجاگر کیا ہے۔ چند مثالیں یہ ہیں:

تو آج ہورہا ہے جو بے دست و پا وطن تجھ کو ملی ہے اپنے کیے کی سزا وطن
سکہ کبھی جہاں میں رواں تھا ترا وطن تھی تیری مشت خاک کبھی کیمیا وطن

ترکِ موالات کی تحریک کے دنوں میں جب موپلوں نے بغاوت کی تو اس سلسلے میں بے شمار موپلوں کو سزائیں برداشت کرنی پڑیں۔ بہت سوں نے اپنی جان کی قربانی دی۔ ان مظلوم موپلوں

کے بارے میں ایک نظم میں ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا:

بے کس و بے نوا تھے وہ　　　خوگرِ ابتلا تھے وہ
راہ نجات دور تھی　　　اور شکستہ پا تھے وہ
ان کے مکان لٹ گئے　　　ان سے عزیز چھٹ گئے
گوشۂ تنگ و تار میں　　　ان کے نفس بھی گھٹ گئے

ہندوستان میں مختلف مواقع پر دستوری اصلاحات کے سلسلے میں ''آئین کمیشن'' آتے رہے۔
ان کے بارے میں محمود اسرائیلی نے دو نظمیں لکھی تھیں۔ ان سے چند شعر درج ذیل ہیں:

جو آئینی کمیشن آ رہا ہے ہند میں　　　بے کسوں پر تہمتیں کچھ اور جوڑی جائیں گی
تفرقے کے جال کو پھر وسعتیں دی جائیں گی　　　اور زنجیریں اخوت کی بھی توڑی جائیں گی
سرفرازی کے لیے نااہل ڈھونڈے جائیں گے　　　سرکشوں کی گردنیں اکثر مروڑی جائیں گی

اس صورتِ حال میں انھیں زمانہ کے انقلاب اور بیداری کا جو احساس تھا اس سے اُنھوں نے
اپنے ہم وطنوں کو بھی روشناس کرانا چاہا ہے۔ وہ آنے والے انقلاب سے بڑے پُر امید تھے:

حُریت انساں کی مٹی میں نہ ڈالی جائے گی
جذبۂ حُبِّ وطن گھر گھر عیاں ہو جائے گا
محبانِ وطن کے دل شگوفے بن کے پھوٹیں گے
اب حریت کے خون سے ہوگا حسن گلستاں پیدا
بدل جائے گی فطرت انقلاب آئے گا دنیا میں
اب ان ہندی غلاموں ہی سے ہوں گے حکمراں پیدا

ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اور موضوع آزادی کے لیے درس عمل ہے:

آج کچھ نیند کے ماتوں کو جگانا ہے مجھے
حشر برپا ہو وہ ہنگامہ اُٹھانا ہے مجھے
دل تو ہو حریت پسند گر نہیں زر نہیں سہی
باغ میں سرو شاد کام بے گل و بے ثمر بھی ہے
رزم گہِ حیات میں مردوں کی طرح صف میں آ
تیرے بھی ہاتھ پاؤں ہیں زور تو آزما کے دیکھ

جادۂ مقصد پہ چلتا ہے تو اُٹھ ہمت دکھا
دست حسرت مل چکا اور چشم گریاں ہو چکی
تیری ہستی گردشِ دوراں سے مٹ سکتی نہیں
کچھ عناصر غیر فانی بھی تری فطرت میں ہیں
دست قدرت کارفرما ہے تری تدبیر میں
منہمک ہو آنے والے دور کی تعمیر میں

اس دور میں خالص سیاسی اور تحریک آزادی کے موضوعات سے قطع نظر قومیت اور قومی وملّی مسائل بیشتر شاعروں نے اپنی شاعری میں پیش کیے تھے۔ مذکورہ شاعر وہ تھے جنھوں نے سیاسی مسائل کو بھی اہمیت دی تھی اور قومی وملّی مسائل بھی ان کے پیش نظر تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ کچھ اور شعرا بھی تھے جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کی فلاح و بہبود، اس کی ترقی اور خوش حالی، اصلاح، تعلیمی اور تہذیبی شعور جیسے موضوعات پر زیادہ توجہ دی اور قوم کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے اپنی شاعری سے کماحقہ کام لیا۔ صفی لکھنوی، نظامی بدایونی، غلام بھیک نیرنگ، یحییٰ اعظمی، نشتر جالندھری، راشد الخیری اس ضمن میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں خصوصیت کے ساتھ شاعروں نے آزادی اور قومیت کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اپنے قومی اور سیاسی رہنماؤں کے ہم دوش رہے۔ بڑی حد تک عوام میں سیاسی شعور اور آزادی کا جذبہ اُبھارنے میں ان شاعروں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

(ج) ترقی پسند شاعروں کا دور

ترقی پسند تحریک کی بنیاد اشتراکیت پر تھی۔[1] یہ تحریک ۱۹۳۶ء میں انگلستان سے ہوتی ہوئی ہندوستان آئی۔ اس کے اعلان نامہ کا مسودہ لندن میں ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمودلین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر نے تیار کیا تھا۔[2] ان کے روابط ہندوستان میں ڈاکٹر محمد اشرف، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، ہیرن مکرجی وغیرہ سے تھے۔ لندن سے تعلیم حاصل کرنے والے افراد کیمبرج میں اشتراکی خیالات کے حامل حلقہ سے تعلقات رکھتے تھے۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی مدد سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔[3] ایف فاکس، ڈیوڈ گسٹ اور کارن فارتھ، جو مارکسی خیالات رکھتے تھے، ان ہندوستانی طلبہ

کی طرف سے بلائے جاتے تھے۔ اعلان نامہ کی تیاری کے کچھ ماہ بعد ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں جو ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ہوئی، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند شریک ہوئے تھے۔ اس میں انقلابی رجحان رکھنے والے دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں نے شرکت کی تھی جیسے گورکی، رومن رولان، طامس مان، آندرے ژید، ہنری باربوس، آندرے مالرو، فورسٹر وغیرہ۔ سجاد ظہیر کے ہندوستان واپس آنے کے بعد پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر نے مل کر ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ پہلے فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، نرندر شرما، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد اشرف، سبط حسن، فیروز الدین منصور، ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ ہم خیال تھے۔ مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی، رابندر ناتھ ٹیگور، میاں بشیر احمد، صوفی تبسم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی وغیرہ نے بھی تعاون کا یقین دلایا مگر اس کے لیے فعال نہیں ہوئے۔

یورپ سے آنے والے ادیب اشتراکیت پسند تھے[۴] ہندوستان میں ان کے دوست ادیب، جن میں سے کچھ انگارے کے خالق تھے، اشتراکی رجحان رکھتے تھے[۵] ان لوگوں نے اپنی تحریروں سے جلد ہی نوجوانوں کو اشتراکی تحریک کا گرویدہ بنالیا[۶] اُنھوں نے اشتراکیت کا، جو ایک فلسفہ اور عمل کا پروگرام ہے، ادبی میدان میں اطلاق کیا۔ غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا گیا۔ چناں چہ اس جدوجہد کو آگے بڑھانے اور ادب میں ایک نئی قوت پیدا کرنے کے لیے ترقی پسند ادب کی بنیاد ڈالی گئی[۷]

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامہ اور اس کے بعد کی توضیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سامراجی طاقتوں سے مراد زیادہ تر برطانوی تسلط لی گئی ہے۔ ملک کی آزادی کی حمایت ترقی پسند منشور کی ایک اہم مشترک کڑی تھی[۸] اس وقت ترقی پسندوں کا محاذ بہت پھیلا ہوا تھا، اور ان کی توجہ برطانوی سامراج پر مرکوز تھی۔ چناں چہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے ابتدائی دور میں ہر اس قوت کے ساتھ اتحاد کی کوشش نظر آتی ہے جو برطانوی حکومت کی واپسی کے لیے مستعد تھی[۹] یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خود ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا بھی یہی نقطہ نظر تھا[۱۰] ملک کی آزادی کے لیے پہلا قدم یہی قرار پایا تھا کہ کانگریس اور لیگ میں اتحاد کرایا جائے، جو ملک کی سب سے بڑی جماعتیں تھیں[۱۱] چناں چہ کانگریس لیگ اتحاد قائم کرنے کے لیے کمیونسٹوں کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں ایک

تحریک شروع کی گئی[۱۲] کمیونسٹ پارٹی کا ہفت روز اُردو اخبار قومی جنگ جس کے مدیر سجاد ظہیر تھے، اس مقصد کا علم بردار رہا[۱۳] ۱۹۴۴ء تک کمیونسٹ پارٹی مطالبۂ پاکستان کے حق میں رہی۔ اس کے خیال میں لیگ ایک سامراج دشمن ادارہ بن چکی تھی۔ اور وہ ''مسلم اقوام'' کے جذبۂ آزادی کی ترجمان تھی اور اس کا مطالبہ پاکستان ان ''اقوام'' کی خود ارادیت کا مطالبہ ہے[۱۴] قومی جنگ نے اپنی پہلی ہی اشاعت ۱۶/ اگست ۱۹۴۲ء سے مطالبۂ پاکستان، مسلمانوں کے حق خود اختیاری اور حق علاحدگی کی حمایت کی۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی نے بعد میں اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لیا۔ کانگریس کے قوم اور قومیت کے تصورات کمیونسٹ اور ترقی پسندوں کے لیے قابل قبول تھے۔ مطالبۂ پاکستان سے قبل مسلم لیگ کی سرگرمیاں ابتدائی مراحل میں تھیں۔ کانگریس میں اشتراکی گروہ فعال اور موثر تھا اور انھیں جواہر لال نہرو کی سرپرستی حاصل تھی، جو نئی نسل میں کافی مقبول تھے۔ ان کے خیال میں ملک کے دکھ درد کا مداوا ''سوشلزم'' میں تھا۔ وہ برطانیہ، فرانس اور دوسرے ملکوں کے اشتراکی راہنماؤں، ادیبوں اور دانش وروں سے بھی ملے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دنیا کی نجات اشتراکیت ہی میں ہے۔[۱۵] ڈاکٹر محمد اشرف، محمود الظفر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا وغیرہ ان کے مددگار تھے[۱۷] ۱۹۳۷ء میں جب نئے آئین کے تحت وزارتیں قائم ہوئیں تو کانگریس وزارتوں کے سہارے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے لیے سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا آسان ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے، جہاں تک آزادی کے مطالبے کا تعلق تھا، زیادہ کھل کر اور بے باکی سے اپنے جذبات اور خیالات ظاہر کیے۔ پھر ان کا یہ انداز حصولِ آزادی تک برقرار رہا۔ حصول آزادی کو اس قدر فوقیت دی گئی کہ ترقی پسند تحریک کا رجحان بڑی حد تک ہنگامی سیاست کی طرف ہو گیا، اور ادب اور شعر کا معیار سیاسی مسلک کی صحت قرار دیا جانے لگا۔ شاعری سیاست کی نذر ہو گئی اور ادب و سیاسی پروپیگنڈے کا آلۂ کار سمجھا جانے لگا۔ نظمیں صرف اپنے نفس مضمون کی سیاسی اہمیت کی بنا پر جانچی جانے لگیں اور شاعری اور ادب میں سیاسی افادیت کو سماجی شعور کا نام دیا گیا۔ اس طرح یہ تحریک اس وقت ادبی سے زیادہ سیاسی تحریک ہو کر رہ گئی۔ سیاسی شاعری اور آزادی کے جذبات کی روایت کو پروان چڑھانے والوں میں ترقی پسند شاعروں کے نام اس دور میں بڑے نمایاں ہیں۔

سردار جعفری نے سیاست اور صحافت کے تقریباً ہر موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور اپنی نظموں کو ہنگامی اور وقتی موضوعات کی حد تک مخصوص رکھا۔ اس طرح ان کی شاعری عام واقعات، عصر

حاضر کی تاریخ اور ہندوستانی سیاست کا آئینہ بن گئی۔ ترقی پسندوں کے سربرآوردہ نمایندے اور اہم شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بغاوت ان کا مخصوص نظریۂ حیات ہے۔

بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

دنیا کے انقلابات پر ان کی گہری نظریں تھیں اور انھیں ہندوستان میں بھی آنے والی تبدیلیوں کا احساس تھا:

جل اُٹھے غلاموں کے سینے کے داغ بکنگھم میں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصرِ شاہی ہلے تخت و تاج نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج
نئی صبح ہے اور نیا آفتاب مبارک زمانے کو یہ انقلاب
بادباں کھل گئے بغاوت کے بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے ایسے جانباز غازیوں کو سلام
دیدنی اہل شہر کا ہے شکوہ گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرہ نگہ میں عزمِ جہاد حریت ضو فگن جبینوں پر

سینکڑوں اور ہزاروں مجاہد قدم سے قدم ملائے ہوئے بڑھ رہے ہیں:

گولیاں سنسناتی ہیں اُڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

سردار جعفری کی شاعری کا ایک نمایاں وصف پیغام بیداری اور دعوت انقلاب ہے۔ ان کی بیشتر نظموں کا یہ ایک عام موضوع ہے:

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے ہیں
کتنے آزاد ہیں ہم
——— آہ ظالم حکومت

اُٹھو ہند کے باغبانو اُٹھو — اُٹھو انقلابی جوانو اُٹھو
اُٹھو کھل گیا پرچم انقلاب — نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو — زمانے کی رفتار کو موڑ دو

وہ اس انقلاب کے نتائج کی طرف سے پُرامید تھے۔ متعدد نظموں میں اُنھوں نے جنگ اور انقلاب کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بہتر مستقبل کی اُمید ظاہر کی ہے:

انقلاب اور بغاوت کے چھیڑیں گے نغمے
اور آزادی کے زمزمے گائیں گے
ذرّہ ذرّہ بغاوت پہ آمادہ ہے

جدوجہد آزادی کو سردار جعفری نے مختلف پہلوؤں سے سراہا ہے:

انقلاب دہر کا چڑھتا ہوا پارا ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ
ہم سے آزادوں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانہ خوب ہے

شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر — چنگیز و ہلاکو و سکندر
جان بیچ کے لڑتے ہیں سپاہی — انسان پہ آ گئی تباہی
یہ ظلم و ستم کا راج کب تک — یہ تخت شہی یہ تاج کب تک

جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسین بوستان ہے ہمارا
سارا ہندوستان ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن اپنے گلزار میں اور کچھ بھی نہیں صرف جینے کا حق مانگتے ہیں

اُنھوں نے ہندوستانی عوام کو جنگ آزادی کے محاذ میں شامل ہونے کی ترغیب دی ہے، جس میں شامل ہوکر وہ اپنی تنظیمی قوت اور قومی دفاع کی طاقت کو اس قدر بڑھا سکتے تھے کہ پھر کوئی سامراجی طاقت انھیں غلام نہ رکھ سکے:

حکومت کی بنیاد ہلنے لگی ہے حکومت کی ہم کیوں کریں گے گدائی
چلو آج کمزور ہاتھوں سے اپنے غلامی کے زنداں کی دیوار ڈھائیں

عہد نو آ گیا ہے
دور ہو اے شہنشاہیت کے جذام
جاگ ہندوستان کے غلام
انتقام انتقام انتقام

سردار جعفری نے اپنی شاعری میں شدید اور پر جوش انقلابی جذبات کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے انگریزوں کے تسلط اور سامراج کی شدت سے مذمت اور آزادی مطالبہ کیا۔ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اس قسم کی بہتر مثال ہے۔ اس میں وہ انگریزوں کی مذمت اور اپنے جذبات آزادی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو
عصر حاضر کے فرعون ہو
تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خون ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے
ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے
ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں ہے
بھاگو بھاگو
اپنا جسم اپنی جان اپنا من اپنا اخلاق وتہذیب وقانون سب لے کے بھاگو
اس زمین کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی بساط اب اُٹھالو
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دنیا اب اُکتا چکی ہے
موت کے بادبان کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر اُٹھاؤ
جاؤ جاؤ

مخدوم محی الدین کا کلام انقلاب اور جذباتیت دونوں سے آراستہ ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی موضوعات بھی رومانوی شاعری کی لطافت اور رعنائی کے انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ اکثر اُنھوں نے انقلاب اور ہنگامی موضوعات کو قدیم استعاروں اور لطفِ بیان کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ان کی بیشتر انقلابی اور سیاسی نظمیں شعری لطافت، آہنگ اور لطفِ بیان کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہیں۔ اپنے ماحول اور اس کی حالتوں کا انھیں احساس ہمیشہ رہا ہے۔ چاہے وہ کسی رومانوی کیف ہی میں کیوں نہ محو ہوں:

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

ملک کی غلامی، پستی اور بدحالی، غیر ملکی حکومت کے مظالم اور استبداد کے مختلف پہلو ان کے احساس میں ڈھلتے رہے ہیں۔ ان کی کئی نظمیں ایسے ہی احساسات کی مظہر ہیں:

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشمِ گنہ گار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

انھیں بدلتی ہوئی دنیا اور آنے والے انقلاب کا بھی یقین تھا۔ اور وہ اس کی آمد کو محسوس بھی کر رہے تھے۔ جابجا اُنھوں نے اس انقلاب کو خوش آمدید کہا ہے:

حیات نو مجھے آواز دے رہی ہو سنو دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر
اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

اڑاتا ہوا پرچم زندگانی سناتا ہوا عہد نو کی کہانی
جلو میں ظفر مندیاں شادمانی چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا ہو رہا ہے میری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے کھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جارہا ہے

ایسی صورتِ حال میں مخدوم نے ایک حساس فرد کی حیثیت سے اپنے جذبہ واحساس کو بھی بیدار کرنا چاہا ہے:

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا مجاہد نہ بنوں
کیا میں تلوار اُٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

انھیں خود پر اور اپنے ہم وطنوں پر اعتماد تھا۔ اپنی قوت اور اپنے عزم کا وہ اس طرح اظہار کرتے ہیں:

سر پُرنخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا شور نالہ سے در ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روش اہل جہاں توڑوں گا عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیر اسیران قفس دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

آج اپنا گھر عدو کی رہ گذر ہی کیوں نہ ہو ہم بڑھے جائیں گے رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے دشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو اپنی وردی خاک وخوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم
اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم نے غیر ملکی اقتدار، غلامی، محکومی اور سامراج کے خلاف عوام کو پیغام عمل دیا ہے۔ آزادی اور انقلاب کے لیے جدوجہد کی دعوت دی ہے:

ایسا جہاں جس کا اچھوتا نظام ہو ایسا نظام جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

عزم آزادی سلامت زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد
آ انھیں کھنڈروں پر آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پر آزادی کا پرچم کھول دیں

زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

جن معنوں میں سردار جعفری اور مخدوم نے سیاسی نظمیں لکھیں، فیض کے کلام میں وہ موجود نہیں۔ گو سیاسی محرکات پر ان کی کئی نظمیں موجود ہیں لیکن وہ ان محرکات اور تاثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد وقتی اور سیاسی مفاد حاصل کرنا نہیں ہے۔ جذبہ واحساس میں زیادہ دیرپا اور اہم تغیر پیدا کرنا ہے۔ ان کے شعری تجربے کی جڑیں بھی رومانوی شاعری میں پیوست ہیں۔

ان کی شاعری رومانیت اور حقیقت، روایت اور بغاوت کا امتزاج ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا متوازن پن، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے۔ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق یا کسی واقعہ کی شدت پر شاعری کا ایسا رنگین پردہ ڈالتے ہیں، جس سے واقعے کی شدت ایک حد تک کم تو ہو جاتی ہے لیکن شعریت، کشش اور جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چوں کہ وہ انتہا پسندی سے گریز کر کے ہر چیز کو اعتدال میں سمو دینے کے عادی ہیں، اس لیے انھیں ترقی پسند شعرا میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ایک مخصوص سیاسی نظریہ کے حامل ہونے کے باوجود، جس نے افادیت کو شعریت پر ترجیح دینا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا اور شعر و ادب کو پروپیگنڈے اور نعرے میں تبدیل کر دیا تھا، فیض اپنے کلام میں کسی پیغام یا فلسفہ کو بار بار نہیں دُہراتے۔ وہ محض وقت کے شاعر ہیں اور ان تمام مظالم اور بہیمانہ استبداد سے انسان کو نجات دلانا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں صدیوں سے غم اور الم موجود ہے:

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

ناداری و فقرِ بھوک اور غم ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت اور احساس، کامیاب امتزاج کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' میں شعریت و سیاست کا بہترین امتزاج قابل غور ہے:

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

اسی سلسلے میں ''سوچ''، ''رقیب سے''، ''چند روز اور میری جان''، ''کتے''، ''سیاسی لیڈر کے نام''، ''اے دل بیتاب ٹھہر''، ''میرے ہمدم مرے دوست'' خاصی اہم نظمیں ہیں۔ وہ عشق سے بھی ایک نئی سیاسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں:

زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا　　سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

وہ ایک حساس فرد کی حیثیت سے معاشرے میں ظلم و ستم اور استحصال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
آج تک سرخ سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

فیض کو سیاسی محکومی اور اپنی بے بسی کا بھی شدید احساس اور قلق تھا۔ قومی حکومت کے قیام کی جو تحریک دوسری جنگ عظیم کے دوران چل رہی تھی، ترقی پسند شعرا نے اسے خصوصی توجہ دی تھی۔ فیض نے اپنی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' میں کانگریس کے اکابرین کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو اس تحریک کی تہ میں پوشیدہ تھا اور جس سے فاشسٹوں کو اس امر کی ترغیب ملتی تھی کہ وہ ہندوستان کے داخلی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر اس میں پیش قدمی شروع کر دیں۔ فیض نے پچاس سالہ تحریک آزادی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا:

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ　　رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز　　جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں　　اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے

شہنشاہیت کی عالم گیر تحلیل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اُنھوں نے کانگریس کے اکابرین کو قطعی خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:[۱۷]

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن　　تجھ کو منظور یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل　　رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

فیض کو اپنے معاشرے کی سیاسی اور معاشی بے بسی کا اور لاچاری کا جو احساس تھا اسے اُنھوں نے مختلف نظموں میں بیان کیا ہے:

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پس پردۂ ساز مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں لغزش پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

محکومی اور غلامی کی حالت سے نجات کی خواہش ان کے کلام میں متعدد مقامات پر ظاہر ہوئی ہے:

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
جلد یہ سطوت اسباب بھی اُٹھ جائے گی یہ گراں باریِ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

وہ ہر ظلم اور تباہی و بربادی کو نظر انداز کرتے ہوئے مظلوم عوام کو سرکشی اور بغاوت پر اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں عزم پیدا کرنا چاہتے ہیں:

بے فکرے دھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں
ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہ جائیں گے ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

بول کہ لب آزاد ہیں
بول زباں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے

فیض کی طرح مجروح بھی وقتی محرکات کو ادبی انداز نظر اور جمالیاتی کیف بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے کہ مجروح بلاواسطہ واقعہ کے بیان کو نظم کرتے ہیں اور فیض کی شاعری میں ہنگامی واقعات کی صورت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ جذبی نے نئے تقاضوں کو محض سیاسی تقاضے سمجھا اور ہنگامی واقعات اور سیاسی حادثات پر غزلیں لکھیں۔ لیکن وہ حیات انسانی اور سیاست کے اہم مسائل تک دسترس نہیں رکھتے۔ ان کے موضوعات ایسے عنوانات سے وابستہ ہیں جو فوری اور ہنگامی ہیں۔ انھیں وہ جمالیاتی کیف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں:

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارہ کرتے ہیں
اے موج ہاں ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں
کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں
یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

کاش توپوں کی گرج میں نہ سنائی دیتا
جذبہ غیرت مظلوم ابھی خواب میں ہے
یہ ذرا دور پہ منزل یہ اُجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ترقی پسند شعرا میں کیفی اعظمی نے بھی اپنے دور کی سیاسی صورتِ حال اور جنگ آزادی پر بکثرت نظمیں تخلیق کیں۔ موضوعات کا انتخاب بڑی حد تک سردار جعفری اور مخدوم کی طرح تھا۔ اپنے دور کے ہر سیاسی واقعے اور انقلابی موضوع کو، جس سے وہ متاثر ہوئے، نظم کی صورت میں بیان کر دیا۔ انداز وہی پر جوش ہے جو سردار جعفری یا دوسرے ترقی پسندوں کا رہا۔ سیاسی محکومی اور زوال، انقلاب کی خواہش، سرخ انقلاب کی جدوجہد، معاشی استحصال اور غیر ملکی اقتدار سے نفرت، ملک کی آزادی جیسے موضوعات کیفی اعظمی کے کلام میں نمایاں ہیں۔ اس وقت کے دوسرے شعرا کی طرح سے سیاسی محکومی اور اس کی حالت ان کا موضوعِ سخن بھی ہے:

لوٹ لی ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی — رات کے کاندھے پہ سر رکھ کر ستارے سو گئے
وہی جلاد وہی دار وہی زنجیریں — تم نے آزادی کی دیکھی ہیں کدھر تصویریں
آج اس بار غلامی سے بہت چور ہیں سب — بھوک سے پیاس سے آزار سے رنجور ہیں سب
مادرِ ہند کے ہونٹوں پہ فغاں ہے کہ نہیں — روئے ملت پہ غلامی کا دھواں ہے کہ نہیں

ناکے ناکے پہ ہے پولیس کا راج — ہو چکی ہے گلی گلی تاراج
جیپ ہر موڑ سے گزرتی ہے — ہر طرف فوج گشت کرتی ہے

مایوسی کے باوجود ان کا عزم و یقین ختم نہیں ہوتا۔ انھیں اُمید رہتی ہے کہ یقیناً یہ وقت بدل جائے گا:

نفاق و غفلت کی آڑ لے کر جیے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک
سہے گا بھارت ستم کہاں تک عوام اُٹھائیں گے ناز کب تک
گلا دبائے گا حریت کا تمھارا دستِ دراز کب تک
سبھاؤں کو توڑنے کچلنے کی ہوگی یہ ساز باز کب تک
اُڑیں گے بپھری فضا میں لے کر تمھیں ہوائی جہاز کب تک
جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی

ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

وہ اس انقلاب کو دیکھ رہے تھے جو دنیا کے دوسرے ممالک میں آچکا تھا اور اس کے اثرات ہندوستان میں بھی ظاہر ہو رہے تھے:

جاگ اُٹھی سینوں میں آزادی کی رو
اب یہ دھارا رُخ بدل سکتا نہیں
سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں
لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں دفتروں تھانوں میں آگ
بہنے ہی والا ہے ایوان شہنشاہی میں خون
پھٹنے ہی والی ہے چھت، گرنے ہی والے ہیں ستون

بڑھتا جاتا ہے جوش آزادی نعرہ زن ہے سروش آزادی
جھک رہی ہے بلندیوں کی جبیں جیسے کروٹ بدل رہی ہے زمیں
شعلہ افشاں ہے صبح بیداری آخری جنگ کی ہے تیاری

وہ ملک کی جدوجہد آزادی کو سراہتے ہیں اور اپنی خوشی اور مسرت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

شرر حریت کے بھڑکنے لگے بیاباں میں گلشن لہکنے لگے
غلامی سے سب سرگرم پیکار ہیں یہاں خانہ جنگی کے آثار ہیں

بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار اُٹھے ہیں جنگ خلافت کے آزمائے ہوئے

نئے ہندوستان میں ہم نئی جنت بسائیں گے تڑپ دے کر خس و خاشاک کو بجلی بنائیں گے
صیاد کی قفس کی نحوست مٹائیں گے کانٹوں کو گدگدا کے تبسم سکھائیں گے

وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو بغاوت، انقلاب اور آزادی کی ترغیب دیتے ہیں:

بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو نظام غلامی مٹاتے چلو

پھونک دو صور کہ اب منتظر صور ہیں سب
ایک جھٹکے میں فقط طوق اُتر جائے گا

اس انتشار چمن کی سوگند باب زنداں ہلا کے اُٹھنا
گلے کا طوق آرہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

ساحلِ ہند پہ برق اب کڑکتی ہے اُٹھو
روح زندان غلامی میں پھڑکتی ہے اُٹھو

ساحر لدھیانوی نے بھی اس دور کے اہم سیاسی واقعات اور معاشرتی حقائق کو اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ تاہم اس میں ان کی شخصیت بھی اُبھرتی ہے اور وہ ہر کڑی حقیقت اور تلخی کو نغمہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومان سے حقیقت کی جانب اور پھر حقیقت سے رومان کی طرف گریز کا انداز خصوصیت رکھتا ہے۔ کہیں وہ ماحول کی تلخیوں سے گھبرا کر رومان میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور کبھی ماحول کی حقیقتوں کو دیکھ کر حساس فرد کی حیثیت سے رومان کی لطافتوں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت ہی ان کا نظریۂ حیات ہے اور وہ ملک کی غلامی اور پستی سے نجات اسی میں چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں بغاوت اور آزادی کے جذبات کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے:

سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں　　برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

اپنی غلامی اور اس کی مختلف حالتوں کا انھیں شدید احساس تھا۔ اسے اُنھوں نے کئی پہلوؤں سے بیان کیا ہے:

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں　　خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت　　یہ ذلتیں یہ غلامی یہ دورِ مجبوری

میرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے　　کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو

حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تاب نشاط بزمِ عشرت لا نہیں سکتا میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

چار جانب ارتعاش رنگ و نور چار جانب اجنبی ہاتھوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند میں مری غیرت میرا دست سوال
زندگی شرما رہی ہے کیا کروں

شملہ کانفرنس کی ناکامی پر اُنھوں نے جو نظم ''پھر وہی کنج قفس'' لکھی تھی۔ اس سے ان کے تلخ احساسات کا پتہ چلتا ہے:

چند لمحوں کے لیے شور اُٹھا ڈوب گیا کہنہ زنجیر غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے وہی دام امواج ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی
ٹوٹتے دیکھ کر دیرینہ تعطّل کا فسوں نبض اُمید وطن اُبھری مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پاکر ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک

ساحر کے پیش نظر حاکم اور محکوم کا جو فرق تھا، اسے اُنھوں نے بڑی تلخی کے ساتھ بیان کیا ہے:

دہر کے حالات کی باتیں کریں اس مسلسل رات کی باتیں کریں
جابر و مجبور کی باتیں کریں اس کہن دستور کی باتیں کریں
اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر اس جہنم زار کی باتیں کریں
دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں اونچے ہوٹل کے در خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے میرے مجبور وطن کی گلیاں جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں میں نقاہت کی نمود خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
کاش یہ اپنے لیے آپ صف آرا ہوتے اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابند سلاسل کتے اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراج قوت

لیکن مختلف بین الاقوامی انقلابات اور جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے وہ بڑے پُر امید ہوئے۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنی خواہشات اور اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کیا:

دور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے ۔۔۔ فتح جمہور کے انصاف کے آزادی کے
تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر ۔۔۔ اور کچھ دیر اُجالے کے لیے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں ۔۔۔ اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح ۔۔۔ رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاؤں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل ۔۔۔ ختم ہوجائے گی انسان کے لہو کی تقطیر
سامراج اپنے وسیلوں پر بھروسہ نہ کرے ۔۔۔ کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں
جذبۂ نصرت جمہور کی بڑھتی رَو میں ۔۔۔ ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں
سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش ۔۔۔ اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزم آزادیِ انساں بہ ہزاروں جرات ۔۔۔ اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے
برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو ۔۔۔ آخری ار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہوکر ۔۔۔ اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

پھر شاعر اپنے جذبات سے سرشار ہوکر خود بھی بغاوت اور آزادی کے حصول کی جدوجہد کا عزم کرتا ہے اور عوام کو بھی ترغیب دیتا ہے:

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اُٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
ہر منزل آزادی کی قسم ہر منزل پر دُہرائیں گے

سکندر علی وجد کو غزل اور نظم دونوں میں دست گاہ حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں متنوع موضوعات پیش کیے ہیں۔ ماضی کی عظمت اور بہتر مستقبل کی بشارت ان کے خاص مضامین ہیں۔ غلامی اور محکومی و بے بسی کا احساس بھی ان کی شاعری کا جزو ہے:

تباہی کا طوفاں ہے چاروں طرف　　ہر اک طفل و پیر و جواں لٹ گیا
اداسی ہے منزل پہ چھائی ہوئی　　سر رہ گذر کارواں لٹ گیا
دیر تک ظلم کا طوفان رہا کچھ نہ ہوا　　عزم کے ہاتھ ہی میدان رہا کچھ نہ ہوا
صبر کی ڈھال شمشیر خزاں لوٹ گئی　　سرِ ہر دار پر انجان رہا کچھ نہ ہوا

ان کا عزم اور ارادہ بھی ان کے کلام سے جھلکتا ہے:

غلامی کے اندھیرے میں نظر آتی نہیں منزل　　چراغ عزم سے آسان رہ دشوار کرنا ہے
بتان سیم و زر پر مرنے والے نوجوانوں کو　　وطن پر جان دینے کے لیے تیار کرنا ہے

اُنھیں یقین تھا کہ مستقبل ان کا اپنا ہے اور محکومی کی حالت ہمیشہ باقی نہیں رہے گی:

گانے کے لیے قمری و بلبل کو چمن میں　　منت کشِ زاغ و زغن کل نہ رہے گی
پُر ہول فضا حسرت صد شام غریباں　　یہ کیفیت صبح وطن کل نہ رہے گی
آدھی دنیا فریادی　　کس کو ملے گی آزادی
کب تک ہوگا حق پامال　　قیدی کرتے ہیں یہ سوال

اُنھیں یہ نظر آتا تھا کہ بہت جلد ان کی کوششوں سے غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے خاتمے کے ابتدائی منظر ان کے سامنے تھے:

نکل رہی ہیں تدبیریں　　سنبھل رہی ہیں شمشیریں
بدل رہی ہیں تقدیریں　　پگھل رہی ہیں زنجیریں
اُٹھے محکوموں کے قدم　　کھلے بغاوت کے پرچم
عظمت انسان مستحکم　　بھاگ رہے ہیں اہل ستم
زور حکومت خواب و خیال　　جیت گئے دھرتی کے لال

ہوگیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو　　اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آ گیا
اہلِ زنداں کو مبارک ہو فروغ صبح نو　　قید ذلت سے نکلنے کا زمانہ آ گیا

جاں نثار اختر کی شاعری رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے۔ ان کی شاعری کا عام مزاج رومانوی شکستوں، چیرہ دستیوں کو بیان کرنا ہے۔ اندازِ نغمگی کے اعتبار سے اہم ترقی پسند شاعر شمار ہوتے ہیں۔ رومان سے حقیقت کی جانب مراجعت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔

خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے قلب انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم
وادیِ نغمہ و مستی میں بھٹکتا ہوا وقت عہد شمشیر و سناں ہے مجھے معلوم نہ تھا
عرصۂ خوں میں بغاوت کا اُبھرتا سورج شمع کاشانۂ جاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

اختر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے احساسات کو اپنے ہم وطنوں پر بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں دعوت غور و فکر بھی دی ہے:

ہم اپنے وطن کی آنکھوں کو کب تک یونہی پُر نم رکھیں گے
بکھرے ہوئے اس شیرازے کو کیا آج بھی برہم رکھیں گے
کب مل کے بڑھیں گے میداں میں کب دوش پہ پرچم رکھیں گے
اے اہل وطن، اے اہل وطن
ظلمت میں غلامی کی آخر یوں گھٹ کے رہیں گے ہم کب تک
یہ ظلم کہاں تک جھیلیں گے یہ جبر سہیں گے ہم کب تک
ہونٹوں پہ لگی ہوں جب مہریں پھر کچھ نہ کہیں گے ہم کب تک
اے اہل وطن، اے اہل وطن

اختر اپنے دور کے انقلاب اور جدوجہد پر یقین کر کے آنے والے بہتر مستقبل کا اندازہ لگا رہے تھے۔ ان کی شاعری میں بدلتے ہوئے زمانے کے حالات اور خوش آیند مستقبل کے آثار نمایاں طور پر ظاہر ہیں:

تھرا کے گرے جاتے ہیں شاہوں کے علم آج اکھڑے نظر آتے ہیں حکومت کے قدم آج
نعروں سے بغاوت کے گونجا ہوا میدان بیدار ہے انسان
یہ زمیں ہل جائے گی یہ آسماں ہل جائے گا اک نیا پرچم ہوا کے دوش پر لہرائے گا
ظلمتیں میدان سے آخر بھاگنے والی ہیں اب دفعتہً منزل کی راہیں جاگنے والی ہیں اب
ختم ہے اب ان اندھیری وادیوں کا سلسلہ ہمرہان قافلہ، اے ہمرہان قافلہ
حکومت کے زرکار ایوان سے ہوتا غلامی کے تاریک زنداں سے ہوتا
بغاوت کے سنگین میداں سے ہوتا بڑی شان سے کارواں جا رہا ہے

اختر اس صورتِ حال سے بڑے مطمئن اور مسرور نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی توقع اور خواہشات

کی تکمیل نظر آرہی تھی۔ اس کا احساس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے:

جو شانے پر بغاوت کے علم لے کر نکلتے ہیں　　کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو آزادی کی دیوی کو لہو کی بھینٹ دیتے ہیں　　صداقت کے لیے جو ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں

وہ اپنے ہم وطنوں کو جدوجہد اور عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان میں جذبہ اور خواہش پیدا کرتے ہیں اور ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں:

یہ دھوپ چمکتی تیغوں کی اک آن میں ڈھل سکتی ہے ابھی
زنجیر غلامی کی کیا ہے اک آنچ میں گل سکتی ہے ابھی
ہم مل کر اُٹھیں تو یہ دنیا اک پل میں بدل سکتی ہے ابھی
اے اہلِ وطن اے اہلِ وطن

مرنے کے لیے جیتے ہیں تو کیا جینے کے لیے مرنا ہے ہمیں
اُٹھو کہ بغاوت کا پرچم میداں میں علم کرنا ہے ہمیں
آزاد وطن کا پرچم بھی ہم شان سے لہرائیں گے کبھی

مجاز کی شاعری میں رومان اور نغمگی دوسری خصوصیات شاعری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ان کی دنیائے رومان روایت سے مستحکم طور پر منسلک ہے لیکن ان کی شاعری میں رومان نغمگی کی سطح سے حقائق کی تلخی تک اُتر آیا ہے:

گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے　　چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے　　آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے
بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ　　ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

مجاز کو اپنے ماحول اور ملک کی غلامی و پستی کا شدید احساس تھا۔ اُنھوں نے اس کی تلخی کو بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے:

اُفق پر زندگی کے لشکر ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک سکوت ہر طرف ہوشربا و ہول ناک
خلد وطن کے پاسباں خلد وطن کو کیا ہوا
کوئی بتائے عظمت خاک وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرت اہل وطن کو کیا ہوا
کوہ و دمن وہی دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حُبِّ وطن کو کیا ہوا

اس صورتِ حال میں مجاز اس پستی اور محکومی کی حالت کو دور کرنے کے لیے مضطرب نظر آتے

ہیں۔ خالدہ ادیب خانم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روحِ اربابِ نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے
کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خار زارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکرِ لاحاصل نہ ہو، اندیشۂ باطل نہ ہو

مجاز کو یقین تھا کہ یہ صورتِ حال ختم ہو جائے گی اور ان کا ملک آزادی اور انقلاب سے ہمکنار ہو جائے گا۔ وہ انقلاب کی آمد اور ملک کی جدوجہد کے انداز کو دیکھ رہے تھے:

توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب
حکومت کے مظالم جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ان کی شاعری میں ان کے مزاج سے قطع نظر، پیغام جہد و عمل بھی ہے۔ وہ نوجوانوں، خواتین اور دوسرے طبقات کو اپنی شاعری کے ذریعہ درسِ بیداری اور جہد آزادی کی ترغیب دیتے ہیں:

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
تجھ پہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنس آزادیِ انساں کے خریدار ہیں ہم
دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ
سرفروشان بلاکش کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاک بغاوت کا سہارا بن جا
یہ جہد و کش مکش یہ خروش جہاں بھی دیکھ
ادبار کی سروں پر گھنی بدلیاں بھی دیکھ
یہ توپ یہ تفنگ یہ تیغ و سناں بھی دیکھ
او کشتۂ نگار دل آرا ادھر بھی آ
آ باغیوں کا زمزمۂ آتشیں بھی سن
او مست ساز و بربط و نغمہ ادھر بھی آ

بول اری او دھرتی بول — راج سنگھاسن ڈانوا ڈول
کیا افرنگی کیا تاتاری — آنکھ بچی اور برچھی ماری
کب تک جنتا کی بے چینی — کب تک جنتا کی بے زاری

ان کی نظم ''آہنگ نو'' اس تعلق سے زیادہ بہتر مثال ہے۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

اے نوجوانانِ وطن روح جواں ہے تو اُٹھو — آنکھ اس محشر نو کی نگراں ہے تو اُٹھو

خوف بے حرمتی و فکر زیاں ہے تو اُٹھو پاس ناموس نگارانِ جہاں ہے تو اُٹھو
اُٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر
اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں شعلہ افشاں و شرر بار چلے آتے ہیں
خون بہتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں تم جو اُٹھ جاؤ تو بے کار چلے آتے ہیں
خون جو یہ نکلا ہے اس خوں میں بہا دو ان کو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو ان کو
خطۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں آہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں

احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا آغاز رومانوی موضوعات سے ہوا تھا لیکن ایک دور میں ان کی شاعری میں جبر و استبداد اور استحصال کے خلاف بغاوت کا عنصر شامل ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو درس ہو تلقین سے دور رکھا۔ متانت و سنجیدگی ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ یوں لگتا ہے کہ غم دوراں نے غم جاناں کو زیادہ مچلنے کا موقع نہیں دیا۔ شاعری میں مناظر فطرت، دیہات کا ماحول، غریبوں، مزدوروں کی ترجمانی اور ملوکیت اور سرمایہ داری سے بے زاری مخصوص مضامین ہیں۔ سنجیدگی کے لہجے میں اپنے احساس غلامی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

مٹی میں مل گئی مری فرخندہ اختری وہ خاک میں پڑا ہے مرا تاج سروری
سالہا سال جسے حاجت مرہم ہی رہی اپنی تاریخ سے وہ داغ مٹا دوں تو ہنسوں
ماضی کے گھاؤ مندمل تو کر لوں پھر دست فرنگ میں مرا ہات نہ دو
اگر چہ "ہندوستان" کہہ کر پکارتا ہے اسے زمانہ مگر وہ ہے ساز حریت کا بس ایک بھٹکا ہوا ترانہ
یہ بے محل سے قانون اجنبی سا نظام لبوں پہ مُہرِ خموشی زباں کو اذن کلام
یہ قید و بند یہ تقسیم زر یہ دانہ و دام یہ جور و جبر مسلسل یہ اختیار کا نام
گرفت ساحر یورپ میں ایشیا کی عناں
غروب مہر کہاں اور طلوع مہر کہاں

اپنی ایک نظم میں جو "کیبنٹ مشن" کی واپسی پر "سمندر کے فرشتہ ہائے رحمت سے" کے نام سے لکھی گئی تھی، ذرا بے باکی سے کہتے ہیں:

نہ جانے کب سے یہ طفلانہ کھیل جاری ہے تمہاری "عقدہ کشائی" ہماری محرومی

مذاق پر اُتر آتی ہے جب شہنشاہی تو اپنے آپ کو پہچانتی ہے محکومی
عذاب جان تھا اگر مملکت کا استقلال تو کیا ضرور تھا ہنگامہ ہائے گفت و شنید
معلمین سیاست تکلفات ہیں یہ کہ خود شناس ہے انسانیت کا دور جدید
تمہارے ذہن کی یہ موشگافیاں ہی تو ہیں کہ حریت کی خرید و فروخت ہے دشوار

یہی انداز و موضوع درج ذیل رباعیوں میں بھی موجود ہے:

تاریخ کے پنجر کو کفن سے نہ نکال اس بگڑی ہوئی لاش کے ٹکڑے نہ اُچھال
ماضی کے تعفن سے فضا بوجھل ہے اے "مصلح قوم" اپنا تابوت سنبھال

تھپکی سے نہ آپ زخمیوں کو بہلائیں ٹلتی نہیں چمکار سے قرنوں کی وبائیں
میں آپ سے ایک التجا کرتا ہوں آپ اپنے عوام سے ذرا آنکھ ملائیں

ندیم نے اپنے زمانہ کے انقلابات اور سیاسی بیداری کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

اب تو ماحول کی زنجیر گلی جاتی ہے بل پہ بل کھاتے ہیں فرسودہ تمدن کے خدا
گرجتا ہے بجتا ہے میدانِ جنگ نرالے ہیں ہٹنے جھپٹنے کے ڈھنگ
اے وائے انقلاب یہ اعجازِ انقلاب دارا کی ٹھوکروں میں تختِ سکندری

تمدن کی قربان گاہوں پہ بے رنگ لاشیں نشان سفر بن رہی ہیں
حکومت کے پنجے میں محبوس و مجبور نالہ صدائے درا ہو رہا ہے
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں یہ شام، یہ شب، یہ پَو یہ سویرا
تو دہکتے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی پھریرا

خزاں رہے کہ بہار آئے ہر چہ بادا باد اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

ندیم کے کلام میں درس و تلقین بھی اسی حد تک موجود ہے کہ وہ نصیحت آموز انداز میں اپنے ہم وطنوں میں بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان میں احساس غلامی اور جذبۂ حریت پیدا کر کے انھیں پستی اور محکومی سے نکالنے کی تدابیر سمجھاتے ہیں۔ کہیں کہیں حوصلہ افزائی کا انداز بھی موجود ہے:

اس انقلاب کے چرچے ہیں کج کلاہوں میں جو خون بن کے سلگتا ہے تیری باہوں میں

قصور تیرا ہے الزام یہ خدا پہ نہ دھر کہ مدتوں سے نہ لی اُس نے تیرے گھر کی خبر
اُلجھ نہ دیوے سیاست کی ہیرا پھیری میں ترا علاج ہے احساس کی پھریری میں
میں نے جس دور کی اُمید دلائی ہے تجھے
وہ تری شعلہ مزاجی سے جلا پائے گا
تیرے انفاس کے جھونکوں سے نکھر جائے گا
مرے اشعار کی محتاج نہیں اس کی نمود
تری یلغار ہے اس عقدۂ مشکل کی کشود

غلام ربانی تاباں کی شاعری بھی رومان اور حقیقت کے امتزاج پر مبنی ہے۔ ان کی شاعری کا ابتدائی دور روایت پسندی کا حامل ہے، اور اس میں بتدریج حقیقت اور سیاست کے موضوعات جگہ پاتے رہے:

وہی دنیا وہی دستور دنیا وہی فرسودہ قدروں کی سیاست
وہی مجبوریوں کا ایک فسانہ وہی پابندیوں کی ایک حکایت
دور وادی میں کوئی گیت کسی نے چھیڑا تند آواز اُٹھی گونجی فضا میں بکھری
اپنے اسلاف کی عظمت کے زمانہ کا گلہ شومئی بخت کہ ابنائے وطن کا شکوہ
ڈیڑھ سو سال کی مجہول سیاست کے نقوش کس طرح اجنبی ہاتھوں نے کیا ہے تاراج
یہ چمن زار یہ پُر کیف بہاروں کا وطن کون بتلائے کہ اس گیت کا موضوع ہے کیا؟

تاباں نے بے باکی سے اپنے دور کے مستبد سیاسی نظام کو پیش کیا ہے:

چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں
اک اجنبی سفید ہاتھ آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرۂ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

ان کے پیش نظر آنے والا اُمید افزا انقلاب اور دورِ آزادی تھا، جس کی وہ خواہش بھی کرتے ہیں

فضا سے سرد ظلمت دور ہو جائے گی اے ہمدم
ضیا میں جاگ اُٹھیں گی حرارت جاگ اُٹھے گی
اب اُبھرنے ہی کو ہے تہذیب نو کا آفتاب
یہ فضائے تیرہ ہے تمہید صبح انقلاب
تاج اور تخت کو ٹھوکر اڑانے کے لیے
ہوتے جاتے ہیں کمر بستہ بغاوت پہ غلام

کل جو اُٹھتا تھا سلامی کو بصد عجز و نیاز
آج اس ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے

چناں چہ وہ اپنے ہم وطنوں کو پیغام عمل دیتے ہیں:

جل چکیں کشتیاں اب کوئی نہیں راہِ فرار
بڑھ کے دشمن پہ کرو آخری وار
اور اس دور درفشاں کو مکمل کر دو

دیگر ترقی پسند شاعروں میں ایسے بہت کم ہیں جو بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایسے شاعروں نے سیاسی موضوعات یا آزادی کی جنگ کو موضوع کی خصوصیت کے طور پر پیش نہیں کیا۔ صرف ان کے کلام میں وقتی تاثر اور ہنگامی کیفیت کہیں نظر آ جاتی ہے۔ ملک کی غلامی کا احساس، غیر ملکی اقتدار سے نفرت اور آزادی کی خواہش ان کا مخصوص موضوع سخن نہیں ہے۔ گاہے گاہے ایسے موضوعات ان کی شاعری میں شامل ہوئے، جیسے مُطلبی فرید آبادی، جو بڑے جذباتی انداز میں انقلابی نظمیں لکھتے رہے، جدوجہد آزادی کی تاریخ نظم کی ہے۔ پہلی دور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک قرار دیا ہے:

محمد علی کے نعرے ہیں گاندھی کے جے کارے ہیں
گھبرائی گوری سرکار کہتا ہے اسے دو دھتکار
لے کر جھپٹے چھری کٹار بھارت جاگے مچی پکار

دوسرا دور ۱۹۳۰ء تک:

قدم کو ہے قرارِ موت وفا سے ہے فرار موت
سکون اب قریب ہے ہے اس کا لالہ زار موت
نہ دیکھو اپنے نقش پا اُٹھو بڑھو چلو چلو

تیسرا دور ''دورِ حاضر'':

تمام جال توڑ کر حماقتوں کو چھوڑ کر
حریف نابکار کی کلائیاں مروڑ کر
بلند اپنے ہوں علم اُٹھے قدم بڑھے قدم

مُطلبی عوام کی زبان اور انھیں کے لہجہ میں عوام کو انقلاب اور آزادی کا مفہوم سمجھاتے ہیں۔

ایک دوسری نظم ''سپاہی کا گیت'' میں لکھتے ہیں:

جیل چلا ہے دیس سپاہی رانی تو کو چھوڑ کر
پھر اچھے دن آئیں گے رانی بچھڑے سب مل جائیں گے رانی
دیس کے باسی گائیں گے رانی جھنڈوں کو لہرائیں گے رانی

ان کی نظم ''تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے'' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ظہیر کاشمیری نے متنوع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اپنی نظم ''سرخ بگولے'' میں جنگ کی نوعیت بیان کرتے ہیں:

دھن کے کارن رن جاگ اُٹھا سرخ بگولے چھائے
پورب پچھم کے مہاراجے آپس میں ٹکرائے
شور مچا ہر کنگلا اپنے آپ کو بھینٹ چڑھائے

اس کی تبدیلی کا عمل اس طرح بیان کرتے ہیں:

ساحر افرنگ خود اپنے طلسموں کا اسیر سر جھکائے پنجۂ احمر میں آکر رہ گیا
وقت نے زنجیر پھیلا دی کچھ اس انداز سے خود نگر بے آب خنجر کو اُٹھا کر رہ گیا

اور پھر سامراج کے خلاف نبرد آزما ہونے کا پیغام دیا:

کوند جاؤ سنگ آخر کا نشاں مٹ جائے گا یہ جہانِ کہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے

ایک دوسری نظم ''بین الاقوامیت'' میں کہتے ہیں:

پرچم امن اُتارے گئے تحقیر کے ساتھ جنگ کی گونج نے تھرا دیا ویرانوں کو
اسی انداز سے بہتا رہا انسانوں کا لہو اسی انداز سے ہر ملک میں چمکی شمشیر
کون اس آہنی دیوار سے ٹکرائے گا پنجۂ موت میں لے آئی ہے کس کو تقدیر

ان کی نظم ''قانون'' میں حکام پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

جمیل مظہری نے غلامی اور آزادی پر مختلف پہلوؤں سے اظہار خیال کیا ہے۔ غلامی کی کیفیت اور اس کے احساسات وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

پابند ہمیں کرنے کے لیے سو راہیں نکالی جاتی ہیں
قانون بنائے جاتے ہیں زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں
سن سن کے اختیار کا راگ ہمت مجبوروں کی بڑھی ہے

گوتم نے بنا بنا کے قانون زنجیر نئی نئی گڑھی ہے

اُنھوں نے انقلاب کی حالتوں اور بیداری کی کیفیتوں کو بھی پیش کیا ہے:

احساسِ خودی مظلوموں کا اب چونک کے کروٹ لیتا ہے
جو وقت کہ آنے والا ہے دل اس کی آہٹ لیتا ہے

علی اختر نے غلامی کو اپنے احساسات میں اس طرح جگہ دی ہے:

قوم جب کوئی رہے صدیوں غلامی میں اسیر
بجھ کے رہ جاتے ہیں ایسی قوم کی روح وضمیر

وامق جونپوری نے اس وقت کی صورتِ حال سے متاثر ہوکر ملک کے اس کرب کو محسوس کرلیا تھا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں رومانی جذبات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور انقلابی خیالات بھی پیش کیے:

یہاں ہر قطرۂ خون جنس آزادی کی قیمت ہے
یہاں انسان کو انسان سے کتنی محبت ہے
یہاں کا ہر سپاہی مادر گیتی کی دولت ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
یہ جنتا کی لڑائی ہے
یہ فاشیت کو دنیا سے مٹالیں گے تو دم لیں گے
یہ استبداد کے ایواں کو ڈھالیں گے تو دم لیں گے
یہ نغمے اپنی آزادی کے گالیں گے تو دم لیں گے

سلام مچھلی شہری بھی جو رومانیت پرست زیادہ ہیں، سماجی مجبوریوں کی بنا پر رومان سے اپنے آپ کو گریز پر مجبور پاتے ہیں:

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو

ترقی پسند شعرا کے معاصر شاعروں میں سے بیشتر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔ ان میں سے ایسے شاعروں کی تعداد بھی نمایاں ہے جو کچھ عرصہ اس تحریک سے وابستہ رہے لیکن رفتہ رفتہ اس سے یا تو علاحدگی اختیار کی یا انھیں اس تحریک کے منشور سے رُوگردانی کے سلسلے میں اس سے

وابستہ شعرا کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ زیادہ تعداد ایسے شعرا پر مشتمل ہے جو اس تحریک سے براہِ راست متاثر ہوئے۔ اس قسم کے شاعروں نے ایک مدت تک ایسے ہی موضوعات کو منتخب کیا جو ترقی پسندوں کے لیے مخصوص رہے۔ اس میں تنوع بھی رہا اور اپنی خلقی صلاحیتوں کے مطابق دوسرے مضامین بھی ان کے پیش نظر رہے۔ مجموعی طور پر وہ اپنے عصری تقاضوں اور رجحانات سے علاحدہ نہیں رہے۔ ایسے متعدد شاعروں کے احساسات اور تصورات کی دنیا بلاشبہ قدیم روایتوں سے الگ ہے۔ ان کا احساس عصری تقاضوں سے دور نہیں اور ان کے تصورات خلوص سے عاری نہیں۔

ن-م-راشد کی شخصیت منفی احساس شکست کا اظہار ہے، جس نے ان کی شاعری کو مردم بیزاری، شکست خوردگی اور مریضانہ کلبیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی محدود ہو کر رہ گئی ہے اور وہ محض ایک حیاتی ہیجان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی کے عصری تقاضے ہنگامی اور وقتی ہیں۔ مشرقی نظامِ زندگی فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کا مذہب اس کا تمدن اب قریب الختم ہے۔ ان کی شاعری اس اعصابی تکان، ذہنی جمود، شکستہ ایمان اور شدید احساس کمتری کا اظہار ہے۔ ان کی شاعری جنگِ عظیم دوم کے دوران پروان چڑھی۔ جس کے نتائج ان کے سامنے تھے کہ مشرق بدستور غلام اور نیم جان رہا۔ اس ماحول کی گھٹن اور مایوسی ان کی شاعری کا نمایاں موضوع ہے:

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی

کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی

میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے، نان شبینہ نہیں ہے۔ غلامی کا احساس بھی انھیں مضطرب رکھتا ہے:

میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر

ہماری بھی نہیں افسوس جو چیزیں ''ہماری'' ہیں
عمر گذری ہے غلامی میں میری
اس سے اب تک میری پرواز میں کوتاہی ہے

یہ عمارات قدیم
یہ خیابان، یہ چمن یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں
اجلی اجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگ بنیاد فرنگ

یہ موضوع اور لہجہ ان کے کلام میں متعدد مقامات پر موجود ہے:

زندگی تیرے لیے بستر وسنجاب وسمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری

ایک عفریت، اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشان
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

وہ اپنے ماحول سے فرار کے جذبہ کو بار بار دُہراتے ہیں۔ انھیں جب اسی ماحول اور اسی زندگی میں رہنا پڑتا ہے تو ان کی روح آزاد ہونے کے لیے بے چین ہو جاتی ہے:

دیکھ خوں خوار درندوں کا وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

لیکن اپنی بے بضاعتی اور کم ہمتی کے سبب وہ انتقام بھی لیتے ہیں تو اپنی مریضانہ کلبیت کے ساتھ:

اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

اپنے دور کے رہنماؤں پر وہ منفرد انداز میں طنز بھی کرتے ہیں:

قوم ابھی نیند میں ہے
مصلح قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے

راشد نے اپنے ماحول کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس کے سامنے ماحول کی بدلتی ہوئی صورتیں تھیں۔ محکومی، غلامی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ وہ کچھ اور بھی دیکھ رہے تھے:

یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم

اپنی فطری مایوسی سے قطع نظر کسی حد تک امید افزا مستقبل کی خواہش بھی ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ وہ اس موجودہ صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے تگ و دو بھی کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ابھارتے ہیں:

یہ انساں کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو
یہی ہے نئے درد کا پرتوِ اوّلیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانہ کی تازہ ولادت کے اس جشن میں مل کے دھوم میں مچائیں

بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج بے دست و پا ہیں
اس آیندہ نسلوں کی زنجیر پا کو تو ہم توڑ ڈالیں
شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو، بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آور کو
حیلۂ شبخون بناؤ

اختر الایمان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی افسردگی اور حزن کا پھیلاؤ طاری نظر آتا ہے۔ ان کے موضوعات خزاں، موت اور ویرانی اور جنگ کی تباہ کاریوں سے متعلق ہیں۔ راشد کی طرح کی شاعری میں خواہش مرگ نمایاں رہتی ہے۔ شخصی واردات ان کی شاعری کا موضوع مخصوص ہے۔ نعرہ اور تحریک ان کے کلام میں موجود نہیں۔ اپنی طویل نظم ''تاریک سیارہ'' میں بے شک اختر الایمان نے یہ کوشش کی ہے کہ ترقی پذیر قوموں کے ارتقا کا منظر پیش کریں۔

آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں ظلم پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو
سب اسی ارض سیہ بخت کی خاطر ہیں کھیل خاک پروردہ نظاروں کی طرف دیکھو تو

ان کی دوسری نظم ''ایک کہانی'' جو ایک تمثیل ہے، شاید اس سلسلہ کی بہتر مثال ہے:

کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا
(افق میں ایک شور پیدا ہوتا ہے، چیخیں بلند ہو کر دب جاتی ہیں)

آدمی۔ ہری بھری کھیتیوں کا دشمن اک پاپی باہر سے آیا
آگ کی مدھم آنچ بڑھا کر گھر پھونکے ہنستوں کو رلایا
لوہے کی زنجیریں ڈھالیں نفرت کے پھل پھول لگائے
محبوب۔ موت کا تحفہ لے کر آئے باہر سے پاپی بیوپاری

رات ہوئی اور تاریکی میں موت نے ظالم بازو پھیلائے
باغی۔ اٹھو نیند کے ماتو جاگو رات نے دن کو گھیر لیا ہے
دھرتی ماں کے بیٹو جاگو ماں نے تم کو یاد کیا ہے
باغیوں کا گروہ[1] موت کے دروازے سے گذرو آزادی کا گیت سناتے
باغیوں کا گروہ[2] آزادی انساں کا حق ہے ہر ذی روح کا ہر انساں کا

اختر الایمان کی دیگر نظموں میں اور بھی متعلقہ احساسات جاگزیں ہیں:

دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں
ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں مگر یہ آہنی رسن، یہ حلقہ ہائے زندگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو چکے میں نقش پائے عمر ہوں فریب خوردہ خوشی

احسان دانش شاعر مزدور کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی اور وقتی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری شدید احساسات کی پیداوار ہے۔ بغاوت اور انقلاب اس دور میں ان کے مخصوص موضوعات سخن ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں انسان کی پامالی، محکومی اور غلامی اور بے بسی کے نقشے ملتے ہیں:

غلامی کے شبستانوں میں زہریلا اُجالا ہے
جو اس میں آ کے سویا وہ کہاں پھر اُٹھنے والا ہے
اللہ اللہ یہ عقیدوں کی سراب آرائیاں
کس تکلف سے غلامی زمزمہ پرداز ہے

اپنی شاعری میں ایسے موضوعات زیادہ پیش کیے ہیں جن میں وہ انقلاب اور آزادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں:

پلا وہ جام ساقی انجمن سرشار ہو جائے
خودی کو نیند آ جائے جنوں بیدار ہو جائے
تنوں میں مے کشوں کے پھونک دے وہ روح آزادی
غلامی کا سکوں آمادۂ پیکار ہو جائے

اُنھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں اپنے ہم وطنوں کو غلامی کی حالت ترک کرنے اور آزادی کے حصول کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے:

دے دیا ہے تجھ کو غفلت نے غلامی کا خطاب
ہے تیری غیرت کے منہ پر بے حیائی کی نقاب
ہو چکا ہے تیری خود داری کا شیشہ چور چور
کھول آنکھیں اے غلاموں کے غلام بے شعور
جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اکھاڑ دو
اٹھاؤ اس طرح نشان فلک کے دل میں گاڑ دو
ہے کھیل دار اور رسن بڑھے چلو بڑھے چلو
مجاہدین صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو
گونج اُٹھنے کو ہیں ہر گوشے میں آزادی کے راگ
خامشی کا لحہ لحہ گوش بر آواز ہے

ساغر نظامی نے متنوع موضوعات پر نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ ان کا اندازِ قدامت اور جدت دونوں کا حامل ہے۔ موضوعات میں بھی یہی امتزاج برقرار ہے۔ جدید عصری تقاضوں کے مطابق ان کے موضوعات سخن میں مختلف معاشرتی اور سیاسی مسائل بھی موجود ہیں۔ انھیں خصوصیت یہ حاصل ہے کہ اُنھوں نے حُبِّ وطن اور قوم پرستی کے جذبہ کو ایک مذہبی جذبے کا سا تقدس دیا اور ہندوستان کی محبت کو اپنی شاعری کو پیام بنا لیا۔ اُنھوں نے اپنے دور کے سیاسی ہیجانات اور ان کے بیشتر پہلوؤں کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے جس میں سنجیدگی اور متانت بھی ہے اور انقلابی جوش اور ولولہ بھی۔ غلامی کا احساس انھیں جس انداز سے مضطرب کیے ہوئے تھا اسے اُنھوں نے کئی نظموں میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی شاعری زیادہ تر پیغام جدو جہد آزادی سے بھی عبارت ہے۔ خود بھی اپنے عزم اور ارادہ کو ظاہر کرتے ہیں:

حکم آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا
جب مجھے پھانسی کے تختہ پر چڑھایا جائے گا
جب یکا یک تختۂ خونیں ہٹایا جائے گا
اے وطن، اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

ان کی عین خواہش تھی کہ:

گلشن ہندوستاں آزاد ہو جنت برباد پھر آباد ہو
ہو مرتب اک نیا قانون گل اک نئی رسم چمن ایجاد ہو
باغ میں کوئی نہ ہو اب پا بہ گل سرو ہو، لالہ ہو یا شمشاد ہو
ذرہ ذرہ ہند کا پھر گل فشاں ہو ایک دن کاش تجدید بہار گلستان ہو ایک دن
پرچم آزادی ہندوستان ہو اور میں ایشیا کا افتخار جاوداں ہو اور میں

درس آزادی کے لیے ان کا خطاب اپنے ہم وطنوں اور نوجوانوں سے بھی ہے:

اے جوانو، نوجوانو توڑ دو بند زار غلامی
خوش جمالو نونہالو پھینک دو سر سے بار غلامی
اے حسینؓ و علیؓ کے سپوتو اے محمدؐ کے شہ زور بیٹو
نسل سے بادشاہوں کے تم ہو پھر بھی ہو یادگار غلامی!
اے جوانو، نوجوانو

نغمۂ ماضی کو اپنے پھر اسیر ساز کر
پھر اسی عنوان سے نظم زندگی آغاز کر
پھر شکستہ رشتۂ سعی و عمل کو جوڑ دے
اُٹھ کے ایک جھٹکے میں زنجیر غلامی توڑ دے
دردِ ملت ہے یہی احساس غیرت ہے یہی
راہِ آزادی میں موت آئے شہادت ہے یہی
ہلا دے جور و استبداد کی سنگین بنیادیں
غلامی کے بتوں کو گرز حریت سے غارت کر
غلامی مستقل لعنت ہے اور توہین انسان ہے
غلامی سے رہا ہو اور آزادوں میں شرکت کر
ترا مذہب بھی دیتا ہے تجھے تعلیم آزادی
اگر دعوائے مذہب ہے تو مذہب کی اطاعت کر
قریب ایوانِ آزادی ہے کیوں مایوس ہوتا ہے
تبسم کامیابی کا مجھے محسوس ہوتا ہے

تصدق حسین خالد کے کلام میں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ ان کا مخصوص رجحان رومانیت کی طرف ہے اور اس میں کوئی خاص نظامِ فکر موجود نہیں۔ لیکن ان کی نظمیں ایک حد تک نئے اندازِ فکر کو ابھارتی ہیں۔ وہ ماحول کے تقاضوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے:

اک نئے دور کی صبح

چیر کر سینۂ مشرق کو ابھر آئی ہے

آہ اس صبح کی رنگینی کو

سرخیِ خون شہیداں دے کر

ابدی سوز کا جوہر بخشیں

بھول جاؤ غم واندوہ کے دن

اس سے زیادہ بہتر مثال ان کی نظم "یہ بغاوت ہے" میں موجود ہے:

"یہ بغاوت ہے"

بغاوت ہی سہی

ہم نے انجام وفا دیکھ لیا

خس وخاشاک بہاتا ہوا، اپنا سیلاب

اب جو اٹھتا ہے تو بڑھتا ہی چلا جائے گا

یہ زر وسیم کے تودوں سے نہیں رُک سکتا

"گولیاں"

کس کو ڈراتے ہو

یہ ڈس سکتی ہیں

ڈس جانے دو

فراق گورکھپوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں اور ان کی نظموں میں حسن و عشق کے معاملات کے پردے میں وہی جذباتی کرب، ارضیت اور بے بسی و لاچاری کا احساس ملتا ہے، جو اُن کے دور کے شاعروں کو عصری تقاضوں کے طفیل ملا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے شریک رکن تھے اور اس کی تحریک ترکِ موالات میں شمولیت کے سبب قید بھی رہے۔ اس واقعہ نے شاید ہمیشہ

کے لیے ان کی شاعری میں مجبوری حیات کا اظہارِ پُر تاسف اور زندگی کے اس غم انگیز پہلو کی ترجمانی کا اضافہ کردیا۔ اپنے وقت کے انقلابات اور ملک کی جدوجہد آزادی کے تاثرات ان کی شاعری کا بھی ایک حصہ بن گئے:

راج ہٹ سے جو پرجا ہٹ کبھی ٹکرائی ہے
وقت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آئی ہے
دیکھ بھری ہوئی دنیا کو دبانے کی نہ سوچ
باز آ کے بغاوت سے نہ باز آئی ہے
روپیہ راج کرے آدمی بن جائے غلام
ایسی تہذیب تو تہذیب کی رسوائی ہے
آج خمیازے سے صدیوں کے فضا ہے لرزاں
نئی دنیا کی یہ آئی ہوئی انگڑائی ہے
ابھی مٹی میں ملا آئے ہیں نازیت کو
سامراجوں کی بھی سنتے ہیں خبر آئی ہے
عالمِ نزع ہے آئین شہنشاہی کا
چارہ گر اب تیری بے کار مسیحائی ہے

یہ موضوع فراق کے کلام میں بار بار بیان ہوا ہے:

دردِ انسانیت کی شان تو دیکھ — گرد ہے آج سطوت چنگیز
دیکھ رفتار انقلاب فراق — کتنی آہستہ اور کتنی تیز

دیکھنے والے تیرے آج بھی بیدار سے ہیں — آج بھی آنکھ لگائے رَسَن و دار سے ہیں
مدتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد — ہم اسیران قفس تازہ گرفتار سے ہیں
دنیا کو انقلاب کی یاد آرہی ہے آج — تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے آج

جدوجہد کے ماحصل اور آزادی کی قدر و قیمت کو فراق نے اس طرح بیان کیا ہے:

یہ مہر و ماہ، یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقامِ آزادی
لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار
اچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اُٹھتا ہے
ارے یہ صبح غلامی یہ شامِ آزادی
قدم یہ اُٹھتے ہیں پس ماندگانِ منزل کے
کہ رہروؤں میں یہی ہیں امام آزادی

آنند نرائن مُلّا ہمہ گیر موضوعات کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں حُبِّ وطن، حسن و عشق، انسان دوستی اور انقلاب محور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیاسی اور انقلابی نظموں کی ان کے کلام میں کمی نہیں۔ سیاسی محکومی اور بے بسی پر اُنھوں نے متعدد نظموں میں اپنے تلخ احساس کا اظہار کیا ہے:

غلامی کی ہنسی ہی کیا بس اک آواز بے نغمہ
بہار باغ ہم رنگ بیابان ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں

نہیں کون آلودۂ خون و خاک
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک
نہ سنگ ہمالہ نہ آبِ چمن
زمین وطن اے زمین وطن!

ذرہ ذرہ خود اپنی جگہ ہیرا اور پنّا تھا
ان دیواروں کی قسمت میں زندانِ فرنگی بننا تھا

کچھ ایسے آ گئے ہیں تنگ ہم کنج اسیری سے
کہ اب اس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں

غلامی اور بے بسی کے احساس کے باوجود مُلّا کو اپنی طاقت اور قدر و قیمت کا بھی احساس تھا:

ستانے کو ستا لے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فردائے وطن ہم ہیں
فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے کو ہی ہم جنت سمجھتے ہیں

غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں
یہی اک حُبِّ قومی کا اصول مختصر جانا
وطن کے واسطے جینا نہ جی سکنا تو مر جانا

ان کی نظموں کا ایک معتد بہ حصہ ہنگامی واقعات اور سیاسی حادثات پر مبنی ہے۔ اس قسم کی نظموں ''قحطِ کلکتہ''، ''مہاتما گاندھی کا خیر مقدم''، ''موتی لال نہرو''، ''جواہر لال نہرو''، ''نذرِ بجنور'' وغیرہ زیادہ مثالی ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک مخصوص موضوع انقلاب اور آثار آزادی ہے۔ وہ مستقبل سے بڑے متوقع تھے اور انھیں حصولِ آزادی کا یقین تھا:

ختم پر حسرت ماضی کا فسانہ آیا پھر زمانہ کے بدلنے کا زمانہ آیا
شمع رکھی جا رہی ہے ہند نو کے سامنے نظم افرنگی کا شعر آخری آ ہی گیا
پھر آزادی کا پرچم ان دیواروں پر لہرائے گا وہ دن آئے گا جلد آئے گا اور یقیناً آئے گا

جگن ناتھ آزاد بھی ہمہ گیر موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔ اس دور میں ان کی شاعری بھی زیرِ بحث عصری تقاضوں سے متاثر نظر آتی ہے۔ خصوصاً ان کی دو نظموں ''سبھاش چند بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر'' اور ''آزاد ہند فوج'' اس سلسلے کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اوّل الذکر نظم میں سبھاش چندر بوس نے بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے اپنے ملک کی غلامی اور اس سے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

اے شہید جنگ آزادی شہنشاہ وطن
میں بھی آیا ہوں یہاں باندھے ہوئے سر سے کفن
میں نے بھی تلوار اُٹھائی ہے تری تقلید میں
اور لاتعداد بازو ہیں میری تائید میں
میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ
جس کے بعد اس سرزمیں پر چھا گئے اہل فرنگ
یہ وطن روندا ہے جس کو مدتوں اغیار نے
جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخ ناہنجار نے

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جوان بیدار ہیں
حریت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں
اس طرح لرزے میں ہے بنیاد ایوانِ فرنگ
کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

''آزاد ہند فوج'' میں سبھاش چندر بوس کی تیار کردہ آزادی کی فوج کو خراجِ تحسین پیش کیا:

مٹ جائے بزمِ دہر سے یہ جنگ یہ فساد
زندان کو توڑ پھوڑ دے اے حریت نژاد
اب وقت آگیا ہے کہ ہو عازم جہاد
ہندوستان کی فوج ظفر موج زندہ باد

اس قسم کے دیگر شاعروں میں جواد زیدی، روش صدیقی، یوسف ظفر، مختار صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، شاد عارفی، شمیم کرہانی، گوپال متل، علی اختر وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قوم، وطن، معاشرت، تہذیب، انقلاب، سیاست اور آزادی کے خیالات اور موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان میں جواد زیدی، شمیم کرہانی، روش صدیقی اور ڈاکٹر تاثیر معاشرے میں سیاسی تبدیلی چاہتے تھے، ایسی تبدیلی جو سماجی آزادی کی ضامن ہو اور جس میں انسان مطمئن ہوں۔ ان میں سے بعض شاعروں نے کچھ اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی لکھیں۔ یہ سب کے سب شاعر انقلاب کی رفتار سے واقف تھے۔ انھیں تاریخی طور پر سماج کے تضاد اور ہیجان کا حال معلوم تھا۔ ان کی تیز نگاہیں عالمی آزادی کی جدوجہد اور لڑنے اور فتح پانے کے اصولوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے کئی تو خود ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں بالفعل شریک تھے۔ ان کے سیاسی شعور نے ان کی شاعری میں بھی سیاسی رنگ آمیزی کر دی تھی، اور وہ اپنی شاعری سے تحریکِ آزادی کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہتے تھے۔ ان کے جذبہ اور شعور نے شاعری کی عام فضا کو بھی بدل دیا، اور اس میں نئے موضوعات بھی شامل ہوئے۔ اس میں زندگی کو سنوارنے اور ماحول کو نکھارنے کا عزم بہت نمایاں ہونے لگا۔ اسی کوشش نے اُردو شاعری میں آزادی اور انقلاب کے تصور کو عام کرنے میں کما حقہ حصہ لیا۔ اُردو شاعری میں یہ بڑی اہم تبدیلی تھی جو ترقی پسند شاعری کے زیر اثر رونما ہوئی۔

(الف) ترقی پسندوں کے معاصر شعرا

اس دور میں تحریکِ آزادی کے دورِ اوّل کے کئی نام ور شعرا اپنی شاعری کے ذریعہ مستقل طور پر اپنے جذبات و خیالات کو بیان کرتے رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک علاحدہ اثر اس دور کی شاعری پر مرتسم رہا۔ جوش، ظفر علی خان، حسرت، سیماب وغیرہ ایک وسیع حلقہ اثر رکھتے تھے۔ ان شاعروں نے اپنے دور کے نہ صرف عصری تقاضوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا بلکہ حصول آزادی کے لیے اپنی شاعری کے ذریعہ جدوجہد میں شمولیت اختیار کی۔ ان کے اور ترقی پسند شاعروں کے زیرِ اثر حصولِ آزادی کی جدوجہد اور خواہش کا اظہار شاعری کے مخصوص موضوعات قرار پائے۔ چناں چہ عام، غیر معروف اور ناپختہ شاعروں نے کچھ زیادہ ہی اس جانب توجہ دی۔ لیکن یہاں اس ذیل میں ایسے نمایندہ شاعروں کا ذکر مقصود ہے جو قدیم رجحانات کے حامل تھے اور ایسے ہی شاعروں سے متاثر بھی تھے، اور ساتھ ہی اپنے دور کی جدید ادبی تحریکوں اور ان سے متعلق شاعروں سے بھی اثر قبول کرتے رہے، اور جنھوں نے اپنے دور کے سیاسی میلانات اور حصولِ آزادی کی جدوجہد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ اس سلسلے میں حامد اللہ افسر کے درج ذیل اشعار قابل توجہ ہیں:

عہدِ گل آنے کو ہے پھولوں کی بارش کے لیے ختم دور برق و بارود و شرر ہونے کو ہے
جلوہ گر ہونے کو ہے صبح بہار آشتی ظلم سے آزاد کل نوع بشر ہونے کو ہے

یہی خیال شورش کاشمیری کے کلام میں بھی موجود ہے:

ایک نئے دور کی ترغیب کے ساماں ہوں گے دست جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے
کچھ دنوں اور اندھیروں کی فراوانی ہے طلعت صبح درخشاں کی قسم
یہ ملک ہوا جس کے تشدد کا نشانہ اب اس کی تباہی کا بھی آیا ہے زمانہ
یورپ کی فضاؤں میں قضا جاگ اُٹھی ہے اب جنگ کفن چور لٹیروں میں ٹھنی ہے
ہٹلر کے ارادوں کا بدلنا نہیں ممکن لندن کے خداؤں کا سنبھلنا نہیں ممکن

شورش نے پیغامِ جدوجہد اور آزادی بھی دیا ہے:

اے لشکر ملت کے رضا کار جوانو آزادی کامل کے طلب گار جوانو
تقدیر کو تدبیر کے بازو پہ جھکا دو ناموس وطن کے لیے جانوں کو لڑا دو

کہتا ہوں سنو جوش جوانی کو پکارو چلتی ہوئی تیغوں کی روانی کو پکارو
مقتل سے اُٹھا لاؤ شہیدوں کے سروں کو آواز دو آواز تبہ حال گھروں کو

اپنی خواہش اور آرزو کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

خورشید شہنشاہی کو ڈھلتے ہوئے دیکھوں سینے میں عزائم کو مچلتے ہوئے دیکھوں
لینا ہے مجھے ہند کی تذلیل کا بدلا ناموس کی بجھتی ہوئی قندیل کا بدلا

وطن آزاد کرنے کے لیے الطاف مشہدی کے کلام میں بھی ایک پیغام موجود ہے

قصر استبداد کو برباد کرنے کے لیے جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لیے
مستیِ صہبائے آزادی سے لہراتے چلو
ابر کی صورت بلند و پست پر چھاتے چلو
قہقہوں سے لیلیِ مغرب کو شرماتے چلو
پھر دیار ہند کو آباد کرنے کے لیے جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کے لیے

ساحلی احسانی نے ہنگامی سیاست کے متنوع واقعات کو نظم کیا ہے۔ ملک کی محکومی کی حالت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

اور عروسِ ہند کا ہے اُجڑا اُجڑا سا سہاگ
آہ و زاری ہے لبوں پر اور ناداری کا راگ
ادھر فاقہ کشی سے تنگ ہیں ہم
ادھر اغیار کے ظلم و ستم ہیں
ہیں بس یوں ہند میں برباد ہندی
نہیں ہو سکتے یوں آزاد ہندی

اُنھوں نے آزادی کی قدر و قیمت بھی بتائی ہے اور اپنے ہم وطنوں کو پیغام آزادی بھی دیا ہے:

نوحہ زن اس بات پر ہو نوحہ زن تو وطن میں ہے مگر ہے بے وطن
تو غلامی کے نشہ میں ہے مگن خونچکاں ہے دیکھ تیرا پیرہن
تو گر آئے تو سنور جائے ہماری زندگی انجمن بھر سے اُتر جائے غلامی کا خمار
مٹیں گے تو آزاد ہو کے مٹیں گے جئیں گے تو آزاد ہو کے جئیں گے
کہو غاصبوں سے، کہو منعموں سے کہ مانگیں پناہیں ان ہمت وروں سے

عبدالمجید بھٹی نے عام نظموں کے علاوہ بچوں کے لیے گیت کے انداز میں سیاسی نظمیں لکھی تھیں۔ ''دیس کی لیلا'' ایسی ہی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مختصر مجموعہ میں دو نظمیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ایک ''اپنے دیس میں راج بدیسی''، دوسری ''ہے دنیا میں پاپ غلامی'' نظموں کا عنوان ہی ان کے نفس مضمون کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلی نظم میں کہتے ہیں:

دیس کی شوبھا گھٹتی جائے
ناک ہماری کٹتی جائے
اس کا کارن تیرے من میں
اب تک کیوں نہیں آیا — مورکھ

اپنے دیس میں راج بدیسی
کیوں تیرے من بھایا؟

دوسری نظم میں کہتے ہیں:
آقا کے گن گاتے رہنا
اس کو نیک بناتے رہنا
ظلم کو رحم دکھاتے رہنا

ہے دنیا میں پاپ غلامی

لٹنا پٹنا اور دکھ سہنا
منہ سے نہ لیکن اف تک کہنا
گھر میں بھی ڈر ڈر کر رہنا

ہے دنیا میں پاپ غلامی

عبدالرزاق سعید کا غالب رجحان مذہبی شاعری کی طرف تھا۔ مسلمانوں کی بیداری اور جہاد ان کے مخصوص موضوعات تھے۔ موضوع زیر بحث کے تعلق سے ان کے کلام میں توجہ کے قابل اشعار موجود ہیں۔ اُنھوں نے احساس غلامی کو اس طرح بیان کیا ہے:

دل افسردہ، طبیعت مردہ، پابندی زبان بندی
سعید اپنی غلامانہ رہی تقریر آزادی

اک ظلمت کدہ بنا ہے ملک — آہ برباد ہو رہا ہے ملک
زن و اطفال کا ہے حال تباہ — نہیں ملتی ہے امن کی راہ
اس دیس کا ہر صوبہ ہے مظلوموں کی دنیا — تو رب ہے جہانوں کا جہانوں کی مدد کر

سعید کا خطاب محض مسلمانوں سے ہے۔ وہ مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں قومی اور ملّی شعور پیدا کر کے انھیں درس جہاد دیتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''نشاط عمل'' اس قسم کے خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ حصولِ آزادی ان کی نظر میں محض ایک سنگ میل ہے۔

وقار انبالوی نام ور صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ صحافت کے شغل کی وجہ سے سیاسی، قومی اور ہنگامی موضوعات پر بکثرت نظمیں لکھیں۔ غزلیں کم کہیں۔ کلام کا بیشتر حصہ قومی اور سیاسی شاعری سے متعلق ہے۔ ان موضوعات کی حامل ان کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ''آہنگ رزم'' ان میں اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ان کی رزمیہ، سیاسی اور قومی نظمیں ہی شامل ہیں۔ اس میں متنوع موضوعات ہیں، جیسے احساس غلامی پر ان کے یہ خیالات:

سپاہی دیکھتا ہے اک بھیانک خواب سوتے میں — کہ جس سے روح کھا جاتی ہے پیچ و تاب سوتے میں
نظر آتی ہے اس کو مادرِ ملت کچھ آزردہ — بہت ہی مضمحل بے چین بے تاب اور افسردہ
کھڑا ہے دور استبداد شان شاد کامی سے — جکڑتا ہے وہ اس کے ہاتھ زنجیر غلامی سے
محافظ سو رہے ہیں مادرِ ملت کے غفلت میں — نہیں کوئی کرے جو اس کی امداد ایسی حالت میں۔
اندھیرا سا وطن پر چھا رہا ہے — دکھوں کا ایک دل منڈلا رہا ہے
وطن خطرہ میں ہے آفت بڑی ہے — مصیبت قوم کے سر آ پڑی ہے
کٹھن یہ آزمائش کی گھڑی ہے — قضا آغوش پھیلائے کھڑی ہے

ان کی شاعری کے لہجہ میں شدید جوش اور ولولہ موجزن ہے اور اس میں درس عمل اور جہد مسلسل کی ترغیب بھی ہے:

بڑھو بہادرو بڑھو علم وطن کا کھول کر
کرو مقابلہ عدو کا تیغ تول تول کر
کٹیں گے سر ٹلیں گی اب بلائیں ملک و قوم کی
کمک کو آ رہی ہیں وہ دعائیں ملک و قوم کی

اس خاک سے ڈر دشمن جس خاک سے اُٹھا ہوں
اس ملک سے ڈر دشمن جس ملک میں بستا ہوں
اس قوم سے ڈر دشمن جس قوم کا بیٹا ہوں
پنجہ جو بھڑاؤں گا چھکے ہی چھڑاؤں گا

عزت پہ ملک و قوم کی کر دے مجھے نثار   سر ہے وطن کا سر کہ سپاہی وطن کا ہوں
گلستان وطن پر آ رہا ہے رنگ آزادی   غلامی سے ٹھنی ہے پھر وطن کی جنگ آزادی

اسی قسم کا لب ولہجہ، جس میں جوش وولولہ شدید ہے اور آزادی کے حصول کی جدوجہد کی ترغیب نمایاں ہے، خان غازی کابلی کی شاعری میں بھرپور ظاہر ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ ان کا براہِ راست تخاطب خود حکمرانوں، انگریزوں سے رہا ہے۔ ان کے اس انداز کی نظمیں ان کے مجموعۂ کلام جے ہند میں شامل ہیں۔ اس کی تمام نظمیں ہنگامی، سیاسی، روزمرہ کے سیاسی واقعات، انگریزوں کی سازشیں، ان کا جبر و استبداد اور ان کی حکمت عملی اور نظامِ حکومت پر کڑی تنقید، ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ، جیسے موضوعات پر مبنی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ جذبۂ آزادی، سیاسی اور قومی رہنماؤں کو خراجِ تحسین اور اپنے ہم وطنوں کو حصولِ آزادی کی ترغیب بھی ان نظموں میں دی گئی ہے۔ مختلف موضوعات کے تحت ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ جذبۂ آزاد کو اُنھوں نے اس طرح پیش کیا ہے:

سو رہی ہے دیش کی قسمت جگانا چاہیے
زور سے جے ہند کا نعرہ لگانا چاہیے
وزیر ہند سے اے خان کہہ دو غور سے سن لے
جوانانِ وطن کرنے کو ہیں اعلان آزادی
تدبیر سے بدلوں گا تقدیر غلامی کی
اور کاٹ کے رکھ دوں گا زنجیر غلامی کی
اب تک میرے بازو میں وہ زور ہے جب چاہوں
میں توڑ کے رکھ دوں گا شمشیر غلامی کی
نعرہ لگا کے ہند کی جے کا بس ایک بار

انگریز کی غلامی کے بندھن کو توڑ دوں
سامنے انگریز کے سر کو جھکا سکتا نہیں
حریت کی راہ میں سر کو کٹا سکتا ہوں میں

بڑی بے باکی اور جرأت مندی سے اُنھوں نے انگریزوں کو مخاطب کر کے انھیں ہندوستان چھوڑنے کے لیے کہا ہے:

کہہ دو یہ فرنگی سے اب ہندوستان خالی کرو
میہمانی ہو چکی میرا مکاں خالی کرو
کہہ دو یہ فرنگی سے کہ بس ڈیرہ اُٹھاؤ
اب ہند کو تم چھوڑ کر انگلینڈ کو جاؤ
ایشیا کو چھوڑ دو ہندوستان خالی کرو
بات یہ سچی فرنگی کو سنا سکتا ہوں میں
بستر باندھو رستہ پکڑو چھوڑو اب اُس نگری کو
آزادی کی دنیا میں اب بول ہمارا بالا ہے
فرنگی چھوڑ دیں ہندوستاں کو
ہمارے گلشن جنت نشاں کو

پیغام آزادی ان کے کلام کا خاص موضوع ہے:

کامل آزادی سے ہی عشق کرو پیار کرو　　اس سے کم تر ہو جو شے اس سے تم انکار کرو
سر دے کے تم آزادی کی دولت کرو حاصل　　عاشق بنو تو عاشق آزادیِ کامل
گاؤ نہ فرنگی کی غلامی کا ترانہ　　آزادی کی تانیں ہی اُڑاتے چلے جاؤ
دہلی کی طرف جوش سے بڑھتے چلے جاؤ　　آزادی کے جھنڈے کو فضاؤں میں اڑاؤ
اے نوجوانو سر سے کفن باندھ کے بڑھو　　اغیار کو تم اپنے وطن سے نکال دو
پیغام سناتا ہوں میں آزادی کا سب کو　　کہتا ہوں کہ ہو جائیں یہ قربانِ وطن سب

خان غازی کابلی کی نظموں کا بیشتر حصہ رہنمایان سیاست کی مدح میں ہے۔ ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس، جے پرکاش نرائن، گاندھی، خان عبدالغفار خان اور دیگر رہنماؤں پر لکھی گئی ان کی نظمیں قصیدہ کے انداز میں ہیں۔ اسی قسم کی ایک کوشش قمر جلال آبادی کی بھی ہے۔ اُنھوں نے گاندھی

کی منظوم سوانح لکھی تھی۔ جو دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی جلد میں گاندھی کی پیدائش سے ۱۹۲۶ء تک کے حالات اور دوسری جلد میں اس کے بعد کے۔ اس منظم سوانح میں مکمل طور پر مدح اور ستائش ہے، بڑی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور گاندھی کی سیاسی کوششوں کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے اقوال اور حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں کو بھی نظم کیا گیا ہے۔ گاندھی ہی کی ایک اور منظوم سوانح رفیق خاور نے بھی نظم کی تھی اور یہ گاندھی نامہ کے نام سے لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ٹیکا رام سخن نے اپنے انقلابی کلام کا مجموعہ زمزمۂ انقلاب کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں شامل زیادہ تر نظمیں انقلابی، قومی اور آزادی کے جذبات میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ان میں سے بیشتر نظمیں شاعر نے ایام قید و بند میں لکھی تھیں۔

(۶) تحریکِ پاکستان

اُردو شاعروں کی ایک معتد بہ تعداد، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے، قومی، سیاسی تحریکوں کے ہر دور میں آزاد اسلامی ریاست کے تصور کو پیش کرتی آئی تھی۔ بیسویں صدی میں جب مسلمانوں کی قومی اور سیاسی تحریکات اور ان کے اتحادِ اسلامی اور ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل کے تصورات ایک اہم مرحلہ میں داخل ہوئے تھے، اُردو کے بعض شعرا نے شاعری کو ایسے تصورات کی تشہیر اور تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اقبال اہم شاعر تھے جنھوں نے کم سے کم شمال مغرب کے مسلمانوں کے لیے ایک متحد شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست کو مقدر سمجھ لیا تھا، جو حکومت خود اختیاری، خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا اس کے باہر ہو[1]

دوسرے بیشتر شاعروں کی شعری اور علمی جد و جہد پاکستان کے لیے وقف رہی۔ ظفر علی خان پہلے کانگریس میں شامل تھے۔ لیکن کانگریس کے اجلاس کراچی منعقدہ ۱۹۳۶ء میں نماز عصر کے موقع پر اجلاس ملتوی نہ کرنے کے سبب وہ کانگریس سے علاحدہ ہو گئے تھے۔ پنجاب کی خلافت کمیٹی کے فعال رکن تھے۔ اس کمیٹی نے بعد میں مجلس اِحرار کی شکل اختیار کر لی تھی اور تحریک آزادی کشمیر میں نمایاں حصہ لیا۔ مولانا ظفر علی خان کے کلام میں کئی نظمیں تحریکِ آزادی کشمیر سے متعلق ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں مسئلہ شہید گنج پر ظفر علی خان کا مجلس احرار سے اختلاف ہوا تو اُنھوں نے مجلس اتحاد ملت بنا لی۔ جب ۱۹۳۶ء کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی تو ظفر علی خان نے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا اور شب و روز ہمہ تن اس کے لیے مصروف ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء کے ضمنی انتخابات

اور پھر ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا اور منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کو فعال عوامی جماعت بنانے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو کامیاب بنانے میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ اس دور میں ان کی شاعری کے موضوعات ان کی عملی جدوجہد کے مطابق ہیں۔ کانگریس اس کے رہنما، ہندوؤں کی اسلام دشمن تحریکیں، ان کی تنقیدوں کا نشانہ تھیں۔ مسلمانوں میں ملّی اور سیاسی شعور بیدار کرنا، انھیں اپنے حقوق کے لیے مستعد بنانا اور اپنے مقاصد کی بجا آوری کے لیے آمادہ کرنا ان کے خاص مقاصد اور موضوعاتِ شاعری تھے۔

حسرت آزادیِ کامل کے خواہاں تھے۔ پاکستان کے مؤید رہے۔ لیکن پاکستان ڈومینین کے بجائے جمہوریت کے۔ اسی نکتہ پر قائدِاعظم اور ان کے مابین اختلاف رائے تھا۔[2] حسرت کا خیال تھا کہ ہندوستان میں چھ جمہوریتیں قائم ہونی چاہییں (۱) مشرقی پاکستان، (۲) مغربی پاکستان، (۳) مرکزی ہندوستان، (۴) جنوب مشرقی ہندوستان، (۵) جنوب مغربی ہندوستان، (۶) حیدرآباد دکن۔ اور ان سب کو وفاق ریاست ہائے ہند کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے۔[3] آزادیِ کامل کی قرارداد پیش کرنے کے بعد سے حسرت مسلم لیگ میں خاصے فعال رہے۔ ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کونسل کے جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے تھے[4] اور اس کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔

جوش نے شاعری میں تحریک آزادی کے ضمن میں اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس دور میں انقلاب، سامراجیت کی مخالفت، حصولِ آزادی ان کے مخصوص موضوعات تھے۔ اپنی ایک اہم نظم ''وقت کی آواز'' میں مسلم لیگ کی جدوجہد کی تائید کی ہے۔ اس میں مادرِ وطن، چھوٹی بہن لیگ کے بارے میں بڑی بہن کانگریس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

کہتی نہیں کہ لعل و گہر اس کو بخش دے ‌ ‌ ‌ جو گھر وہ مانگتی ہے وہ گھر اس کو بخش دے
دنیا میں سب کو فکر بقائے زباں کی ہے ‌ ‌ ‌ دل میں لگن تحفظ نام و نشاں کی ہے
دھن سب کو ایک حلقۂ امن و اماں کی ہے ‌ ‌ ‌ حاجت ہر ایک فرد و بشر کو مکاں کی ہے
ہاں لیگ کو بھی حق ہے کہ وہ اپنا گھر بنائے ‌ ‌ ‌ بچوں کو اپنے اپنی زباں اپنے فن سکھائے
''چھوٹی کی ہٹ غلط ہے'' یہ باتیں ہیں واہیات ‌ ‌ ‌ ''دشمن کی ہے وہ دوست'' یہ ہے دھاندلی کی بات
بنتی ہے حصے بخرے میں کیوں اس قدر پچیٹ ‌ ‌ ‌ جو اپنی چیز مانگے وہ ٹھہرا نرا پٹیت
بس تو ہی ایک شاہ ہے چھوٹی نری ڈکیت ‌ ‌ ‌ آنکھوں میں گھس رہی ہے اری جوتیوں سمیت

خود دیکھ اپنے اس کے ترانوں میں اختلاف وہموں میں اختلاف گمانوں میں اختلاف
قصوں میں اختلاف فسانوں میں اختلاف لہجوں میں اختلاف زبانوں میں اختلاف
وضع و طریق حرف و حکایت شگون و فال انداز نطق طرزِ عمل جادۂ خیال
رسم و رواج دین و روایات قیل و قال اُٹھ بیٹھ بات چیت لب و لہجہ چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جدا ہر چلن جدا دونوں کے پھول پات جدا ہیں چمن جدا
زیدوں سے آسمان کے لب تو سیے ہوئے وہ اس زمین پر ہے حکومت کیے ہوئے
یہ تو غلط کہ اس کی ضرورت نہیں کوئی پر ساتھ رہنے کی ابھی صورت نہیں کوئی
پھل صبح و شام پھوٹ کے چکھنے سے فائدہ چھوٹی بہن کو گھونٹ کے رکھنے سے فائدہ
چھوٹی بہن مراد نہ جب تک کہ پائے گی بیٹا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی

دیگر ترقی پسند شاعر ۱۹۴۵ء تک پاکستان کی تشکیل کے حق میں تھے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے مسلمانوں کے حق خودارادی اور حق علاحدگی کو تسلیم کیا تھا۔[۵] اس کے ہفت روزہ اخبار قومی جنگ میں اس حق کی تائید کی جاتی تھی۔[۶] لیکن ۱۹۴۵ء میں کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۵ء کے انتخابی اعلامیہ میں پاکستان کی تشکیل کے منصوبے کو انگریزوں کی مصلحت قرار دیا۔[۷] وہ متحدہ ہندوستان میں اپنی سرگرمیوں کو زیادہ مؤثر اور دوررس سمجھتے تھے۔ اس لیے اب مسلم لیگ کے مطالبہ کو ''فرقہ واریت'' اور ''رجعت پسندی'' سے تعبیر کیا گیا۔ بھارت ایک مذہبی مملکت کے طور پر وجود میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پاکستان کے مطالبے کی بنیاد ہی مذہب پر تھی۔ اور اس کے قیام کے بعد اس میں اشتراکیت یا کسی لادینی نظریہ کے لیے کوئی حوصلہ افزا اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ حصولِ آزادی کے حق میں تھے۔ اور اس کے لیے کانگریس اور لیگ کا اتحاد ضروری خیال کرتے تھے۔[۸] لیکن انھیں جب یقین ہو گیا کہ پاکستان کی تشکیل ناگزیر ہے تو اُنھوں نے اپنے مقصد کو کمزور ہوتا ہوا دیکھ کر پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔[۹] یہی وجہ ہے کہ کسی نامور اور اہم ترقی پسند شاعر کے کلام میں جو انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہا ہو، پاکستان کی حمایت و تائید موجود نہیں ہے۔ صرف مجاز ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں ''پاکستان کا ملی ترانہ'' ملتا ہے:

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا خیبر کے گردوں پر چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا

پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا

سو انجیلوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا

ہر ترک اپنا ہر حُر اپنا افغان ہمارا ہر شخص اک انسان ہے ہر انسان ہمارا

پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا

یہ ترانہ ان کے مجموعہ کلام شب تاب میں شامل تھا، جو آہنگ کا اضافہ شدہ تیسرا اڈیشن تھا۔ یہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مجاز نے اس کا انتساب ۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو لکھا تھا۔ ۲۳ر مارچ کے بجائے اُنھوں نے ''یومِ پاکستان'' لکھنا پسند کیا۔ عبارت کی ترتیب یوں ہے:

عصمت کے نام

مجاز

یومِ پاکستان۔ دلی۔ مارچ ۱۹۴۵ء

اس دور کے اکابر شعرا میں عبدالمجید سالک، غلام بھیک نیرنگ، میاں بشیر احمد وغیرہ عملی سیاست میں شریک رہے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مختلف حیثیتوں سے شامل رہے۔ ماہر القادری، نعیم صدیقی، نشتر جالندھری، قوم کے سیاسی نصب العین کو اپنی نظموں کے ذریعہ عام کرتے رہے۔ ان کے علاوہ لاتعداد ایسے غیر معروف شاعروں نے اپنے جذبات و تصورات کو شاعری میں پیش کیا جو پاکستان سے متعلق تھے۔ اسے شاعروں نے کانگریس اور ہندوؤں کے مقاصد کی مخالفت بھی کیا اور مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کو بھی اُجاگر کیا۔ حصولِ پاکستان کے تعلق سے اپنے عزم اور ولولہ کو بیان کیا، پاکستان کے لیے ترانے تحریر کیے اور قائدین پر قصیدے لکھے۔

محمود اسرائیلی نے جدوجہد آزادی اور مسلمانوں کی بیداری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ ان کے مجموعہ کلام ملک و ملت میں مذکورہ موضوعات کے علاوہ مسلمانوں کی علاحدہ قومیت اور آزاد اسلامی ریاست کے تصورات بھی ملتے ہیں۔ ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور اپنے

مذہب میں مدغم کرنے کے لیے جب شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کی گئیں تو اس کے نتیجہ میں ہ
طرف فسادات ہونے لگے تھے۔ اس صورتِ حال میں محمود اسرائیلی نے "جنگ جو ہندوستان کو پیام
کے نام سے ایک نظم لکھی تھی، جس میں علاحدگی کا تصور صاف نظر آتا ہے:

اب وہ بہار ہی کہاں جس سے کوئی چمن بنے　　اب وہ خصوصیت کہاں جس سے کوئی وطن بنے
اہل وطن جدا ہوں تو کس طرح انجمن بنے　　اپنے نیاز مند کا آخری یہ پیغام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش ہند مرا سلام لے

کچھ ایسا ہی خیال "درسِ اتحاد" میں بھی ہے:

اہلِ اسلام کی حجت ہے یہ ہندو کے خلاف　　کبھی مشرک کو نہ پاؤ گے موَحد کا رفیق

جداگانہ قومیت کا تصور ان کی نظموں "عصر اسلام"، "پیغامِ عندلیب" میں نمایاں ہے۔ ان ک
ایک قطعہ بھی اس سلسلے میں زیادہ واضح خیال پیش کرتا ہے:

نہ ہو نسلی و تاریخی روایات ایک ہی جب تک　　نہ وہ یک قوم کہلائے نہ اس کا ایک کلچر ہو
یہاں پر ہم وطن ہم قوم تو ہو ہی نہیں سکتا　　وہ گو جغرافیہ کی رُو سے یک خطہ کے اندر ہو

اپنی نظم "مسلم لیگ" میں اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

جادۂ حق سے ترا ایک قدم بھی نہ ہٹے　　کہ تجھے حق کے لیے جان فدا کرنا ہے
تیرے نعروں میں بھی وحدت کے ترانے ہیں　　حق اسلام مگر تجھ کو ادا کرنا ہے
توڑ دے جنبش ابرو ہی سے باطل کے طلسم　　باغیوں کو تجھے ملت سے جدا کرنا ہے

وہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے گاہے گاہے عمل کی ترغیب بھی دیتے ہیں:

تو میدانِ عمل میں روکش برق رواں ہو جا
جو چھوٹے کارواں تجھ سے تو گردِ کارواں ہو جا
تجھے اس بزمِ گیتی میں فنا ہو کر چمکنا ہے
شرر بن شعلۂ جوالہ بن برق تپاں ہو جا
یہ پاکستان کیا؟ دنیا ترے قدموں کے نیچے ہے
مگر پہلے خدائی طاقتوں کا رازداں ہو جا

عارف سیالکوٹی نے پاکستان کے تعلق سے بکثرت نظمیں تحریر کی تھیں۔ ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ

لے کے رہیں گے پاکستان کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں صرف ایک نظم "پاکستان۔ مسلمانو
سے خطاب" کلیم انصاری کی ہے۔ باقی تمام نظمیں عارف سیالکوٹی کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں مختلف
پہلوؤں سے پاکستان کے بارے میں اظہار کیا گیا ہے۔ ابتدائی چند نظمیں حمد، دعا، اسلام کی ابتدا
رسالت وغیرہ پر ہیں اور پھر دیگر نظموں میں مسلمانوں کی زبوں حالی، بے بسی، محکومی کا ذکر ہے۔ ان میں
خدا سے دعا کی گئی ہے تا کہ مسلمانوں کے ادبار کی یہ حالت دور ہو سکے۔ کچھ نظموں میں جہاد کی اہمیت
زندہ قوم کی علامات اور سیاست کا اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ باقی نظمیں پاکستان، قائداعظم او
عزمِ حصولِ پاکستان سے متعلق ہیں۔ پاکستان کے بارے میں اُنھوں نے جن نظموں میں اظہارِ خیال
کیا ہے، ان سے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اک نوائے جنگ آزادی خلاف دشمناں　　ایک واحد چارۂ مجبوریِ ہندوستان
اپنے اپنے ملک میں ہر قوم ہو فرماں روا　　اپنے مذہب کے مطابق ہر فریضہ ہو ادا
بے سروں میں ہیں ہم سامان پاکستان ہے　　ہم تن بے جاں ہماری جان پاکستان ہے
ہے یہی ایمان کہ ایمان پاکستان ہے　　جان کی سامان کی ایمان کی باتیں کریں
آؤ ہم سب مل کے پاکستان کی باتیں کریں

روح ملت، پاکستان
سر وحدت، پاکستان
عین شریعت، پاکستان
پاکستان ہی ہے ایمان

لے کے رہیں گے پاکستان　　چاہے جائے ہماری جان
لے کے رہیں گے پاکستان

ہند کے دس کروڑ مسلم کا　　آخری فیصلہ ہے پاکستان
جان دے کر بھی ہم اسے لیں گے
حاصل زندگی ہے پاکستان

قائداعظم کے بارے میں:

ہند کے کل مومنوں کے واسطے　　بیش قیمت ایک نعمت ہیں جناح
کافروں کی موت کا پیغام ہیں　　اور مسلمانوں کی عظمت ہیں جناح

مسلم لیگ پر:

عالموں کی ہو جمعیت مجلس احرار ہو　　نام کے آزاد کے یا انجمن تیار ہو
کیوں نہ دل مسلم کا ان سب لوگوں سے بیزار ہو　　جب کہ تقریروں سے ان کی کانگریس پرچار ہو
میں مسلمان ہوں مسلم لیگ ہی میں جاؤں گا

ہو حسین احمد کہ غفار خاں یا بُوالکلام　　دور ہے ان کی رسائی سے محمدؐ کا پیام
یہ اسیر خود روی ہیں خودسری سے ان کو کام　　میرے آگے پھر نہ لینا بھول کر بھی ان کا نام
میں مسلمان ہوں مسلم لیگ ہی میں جاؤں گا

اپنے عزم اور پیغام جدوجہد کا اظہار اس طرح کیا ہے:

دو بڑے حصوں میں اب تقسیم ہو جائے گا ملک
اب تو ہندوستان میں پاکستان بنایا جائے گا

نثارانِ توحید ایمان والو　　یہ آواز ہے وقت کی تیغ اُٹھا لو
اب اس پاک حصے پہ قبضہ جما لو　　حریفوں کی نادانیوں کو مٹا دو
اُٹھو ظلم کے بانیوں کو مٹا دو

شرم تیرے ملک کی قسمت ہو دست غیر میں
چھین لے بازوئے دشمن سے یہ طاقت چھین لے
بن کے حشر و انقلاب و انتقام انگیز اُٹھ
ہستیِ دشمن مٹا تقدیر ملت چھین لے
قصر استبداد ڈھا دینے کا موسم آگیا
ظلم کی دنیا مٹا دینے کا موسم آ گیا
اب مسلمانوں کا نصب العین پاکستان ہے
جس کی خاطر جاں لٹا دینے کا موسم آ گیا
کچھ کر کے ہمیں اب تو دکھانا ہی پڑے گا
اس ہند کو اب ''پاک'' بنانا ہی پڑے گا

اقبال حسین رمزی الہ آبادی بھی پاکستان پر متعدد نظمیں لکھتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھی ہوئی ان کی نظموں کا مجموعہ مسلم نیشنل گارڈز کے ترانے کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان نظموں میں

بڑا جوش اور ولولہ جھلکتا ہے۔ ان میں حصول پاکستان کا پُر جوش عزم اور پیغام بھی دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قائداعظم، مسلم لیگ اور اس کی سرگرمیوں پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مجموعہ کے آخر میں انھیں مذکورہ موضوعات پر دوسرے شعرا کی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں رمزی الہ آبادی نے جو نظمیں لکھیں ان سے چند شعر درج ذیل ہیں:

یقین کیجیے کہ اس سے ہم نہ ہرگز بیش و کم لیں گے
اب حق خود ارادیت کو ہر قیمت پر ہم لیں گے

نہ ہم ان سے درم لیں گے نہ ہم ان سے رقم لیں گے
خدا چاہے تو اک دن لے کے پاکستان دم لیں گے

بس اب تو ہے یہی رمزی تمنائے دِلی اپنی
کہ پاکستان کی صورت بنے دنیا نئی اپنی

اکثریت کی شفقت دیکھی ان کی ہم نے حکومت دیکھی
اقلیت کی درگت دیکھی کیسی کیسی بدعت دیکھی
یہ جو ہم کو ایسا ستائیں کیوں نہ پاکستان بنائیں
آخر کب تک ظلم سہیں گے پاکستان ہم لے کے رہیں گے

مسلمان ہو منظّم جذبۂ ایمان پیدا کر خدا کے پاک بندے اپنا پاکستان پیدا کر

قائداعظم کے بارے میں:

فلاحِ ملت بیضا کو جو مدِّنظر رکھے نہ کیوں پہلو میں اپنے شیر کا قلب و جگر رکھے
کرے یورپ کو متنبہ زبان مثل شرر رکھے یہ تیور قائداعظم کے اللہ عمر بھر رکھے
اسی کے واسطے کی وقف جس نے زندگی اپنی کہ پاکستان کی صورت بنے دنیا نئی اپنی

حصولِ پاکستان کے لیے اپنے عزم و ارادے اور پیغام کو اُنھوں نے اس طرح دہرایا ہے:

قومی جھنڈا ہاتھ میں لے کر آئے ہیں یوں آج برادر
بن جاؤ سب لیگ کے ممبر کام کرو رمزی کو لے کر
اُٹھو پاکستان بنا لو
جاگو جاگو سونے والو
لیگی کو ووٹ دلائیں کیوں نہ پاکستان بنائیں

پاکستان میں یہ لہرائے خوشی خوشی ہر مسلم گائے
ہرا ہرا یہ پیارا پرچم پرچم اونچا رہے ہمارا
باطل ہے قول تیرا یعنی وطن پرستی مسلم کا ایک مذہب ہوتا ہے حق پرستی
اُٹھ لیگ کا علم لے پھر کامگار بن جا

رمزی نے اس میں ''الیکشن کے دو گیت'' بھی شامل کیے ہیں۔ پہلے گیت میں کہتے ہیں:

آیا پیام قائد اعظم جس نے کیا ہے ہم کو منظم
ہو کے مسلماں شاد و خرم لہراؤ اسلام کا پرچم
ووٹ دو مسلم لیگ کو اپنی جو ہے اپنی جیت
جیت الیکشن جیت مسلماں جیت الیکشن جیت

دوسرا گیت ایک ''مارچنگ سانگ'' تھا:

یہ محاذ جنگ ہے پہلے دشمن کو زک دینا ہے یعنی پاکستان ہمارا حق ہے حق کو لینا ہے
مدت سے ہے ناؤ بھنور میں ناؤ کو اپنی کھینا ہے مان الیکشن ہے اک طوفان مسلم لیگ ہے بوٹ
مسلم لیگ ہے اپنی بھیا لیگ کو دیا ووٹ

اس مجموعہ میں دوسرے شاعروں کی جو نظمیں شامل ہیں وہ بھی پاکستان اور اس سے متعلقہ دوسرے پہلوؤں پر ہی لکھی گئی ہیں۔ اس حصہ نظم میں مختلف شاعروں کے جو خاص خاص خیالات ملتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ قائداعظمؒ کے تعلق سے:

ملت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح اسلامیوں کے ہاتھ میں تلوار ہے جناح

(میاں بشیر احمد)

تجھ سے روشن ہے جہاں میں نام پاکستان کا تیرے لب پر دل کشا پیغام پاکستان کا
تو نے بخشا روح پرور جام پاکستان کا تو نے بدلے قوم کے فرسودہ آئین و نظام
السلام اے فخر ملت قائداعظم السلام

(کوثر امروہوی)

سمجھیں گے ہر وقت مقدم جو فرمائیں قائد اعظم
لے کر مسلم لیگ کا پرچم ہاتھ میں حامد مل کر باہم

پاکستان ہم لے کر رہیں گے

(عبدالمجید خاں حامد)

تیرے اشارے پہ ہے قوم اب کمر بستہ　　اٹھائے جادۂ ملت میں ہر قدم بے باک
ہمارا عزم ہے حاصل کریں گے پاکستان　　جسے بدل نہیں سکتی یہ گردشِ افلاک

(مدہوش مہری)

مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد کے بارے میں:

ہے نور اِدھر سایہ ہے اُدھر　　رستہ ہے اِدھر دھوکا ہے اُدھر
ہے پھول اِدھر کانٹا ہے اُدھر　　منزل ہے اِدھر صحرا ہے اُدھر
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

(شفیق عماد پوری)

جو مسلمان ہیں وہ ہوتے ہیں مسلم لیگی　　لیگ کیا چیز ہے؟ مترادفِ پنداری ہے

(صابر کولاری)

لیگ کی گاڑی کوک اُٹھی ہے　　سینے سے اک ہوک اُٹھی ہے
بن جاؤں کہیں نہ سودائی　　بات یہ ہے اے ووٹر بھائی
تھانیدار کے بس میں
دل ہے پرائے بس میں

(حفیظ جالندھری)

اپنے عزم اور پیغام آزادی کا اظہار:

اسلام کا جھنڈا لہرا کر　　ایمان کا جذبہ پیدا کر
بت خانے کی راہ نہ دیکھا کر　　کعبہ کی طرف رُخ اپنا کر

(شفیق عماد پوری)

آزادی پیغام ہمارا　　غم خواری ہے کام ہمارا
فیض جہاں میں عام ہمارا　　سب سے اونچا نام ہمارا
اللہ اکبر، اللہ اکبر

(ماہر القادری)

بس اُلٹ دے ایک جنبش میں تختِ ظالماں کفر ساماں تیری ہرگز تاب لا سکتے نہیں
اب مسلماں جاگ اُٹھا ہے سلا سکتے نہیں یہ الگ اک قوم ہے اس کو مٹا سکتے نہیں

(ضرغام جعفری)

وقت آگیا ہے مسلم جانباز خبردار مرنے کا حلف تجھ کو اُٹھانا ہی پڑے گا

(تاجور جلگانوی)

آثار قید و بند مٹا لوں تو چین لوں آزاد ہو کے نام خدا لوں تو چین لوں

(اسلم لکھنوی)

اسی انداز کا ایک مجموعۂ نظم نغماتِ پاکستان کے نام سے امتیاز جہاں بیگم رحمٰن نے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اس میں پاکستان اور تحریکِ پاکستان کے تعلق سے لکھی جانے والی معروف اور غیر معروف شاعروں کی نظمیں شامل ہیں۔ اسے بالخصوص پاکستان اور مسلم لیگ کے نصب العین کی تشہیر اور تبلیغ کے خیال سے مرتب کیا گیا تھا اور اس میں مرتبہ زیادہ نظمیں مسلم لیگ کے مختلف سالانہ جلسوں میں پڑھی گئی تھیں۔ ان تمام نظموں میں حصولِ پاکستان کا جذبہ، پاکستان کا مقصد، مسلم لیگ اور قائد اعظم سے عقیدت کے جذبات موجزن ہیں اور ان میں مسلمانوں کی بیداری اور حصولِ پاکستان کے لیے پیغام اور عزائم مشترک خصوصیات ہیں۔ پاکستان کے تعلق سے مختلف شاعروں نے اپنے جذبات کا جس طرح اظہار کیا تھا، اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

لے کے اُٹھے ہیں عزمِ مصمم زندہ باد اے پاکستان
پی کے رہیں گے کوثر و زم زم زندہ باد اے پاکستان

(اصغر سودائی)

وہ دن گزرے جب ہندوستاں کو ہندوستاں سب کہتے تھے
اب اس کا گوشہ گوشہ پاکستان ہے ہندوستان نہیں
وہ دیکھ ریاست آتا ہے شمشیر بکف تکبیر بلب
معلوم انھیں ہو جائے گا جو کہتے ہیں پاکستان نہیں

(ریاست علی خاں ریاست)

زمیں اپنی مکاں اپنا حکومت غیر، کیا معنی؟
غلامی ہے تو لعنت ہے یہ ہندوستان کی دنیا

چھپی ہے لیگ کے پردے میں طرفہ شان کی دنیا
ہے پاکستان میں پنہاں مرے ارمان کی دنیا

(عبداللہ محمود کامن امرتسری)

وطن کی بگڑی بن جائے مٹے ہر روز کا جھگڑا
دلوں سے دور ہو جائے نشان گرد و کدرت کا
ادھر بنگال اور آسام کا تھوڑا سا کچھ حصہ
ادھر پنجاب، سرحد، سندھ بلوچستان کی دنیا
ملا کر خطۂ کشمیر پاکستان ہو جائے
دوبالا ہمت اہلِ وطن کی شان ہو جائے
بقائے حریت کا ہند میں اعلان ہو جائے
پنپنے کا مسلمانوں کے کچھ سامان ہو جائے
اگر تقسیم دو ٹکڑوں میں ہندوستان ہو جائے
یہ پاکستان ہو جائے وہ ہندوستان ہو جائے

(غلام محمد خاں یکتا لدھیانوی)

کیا ہے پاکستان کا مطلب؟ سمجھوتے کا ڈھنگ
ہندو مسلم مل کر جیتیں آزادی کی جنگ
اپنی اپنی حد میں رہ کر نکھریں دونوں رنگ
اپنے اپنے گھر میں نکلیں دونوں کے ارمان
بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان

(رئیس امروہوی)

تخت بھی اپنا تاج بھی اپنا ملک بھی اپنا راج بھی اپنا ہوگا اک سرتاج بھی اپنا
اپنا پاکستان بنے گا
خوش حالی و شادی ہوگی مذہب میں آزادی ہوگی اسلامی آبادی ہوگی
اپنا پاکستان بنے گا

(نور اللہ کاتب الہ آبادی)

مبارک ہو تمھیں بیکنڈ ہم کو روضۂ رضواں مبارک ہندوؤں کو دھرم مسلم قوم کو ایمان
مبارک نیائے مندر تم کو اور ہم کو عدل کا ایوان مبارک ہندوؤں کو رام راج اور ہم کو پاکستان
رہیں امواج بحرِ ہند پر قائم سفینے دو
غرض اے ہندوؤ! تم بھی جیو ہم کو بھی جینے دو

(مجاز سیمابی)

روز و شب پھر کیوں نہ ہو اس کو عروج پالیسی گہری ہے پاکستان کی
جگ مگایا گوشہ گوشہ ہند کا روشنی پھیلی ہے پاکستان کی
یہ دعا ہے ہند میں نصرت میری
ہو حکومت جلد پاکستان کی

(شکیلہ خاتون نصرت)

قائداعظم اور مسلم لیگ کے بارے میں بیشتر شاعروں نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

بڑی نزدیک ہے واللہ پاکستان کی منزل نصیبوں سے امیر کارواں ہے قائداعظم

(عبدالمجید زاہد)

بچے بچے نے مرے کارِ نمایاں کر دیا کانگریس کے دیو کو زخمی و لرزاں کر دیا
کوئی دشمن لیگ کو جوہر مٹا سکتا نہیں یہ ہمالہ ہے اسے ہاتھی گرا سکتا نہیں

(جوہر بجنوری)

اک اشارے پر جناح کے، سر کٹا سکتے ہیں ہم جنگِ آزادی میں گھر کا گھر لٹا سکتے ہیں ہم

(آرزو شیدائی)

قسم اسلام کی ہاں سیزدہ صد گزرے سالوں کی بڑی مشکل سے ہوتا ہے جناح سا دیدہ ور پیدا

(حفیظ رومانوی)

مجید اب لشکرِ اسلام کی شیرازہ بندی کو جناب قائداعظم سے سلطاں کی ضرورت ہے

(عبدالمجید مجید)

ہاں بتائیدِ الٰہی قائداعظم ہے تو قوم مسلم کے دلِ مجروح کا مرہم ہے تو

(مجاز سیمابی)

حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کا پیغام اور اپنے عزم کا اظہار ان نظموں کی مشترک خصوصیت ہے، جو اس مجموعہ میں جابجا نظر آتی ہے:

جستجو ہے رات دن لیلائے پاکستان کی
بن کے مجنوں اپنی ہستی کو مٹا سکتے ہیں ہم
(آرزو شیدائی)

سر کٹا سکتے ہیں ہم تحریکِ پاکستان پر
اور بدل سکتے نہیں تجویز پاکستان کو
(رفیق قریشی)

یہ کہہ دو مادر گیتی سے سارے نوجواں مِل کر
جو پاکستان کے حامی ہوں وہ انسان پیدا کر
(شفیق میرٹھی)

اے پاکستانی دیوانو ملت کی بنا دو تقدیریں
اور رکھ دو کر کے ملیامیٹ اغیار کی ساری تدبیریں
(عبداللہ محمود کامن امرتسری)

نعرے لگائیں ہو کر شاد
پاکستان پائندہ باد
قائداعظم زندہ باد
جن کا ہم پر ہے احسان
لے کے رہیں گے پاکستان
ملت کے جاں باز جوان
(رمزی الہ آبادی)

ہاتھ اُٹھیں پرچم ایمان لینے کے لیے
قوم ہو بیدار پاکستان لینے کے لیے
لیگ کیا ہے؟ ایک مرکز قوم و ملت کے لیے
لیگ کیا ہے؟ ایک جلوہ چشم عبرت کے لیے
کون ہے راز حیات قوم کا محرم؟ جناح
محو خدمت کون ملک و قوم میں ہر دم جناح
(کوثر امروہوی)

اپنا حق ہم لے کے رہیں گے
غیروں کے نہ طعن سنیں گے
اپنا ہوگا ملک ہمارا
آپ سنیں گے آپ کہیں گے
بٹ کے رہے گا ہندوستان
لے کے رہیں گے پاکستان
(ساحر صدیقی)

اک جھنڈے پہ پاکستان با خطِ جلی لکھ کر
ہم کوہ ہمالہ کی چوٹی پہ لگا دیں گے
(خلیل ملکاپوری)

مر مٹے گی قوم مسلم آج اپنی آن پر
جان کی بازی لگا دے گی یہ پاکستان پر
(مجاز سیمابی)

حق ہے ہمارا پاکستان حق پہ ہمارا ہے ایمان
آؤ کریں یہ آج اعلان چاہے اپنی جائے جان
لے کے رہیں گے پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان

(میاں بشیر احمد)

اپنی اس تحریک کو کوئی لاکھ کرے بدنام ہم کو کسی سے کام نہیں ہے اپنے کام سے کام
قائداعظم اپنا رہبر ہادی ہے اسلام ہونٹوں پر تکبیر کا نعرہ سینے میں قرآن
بٹ کے رہے گا ہندوستان لے کے رہیں پاکستان

(رئیس امروہوی)

مجھ میں محمودی تڑپ پھر لوٹ کر آنے کو ہے میری بیداری ہے یکسر تاجداری کی دلیل
دل کی ہر دھڑکن میں اب محو تکلم ہے حیات آشکارا ہو رہا ہے ہر نفس راز خلیل
انقلاب ایمان من آئین من قرآن من
مومناں را در جہاں خلداست پاکستان

(عبدالمجید زاہد)

یا تو پاکستان حاصل کر کے دکھلا دو ہمیں یا کٹا دو گردنیں اسلام و ملت کے لیے

(سعیدہ سلیم شاد)

کون کہہ سکتا ہے ہندوستان بٹ سکتا نہیں یہ جو بٹ سکتا نہیں تو کیا میں کٹ سکتا نہیں
فکر لاحاصل کو چھوڑ اب زیست کا سامان کر تو مسلمان ہے تو حاصل آج پاکستان کر

(محمد یعقوب اجر)

لیں گے کربلا سے حوصلہ فاران سے عزم خیبر سے تو استقلال ترکستان سے
اس طرح دہرائیں گے اسلام کی تاریخ کو ہم کریں گے فتح کا آغاز پاکستان سے

(عمر انصاری)

چاہو گر آزادی پاؤ ایک ہی نصب العین بناؤ
آؤ آؤ لیگ میں آؤ سید ، مرزا ، شیخ ، افغان
لے کے رہیں گے پاکستان

(کوثر امروہوی)

پاکستان ہے عزت قومی پاکستان ہے ثروت قومی
پاکستان ہے دولت قومی محنت کا پھل پائیں گے
پاکستان بنائیں گے ہم پاکستان بنائیں گے

(شفیق میرٹھی)

آرزو سر میں اگر سودائے پاکستان ہے پاؤں کے چھالوں کو لے کر دشت کے خاروں سے کھیل

(آرزو ڈبائیوی)

شب ظلمت میں گذاری ہے اُٹھو وقت بیداری ہے
جنگ شجاعت جاری ہے آتش و آہن سے لڑ جا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ اُٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ غیر اللہ کا نام مٹا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

(اصغر سودائی)

تحریکِ پاکستان کے دوران یہ شعر کہ:

لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان

زبان زدِ خاص و عام تھا۔ مذکورہ شعری مجموعوں میں اس شعر پر کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی تھی۔ اسی پر ایک نظم کیف بنارسی نے بھی لکھی تھی، اس کا یہ بند قابل توجہ ہے:

منزل کو سر کرنا ہے مشکل سے کیا ڈرنا ہے
آزادی کے شعلہ کو دل میں روشن کرنا ہے
پاکستان کی الفت میں اپنا جینا مرنا ہے
لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

ان کا ایک اور شعر ان کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

ملت کے جاں باز نو جوانوں کا اب یہ قومی نعرہ ہے
دور ہٹو اے دنیا والو پاکستان ہمارا ہے

یا محشر بدایونی کا ایک شعر:

اس جوانی کی قسم اب سینۂ باطل پہ ہم　　نوک نیزہ سے لکھیں گے لفظ پاکستان کا

حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مقصد اور مسلم لیگ و قائداعظم سے عقیدت کے اعتبار سے نغمات پاکستان مثالی مجموعۂ نظم ہے۔ اسی قسم کی عقیدت کا اظہار انور حارث نے گلدستۂ عقیدت میں کیا ہے۔ یہ قائداعظم کے بارے میں ان کی لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے آخر میں قائداعظم کے کچھ پیغامات کو منظوم شکل میں شامل کیا گیا ہے، اور سب سے آخر میں بہادر یار جنگ کے بارے میں ایک نظم ہے۔ اس مجموعہ کا تعارف سیّد نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے۔ انور حارث کو قائداعظم اور ان کی تحریک سے جو عقیدت اور دل بستگی تھی وہ اس مجموعہ میں جابجا نظر آتی ہے۔ اس کی چند غزلوں سے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

مسیحا آن پہنچا آخرش تائید غیبی سے　　بڑی مدت سے جس کی منتظر تھی قوم بیچاری
تن مردہ میں اس کے زندگی کی روح پھونکی ہے　　دیا سب نیند کے ماتوں کو اک پیغام بیداری
ہے سینہ اس کا مخزن گوہر راز مسلماں کا　　وہ اسلامی سیاست کا ہے خود قرآن خود قاری
تگ و دو، عزم و ہمت اور ان کی کوشش پیہم　　بنا دے گی مسلمانوں کو پاکستان کا احکم
صمیم قلب سے محراب جان مسلم میں　　جلایا حریت قوم کا دیا تو نے
شکستہ حال و تہی دست قوم کو اپنی　　یقین و ذوق عمل کا عصا دیا تو نے
یہ انقلاب کیوں ہو پھر ہنگاموں کا محل　　ملت کے پاس عیسیٰ دوراں ہے آج کل
نہیں کچھ حسن ظن اپنا یہ ایک زندہ حقیقت ہے　　کہ پاکستان بنا ہے جزو ہر مسلم کے ایماں کا
یہ کس کے خبتِ قومی درد ملّی فکر و ہمت پر　　شہادت دے رہا ہے قلب ہر مرد مسلماں کا
جنگ آزادی کے اس دور حیات افزا میں　　ہو مبارک تجھے ملت کا نگہباں ہونا
حارث وطن کے بحر سیاست میں آج کل　　اک دُر بے بہا ہے محمد علی جناح

قائداعظم نے مختلف اوقات میں نوجوانوں، ہندوستانیوں اور دوسروں کو جو پیغامات دیے تھے، انھیں حارث نے تین نظموں کی صورت میں پیش کیا تھا۔ ان کے چند شعر یہ ہیں:

اغیار ہیں گر شعلہ تو اُٹھ تو بھی شرر ہو　　یہ معرکہ دین و وطن ایسے ہی سر ہو
آزاد وطن ہو کے وطن کے لیے کٹ مر　　منزل ہے تیرے سامنے اُٹھ سینہ سپر ہو

یہ ''ستیہ گرہ'' اور گاندھی کی یہ تحریک سہ روزہ ہمارے درد کا ان سے مداوا ہو نہیں سکتا
جدا گانہ ہیں دو قومیں نہیں کچھ مشترک ان میں بہم زیرِ فلک ان کا گذارا ہو نہیں سکتا

بہادر یار جنگ کے بارے میں ان کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

محفل فکر و عمل ویران ہے اس کے بغیر جسم ملت پیکر بے جان ہے اس کے بغیر
وائے قسمت خالد جانباز اک جاتا رہا ملت مرحوم کا دم ساز اک جاتا رہا
سنگ در ہرگز نہ بھولے گا ترا ذوق نیاز نغمہ زن تیرے نفس سے تھا مرے قائد کا ساز

شاعری میں اس قسم کے تصورات، جذبات، عزائم اور پیغامات کا بیشتر حصہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بہت سی چیزیں منظرِ عام پر نہ آسکیں یا کسی خاص اہتمام سے ظاہر نہ کی جاسکیں۔ بعض نظمیں عام جلسوں میں پڑھی گئیں، اور اخبارات و رسائل میں یا کتابی صورتوں میں شائع ہوئیں لیکن ہر ایک نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنی تخلیق کے مقصد کو بڑی حد تک پورا کیا۔

باب پنجم
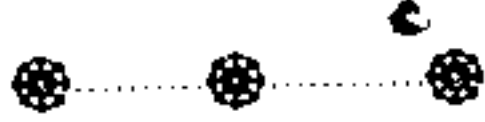
افسانوی ادب میں آزادی کا جذبہ

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

(ا) ناول

(الف) نذیر احمد سے پریم چند تک

۱۸۵۷ء کے سیاسی اور تہذیبی اثرات نے ہندوستانی معاشرے کو توہمات اور تصورات کی دنیا سے ہٹا کر حقیقت کی راہ پر لگایا۔ مغلیہ سلطنت کے دامن میں جس تہذیب نے پرورش پائی تھی وہ ایک عرصہ تک پھلنے پھولنے کے بعد یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے، اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالتی ہیں۔ یہی دور سیّد احمد خاں کی تحریک کا ہے۔ ان کی تحریک کے زیر اثر اور اس زمانہ میں جو خاص علمی اور مذہبی بحثیں ہوئیں، اُنھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کے شعور اور حقیقت پسند کو ناگریز قرار دیا۔ اس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ ایک نئی ذہنی اور ادبی فضا وجود میں آئی۔ افسانوی ادب پر ان کا یہ اثر ہوا کہ تخیلی اور طلسماتی ماحول کی جگہ حقیقی ماحول نے لے لی اور کرداروں میں تصوراتی کے بجائے اخلاقی صفات کے مثالی افراد نے لے لی۔ وہ تمام اخلاقی صفات جو عمل اور خلوص پر مبنی ہوں اور قوم کو ترقی کی طرف لے جائیں اور جنھیں قوم کے اخلاق درست کرنے کے لیے کام میں لایا جائے، کرداروں میں تخلیق کیے جانے لگے۔ ناولوں میں اس خصوصیت کو پیش کرنے اور اسے تکمیل تک پہنچانے میں مولوی نذیر احمد خصوصیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی قبل افسانوی ادب میں یہ روایت نظر آتی ہے۔ محکمۂ تعلیم کے انگریز حکام کی ترغیب میں نئے مدارس کے طلبہ کے لیے قصے اور کہانیاں لکھی جانے لگی تھیں، جن میں اصلاحی اور اخلاقی نظر کے علاوہ واقعات کا پہلو بھی موجود تھا۔ دھرم سنگھ کا قصہ، سورج پور کی کہانی اور ایک اخلاقی قصہ سودھی کھودی سے نام

سے محکم تعلیم کے لیے شائع ہوئے تھے۔[1] گارساں دتاسی نے سررشتۂ تعلیم کی بعض مفید کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ۱۸۶۴ء میں محمد اسماعیل نے طالبات کے مدارس کے لیے ایک کتاب نیرنگِ نظر لکھی۔ اس سال ایم کیپسن ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم نے ایک سبق آموز قصہ داستان جمیلہ خاتون تصنیف کیا۔[2] اس قصہ کا مقصد طلبہ کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو اُبھارنا تھا۔[3] رسوم ہند ناظم سررشتۂ تعلیم کی نگرانی میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی تالیف کا ایک مقصد یہ تھا کہ حقیقت نگاری اور واقعیت سے اہل ہند کے مذہبی عقائد و رسوم اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلو اُجاگر کیے جائیں۔ مولوی کریم الدین نے ۱۸۶۲ء میں جو تمثیلی قصہ خطِ تقدیر لکھا تھا، اُنھوں نے اسے ماحول کے مختلف طبقات کا نمایندہ بنانے کی کوشش کی تھی۔[4] شیخ محمد غوث قریشی نے اپنے قصہ فسانۂ غوث کا بنیادی موضوع خیر و شر کا تصادم رکھا تھا، جس میں خیر کی فتح اور شر کی شکست دکھائی تھی۔ مولوی وزیر علی نے واقعاتی اور اصلاحی کہانیوں کا ایک مجموعہ مرأۃ النساء کے نام سے مرتب کیا جو چھ طویل کہانیوں اور چونتیس حکایات پر مشتمل تھا۔ یہ تمام اسلامی معاشرے سے متعلق تھے۔ اور یہ محکمہ تعلیم کی درسی ضروریات یا حکام کی فرمایش پر نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ ان کی تصنیف کا محرک مصنف کا پرخلوص جذبۂ اصلاحی نظر آتا ہے۔ مولوی وزیر علی کی مقصدیت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ ان کے پیش نظر اوّل تو مسلمانوں کی خانگی زندگی اور بالخصوص طبقہ نسواں کی اصلاح تھی۔ ساتھ ہی مصنف معاشرتی رسوم اور عقائد کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی مضطرب نظر آتا ہے۔ چناں چہ اس میں اودھ کے دیہاتی معاشرے کی تمام خرابیاں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔[5]

محکمۂ تعلیم کی زیرِ نگرانی جو قصے لکھے گئے ان قصوں کی داستانی فضا، جدید کہانیوں کی مانوس واقعاتی فضا سے مختلف اور زمان و مکان کی تخصیص و تحدید سے آزاد ہے۔ یہ قصے نہ صرف واقعاتی ہیں بلکہ دیہاتی ہیں۔ ان کوششوں کو سراہنے کی تحریک سب سے پہلے سیّد احمد خاں نے سائنٹی فک سوسائٹی کی طرف سے سر ولیم میور کو ایک سپاسنامہ میں پیش کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ دیسی زبانوں میں جو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ کی جاتی ہیں، ان میں سے بہترین کتابوں پر مصنفوں اور مؤلفوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات دیے جائیں۔[6] چناں چہ سر ولیم میور نے ہر سال بہترین مصنف، مؤلف یا مترجم کو ایک ایک ہزار روپیہ کے پانچ انعامات کا اعلان کیا[7] اور پھر اس نے ملک کے ادیبوں کو ایک ایسے قومی ادب کی بنیاد ڈالنے کا پیغام دیا جو ہندوستان کے ماحول کا ترجمان ہو۔[8] مولوی نذیر احمد نے

اس وقت تک قانونی و ادبی تراجم کے ذریعہ صاف اور سادہ نثر لکھنے پر قدرت حاصل کر لی تھی اور مختصر حکایتوں کا ایک مجموعہ منتخب الحکایات بھی مرتب کر چکے تھے۔ انعام کی ترغیب پر اُنھوں نے اس عہد کے اصلاحی رجحانات اور تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر اپنا پہلا ناول مراۃ العروس لکھ کر انعامی مقابلہ میں پیش کیا، جس پر انھیں انعام دیا گیا۔[9]

مولوی نذیر احمد معاشرتی شعور سے بہرہ ور اور زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر کے حامل تھے۔ ان کے قصے معاشرتی زندگی کی تصویر اور تفسیر بھی ہیں اور تنقید بھی۔ اپنی خامیوں کے باوجود ان کا فن گذشتہ تمام واقعاتی قصوں سے بہتر اور ناول کی ہیئت سے قریب تر ہے۔ ان میں واقعات اور معاشرتی حالات سے زندہ افراد قصہ کی شخصیت و سیرت کو اہمیت دی گئی ہے۔ مولوی نذیر احمد کے رجحانات و تصورات تقریباً وہی تھے جو سیّد احمد خاں کے رفقا کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ اصل جذبہ اور محرک قوم کی اصلاح اور ترقی کا خیال تھا۔ اور ان کے تمام قصوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان کی مقصدیت ایک خاص دور کے تقاضوں اور تحریکوں سے تعلق رکھتی ہے۔[10] اُنھوں نے قصوں میں اپنی مقصدیت کو خانگی زندگی میں خوش حالی اور مسرت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خانگی مسرت قومی ترقی میں بڑی معاون ہو سکتی ہے۔ اُنھوں نے طبقہ نسواں کو حصول منزل کا سنگ بنیاد قرار دیا اور قومی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی ضرورت تسلیم کی۔ مراۃ العروس اور بنات النعش کی تصنیف مسلمانوں میں براہِ راست تعلیم نسواں کی تحریک کو مقبولیت دینے کا سبب بنیں۔ اس کے علاوہ مولوی نذیر احمد کے معاشرتی اور دینی شعور کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے افادیت پرستی سے آگے بڑھ کر اپنی اصلاحی کہانیوں میں اسلام کی بعض جمہوری اور علمی اقدار، محنت، مشقت، سادہ معاشرت، کفایت شعاری اور ایثار و خدمت پر بہت زور دیا۔[11] ان کے قصوں کی تصنیف کے وقت علی گڑھ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ابتدائی مرحلہ میں نذیر احمد اور سید احمد خاں کے نظریات میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ معاشرتی مسائل کے حل میں بھی وہ سید احمد خاں کے نقطہ نظر سے بہت قریب تھے۔ چناں چہ اپنے قصوں میں انگریزوں سے مصلحتاً سیاسی مفاہمت، انگریز دوستی اور انگریزی تعلیم جیسے مقاصد کی تبلیغ کے لیے بھی گنجائش نکالی ہے۔ وہ حصول علم کو حصول آزادی کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ بنات النعش کی ایک معنی خیز عبارت میں اُنھوں نے یہ نکتہ پیش کیا ہے:

ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی۔ نرے وحشی تھے　　رومیوں

کی سلطنت تھی۔ انھیں سے انگریزوں نے عقل وسلیقہ سیکھا۔ یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔[۱۲]

مولوی نذیر احمد نے بنات النعش میں اپنے تعلیمی و اصلاحی مقاصد کے تحت معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ اصلاحی مقصد کے تحت ان کی توبۃ النصوح بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں فسانۂ مبتلا اور ایامیٰ معاشرتی ناول ہیں۔ اور ابن الوقت اور رؤیائے صادقہ نظریاتی ناول ہیں۔ آخر الذکر دونوں کا تعلق قومی زندگی کے ایک عبوری دور کے اہم مسائل اور رجحانات سے ہے۔ ان میں اس زمانہ کی سیاسی اور مذہبی فضا کی عکاسی کی گئی ہے اور اسلامی معاشرے میں قدامت وجدت کی آویزش کے مناظر تمام جزئی پہلوؤں کے ساتھ دکھائے گئے ہیں[۱۳] اور دونوں ناول مولوی نذیر احمد کے سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی نظریات کے ترجمان ہیں۔ مولوی نذیر احمد کو زیادہ دلچسپی مذہب سے تھی، لیکن انھیں اس ماحول میں فرد اور حکومت کے تعلق پر بھی سوچنا پڑا تھا۔ ایک مسلمان فرد کے حکومت سے کیسے تعلقات ہونے چاہییں اور اس کی سیاسی حیثیت کیا ہو؟ ان کے ذہن میں علی گڑھ تحریک بھی تھی۔ سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کی بہبود، انگریزی حکومت اور تہذیب سے مصالحت میں تلاش کی تھی، مولوی نذیر احمد نے اپنی رائے ابن الوقت میں دی ہے۔ اُنھوں نے ابن الوقت ایک ایسا عینی فرد تصور کیا ہے جو اگر سیّد احمد خاں نہیں تو ان کے نظریہ کے مطابق ضرور ہے[۱۴] ابن الوقت کی تصنیف ۱۸۸۸ء تک ان کا تعلق علی گڑھ تحریک سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اسی سال اُنھوں نے سیّد احمد خاں کی دعوت پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور میں پہلے پہل شرکت کی، پھر جب تک سیّد احمد خاں زندہ رہے وہ ان کے ساتھ تبلیغی دوروں اور قومی جلسوں وغیرہ میں شریک ہوتے رہے۔ مذہبی، سیاسی اور تہذیبی نظریات میں بڑی حد تک اتفاق کے باوجود مولوی صاحب کو سیّد احمد خاں سے دوسرے رفقا کی طرح جو اختلاف تھا، وہ ابن الوقت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس ناول میں اُنھوں نے علی گڑھ تحریک کے مطمحِ نظر کو تجزیے اور تبصرے کا موضوع بنایا ہے۔ اس تحریک کے جو پہلو کہانی کی واقعاتی حدود میں سما سکے، بحث وتقریر کے ذریعہ ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مولوی نذیر احمد اور سیّد احمد خاں کے معاشرتی نظریات کا بنیادی فرق یہی تھا کہ نذیر احمد قومی خودی اور قومی کردار کو برقرار رکھتے ہوئے ایک جائز حد کے اندر اصلاح چاہتے تھے، جب کہ سیّد احمد خاں قوم کی قلبِ ماہیت کے خواہاں تھے۔ ابن الوقت میں مذہب اور عقل کی بحث چھیڑ کر نذیر احمد

نے سیّد احمد خاں کے علم الکلام پر بھی طنز کیا ہے۔ سیّد احمد خاں سے ان کا اختلاف اپنی جگہ قائم رہا۔ لیکن رویائے صادقہ میں اگر چہ سیّد احمد خاں کی اجتہادی لغزشوں کا ذکر آیا ہے، تاہم تنقید و تبصرہ میں اپنائیت کا انداز ہے۔ سیّد احمد خاں کا نام لے کر ان کی تعلیمی جدوجہد اور اصلاحی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ابن الوقت کا بنیادی موضوع معاشرتی اور رویائے صادقہ کا مذہبی ہے۔ ابن الوقت پر مقصدیت کی گرفت، ان کے دوسرے ناولوں سے زیادہ شدید ہے۔ اس کی اہمیت معاشرے کے بنیادی مسائل کے حقیقت پسندانہ شعور و احساس پر مبنی ہے۔ اس ناول کا ماحول، خانگی زندگی کے بجائے قومی زندگی کے مسائل اور ایک خاص دور کے رجحانات سے ہے۔ اس میں فصل دوم سے فصل ششم تک جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے عواقب کا بیان نذیر احمد کے عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے حکومت کی کمزوریاں اور حکام کی زیادتیاں بھی کھلے لفظوں میں بیان کی ہیں۔[۱۵]

فی الحقیقت نوبل صاحب کی دعوت میں ابن الوقت کی تقریر سیّد احمد خاں کے رسالۂ اسباب بغاوت ہند کا ایک مؤثر تتمہ ہے۔[۱۶] سیّد احمد خاں کی سیاسی مصالحت کے نظریہ کے مطابق نذیر احمد کو بھی یقین تھا کہ اگر مسلمان سیاسی شعور سے دُور رہ کر اپنی اقتصادی اور تعلیمی اصلاح کی منظم کوشش میں لگے رہے تو ان کا سیاسی مستقبل بھی تابناک ہو سکتا ہے، اور ملک کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ آ سکتا ہے۔[۱۷] اُنھوں نے مسلمانوں کو ہندو ذہنیت سے بھی خبردار کیا۔[۱۸] اٹھارویں فصل میں ہندو سرشتہ دار کا کردار دراصل جنگِ آزادی کے بعد عام ہندوؤں کے قومی کردار کا نمایندہ ہے۔ ابن الوقت کے خلاف اس کا حریفانہ رویّہ اس سیاسی سازش کا پیش خیمہ تھا جو مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع، منظم تحریک کی صورت میں شروع ہو رہی تھی۔[۱۹]

ابن الوقت نذیر احمد کے دیگر ناولوں سے اس اعتبار سے منفرد اور امتیازی ہے کہ اس کے ذریعہ نذیر احمد کے سیاسی نظریہ سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سیاسی نصب العین اور مطمحِ نظر کو بخوبی اُجاگر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اس غلامانہ ذہنیت اور کورانہ تقلید کے خلاف زبردست طنز کیے ہیں جو اس زمانہ کے مسلمانوں خصوصاً مصلحین میں پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے ناول کے ماحول اور کرداروں سے اس دور کی معاشرتی کش مکش کا پورا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں اس وقت کے سیاسی ماحول کے مناظر بھی اپنی جزئیات سمیت معرضِ تحریر میں آ گئے ہیں۔ انگریزوں کے خیالات، رعایا کے احساسات، سیاست

اور مذہب کے نئے نئے تصورات اور ان کے زیرِ اثر ہندوستانیوں کے لیے تہذیبی اور معاشرتی رجحانات جیسے موضوعات کو گفت گو اور مکالمہ کی صورت میں بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔[۲۰] اس میں ایک حد تک مسلمانوں کو ہندو ذہنیت سے بھی واقف کرایا گیا ہے اور ان کے لیے ایک سیاسی نصب العین بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں ان کا اپنا ایسا عمل دخل ہو جیسا کہ انگلستان میں انگریزوں کا۔[۲۱]

مولوی نذیر احمد قومی تعمیر کے اوّلین دَور کے رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ اپنے دور کے صحیح نمایندے اور ترجمان ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے دوسرے رفقا کی طرح ذہن کو بدلنے کے لیے بڑا موقر ادب تخلیق کیا۔ لیکن اس سے زیادہ ان کے ناول، جن کا تعلق خاص عوام سے تھا، مؤثر ثابت ہوئے۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کو معاشرتی، اخلاقی اور معاشی نقطہ نظر سے اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ مستقبل کا مقابلہ یقین اور اعتماد کے ساتھ کرسکیں۔ اُنھوں نے قصہ اور اصلاحِ معاشرت میں جو رشتہ قائم کیا اس نے اُردو ناول میں ایک خاص معاشرے کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے گہری جذباتی وابستگی کے عنصر کو شامل کیا۔ قصہ اب محض دل چسپی یا وقت گذاری کا مشغلہ ہونے کے بجائے معاشرتی زندگی کے مسائل کی مصوری اور اصلاح کا ذریعہ بن گیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار، اپنے معاصرین میں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ اُنھوں نے اپنے ناولوں میں مشرقی طرزِ معاشرت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ حکمران قوم کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔ ان کی وسیع القلبی اور بیدار مغزی، صحیح فنکارانہ فکر ونظر کا ثبوت ہے۔ خود ہندو تھے لیکن لکھنؤ کی مسلم معاشرت اور تہذیب کے مصور تھے۔ اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی معاشرت سے ان کی مکمل واقفیت یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ان کی تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی۔[۲۲] اُنھوں نے اپنے ناولوں میں وہ سب کچھ پیش کیا ہے جس کے محرکات سیّد احمد خان اور حالی کی تحریکات میں ملتے ہیں۔ اپنی تصنیفات میں ان کی نظر ایک ناقد اور مصلح کی ہے۔ جدید خیالات کے مؤید تو نظر آتے ہیں لیکن میانہ روی کے ساتھ ان کا مطمح نظر لکھنوی معاشرت اور خصوصیت سے عام ہندو مسلم طبقات کی پستی اور انحطاط کا مذاق اڑانا تھا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ چناں چہ وہ دوسروں کی کمزوریوں کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہر اُس بات کا جو خلافِ اُصول وضابطہ ہو خاکہ اُڑاتے ہیں۔ معاشرے میں بے ضابطہ اور غیر پسندیدہ پرانے رسوم اور خیالات کی کمی نہیں تھی۔ سرشار نے ان سب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ معاشرے کے قریب قریب ہر مذموم پہلو پر اُنھوں نے روشنی ڈالی

ہے۔[۲۳] ان کی تصانیف مابعد جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی معاشرت کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اُنھوں نے معاشرے کے مذموم پہلوؤں پر کہیں طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور کہیں حقیقتِ حال کا اظہار کر کے قاری میں ان کی جانب سے تنفر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اُنھوں نے مصلحانہ لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے اور یہ خصوصیت ان کی تصانیف میں جابجا موجود ہے۔ معاشرے کی تمام فرسودہ رسوم ورواج کے علاوہ بری عادتوں، معاشرتی برائیوں، نظم ونسق کی خرابیوں اور نظامِ حکومت کی بے قاعدگیوں پر طنز کیے ہیں۔ فسانۂ آزاد میں جوان کی مثالی اور لازوال تصنیف ہے، زندگی کے عام مسائل اور موضوعات پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ یہ مسائل اس دور کے معاشرے کے بہترین ترجمان اور نمایندہ تھے۔ یہ سرشار کی فنی خصوصیتوں کا بھی ایک مرقع ہے۔ اس میں مسلمانوں کے زوال پذیر تمدن کے مؤثر اور عبرت انگیز مناظر موجود ہیں۔ بعض مقامات پر اس دور کے تعلیمی نظام، پڑھانے کے فرسودہ طریقوں، نصاب تعلیم وغیرہ پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔[۲۴] میانہ روی ان کا مخصوص نظریۂ حیات تھا اور وہ جدید علوم اور خیالات کے حصول کو ضروری سمجھتے تھے۔

سرشار علی گڑھ تحریک سے بھی متاثر نظر آتے تھے۔ سیّد احمد خان کی کوششوں کو سراہتے تھے:

> ''......وہ کشتۂ قوم اپنی قوم کے لیے کیا کر رہا ہے۔ کن کن حکیمانہ تدبیروں سے اسلام کی حالت کے ترقی دینے میں ساعی بالخیر ہے۔ اپنی عمر اس نے بہبودی اسلام ہی میں صرف کی اور اب تک صرف کر رہا ہے۔''[۲۵]

سرشار مسلمانوں کو نئے حالات کے مطابق ڈھل جانے کی ترغیب دیتے ہیں اور ان میں آپس کے اختلافات کی مذمت کی ہے۔[۲۶] اُنھوں نے روایت سے بغاوت اس قدر ہی نہیں کی کہ پرانی رسوم اور افسردہ دل کو ٹھکرایا بلکہ ایک زوال آمادہ تہذیب کے زوال پذیر معاشرے اور بداعمالیوں کے خلاف بھی بغاوت کی۔ وہ صرف مصلح ہی نہیں تھے، اُنھوں نے اپنے ماحول کے مطابق انقلابی خیاالات بھی عوام کے سامنے رکھے ہیں۔

عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری بھی سیاسی اور معاشرتی پس منظر ہی کی رہینِ منت ہے۔ اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا میں اُنھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ صلیبی جنگوں پر ایک ناول لکھ کر اسلام اور اس کے جاں بازوں کی عظمت کو اُجاگر کریں گے۔[۲۷] اسلام سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کے تاریخی ناول ان کے جوش اور جذبۂ اسلام کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان کا جذبہ

مذہبی ان کے ناول نگار ہونے کا محرک نظر آتا ہے۔[۲۸] مذہبی جوش اور اسلام کے احیا کا جذبہ ان کے ناولوں میں ہر جگہ موجزن ہے۔[۲۹] سیّد احمد خان اور ان کی تحریک سے بڑے متاثر تھے اور اپنی تمام کوششوں میں سیّد احمد خان کے مؤید اور متفق رہے۔ پہلے ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے لیکن بعد میں ہندوؤں کے طرزِ عمل سے مایوس ہو کر ہندوؤں سے مسلمانوں کے علاقوں کی علاحدگی کو ضروری سمجھنے لگے تھے۔[۳۰] مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اس کی مختلف خرابیوں سے پورے طور پر واقف تھے اور ان کی اصلاح کی خواہش بھی کرتے تھے۔

اپنی ناول نگاری کے ذریعہ شرر راسخ خیالات کی تبلیغ اور اصلاح احوال و اخلاق چاہتے تھے۔ ان ناولوں کی تخلیق کا مقصد اُنھوں نے یہ قرار دیا تھا کہ ان کے مطالعہ سے مسلمانوں میں حمیت اسلام جوش میں آئے۔ ان کے تصورات قومیت میں پختگی پیدا ہو اور وہ ترقی کی راہ پر چلنے کا تہیہ کرلیں۔[۳۱] ان کی ناول نگاری کی ابتدا معاشرتی اصلاحی ناولوں سے ہوئی جن میں کئی حیثیتوں سے ان کے اصلاحی رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن ان کا مقصد اور مطمح نظر ان کے تاریخی ناولوں میں جاگزیں ہے[۳۲] اور ان میں شوقین ملکہ، فلپانا، حسن انجلینا، فلورا فلورنڈا، فتح اندلس اس قابل توجہ ہیں کہ ان میں مغربی اقوام بالخصوص عیسائیوں پر مسلمانوں کی برتری ثابت کی گئی ہے، وہ اپنے ناولوں میں عظمت ماضی کی داستانیں دُہرا کر مسلمانوں میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جو افسردہ دلوں کی رہنمائی کر کے انھیں عمل کے راستے پر چلا سکے۔

ناول نگاری میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی شروع کی ہوئی روایت کی تقلید میں کافی مثبت کوششیں ہوئیں۔ یہ روایت عام ہوتی گئی۔ منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب اور مرزا رسوا اسی روایت کے علم بردار تھے۔ منشی سجاد حسین کے ناولوں میں مصنف کا مزاج اور فکر و احساس کا امتیازی عکس موجود ہے۔ ایک مخصوص معاشرہ اور صداقتوں اور حقیقتوں سے مل کر بننے والے کردار ان کے ناولوں کی خصوصیت ہے۔ اُودھ پنچ کے خالق تھے۔ جو سیاست میں کانگریس کا حامی اور انگریزوں کا مخالف تھا۔ اس دور کے اہم اور نام ور ادیب اور شاعر ان کے حلقہ سے وابستہ تھے۔ اپنے ناول اور دیگر تحریریں اودھ پنچ ہی کے ذریعہ عام کیں۔ ان کے خاص ناول حاجی بغلول، احمق الدین، طرح دار لونڈی، میٹھی چھری، پیاری دنیا، کایا پلٹ ہیں۔ اپنے ناولوں میں لکھنؤ کی معاشرت کے مخصوص پہلوؤں کے اظہار کو خاص موضوع کے طور پر اپنایا تھا۔ قدیم طرزِ معاشرت کے دل دادہ تھے، اور اسی لیے ہر قسم کے تجدد کی

مخالفت کی۔ زندگی بھر علی گڑھ تحریک اور اس سے وابستہ افراد کے سخت گیر نقاد رہے۔ قدیم اور زوال پذیر معاشرت کے تفصیلی خاکے ان کے ناولوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ محمد علی طبیب نے شرر کی بھرپور تقلید کی تھی۔ ان کے ناول شرر کے ناولوں کی مقبولیت سے متاثر ہوکر لکھے گئے۔ معاشرتی اور تاریخی دونوں طرح کے ناول لکھے۔ معاشرتی ناولوں میں اپنے دور کے بعض مسائل پیش کیے۔ گورا میں بیوگان کی پُر درد زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اختر و حسینہ میں تعلیم نسواں کی اہمیت جتائی ہے۔ پند و نصائح ان کے ناولوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ اپنے تاریخی ناولوں میں اُنھوں نے وہی کچھ پیش کیا ہے جو شرر کے ناولوں کا موضوع ہے۔

ان ناول نگاروں کے علاوہ بھی اس دور میں بہت سے افراد نے ناول لکھے۔ ناول کی صنف اس دور میں بڑی مقبول ہورہی تھی۔ نواب سیّد محمد آزاد، سجاد حسین انجم کس منڈی، مرزا عباس حسین ہوش، جوالا پرشاد برق، سرفراز حسین عزمی، محمد احسان اللہ العباسی وغیرہ نذیر احمد، سرشار اور شرر کے مقلدین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نواب سیّد محمد آزاد نے نوابی دربار لکھا۔ اس میں طنزیہ انداز میں اودھ کے نوابوں کی تیزی سے رُو بہ زوال معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے موضوعات منشی سجاد حسین سے بڑی حد تک مطابقت رکھتے تھے۔ سجاد حسین انجم کس منڈی نے بھی یہی انداز اختیار کیا تھا۔ بگلا بھگت، حیات شیخ چلی اور کائنات ان سے منسوب ہیں۔ ان کے علاوہ نشتر فارسی سے ترجمہ ہے۔[۳۳] کائنات انسانی زندگی کی رمزی یا مثالی داستان ہے اور بڑے گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں خالق و مخلوق، خدا اور بندہ اور اس کے تعلقات کی نوعیت، زندگی کی منزلوں کی کیفیت اور آخر میں روزِ حساب کا نقشہ بیان کیا گیا ہے۔ نشتر بظاہر فارسی سے ترجمہ ہے، جس کا مصنف سیّد حسن شاہ لکھنؤ کا باشندہ تھا اور یہ کسی کی خودنوشت داستان معاشقہ ہے۔ لیکن اس کے واقعات انگریزی قبضہ کے ابتدائی زمانہ کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عباس حسین ہوش نے نذیر احمد اور سرشار کی تقلید میں افسانہ نادر جہاں اور ربط ضبط لکھیں۔ اوّل الذکر تعلیم نسواں کی ضرورت پر ہے اور ربط ضبط تاریخی ناول ہے۔ جوالا پرشاد برق نے اودھ پنچ کے مستقل لکھنے والوں کے انداز میں بنگالی ناولوں کے ترجمے کیے۔ سرفراز حسین عزمی نے طوائف کو اپنے تمام ناولوں کا موضوع بنایا، اور ان سے طوائفوں کی اصلاح اور ان میں تبلیغ کا کام لیا۔ شاہد رعنا ان کا نمائندہ ناول ہے۔ محمد احسان اللہ العباسی نے کئی موضوعات پر ناول لکھے۔ اُردو میں ترجمہ قرآن، تاریخ اسلام اور تاریخ

حکمائے یورپ ان سے منسوب ہیں۔ ناولوں میں زاہدہ، فسانۂ دل پذیر اور المجاہد ہیں۔ زاہدہ میں عورتوں کے حقوق پر بحث کی گئی ہے۔ فسانۂ دل پذیر بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح سے متعلق ہے۔ المجاہد میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور وراثت کے مسئلہ پر متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول چھپرہ کے ایک نام ور رئیس شیخ نصیر کے خاندانی حالات کے سلسلے میں مولوی محمد مجاہد چھپروی کو مرکزی کردار کی حیثیت دے کر لکھی گئی ہے۔ موضوع کے انتخاب اور طرزِ تحریر میں نذیر احمد کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ ناول ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔

اس دور میں ایسے ناول نگار جن کے ناولوں میں زندگی کا تنوع بھی ہے اور اجتماعی اور انفرادی عمل کے محرکات بھی، صرف دو ہی ہیں۔ ایک مرزا رسوا اور دوسرے مرزا محمد سعید۔ مرزا رسوا نے بھی سرشار کی طرح سے لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی مصوری کی ہے لیکن سرشار سے قطع نظر مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر پہلی مرتبہ ناول نگاری کی خصوصیات میں یہ اضافہ کیا کہ زندگی کے سیدھے سادھے معمولی اور بظاہر غیر اہم مشاہدات کے پس منظر میں تہذیب، معاشرت، سیاست، معیشت اور اخلاق اور بعض اوقات تاریخ کے حقائق بھی موجود ہوتے ہیں۔[۳۴] امراؤ جان ادا کے علاوہ رسوا نے افشائے راز، ذاتِ شریف، شریف زادہ اور اختری بیگم بھی لکھیں۔ ان کے علاوہ کئی تراجم بھی اُنھوں نے کیے، جو جرائم اور اسرار کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ افشائے راز میں بھی لکھنؤ کی شہری زندگی، وہاں کے باشندے اور ان کا سماجی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ ذات شریف میں بھی حقیقت نگاری کی کوشش نظر آتی ہے۔ شریف زادہ میں ایک مثالی انسان کا کردار پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے، جو ذاتی محنت، قابلیت اور نیک نفسی کی بدولت ترقی کرتے ہوئے ممتاز حیثیت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اختری بیگم میں متوسط طبقہ کی زندگی کے نفسیاتی روابط دکھائے گئے ہیں اور مختلف کرداروں کو ان کے نفسیاتی پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک خصوصیت جو ان کے ناولوں میں دیگر معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ ہی موجود ہے، وہ حقیقت نگاری ہے جو مثالیت پسندی کو کم سے کم کر دیتی ہے۔ امراؤ جان ادا ان کا بہترین ناول ہے، جس میں نگار خانے کے توسط سے لکھنؤ کے انحطاط پذیر تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔ امراؤ جان ادا کے نگار خانے سے فرار کے بعد اس زمانہ کے غیر محفوظ راستوں، معاشرے کے شر پسند عناصر کی کارستانیوں، سیاسی بے تدبیریوں اور فوجوں کی کم ہمتی کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس ناول میں اس عہد کے طرزِ معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس کے کردار عام طور پر اپنے آپ کو اس مخصوص تمدن کا رُکن ثابت کرتے ہیں اور یہ اس تمدن کے خالق بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا وجود بے جان ہے، حال سے بے خبر ہیں اور انھیں مستقبل کا احساس نہیں۔ اس روایتی تمدن کی ساری قدریں شکستہ ہو چکی ہیں۔ اس تمدن کے افراد کے ذہن کھوکھلے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود لیکن اس میں خال خال کچھ افراد ایسے بھی نظر آتے ہیں جن میں اپنے طبقہ کے افراد سے مختلف احساس ہوتا ہے، جرأت وحوصلہ کے عناصر بھی ہوتے ہیں۔[۳۵]

رسوا نے اپنے معاشرے میں جو اخلاقی کمزوریاں دیکھی تھیں، ان کے ذریعے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قوم کی ترقی کا انحصار اخلاق کی پختگی پر ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے کردار تخلیق کرنے چاہے تھے جن میں نیک نفسی ہو، صبر واستقامت، جرأت وحوصلہ اور ترقی اور بہبود کی اُمنگ موجود ہو۔ اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ خود رسوا کی تمام زندگی کی مسلسل محنت، مطالعہ اور تجزیے نے یہ جتایا کہ زندگی کی مشکلات کو بھول کر انسان تسکین ذوق اور خدمت خلق کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے ہر کارنامہ میں ایک جدت اور اصلاح کی خواہش نظر آتی ہے۔[۳۶]

مرزا محمد سعید کا ناول خواب ہستی اصلاحی تھا۔ ناول کا مقصد نوجوانوں کو عیش ونشاط سے بچانا تھا۔ ناول نگار کی نظر میں دنیوی تعلقات اور حسن وشباب کی حیثیت ناپائیدار ہے اور انسان کو سکون محض مذہب کے سایہ میں مل سکتا ہے۔ یہ خیال ناول میں ناصحانہ پیرانہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک انفرادیت یہ ہے کہ مصنف نے اپنے زمانہ کے معاشرتی انتشار کو واقعات کی شکل دینے کی طرف توجہ دی ہے۔ ان کی نظر زمانہ کے اس انتشار اور اضطراب پر ہے جس میں سیاست اور تہذیب دونوں متاثر ہو رہی تھیں۔ اس سے فرار کی صورت میں انسان کی فطرت آزادی کے حصول کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان کا دوسرا ناول یاسمین بھی اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس میں ناول نگار یہ کہنا چاہتا ہے کہ جوانی کا جوش انسان کو اکثر گمراہ کرتا ہے اور محض جذباتیت پرسکون زندگی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

اس دور کے دیگر ناول نگاروں کا رجحان بھی زیادہ تر ماحول کی اصلاح کی جانب رہا۔ حالی نے معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی بعض اہم تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی دیگر موقر مسائل کے ساتھ ساتھ مجالس النسا تحریر کی۔ یہ ایک سادہ، اصلاحی اور مقصدی کہانی ہے، جو عورتوں کے لیے نصیحتوں کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ یہ دراصل مختصر قصوں کا مجموعہ ہے جسے مجلس کا نام دیا گیا ہے۔ ہر مجلس میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے کسی ایک مسئلہ کے متعلق جس قدر بھی نصیحتیں عورتوں کو کی

جا سکتی تھیں اور ان کی تربیت کی جا سکتی تھی، حالی نے انھیں یک جا کر دیا ہے۔ وہ ان قصوں کی مدد سے اپنی کہانی میں معاشرتی زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے صورت الخیال کے نام سے ایک ناول تین جلدوں میں لکھا تھا، یہ بھی پند و نصائح پر مشتمل تھا، جن کا مقصد عورتوں میں جرأت و استقلال پیدا کرنا تھا۔ بیخود دہلوی نے بھی ننگ و ناموس کے نام سے ایک ناول لکھا۔ اس میں بے پردگی کی خرابیاں بیان کیں۔ کشن پرشاد کول نے سادھو اور بیسوا مقصدی ناول لکھا تھا۔ اس میں ہندو معاشرت کی بعض خرابیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

بحیثیت مجموعی اس دور میں ناول نگاروں نے زیادہ تر نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ناولوں کی تقلید میں ناول تصنیف کیے۔ ناولوں کا زیادہ تر رجحان اصلاحی اور تاریخی رہا۔ اصلاحی ناولوں میں مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح بھی مقصود تھی اور ان کی تہذیبی اور تمدنی خرابیوں کو بھی دور کرنا تھا۔ تاریخی ناولوں میں اسلام کی عظمت، مسلمانوں کا عظیم الشان ماضی اور مسلمانوں کے کارنامے دکھائے جاتے رہے۔ اور ان کی تصنیف کا مقصد بڑی حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں سے افسردگی اور مایوسی ختم کر کے ماضی کے حوالے سے ان میں حوصلہ اور ترقی کی اُمنگ پیدا کرنا تھا۔ بعد میں مختلف پہلوؤں سے ایسی روایت کی پیروی بھی ہوتی ہے اور اسے فروغ بھی ملتا ہے۔

راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش اسی روایت کے پیرو اور علم بردار ہیں جسے نذیر احمد اور شرر نے شروع کیا تھا۔ اُنھوں نے اس روایت کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت انجام دی۔ راشد الخیری نے اپنے موضوع اور فن کی تمام بنیادیں نذیر احمد کی روایت پر استوار کیں۔ مزید آگے بڑھ کر اُنھوں نے طبقہ نسواں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی حیثیت کے بلند کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ ان کوششوں نے عورتوں کے مسائل سے ہمدردانہ حمایت کی بنیاد ڈالی۔ راشد الخیری نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے ناول لکھے۔ ان کے ناولوں کے زیادہ تر موضوعات عورتوں کی تعلیم و ترقی کی کوشش اور ان کی زندگی کے مسائل کے بیان پر مرتکز رہی ہے۔ اپنے ناولوں میں اُنھوں نے معاشرے کی مذموم اور قبیح رسوم پر تنقیدی نظر بھی ڈالی۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کر کے مشرقیت کی برتری ثابت کرنا بھی ان کے ناولوں کا ایک مقصد ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے متعدد تاریخی ناول بھی تصنیف کیے تھے۔

ان کی تصنیف کے مقاصد بڑی حد تک شرر کی متابعت میں تھے۔ ایک خصوصیت ان کے تاریخی ناولوں کی یہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے ہی تاریخی موضوعات اور کردار منتخب کیے جن کے ذریعہ مسلمان

خواتین کے کارنامے پیش کیے جاسکتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو بھی اپنے دیگر معاشرتی اور اصلاحی ناولوں کی طرح عورتوں کے افادہ کے لیے ہی تصنیف کیا۔

سلطان حیدر جوش نے زیادہ تر افسانے لکھے، لیکن کچھ ناول بھی تحریر کیے۔ ان کی تحریروں کا مقصد مسلمانوں کو مغربیت سے بچانا تھا۔ افسانوں اور ناولوں میں ہمیشہ یہ مقصد ان کے پیش نظر رہا۔ چناں چہ ان کا انداز ناصحانہ تھا۔ ان کے ناولوں میں ہوائی، نقش و نقاش اور نواب فرید ہیں لیکن ایک اور ناول ابن مسلمہ زیادہ اہم ہیں۔ یہ تاریخی ناول ہے جس میں ایک مثالی مسلمان مجاہد کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اصلاحی مقاصد معاشرتی زندگی تک محدود ہیں۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے فرق کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والے مضر قومی اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

خان احمد حسین خان، جنھوں نے متعدد ناول لکھے، خیر و شر کا تصادم اور ہمیشہ خیر کی فتح ان کے ناولوں کا موضوع تھا۔ ان کے ناولوں میں نذیر احمد کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اس دور میں نذیر احمد کی تقلید اور کسی حد تک شرر کی قائم کی ہوئی روایت کے زیرِ اثر عورتوں نے بھی ناول تصنیف کیے اور یہ اثرات ان کے ناولوں میں کافی عرصہ تک محسوس ہوتے ہیں۔ عام طور پر خواتین ناول نگاروں کے موضوعات اور مقاصد پر نذیر احمد کے فکر، نظریۂ حیات اور مقصدیت کا اثر نظر آتا ہے۔ خواتین ناول نگاروں کے ابتدائی دور میں صغرا ہمایوں مرزا نے زہرہ لکھا۔ اس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت، ان کے اخلاق و معاشرتی ماحول کا جائزہ اور اصلاحِ رسوم کی جانب واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ یہی کچھ فاطمہ بیگم کی تحریروں صبر کا پھل، کرنی کا پھل، لالچ کا شکار، وفائے مغرب اور غیرت کی پتلی میں، محمدی بیگم کی سگھڑ بیٹی اور شریف بیٹی میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کا غالب پہلو عورتوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ ترکِ رسوم اور محنت و مشقت کو معاشرتی زندگی کی کامیابی کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ طیبہ بیگم کے ناول انوری بیگم میں عورتوں کے فرائض سمجھائے گئے ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے اپنے ناول اختر النسا بیگم میں بتایا ہے کہ عورت تعلیم یافتہ ہو تو اپنی زندگی کو کس طرح پُرسکون گزار سکتی ہے۔ ظفر جہاں بیگم کے ناول اختری بیگم میں بھی یہی اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اپنی تعلیم اور عقل سے زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ یہ سارے ناول اس وقت کی عورت کے سب سے بڑے مسئلہ تعلیم کو زیادہ خصوصیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان ناولوں کی تصنیف کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ داخلی اور خارجی

زندگی سے ہم آہنگ ہونے، اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے اور نت نئے ماحول کے سائے میں ڈھلنے میں عورت کو جو دقتیں پیش آتی ہیں، ان سب کا حل تعلیم ہے۔[۳۷] ان ناول نگاروں نے رجعت کے بجائے ترقی کی ہم نوائی کی ہے اور اپنے ناولوں میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے جو مشرق کی دینی اور اخلاقی قدروں کی بھی پابند ہیں اور زمانے کے نئے تقاضوں پر بھی توجہ دیتے ہیں۔[۳۸] ان کے اثرات بجا طور پر اپنے ماحول میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ان متفرق ناول نگاروں کے مقابلہ میں پریم چند نے بلاشبہ اپنے ناولوں میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ ان کے ناول نہ صرف ایک خاص عہد کے معاشرتی اور سیاسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ایک خاص قوم کے مزاج اور ہیجانات کے مبصر بھی ہیں۔ ان کے ناول کسی محدود اور مخصوص معاشرے کے بجائے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں، ان کے مختلف طبقات اور ان کے تہذیبی، سیاسی اور قومی مسائل، کش مکشوں اور انقلابات کے مظہر ہیں۔ موضوع اور میلان کے اعتبار سے پریم چند کے ناول دو اقسام میں منقسم ہیں۔ پہلی قسم کے ناولوں میں ہندوؤں کی معاشرتی حالت اور عقائد کی اصلاح کا عنصر ملتا ہے۔ ان میں حُبّ الوطنی اور معاشرتی اصلاح کا جذبہ بھی زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے اس قسم کے ناول بیوہ، جلوۂ ایثار، بازارِ حسن، پردۂ مجاز، غبن اور نرملا ہیں۔ جلوۂ ایثار مقصد کے اعتبار سے ہندو قوم کی بیداری، مذہبی رسوم و رواج کی اصلاح اور روحانی اقدار کے فروغ پر مبنی ہے۔ نرملا کا موضوع جہیز کے لالچ سے پیدا ہونے والے مسائل اور خرابیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ بازار حسن میں اخلاقی بے شرمی اور عصمت فروشی کی مذمت کی گئی ہے۔ اس کا اصل موضوع عورت کی عصمت سے قطع نظر مظلومی اور کسمپرسی ہے۔ بیوہ، پردۂ مجاز اور غبن بھی معاشرے کے قبیح پہلوؤں کی اصلاح سے متعلق ہیں اور ان سے عبرت آموز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

پریم چند کے دوسری قسم کے ناول موضوعات اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس قسم کا ایک ناول گوشۂ عافیت ہے۔ اُردو ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب میں یہ پہلا ناول ہے جس میں دیہاتی زندگی کے بنیادی مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا زمانۂ تصنیف (۱۹۲۰ء-۱۹۲۲ء) ہندوستان میں تحریکِ عدم تعاون، سول نافرمانی اور کسانوں کی بغاوت اور کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا تھا۔ اس ناول کا مخصوص موضوع کسانوں کی بغاوت ہے، جو انگریزی نظامت کے خلاف وقتی تقاضوں

کے مطابق تھی۔ اس میں سرکاری حاکموں، زمینداروں اور اسی قسم کے بہت سے کرداروں کی تصویر کے ساتھ ساتھ کسانوں کے شعور کی بیداری ہے۔[۳۹] چوگان ہستی، اپنے عہد کی تمام سیاسی کش مکشوں کا آئینہ ہے۔ پریم چند نے اس ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے گاندھی جی کے نظریات اور اُن کی جدوجہد کی ترجمانی کی ہے۔ پریم چند سیاسی مسلک میں گاندھی سے متاثر اور تلک کے حامی تھے۔[۴۰] اس ناول کا کردار سور داس، گاندھی کے عقائد اور نظریات کا ترجمان ہے۔ اس سے پریم چند کے گاندھی اور آزادی کے ضمن میں تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ میدانِ عمل، ان کے اس قسم کے ناولوں میں ایک اہم ناول ہے۔ یہ ہندوستان کی سیاست اور اس کے انقلابات کی زیادہ بہتر منظر کشی کرتا ہے اور اس میں حکمرانوں کے مظالم زیادہ بے باکی سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس ناول کے تمام کردار ظلم اور غیر ملکی حکومت سے نجات کے طلب گار ہیں اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس میں اس دور کے سماجی انقلابات اور ان کے اثرات کا تذکرہ بھی ہے۔ اس کے مرکزی کردار امر کانت کا گھریلو کش مکش اور لاحاصل عشق سے نکل کر ماحول کے سیاسی اور معاشی تقاضوں کے ماتحت سیاسی رہنما اور ملک کے بہی خواہ ہو جانے کا قصہ کافی جزئیات اور اثر کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس ناول کے تقریباً تمام اہم کردار انقلابی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے اپنے میدان میں سیاسی رہنمائی کرنے لگتے ہیں۔ اس اعتبار سے میدانِ عمل اپنے وقت کے ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی بیداری کی ولولہ انگیز تصویر پیش کرتا ہے۔

پریم چند کا اہم کارنامہ گئودان ہے۔ یہ اپنے دور کے مختلف اقتصادی اور سیاسی انقلابات کو پیش کرتا ہے۔ شہروں میں صنعتیں قائم ہونے سے اور دیہاتوں میں تلاشِ معاش کے لیے افراد کی نقل مکانی نے جو مسائل پیدا کر دیے تھے، وہ اس ناول میں بالخصوص نظر آتے ہیں۔ شہروں میں سیاسی تحریکوں نے جو صورت پیدا کی تھی اس کے اثرات دیہاتوں میں بھی قائم ہو رہے تھے۔ انتخابات اور رنگینیت کے چرچے نے زمینداروں اور کسانوں میں جو کچھ نئے مسائل پیدا کیے تھے، ان تمام کا عکس گئودان میں نظر آتا ہے۔ اس میں دیہاتی ماحول اور کرداروں کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل موجود ہے۔ اس ناول میں جو طبقاتی کش مکش، طبقاتی تضاد اور مفادات کھل کر سامنے آتے ہیں، اس میں کسانوں کی ایک مسلسل جدوجہد کی داستان ہے جو زمینداروں اور حکمرانوں کے خلاف تھی۔ اس کے کرداروں میں کسان، زمیندار، شہر کے باشعور افراد، قومی تحریک کے کارکن بھی ہیں جو حکام بالادست سے نہیں ڈرتے اور

ملک کی آزادی کے جذبات کو عملاً ظاہر کرتے ہیں۔ اس ناول کے دیہاتی افراد گاندھی کی لگان بندی کی تحریک کے مجرم اور حکومت کے معتوب رہتے ہیں۔

پریم چند کے بیشتر کرداروں کی ایک مشترک خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ وہ مثالی ہوتے ہیں اور وطن پرستی، حوصلہ، ہمت اور ایثار ان کا لازمی عنصر ہوتا ہے اور قوم کے لیے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ناولوں کے مناظر زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن شہری زندگی اور اس کے مسائل بھی ان کے پیش نظر تھے۔ ان کے ناولوں کے موضوعات انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل ان کے ناولوں کے مواد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور ان سب میں ان کا نقطہ نظر اصلاحی ہے۔ سیاست میں وہ زمیندار اور کسان، عوام اور حکمران کا تصادم دکھاتے ہیں۔ گئودان، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی اور گوشۂ عافیت میں سے ہر ناول میں حکمرانوں کے ظلم و ستم، نظم و نسق اور ناانصافی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ماضی پر نازاں نظر آتے ہیں اور اپنے ملک پر غیر ملکی اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں۔

(ب) ترقی پسند ناول نگاروں کا دور

ترقی پسند ادب کی تحریک کے زیر اثر اُردو ناولوں میں موضوع، ماحول اور مقصد کے اعتبار سے بڑی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ماحول کے سیاسی اور معاشی محرکات اس دور کے ناولوں کے امتیازی وصف ہیں۔ لیکن پریم چند کے بعد ناول نگاری کے مقابلے میں افسانہ نگاری نے زیادہ قبول عام حاصل کیا۔ محض چند ناول نگاروں نے بہتر شاہکار پیش کیے۔ اس دور کے نمایاں ناول نگار سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی ہیں، ان کے ناول واقعات سے قطع نظر ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدا کیے ہوئے کرداروں پر مبنی ہیں۔ یہ کردار اپنے دور کے اضطراب اور انتشار کا عکس ہیں۔ ان کرداروں کے ذہن بے شمار اور مستقل الجھنوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہ الجھنیں ان کے ماحول کی دی ہوئی ہیں اور یہ سیاسی نظریات، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کش مکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس دور میں سجاد ظہیر کی لندن کی ایک رات، کرشن چندر کی شکست عزیز احمد کی گریز اور عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر فرد کی الجھنوں سے گھرے ہوئے ماحول کی عکاسی اور مصوری کرتی ہیں۔ اس وقت کے زیادہ تر ناول اس انتشار اور اضطراب کا عکس تھے جنھوں نے فرد کو کش مکش میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ کون سی راہ اختیار کرے۔ سیاست اور زندگی میں جو گہرا

ربط پیدا ہو گیا تھا اس کا بہتر پرتو لندن کی ایک رات ہے۔ اس میں کرداروں کے عمل اور ان کے جذباتی ہیجان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے۔ زندگی کے پس منظر میں ہر وقت اس کے انتشار کا احساس موجود ہے۔ اس میں ماحول اور فرد کے انتشار کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں، ان میں شروع سے آخر تک زندگی کی مختلف اقدار کو معاشی حقائق کی روشنی اور پس منظر میں دیکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ مختلف کرداروں میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تعلقات اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ اس کے کردار اپنے گرد و پیش کی دنیا میں پرانے اقدار کی جو شکست و ریخت اور زبوں حالی نظر آتی ہے، ان سے افسردہ اور مضطرب ہو کر نئی قدروں کی جستجو کرتے ہیں۔ انھیں نئے تقاضوں سے دوچار ہوتے ہوئے ماحول میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملتا ہے تو وہ فرار کی کوئی راہ اختیار کرتے اور رومانیت کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں۔ شکست بھی اسی انداز سے نئے دور کے انتشار میں ایک نئی اور دل کش دنیا کی تلاش و جستجو ہے۔ اس میں فرد کے ذہن اور اس کے گرد و پیش کے ماحول کا اضطراب فطرت کی حسین دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے کردار واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس نئی خواہش اور اصل فطرت میں ایک کش مکش شروع ہوتی ہے۔

گریز پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عہد کے سیاسی اور معاشی ماحول کا ایک منتشر ترجمان ہے۔ یہ یورپ اور انگلستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک پرشور زمانہ کا عکاس ہے جسے پڑھ کر وہ سیاسی اور معاشی محرکات سامنے آتے ہیں جو یورپ کے زیرِ اثر اس وقت کے عالمی مسئلے تھے۔ اس ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی نفسیات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ جو دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کی زندگی کے انقلابات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے مرکزی کردار کو انگلستان کے دوران قیام میں پہلی بار نسلی امتیاز اور اپنی سیاسی محکومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ''انتقامی حرکتوں'' سے فراریت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس میں پورے یورپ اور اس کی سیاسی واقتصادی و جنسی اقدار کو ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار حکومت کا کارندہ تو ہے لیکن باطنی طور پر مضطرب اور غیر مطمئن۔

ٹیڑھی لکیر کی بنیاد اس فطرت پر ہے کہ جو اپنے اظہار کے لیے سماجی قوانین کے جواز کی پابند نہیں۔ اس میں بھی اس زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو سیاست، فکر، تخیل اور اقتصادیات سے کھلی ملی ہے۔ اس زندگی کا ماحول انسان کی سیرت اور کردار کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتا ہے۔

یہ ناول اپنے دور اور عہد کی نمایندگی کرتے ہیں۔ یہ ناول کے فن کی روایت میں ایک ملے جلے سیاسی، معاشی اور معاشرتی محرکات کے حامل اور عکاس ہیں۔ ان میں ماحول کے سیاسی اور معاشی تقاضوں کا بھرپور اظہار ہے اور ان عوامل و محرکات میں فرد کے کردار کی تشکیل و تعمیر کا جائزہ بھی ان ناولوں کا مقصد ہے۔ اس قسم کے ناول اس دور میں دیگر ناول نگاروں کی کوششوں سے بھی لکھے گئے۔ ایم اسلم نے ناولوں میں اصلاح کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اصلاحی مقاصد کے ساتھ رومانیت بھی ان کے ناولوں کا مخصوص عنصر ہے۔ ان کے تاریخی ناول بھی انھیں پہلوؤں پر مشتمل ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی اور قیسی رام پوری کے تاریخی، رومانی اور معاشرتی ناول نمایاں طور پر قومی، مذہبی، تاریخی، اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ لیکن ان ناول نگاروں کے علاوہ معروف اور غیر معروف متعدد ناول نگاروں نے کئی ایسے ناول لکھے، جنھیں اصلاحی اور مقصدی کہا جاسکتا ہے۔ اشتیاق حسین قریشی کے تاریخی ناول افغانوں کی تلوار یا تسخیر بنگالہ میں معاشرے اور عام سیاسی حالات کا نقشہ بڑی کامیابی سے کھینچا گیا ہے۔ یہ اپنی نوع کے دوسرے تاریخی ناولوں سے اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں باہمی نفاق کے قومی اور سیاسی نقصانات اور اتحاد باہمی کے عام فوائد پیغام کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ نجم الدین شکیب کا ناول یہ دنیا ہے غلامی کے پروردہ افراد اور کردار اور اس کے ماحول کو پیش کرتا ہے۔ ناول نگار نے عام معاشرتی افراد کے قبیح کرداروں کے علاوہ پولیس اور عدالتوں کی بدنظمی، رشوت کی زیادتی، طبقاتی تنازع، سیاسی رہنماؤں کی زندگی کے مختلف رنگ، دیسی ریاستوں کی داخلی صورتِ حال، رعایا پر مظالم کے پُر درد واقعات آپ بیتی کی صورت میں بیان کیے ہیں۔ مصنف کا نقطہ نظر سراسر انقلابی ہے۔ اور وہ مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل بھی پیش کرتا ہے۔ اسی قسم کا ایک ناول وزیرِ اعظم ہے جسے عبدالرشید تبسم نے لکھا تھا۔ اس میں ناول نگار نے آزادی اور جمہوریت کا خواب دکھانے کی کوشش کی ہے اور وہ لوگوں کو اپنی خامیوں کی اصلاح کرنے، مستقبل کے بارے میں فکر کرنے اور ارادوں میں استحکام و پختگی پیدا کرنے کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ ضیا سرحدی کا تاحدِ نگاہ اور قدوس صہبائی کا نیے انسان بغاوت اور انقلاب کے جذبات سے بھی موجزن ہیں۔

اس دور میں خواتین ناول نگاروں نے بھی گھریلو زندگی، اس کے مختلف کردار اور ان کے محدود ماحول سے باہر نکل کر معاشرتی زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاست کے اثرات اور معاشی محرکات کو

پنے ناولوں کی گرفت میں لیا ہے۔ اس دور میں عصمت کے علاوہ نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی اور
الحہ عابد حسین نے اپنے ناولوں میں ایسی کہانیاں پیش کی ہیں جن میں مشرق و مغرب کی تہذیبی
روں کا تصادم ایک انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ ان کے کرداروں میں ماحول کا مشاہدہ اور اس پر سنجیدگی سے
ر و فکر ان کا مسلک ہے۔ تصادم اور کش مکش کے اس ماحول میں ان کے کردار لوگوں کو راہِ ہدایت
ھاتے ہیں۔ سیاسی اضطراب اور ہنگاموں کی صورتِ حالات سے وہ باخبر ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو
ا کرتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں صالحہ عابد حسین، کے عذرا، آتش خاموش اور قطرے سے گہر ہونے
ت اور حجاب امتیاز علی کے ظالم محبت اور اندھیرا خواب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان ناولوں کا وصف
ہے کہ اُنھوں نے عہد حاضرہ کی منتشر اور مضطرب زندگی کے لیے ایک ایسی معاشرتی زندگی کا تصور
ش کیا ہے جس میں عورت اور مرد مل کر حیاتِ اجتماعی کے لیے سکون اور راحت مہیا کر سکتے ہیں۔

اس دور کے نمایندہ ناولوں کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ ان میں موضوع اور ماحول اور مقصد کے لحاظ
سے وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ ان میں حرکت ہے، زندگی اور اس کے تقاضوں کی ساری ہل چل اور اس
ا تنوع ہے۔ وہ ہر قدم پر زمانے کے ساتھ چلتے ہیں۔ زندگی کی ساری پیچیدگیوں کو جن میں سیاست
ر معاشرت سب ایک دوسرے سے گھلے ملے ہیں، اُنھوں نے اپنے اندر سمویا ہے۔ ان میں ماحول
کے سیاسی پس منظر اور اس کے محرکات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے اور پھر یہ بھی کہ مختلف کردار اپنے ردِ عمل کو
کس طرح ظاہر کرتے ہیں یا وہ کس قسم کا لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ یہ ناول اپنے عہد کے سیاسی
ضطراب اور انتشار کو بھی پیش کرتے ہیں اور یہ سیاسی انقلاب کی جدوجہد کے مصور بھی ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

(۲) افسانہ

(الف) پریم چند کا دور

ناول کے عین عروج کے زمانہ میں اُردو افسانہ کا آغاز ہوا۔ یہ امراؤ جان ادا کی تخلیق کا دور تھا جس میں واضح طور پر داستان کی دل کش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے سوز وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن ان کے معاصرین میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں ''خارستان'' اور ''گلستان'' سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے اِفسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص ''کیوپڈ اور سائیکی'' اور ''الحمرا کا گلاب'' وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں ہیں۔ ان کی فضا اور ماحول سرتا سر رومانی ہے۔ اس رنگین اور رومان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج، ان کا جذباتی انداز فکر و نظر، گفت گو کا شاعرانہ اور پر تصنع اسلوب، افسانہ کے انجام میں حق کی اقدار کی فتح، یہ سب داستانی رنگ کی باقیات ہیں[۱] ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں کی خصوصاً ابتدائی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی روایت کا جو گہرا عکس ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی نئی صنف کے نقش اوّل بھی ہیں۔ ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے[۲]

اس دور کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرتی اور سیاسی اصلاح پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری دنوں میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی تحریکوں کا زور تھا اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس نے ایک سیاسی اور قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ان تحریکوں میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ سیاسی رہنما اس جدوجہد میں مصروف تھے کہ ملک کو کچھ ایسی اصلاحیں دی جائیں جن سے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی بہترین بن سکے۔ مذہبی مفکر اور علما مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے

خطروں پر زور دے کر قوم کو اس پُر خطر راہ سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی پرانی چیزوں کی اچھی اور نئی آئی ہوئی چیزوں کی بُری بلکہ بھیانک تصویریں بنا رہا تھا اور ادیب، جو براہِ راست کسی جدوجہد میں حصہ لے سکتے تھے، ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان کی تحریروں میں اصلاحی مقصد اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ فن اور اس کا احساس پس منظر میں چلے گئے۔ یہ بات تو ابتدائی افسانہ نگاروں کے بس میں نہ تھی کہ نئی تہذیب جن چیزوں کو خوب صورت اور پُر فریب بنا کر لوگوں کے سامنے لا رہی تھی، اس پر پردہ ڈال دیتے۔ وہ محض اس قدر کر سکتے تھے کہ اپنی باعظمت اور پُرشکوہ زندگی کی پرانی تصویروں میں نیا آب و رنگ بھر کر ان میں وہ تاثیر پیدا کریں جو اس نئے حسن کی چمک دمک کو ماند کر سکتی تھی۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت پیدا کی اور انھیں وطن پرستی کا سبق سکھایا۔ پریم چند نے اُردو کے افسانہ نگاروں میں اس بات کو سب سے پہلے محسوس کیا تھا۔ ان کے اس قسم کے افسانوں میں سوز وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے مثالی ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات کے تحت تعلیم یافتہ افراد کو اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ سیاسی آزادی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک نچلے طبقہ بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کو اس جدوجہد میں شریک نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے لازم تھا کہ کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کو حل کر کے ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ اس قوم پرستی کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے ملک اور قوم کی ابتر زندگی کی صحیح تصویریں پیش کی جائیں تا کہ ان میں اس ابتر زندگی کو بہتر بنانے کا شوق اور ولولہ پیدا ہو۔ اس خیال کے پیشِ نظر اُس دور کے افسانہ نگاروں نے دیہاتی زندگی کے ان گنت مسائل کو اپنے افسانوں کے ذریعہ پڑھے لکھے افراد کی زندگی سے قریب تر کیا۔ ان کی ان کوششوں سے لوگوں نے دیہاتی زندگی کو اپنے ملک کی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھنا شروع کیا اور اس احساس نے رفتہ رفتہ دیہاتی زندگی اور اس زندگی کے چھوٹے بڑے مسئلوں کو سیاسی ادراک کی بنیاد بنایا۔ یہاں تک کہ ساری قومی اور سیاسی تحریکوں کا سلسلہ دیہاتی زندگی سے وابستہ نظر آنے لگا۔ بعد کی سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال نے افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے کر دیے۔ اس زمانے کے شدید معاشی اور سیاسی ہیجان و اضطراب نے افسانہ نگاروں کو اپنے فنی منصب سمجھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اپنے سیاسی ماحول سے متاثر ہو کر افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جن میں اس دور کے

سیاسی ہیجانات اور اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ آزادی کی تحریکیں، اس کے حصول کی جدوجہد او
دقتیں، آزادی کا شعور اور اس کی تبلیغ، افسانوں کا موضوع اور مقصد نظر آتا ہے۔ ابتدائی دور کے افسا
نگاروں میں یہ کام پریم چند اور سلطان حیدر جوش نے زیادہ مستعدی سے کیا تھا۔

پریم چند اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں بلاشبہ ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اُنھوں نے
بکثرت افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں پر گردوپیش کی زندگی کے بعض اہم تقاضوں کا عکس ہے
گردوپیش کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کا موضوع بھی بدلتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے
ان کے افسانے موضوعات کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے دور کے افسانوں
میں وطن پرستی کے جذبات ہیں۔ دوسرے دور کا میلان سماجی اور معاشرتی اصلاح کی طرف ہے او
تیسرے دور میں سیاسی اور آزادی کے مسائل پر افسانے لکھے گئے۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں کا مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعہ قوم میں وطن کی محبت اور اس کی
محبت میں سب کچھ نثار کردینے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اُس زمانہ میں اُنھوں نے جتنے افسانے لکھے و
ان کے افسانوں کے پہلے مجموعہ سوزِ وطن میں چھپے یا پریم پچیسی میں۔ حُبِ وطن کا جو جذبہ ان
افسانوں کی تخلیق کا محرک بنا ہے اس میں سیاسی احساس قدرے کم ہے۔ صرف ایک خاص تہذیب
ایک خاص معاشرت اور خاص نظام معاشرت سے محبت اور وابستگی کے احساس نے یہ کہانیاں لکھوائی
ہیں۔ پریم چند نے جب حُبّ الوطنی کے جذبہ کو اُبھارنے کے مقصد کے تحت راجپوتوں کی زندگی کے
کچھ تاریخی اور کچھ روایتی واقعات کو افسانہ کی شکل دے کر یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ
ہمارے وطن کے ماضی میں اتنی دل کشی ہے کہ اگر اسے ہم اپنی موجودہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے
استعمال کرنا چاہیں تو استعمال کرسکتے ہیں۔ اُنھوں نے قدیم راجپوتوں کی روایات کو بیان کرکے
انگریزی تہذیب کی بالواسطہ مخالفت کی ہے۔

بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، گناہ کا اگن کنڈ، راج ہٹ، راجا ہردولی، منز
مقصود، اور آہِ بے کس اسی قسم کی مثالیں ہیں۔ سوزِ وطن کے نام سے پریم چند کے جتنے افسا
شائع ہوئے تھے ان کا پس منظر سیاسی اور قومی تھا۔ یہاں تک کہ حکومت نے اس میں بغاوت دیکھی
اس مجموعہ کو ضبط کرلیا۔[ک] ان افسانوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس خاص دور کی ہندوستا
زندگی کے قومی احساس کی صحیح جذباتی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں پریم چند نے قوم کے

سامنے تاریخ، حُبِّ وطن، حُبِّ قومی اور دردمندی کا ایسا تصور پیش کیا جو نہ صرف اس زمانہ کی قومی اور
ی تحریکوں سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے بلکہ اس تصور کی بے حد دل کش اور موثر صورت ہے۔[۴]

سوز وطن میں ''دنیا کا سب سے انمول رتن''، ''شمع مخمور''، ''یہی میرا وطن ہے''، ''صلۂ ماتم''
ر ''عشق دنیا اور جنت وطن'' پانچ افسانے شامل ہیں۔ جن میں ''صلۂ ماتم'' کے علاوہ سب ہی حُبِّ
ن کے موضوع پر ہیں۔ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اس تصور اور خیال کا اظہار کرتا ہے کہ ''وہ
خری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔'' ''شمع مخمور''
ں کہانی کی فضا آزادی کی راہ میں لڑنے مرنے کے رجحان سے تشکیل پاتی ہے۔ وطن کی محبت کا جذبہ
ری کہانی پر چھایا ہوا ہے ''یہی میرا وطن ہے'' ایک ایسے شخص کے قومی تاثرات اور جدید حُبِّ وطن کی
صویر ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں زندگی بسر کر کے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے دیس
ں آیا ہے لیکن یہاں کی زندگی کا مغربی انداز اور معاشرے کے انقلابات کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں
انسو بھر آتے ہیں اور وہ ہر مرتبہ کہہ اُٹھتا ہے۔ یہ میرا پیارا دیس نہیں، میرا پیارا بھارت نہیں'' چوتھے
سانے'' عشق دنیا اور جنت وطن میں اٹلی کے ایک محب وطن میزینی کی حسرت ناک زندگی کے چند
برت ناک مناظر بیان کیے ہیں۔ پوری کہانی میں اپنے وطن اور قوم کی محبت اور قوم اور وطن کے لیے
جذبۂ ایثار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ حُبِّ وطن کے موضوع پر مشتمل ان افسانوں میں پریم چند نے
اپنے آپ کو ایک سچا دردمند اور عاشق وطن ظاہر کیا ہے۔ وہ وطن کی ہر چیز کو بالخصوص وطن کی آزادی کو
والہانہ جذباتیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وطن سے محبت کرنا ایک مقدس فریضہ ہے۔

دوسرے دور کے افسانے اصلاحی مقصد لیے ہوئے ہیں۔ پریم چند نے اس دور میں خاصی تعداد
میں ایسے افسانے لکھے جن میں متوسط طبقے کے ہندو گھرانوں اور ہندوستانی دیہاتوں کی معاشی زندگی
کی بڑی حقیقی اور موثر تصویریں ہیں۔ ان کے ذریعہ پریم چند نے ہندو معاشرے کی مختلف رسموں کو ختم
کرنے اور اس کے بہت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آہ بے کس، مجبوری، حسرت،
نئی بیوی وغیرہ انھیں مقاصد کو پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں پریم چند گاندھی کے بڑے معتقد ہو گئے
تھے[۵] اور اس کی ''ہریجن تحریک'' سے بھی متاثر تھے۔ اس کی پیروی میں طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے کا
پرچار کرنے لگے۔ ان کے افسانے ''صرف ایک آواز'' اور ''مندر'' اس مقصد کا اظہار کرتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کا تیسرا دور سیاسی موضوعات اور مسائل پر مبنی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ملک

ہم نے ایک درخت کے سایے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے۔ شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا...... لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹتے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں...... وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پروا بھی نہیں۔ جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی...... آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا، آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس مرتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجا کو بھی حاصل نہیں...... ۱۷؎

سیاسی اعتبار سے آزادی کی جدوجہد کو بیان کرنے میں پریم چند کا یہ افسانہ مثالی ہے۔ اُنھوں نے اس موضوع پر اور بھی افسانے تخلیق کیے تھے۔ ''ڈامل کا قیدی''، ''قاتل''، ''آخری تحفہ''، ''جیل''، ''سہاگ کی ساڑھی''، ''جلوس''، ''ہولی کا اپھر'' بھی اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ ان میں آزادی کی تحریک، تحریکِ ترکِ موالات کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ''بھدے کا ٹٹو'' میں ایک امن پسند نوجوان پر اپنے زمانہ کی سیاسی تحریکوں کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ ''لال فیتہ'' میں سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے کے اور سرکاری ملازمتوں سے افراد کے مستعفی ہونے کے واقعات ہیں۔ ''بارات'' میں ان نوجوانوں کی داستان پیش کی گئی ہے جو آزادی کے لیے جنگ اور تشدد پر اُتر آتے ہیں۔

اپنے ایسے افسانوں کے ذریعے پریم چند نے افسانہ نگاری کی تمام موجودہ روایتیں ترک کرکے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ فن کی روایت میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس اقدام کے بعد سے افسانہ نگاروں نے تخیل اور تصور کی دنیا کو خیرباد کہ کر حقائق کے اظہار کو ضروری سمجھا۔ پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ وطن کی محبت اور اسے آزاد کرانے کے جذبے سے معمور تھا اور اسی سبب ضبطِ سرکار بھی ہوا۔ ان کے افسانے ''آشیاں برباد'' اور افسانوں کے مجموعہ سمر یاترا کے ساتھ بھی حکومت نے یہی سلوک کیا۔ ان کارروائیوں سے پریم چند کا جذبہ کم ہونے کے بجائے مزید تیز ہوا اور پھر اُنھوں نے جو کچھ لکھا خوب کھل کر لکھا۔ قومی زندگی میں اس سے خواہ انقلاب نہ برپا ہوا ہو لیکن اس کے معاصرین اور ان کے بعد ہر افسانہ لکھنے والا جس نے اپنے افسانوں کا موضوع زندگی سے حاصل کیا کسی نہ کسی طرح پریم چند سے ضرور متاثر ہوا۔ اس کے طفیل افسانے کو زندگی کے انقلابات میں

میں سیاسی اعتبار سے انتہائی ہیجان برپا تھا، مختلف تحریکیں عروج پر تھیں۔ اس وقت پریم چند نہرو کی اشتراکی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔[۶] ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور شدھی کے مخالف تھے۔[۷] علی برادران اور ان کی جدوجہد کے بڑے قدردان تھے۔[۸] پہلی جنگ عظیم کے دوران حکومت کی جانب سے نکالے جانے والے جریدے کی ادارت کی پیش کش کو رد کر دیا تھا۔[۹] ادبی خدمات پر جب حکومت کی طرف سے خطاب ''رائے صاحب'' کا اعلان ہوا تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[۱۰] پریم چند نے اپنی تحریروں اور طرزِ فکر میں گاندھی جی کے نصب العین اور مسلک کو اختیار کر لیا تھا، بالخصوص اُن کی چرخا تحریک کو پھیلانے میں حصہ لیا۔[۱۱] بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی تحریک کو بھی قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔[۱۲] اسی زمانے میں نمک کی ستیہ گرہ تحریک میں بھی شامل ہوئے۔[۱۳] جلیاں والا باغ، امرتسر کے سانحہ سے متاثر ہو کر اپنی بیس سالہ سرکاری ملازمت ترک کر کے آزادی اور بے باکی کے ساتھ سیاسی حالات پر تبصرہ کرنے لگے تھے۔[۱۴]

اس دور میں پریم چند نے افسانوں میں بہت واضح قسم کی حقیقت نگاری کو رواج دیا۔ ایسے افسانے لکھے جن پر زندگی کی تلخیوں کا بھرپور سایہ ہے۔ اُنھوں نے افسانے کو اس طرح سے پیش کیا کہ وہ وطن اور انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دور تک ہندوستانی سیاسیات میں تیزی سے تغیر پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ پریم چند نے بڑی لگن کے ساتھ اس تغیر کا ساتھ دیا۔ کانگریس سے تو انھیں اپنی فکر کے لیے غذا ملتی رہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ دوسری سماجی اور اصلاحی تحریکوں سے بھی اثر لیتے رہتے تھے۔ چناں چہ راناڈے، گوکھلے، تلک، لاجپت رائے وغیرہ کی سماجی اور سیاسی اصلاح کی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔[۱۵] ان کا افسانہ ''آشیاں برباد'' ان کے نصب العین کی عملی صورت ہے۔ اس میں ہندوستانی عورتوں کی جدوجہدِ آزادی پیش کی گئی ہے۔ ایک عورت دوسری عورت سے اس وقت کا حال سناتی ہے جب وطن اور اس کی آزادی کی خاطر جان دینے والے سرفروش دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ [illegible] سے مرکزی کردار ''مردلا'' کے روپ میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے جو اپنی سماجی اور فطری مجبوری اور مظلومی کے باوجود آزادی کی جنگ میں ایثار، جاں بازی کا نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ اس کا شوہر، بیٹا اور اس کی ماں آزادی کی جدوجہد میں شہید ہو چکے ہیں اور وہ سوچتی ہے کہ:

..... ایک بار جی میں آیا بھی انھیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے۔ لیکن پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے، جس کا معاوضہ یہ ملے۔[۱۶]

انقلابات کا ایک راستہ ملا تھا۔ اس راستے کی رہبری پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند کی طرح ان کے دوسرے معاصرین پر بھی اس سیاسی احساس کا خاصا گہرا اثر پڑا۔ اور اب کسی لکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ سیاست سے اپنا دامن بچا سکے۔ چناں چہ سدرشن، سلطان حیدر جوش اور علی عباس حسینی کے افسانوں میں اس کے مختلف تاثرات ملتے ہیں۔

سدرشن نے بڑی حد تک پریم چند کا انداز اختیار کیا تھا۔ دونوں کے افسانوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً ہندوستانی ماحول، وطن کی محبت، ہندو معاشرت اور غربت و افلاس وغیرہ کا ذکر، اس اعتبار سے سدرشن کو پریم چند کا مقلد کہا جا سکتا ہے۔ سدرشن بھی آریہ سماج تحریک اور گاندھی تحریک سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ دیہات سدھار اور معاشرت کی اصلاح ان کے افسانوں کے مخصوص موضوعات ہیں۔ ان کی انفرادیت، پریم چند کے مقابلے میں یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں مذہب یا فرقے کی تخصیص کا اثر نہیں چھوڑا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سلطان حیدر جوش نے اپنے افسانوں کو بالخصوص معاشرتی اور اصلاحی مقاصد تک محدود رکھا اور اپنے اصلاحی مقصد کے تحت قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مغرب اور مشرق کے طرز معاشرت میں جو تضاد ہے وہ دو ملکوں، دو قوموں اور دو تہذیبوں کے لازمی اختلاف اور فطری فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اُن کے جو افسانے فسانۂ جوش کے نام سے چھپے ہیں ان سب کا انداز خالص اصلاحی بلکہ کہیں کہیں تبلیغی ہے۔ ان کے پس پشت ایک بلند قومی مقصد اور ایک واضح تہذیبی اور اخلاقی نصب العین ہے۔ ان میں افسانہ نگار کو انگریز اور انگریزیت کے بڑھتے ہوئے تسلط میں ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کی روایات، اس کی معاشرتی زندگی اور اخلاقی قدروں کا زیاں نظر آتا ہے۔ اسے وہ مختلف سطحوں پر آ کر بے نقاب کرتے اور بیک وقت مدبر، مصلح کے منصب ادا کرتے ہیں۔ جوش کے افسانوں میں مغربی تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کے بُرے نتائج کو دکھا کر لوگوں کو ان سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ وہ مغربی تہذیب اور معاشرت کی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والے مہلک اثرات و نتائج سے بچ سکیں۔ اُنھوں نے مغربی تقلید پر بیباکانہ اور آزادانہ تنقید بھی کی۔

مجموعی طور پر ان ابتدائی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے مذاق اور مزاج کی مناسبت سے کہانی سے مختلف کام لیے اور مختلف طریقوں سے اپنے مقاصد بھی پورے کیے۔ سیاست و معیشت، اخلاق

دین، محبت و نفرت سب ان کے موضوعات رہے۔ ان کے افسانے بیک وقت مصلح اور واعظ کے ہم زبان بھی بنے اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بہت سے لکھنے والے ابھرتے رہے۔ علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، ل احمد اکبر آبادی، کوثر چاند پوری، وغیرہ کے افسانوں میں زندگی کے ساتھ ایک ربط اور تعلق پیدا کرنے کی نمایاں خواہش موجود ہے۔ اپنے افسانوں میں ان افسانہ نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی تلخیوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے۔ اس وقت بہت سے افسانہ نگاروں کا عام رجحان یہ ہو گیا تھا کہ وہ زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھیں اور اپنے تاثرات اور محسوسات کو بلا تکلف افسانوں میں جگہ دیں۔ اور افسانے میں صرف زندگی کے حقائق اور معاشرتی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر طرح کے مسائل کی ترجمانی اور عکاسی ہونی چاہیے۔

پریم چند نے سیاسی زندگی کی کش مکش کو افسانہ بنا کر ان افسانہ نگاروں کو جو راہ دکھائی تھی، اس پر چلنا اب ان کی عام روش ہوتی جارہی تھی۔ سیاسی حالات کا یہ عکس حقیقت نگاری کے رجحان کو آہستہ آہستہ زیادہ مستحکم بناتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کو افسانے کا موضوع بنانے کی روش اتنی عام ہوئی کہ لگ بھگ ۱۹۲۹-۱۹۳۰ء کے بعد ہر افسانہ نگار زندگی کے حقائق سے الگ افسانے کا تصور بھی ناممکن سمجھتا ہے۔ قریباً یہی دور تھا کہ جب افسانہ کچھ اور تحریکات سے دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اور دوسرے انگارے کے افسانے ہیں اور پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا قیام ہے۔ کفن افسانوی فن کی روایت میں ایک اہم منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں زندگی اور فن کا جو صحیح امتزاج ہے، اسے ۱۹۳۵ء کے بعد سے افسانے کو اپنا فنی رجحان بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انگارے میں دس افسانے تھے۔ سجاد ظہیر کے پانچ، احمد علی کے دو، رشید جہاں کے دو، محمود الظفر کا ایک۔ یہ افسانے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہیں۔ اس مجموعے کے افسانوں میں ہندوستان کی مذہبی سماجی زندگی کی مختلف تصویریں ہیں۔ ان میں ہر جگہ تلخ طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ ہر مقام پر آزادی اور بیباک خیالی ہے۔ ان افسانوں کا مقصد غلامی کے خلاف احتجاج اور نفرت کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ یہ مجموعہ نئے سائنسی نظریوں، سیاست اور اقتصادی مسائل کی ہم آہنگی مذہبی اور روحانی قدروں کی شکست و ریخت کا ایسا امتزاج تھا کہ نہ صرف افسانوی ادب میں بلکہ پوری معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔[۱۸] ان کا فوری نتیجہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جارحانہ اندازِ فکر و نظر کو انقلاب کا پیش خیمہ سمجھنے کی روش عام ہو۔ چناں چہ اس

انداز فکر ونظر کو ترقی پسندی کی اس تحریک سے جس کی بنیاد ہندوستان میں پہلے پہل ۱۹۳۶ء میں رکھی گئی، زیادہ عام ہونے اور زیادہ پھیلنے پھولنے کا موقع ملا۔

(ب) ترقی پسند افسانہ نگاروں کا دور

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام ۱۹۳۶ء سے افسانوں کا میدان اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت وسیع ہوگیا۔ اس انجمن کا نصب العین انگارے کے مصنفین نے مرتب کیا تھا اور اس کی پہلی کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ اس کے قیام سے ۱۹۴۷ء تک کا افسانہ پریم چند اور انجمن کے بانیوں کی متعین کی ہوئی حدود کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ کرشن چندر، احمد علی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی اور ان سے ذرا آگے بڑھ کر احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، حسن عسکری، ممتاز مفتی، اختر اورینوی، اپندر ناتھ اشک، ابراہیم جلیس وغیرہ نے افسانہ میں وسعت پیدا کی اور گہرائی بھی۔ تیزی سے بدلتے ہوئے خارجی ماحول اور اس سے متاثر ہوتی اور بدلتی ہوئی شخصیت کے ساتھ ان کا فن بھی بدلتا اور ترقی کرتا رہا۔

ان افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاریؔ، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ کے افسانوں میں دیہات کی زندگی اور اس کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ کرشن چندر، احمد علی، منٹو، حیات اللہ انصاری، بیدی، عصمت، ابراہیم جلیس، غلام عباس، حسن عسکری کے افسانوں میں شہری زندگی کی مختلف طبقاتی سطحیں اور ان کے مخصوص حالات و مسائل کی آئینہ داری ہے۔ اس دور میں افسانے کے موضوع میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی زندگی کا کم و بیش ہر پہلو ملتا ہے اور ہر افسانہ نگار نے اپنے افسانوں کے لیے زندگی کے وہ پہلو اور ماحول کے وہ حصے منتخب کیے ہیں جن سے وہ زیادہ متاثر ہوا ہے۔

کرشن چندر نے اپنے افسانوں کا آغاز ایک شدید قسم کے جذباتی رومان پرست کی طرح کیا تھا۔ ان کی افسانہ نگاری اندازِ فکر میں تدریجی ترقی اور پختگی کی ایک اچھی مثال ہے لیکن جیسے جیسے ماحول تبدیل ہوتا ہے، زندگی کی تلخیاں افسانہ نگار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ رومان کی منزلوں سے گزر کر زندگی کی پیکار سے دوچار ہوتا ہے۔ افسانوں کے دوسرے مجموعے نظارے کے افسانے نمایاں طور پر اس کش مکش کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ان میں رومان کی جنت اور حقیقت کا جہنم ایک دوسرے سے متصادم اور برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ کھوئے ہوئے تارے میں یہ دونوں تصور ایک دوسرے

سے ہم آہنگ ہیں، یہاں تک کہ ''ان داتا'' میں حقائق کے جہنم نے رومان کی جنت کو اپنے اندر ضم کرلیا ہے۔ اس میں کرشن چندر نے اپنے آپ کو حقیقت پسندانہ اور تلخ نگار انقلابی ظاہر کیا ہے اور اس ذہنی جذباتی اور فکری انقلاب نے اس کے افسانوں کو جو ''سفید پھول'' ''ٹوٹے ہوئے تارے'' اور ''ان داتا'' میں شامل ہیں ارتقا کی مختلف منزلوں تک پہنچا دیا ہے۔ ان افسانوں میں تخیل اور مشاہدہ ایک دوسرے سے اس حد تک مربوط ہو جاتے ہیں اور رومان اور سیاست دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے افسانوں میں افسانہ نگار کا ایک دردمند حساس دل نظر آتا ہے۔ یہ دل زندگی کے حسن کا تو شیدائی ہے لیکن وہ اس حسن کو زندگی کی تلخیوں میں گھرا ہوا پاتے ہیں تو اس میں ایک ٹیس اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ کر اسے جہاں کچھ افراد پر ترس آتا ہے وہاں بعض پر غصہ بھی آتا ہے۔ سرمایہ داروں، اجارہ داروں اور استعماری حاکموں کے لیے اس میں بڑی تلخی ہے۔ کرشن چندر کے حساس دل اور دردمند جذبات کو انسانیت کشی سے زیادہ دکھ کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے افسانوں میں ان ساری ہستیوں کے خلاف اپنے باغیانہ جذبات کا اظہار کیا ہے جو انسانیت کش نظام کو چلا رہی ہیں۔ کرشن چندر کے انقلابی رجحانات کے زیر اثر جنگ، سامراج اور فاشیت بھی موضوع بنے ہیں اور ان کے موضوعات میں سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی ماحول میں رہ کر ایک مخصوص نظریے کے تحت اُنھوں نے افسانے لکھے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہمیں جو ماحول ملتا ہے وہ سیاسی طور پر غلام اور سماجی اعتبار سے پس ماندہ ہے اور ان دونوں کے اسباب انگریز قوم اور سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ ہر طرف بھوک ہے، قحط ہے اور غلامی ہے۔ ہر افسر ایک ظالم اور سفاک افسر ہے، جسے اس ملک کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ماحول کرشن چندر کو انسان دوستی اور سماجی رشتوں کو سمجھنے پر مجبور کرتا ہے چناں چہ ان کی انسان دوستی بعد میں گہری سے گہری رومانی فضا میں بھی انسانیت کی آزادی کے پرچم کو بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے رومانی انداز میں انسانیت کی آزادی اور محبت کی آزادی کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جب وہ سماجی رشتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس بڑی حکمران طاقت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جس نے زندگی اور فطرت دونوں ہی کے حسن پر قبضہ جما لیا تھا۔ کرشن چندر نے انسان کی دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار سے انسان کی آزادی اور ہندوستان کی آزادی کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا۔

منٹو کا فنی شعور افسانہ نویسی کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ ان کے عام افسانوں میں طوائف کی زندگی اور جنسی الجھنوں سے دوچار نوجوانوں کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے مناظر، سیاسی جلسے، جلسوں پر پولیس کی گولہ باری، گلیوں اور بازاروں میں مسلح فوج کا راج، جیل خانے، مارشل لاء، بغاوت کو ختم کرنے والی برچھیاں اور گولیاں، ایک نئے قانون کی خواہش، انقلاب کے نعروں کی گرما گرمی جیسے موضوعات بکثرت ہیں۔ ان کے بے شمار موضوعات میں خصوصیت سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی منظر کشی ہے۔

افسانہ نگار کے سیاسی احساس نے چند مؤثر باتوں کو پھیلی ہوئی فضا میں سے چن کر انھیں اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے اور ایک خاص دور کے سیاسی حالات اور ان حالات کے پیدا کیے ہوئے احساسات کی مصوری ہے۔ ان کے ایسے افسانوں میں سے ''نیا قانون''، شرابی، ''تماشا''، ''ماتمی جلسہ''، ''دیوانہ شاعر''، ''سوراج کے لیے''، ''موتری'' وغیرہ کی بنیاد ہی اس سیاسی احساس پر ہے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند جیسے ایک دو افسانہ نگاروں کے علاوہ کسی نے بھی اپنے عہد کے سیاسی حالات و واقعات کے مناظر کی تصویریں اپنے افسانوں میں نہیں کھینچیں۔ بڑھتے ہوئے سیاسی احساس کی ترجمانی تقریباً ہر بڑے افسانہ نگار کے ہاں موجود ہے لیکن اس احساس کے عملی مظاہروں کے نقوش ہمیں منٹو کے افسانوں میں جتنے نمایاں نظر آتے ہیں، کسی اور کے افسانوں میں نہیں ہیں۔

ان کے ان افسانوں میں ''تماشا''، ''شرابی'' اور ''نیا قانون'' زیادہ اہم اور مثالی ہیں ''تماشا'' ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے، ''شرابی'' اس کے بعد کے اثرات اور واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں منٹو نے تحریک عدمِ تعاون کی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز کو پیش کیا ہے۔ اس میں ان کی آزادی کی خواہش بھی جھلکتی ہے:

> آہ آزادی...... خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہوگا۔ میں آزاد لوگوں کے حالات پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے...... اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔[1]

افسانہ نگار اپنی غلامی اور مظلومی و بے بسی کا احساس بھی بیان کرتا ہے۔ ''قصور وار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لیے کھڑے رہتے ہیں ''میں نے جواب دیا'' ہندوستان کے ۲۵ کروڑ باشندے اپنی چھپی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے اگر ظلم کا کٹا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور ہم اس لیے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو ان کے ظلم سے مفلوج ہے......[2]

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ٹڈی دل پر کتنے لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں...... حاکم ہرگز ملعون و مطعون نہیں ہو سکتے۔ ہمارا وطن خوف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند کو دور کر دیجیے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔[۳]

منٹو نے بڑی سادگی اور فن کاری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کو اور ہندوستان کی سیاسی بے بسی کو ''نیا قانون'' میں سمو دیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار ''منگو'' کوچوان اپنی حیثیت کے لوگوں میں دانش مند سمجھا جاتا ہے، جس کا سیاسی شعور بظاہر بیدار ہے۔ اس کو یہ معلوم ہے کہ اس کی قوم ایک غیر قوم انگریز کی محکوم ہے۔ اسے شدت سے احساس ہے کہ وہ ایک غلام قوم کا فرد ہے۔ یہ احساس اس کے دل میں انگریز قوم کے لیے نفرت کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ اس میں آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے جب اس کے تانگے میں کوئی گورا سوار ہوتا ہے۔ ''منگو'' نے کہیں سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ عنقریب ہی ایک نیا قانون نافذ ہونے والا ہے۔ وہ خیال کرتا کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد انگریز کی حکمرانی ختم ہو جائے گی۔ چناں چہ پہلی اپریل کو جب یہ ''نیا قانون'' نافذ ہو گیا تو منگو کوچوان ایک انگریز سے ذرا سی بات پر بھڑ گیا۔ لیکن نظام سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس بات کا تلخ احساس اسے اس وقت ہوا جب گورے کو پیٹنے کے جرم میں اسے جیل جانا پڑا۔

مجموعی طور پر منٹو کا فن ہر اس مقام پر چونکا ہے جہاں انسان اور اس کی فطری جبلتوں کی آزادی کا معاملہ آیا۔ انسان پر اور اس کی فطرت پر جب کبھی حملہ ہوا، منٹو کے ذہن اور اس کے فن نے اسے پوری شدت سے محسوس کیا ہے۔

احمد علی نے انگارے میں شامل اپنے افسانوں ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات'' کے توسط سے یہ بتا دیا تھا کہ وہ افسانے کے لیے زندگی اور فن کے گہرے اور قریبی میل جول کو سب سے مقدم اور اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان افسانوں اور دیگر افسانوں میں احمد علی نے اپنی سماجی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ان افسانوں کا مواد فراہم کیا ہے۔ ان میں جا بجا ہندوستانیوں کی اخلاقی اور سیاسی بے حسی اور اس سے پیدا ہونے والی آپس کی لڑائیوں پر چوٹیں ہیں۔ ''شعلے'' کے افسانوں میں جو ماحول ہے وہ ہماری معاشرت اور قدیم تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مسلمان شرفا کی گھریلو زندگی، دہلوی تمدن کی جھلکیاں، پھر نئے زمانہ کی سیاسی فضا، جس میں کچھ لوگ انقلاب کے نعرے لگا کر گولی کا نشانہ بنتے ہیں اور کچھ اب بھی برطانیہ کے سایہ کو اپنے لیے سب سے بڑی

برکت سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں ان کے افسانہ ''تصویر کے دورخ'' میں مجتمع ہیں ''ہماری گلی'' کے افسانوں میں مسلمانوں کی زندگی کے اجتماعی پہلوؤں اور ان کی سماجی اور اخلاقی زندگی کی مصوری کی ہے ''قید خانہ'' کے افسانوں میں بھی ایسے ہی تاثرات ہیں لیکن افسانہ ''قید خانہ'' اور ''قلعہ'' میں سیاسی شعور بھی نمایاں ہوا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے، وہ بڑا وسیع ہے۔ اس میں زندگی کچھ محدود نہیں۔ اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ انھیں مجرد حالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کے مخصوص رومانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح اور مرکز چوپال کے علاوہ انقلاب زمانہ، عصری تحریکات، خصوصاً خلافت تحریک انقلاب و آزادی کی جدوجہد، ایسے موضوعات ہیں جن کا افسانوں میں گہرا عکس موجود ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو ہمیشہ ایک سیاسی اور مصلحانہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مظلوم اور ستم رسیدہ کی حمایت کے معاملہ میں وہ اس حد تک مستعد ہیں کہ بڑی سے بڑی قوت یہاں تک کہ حکومت اور سیاسی اقتدار کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اس میں بھی خیال و اظہار کی پوری آزادی سے کام لیتے ہیں۔ اس مرحلہ پر وہ اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ مقصدیت کی زیادتی پروپیگنڈے کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے افسانوں میں ''زعفران کے پھول''، ''داروغہ صاحب'' ''ایک لڑکی''، ''ایک پائلی چاول'' ان کے خاص افسانے ہیں۔ ''زعفران کے پھول'' کشمیر میں تحریکِ آزادی اور اس کے حصول کی جدوجہد کو بیان کرتا ہے۔ ''داروغہ صاحب'' اور ''ایک لڑکی'' ظریفانہ انداز میں اپنے عہد کے سیاسی حالات پر طنز ہیں۔ ''ایک پائلی چاول'' ہندوستان میں دوسری جنگ عظیم کے معاشی اور سیاسی اثرات کی ایک دردانگیز کہانی ہے۔

یہی انداز ابراہیم جلیس نے بھی اختیار کیا تھا۔ اُنھوں نے بھی اپنے اکثر افسانوں میں بے باکی اور جوش و خروش سے غیر ملکی سیاسی اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے افسانوں میں طنز و مزاح کا عنصر بھی ہے اور وہ اس کو بھی اپنے عہد کے سیاسی معاملات اور واقعات پر مرتکز کرتے ہیں۔ اُنھوں نے متعدد افسانے تحریر کیے جن میں ہندوستان کی سیاسی بے حسی اور معاشی بدحالی کے واقعات پیش کیے ہیں۔ وہ اعلانیہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار انگریز کو ٹھہراتے ہیں۔ مختلف پیرایوں میں ان سے اپنی نفرت کو

ظاہر کرتے ہیں۔ ''چالیس کروڑ بھکاری''، ''رذیل''، زرد چہرے''، ''تکونا دیس''، ''ہندوستان چھوڑ دو''، ''اونچی ایڑھی کی گرگابی''، ''ہمیں امن نہیں چاہیے''، ''بنارس کی ساڑھی''، ''عریانی''، ''تیری اور میری''، ''آنے والی نسل''، ایسے متعدد افسانوں میں سے چند ہیں جو اپنے عہد کے سیاسی رجحانات، میلانات اور واقعات کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں طنز بھی ہے اور تنقید بھی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''تکونا دیس'' محض ایسے ہی افسانوں پر مشتمل ہے۔

حیات اللہ انصاری کا افسانوں میں اصلاح کا نقطۂ نظر بے حد وسیع ہے۔ اس میں انسانیت کو اوّلیت حاصل ہے۔ اور جو کوئی انسانیت کے وسیع مفہوم کو مجروح کرے وہی ان کے لیے طنز اور نفرت کے لائق ہے۔ اُنھوں نے اس طور پر زندگی اور اس کے اہم مسائل کے اہم پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ حیات اللہ انصاری کے علاوہ بیدی، عصمت، اختر اورینوی، غلام عباس، مہندر ناتھ، سہیل عظیم آبادی، دیوندر ستیارتھی وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر معمولی سے معمولی ارتعاش کو بھی پیش کیا ہے۔ ان لکھنے والوں نے انسان کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے ہر تقاضے اور مسئلے کو بیان کیا ہے۔ ان میں مجموعی حیثیت سے زندگی کا شعور، انسانیت کا احساس اور ماحول کا پرتو اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ایسے متعدد افسانہ نگار بھی موجود ہیں جنھوں نے ان موضوعات اور مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ لیکن وہ زیادہ معروف اور مشہور نہ ہو سکے۔ خود ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی شہرت حاصل نہ کر سکے۔ اس کی ایک عام وجہ ان کا کم لکھنا ہے۔ اُنھوں نے زیادہ نہیں لکھا لیکن ایسے رجحانات کو ضرور پیش کیا جو ان کے عہد کے سیاسی اثرات کے حامل تھے۔

یہ سب لکھنے والے ایک خاص ماحول کو، جو سیاسی ہل چل اور ہنگاموں سے پُر ہے مختلف زاویوں سے پیش کرتے رہے۔ اُنھوں نے سیاسی تقاضوں اور تحریکوں کا پوری طرح مشاہدہ بھی کیا تھا اور اثرات بھی قبول کیے تھے۔ وہ اپنے ان مشاہدات اور اثرات کو مطالعہ، تخیل اور فکر کی پوری شدت سے ساتھ افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے ملکی اور غیر ملکی سیاست سے کیا تاثر قبول کیا تھا اور ان کے پیش نظر ملک کی سیاسی آزادی کا کیا لائحہ عمل تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁

(۳) ڈراما

(الف) اُردو ڈراموں میں آزادی کا جذبہ

اُردو ڈرامے اور تھیٹر کی ترویج و ترقی میں ابتداءً چوں کہ پارسیوں کی کوششوں اور انہماک کا بڑا دخل رہا، جو خالص تجارتی مقصد رکھتے تھے، اس لیے ملکی اور قومی زندگی اور سماجی کش مکش اور اس کے تقاضے ان ڈراموں کا حصہ نہ بن سکے۔ جن تھیٹروں میں یہ ڈرامے دکھائے جاتے تھے موضوعات اور مقاصد کے لحاظ سے ان کی کوئی قومی اور تہذیبی اہمیت بھی نہیں تھی۔ چوں کہ ان کی تخلیق تجارتی مصلحت کے تحت ہوتی تھی، اس لیے ان میں فکری گہرائی اور فنی جدت یا حیاتِ معاشرہ کی کوئی خاص عکاسی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی روایت میں مقامی عنصر، لوک کہانیاں سنسکرت ناٹک، راس لیلا اور کٹھ پتلیاں وغیرہ کے اجزائے تراکیب شامل رہے، اور یا پھر ان میں مغربی اثرات کارفرما رہے۔ جب شائقین ابتدائی دور میں مافوق الفطرت واقعات اور طلسماتی کھیل دیکھتے دیکھتے بیزار ہو گئے اور مذہبی ڈراموں کے لیے موضوع زیادہ وسیع نہ تھا، تو اپنے ماحول کے معاشرتی نتائج، شراب نوشی، قمار بازی اور دوسری مذموم و مضر رسوم و عادات پر مبنی پلاٹ تیار کر کے ڈرامے لکھے گئے، جنھیں یقیناً پسند کیا گیا۔ اس سلسلے میں بعض مغربی ڈراموں کے چربے بھی ہوئے جن کے نام و مقام اور فضا تبدیل کر کے مقامی رنگ میں پیش کیا گیا۔ طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی، اور سب سے زیادہ آغا حشر کاشمیری نے اصلاحِ معاشرت پر مبنی کامیاب ڈرامے تخلیق کیے۔

موضوع زیرِ بحث کے تعلق سے ذیل میں ایسے نمایندہ ڈراموں کا ذکر مقصود ہے جن میں قومی اور سیاسی شعور پیش کیا گیا ہے۔ ان میں ملک کے سیاسی حالات، مسائل اور تقاضے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اور قوم کو درسِ بیداری مختلف پہلوؤں سے دیا گیا ہے، ایسے ڈراموں کو مذہبی، تاریخی اصلاحی اور سیاسی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اُردو میں مذہبی ڈرامے قدرے کم لکھے گئے۔ ایک تو ماکان کمپنی، جن کی تحریک سے اُردو ڈرامے

تخلیق کیے جاتے تھے، زیادہ تر پارسی تھے۔ دوسرے مذہبی تقدس کے حامل کردار اور مثالی واقعات پیش نہیں کیے جاسکتے تھے اور پھر مسلمان اپنے عقائد کے متعلق کوئی بات تماشے کی صورت میں سٹیج پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان کے مذہبی جذبات اس سے سخت مجروح ہوتے تھے[1] اسی طرح تبلیغی ڈرامے بھی اُردو میں کم تحریر ہوئے۔ چوں کہ تبلیغ کے لیے واقعات میں عام طور پر صورتِ حال پیدا نہیں کی جاسکتی تھی اور اس کے مقاصد بھی موجود نہیں تھے کہ تبلیغ ڈراموں میں جگہ پاسکتی۔ کچھ ڈرامے ایسے ضرور تخلیق ہوئے جن کا مقصد تبلیغی تھا۔ شیخ بڈھن ذرہ نے آثار قیامت میں ایک نیک و پارسا شخص بنام خاقان کا کردار پیش کیا ہے جسے شیطان مختلف روپ بدل کر اپنے فریب میں گرفتار کرنا چاہتا ہے لیکن وہ ہمیشہ راہِ راست اختیار کرتا اور دوسروں کو بھی شیطان کے مکروفریب سے ہوشیار رکھتا ہے۔ وہ اپنے کردار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر انسان چاہے تو وہ جملہ آفاتِ راضی وسماوی سے بچ سکتا ہے، اور شیطانی فریب کو شکست دے سکتا ہے۔ اسی موضوع پر وحشت دہلوی نے بھی ''دستِ ابلیس'' کے نام سے ڈراما تحریر کیا تھا۔ اس میں انسان کی عظمت اور برتری کا احساس پیش کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ وہ تمام مخالف قوتوں کے مقابلہ میں آزاد اور خودمختار ہے۔ کچھ یہی موضوع رونق بناری نے رستم بامان میں، غلام حسین ظریف نے مکرابلیس میں، مراد لکھنوی نے آب ابلیس اور کالا چراغ میں اور نازاں دہلوی نے خاکی پتلا میں بھی پیش کیا ہے اور حق و باطل کی جنگ میں حق کی فتح اور برتری دکھائی ہے۔ بعد میں ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم اور جبر و استحصال کی کش مکش کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے وابستہ ڈراما نگاروں نے حق و باطل کی یہی جنگ نئے اور پرجوش انداز میں اپنے ڈراموں میں پیش کی۔ سردار جعفری نے یہ کس کا خون ہے؟ اور پیکار میں ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی اور عوام کو دشمنوں کے مقابلہ میں تیار کرنے کی سعی کی۔ یہی موضوع اور مقصد ان کے مرتب کردہ ڈراموں کے مجموعہ نئی تصویریں میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں سردار جعفری کے تین، رشید جہاں کے دو اور سبط حسن کے تین ڈرامے شامل ہیں۔ ان ڈراموں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا بے باک اور باغیانہ لب ولہجہ ہے۔

اُردو میں تاریخی ڈراموں کی کچھ کمی نہیں ہے۔ دراصل یہ اس وقت کی تہذیبی اور سیاسی صورت حال کا فطری تقاضا تھا کہ اپنے عظیم ماضی کو یاد کرکے احساسِ محرومی اور شکست کی اذیت کو طمانیت اور

سکون میں تبدیل کیا جائے۔ تاریخی واقعات، مثالی تاریخی کردار اور ماضی کی عظمت اور برتری
احساس اور وقوف اس وقت مسلمانوں کے لیے سکون قلب کا باعث ہوسکتا تھا۔ چناں چہ ڈراموں می
تاریخی موضوعات کی بہتات یہ ظاہر کرتی ہے کہ انھیں خاصی مقبولیت حاصل رہتی تھی۔ ایسے بیش
ڈرامے، قصے کہانیوں اور حکایات پر مبنی ہیں۔ ایدل جی کھوری نے ۱۸۷۲ء میں نور جہاں تحریر کیا ج
بہت کامیاب رہا۔ محمد قاسم علی خان نے شہنشاہ ظہیرالدین بابر اور شہنشاہ ہمایوں لکھے۔
بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئے[۲] امراؤ علی لکھنوی نے، جنھوں نے البرٹ بل بھی لکھا تھ
جہانگیر تصنیف کیا۔ غلام قادر فصیح نے سلطان ٹیپو تخلیق کیا جس میں ٹیپو کی انگریزوں سے جنگ
اس کے اسباب و نتائج دکھائے گئے ہیں۔ یہی کچھ کاذب نے ماتم شاہ ظفر دہلی میں پیش کیا تھا
اس میں بہادر شاہ ظفر اور انگریزوں کی افواج کے درمیان دہلی میں معرکہ آرائی دکھائی گئی تھی۔ شاہ
فوجیں پسپا ہوتی ہیں۔ شہزادہ آزاد بخت زار روس کے پاس مختلف ترکیبوں کے بعد امداد کے لیے پہن
ہے۔ عام خون ریزی کے ساتھ ساتھ شہزادوں کو بھی کوڑے سے مارا جاتا ہے۔ اور دو شہزادوں کے
سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جانا جیسے مناظر بھی اس میں موجود تھے۔ آغا سیّد اصغر علی اص
نظامی نے ترکی تلوار میں صلیبی جنگوں کے واقعات تحریر کیے۔ اس کا دوسرا نام شان اسلام تھا۔ اس
میں عیسائی رومیوں کے خلاف سلطان صلاح الدین ایوبی کی بہادری اور جوشِ جہاد کی کیفیت کو بیان کی
گیا تھا۔ اسی ڈرامے کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسلامی جھنڈا کے نام سے ریاض دہلوی نے لاہو
سے شائع کرایا تھا۔[۳] آغا حشر کاشمیری نے ہندوستان کے نام سے تین بابوں پر مشتمل تاریخی ڈراما لکھ
تھا۔ اس میں شہنشاہ ہمایوں کے سفری حالات ایران کا سفر، طہماسپ کی فوجی اعانت اور ہندوستان کی
ازسرِنو فتح کا حال ہے۔ اپنے دوسرے ڈراموں ترکی حور اور یہودی کی لڑکی، شیر کی گرج عرف
نعرۂ توحید میں تاریخی واقعات پیش کیے۔ فائق لکھنوی نے نورِ عرب، عروج اسلام اور فخرِ عرب میں
دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی برتری ثابت کی اور ایسے واقعات منتخب کیے جن میں اسلام کی
عظمت اور فتح حاصل ہوئی تھی۔ عباس نے نور اسلام عرف شاہی فقیر لکھا تھا۔ اور بعد میں یہ ''شمشیر
اسلام'' کے نام سے سٹیج کیا گیا۔ اس میں کفر کے خلاف اسلام کی فتح دکھائی گئی تھی۔ محشر انبالوی ۔
جوش توحید میں مسلمانوں پر رومیوں کے مظالم دکھائے تھے۔ اور پھر طویل جدوجہد کے نتیجہ میں تما
رومیوں کا مسلمان ہونا دکھایا گیا تھا۔ نازاں نے متعدد ڈرامے لکھے تھے۔ حورِ عرب میں رومیوں او

...نوں کی جنگ اور نورِ وطن میں ہسپانوی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ اور بالآخر
...نوں کی فتح دکھائی ہے۔ شیرِ کابل میں علی وردی خان کے ابتدائی دورِ حکومت میں ہندوستان اور
...ستان کے متعلق متعدد تاریخی واقعات کی منظر کشی کی ہے۔ اس میں مونگیر کا راجا سریندر مسلمانوں
...اتھوں شکست کھاتا ہے۔ قومی دلیر میں رومیوں اور تاتاریوں کی جنگ میں مسلمانوں کی برتری
...ی گئی ہے سلطان چاند بی بی وطن پرستی کی ترغیب دیتا ہے۔ لعل یمن اور سلطان صلاح الدین
... بھی نازاں ہی کے تاریخی ڈرامے ہیں۔ آصف محمد زاہی نے ترکی میں یہودیوں پر مسلمانوں کی
...کھائی ہے۔ شہنشاہ جہانگیر عرف دہلی دربار، مہتاب جہاں عرف شاہ جہاں بھی آصف نے
...ر کیے تھے۔ تائب بیداروی نے جوشِ اسلام عرف شہید قوم میں عیسائیت اور اسلام کی جنگ
...ہر اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کی شکست دکھائی ہے۔ دل لکھنوی نے غازی مصطفی کمال،
...محل، شیدائے وطن عرف بچہ سقہ، نادر شاہ درانی وغیرہ لکھے۔ ان تمام میں کفار کے مقابلہ
...مسلمانوں کی بہادری اور فتح کے واقعات تحریر کیے، ریاض دہلوی نے جانباز وطن راحت مراد
...ی کے ڈرامے خون وفا کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ شائع کرایا۔ یہ رومیوں اور مسلمانوں کے
...ن جنگ کے واقعات سے پُر ہے۔ مسلم پجاری عرف گائے کی فریاد بھی ریاض نے تحریر کیا
...۔ شمس گیاوی نے ترکی خون میں عیسائیوں پر ترکوں کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ شمس
...نوی نے تلوار کا دھنی میں حق کی فتح اور باطل کی شکست دکھائی ہے۔ آئینہ ایمان میں ہلاکو کے حملہ
...اد کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں ہلاکو کی گرفتاری اور پھر ڈرامے کے ہیرو کا اسے معاف
...ر دینا جذباتی باتیں ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے جنگ روس و جاپان میں ایشیا کی برتری کا
...ساس اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ جاپانیوں کی قوم پرستی اور حُب الوطنی کو نمایاں کر کے ہندوستانی
...م کو عبرت اور نصیحت کا درس دیا ہے۔ روس کے مقابلہ میں جاپانیوں کا اپنے وطن و قوم کی خاطر
...بانیاں پیش کرنا دل دوز طریقوں پر دکھا کر اپنے ملکی عوام کو غلامی سے نجات حاصل کرنے کی طرف
...وجہ کیا ہے۔ حکیم فرخ دہلوی نے رفتارِ زمانہ کو شانِ اسلام کے نام سے پیش کیا۔ قابل حیدر آبادی
...نے اسلام کا انصاف تحریر کیا۔ ماہر کان پوری نے شہید ملت میں اسلام اور کفر کی کش مکش لکھی
...ہے۔ اور نیر انبالوی کے ڈراموں ترکی فرشتہ عرف مصطفی کمال، وطن اور غیبی تلوار میں
...ی روایت نظر آتی ہے۔ وحشت دہلوی نے ترک مسلمانوں کی جدوجہد استقلال کو اپنے ڈراموں میں

پیش کیا۔ اسلامی شیر عرف مصطفیٰ کمال پاشا، ترکی تلوار عرف شانِ اسلام، تر
خون عرف جنگ طرابلس، غازی انور پاشا، ان کے علاوہ اسلامی تاریخ کے دیگر واقعات پر
کئی ڈرامے تحریر کیے۔ بہادر نقاب پوش عرف نصرتِ اسلام، برق اسلام عرف جلوۂ طور، ج
اسلام عرف صلیبی جنگ، اسلامی چاند، تصور اسلام عرف شمشیر اسلام، ہمارا دین عر
جوش توحید وغیرہ ان تمام میں مسلمانوں کو ہر دشمن کے مقابلہ میں فاتح دکھایا گیا ہے۔ اظہر دہل
نے فاتح بنگال کے نام سے نواب قتلو خان حاکم اڑیسہ، بنگال پر اکبر اعظم کی سرکوبی کی داستان
ڈرامے کی شکل دی ہے۔ خورشید لکھنوی نے ڈراما سلطان رضیہ لکھ کر اس کے بارے میں پھیلی ہو
غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح کی ایک کوشش لالہ کشن چند زیبا نے شیوا
مرہٹہ لکھ کر کی تھی۔ رضیہ سلطانہ پر ایک ڈراما قاسم علی خاں نے بھی تصنیف کیا تھا۔ ضیا عظیم آبادی
ہمایوں کے نام سے سٹیج کے لیے ایک ڈراما تحریر کیا تھا۔ چودھری سلطان حسین نے اکبر، جہانگ
اور شاہ جہان نامی ڈرامے آل انڈیا ریڈیو کے لیے تحریر کیے جو نشر ہوئے۔ شاہ جہاں پر شاد عظیم آباد
آصف اور صولت نے بھی ڈرامے تصنیف کیے۔ آصف نے جہانگیر پر اور اورنگ زیب پر بھی ڈرا
لکھے تھے۔ اورنگ زیب پر وحشی اور ایدل جی کھوری نے بھی ڈرامے تحریر کیے۔ عبدالوہاب عاصم
خالد بن ولید کو مرکزی کردار بنا کر اسلامی تاریخی ڈراما تشکیل دیا۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں
تسخیر ملک کے ساتھ ساتھ تعمیر اخلاق اور تہذیب معاشرت میں کیا حصہ لیا تھا۔ عشرت رحمانی
شاہ جہان میں ایک تاریخی المیہ دہرایا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کئی ڈرامے تحریر کیے۔ ا
میں سب سے پُر اثر نقش آخر ہے۔ یہ بھی ایک عظیم تاریخی المیہ پر مبنی ہے۔ اس میں مسلمانوں
تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی زندگی پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اثرات موثر انداز میں دکھا
گئے ہیں۔ یہ اس وقت کی صورتِ حال میں مستقبل کے تعلق سے مسلمانوں کے مختلف طرز ہائے فکر
بھی پیش کرتا ہے۔ محمد مجیب نے خانہ جنگی میں شاہ جہاں کی عدالت، دارا شکوہ اور اس کے بھائیو
کی خانہ جنگی اور بالآخر اورنگ زیب کی فتح دکھائی ہے۔ منظر بریلوی نے بچہ سقہ عرف امیر کا
تحریر کیا، جس میں بچہ سقہ کی حکومت افغانستان کے خلاف بغاوت کی جدوجہد بیان کی ہے۔ نیاز
پوری نے فلپ کا کس کے رانی آف جھانسی کا ترجمہ جھانسی کی رانی کے نام ہی سے کیا۔ ا
میں بڑی صداقت سے ان واقعات پر روشنی ڈالی ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دینے کا س

نے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے نامق کمال بک کے ڈرامے جلال الدین خوارزم شاہ کا ترجمہ کیا۔
ی میں تاتاریوں کے خلاف ان کی جدوجہد دکھائی گئی تھی۔ امتیاز علی تاج نے انار کلی تصنیف کیا،
س میں مغلیہ عہد میں مسلمانوں کی تہذیب اور اس کی نفاست اور شائستگی کے مناظر پیش کیے گئے۔
اسلامی تاریخ کے موضوع پر تقریباً تمام ڈرامے پُرجوش اور ولولہ انگیز جذبات کے حامل
ظر آتے ہیں۔ ان میں عام طور پر دکھایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ہر قسم کی قربانی
ے سکتے ہیں۔ اذیتیں برداشت کر سکتے ہیں اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان میں
جتماعی قربانیوں کی مثالیں بڑی عام ہیں۔ ایسے تمام ڈراموں میں مسلمانوں کی فتح و نصرت، ایثار،
بہادری، جوش، اخلاق، جان فروشی، جنگ و جدال، قتل و خون ریزی اور مسلمانوں کی فتح و نصرت اور
سلام کا غلبہ ان کی عام خصوصیات ہیں۔ یہ ڈرامے اپنی تحریری شکل میں بھی اور سٹیج پر بھی بّرِعظیم کے
طول و عرض میں بار بار دکھائے جاتے رہے اور ہر جگہ مقبول ہوئے۔

برِعظیم میں قومی اور سیاسی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کے مختلف
طبقات نے جو شعوری کوششیں کیں ان سے سارے ہندوستانیوں کی زندگی اور اس کے تمام پہلو متاثر
ہوئے۔ قوم میں انفرادی اور مشترکہ ہر دو صورتوں میں جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس مرحلہ پر قوم کو اپنی
کوتاہیوں اور کمزوریوں پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت کا احساس ہوا تاکہ انھیں دور کر کے ان کی جگہ اپنے میں
توانائیاں پیدا کی جا سکیں جو دشمنوں سے مقابلے میں مدد دے سکیں گی۔ بعض ڈراما نگاروں نے اپنی قوم اور
ملک کی معاشرتی قبائح اور مذموم و مضر رسوم و عادات پر مبنی موضوعات تلاش کر کے ڈرامے تحریر کیے۔

بدکرداری اور شراب نوشی کی مذمت پر کثیر ڈرامے تحریر ہوئے۔ حافظ محمد عبداللہ نے رہبرہ و
بہرام اور فریب فتنہ میں اور آغا حشر کاشمیری نے آنکھ کا نشہ، خواب ہستی اور ترکی حور
میں پر اثر انداز میں اس فعلِ قبیح کے خلاف لکھا۔ آصف کے ڈرامے مسافر میں ''شاہ تاتار'' اپنی اسی
عادت کے طفیل مارا جاتا ہے۔ مغرب کی کورانہ تقلید کے برے نتائج اور عبرت انگیز انجام بھی ڈراموں کا
موضوع ہے۔ اس کی بہتر مثالیں اعظم کا ڈراما ایشیائی ستارہ اور نسیم چغتائی کا ڈراما اندھی دنیا
ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کے پردۂ غفلت میں اصلاحِ قومی کی ترغیب دی گئی ہے اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم
دلانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہی مقصد اشتیاق حسین قریشی کے ڈرامے نقشِ آخر کا بھی ہے۔
ان کے دوسرے ڈرامے بھی اصلاحی مقصد رکھتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے ڈرامے شہید وفا اور میوہ

تلخ معاشرتی اصلاح کی ترغیب پر مبنی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی ایک اصلاحی معاشر
ڈراما زود پشیمان تحریر کیا تھا۔ فائق لکھنوی نے دیش بندھو میں اصلاحی موضوع قلم بند کیا ہے
آصف مدراسی نے قومی آئینہ میں مختلف تمثیلی کرداروں کے ذریعہ علم اور جہالت کا موازنہ کیا ہے اور عل
کی فضیلت ثابت کر کے حصول علم کی ترغیب دی ہے۔ عبدالغفار مدہولی نے بچوں کے لیے متعد
ڈرامے تحریر کیے جن میں زیادہ تر اصلاحی موضوعات اور مقاصد کے حامل تھے۔ کایا پلٹ، محنت
چھوٹا لڑکا، چور کا لڑکا، نئی روشنی کے لڑکا لڑکی ان کے ایسے ڈرامے ہیں۔ محمد مجیب
نے ڈرامے کھیتی میں ایک ایسے قدامت پرست اور بوالہوس مولوی کا کردار پیش کیا ہے جو دوسرو
کے لیے بڑا عبرت انگیز ہے۔ انجام میں ایک دنیا پرست جج کا عبرت ناک انجام دکھایا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں اور طویل سیاسی
جدوجہد کے دوران کئی ڈراما نگاروں نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کیے۔ یہ ڈرامے
عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئے تھے۔ ان میں سیاسی جذبات و احساس اور شعور
عام نظر آتا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اور قومی بیداری ان کے مقاصد معلوم ہوتے
ہیں۔ ان میں سے اکثر ڈرامے عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور اس زمانہ کی تھیٹر کمپنیوں نے جگہ جگہ
انھیں سٹیج کیا۔ ان میں سے بعض ڈراموں کے سلسلے میں حکومت نے کئی کمپنیوں کے خلاف کارروائی
بھی کی، بھاری جرمانے کیے اور کمپنیاں ضبط ہوئیں[۴] ایسے بعض ڈراموں میں محض سیاسی واقعات و
حالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اور بعض میں کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر واستبداد اور انگریزوں
کی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے۔ اور چند ڈراموں میں آزادی کی اہمیت، حصولِ آزادی کی ترغیب
اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات اور خیالات بیان کیے گئے ہیں۔

اُردو میں سیاسی موضوعات پر پہلا ڈراما ''فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'' تھا جو ۱۸۵۸ء میں
بمبئی میں سٹیج پر پیش کیا گیا تھا[۵] اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں لیکن چوں کہ بعد میں
لکھا جانے والا ایک ڈراما نانا صاحب اس کے مقابلہ میں لکھا گیا تھا۔ جس میں جنگ آزادی کے
اس مجاہد کو دشمن قوم اور غداروں کی حیثیت سے دکھایا تھا، اس لیے یہ بات قریب قریب درست ہو سکتی
ہے کہ ''فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت'' میں حکومت برطانیہ پر ضرور طنز کیا گیا ہوگا۔ اس کے ایک
سال بعد ۱۸۵۷ء کے واقعات ''نانا صاحب'' کے عنوان سے سٹیج پر دکھائے گئے۔ اس میں انگریزوں

کی مدح اور نانا صاحب کی مذمت کی گئی تھی۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد امراؤ علی لکھنوی نے ۱۸۹۳ء میں البرٹ بل تحریر کیا۔ اس میں شروع سے آخر تک برطانوی حکومت کے ظلم وستم دکھائے گئے تھے اور ہندوستانیوں کو غلام بنائے جانے کی داستان دُہرائی گئی تھی گو کہ انگریزوں کی مخالفت نہیں کی گئی لیکن انھیں سخت متعصب اور مغرور دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعض کردار مسٹر بارش، مسٹر پریجوڈس، مسٹر اینگری، مسٹر پراوڈ، اسم بامسمّیٰ تھے۔ البرٹ بل پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ آخر میں ہندوستانیوں کی فتح اور ترمیم شدہ البرٹ بل وائسرائے کی کونسل میں منظور ہونے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ایک اہم ڈراما مولانا ظفر علی خان کا جنگ روس و جاپان تھا۔ اس کا مقدمہ مولوی عبدالحق نے تصنیف کیا تھا۔ اس میں اس زمانہ کے سیاسی ماحول پر تبصرہ کرتے ہوئے یورپ کی آخر انیسویں صدی کی جنگی حکمتِ عملی کو ''مرض جوع الارض'' قرار دیا ہے۔ ظفر علی خان نے جاپانیوں کی قوم پرستی کے ذکر سے ہندوستانیوں کو سبق حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے لیے مثال ہو سکتے تھے۔ ضعیف بیوہ ماں کا محض اس خیال سے خودکشی کرنا کہ اس کے بعد اس کا لڑکا ماں کی خدمت کے بجائے ملک وقوم کی خدمت کر سکے، اور اس نوجوان کا دھیان صرف ملک اور قوم کی طرف رہے۔ طفل مکتب کا مدرسہ کے اوقات کے بعد مٹھائی بیچ کر جنگی فنڈ میں روپیہ دینا محکوم ہندوستانیوں کے لیے مشعل راہ ہو سکتا تھا۔ اس ڈرامے کے ذریعہ یورپ کے مقابلہ میں ایشیا کی برتری کے احساس کو بیدار کرنا بھی تھا۔ جو فی الواقع جاپان کی روس کے مقابلہ میں فتح ۱۹۰۵ء کے بعد ایشیا میں بیدار ہا تھا۔

اصغر نظامی کا قومی دلیر ہندو مسلم اتحاد کے جذبہ پر مبنی ہے۔ عبداللطیف شاد کے بسارا گنبھیر میں اس کا مرکز کردار ہندو اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنی زندگی ملک وقوم کے لیے وقف کرتا اور جیل تک جاتا ہے۔ اپنا تمام سرمایہ سوراج اور خلافت فنڈ میں دے دیتا ہے۔ عباس علی کے ڈرامے لیڈی جوئتی میں بھی ہندو مسلم اتحاد کے بہتر نتائج دکھائے گئے ہیں۔ عباس علی ہی نے شاہی فرمان عرف دیش اپدیش میں ڈرامے کے مرکزی کردار رام ناتھ کے ذریعہ، جو ہندو درپن نامی اخبار کا مدیر ہوتا ہے، ریاست اور حکومت کی بدنظمی پر سخت تنقید کی ہے۔ محشر انبالوی نے غریب ہندوستانی عرف انقلاب یعنی سودیشی تحریک میں اپنے طور پر ہندو مسلمانوں کے متعدد قومی اور سیاسی مسائل حل کرنے کی تجاویز پیش کی ہیں۔ ہری پانڈے اور

شیو پانڈے ہندوؤں کی اور مولانا بشیرالدین مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار آپس
ہندوؤں مسلمانوں کے اتحاد، میل ملاپ اور پُرسکون زندگی کے لیے مختلف ایثار کرتے ہیں۔
موضوع ریاض دہلوی نے مسلم پجاری میں، نیّر انبالوی نے وطن میں پیش کیا ہے۔ ان ڈرا
کے کردار گاؤکشی بند کردیتے ہیں یا اس کی مخالفت کرتے ہیں تاکہ ہندوؤں کی دل آزادی نہ ہو
لکھنوی نے بھی تاج محل میں ہندو مسلم اتحاد کا درس دیا تھا۔ اپنے ایک دوسرے ڈرامے شہ
وطن میں بچہ سقّہ کی داستانِ جدوجہد کو پیش کیا تھا۔ حکومت نے اسے سٹیج پر پیش کرنے کی اجازت
دی۔ یہ اس قدر مقبول ہوا تھا کہ دن میں تین تین مرتبہ دکھایا جاتا تھا۔[1] شمس لکھنوی نے اپنے ڈرام
مادروطن اور حب الوطن میں اور محمد دین تاثیر نے لیلائے وطن میں وطن کی محبت کے جذبات
کیے۔ عاجز ناگپوری نے پیامِ حق لکھا جس کا مقصد حکمران کے عہد میں قومی رہبر کی اخلاقی جرأ
پیش کرنا تھا، جو ظلم و ستم کے خلاف جوان مردی، بے باکی، جاں بازی، شجاعت اور صبر سے کام لینا
محی الدین عزم نے اپنے ڈرامے دیش کی پکار میں قومی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وحشی
دہلوی نے کرشمۂ افلاس عرف خونِ حسرت میں انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کا پرچار
مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کش مکش، سرمایہ داروں کے ظلم اور عورتوں کی مشقت اور محبت اس
موضوعات ہیں۔ اظہر دہلوی نے ڈرامے بیداری میں افلاسِ ملکی کا نقشہ دکھایا ہے۔ ''رولٹ ایکٹ''
خامیاں عدم تعاون کی حمایت اور اس کے تحریک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ جلیاں
باغ کا سانحہ، مارشل لاء، سودیشی تحریک اور تحریکِ خلافت کے مختلف مناظر بھی دکھائے ہیں۔ آخر
ملک کی بیداری کا تذکرہ ہے اور عوام کو آزادی کی جدوجہد میں ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کی دع
دی ہے۔ اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ سارا ڈراما اسی لہجے میں تحریر کیا گیا ہے۔

امرت۔ جلیاں والا باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی ہے۔ بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گن
نشانہ بنادیا گیا۔ مسلمانوں بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کردی گئی۔ اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی
بخشی۔ بے شک عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ اس وقت تک ج
رہے گا، جب تک کہ قاتلانِ جلیاں والا باغ کو عبرت انگیز سزا نہیں دی جائے گی، اور جب تک خلا
کا فیصلہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا۔ اور ہندوستان کی آواز کو نہیں سنا جائے
امرت۔ مگر یہ باتیں سوراج کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔
بخشی۔ بے شک نہیں ہوسکتیں۔ اسی لیے کانگریس اور مسلم لیگ نے سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

غلام باری نے پیکار میں جبر واستحصال کے خلاف اظہارِ خیال کیا ہے۔ مزدوروں اور سرمایہ
وں کی کش مکش اس کا موضوع ہے، اور قوم کے مفلوک الحال طبقہ کو معاشی شعور سکھانے کی ایک
شش۔ سردار جعفری نے اپنے ڈرامے پیکار میں بنگال کا قحط، اس کے اسباب، ذخیرہ اندوزوں
ی کرتوت دکھائے ہیں۔ اس میں بڑے مشتعل انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی
از کی ایک اور کوشش مصنف نے یہ کس کا خون ہے میں کی ہے۔ یہ پانچ ایکٹ کا ڈراما
گانگ پر جاپانی بمباری کے سچے واقعات کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ اس میں ہندوستانیوں کی بہادری
شجاعت کے اس جذبہ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس میں ''بھیم وارجن''، ''اکبر اور ٹیپو''،
جھانسی کی رانی'' اور بھگت سنگھ کی روح ہے''۔ ان کا ایک اور ڈراما منزل اشتراکی نظریات کو پیش کرتا
ہے۔ ان کے تین مختصر ڈرامے نئی تصویریں میں شامل ہیں، جسے سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا،
یڈرک میں دوسری جنگ عظیم کے عالمی واقعات ہندوستان کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔
رشل تموشکو میں روس کو نا قابلِ تسخیر قرار دیا ہے۔ ان کا تیسرا ڈراما لال جھنڈا اس خیال کے
ھ ساتھ، اشتراکی احساس سے لبریز ہے۔ ڈراموں کا مجموعہ نئی تصویریں دراصل ترقی پسند تحریک
ے زیرِ اثر مرتب ہوا تھا، جس کے تحت ڈرامے کو ہندوستانی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی
ی۔ اور عام مسائل حیات کو خالص ہندوستانی انداز میں پیش کیا گیا۔ اس مجموعہ میں شامل ڈراموں
ے علاوہ اس تحریک کے زیرِ اثر اور بھی ڈرامے تحریر ہوئے۔ جو ترقی پسند ادیب، ڈراما نگار بھی تھے،
ں میں پیش پیش رہے۔ سردار جعفری، سجاد ظہیر، رشید جہاں کے علاوہ خواجہ احمد عباس کے ڈرامے یہ
رت ہے اور زبیدہ، ضیا سرحدی کا ایک سو سال بعد اسی قبیل کے ڈرامے ہیں۔

سیّد بادشاہ حسین، مصنف اُردو میں ڈراما نگاری نے انتخاب جداگانہ میں مسلمانوں کی
احدہ قومیت جتا کر ان کے لیے علاحدہ سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی
ثیت، ان کی سیاسی جدوجہد اور ان کا سیاسی نصب العین بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے
زاجنگی میں ''الحاقِ اودھ'' کے واقعات پیش کیے ہیں۔ دربار اودھ کی نااہلیوں اور اکابرین دولت
ی کمزوریوں کا ذکر طنز و مزاح کے پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ انگریزی فوجوں کا حملہ اور کامیابی کا سبب
ندوستانیوں کی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے۔ لالہ کشن چند زیبا نے مذہبی جذبات پر مبنی نئے ڈرامے تخلیق کیے
ے، جن میں ہندو دھرم کی برتری اور بھارت کی عظمت کو بیان کیا تھا۔ اپنے ایک ڈرامے شہید

وطن میں پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے خاندان کے حالات پیش کیے تھے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ
موتی لال نہرو جو ابتداءً عیش پرست تھے، بھارت ماتا کے احساس دلانے پر اپنی زندگی ملک اور قو
کے لیے وقف کر دیتے ہیں، اور گاندھی کے پرستار بن کر سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ ایک
ڈرامے قومی تلوار میں دوسری جنگِ عظیم کے واقعات پر تبصرہ ہے۔ اس میں ہندوستانیوں کی بے بس
اور بے چارگی کا احساس بھی موجود ہے۔ اس کا تدارک مصنف کے خیال میں قومی جدوجہد آزاد
ہے۔ نورالٰہی محمد عمر نے روح سیاست میں پنڈت نہرو اور ابراہام لنکن کی زندگی کی جدوجہد پیش ک
ہے، اور دونوں کی ملکی اور قومی خدمات بیان کی ہیں۔ عبدالغفار مدھولی نے قوم پرست طالب عل
میں نصیحت آموز لہجہ میں قوم کے بچوں کو اتحاد کا درس دیا ہے۔ اس میں کم عمر لڑکوں کی قومی جدوجہد او
ان کا قومی شعور دکھایا گیا ہے۔ ابوسعید قریشی نے آزادی کے نام سے ایک ڈراما لکھا تھا جس میں
آزادی کی اہمیت اور اس کی خوبیوں کا احساس دلایا گیا۔ نقش آخر میں اشتیاق حسین قریشی نے جنگ
آزادی ۱۸۵۷ء کے اثرات پیش کیے ہیں۔ یہ ان کا ایک اہم ڈراما ہے جس میں وہ مسلمانوں کے
لیے ایک نصب العین تجویز کرتے ہیں اس کے ذریعہ ان میں سیاسی، قومی اور تعلیمی شعور پیدا کر
کی کوشش کی گئی ہے۔ محمد مجیب نے ڈراما کھیتی میں مذہبی آزادی کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد
پیش کیا ہے۔ یہ اصلاحی ڈراما ایک مقصد بھی لیے ہوئے ہے۔ اس میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکا
کے اثرات کے ساتھ ساتھ مغربی و مشرقی تہذیب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ اور ایک ڈراما نیم شب
اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ اگر ہندوستان میں اشتراکیت کا عمل دخل ہوا تو ملک کی کی
حالت ہوگی؟ اس سوال پر مصنف نے اپنے خاص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

سیّد نصیر احمد نے اپنے ڈرامے جمہوریت و آمریت میں آمریت کی مذمت اور جمہوریت
کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ یہ ایک تمثیل ہے، جس میں آمریت جمہوریت کے خلاف عدالت میں دعو
دائر کرتی ہے۔ اس میں جمہوریت پرست طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ بالآ
جمہوریت کی فتح ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کا مقدمہ مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا تھا۔ ایک اہم ڈرا
فضل حق قریشی دہلوی نے لیڈر کے نام سے تحریر کیا تھا۔ یہ اپنے وقت کے اہم سیاسی اور قومی مسائل
آئینہ ہے۔ بزم تہذیب ادب دہلی کے زیرِ اہتمام اینگلو عربک انسٹی ٹیوشن کی امداد کے لیے سٹیج کیا گیا
تھا۔ اور پھر کتابی صورت میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ نیاز فتح پوری نے تحریر کیا تھا۔ مقد

میں فتح پوری نے مسلمانوں کو اس امر پر مبارک باد دی کہ اُنھوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی ہے۔ اس میں اُنھوں نے ہندوؤں کی مذہبی اور لسانی تنگ نظری کی مذمت بھی کی۔[8]

مقدمہ پر تاریخ یکم جنوری ۱۹۴۰ء درج ہے۔ فضل حق قریشی نے اس کا انتساب ''مہاتما گاندھی'' کے نام کیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

> جن کی جان توڑ کوششوں سے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ میراث اور تنہا وجہ یگانگت، یعنی اُردو کی جڑیں کھودنے کا کام بڑی خوش اُسلوبی سے انجام پارہا ہے۔[9]

سارے ڈرامے میں اُردو ہندی کش مکش پر مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے اور بدنیت لیڈروں خصوصاً گاندھی کا مطمحِ نظر بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مقاصد کی اصل کیا ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کیا چاہتا ہے۔ ڈرامے میں خاص طور پر ہندو اغراض پر مبنی جماعت کانگریس کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس میں جگہ جگہ مسلمانوں کو گاندھی اور کانگریس کے اثر سے نکالنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ پھر حصولِ آزادی کی ترغیب اس کا مقصد ہے۔

ان ڈراموں نے مجموعی طور پر اپنے دور کے عصری تقاضوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان میں وہ سب باتیں دیکھی جاسکتی ہیں جو اس وقت سیاسی سطح پر رونما ہورہی تھیں۔ قومی اور سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ ڈراموں کے موضوعات اور مقاصد بھی تبدیل ہوئے اور ضرورت کے ماتحت ایسے ڈرامے تخلیق کیے گئے جو قومی مقاصد کی بجاآوری میں معاون ہوسکتے تھے۔ یہ کوششیں شعوری بھی تھیں اور غیر شعوری بھی۔ کچھ ڈراما نگاروں نے جرأت و بے باکی کا ثبوت دیتے ہوئے یقیناً بعض ڈراموں میں کھل کر آزادی کا جذبہ اور مطالبہ پیش کیا۔ بعض ڈرامے بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی حیثیت، ان کے قومی مسائل، ان کی علاحدہ قومیت اور ان کے لیے علاحدہ سیاسی حقوق کے مطالبہ پر مشتمل تھے۔ یہ دراصل ڈراموں میں مطالبۂ پاکستان کی ابتدا تھی۔

(ب) اُردو ڈراموں میں مطالبۂ پاکستان

برطانوی تسلط سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے تمام قوموں نے ابتداءً مشترکہ جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ لیکن بعد میں ہندوؤں کی تہذیبی احیا کی کوششوں، نشاۃ الثانیہ کی تحریکوں اور فرقہ پرستی کی انجمنوں کے قیام اور ان کی تحریکوں کی ذاتی اغراض نے مسلمانوں کو اپنے مفاد اور تحفظ کی خاطر اپنے لیے جداگانہ محاذ بنانے پر مجبور کیا۔ مسلمانوں نے اپنی تہذیبی اور قومی ترقی کے لیے علاحدہ نصب العین

کے تعین کی ضرورت محسوس کی۔ پھر تحریک اتحاد اسلامی، تحریکِ خلافت نے مسلمانوں کے قومی شعور میں پاکستان کو اجاگر کر دیا۔ ان کا ایسا طبقہ جو زیادہ باشعور تھا اور جسے اپنے عظیم ماضی سے بھی واقفیت تھی، پاکستان کی آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح کے لیے ناگزیر سمجھنے لگا۔ ان کا یہ تصور اور نصب العین، جہاں ادب کی مختلف اصناف میں نمایاں ہوا ہے، ڈراما بھی اس سے مزین ہے۔ سیّد بادشاہ حسین اور فضل حق قریشی کے مذکورہ بالا ڈرامے اس کی شروعات تھی لیکن بعض ڈرامے اس ضمن میں خصوصی تذکرے کی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک ڈراما ضیا سرحدی کا پاکستان ہے۔ اس میں مصنف نے بڑے جذباتی انداز میں پاکستان کے تصور اور نظریہ کی تبلیغ کی ہے۔ انتساب اتاترک کے نام ہے اور اس میں جنگ آزادی میں جان دینے کا عزم ہے،[1] دیباچے میں کہا گیا ہے کہ یہ تصنیف ہندی مسلمانوں کے نام ایک پیام ہے اور یہ کہ مصنف ہندی مسلمانوں کو شجاع اور جفاکش دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ مسلمان ''اہنسا'' میں مبتلا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کی تصنیف کا ایک مقصد تحریک پاکستان کو عورتوں میں مقبول بنانا ہے۔ مصنف خیال ظاہر کرتا ہے کہ جس دن تک ہماری عورتوں میں، ہنر، شجاعت اور جفاکشی پیدا نہ ہوگی، ہماری ترقی معدوم رہے گی[2] مرکزی کردار سلمٰی ہے، جو مسلمان عورتوں کے لیے ایک درس و ترغیب ہے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھ لیتی ہے کہ ''پاکستان ہمارا قومی حق ہے، گو اس کو محسوس کرنے میں ہم نے دیر کی ہے''[3]

ڈرامے کا منظر اوّل خلد بریں کا پیش کیا گیا ہے یہاں اتاترک، ایک کانگریسی رہنما، قائداعظم اور علامہ اقبال موجود ہیں۔ وہ تحریک پاکستان کے بارے میں اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ اتاترک کے ذریعے عالم اسلام کی رائے اس ضمن میں معلوم ہوتی ہے۔ کانگریسی ہندو نقطۂ نظر کا نمائندہ تھا لیکن اب وہ تائب ہو چکا ہے۔ قائداعظم اور علامہ اقبال ہندی مسلمانوں کا واحد نصب العین تجویز کرتے ہیں۔ کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

کانگریسی۔ قائداعظم، کانگریسی حکمت عملی کی پہچان میں نے کر لی ہے۔ گاندھی کے عقائد پر بھی مجھ کو ایمان نہیں رہا۔ اور بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ''اہنسا'' محض مسلم شجاعت کو ہلاک کر دینے کی ایک تجویز تھی۔ ''دھرم'' اور ''سچ'' کی آڑ میں سیاسی شطرنج کھیلا جا رہا تھا۔[4] قائداعظم (تدبر بھری آواز اور لہجہ میں)، ''تحریک پاکستان کا مدعا ہندی مسلم قوم کے لیے ایک ایسا گھر تعمیر کرنا ہے جس میں ہندی مسلمان آزادی کے ساتھ موجودہ اور آئندہ نسلوں کی پرورش کر سکیں۔ پرورش سے میری

مراد اناج کھا کر پیٹ بھر لینا ہی نہیں۔ اخلاقی، معاشرتی، علمی اور اقتصادی بہبود بھی زیر نظر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی، معاشرتی، علمی اور اقتصادی راہ میں ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہوگا...... تحریک پاکستان کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سو فیصدی مذہبی تحریک ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کانگریس سو فیصدی ہندوراج کی پرچارک ہے۔[۵]

اقبال۔ میرا فلسفہ، فقیر اور گدائے حجاز کا فلسفہ، حُبِ اسلام اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا واحد مورچہ، جسے یاروں نے فرقہ آفرینی اور فرقہ پروری کے نام سے پکارا ہے۔ ایک قوم بھی تو ایک فرقہ ہے۔ میں مسلم قوم کا ایک فرد ہوں اور اسی لیے مسلم نیشنلزم کا حامی ہوں۔[۶]

خلد بریں، اصل میں خواب کا منظر ہے، جسے اس ڈرامے کے ایک مرکزی کردار انور نے دیکھا تھا۔ سلمیٰ اس کی بیوی ہے جو ہر طرح سے اس کی ہم خیال ہے۔ وہ کسی قدر اختلاف رائے رکھتی تھی لیکن انور نے اسے قائل کر لیا تھا۔ سلمیٰ بھی انور کے ساتھ تحریک پاکستان کی کارکن بن جاتی ہے۔ اس کے تمام کردار اپنے آپ کو مختلف انداز سے تحریک پاکستان کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ مصنف کی خاص توجہ مسلم خواتین پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان خواتین بھی تحریک پاکستان میں مردوں کے دوش بدوش جدوجہد میں حصہ لیں۔ چناں چہ سلمیٰ قائل ہونے کے بعد نہ صرف خود شریک ہو جاتی ہے بلکہ دوسری عورتوں کو بھی اپنی ہمنوا بنا لیتی ہے۔ انور جدوجہد کے دوران شہید ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ سلمیٰ لے لیتی ہے۔ کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

انور: جب سے ہم وجود میں آئے ہیں، اعدا ہمیں مٹا دینے کی مساعی کر رہے ہیں اور ہمارا بایں ہمہ قائم رہنا مسلم الوالعزمی کی دلیل ہے۔ ہم لڑتے آئے ہیں، لڑتے رہیں گے ... ہماری اولین اور آخری مانگ پاکستان ہے۔ خدا کی ڈومنین اور اپنے پیدا کردہ سٹیٹس کے ہم قائل ہیں۔[۷]

باپ: ہندو مسلم الگ نہیں ہو سکتے۔

انور: الگ ہیں ہی، اخلاقاً، مذہباً، معاشرتاً۔ زمین کی تقسیم، اگر نیت صاف ہو تو بہت آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

باپ: مگر ہندوستان ہندوؤں کا ہے، تم تو باہر سے آئے ہو۔

انور: جو باہر سے آئے تھے وہ مر گئے۔ موجودہ مسلمان یہیں کے مسلمان ہیں اور اس ملک میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے اور اپنا وہی حصہ ہم مانگتے ہیں۔[۸]

سلمیٰ: میں نے ادارہ عالیہ سے درخواست کی ہے کہ مجھے اپنے شوہر کے باقی ماندہ فرائض انجام دینے

کا حکم دیا جائے۔ وہ جگہ جو آپ کے نہ ہونے سے خالی ہو چکی ہے مجھے ملنی چاہیے۔

انور: میرا پیام۔ اکثریت ہماری قوم کی دشمن ہے۔ قوم کا تحفظ کا مرید کا اوّلین فرض ہے۔ قائداعظم کے نقش قدم پر نہ چلنے والے میری روح کو صدمہ پہنچائیں گے۔ قائداعظم کے نقش قدم پر چلنے ہی میں ہمارا تحفظ ہے۔[9]

اسی سلسلے کا ایک ڈراما فطرت حیدری نے پاکستان کیوں؟ کے عنوان کے تحت لکھا تھا۔ یہ پرائمری مسلم لیگ، درلی، بمبئی کے پروپیگنڈہ آفیسر تھے۔ ڈراما کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ سرورق پر قائداعظم کا نقشہ ہے جس میں پاکستان کے مجوزہ علاقے دکھائے گئے ہیں اور ایک گوشہ میں قائداعظم کی تصویر ہے۔ فطرت حیدری نے ڈرامے کی تصنیف کے مقاصد شروع میں تحریر کیے ہیں۔[10]

۱۔ حقائق کی روشنی میں تحریک پاکستان کی تبلیغ

۲۔ پاکستان کے متعلق غیر مسلم سیاسی جماعتوں کے اعتراضات کا مدلل جواب

۳۔ اشاعت مسلم لیگ

۴۔ تلقین ہندو مسلم اتحاد

اس میں جن سیاسی مسائل کی تشریح کی گئی ہے، ان کا ذکر بھی مصنف نے کر دیا ہے۔[11]

۱۔ مکمل تشریح پاکستان، پاکستان کی مالیات، معاشرت، تہذیب و تمدن، مذہب، تعلیم، جمہوری حکومت وغیرہ کی وضاحت۔

۲۔ پاکستانی و غیر پاکستانی (غیر مسلم اقوام ہند) کے باہمی تعلقات کی افزائش کے امکانات پر بحث۔

۳۔ مسلم انجمنوں و دیگر چھوٹے چھوٹے سیاسی و سماج سدھار ادارہ جات کے غلط سیاسی تصورات کا اظہار اور ان کی غلط روی پر تنقید و مشورہ ترقی و تعمیر وغیرہ۔

۴۔ برطانوی وزارتی کمیشن کی پیش کردہ آزادی پر تنقید و تلقین قبولیت۔

۵۔ پاکستان سے ہندوستان کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔

۶۔ بغیر ہندو مسلم اتحاد کے ہندوستان کامل طور پر آزاد نہیں ہو سکتا۔

۷۔ مکمل تشریح مجالس قانون ساز و وزراء وغیرہ۔

۸۔ وضاحت صوبہ داری و مرکزی حکومت و اختیارات راعی و رعایا، تشریح ہندو مسلم فساد۔

ڈراما فنی اعتبار سے خصوصیت کا حامل نہیں اور اس میں کئی کئی صفحات پر مشتمل طویل طویل خشک مکالمے فنی خوبیوں سے دور کر دیتے ہیں۔ درج بالا مقاصد اور مسائل کی تشریح کرنے اور کہانی اور

واقعات کو بیان کرنے کے لیے ڈرامے کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور ڈرامے میں، جو پچاس سے زیادہ صفحات پر محیط ہے، شروع سے آخر تک تبلیغ کے مقصد کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کے تمام کردار مسلمان ہیں جو برِ عظیم کے ہر اس صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مسلمان قابل ذکر تعداد میں تھے۔ ڈرامے کا مقام ایک اصلاحی انجمن موسوم بہ انجمن تنظیم المسلمین ہے۔ اس کے دو مناظر، ایک تنظیم المسلمین کی مجلس عاملہ کا اجلاس اور دوسرے ارکان مجلس عاملہ میں پاکستان کے متعلق مباحثہ پر مبنی ہے۔

۲-طنز و مزاح میں آزادی کا جذبہ

اُردو ادب میں طنز و مزاح کا ابتدائی دور ہجویات، شہر آشوبوں اور دوسری نظموں پر مشتمل ہے، جن میں اعلیٰ درجہ کی طنزیات و ظرافت کے نمونے محض چند نظموں کی حد تک محدود ہیں اور اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ سودا نظیر یا اکبر کا نام لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے مضامین کی وسعت اور تنوع کے ساتھ ساتھ فنی محاسن بھی پیش کیے۔ لیکن قدیم دور میں، خصوصاً شاعروں میں، مذکورہ شعرا کی کاوشوں کے باوجود بھی لامحدود گنجائشیں باقی ہیں۔ اُردو میں طنز و مزاح کے دورِ جدید کی ابتدا کے آثار بالاشبہ غالب کے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ غالب کی تحریر کا نگریس شوخی، رنگینی، بے ساختگی، بوقلمونی، قوت ایجاد کی مثال، بالحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے، کہیں نہیں ملتی۔

غالب کے خطوط کے بعد اودھ پنچ کی ظرافت سامنے آتی ہے۔ لیکن اس سے قبل مولوی نذیر احمد اور سیّد احمد خاں کا ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ظرافت کے نمونے نذیر احمد کی تقریباً تمام تصانیف میں ملتے ہیں۔ لیکن عنوان زیر بحث کے تعلق سے ان کی کاوشیں ابن الوقت میں زیادہ مستحسن ہیں۔ اس میں ابن الوقت کا کردار اُنھوں نے جس صورت میں پیش کیا ہے اس سے ان کی تحریر کا رنگ بھی شوخ ہوگیا ہے۔ ابن الوقت کے کردار کے تعلق سے نذیر احمد نے ایسے شرفیوں کے کردار پر بھی بھرپور طنز کیا ہے جو مغربی تہذیب کے دل دادہ ہوتے ہیں اور اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک اجنبی تہذیب کو اپنانا چاہتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے بھی ایسے پہلو ابن الوقت کے کردار میں نظر آتے ہیں جو طنز کا انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کے کردار کو نشانہ بنا کر نذیر احمد نے بیک وقت اپنی قوم کے لیے ایسے افراد اور پھر انگریزی تہذیب دونوں کا تمسخر اُڑایا ہے۔

سیّد احمد خاں کی بعض تحریروں میں جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں اور ان خطوط میں جو اُنھوں نے انگلستان سے لکھے تھے، طنز و ظرافت کے کئی نمونے ملتے ہیں، اور ان میں مصنف کے

زہرخند کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اودھ پنچ دراصل سیّد احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کا ردِ عمل تھا۔ کا مقصد مشرقی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی مدافعت، مغرب کی مادی اور الحالی تہذیب، انگریز نوازی، انگریز پرستی اور غلامانہ ذہنیت کی مخالفت اور تنقید تھا۔ اس مقصد کے لیے اُودھ پنچ نے طنز و مزاح کی روش اختیار کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے یہ ایک اعلیٰ اور مفید کام تھا، اور اس نے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیابی حاصل بھی کی، لیکن طنز و ظرافت کا کوئی اعلیٰ معیار قائم نہ کر سکا۔ اس کے باوجود اس وقت کے معاشرے اور اس وقت کی صورتِ حال کو پیش نظر رکھ کر اودھ پنچ کے ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات[۱] کا جائزہ لیا جائے تو بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ اس رسالہ نے اُردو زبان میں پہلی مرتبہ ایک مقصد کے تحت بھرپور طنزیہ انداز اختیار کیا۔ اور ایک ایسے وقت جب ماحول میں انقلاب انگیز تبدیلیاں ظاہر ہو رہی تھیں، فضا کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے یہ پہلا اخبار تھا کہ جس کا ایک مستقل مقصد اور مسلک تھا، اور جو قومی خدمت کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے، جو اپنے صوبہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے رکن تھے۔ علی گڑھ تحریک اور سیّد احمد خاں کی حکمت عملی کے ہمیشہ خلاف رہے۔ نظام معاشرت میں قدامت پرستی کے قائل اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور مرتے دم تک اس کے حامی رہے[۲] علی گڑھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر سیّد احمد خاں کو ''پیر نیچر'' کا خطاب دیا۔ پردے کی اصلاح اور تعلیم نسواں کے متعلق جو تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھی، اس کی شدت سے مخالفت کی۔ دراصل مذہبی اور قومی رسم و رواج کی اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا روّیہ زمانہ شناسی کی رفتار سے الگ تھا۔ اس کی سیاسی خدمات قابل توجہ ہیں۔ ابتدا سے عوام کا ترجمان اور حکومت کا مشیر تھا۔ کانگریس کے قیام سے قبل اس نے عوام کے خیالات کی نمائندگی کی۔ بعد میں کانگریس کی تحریک کا حامی اور مبلغ ہوا۔ لیکن معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اس کا تمام زور علی گڑھ تحریک کی مخالفت میں صرف ہوا۔[۳] اس کے لکھنے والوں میں اس کے مدیر منشی سجاد حسین کے علاوہ رتن ناتھ سرشار، اکبر الٰہ آبادی، نواب سیّد محمد آزاد، بابو جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان تمام لکھنے والوں کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اُودھ پنچ کے مزاح نگاروں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ خاص طور پر اپنے ماحول کی تہذیب و معاشرت کے

مختلف پہلو سماجی، قومی اور سیاسی مسائل ان کے مضامین کا حصہ رہتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور اکبراللہ آبادی کا ذکر گزشتہ عنوانات میں آ چکا ہے۔ دوسرے مصنّفین میں سے کئی ایسے ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص شوخ اور ظریفانہ انداز میں سیاسی مسائل پر قلم اٹھایا اور بعض مقامات پر بے باکی اور جرأت کا اظہار کیا ہے۔

منشی سجاد حسین ادب میں حاجی بغلول، طرحدار لونڈی اور احمق الدین کی تصنیف کے سبب اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اپنے مخصوص دل چسپ اور لطیف طنز و مزاح کے انداز میں اُنھوں نے اودھ پنچ میں جو خطوط ہندوستانی روٴسا کے نام لکھے اور ''لوکل'' اور ''موافقت زمانہ'' کے عنوان کے تحت ان کے جو مضامین شائع ہوئے، ان میں ملک کے سماجی اور سیاسی حالات پر زبردست طنز کے حامل خیالات ہیں۔ کانگریس کی حمایت اور اس کے مخالفین کی مذمت پر ان کا مضمون ''انڈے بچے والی چیل چلہاڑ'' خاصا مشہور ہوا تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنوٴ مرحوم میں جان تازہ تازہ پھونکنے، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں۔ اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموہی بنی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجیے۔ بولیں اور بیچ کھیت بولیں۔[۳]

ان کے خطوط کے طویل سلسلے میں اس وقت کے بے پناہ سماجی اور سیاسی مسائل موجود ہیں۔ گلیڈاسٹن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

... آج کل ہزاروں دوست ہیں تو لاکھوں تمہارے دشمن، دس اچھا کہتے ہیں تو بیس برا بھی۔ مگر یہ سب ہوا کے رخ اپنا جہاز رانے چلاتے، انصاف کا انجن ہرگز کام میں نہیں لاتے۔ لیکن یہ تمہارا اور اپنی ملکہ معظمہ کا سچا، بے میل، پکا، سولہ آنے ڈبل دوست، خیر خواہ جان نثار اور اودھ پنچ ان عیوب سے ایسا دور ہے جیسا روس، ایران یا ہندوستان کی نمک حرامی سے۔[۵]

ملکہ معظمہ کو لکھتے ہیں:

... لارڈ رنڈالف چرچل جو بدقسمتی ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں بجائے خود تیز آدمی ہیں۔ مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے۔

معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ اور میری رائے میں تم بھی اس کی ... سمجھو لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم کی دست و برد سے اعزاز قیصری کو محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔[۶]

لارڈ لینسڈ اون کو لکھتے ہیں:

......یاد رکھیے گا کہ ہم کو یہ شکایت بھی ہے کہ آپ کی گورنمنٹ نے اپنے حدود اختیارات کی وسعت کو بھی ہم لوگوں کے فوائد پر وقف نہیں فرمایا''۔[۷]

منشی سجاد حسین کے دوسرے مضامین ''نیچر کا مارشل لاء'' اور ''مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے'' اپنے زمانے کی خارجہ سیاست کی طنز و مزاح کے رنگ میں اچھی مثالیں ہیں۔

پنڈت جوالا پرشاد برق نے زیادہ تر ترجمے کیے۔ لیکن ایسے طبع زاد مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر اپنے جذبات کی شدت ظاہر کی۔ ان کا مضمون ''البرٹ بل'' جو اس بل کی مخالفت میں ہے، مثالی تحریر ہے۔ اس کا نمونہ درج ذیل ہے:

......اختیار ملا مگر برائے نام، مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے، پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو دشمنوں سے سبق لو کچھ کھو کے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر ہم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا۔ مگر شر ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو سچے خیر خواہ سرکار ہیں۔ مگر ہائے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی۔ کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر کنگارڈٹ کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا......[۸]

اس قبیل کے اہم طنز نگار نواب سیّد محمد آزاد ہیں۔ مقصد سے پُر خلوص لگاؤ کی وجہ سے ان کی تحریروں میں بڑی گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کا مقصد قدیم و جدید کی کش مکش میں اعتدال کی راہ تلاش کر کے معاشرے کی رہنمائی کرنا تھا۔ جذبے اور احساس کی شدت بھی ہر جگہ موجود ہے۔ تلخ ترین حقائق کو بھی شوخی اور ظرافت کے ساتھ پیش کیا ہے اپنے مضامین میں اپنی تہذیب کے علاوہ مغربی تہذیب کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنے خطوط میں، جو لندن سے لکھے گئے تھے، مغربی تہذیب کا تمسخر اڑایا۔ اپنے ناول ''تحریفات'' کے انداز میں ایک ''ڈکشنری'' بھی تحریر کی جس میں انتہائی ظریفانہ پیرایہ میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں[۹] اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

پولیسی (حکمت عملی)......ممبران پارلیمنٹ کے آپس کا ناز و نیاز، کمزور کو دبانا، زبردست سے ڈرنا...... مارتے کے آگے اور بھاگتے کے پیچھے جانا، کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا۔

پارٹی فیلنگ (پاسداریِ جماعت): مرغ بے ہنگام کی طرح چلانا۔ غول بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قوموں کو راہ راست سے بہکانا۔ بے ہودہ شکایت، ناجائز تہمت، وزارت کے کھونے کا صدمۂ جگر گداز، کوئی سنے یا نہ سنے اپنی کہے جانا......۔

پارلیمنٹ (جلسۂ مدبران ملکی): مدبروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تماشا دکھانے کا تھیٹر۔ باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور۔ انصاف آموزی کا وہ سکول جہاں روسیوں کے ظلم ناحق کے انسداد کی کوئی عمدہ سبیل نہیں۔

یورپین کنسرٹ (یورپ کے سلاطین کا اتفاق) تمدن کی آراستہ فوج، دنیا کی آزادی کا ضامن مشرقی مسئلہ کے حل کرنے کی کھرل، کمزور کو زور آور اور زور آور کو کمزور بنانے کی ولایتی کل، کمزور سلطنتوں کے لیے بٹوارے کا نیا قانون ......''[۱۰]

اسی موضوع کی ایک اور تحریر ''لوکل سیلف گورنمنٹ کی نئی چمکتی ہوئی ڈکشنری'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔[۱۱] ان کی تحریروں بعنوان ''روئداد اجلاس جنجال کونسل'' اور ''گرما گرم تار کی خبریں'' ہندوستان کے سیاسی مسائل کو بیان کرتی ہیں۔

تربھون ناتھ ہجر نے اپنی تحریروں کے ذریعے بُری عادتوں اور اعمال قبیحہ کی اصلاح پر زور دیا۔ احمد علی کسمنڈوی نے اودھ کی معاشرتی زندگی کی خرابیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ عبدالغفور شہباز نے جو اودھ پنچ کے حلقہ تحریر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، مذہب کے روایتی تصور کی بعض رسوم و روایات پر تنقید کی۔[۱۲]

بحیثیت مجموعی اودھ پنچ سے تعلق رکھنے والے طنز نگاروں کا میدان ان کا اپنا ماحول اور معاشرہ تھا۔ ایک ایسا ماحول اور معاشرہ تھا، جو آئے دن کے ہمہ گیر انقلابات سے دوچار ہو رہا تھا اور جس میں سیاسی اور سماجی کش مکش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس ماحول میں اودھ پنچ کے ظرافت نگار اپنی تحریروں کو اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس قسم کی فضا میں ان کی ظرافت کا گہرا رشتہ لیے ہوئے ہے۔

اُودھ پنچ ایک باقاعدہ تحریک کا پیش رو ثابت ہوا۔ سارے ہندوستان میں ''پنچ'' اخبارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی طرح کا ایک اخبار ''اَلپنچ'' تھا، جو پٹنہ سے جاری ہوا۔ طنز و ظرافت کے لب و لہجہ میں اس اخبار نے بھی اپنے عہد کے ہنگاموں اور مسائل کو پیش کیا ہے۔ ''سوال از آسمان و جواب از ریسمان'' کے عنوان کے تحت انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کے احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتا تھا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

حساب و جبر و مقابلہ

سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں اور انگریز دن میں کتنی دفعہ اور کون کون سے وقت کھاتے ہیں؟

جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیوں کہ اس سے زیادہ بیچاروں کو میسر نہیں۔ اور غریب بیچارے کبھی دو دن میں اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں انگریز دن میں پانچ مرتبہ......

سوال: انگریزی کھانوں میں پڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: پڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان سے گیہوں روپے من کے حساب سے خرید کر انگلینڈ چلان ہوتا ہے۔ وہاں اس کا مائدا (میدہ) بنتا ہے اور وہاں سے روپے سیر کے حساب سے یہاں روانہ کیا جاتا ہے۔ اسی مائدے میں گھی، دودھ اور چینی ملا کر آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔ جب تیار ہو جاتا ہے تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں......[13]

تاریخ

سوال: خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لیے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں۔ جب چاہے قید کیجیے اور جب چاہے پھانسی دیجیے۔ مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیت دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پرواہ نہیں۔

سوال: سزائے حبس دوام بعبور دریائے شور کن مجرموں کے لیے مقرر کی گئی ہے؟

جواب: پہلے تو یہ سزا صرف دو تین مجرموں کے لیے تھی۔ مگر دو جرم اس میں اور بڑھائے گئے ہیں۔ ایک تو کسی انگریز سے مقابلہ کے ساتھ باتیں کرنی، دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر نکتہ چینی کرنی۔[14]

یہی اخبار سال نو کی آمد پر ایک جگہ لکھتا ہے:

......ہاں خوشی تو جب کرتے کہ سال کے بدلتے اس بے چارے مفلس، آفت زدہ ہندوستان کی قسمت پوری بدل جاتی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ٹیکسوں کی بھرمار کے بدلے کچھ اپنے پیارے انگلینڈ سے لا کر یہاں کی غریب رعایا کی دست گیری کرتی۔ یا ان کی بے چارگی پر ترس کھا کر یہ سب تباہ کن قانونی دفعوں کو بدل ڈالتی تو البتہ ایسی لمبی چوڑی خوشی کا موقع تھا۔[15]

اس پہلے دور کے بعد اُردو نثر میں طنز و ظرافت کا عبوری دور آتا ہے[16] اس دور میں طنز و ظرافت کے مزاج میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور اگر چہ اس دور میں بھی طنز کا روئے سخن وہی ہے جو اودھ پنچ کے ظرافت نگاروں کے دور میں تھا۔ تاہم کہنے کی باتیں بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں کہی گئی ہیں اور اخلاق اور تہذیب اور وضع داری کا خیال رکھا گیا ہے۔ اودھ پنچ کے طنز کا رنگ سیاسی اور ہنگامی تھا۔

عبوری دور کے طنز کا رنگ نیم سیاسی اور جدید دور کا رنگ غیر سیاسی یا سماجی ہے۔[17] عبوری دور کے ظرافت نگاروں میں مہدی الافادی، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی۔ عالم بھی ہیں اور قومی رہنما بھی۔ اُنھوں نے خالص ادب کے طور پر بھی مزاح تخلیق کیا اور اپنی فطری اُپج کے میلان کو بھی ظاہر کیا۔ محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ملا رموزی ایسے صاحب قلم ہیں جنھوں نے اپنی ظریفانہ تحریروں کے ذریعہ مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی سیاسیات اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاسی ہل چل اور مسائل کی عکاسی ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی تحریروں کا مقصد محض اپنی قوم کے کردار کی اصلاح تک محدود رکھا۔

میر محفوظ علی خود اپنی وضع قطع سے مشرقی روایات کا زندہ نمونہ تھے اور اپنی تحریروں میں ان اقدار کے فروغ پر زور دیتے تھے جو ان کے خیال میں ان روایات کی اساس تھے۔[18] متعدد رسالوں کے علاوہ ہمدرد میں فرضی ناموں سے مستقل لکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ماحول کی عکاسی بہ خوبی موجود ہے۔ اودھ پنچ کے مقابلہ میں ان کا لب ولہجہ زیادہ متین وسنجیدہ ہے۔ وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ گہری سنجیدگی کے باوجود مزاح کے نقوش بھی واضح ہیں اور جو زیادہ تر اسلوب کی رنگینی، شگفتگی اور بے ساختگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی مباحث ان کے متعدد مضامین میں موجود ہیں۔ اُنھوں نے اپنے مخصوص خیالات ''انجمن تجاہل عامیانہ کا غیر معمولی جلسہ''، ''کارروائی جلسہ''، ''حاجی صاحب کی تقریر اور کارروائی جلسہ''، ''حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر''، ''بلبلان اسیر کی رہائی''، ''مسٹر صاحب دین'' وغیرہ میں ظاہر کیے ہیں، مثلاً علی برادران کی رہائی پر ''بلبلانِ اسیر کی رہائی'' میں باپ بیٹے سے مکالمے تحریر کرتے ہیں:

بچہ: ابا جان یہ کیا کام کرتے ہیں؟

باپ: یہ اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔

بچہ: تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سلف لا دیتے ہیں؟

باپ: ہماری محبت تو انھیں ایسی ہے کہ اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ لیکن اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں۔

بچہ: تو کیا یہ بوجھ اٹھاتے ہیں؟

باپ: (آنکھوں میں آنسو آ گئے) حقیقت میں بڑے بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں۔

بچہ: اچھا۔ میں جان گیا۔ یہ حمال ہیں، جب ہی ایسے موٹے تازے ہو رہے ہیں۔[19]

خواجہ حسن نظامی ہر موضوع پر لکھ سکتے تھے۔ اُنھوں نے زیادہ تر اپنی تحریروں میں اجڑی تہذیب کا رونا رویا ہے۔ کہیں اپنے عہد کے تہذیبی اور سیاسی مسائل بھی زیر بحث لائے ہیں۔ ''کم ان مائی ڈ سنہ ۱۶ء'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مجھے خطاب چاہیے نہ کونسل کی ممبری، میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر اور کنویں کا پانی اور تن کا موٹا جھو کپڑا چاہتا ہوں۔ کنویں کا پانی اس واسطے کہ نل کا پانی لوہے کے منہ سے آتا ہے اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمیوں کا خون بہاتا ہے اور میں خون خرابے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ لوہے کا پانی پی کر کہیں مجھ میں بھی فتنہ و فساد کا اثر نہ آ جائے۔

''مقتول کا رقص'' میں لکھتے ہیں:

کل میدان جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو زانو پر رکھا اور اس کے رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ ملک الموت نے کہا، اس کو میری گود میں دے دو۔ میں نے کہا ٹھہرو، اس کے رقص کی سیر تو کر لوں۔ فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے آپ کو اس میں مزہ آتا ہے۔ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف ہے۔

سلطان حیدر جوش کی بعض تحریروں میں شگفتگی اور طنز کے بڑے منفرد نمونے ملتے ہیں۔ ان کا طنز زہرناکی کی حد سے قریب ہے۔ اس کی یہ کیفیت ان موقعوں پر نمایاں ہے جہاں مغربی تہذیب کو ہدف طنز بناتے بناتے وہ سنجیدہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وہ مغربی تہذیب اور سیاسی بدعنوانیوں پر تنقید میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔[20]

پریم چند کے بعض افسانوں اور ان کے چند ناولوں میں طنز و ظرافت کے کچھ عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو سماجی شعور ہے وہ بیشتر معاصرین کی تحریروں میں نہیں۔ ان کی نظر اپنے ماحول کی تمام تر ناہمواریوں پر ہے اور وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے ماحول اور معاشرے کے قبیح اور تلخ پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ماحول کا پُر خلوص تجزیہ اور کرداروں کی بداعمالیوں کی اصلاح کا انداز ان کی تحریروں میں طنز کی تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں جہاں معاشرے کے مسائل اور ناسور کا ذکر ہوا ہے وہاں ان کا زہر خند صاف نظر آتا ہے۔

سجاد حیدر انصاری کے مزاح پر بھی بظاہر سنجیدگی اور متانت کا دبیز خول چھایا ہوا ہے۔ ان کے طنز کا نشانہ زیادہ تر انسان کی اخلاقی و مجلسی زندگی کے ضوابط اور ان سے اس کا انحراف ہے۔ ان کے طنز کا مقصد ایک محتسب کی حیثیت سے ماحول کی بے اعتدالیوں کو مٹانا ہے۔ ان کے موضوعات میں خیر و شر کی کش مکش زیادہ حاوی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح اپنی طرزِ تحریر میں منفرد اور بے مثال ہیں، اسی طرح کے ایک اعلیٰ درجہ کے طنز نگار بھی ہیں اور ان کی یہ خصوصیت منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ ان کی شدت احساس اور قوت بیان نے ان کی تحریر کو ایک عجب شان عطا کر دی ہے۔ ان کا یہ انداز الہلال اور البلاغ کے مضامین میں خاص نمایاں ہے۔ طنز و مزاح کے سلسلے میں الہلال کا مستقل شذرہ ''افکار و حوادث'' بڑا اہم ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا آزاد مسائل حاضرہ پر بحث و مناظرہ کرتے تھے۔ اس میں مزاح کے فقدان کے باوجود طنز اور رمز کے بہت سے نمونے مل جاتے ہیں۔ مسجد کان پور کے خونی حادثہ کے سلسلے میں سر جیمز مسٹن کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

... ہم ہز آنر کی مطلق العنان حکومت و فرمان روائی پر اس دور قانون و دستور میں صبر کر سکتے ہیں۔ ان کو اپنے ایک واعظ اور ملا کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں۔ اگر علی گڑھ کالج میں ان کی ضرورت پیش آئے، ان کو اپنا شیخ الاسلام اور مفتی و فقیہ بھی مان لیں گے جیسا کہ وہ کان پور کے متعلق فتویٰ دے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ مان لینے کے لیے تیار ہیں، مگر خدارا ''خوف الٰہی'' کے وعظ سے تو ہمیں معاف ہی رکھیں۔[21]

اپنی ایک ابتدائی تحریر حدیث الغاشیہ کے عنوان کے تحت اسلامی قومیت کے بارے میں لکھا تھا:

... صرف کعبہ ہی کے کیوں ہو رہیے، جب بت کدے سے بھی رسم و راہ ہو سکے؟ ایک ہاتھ میں زنارِ برہمن لیجیے اور دوسرے ہاتھ میں سبحۂ زاہد۔ یعنی ایک ہاتھ ایمان سے ملائیے اور دوسرا [illegible] وقت مصافحۂ نفاق، یعنی ایک ہاتھ میں ''جام غلامی'' اور دوسرے میں ''سندان حریت''

ان کی طنزیہ تحریروں کی ایک اور مثال:

... اتنے میں خبر اڑی کہ ہز آنر کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے [illegible] قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور ان نقرئی چمچوں اور کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ نہیں، شکست کا اعتراف ہے۔

جو خطیبانہ ہیجان اور جوش ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے، وہ مولانا محمد علی کی تحریروں میں بھی کسی حد تک موجود ہے۔ ہمدرد کے بعض مضامین میں وہ اسی طرز نگارش کا سہارا لے کر ملکی مسائل پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں نمکینی اور مزاح کی چاشنی ہے۔ اُنھوں نے ایک ایسے وقت میں قلم اٹھایا جب سیاسی مسائل میں بولتے ہوئے حالات کی وجہ سے بے شمار الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں، ایسے میں ایک خاص انداز سے حالات پر تبصرہ کر کے اُنھوں نے ایک قومی خدمت انجام دی ہے مضمون ''سائمن کمیشن'' میں لکھتے ہیں:

اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں وہ کمیشن ہرگز قبول نہ ہوتا، اس لیے کہ اگرچہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخری فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا، بلکہ ہندو مسلمان دونوں، بیویاں بن جاتے اور سوکنوں اور بیرنوں کی طرح لڑتے اور فیصلہ میاں کرتے۔ اگر ہم دونوں اتفاق و اتحاد بھی کرتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا، وہی عربوں کی مثل صادق آتی ہے'' ہر کام میں گھر والی سے مشورہ ضرور لیا کرو مگر کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو۔[۲۲]

ایک اور مضمون ''سائمن کمیشن اور ہندوستان'' میں تحریر کرتے ہیں:

حسرت صاحب چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاک خانہ بنایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک، جسے حسرت صاحب اس کمیشن کے منہ پر پھینکنے کے لیے ہم سے کہتے ہیں، ہم ایک پوسٹ کارڈ اس ڈاک خانہ میں ڈال دیں جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے، یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ رفروری کی ہڑتال ہی ہو سکتی ہے۔[۲۳]

ملّا رموزی کے مزاح میں تنوعِ مضامین زیادہ ہے۔ ان کا موضوع صرف سیاست ہی نہیں، بنیادی طور پر ان کی فطرت ظریفانہ تھی، اور اس کے ساتھ اُنھوں نے سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے نکتوں سے بحث کی ہے۔ ان کی ظرافت زیادہ تر سیاسی مسائل سے متعلق ہے۔ اُنھوں نے اپنی ''گلابی اُردو'' کے ذریعہ بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ وہ کسی موضوع پر بھی لکھیں ان کی تحریر میں معاصر سیاسی واقعات کے اشارے جھلکتے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور ان کے اثرات کے شدید مخالف ہیں:

''اے انگریزی تیل سر میں ڈالنے والو!

خبرداری اور آگاہی ہے تمہارے واسطے ان اڈیٹروں اخبار اُردو کے کہ نہیں جواب دیتے وہ مبلغ ایک برس تک نامہ نگاروں اور خریداروں اپنے کو ساتھ بہانہ مصروفیتوں اپنی کے اور لائڈ جارج وفد

مسٹر محمد علی کو ساتھ تعصب اور گھمنڈ قوت حکومت اپنی کے۔ اگرچہ دم بیچ ناک کے کر دیا جماعت سن فین آئرلینڈ نے فوجوں برطانیہ کا (وغیرہ وغیرہ)۔[۲۴]

ایک دوسری مثال:

خدا جانے یہ کنگ پرائمر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں۔ اور تو کچھ نہیں، لباس کی یگانگت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہ گزرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجیے میں ہندو ہوں، کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔[۲۵]

طنز و مزاح کے اس عبوری دور کے بعد ماحول کی انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا بھی دورِ جدید شروع ہوا ہے۔ اس دور میں مغربی ادب کے مطالعہ، عالمی سیاسی تحریکوں سے اثر پذیری، تعلیم کی ترقی اور ملکی سیاسی تحریکوں نے اُردو ادب کو بھی جدید رجحانات دیے۔ اس دور میں نہ صرف مغربی طنز و ظرافت کے مختلف حربوں کو استعمال کرنے کے بڑے واضح رجحانات ملتے ہیں بلکہ مزاح، طنز، تحریف اور تلخ اندیشی کا افق بھی یکلخت وسیع تر ہو گیا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں نے زندگی اور معاشرے کی ناہمواریوں کو بڑی گہری نظروں سے دیکھنا اور دکھانا شروع کیا۔ سیاسی جدوجہد کے ماحول میں، ان میں سے بیشتر نے اپنی تحریروں کو اس کے اثرات سے مزین کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج، میاں عبدالعزیز فلک پیما، احمد شاہ بخاری پطرس، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، حاجی لق لق، اس دور کے ممتاز مزاح نگار ادیب ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنے عہد کے سیاسی رجحانات اور واقعات و مسائل کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بنایا۔ بعض نے تحریکِ آزادی کے بعض مخصوص واقعات اور رجحانات مزاح کے ساتھ پیش کیے اور بعض نے استعماری طاقتوں کو تنقید کا ہدف قرار دیا۔

عظمت اللہ خاں کے بعض مضامین ایک متین اور سنجیدہ ظرافت کے حامل ہیں۔ وہ اپنے خیالات و تاثرات کو بڑے شگفتہ اور طنزیہ انداز میں قاری تک پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کو اس انوکھے انداز سے زیرِ بحث لاتے ہیں اور طنز نگاری کے سنجیدہ ترین لمحات میں بھی اس خوبی سے ظریفانہ انداز کو برقرار رکھتے ہیں کہ قاری کی توجہ ہٹنے نہیں پاتی۔ اس سلسلے میں خصوصاً ان کے مضامین "لڑیا خانہ"، "اٹکرلیس"، "ڈیڑھ اینٹ" ہیں جن میں عصری سیاسی مسائل نظر آتے ہیں۔

''ڈیڑھ اینٹ'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ امن کا دور دورہ ہوا۔ لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیراتِ ہند مرتب کیا اور دوسری طرف علم مغرب کی گنگا بہائی۔[26]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

مشہور ہے کہ کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ آپ کو ہندوستان کا کون سا میوہ بھایا؟ تو اس ستم ظریف نے ایک لفظ میں لارڈ مارلے کی ساری ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی تحقیقات بھر دی۔ اس نے ہنس کر صرف یہ کہا ''پھوٹ''۔[27]

اسی مضمون میں اسلامی قومیت پر اظہار خیال کرتے ہیں:

مسلمانوں پر بھی رفتہ رفتہ کانگریس نے ڈورے ڈالنے شروع کیے کہ آخر ان کی بھی تھاہ لینی چاہیے۔ مسلمانوں کے اجسام کو تو ہندوستان میں پایا مگر ان کے دل اور ان کی روح کا سراغ چلایا تو حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ صدیوں کے رنگ و استخوان کا تبدل زبان اور گوشت پوست کا تغیر بھی ان کی روح اور ان کے دلوں کو عرب اور ایران، افغانستان اور ترکستان کی خاک سے نہیں تڑا سکا۔[28]

ڈیڑھ اینٹ کا مقصد کانگریس کی حکمت عملی پر طنز تھا۔ اس میں وہ گاہے گاہے اسی طرح سے مسلمانوں کی علاحدہ اسلامی قومیت کے تصور کو بیان کرتے رہے ہیں۔ اپنے مضمون ''خیالی پلاؤ'' میں لکھتے ہیں:

قومیں بھی مجموعاً خیالی پلاؤ پکاتی ہیں، اور یہ خیالی پلاؤ زیادہ اہم اور بیشتر تاریخ کے بنانے والے ہوتے ہیں۔ برطانوی قوم فی الحال ایک جہاں وسعت ابد مدت شہنشاہیت کے خیالی پلاؤ میں مگن ہے اور ہندوستان کی جنین مثال آگے چل کر ہونے والی قوم کا خیالی پلاؤ سوراجیہ ہے اور یہ دونوں خیالی پلاؤ تاریخ عالم کے نئے ابواب معرض تحریر میں لانے والے ہیں۔[29]

''گڑیا خانہ'' کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادر وطن اور سوراج کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل خانہ جانا فخر سمجھتے ہیں، اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ اُنھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے؟ برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے۔[30]

ان کے مضامین کا یہ عام انداز ہے اور اُنھوں نے ایسے کئی مضامین تحریر کیے۔

مولانا ظفر علی خاں کا طنزیہ انداز نثر کے مقابلے میں شاعری میں زیادہ بہتر اور موثر ہے۔ نثر میں شاعری کی طرح سے ہیجان اور جوش نہیں۔ یہاں ان کا آہنگ دھیما ہے۔ جذبات میں شدت

نہیں۔ زمیندار کے فکاہی شذرات میں مختلف فرضی ناموں سے بھی لکھتے رہے۔ وہ بھی سیاسی طنز کی راہ میں گامزن رہے۔ زیادہ تر اُن کی تحریریں ہنگامی حیثیت رکھتی ہیں۔

میاں عبدالعزیز فلک پیما اپنے خیالات و نتائج کو بڑے شگفتہ اور دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر ایک طنز نگار ہیں۔ ان کی یہ طنز نگاری بعض مقامات پر تلخ لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ظریفانہ رنگ بھی ان کی تحریر کا امتیازی وصف ہے۔ زندگی کے مسائل اور معاشرے کی روایات کو نئے ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سیاسی زندگی کے انقلابات اور اس کے اثرات اور ملک کی سیاسی جدوجہد کے مختلف پہلو اُن کے مضامین میں سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ موضوعات ان کے کئی مضامین میں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں ''شملے کی سڑکیں'' میں لکھتے ہیں:

> شملے کی سڑکیں لاکھ سر پٹخیں، حکومت کی مغرور رکشا کے لیے آٹھ نہیں آٹھ کروڑ ننگے پاؤں موجود ہیں[۳۱]

مضمون ''عدالتیں'' میں ہندوستان کی عدالتوں کے نظام پر کڑی تنقید کی ہے۔

> پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔
>
> چلو پکوڑی چند اور قرض محمد
>
> چلو کروڑی مل اور فاقے خاں
>
> چلو لالہ گروی مل اور مرہون الٰہی
>
> یہ چل چلاؤ غدر کے بعد شروع ہوا تھا۔ اور شاید قیامت تک رہے[۳۲]

''شیطان اور بزرگ'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ..... جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگریسی یا مہا سبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے۔ شیطان کے لیے بھی ایک نئی دل چسپی ہوگی[۳۳]

اپنے ایک طویل مضمون ''فرانس اور ہندوستان'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ... کئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انھیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال یہاں تک پھیلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس ذلت سے نہ بچ سکے۔ آج کل انگریز بے چارے تختۂ مشق ہیں اصل منشا یہی ہے کہ جب باری باری سب قومیں ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شہنشاہی کرنے لگے۔[۳۴]

عبدالمجید سالک کی ظرافت سے فطری مناسبت نے انھیں اُردو طنز و مزاح میں ایک امتیازی حیثیت دے دی ہے۔ ان کے طنز و مزاح کی ابتدا زمیندار کے فکاہی شذرہ ''افکار و حوادث'' سے ہوئی۔ مزاحیہ اسلوب نے اس شذرہ کو اتنا مقبول بنا دیا کہ قریباً ہر اُردو اخبار نے اس کی تقلید میں فکاہی شذرات شروع کر دیے۔ جب سالک نے خود اپنا اخبار انقلاب نکالا تو ''افکار و حوادث'' بھی اس کا ایک جزو بن گیا۔ سالک نے اپنے اس کالم کو صرف سیاست تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ سماجی مسائل کو بھی طنز و مزاح کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ واقعات میں چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کر کے اسے مزاحیہ اور طنزیہ بنا دیتے تھے۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے، جو کبھی مدیر مدینہ، بجنور کی حیثیت سے یوپی میں گنگا کنارے آم کھایا کرتے تھے، لاہور سے ایک اخبار زمزم کے نام سے جاری کیا ہے۔ پالیسی تو وہی دھوتی پرشادوں کی سی ہے یعنی آپ حسب معمول کانگریسی ثابت ہوئے ہیں۔[۳۵]

جب ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگریس سے بدگمانی پیدا ہوگئی تو بعض مقامات پر کانگریسی ذہنیت کے مسلمانوں نے ایک نیا چولا بدلا۔ اُنھوں نے عام مسلمانوں کی ہم آہنگی تو اختیار نہ کی لیکن کانگریس سے اپنا تعلق بڑی حد تک توڑ لیا اور آزاد مسلم پارٹی، مسلم انڈی پینڈنٹ لیگ، آزاد مسلم لیگ، ریڈیکل مسلم لیگ، مجلس احرار وغیرہ کے نام سے جماعتیں بنالیں یعنی کانگریس کے ہم آہنگ بھی رہے اور فرقہ وارانہ اصول پر منظم بھی ہو گئے...... یہ لوگ حریت پرست کے حریت پرست رہے اور فرقہ پرور کے فرقہ پرور''۔[۳۶]

چراغ حسن حسرت نے بھی زیادہ تر فکاہی کالموں میں اپنی تحریر کے ذریعہ وقتی اور ہنگامی واقعات اور سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال پر تنقید کی۔ ابتداءً کلکتہ کے اخبار نئی دنیا میں کولمبس کے نام سے اور پھر زمیندار میں سندباد جہازی کے نام سے فکاہی کالم لکھے۔ ان کی طنزیہ تحریروں میں ان کے عہد کے بدلے ہوئے حالات اور سیاسی ہنگاموں پر مخصوص انداز سے نظر ڈالی گئی ہے۔ لاہور سے اُنھوں نے ۱۹۳۶ء میں سندباد جہازی کے فرضی نام سے شیرازہ کے نام سے ہفت روزہ ادبی فکاہی اخبار جاری کیا۔ اس میں حسرت کے علاوہ سالک، کرشن چندر، کنہیالال کپور، حاجی لق لق، ضمیر جعفری وغیرہ بھی جو بعد میں مزاح نگاروں میں اپنی امتیازی اہمیت کے بھی حامل ہوئے، عام طور پر لکھا کرتے۔ فکاہی کالموں کے علاوہ حسرت کی کتاب ''پنجاب کا جغرافیہ، منفرد مثال ہے جس میں اُنھوں نے اپنے زمانہ کے

پنجاب کی بعض مشہور سیاسی شخصیتوں اور تحریکوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

کوہ ممدوٹ: مشہور پہاڑ ہے جو اتحادی سطح مرتفع سے وادیٔ لیگ تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں چناں چہ جو برساتی نالے اس سے بہ نکلتے ہیں ان کی ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادیٔ لیگ دونوں کے باشندے فائدے اٹھاتے ہیں۔

کانگریسی ندی نالے: بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگریس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانہ میں بہ نکلی تھی۔ یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا بھی پانی آملتا تھا۔ بہرحال یہ صرف برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

دریائے کالی: ہندو مہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے ''کالی ناگ'' کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا اور ہندو مہا سبھا کی ترائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے..... کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو مہا سبھا کے ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ دریا کس علاقہ کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دھن بدیسی ہے۔ اس کا طاس جسے ''ٹریبیون'' کہتے ہیں، بہت زرخیز ہے''۔

حاجی لق لق کی نثر بھی اپنے دور کے ہنگامی سیاسی موضوعات کو پیش کرتی ہے۔ کئی برس مختلف اخبارات جیسے احسان اور زمیندار میں فکاہی کالم لکھتے رہے۔ حسرت کے ''شیرازہ'' کے مستقل لکھنے والے تھے۔ ان کے مزاح کا انداز قدرے عامیانہ ہے۔ سماجی مسائل اور سیاسی حالات پر خاصی تنقید کی ہے۔ حاجی لق لق کے افسانے اور ادبِ کثیف ان کی ایسی تحریروں کے مجموعے ہیں جن میں مختلف موضوعات اور مسائل پر ان کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔

شوکت تھانوی بڑے زُود نویس مزاح نگار تھے۔ اُنھوں نے ہر صنف میں اپنے اسلوب کو برتنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی تحریریں اسلوب و مزاح کی جملہ خصوصیات کی حامل ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور بساط کے بے شمار سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں کی ایک تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے۔ ان سے بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں اُنھوں نے معاشرے کی فطری کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ''سودیشی ریل'' ان کی مثالی اور شاید سب سے اچھی تحریر

ہے، اور ''لکھنؤ کانگریس سیشن'' میں۔ یہ دونوں تحریریں اس وقت کی سیاسی زندگی کی رفتار اور تحریکِ آزادی کی خامیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ سودیشی ریل کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا ''بندے ماترم'' کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ ''بھائی یہ کیا ہے؟'' جواب ملا کہ ''کیا سو رہے تھے؟'' ''خبر نہیں کہ سوراج مل گیا ہے''؟......اور ایک آزاد اور خودمختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا......

''لکھنؤ کانگریس سیشن'' کا یہ حصہ اس کے انداز کو ظاہر کرتا ہے:

ایجنڈے میں اب آزادیِ کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ یہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہوگئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کون سی جماعت لائے۔ نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں''

''شہزادوں نے کہا ''نہیں پہلے آپ''

نواب زادوں نے کہا ''پہلے آپ''

شہزادوں نے کہا ''واللہ یہ نہ ہوگا، پہلے آپ''، آخر اس پہلے آپ اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہوگئی اور اجلاس ختم ہوگیا۔

کنہیالال کپور کے طنز کا موضوع وسیع اور زندگی اور معاشرہ کی بہت سی غیر ہمواریوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے اکثر مضامین ان کے ماحول کی تمدنی اور مجلسی فضا کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنے نکھرے ہوئے ذوق مزاح سے فرد اور معاشرے کی باریک سے باریک غیر ہمواریوں کو دیکھ کر بیان کرتے ہیں۔ اپنے دور کی سیاسی تحریکوں اور ہل چل اور ہنگاموں پر بھی ان کی نظر تھی۔ اپنے مخصوص انداز سے وہ ان کی کوتاہیوں کو دیکھ کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور صرف چند پہلوؤں پر ان کی نظریں نہیں جمتیں بلکہ وہ ہر ہر گوشے سے اس کی باریکیوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ سیاسی قائدین کی کمزوریوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

......آپ نے سیاسیات کی باقاعدہ تعلیم کہاں حاصل کی؟ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی، مسٹر چرچل اور جوزف سٹالین سے کیوں افضل سمجھتے ہیں؟ آپ جیل جانے سے کیوں ڈرتے ہیں؟۔[۳۷]

ہندو مسلم مسئلہ کا حل اس طرح پیش کرتے ہیں:

حضور لیڈر...... دیکھیے اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنے مفاد کا بیمہ کسی امریکن کمپنی سے کرالیں۔ اس طرح وہ دونوں اس خطرہ سے بچ جائیں گے......

تو حضرات یہ ہے میرا نیا فارمولا......[۳۸]

ایک اور صورت میں اپنے طنز کا اظہار کرتے ہیں:

''کمال کر دیا مہاتما جی نے''

''پورے تین ہفتے کچھ نہیں کھایا''

''روحانی طاقت ہے''

''اوتار ہیں''

''میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ مہاتما کبھی مر نہیں سکتے''

''ایک دفعہ تو دُنیا کو ہلا دیا''

''میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت''

''یہی تو میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔

''تمہارا کیا خیال ہے تمام بزدلوں کو گولی مار دی جائے''

''ہاں''

''تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا''[۳۹]

رشید احمد صدیقی اُردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کی ظرافت کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی خامیوں اور کوتاہیوں پر تنقید کرنا ہے۔ وہ اپنی باتیں کھل کر کہنے کے بجائے اشاروں اور کنایوں میں زیادہ کہتے ہیں۔ ان کے ہر جملہ اور ہر فقرہ میں ایک دنیائے معانی پنہاں رہتی ہے۔ نکتہ آفرینی، خیال و نظر کی گہرائی، غیر معمولی ذہانت اور خوش مذاقی، معاشرے کے سیاسی اور تہذیبی مسائل پر بھی محیط ہے۔ ان کے چند جملے درج ذیل ہیں جن میں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ ظرافت اور طنز بھی ہے:

''عشاق اور انگریز دو ہی قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے یوں نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیرات ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی آوردہ ہیں اور ظاہر ہے

عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے آزاد ہیں۔[۴۰]

انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا اور عشاق کو شعرا نے۔ چناں چہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعرا اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے سوراج مل جائے، یعنی انگریزوں میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔[۴۱]

نان کو آپریشن کی مانند مغالطہ بھی ایک کیفیتِ دماغی ہے اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ نان کو آپریشن اور مغالطہ دونوں اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف کے متحمل نہ ہو سکے۔[۴۲]

ہر ہندوستانی کے دو پیدائشی حقوق ہیں۔ ایک ''بلوغ'' اور دوسرا ''سوراج''۔[۴۳]

اس وقت ہندوستان کو دو خطرات درپیش ہیں۔ ایک ''سوراج'' کا دوسرے تعلیم یافتہ بیویوں کا۔[۴۴]

نہرو رپورٹ سے پہلے ہندوستانیوں پر دو آفتیں مسلط تھیں۔ ایک ملیریا اور دوسری مس میو المعروف بہ مادرِ ہند۔[۴۵]

نہرو رپورٹ اور مادرِ ہند دونوں میں ایک نسبت ہے۔ ایک نے مسلمانوں کے حقوقِ سیاسی کو نظر انداز کیا۔ دوسرے نے ہندوؤں کی معاشرتی رسوم کی پردہ دری کی۔[۴۶]

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاست، تہذیبی مسائل لسانی قضیے سب کچھ موجود ہیں اور ان پر اُنھوں نے ایک معلم اور مفکر کی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ دراصل ان طویل معترضہ جملوں کی صورت میں ہے جو ان کے مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت ہے[۴۷] اپنے زمانہ کا قریبی مشاہدہ اور ہنگامی واقعات اور سیاسی ابتری پر ان کی تحریروں میں گہرا طنز موجود ہے:

دیکھتے نہیں کہ بھارت ماتا کے سپوت مہابھارت بچھا رہے ہیں ''اسلامی مجاہدین'' کی صرف آخری صف میدان جنگ میں باقی رہ گئی ہے یا قرونِ اولی کے مسلمان ''محمود و ایاز'' سمیت صف بند ہیں۔ یہ وقت سونے کا ہے یا گورنمنٹ کو گالی دینے اور خود مر جانے کا۔[۴۸]

کرشن چندر بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی اکثر تحریروں میں ایک ظریفانہ کیفیت موجود نظر آتی ہے۔ ان کے ظریفانہ رنگ میں طنز بھی شامل ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے زندگی اور معاشرے کے وسیع تر پس منظر کو پیش نظر رکھ کر اپنی طنز و ظرافت کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظریں گہری ہیں اور وہ ماحول کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی تحریروں کے موضوعات وسیع سے وسیع تر ہو کر ماحول کی ناہمواریوں تک جا پہنچے ہیں۔ ان کے مضامین ''سوراج سے پچاس سال بعد'' اور ''ہوائی قلعے'' اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

دیگر طنز و مزاح نگاروں میں اکثر ایسے نام ہیں جنھوں نے مزاحِ لطیف، خوش مذاقی اور شوخ طبعی کو تو ظاہر کیا لیکن معاشرے کے سیاسی ہیجانات اور ہنگاموں سے ان کی تحریریں زیادہ قریب نہ رہ سکیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں ہلکے ہلکے طنز کی کیفیات موجود ہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کے دل دادہ اور مغربی معاشرت و تمدن کی اندھی تقلید کے مخالف ہیں۔ لیکن مشرقی تہذیب و تمدن کی خامیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین ''دام خیال'' اور ''پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر'' اس قبیل کے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز ہونے کے علاوہ نثر نگاری میں بھی انفرادیت رکھتے ہیں۔ وہ اسلام کے شیدائی اور مشرقیت کے دل دادہ ہیں۔ ان کے طنز میں ظرافت کا فقدان اور نشتریت کی زیادتی ہے۔ قاضی عبدالغفار ادیب اور انشا پرداز کے ساتھ ساتھ طنز نگار بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں سیاسی ماحول کے اثرات بھی ہیں۔ وہ معاشرت میں مشرقی تمدن کے دل دادہ اور مغربی تہذیب کے نکتہ چین ہیں۔

ان سب ادیبوں کی تحریروں میں ایک خصوصیت کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے اور وہ ان کا جذبۂ اصلاح ہے۔ اس کا ایک عام سبب یہی ہے کہ طنز نگار فطری طور پر کسی نہ کسی حیثیت سے مصلح بھی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد محض ظرافت ہی نہیں بلکہ معاشرے میں موجود کوتاہیوں، کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنا ہے۔ ان مصنّفین کے دور میں معاشرتی اور سیاسی بلکہ معاشی انقلاب آئے جن سے پرانی روایات اور اقدار تبدیل ہونا شروع ہو گئیں چناں چہ جو اخلاقی یا معاشرتی ماحول ان کے اطراف موجود تھا، یا جس اخلاقی، سماجی اور سیاسی ماحول میں یہ مصنّفین زندگی گزار رہے تھے اسے وہ معیار کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اور معاشرہ یا سیاست میں انھیں جو بے راہ روی، انتشار یا کج روی نظر آئی اسے اُنھوں نے تمسخر اور تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ کوشش نثر کے علاوہ شاعری میں بھی کی گئی ہے لیکن یہاں اس کا جائزہ اس لیے نہیں لیا گیا کہ اس کے اہم اور نمایندہ شاعروں کی کوششوں کا جائزہ شاعری کے باب میں لیا گیا ہے۔

۴- مضامین و مقالات میں آزادی کا جذبہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اُردو ادب میں قدیم و جدید کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ اس کی ناکامی کے اثرات اور پھر برِّعظیم میں رونما ہونے والے بے شمار سیاسی اور معاشرتی واقعات، حادثات اور تحریکات نے یہاں کے عام باشندوں اور مسلمانوں کی زندگی پر گوناگوں اور دوررس اثرات مرتسم

کیے۔ نتیجتاً شعروادب بھی متاثر ہوئے اوران تحریکات و رجحانات کی ترجمانی کر کے معاشرے کو بھی متاثر کرتے رہے۔ ادب میں فارسی کے بجائے انگریزی کی تقلید ہونے لگی اور اُردو میں مضمون وانشا نگاری کے علاوہ ناول، افسانہ، سوانح اور تنقید کا بھی آغاز ہوا۔ سیّد احمد خاں نے پہلی مرتبہ اُردو زبان میں ہرقسم کے موضوعات پر صاف و سادہ زبان میں مضمون لکھنے شروع کیے۔ اور اُردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان کی اس کوشش کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اسی طرز پر لکھنے والوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا۔ سیّد احمد خان کے رفقا تو ان کے ساتھ ہی شریکِ تحریر رہے، ان کے مخالفین نے بھی اسی طرز کو اختیار کیا، اوراس طرح مضمون نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کرلی۔

جدید اُردو ادب کا پہلا دور اپنے مقصد اور موضوع کے اعتبار سے اصلاحی تھا۔ جنگ آزادی کی ناکامی اور ملک پر انگریزوں کے مکمل تسلط نے مسلمانوں کو سخت زبوں حال اور مصائب و مشکلات میں گرفتار کردیا تھا۔ وہ انتہائی کس مپرسی اور بے چارگی کے عالم میں تھے۔ ان حالات میں داستانیں اور غزلیں قوم کو طمانیت نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ ایسے وقت میں سیّد احمد خان کی سرکردگی میں ایک گروہ مسلمان ادیبوں اور شاعروں کا پیدا ہوا جس نے اُردو ادب اوراس کے ذریعے پوری قوم کی اصلاح کی تدابیر اختیار کیں۔ سیّد احمد خان اس گروہ کے رہنما اور سرپرست تھے ہی۔ ان کے علاوہ حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقارالملک، مولوی چراغ علی اس کے اہم اور ممتاز ادیب اور شاعر تھے۔ اُنھوں نے ادب میں مقصدیت پیدا کی اور اسے اصلاح تہذیب و اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ یہ سب کے سب مذہب پرست تھے اوراس کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ صرف ادیب و شاعر ہی نہیں تھے بلکہ قوم کے رہنما بھی تھے۔ ان کا دل دردِ قومی سے لبریز تھا اور یہ مسلمانوں کو ذلت کی پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں قوم کی اصلاح کے لیے ادب و شعر کی اصلاح ضروری تھی۔ چناں چہ وہ شعروادب کو اپنے مقصد کے حصول کا نہایت موثر ذریعہ جانتے تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ قوم کی بھلائی اور فلاح کے لیے لکھا۔ ان مصلح ادیبوں کی کوششوں سے بہت تھوڑے عرصہ میں اُردو میں بامقصد، اصلاحی، اور پاکیزہ ادب کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا، جس نے مسلمانوں کے فکروعمل پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس ادب نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، انھیں اپنی پستی اور ذلت کا احساس دلایا اور پھراس پستی و ذلت سے نکلنے اور فلاح وترقی کے راستے پر گامزن ہونے کا حوصلہ دیا۔ اس ادب نے مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور بیدار کیا اور

انھیں اپنی کھوئی ہوئی سیاسی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لینے یا حصولِ آزادی کی طرف مائل کیا۔

سیّد احمد خان نے جو مضامین تحریر کیے انھیں تین موضوعات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) خالص مذہبی اور دینی مضامین، (۲) اصلاحِ اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین اور (۳) سیاسی مضامین۔ سب مضامین ان کے مقصد کے آئینہ دار تھے۔ اسی مقصد کے مدِنظر سیّد احمد خان معاشرتی اور مذہبی دونوں طرح کے مصلح تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک خاص سیاسی نظریہ کے نقیب اور علم بردار بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریروں میں جوش اور جذبہ و احساس کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ ارادہ اور خواہش بھی صاف ظاہر ہے کہ قوم ان کے خیالات سے متاثر ہو۔ چناں چہ اکثر مقامات پر ایک مدعی اور مناظر بلکہ واعظ اور خطیب بن جاتے ہیں[۱] اُنھوں نے جو کچھ لکھا، اپنے افکار و تصورات کی اشاعت کے لیے لکھا۔ ان کے مقصد کو رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جسے وہ ''مسلمانوں کے دین و دنیا کی بھلائی کی خاطر نکالنا چاہتے تھے[۲] وہ چاہتے تھے کہ ''مسلمانوں کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کی طرف دیکھتی ہیں۔ وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلا دیں[۳] اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سیّد احمد خان نے متعدد مضامین تحریر کیے جن کا مقصد تہذیب الاخلاق کے اجرا کو مفید بنانا تھا اور اس کے علاوہ ان کے پیشِ نظر فرد کے اخلاق کی اصلاح، قومی اصلاح و تکمیل، تہذیب اور شائستگی اور عزت کا احساس پیدا کرنا، قوم کو جدید ترقیات علمی کی طرف راغب کرنا، علمی نقطہ نظر کی اصلاح، دینی زاویہ نگاہ کی اصلاح، ادب و انشا کے لیے ذوقِ صحیح کا پیدا کرنا، اُردو زبان کو قومی حسیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنانا اور بالآخر قوم میں زندہ دلی پیدا کرنا تھا۔[۴]

سیّد احمد خان کا مقصد جہاں اصلاح تہذیب و اخلاق تھا، دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان انگریز حکمرانوں کے قریب ہو جائیں اور ان کی زبان و تعلیم کے علاوہ تہذیب و معاشرت کے وہ طور طریقے بھی اختیار کر لیں جو مفید و نفیس ہوں تاکہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو منافرت اور بدگمانیاں ہیں وہ دُور ہو جائیں۔ اور مسلمانوں کو بھی ترقی کے مواقع مل سکیں۔ ان کے مضامین ''عیسائیوں اور مسلمانوں میں باہمی مودت اور اتحاد'' ''کفار سے موالات''، ''مہذب قوموں کی پیروی''، ''انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا، اسلامی احکام کی رو سے'' وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ سیّد احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اپنی موجودہ پستی اور ذلت سے نکلنا چاہتے ہیں اور دنیا کی

مہذب قوموں میں سرفراز ہونا اور ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں زمانہ کا ساتھ دینا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ مغربی علوم کے حصول کے بغیر وہ مسلمانوں کی ترقی کو محال ہی نہیں بلکہ ناممکن خیال کرتے تھے۔ قوم میں جدید تعلیم کے حصول کا شوق پیدا کرنے کے لیے اُنھوں نے مضامین کا ایک سلسلہ تحریر کیا۔ ''علم''، ''تعلیم''، ''انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں''، ''تعلیم و تربیت''، ''غیر مفید تعلیم''، ''طریقۂ تعلیم مسلمانان''، ''مہذب اور عام تعلیم''، ''مسلمان اور تعلیم زبان انگریزی''، ''ہندوستانیوں کی تعلیم ولایت میں'' ایسے ہی مضامین تھے، جن میں سیّد احمد خان نے مختلف پہلوؤں سے جدید تعلیم اور انگریزی زبان کی اہمیت اُجاگر کی تھی۔ جہاں اُنھوں نے مغربی علوم کے حصول پر زور دیا، وہیں مشرقی تہذیب و معاشرت کی خامیاں اور مغربی تہذیب و تمدن کی خوبیاں بھی اجاگر کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کیا۔ انھیں مسلمانوں کے مذہبی خیالات و عقائد اور تہذیب و معاشرت میں بے شمار خامیاں نظر آتی تھیں، وہ انھیں دور کرنا چاہتے تھے اور مغربی تہذیب کی خوبیوں کو مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس تعلق سے اُنھوں نے متعدد مضامین تحریر کیے، جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ''عزت''، مذہب و معاشرت''، ''رسوم و عادات''، ''رسم و رواج کی پابندیوں کے نقصانات''، ''مہذب قوموں کی پیروی''، ''طریقۂ زندگی''، ''ہمدردی''، ''خود غرضی اور قومی ہمدردی''، ''اپنی مدد آپ''، ''انسان و حیوان''، ''بحث و تکرار''، ''قومی اتفاق''، ''آزادیِ رائے''، ''طریقۂ تناول طعام''، ''مخالفت''، ''تعصب''، ''مشرقی علوم و فنون''، ''زاہد اور فلاسفر کی کہانی''۔ ان مضامین کا حاوی مقصد ہی مسلمانوں کے اخلاق اور طرز معاشرت کی اصلاح تھا۔ اُنھوں نے تہذیب کے موضوع پر اور بھی کئی مضامین تصنیف کیے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان کبھی کسی کام پر آمادہ نہیں ہوسکتے جب تک کہ اسلام کی روشنی میں اس کام کی اہمیت ثابت نہ کردی جائے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اسلام ایک مکمل دین اور آخرت میں سرخروئی کا ضامن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تمام اصلاحی کوششوں کو اسلامی تعلیمات کے ذریعہ صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے مذہب پر بحیثیت مذہب نئے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔ ان کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ مذہب کو علوم جدیدہ کی روح اور ان کے اصول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس معاملہ میں سیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک کا نصب العین خالص عقلی اور علمی تھا۔ ان کے مضامین ''نیچر''، ''نیچری''، ''مذہب اور

معاشرت''، ''راہِ سنت اور بدعت''، ''معجزہ کی حقیقت'' اور معجزہ کے بارے میں دیگر تحریریں، ''فرشتوں اور شیطان کی حقیقت''، ''بہشت کی ماہیت''، ''واقعہ معراج کی حقیقت و اصلیت''، و نیز تفسیری مضامین اور مضامین مشتمل بر قرآنی قصص۔ ان کے ایسے نصب العین کا اظہار کرتے ہیں کہ جس کے تحت سیّد احمد خاں مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح چاہتے تھے، تاکہ وہ جدید زمانہ کا شعور حاصل کر سکیں۔ ان کا ذہن تجدد پسند تھا۔ اسی کے زیرِ اثر اُنھوں نے عہدِ حاضر کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ کی تھی، اور جن موضوعات پر قلم اٹھایا تھا ان میں اصل مقصد یہی رکھا تھا کہ جہاں تک ہو قوم و ملک کی موجودہ حالت درست ہو۔ یہاں تک کہ تفسیر القرآن اور تبیین الکلام جیسی علمی کوششیں بھی اسی مقصد کے تحت وجود میں آئی تھیں۔ مسائل حاضرہ سے دل چسپی کا مکمل اظہار ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں موجود ہے۔ حالات زمانہ کے تحت ان کا مطمحِ نظر ملکی اور جغرافیائی کم تھا، دینی اور مذہبی زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیاست کے معاملہ میں اُنھوں نے تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی اور عقلی معیاروں کو بہت کم مدِنظر رکھا ہے۔ سیاسی مسائل کو اُنھوں نے دینی اور مذہبی زاویہ نظر سے دیکھا ہے۔ سیاست میں ان کا نظریہ وطنی کم اور ملی زیادہ تھا۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں مذہب کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا احساس پیدا کیا اور انھیں ہندو اکثریت میں مدغم ہو کر اپنی حیثیت اور امتیاز کھونے سے بچالیا۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے بڑی سختی سے روکا۔ اس لیے کہ کانگریس دراصل ہندوؤں کی جماعت تھی اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا تعصب، تنگ نظری، دلی عداوت اور بغض و کینہ سیّد احمد خان پر پورے طور پر منکشف ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے اس کا اچھی طرح اندازہ لگالیا تھا کہ ہندو مسلمان مل کر کوئی کام نہیں کر سکتے اور اگر وہ ایسا کریں گے تو ہندو اپنی خودغرضی، بے مروتی اور تعصب کی وجہ سے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کو نظر انداز کر دیں گے بلکہ انھیں زک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک انگریزوں کی جانب سیّد احمد خان کے رویے کا تعلق تھا، اُنھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ انگریزوں کے مکمل استیلا کے بعد جب کہ مسلمان اپنے تنزل کی انتہا پر پہنچ گئے تھے اور ہندو برطانوی حکمت عملی کے طفیل معاشی، تعلیمی، انتظامی اور عدالتی شعبوں میں مسلمانوں پر بالادستی حاصل کر چکے ہیں، مسلمانوں کے لیے بقا کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ انگریز حکمرانوں سے تعاون کر کے ان کی حمایت حاصل کریں تاکہ اپنی ضائع شدہ قوت دوبارہ اخذ کر سکیں اور پھر جدوجہد کر سکیں۔ ہندوؤں کی جانب سے اُردو زبان کی مخالفت کے بعد سیّد احمد خان ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو کر صرف

مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اُردو ذریعہ تعلیم کے لیے ایک جامعہ اور پھر مدرستہ العلوم مسلمانان کے قیام کا منصوبہ بھی دراصل ان کے سیاسی نصب العین کا ابتدائی اظہار تھا۔ ان منصوبوں کی وضاحت کے لیے اُنھوں نے کئی مضامین تحریر کیے، جیسے ''ہماری تعلیم ہماری زبان میں''، ''عرضداشت برائے ورنیکلر یونی ورسٹی'' ''مجوزہ مدرستہ العلوم مسلمانان''، ''مدرستہ العلوم مسلمانان کیسا ہوگا'' وغیرہ۔ انگریزوں سے مصالحانہ روّیہ کا اظہار سیّد احمد خان نے اپنے کئی مضامین میں کیا ہے۔ بعض میں انگریزی حکام کی حکمت عملیوں کو سراہا ہے اور مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی خوبیاں اجاگر کرنے کی کوشش ہے۔ ''دہلی کا دربار اور اس کا خرچ''، ''ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ''، ''اپنی مدد آپ'' مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے گورنمنٹ کی تدبیریں'' ایسے مضامین ہیں جو انھیں کوششوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی متعدد مضامین سیّد احمد خان نے تحریر کیے تھے جن میں انگریزی حکومت کی انتظامی حکمت عملیوں، مسلمانوں سے ان کا سلوک اور حکومت کی زیادتیوں پر تنقید کی ہے۔ ان کے مضامین ''ہندوستانیوں کا خون''، ''صاحب بہادر کی چوری''، ''زبردستی کا سلام''، ''خواجہ کا فساد''، ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''، ''جیل غانوں کی رپورٹ''، ''جوتے کا مقدمہ'' ''شاہ جہاں پور کا واقعہ'' ان کے تلخ لہجہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''ہندوستانیوں کا خون'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اے انصاف پسند لوگو! اب انگریزی عمل داری کو یہ حرکتیں بدنام نہیں کریں گی؟ کیا غریب ہندوستانی اسی طرح کام میں آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور رولوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔[۵]

''جوتے کا مقدمہ'' میں تحریر کرتے ہیں:

> کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی قوم کے ایک شخص کے سر پر برسرِ عدالت جوتا رکھوایا جانا ان کے حق میں ذلت کا باعث ہے اور قومی عزت میں نقصان آنا کس نتیجہ کا موجب ہے؟ یا وہ اس بات سے خوش ہوں گے کہ ان ہی کی جوتی ان ہی کا سر ہو۔[۶]

سیّد احمد خان نے اپنے خالص سیاسی مضامین میں برطانوی حکومت کی سیاسی حکمت عملیوں اور ہندوستانیوں کے لیے اس کی غلط کاریوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اور ہندوستانیوں کی جانب سے بالعموم اور مسلمانوں کی جانب سے بالخصوص انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نمایندگی کرتے ہوئے حکومت پر اثر ڈالنے کی جستجو بھی ان مضامین میں نظر آتی ہے۔ اسی قبیل کے

مضامین میں ''بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ہے؟'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

......دیکھنا چاہیے کہ کس قدر ظلم غریب رعایا کی جان پر ہوتا ہے اور ظلم بھی ایسا جان فرسا کہ جب تک اس کا گمان و خیال بھی رعایا کے دل پر رہے گا، کسی طرح بھی امید نہیں ہوسکتی کہ وہ ایسے سرکاری انتظاموں کو خوشی سے پسند کرے اور اس سے فائدے اُٹھاوے......

جو امور رعایا کے سراسر تکلیف کا باعث ہیں ان کو لکھنا ہم اپنا فرض سمجھیں گے۔[۷]

سیّد احمد خان نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے تمام عمر جدوجہد کی۔ ان کے افکار نے ان کے زمانے کی تقریباً تمام علمی اور ادبی تحریکوں پر اثر ڈالا۔ سیاست، معاشرت، تعلیم اور تربیت اور مذہب تمام شعبہ ہائے تحریر ان سے متاثر ہوئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے رفقا نے ان کی اشاعت میں خاص حصہ لیا۔ محسن الملک، وقارالملک، سیّد محمود، مولوی فارقلیط اللہ، مولوی ذکاء اللہ، چراغ علی، شرر، حالی، شبلی، تہذیب الاخلاق کے خاص مضمون نگار تھے۔ اُنھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اس انقلاب میں بڑا حصہ لیا جو علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر برِّعظیم میں رونما ہوا۔ یہ محض تعلیمی اور علمی نہیں تھا بلکہ دراصل سیاسی تھا، اور اس نے آگے چل کر بیسویں صدی کے ہندوستان کو واضح اور سیاسی تحریکات سے روشناس کرایا۔

سیّد مہدی علی محسن الملک سیّد احمد خان کے عزیز ترین رفیق تھے۔ تہذیب الاخلاق میں سیّد احمد خان کے مقاصد کی حمایت اس قدر جوش اور انہماک سے کی کہ لوگوں پر اس تحریک کا نمایاں اثر قائم ہوا۔ محسن الملک دراصل سیّد احمد خان کے ترجمان ثابت ہوئے اور بہت سے مسائل میں انھیں کی پیروی کیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں انھیں سیّد احمد خان کے مذہبی خیالات اور سیاسی ارادوں سے اختلاف تھا مگر رفتہ رفتہ ان کا اختلاف رفع ہوتا گیا۔ اور اکثر معاملات خصوصاً سیاسی نصب العین میں کامل یک جہتی پیدا ہوگئی تھی۔ سیّد احمد خان کے بعد تہذیب الاخلاق میں زیادہ تر انھیں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین میں بڑا زور اور جوش ہے۔ ان سب کے موضوعات تقریباً وہی ہیں، جو سیّد احمد خان کے مضامین سے مخصوص ہیں۔ مثلاً ''تعلیم و تربیت''، ''تدبیر و امید''، ''عزت''، ''تعصب بالرائے'' وغیرہ۔

نواب مشتاق حسین وقارالملک نے تہذیب الاخلاق میں کچھ زیادہ مضامین تحریر نہیں کیے۔ جو مضامین لکھے وہ پُرمغز اور مفید تھے، جن میں وہ ایک مدبر اور منتظم نظر آتے ہیں اور ان میں وہ سیّد احمد خاں کے مقاصد کے کم، ان کی قومی خیرخواہی کے زیادہ مداح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن قومی ترقی کے مسئلہ

میں ان کے ہم نوا تھے، سماجی اخلاق کے متعلق ان کے مضامین ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے خاص مضامین ''توکل''، ''شیریں زبانی''، ''تقویٰ''، ''اعتدال''، ''عام محنت''، ''انسان کی زندگی''، ''تہذیب و شائستگی'' وغیرہ ہیں۔ ان میں اُنھوں نے حسنِ معاشرت، تہذیب و شائستگی، مجلسی اخلاق جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کا ایک اہم مضمون وہ ہے، جب حکومت نے ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے فیصلہ کو منسوخ کر کے بنگال کی سابقہ حیثیت قبل از تقسیم ۱۹۰۵ء کو بحال کر دیا۔ نواب وقارالملک نے دلی دربار میں شرکت سے واپس آ کر پہلی فرصت میں ''ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ حالت'' کے عنوان سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک پُرزور مضمون تحریر کیا، جس میں نہایت مہذب طریقہ سے حکومت کے فیصلہ پر نکتہ چینی کی۔ یہ مضمون ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہوا۔

سیّد محمود نے معاشرتی اخلاق کی اصلاح، دوست داری اور شائستگی کے موضوعات کو اپنے مضامین کی بنیاد بنایا تھا۔ ان کے مضامین سلجھی ہوئی فکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ جذباتیت سے عاری محتاط انداز میں لکھتے رہے۔ مولوی فارقلیط اللہ نے قدیم مناظرانہ طرز کے مضامین تحریر کیے جو اس حد تک پرجوش اور غیر معتدل ہیں کہ ان میں بے جا تشدد اور درشتی نظر آتی ہے۔ مولوی ذکاءاللہ سیّد احمد خان کی تحریک کے اہم رکن تھے۔ ورنیکلر یونی ورسٹی کے بڑے حامی اور تہذیب الاخلاق کے نام ور مضمون نگار تھے۔ ان کا اہم موضوع تصنیف ریاضی ہے۔ تاریخ و سوانح ان کا ریاضی کے بعد دوسرا مقبول موضوع تھا۔ بیشتر کام مدرسانہ ہے۔ کچھ کام ترجمے کا ہے۔ مضامین میں قومی، معاشی، علمی، معاشرتی سب موضوعات پر خیالات ملتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے عام افکار سے وہ بھی متاثر تھے۔ مگر انقلاب انگیز جذبات و افکار سے ان کا دل و دماغ آشنا نہ تھا۔

سیّد احمد خان سے عقائد کے اعتبار سے سب سے قریب مولوی چراغ علی تھے۔ ان کا زیادہ محبوب موضوع مذہب تھا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے اہم مضمون نگار تھے۔ اپنے مضامین میں زیادہ تر سیّد احمد خان کے عقائد اور خیالات ہی کی تبلیغ کی۔ ان کا موضوعِ تحقیق جس سے انھیں زیادہ دل چسپی رہی، تقریباً وہی تھا جو سیّد احمد خان کا رہا۔ ان کا طرزِ استدلال بھی سیّد احمد خان کے طریق پر استوار ہوا۔ ان کی تحریروں میں سیّد احمد خان اور ان کی تحریک کا اثر نمایاں ہے۔

حالی اپنی شاعری اور نثر دونوں کے لحاظ سے اُردو کے عظیم ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نثر

میں ادبی تنقید اور سوانح نگاری نے ان کو امتیاز خاص بخشا ہے۔ وہ ایک مخصوص طرز انشا کے مالک تھے۔ اُنھوں نے تہذیب الاخلاق میں جو چند مضامین تحریر کیے ان سب کے مرکزی خیالات تقریباً وہی ہیں جو سیّد احمد خان کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔ وہ نظم و نثر دونوں جگہ مصلح اخلاق کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر اصلاح اخلاق و معاشرہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مضمون ''زمانہ'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ''جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ مقتضائے وقت کا خیال رکھو اور بیہودہ تقلید سے بچو''، ''تدبیر'' میں حصول مقاصد کے لیے تدبیر اور سعی و کوشش کو انسان کا فرض قرار دیا ہے۔ ''بدگمانی'' میں قوم میں پھیلی ہوئی عام بدگمانی کے مضر نقصانات بیان کیے ہیں۔

''کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟'' ''موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے''؟ ''دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے''؟ ''ہم جیتے ہیں یا مر گئے''؟ ''حسب و نسب''، ''مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی''؟ ''تجارت کا اثر عقل و اخلاق پر''، ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے''؟ ان کے اصلاح معاشرت و اخلاق سے متعلق مضامین ہیں۔ ان تمام میں اُنھوں نے سیّد احمد خان کے ہی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی تحریک کے مقاصد کو پورا کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی۔ اُنھوں نے قوم سے التجائیں بھی کیں، جو کہیں زیادہ نصیحت آمیز ہیں، وہ اس امر کی جانب ترغیب دیتی تھیں کہ سماجی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہا جائے۔ ''اندھی تقلید اور بے سرو پا وضع داری'' کو وہ ترقی قرار دیتے ہیں۔[8] ان کے خیال میں مسلمانوں کے تنزل کا واحد سبب مایوسی اور ناامیدی ہے۔[9] معاشرت کی ترقی اور اصلاح کے لیے قوت علمی کو ضروری سمجھتے ہیں۔[10] اپنے مضمون ''دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے''؟ عمل اور جدوجہد کے حق میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں:

> جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ، وہ تعلیم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ، شاداب کرے''۔ نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ بنا دے۔[11]

مضمون ''ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟'' میں بتایا ہے کہ ترقی کے لیے سب سے پہلے اپنے تنزل کا یقین اور احساس ضروری ہے تاکہ ہم ہاتھ پاؤں ماریں اور مسلسل کوشش کے لیے آمادہ کر سکیں''۔ مدعیان تہذیب کی بداعمالیاں'' میں غیر ملکی سامراجی قوت کے زرعی اور صنعتی استحصال کے سبب ملک کی تباہی اور بربادی کی تصویر پیش کی ہے۔[12]

حالی کے پیش نظر مسلمان ایک علاحدہ قوم تھے۔ وہ ابتدا سے علم ہی سے سیّد احمد خان سے بڑے

قدردان تھے، جو "اپنی قوم کی تہذیب و اصلاح میں خصوصاً مردانہ سعی اور کوشش" کررہے تھے۔ حالی کو اپنی محکومی اور غلامی کی حالت کا شدید احساس تھا۔

> غلام جب تک غلام ہے حقیر و ذلیل سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ خود غلام بن گیا ہو اور خواہ جبر سے اس کو غلام بنایا گیا ہو۔[۱۴]

حالی آزادی کے لیے مادی ترقی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ان کا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان آزادی اور "حصول سلطنت" کے لیے سب سے پہلے ترقی یافتہ قوموں کی سی قوت پیدا کریں، جو اس دور میں صنعتی اور سائنسی ترقیوں کے بغیر ممکن نہیں[۱۵] حالی کو یقین تھا کہ انگریز اپنے تجارتی مفاد کی خاطر دیسی صنعتوں کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ اسی اثنا میں مسلمان چاہیں تو ہندوؤں کے برابر پہنچ سکتے ہیں، جو ان سے بہت آگے ہیں۔[۱۶] اپنی محکومی اور غلامی کے شدید احساس کے سبب حالی نے سودیشی تحریک کی حمایت کی تھی۔ اس تحریک کے بارے میں رسالہ زمانہ کان پور کے مدیر دیا نرائن نگم نے ان سے اس تعلق سے رائے طلب کی تھی۔ حالی نے جو جواب تحریر کیا تھا اس سے ان کے صحیح خیالات کا علم ہوتا ہے۔

> جس قدر تحریکیں کہ اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی امید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی...... لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا ہے جس راستہ سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے...... اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کی بہت جلد کامیابی ہوئی۔[۱۷]

اس مضمون میں ایسے اشارات موجود ہیں کہ حالی نے تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء کو مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر اس کی تائید کی۔[۱۸] حالی نے ایسے تمام مضامین سادگی، استدلال اور دردمندی کے عناصر کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جذبہ کی شدت نہیں جاتی۔

شبلی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ زیادہ تر مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصہ کا مطالعہ اپنی قوم کے سامنے پیش کیا جس پر وہ بجا طور پر فخر کرسکتی تھی۔ ان کی تحریروں نے مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس وقت مسلمان اسے پسند کرتے تھے اگر ان سے کہا جاتا کہ تمہارا ایک عظیم ماضی تھا اور تم ایک عظیم تر مستقبل کی تعمیر کرسکتے ہو۔ شبلی کے مضامین اور ان کی تحریروں نے ان جذبات کو ابھارا جو ملت میں کبھی پوری طرح خوابیدہ نہیں رہے تھے۔ سیّد احمد خان

مذہب میں آزاد خیال لیکن سیاست کے معاملہ میں بظاہر قدامت پرست واقع ہوئے تھے۔ اس لیے کالج کی تدریس کے زمانہ ہی میں شبلی کو سیّد احمد خان کے سیاسی خیالات سے اختلاف محسوس ہو گیا تھا۔ شبلی مذہب کی طرح سیاست میں بھی تجدد اور آزاد خیالی کو پیش کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مغربیت کو روکنے کے لیے شبلی نے اپنا زورِ قلم صرف کیا۔ اگرچہ اُنھوں نے سیّد احمد خان کے ساتھ تقریباً سولہ سال گزارے اور سیّد احمد خان کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متاثر بھی رہے، لیکن یہ تأثر وقتی اور سطحی تھا، وہ زیادہ دنوں تک سیّد احمد خان کے ہمنوا نہ رہ سکے۔ ان کی وفات کے بعد اُنھوں نے علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر ندوہ آباد کیا۔

شبلی نے اپنے مضامین میں بھرپور انداز میں ہر قسم کے خیالات تحریر کیے ہیں۔ ان کے ذریعہ شبلی نے قدیم علوم سے دل چسپی پیدا کی اور روایاتِ تاریخ کو نئے ماحول میں زندہ کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک زندہ اور جان دار علمی تحریک کی بنیاد رکھی۔ نئی قومی زندگی کے پیدا کرنے اور اس کو صحیح تاریخ بنیادوں پر قائم کرنے میں شبلی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ابتداءً علی گڑھ کی زندگی میں شبلی سیّد احمد خان کی تحریک میں پورے جوش و خروش سے شریک رہے۔ سیاست میں ان کا نقطۂ نظر بھی سیّد احمد خان کی ہم نوائی میں تھا۔ سیّد احمد خان نے ۱۸۸۷ء میں کانگریس کے متعلق ایجوکیشنل کانفرنس میں تاریخی تقریر کی تھی جس میں مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ شبلی نے اسی جلسہ میں ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' پر اپنا معرکۃ الآرا مقالہ پڑھا تھا۔ شبلی مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ جدت پسند نہیں تھے۔ وہ جدید اور قدیم نصابات کے درمیان ایک توازن رکھنا چاہتے تھے۔ انگریزی کے حصول کو مسلمانوں کے لیے ضروری گردانتے تھے۔ ان کے ایسے خیالات متعدد مضامین میں موجود ہیں۔ جیسے ''ندوہ اور نصابِ تعلیم''، ''تعلیم قدیم و جدید''، ''ندوۃ العلما کیا کر رہا ہے''، ''ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز'' وغیرہ۔

شبلی نے اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعہ قوم میں جوش اور شوقِ آزادی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ تقسیم بنگال اور قیام مسلم لیگ کے بعد کے واقعات نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ اور قوم کے خیالات میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ شبلی نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار بالعموم اس زمانہ میں الہلال، زمیندار اور مسلم گزٹ میں کیا۔ اس وقت ان کا اہم ترین مضمون ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' تھا جس کی پہلی تین قسطیں مسلم گزٹ میں اور چوتھی آخری قسط معارف اعظم گڑھ کے پہلے نمبر میں شائع ہوئی۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی گزشتہ اور آئندہ پالیسی سے بحث کی گئی تھی۔ یہی

زمانہ تھا جب وقار الملک نے اپنا اہم مضمون ''مسلمانوں کی آیندہ حالت'' تحریر کیا تھا۔ جس میں اُنھوں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اگر وہ کانگریس میں شامل ہوئے تو ان کا وجود فنا ہو جائے گا۔ شبلی نے اپنے مذکورہ مضمون میں مجموعی طور سے اس خیال پر اعتراض کیا تھا۔ اس میں مسلم لیگ پر بھی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس مضمون کے مباحث زیادہ تر سیاسی تھے۔

......ہمارے پولٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے۔ ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے۔ لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں......۔[19]

اس موقع پر ان کے سامنے مسلمانوں کی آیندہ زندگی کے لیے لائحہ عمل پیش کرتے ہیں:

......ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ہم کو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیے۔ ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی۔ اس لیے ہم کو ایک جداگانہ پولٹیکل سٹیج کی ضرورت ہے......۔[20]

یہاں اُنھوں نے مسلم لیگ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔[21] لیکن اس کے بعض مطالبات کی پُر زور تائید کی ہے۔[22] اور پھر مسلم لیگ کے نقائص کو دور کرنے کے لیے اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں۔[23] اپنے ایک دوسرے مضمون ''لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا''۔ میں شبلی نے ''سیاسی قائدین'' کے قحط کا ذکر کیا ہے۔

شبلی تحریک اتحاد اسلامی کے زبردست حامی تھے۔ ان کی متعدد نظموں میں اس تحریک سے ان کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے بیسویں صدی کے اوائل میں ترکی کے ساتھ پیش آنے والے سانحات سے بھی وہ متاثر تھے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے اپنے درد و غم کو کئی نظموں میں بیان کیا تھا۔ ایک مضمون بعنوان ''مسئلہ آرمینیا'' بھی تحریر کیا۔ اور اس میں بھی کھل کر حکومت برطانیہ کو ان زیادتیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

موجودہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ آرمینیوں کے ہنگامے کی تحریک درحقیقت خود انگلستان نے کی۔ بلکہ ترکی میں جو خود سر جماعت پیدا ہو گئی ہے وہ انگلستان کے اغوا کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انگلستان ترکی کے انتظامات میں جس قسم کی مداخلت کر رہا ہے۔ وہ عام امن و امان کو ضرر پہنچانے والا ہے۔[24]

شبلی اُردو مضمون نگاروں میں پہلے دور کی اہم اور نمایاں شخصیت ہیں، جنھوں نے کھل کر اور وضاحت سے اپنے وقت کے سیاسی مسائل اور موضوعات کو اپنے مضامین میں جگہ دی اور خاص طور پر اُنھیں موضوع بنایا۔

تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ تحریک سے فیض یافتگان میں مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا وحیدالدین سلیم، عزیز مرزا، حسرت موہانی، مولانا محمد علی نے اپنے مضامین اور مقالات میں اپنے سیاسی رجحانات پیش کیے۔ عصری سیاسی تحریکوں کو تقویت بھی پہنچائی اور نہ صرف برطانوی حکومت پر مناسب مواقع پر تنقید اور نکتہ چینی کی بلکہ اپنے جذبات آزادی بھی بیان کیے عبدالحلیم شرر کی تصانیف کا بنیادی جذبہ اسلام کے شاندار ماضی کا احیا اور مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی برتری تھا۔ ان کے مقالات وغیرہ بھی اسی جذبہ سے موجزن ہیں۔ اپنے سیاسی رجحانات کھل کر مختلف رسالوں میں مضامین اور اداریوں کی صورت میں پیش کیے۔ قومی اور ملکی مسائل پر لکھے گئے مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

مولانا وحیدالدین سلیم کا زیادہ رجحان ادب اور لسانیات کی طرف تھا۔ لیکن چوں کہ ان کی تربیت تہذیب الاخلاق کے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے اس کی روح بعد میں ان کی مقالہ نگاری میں نظر آتی ہے۔ تہذیب الاخلاق، مسلم گزٹ اور معارف میں مضامین لکھتے رہے۔ مولوی عزیز مرزا نے مختلف موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی تھی۔ ان کے مضامین تاریخ اور ادب پر زیادہ تھے۔ کچھ مضامین اُنھوں نے مسلمانوں کے طرزِ معاشرت اور اپنے عہد کے بعض واقعات پر تحریر کیے۔ ''دنیاوی ترقی کے واسطے پابندیِ مذہب لازمی ہے''، ''صنعت و حرفت کی تعلیم کی ضرورت''۔ ''دیسی مصنوعات کی حفاظت'' وغیرہ اصلاحی و معاشرتی ہیں۔ ''جاپان اور ہم''، ''ہندوستان اور مسٹر چرچل'' اپنے وقت کے قومی اور سیاسی مسائل پیش کرتے ہیں۔ ''جاپان اور ہم'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں جاپان سے ہندوستان کا مقابلہ کرکے اور جاپان کی روس جیسے بڑے ملک کے مقابلہ میں فتح کا حوالہ دے کر اپنی قوم میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''ہندوستان اور مسٹر چرچل'' برِعظیم کے سیاسی مسائل کے تعلق سے برطانیہ کے نقطۂ نظر پر تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی اس دور کے بڑے بے باک اور نڈر صحافی اور سیاسی رہنما تھے۔ اُنھوں نے اپنے رسالے اُردوئے معلّٰی کو علم و ادب کے ساتھ سیاسی مضامین کے لیے بھی وقف کر دیا تھا۔ ان مضامین کا لب و لہجہ ایسا ہی ہوتا تھا کہ اُنھوں نے اسے پرجوش سیاست کا علم بردار بنا دیا تھا۔ حسرت آزادیِ کامل کے حامی اور غیر ملکی حکومت کے دشمن تھے۔ ابتدا سے ملکی تحریک سے سب سے پرجوش کارکن اور مؤید رہے۔ اپنے مضامین میں، جو زیادہ تر اُردوئے معلّٰی میں شائع ہوئے، اپنے باغیانہ اور کامل آزادی کی خواہش پر مضامین تحریر کیے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

..... اب کہ بارہا مسلمانوں نے رعایت کی درخواست کرکے دیکھ لیا ہے کہ انگریزی مروت ملنا ناممکن ہے

سے کسی کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا عادی نہیں ہے۔ وہ ان کی اس ذلیل درخواست کو ملامت
کے ساتھ رد کر دیتا ہے کہ لیاقت پیدا کرو۔ اس پر بھی مسلمانوں کا غفلت امید میں پڑا رہنا صد ہزار
افسوس کے لائق ہے۔[۲۵]

سودیشی تحریک کے ضمن میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ یہ جو حکومت کی جبروت سے بہ ظاہر تحریک
حریت کو فاش شکست ہوئی ہے، اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ابھی تک
ہماری نہ قوت مجتمع ہے نہ منظم...... سرِ دست ہمارے نزدیک ہر محبِّ ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلہ
میں مزاحمت دفاعی کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خرید نے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد
پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیے۔[۲۶]

''مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کی حقیقت'' کے تحت لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک مسٹر مارلے کی تجویزوں کو اصلاح کی بجائے تخریب کا نام دینا زیادہ موزوں ہوگا۔[۲۷]

۱۹۰۸ء میں اُردوئے معلّی میں حسرت نے مصر کے بارے میں برطانوی حکمت پر ایک مضمون
شائع کیا جس میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ یہ مضمون جس کا عنوان تھا ''مصر میں انگریزی
سیاست'' دراصل کسی عربی مضمون کا ترجمہ تھا۔ حسرت نے لکھنے والے کا نام حکومت کو بتانے سے انکار
کر دیا۔ اس بنا پر انھیں دو سال قید کی سزا دی گئی۔ ۱۹۱۶ء میں کابل کے انقلابیوں سے ساز باز اور خفیہ
ربط و ضبط رکھنے کے الزام میں دوبارہ قید کر دیے گئے۔ ان دونوں قید کی سزاؤں کو ان کے تاثراتی
مضامین ''فرنگی جیل خانوں میں گورے اور کالے رنگ کی تمیز'' اور ''پولیٹیکل قیدی'' میں دیکھا جا سکتا
ہے۔ بعد میں ان کی تصنیف قیدِ فرنگ اس کا مکمل رپورتاژ ہے۔

مولانا محمد علی مسلمانوں کے پُر جوش سیاسی رہنما، نڈر صحافی، شاعر اور ولولہ انگیز خطیب تھے۔
صحافت میں کامریڈ اور ہمدرد اُن کے مثالی کارنامے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اُردو میں مضامین بھی تحریر
کرتے تھے۔ اُنھوں نے کمال بے باکی اور خلوص و دیانت سے اپنے عہد کے سیاسی مسائل اور ان کو
حل کرنے کی تدابیر اپنے مضامین، اداریوں اور خطبات میں پیش کیں۔ آزادی کے پُر جوش کارکن اور
حکومت برطانیہ کے سخت دشمن۔ اپنے مضامین کے ذریعہ اُنھوں نے ہندوستان کی رائے عامہ پر بڑا اثر
ڈالا تھا۔ ان کے یہ مضامین مقالات محمد علی، مضامین محمد علی، حصہ اوّل و حصہ دوم اور
افادات محمد علی کے نام سے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ ان کے متعدد مضامین ایسے ہیں جن میں

ان کے پُر جوش، ولولہ انگیز اور باغیانہ جذبات شامل ہیں، یہ کام اُنھوں نے زیادہ تر اپنے اداریوں، خطبات اور انگریزی تحریروں سے لیا تھا۔ مضامین میں ''قفل بے کلید''، ''امپریلزم کی روح''، ''ایک دردانگیز مقالہ''، ''خلافت کانفرنس، لکھنؤ''، ''سائمن کمیشن''، ''سائمن کمیشن اور ہندوستان'' ان کے جذبات و احساسات کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''امپریلزم کی روح'' میں اپنے جذبات اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

>......میں اس پر (جنرل ڈائر پر)، اس کی حکومت پر، اس کی ساری قوم پر ہنسنے کو ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت سمجھتا ہوں۔ اور ۱۹۱۹ء سے آج تک ان سب کا مضحکہ اڑانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔[۲۸]

''قفل بے کلید'' میں تحریر کرتے ہیں۔

>تارکِ موالات ہوں۔ حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکا ہوں۔ اسمبلی اور کاؤنسلوں کی جنگ زرگری کو شاعری سے زیادہ کار بے کاراں سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس کی میری نگاہ میں ہیچ دنداں سے زیادہ وقعت نہیں۔[۲۹]

تہذیب الاخلاق کے رجحانات اور اس کے مضمون نگاروں کے میلانات کی جانشینی کی خصوصیات مولوی عبدالحق میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُردو زبان کی پوری تاریخ میں ان سے زیادہ اُردو کے لیے جدوجہد اور کسی فردِ واحد نے نہیں کی ہے۔[۳۰] اُنھوں نے اُردو کے فروغ اور اس کو ملکی اور قومی زبان کی حیثیت سے اس کا جائز مقام دلانے کے لیے اپنے مضامین کے ذریعہ عمر بھر جدوجہد کی۔ یہ اس وقت کے مسلمانوں کے لیے اہم قومی اور ملی مسئلہ تھا۔ اس کی لسانی سے زیادہ سیاسی اہمیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے زیادہ تر مضامین اسی قومی اور سیاسی مسئلہ پر تحریر کیے۔ اُنھوں نے مجموعی طور پر اُردو کے تحفظ کے لیے بڑا کام کیا۔

تہذیب الاخلاق کے بعد ہمدرد اور اُردوئے معلی اہم رسائل تھے، جنھوں نے پُر جوش جذبات اور ہیجان انگیز خیالات سے بھرپور مضامین کی نشر و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ یہ کام دراصل ان سے قبل دوسرے رسائل اور اخبارات نے بھی کیا۔ ... مسلم گزٹ بھی تہذیب الاخلاق کا فیض یافتہ تھا۔ اس کی ادارت مولانا وحید الدین سلیم کے سپرد تھی۔ اس نے تہذیب الاخلاق سے فوراً بعد زمانہ کے سیاسی تغیرات اور خیالات کی تولید میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا۔ اس نے مضامین

بڑی دلیری اور حق گوئیانہ آزادی کے ساتھ آواز بلند کرتے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم اس کے مستقل مضمون نگار تھے۔ ان کے علاوہ شبلی، حبیب الرحمٰن شیروانی، سلیمان ندوی جیسے اہلِ قلم اس کے خاص مضمون نگار تھے۔ اس دور میں مسلم گزٹ کے علاوہ مضامین کے تنوع، موضوعات اور مسائل کو پیش کرنے کے تعلق سے اگر کسی اور رسالے کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تو وہ الندوہ تھا۔ یہ ندوۃ العلما کا ترجمان رہا۔ اور قومی اور سیاسی، ادبی، تعلیمی مسائل کو مولانا شبلی کے نقطہ نظر سے پیش کرتا تھا۔ اس کے اہم مضمون نگار خود شبلی اور ان کے حلقہ سے متعلق افراد ہی تھے۔ شبلی کے مقالات کا اہم حصہ پہلے الندوہ میں ہی شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ کا ایک واضح نصب العین یہ تھا کہ ملک میں ایک علمی اور ذہنی انقلاب پیدا ہو۔ اس کی دعوت کی اساس دین اور قومی تاریخ پر تھی۔ بعد میں دارالمصنّفین سے جاری ہونے والا رسالہ معارف اعظم گڑھ بھی اسی دعوت کو پھیلاتا رہا۔ معارف اوّلاً مولانا وحید الدین سلیم کی زیرِ ادارت پہلے علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت اس رسالے میں تعلیمی، علمی اور اصلاحی مضامین چھپتے تھے۔ دارالمصنّفین سے شائع ہونے والے معارف نے مذہب، قومی تاریخ اور تحقیق کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ ان رسائل میں لکھنے والے مضمون نگار شبلی کے نیم جذباتی، تاریخی اور قومی نقطہ نظر کے شارح تھے۔ ان میں خصوصیت سے سیّد سلیمان ندوی کا نام آتا ہے۔

سلیمان ندوی نے زبان، تاریخ، سیرت، ادب اور قومی مسائل پر اعلیٰ معیار کے مقالات تحریر کیے۔ ان سب کی غرض و غایت اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری ہے۔ مستقل اور وقیع تصانیف کے علاوہ اسے مضامین کے علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، قومی و ملی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش پر شبلی نے سلیمان ندوی کو الہلال کی ادارت میں معاونت کے لیے بھیجا تھا۔ اب تک وہ الندوہ میں علمی کام کر رہے تھے۔ الہلال کے ذریعہ سیاسی میدان میں اپنے شعلہ باز مضامین کے ساتھ داخل ہوئے۔ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جو جذبہ مولانا ابوالکلام کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس میں سلیمان ندوی کے زورِ قلم کو بھی بڑا دخل تھا۔ خصوصاً ان کے مضمون ''مشہدِ اکبر''، ''الحریۃ فی الاسلام'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''الحریۃ فی الاسلام'' آزادی کے بھرپور جذبات کا حامل ہے اور آزادی کی اہمیت و نعمت کو بیان کرتا ہے۔ ''مشہدِ اکبر'' کان پور کے سانحہ مسجد مچھلی بازار کے واقعہ پر لکھا گیا ہے۔ اس کا لہجہ اتنا شدید اور تلخ تھا کہ اس کی اشاعت پر الہلال کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ اس پر مولانا

ابوالکلام نے سلیمان ندوی کو مبارک باد کا تار بھیجا تھا۔ اس مضمون کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

......زمین پیاسی ہے۔ اس کو خون چاہیے۔ لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا۔ مغرب اقصا کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی سرزمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے۔ کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخرکار سرزمین کان پور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی......

......ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حریت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیتِ ملّی ہے۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ وہ مسجد خلیل کی بقائے حریت کے لیے سربکف ہیں۔ لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی، اس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہوگی؟[۳۱]

سلیمان ندوی تحریکِ اتحاد اسلامی کے لیے بڑے زبردست مؤید تھے۔ تحریکِ خلافت میں بھی اس کے سرگرم اور ممتاز قائد رہے۔ مسئلہ خلافت پر ان کا مضمون ''ہندوستان اور خلافت'' بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں برِّعظیم کی تاریخ کا جائزہ خلافت اور ہندوستان کے رشتے سے لیا گیا ہے۔ اور آخر میں مسلمانوں کے جذبات پیش کیے ہیں۔ یہیں خلافت کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں اور استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے مضامین زیادہ تر الندوہ، الہلال اور معارف میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے مضامین کی روح اثباتی اور ایجابی تھی، مذکورہ رسالے ان مضامین و مقالات کی روح کے سبب محض رسالے نہ رہے تھے، ایک تحریک کے داعی کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ تحریک کے طور پر اپنے مضامین کے ذریعہ یہی کام اس دور میں کچھ اور رسالوں نے بھی کیا۔ ایسے رسالوں میں مخزن، زمانہ، الہلال، البلاغ، کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مخزن کے مضمون نگاروں میں لطیف ادبی، رومانی، رجحانات بھی تھے اور شدید جذباتی جوش بھی نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں سے اس زمانہ کے سب ادیب متاثر ہوئے۔ مگر ان کی تحریک پر بہت جلد ظفر علی خان، ابوالکلام اور اقبال کے اثرات غالب آ گئے۔ اور پھر بعد میں خالص ادبی رومانیت نے جنم لیا۔ اپنے ابتدائی دور میں بالخصوص اس نے قومی اور سیاسی مسائل کو بھی جگہ دی تھی۔ اس کے مدیر شیخ عبدالقادر علی گڑھ تحریک کے ہمنوا تھے۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی پر فخر کرتے تھے اور مسلمانوں میں آپس کے اتحاد اور یگانگت کے علم بردار تھے۔ اپنے قیام انگلستان کے دوران وہ اقبال کے ساتھ تحریک اتحاد بین المسلمین میں سرگرمی سے شریک ہو گئے تھے[۳۲] ان کے اپنے مضامین، جو مخزن میں

شائع ہوئے، ان کے میلان اور رجحان کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں، اور تقریباً یہی موضوع ان مضمون نگاروں کے پیشِ نظر رہے، جو مخزن کے لیے مضامین تحریر کرتے تھے۔ اس دور کے بڑے ادیبوں، شاعروں میں حالی، شبلی، اکبرالٰہ آبادی، اقبال، حسرت کے علاوہ ذکاء اللہ، وحیدالدین سلیم، ابوالکلام، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، تاجور نجیب آبادی وغیرہ اس میں قومی اور ملکی مسائل پر بھی لکھتے رہتے تھے۔

زمانہ میں بھی مخزن کے انداز سے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ادبی کے علاوہ قومی اور سیاسی مضامین بکثرت شائع ہوتے تھے۔ سیاسیات میں کانگریس کے نقطہ نظر کو پیش کرتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں اس کے مدیر منشی دیا نرائن نگم، لالہ لاجپت رائے، چکبست، پریم چند، نوبت رائے ظفر وغیرہ کے مضامین عام طور پر شائع ہوتے رہتے تھے۔ دیا نرائن نگم ''رفتارِ زمانہ'' کے عنوان کے تحت مستقلاً حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے قومی اور سیاسی مسائل پر مسلسل مضامین لکھتے رہتے تھے۔ لاجپت رائے نے مضامین کی صورت میں جس قدر لکھا، اس کا معتدبہ حصہ زمانہ ہی میں طبع ہوا۔ ہماری موجودہ پولیٹیکل حیثیت[۳۳] ان کا اہم مضمون تھا۔ اس میں حالاتِ حاضرہ میں ہندوستانیوں کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کیا گیا تھا۔ متعدد مقامات پر حکومت پر واضح تنقید بھی کی گئی ہے اور حب وطن کی منزل میں حکومت کی حکمتِ عملی پر نکتہ چینی کی گئی۔ اس میں ہندوستانیوں کے اضطراب اور بے چینی کو پیش کیا ہے۔ ''شرط مصالحت'' کے عنوان کے تحت ''عدم تعاون'' کے جذبات ابھارنے اور دلائل کے ساتھ ہندوستانیوں کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زمانہ سودیشی تحریک کا سرگرم آلہ کار تھا۔ چناں چہ اس تحریک پر متعدد مضامین اس میں شائع ہوئے تھے۔ اس رسالے نے اس عہد کے زعما سے مضامین کا ایک سلسلہ سودیشی تحریک پر تحریر کروایا تھا، جو مدیر کی جانب سے کیے گئے سوالات کے جوابات کی صورت میں تھا۔ حالی اور اقبال کے مضامین بسلسلہ سودیشی تحریک اس کی مثال ہیں، جو زمانہ میں شائع ہوئے تھے۔[۳۴] سودیشی تحریک کے ضمن میں سیّد محمد فاروق نعمانی کا مضمون بعنوان ''سودیشی تحریک اور مسلمان'' خاصا اہم ہے۔[۳۵] اس میں تفصیل سے سودیشی تحریک میں مسلمانوں کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں مسلمانوں پر لگائے گئے الزامات کا مدلل جواب بھی ہے۔ ہندوستان اور سلف گورنمنٹ از راج کمار پرتھوی سنگھ[۳۶] ''کانگریس میں فرقہ بندیاں'' از پنڈت مادھورام،[۳۷] ''ملکی جدوجہد از راج کمار پرتھوی سنگھ[۳۸] اس کے نمائندہ مضامین ہیں۔ ایسے مختلف موضوعات کے علاوہ زمانہ کا حاوی رجحان ملکی قومی مسائل کی

طرف ہی رہا۔ اس میں شائع ہونے والے زیادہ تر مضامین حُبِّ وطن، ملکی مسائل، قومی جدوجہد اور سیاسی خود مختاری کے موضوعات کے حامل ہوتے تھے۔

ابوالکلام کے الہلال نے اپنے مضامین کے لحاظ سے بجا طور پر الہ۔وہ کی دعوت کو، جس کی اساس دین اور قومی تاریخ پر تھی، جاری رکھا۔ الہلال سے قبل ابوالکلام اپنے مضامین الندوہ، المصباح، مخزن، احسن الاخبار، خدنگ نظر میں شائع کراتے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں زیادہ بہتر طور پر الہلال اور البلاغ کے ذریعہ مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے روشناس کرانے اور مغربی تعلیم و تربیت اور سیّد احمد خان کی تحریک کی خامیوں سے آگاہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ الہلال اور البلاغ کے مضامین کو بڑی حد تک دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک سلسلہ وہ تھا جو بنیادی طور پر وقت کے سیاسی مسائل یا واقعات سے متعلق تھا۔ ان مضامین اور شذرات میں قیمتی علمی مباحث آ گئے ہیں۔ مگر اصلاً ان کا موضوع وقت کے سیاسی اُمور تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک سلسلہ مضامین وہ ہے جس میں گو ضمناً وقتی سیاسی مسائل کا ذکر آیا ہے مگر اصلاً ان کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو پیش کیا گیا ہے مذہبی نقطۂ نظر سے ابوالکلام کا سب سے اہم کام جدید علم کلام کی تردید و اصلاح ہے۔ طرزِ تحریر میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی موضوع پر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اظہارِ خیال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات نے ابوالکلام کے شعور کی اشاعت میں بڑی مدد دی۔ ان کے الہلال نے اس وقت مسلمانوں کو ان کی پسندیدہ باتیں سنائیں۔ الہلال ابوالکلام کے ابتدائی نظریات کا ترجمان تھا۔ اس کے مضامین کے ذریعہ اُنھوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر فخر و ناز کرنا سکھایا۔ ان کے مضامین اوسط درجے کے مسلمان کے ذہن میں اس دنیا کے علاوہ کسی اور دنیا کی رومانیت پیدا کرتے تھے۔[۳۹] شاید اس قسم کی رومانیت اس لیے ضروری تھی کہ ملت کو اس قابل بنا دے کہ وہ اسلام کے اعلیٰ اصولوں کو پھر اپنی گرفت میں لے لے۔ ان کی یہ بات بڑی مستحسن ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کے ان جذبات کو اپنی تحریروں کے ذریعے بیدار کیا جو اُن میں پورے طور پر خوابیدہ نہیں رہے تھے۔ اپنی ہستی کا ادراک ان کے لیے ہیجان خیز تھا۔ الہلال کے مضامین شوکتِ بیان اور جوش و خروش کے سیلاب سے امنڈے پڑے ہیں:

... اگر مسلمانوں نے اپنے لیے ایک نہایت آزادانہ پولٹیکل پالیسی تیار کر لی، کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام ان کے ہاتھ میں ہوا لیکن ساتھ ہی اگر اُنھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال

میں اسلام کی عملی روح نہ پیدا کی...... یہ تمام بڑی سیاسی ہنگامہ آرائیاں، تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیز اور پولیٹیکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان ایک لمحہ، ایک دقیقہ ایک عشیر دقیقہ تک کے لیے بھی کچھ نفع نہیں پہنچا سکے گا۔[۴۰]

ایک دوسرے موقع پر تحریر کرتے ہیں:

میں وہ جمہور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے...... لیکن اے رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو، یہ کیا ہے کہ تمہارے گھر میں آگ لگ چکی ہے۔ ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت، مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو......[۴۱]

ابوالکلام نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مخالفوں کو زیر کر کے مسلمانوں کی شکست خوردہ ذہنیت میں خودشناسی اور خوداعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں کو اسلام کی طرف دعوت مراجعت کی خاطر الہلال میں ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر''، ''القسطاس المستقیم''، ''الجہاد فی الاسلام''، ''عیدالضحیٰ''، ''الحج''، ''محرم الحرام''، ''حقیقۃ الصلوٰۃ'' وغیرہ جیسے مضامین لکھ کر یہی ظاہر کرتے رہے کہ مسلمانوں کی ساری مصیبتیں صرف اسی غفلت کا نتیجہ ہیں کہ اُنھوں نے اسلام کی تعلیمات پر عمل چھوڑ دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنی سیاست کی اساس بھی مذہب پر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تحریکِ اتحاد اسلامی کے پرجوش حامی اور مبلغ تھے۔ ترکی کے مصائب کے دنوں میں اس کے مسئلہ پر الہلال میں پُرجوش اور اشتعال انگیز مضامین لکھے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں ان کی تحریریں ہمیشہ پیش قدمی کرتی رہیں انگریزوں کے ''کنگرہ فرعونیت'' کو متزلزل کرنے اور ان کے ''وقار نمرودیت'' کو پامال کرنے اور غلامی سے نکلنے کے لیے جھنجھوڑتے رہے۔ ان کے ایک مضمون کا عنوان ''الجہاد'' الجہاد الجہاد فی سبیل الحریۃ ہے، اس میں ایک جگہ لکھا ہے:

......ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حُبّ الوطنی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے۔ اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے، جو حق اور صداقت اور انسانی بندِ استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔[۴۲]

اپنے وقت کے سیاسی حالات، واقعات اور مسائل پر متعدد مضامین بھی تحریر کیے۔ تحریکِ خلافت کے تعلق سے ''ترک اور یورپ''، ''مسئلہ خلافت''، ''مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ'' جیسے مضامین آل

پارٹیز کانفرنس لکھنؤ کے موقع پر ''لکھنؤ کانفرنس اور مسلمانوں کے حقوق'' کے عنوان سے ایک بہت مفصل مضمون، تحریکِ ترکِ موالات پر ''صور بیداری''، پہلی جنگ عظیم پر ''جنگِ عظیم'' ایسے ہی مضامین تھے، آزادی کے جذبات اور ان کے مطالبات کو ان کے مضامین ''ہندوستان کی آزادی اور مسلمان''، ''آخری منزل اور ہمارا فرض'' اور ''صاف اور سادہ سوال'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔
''ہندوستان کی آزادی اور مسلمان'' میں مستقبل کی نوید دیتے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بد قسمتی، راہ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچہ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی......[۴۳]

سارا مضمون اسی طنزیہ لہجہ میں ہے۔ لیکن اس کے برعکس ''آخری منزل اور ہمارا فرض'' میں مسلمانوں کو جرات اور حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

دنیا ہماری طرف تک رہی ہے۔ تاریخ کے صفحات ہمارے انتظار میں ہیں۔ ہزاروں لاکھوں شہیدان ظلم کی نگاہیں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ سمرنا اور ایشیائے کوچک کی خون آلودہ سرزمین سے ہمارے لیے صدائیں اٹھ رہی ہیں اور ہندوستان کی پامال سرزمین کا ایک ایک ذرہ ہماری حسرت میں ہے۔ کیا ہمارا وجود ان سب کے لیے مایوسی ہوگا؟[۴۴]

''صاف اور سادہ سوال'' میں جنگ عظیم دوم میں ہندوستان کی شرکت کے سوال پر لکھتے ہیں

ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مخالف سمت جاری ہے۔[۴۵]

مولانا ابوالکلام نے اپنے مضامین اور الہلال اور البلاغ کے ہمہ گیر اور مؤثر فن سے خوب کام لیا تھا۔ اس دور میں ایسے مزید رسائل اور جرائد تھے جن میں ملکی، قومی اور سیاسی مسائل، حالات و واقعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ دکن ریویو مولانا ظفر علی خان نکالتے تھے۔ اس وقت کے نام ور ادیب اور شاعر اس کے حلقۂ تصنیف میں شامل تھے۔ مضامین میں ملکی مسائل کے علاوہ خلافت، عالم اسلام اور بین الاقوامی حالات بھی شامل رہتے تھے۔ زمیندار میں بھی ملکی سیاسی اور قومی مسائل پر مضامین کی اشاعت ہوتی تھی۔ ستارۂ صبح کو بھی مولانا ظفر علی خان ہی ترتیب دیتے تھے۔ ادبی رسالہ تھا لیکن معاشی اور معاشرتی موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ رسالہ سودمند مولانا طفیل احمد منگلوری نکالتے تھے۔ اس کے اجرا کا مقصد مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے اُنھیں معاشی طور پر خوش حال بنانے کی تدابیر پیش کرنا تھا۔ انھیں تدابیر سے متعلق مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے لکھنے والوں میں طفیل احمد منگلوری کے علاوہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیت العلمائے ہند کے مضامین اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ علی گڑھ منتھلی، علی گڑھ کالج کا جریدہ تھا، لیکن قومی سیاسی مضامین کے اعتبار سے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں شامل مضامین قومی سیاسی جذبات کا بے باک اور پُر جوش اظہار ہوتے تھے، سہیل کے نام سے رشید احمد صدیقی نے سہ ماہی رسالہ جاری کیا تھا۔ اس میں معاشرتی اور قومی مسائل پر بھی مضامین ہوتے تھے جامعہ، جامعہ ملیہ دہلی کا ترجمان تھا اور الجمعیة، جمعیۃ العلمائے ہند کی ترجمانی کرتا تھا۔ ان میں اکثر مضامین معاشرتی، معاشی، قومی اور سیاسی موضوعات پر مبنی ہوتے تھے۔ اور عام طور پر نام ور اور مشہور صاحب قلم ان میں لکھتے تھے۔ دلگداز، ادیب، الناظر، موقع، حسن، العصر، صلائے عام، نقاد وغیرہ ایسے ادبی اور علمی رسالے تھے، جو قومی اور معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین شائع کرتے رہتے تھے۔ تاج، مدینہ، البشیر، اپنے اجرا کا علمی، مذہبی مقصد رکھتے تھے۔ لیکن ان کے مندرجات میں بھی حالات حاضرہ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور ایسے مضامین ان میں چھپتے رہتے تھے جو قومی اور ملکی مسائل کے حامل ہوتے تھے۔ بعد میں نگار، ساقی، ہمایوں، عالمگیر، اور نیرنگِ خیال عام طور پر قومی اور سیاسی مسائل کو جگہ دیتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے بعض مواقع پر چند خصوصی اشاعتوں میں خاص مضامین بھی شائع کیے۔ تحریکِ آزادی میں جیسے جیسے سرگرمی اور جوش کا اضافہ ہوتا گیا ان رسالوں نے اس کی معاونت میں بکثرت مضامین شائع کیے اور خصوصی اشاعتیں پیش کیں۔

ایسے علما اور ادیب بھی تھے جو کسی خاص رسالے کی بزم تک محدود نہیں رہے۔ بعض نے مستقلاً اور کثرت سے مضامین نہیں لکھے لیکن اُنھوں نے جس قدر لکھا، ان میں ایسے مضامین بھی تھے جو تاریخ ساز اہمیت رکھتے ہیں۔ چودھری عبدالغنی نے ''ہندوستان اور پلیگ'' کے عنوان سے روزنامہ خلافت بمبئی کی اشاعت ۳۰/اپریل ۱۹۲۳ء میں ایک خصوصی مضمون لکھا تھا۔ اس میں لب ولہجہ اتنا شدید اور بے خوف تھا کہ حکومت بمبئی کی طرف سے مدیر سے ایک سال کے لیے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی تھی، جس کے انکار پر ان پر مقدمہ چلایا گیا اور بالآخر ایک سال کی سزائے قید ہوئی۔[۴۶] عبدالماجد بدایونی، تحریکِ خلافت اور دیگر قومی تحریکوں کے سرگرم کارکن تھے۔ ''سوراج اور خلافت'' ان کا مثالی مضمون ہے۔ علامہ اقبال نے کچھ مضامین اُردو میں بھی تحریر کیے تھے۔ ان کے ایک مضمون کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے نام سے کیا تھا۔ ''مسلمانوں کا امتحان'' بھی اسی قسم کا مضمون تھا[۴۷] لیکن ان کا زیادہ اہم مضمون ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' ہے۔[۴۸] اس کا پس منظر مولانا ابوالکلام کا متحدہ قومیت کا نظریہ تھا۔ جسے وہ سیاسی جلسوں میں بیان کرتے رہتے تھے۔ اس تصور کی دینی تشریح کا کام مولانا حسین احمد مدنی نے انجام دیا تھا۔ اس کی تردید اور ابطال کا کام اوّلاً علامہ اقبال نے کیا۔ اس سلسلے میں ان کا موخرالذکر مضمون امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام ہی مسلمانوں کی قومیت ہے اور اس قومیت کے تقاضے اس وقت پورے ہوسکتے ہیں جب اسلامی نظام عملاً قائم ہو۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مسلمانوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو اور وہ اس کے حصول کے ذریعہ اسلامی حکومت قائم کریں۔ یہی خیال اپنے سلسلہ وار مضامین میں، جو رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا مقالہ ''مسئلہ قومیت'' ہے، جس میں اُنھوں نے متحدہ قومیت کے نظریہ کی تردید کی اور اسلام ہی کو مسلمانوں کی قومیت قرار دیا۔ ان کا دوسرا سلسلہ مضامین وہ تھا جس میں اُنھوں نے کانگریس کی حکمت عملی اور برطانوی حکومت پر نکتہ چینی کی۔ یہ مضامین کتابی صورت میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش میں شائع ہوئے۔ ان میں مسلمانانِ برِعظیم کے سیاسی اور تمدنی مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ متحدہ قومیت کو کانگریس کی اس حکمت عملی کا جو مسلمانوں کے حق میں مضر تھی، منام رکھا گیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہیں بھی تجویز کی گئیں۔ مولانا مودودی نے خلافت کے مسئلہ پر بھی مضامین تحریر کیے تھے۔ ''ممالک اسلامیہ کا مستقبل''، برطانیہ اور

ترکی''، ''ترکوں کا حسن سلوک''، ''پیرس کانفرنس کی تجاویز'' اسی سلسلے کے اور عالمِ اسلام کے مسائل کے بارے میں مضامین تھے۔ اپنے عہد کے سیاسی اور قومی حالات و واقعات پر ان کے مضامین ''مسلمانانِ ہند سے خطاب''، ''ہمارا نصب العین''، مہاتما جی کی گرفتاری''، ''تشدد اور اس کے نتائج''، ''کانگریس کا آخری فیصلہ''، ''کانگریس کے فیصلے کے اثرات''، ''ہمیں اپنی پالیسی بدلنی چاہیے'' مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ان رسائل میں تاج، معارف، نگاہ، مخزن، مدینہ، الجمعیۃ اور ترجمان القرآن قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے قوم کو مادی اور معاشی اصلاح کی دعوت دی تھی۔ ان کے خیالات پر شاہ ولی اللہ کی حکمت، روس کی اشتراکیت اور ترکی کی کمالی تحریک کے اثرات تھے۔ ایک طویل عرصہ ہندوستان سے باہر گزار کر واپس آنے کے بعد تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ اہم مسائل پر مضامین تحریر کیے۔ ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کا قیام'' مضمون سے زیادہ ان کے سیاسی نصب العین کا منشور ہے۔ اسی انداز کا مضمون ''جمعیت خدام الحکمۃ'' ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ کے افکار کی تبلیغ و اشاعت کا ایک منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ''قومی اجتماع ہند''، ''ہم کیا چاہتے ہیں'' ان کے سیاسی رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخرالذکر مضمون آزادیِ ہند کے تصورات کا اظہار کرتا ہے۔ آزادی کے جذبات کا اظہار ان کے سیاسی آئین کے اس خاکے سے بخوبی ہوتا ہے جسے اُنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے ۱۹۲۲ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ کی صورت میں قسطنطنیہ سے اُردو اور انگریزی میں طبع ہوا تھا۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ حصولِ آزادی اور انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادانہ اور فعال قوم کی مانند کس طرح رہنا چاہیے۔ وہ کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کے بجائے برِعظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تہذیب اور زبان کے فرق کی بنیاد پر تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعہ متحد رکھنا چاہتے تھے۔

یہاں ان مضامین کا ذکر بھی خصوصیت سے کیا جا سکتا ہے جو تحریکِ پاکستان کی معاونت اور حصول پاکستان کی جدوجہد کے طور پر لکھے گئے تھے۔ یہ مضامین رسائل میں بھی شائع ہوئے اور مختلف کتابوں میں اپنی نوعیت اور موضوع کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ عنوانات کے تحت بھی طبع ہوئے۔ تشریحات پاکستان ایسے ہی مضامین کا مجموعہ تھا، جو پاکستان کی تائید وحمایت میں لکھے گئے تھے۔ یہ مضامین مختلف پہلوؤں سے پاکستان کے سلسلے میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دور کرتے ہیں اور

دوسرے، پاکستان کے حصول میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور الزامات کے مدلل جوابات بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے ان مضامین کو مرتب کیا تھا۔ اس میں زیادہ تر انھیں کے مضامین شامل تھے۔ ان کے علاوہ مولانا مودودی، ریاض الحسن، سیّد محمود علی ہاشمی کے مضامین بھی اس میں شامل تھے۔ کچھ مضامین دوسری زبانوں سے ترجمہ تھے۔ اسی طرح کا ایک اور مجموعہ بھی قابلِ ذکر ہے، جسے مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے مرتب کیا تھا۔ پاکستان مخالفین کی نظر میں اس میں ایسے مضامین شامل تھے جو تحریکِ پاکستان پر لگائے گئے الزامات کے جوابات اور تردید میں تھے۔

ہنگامی، سیاسی اور ملکی موضوعات پر اشتعال انگیز مضامین کی جو روایت الہلال، ہمدرد، زمیندار وغیرہ نے قائم کی تھی، وہ تحریکِ آزادی کے آخری مرحلہ تک برقرار رہی۔ بعد میں انقلاب اور احسان ان کے پیرو ثابت ہوئے۔ یہ اخبارات تھے جو مضامین میں مذکورہ جرائد کی قائم کی ہوئی روایت پر قائم رہے۔ ان کے لکھنے والوں میں غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مرتضیٰ احمد خان میکش، چراغ حسن حسرت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ بہت سے مضامین صحافت کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ ان کا جائزہ آیندہ صحافت میں موجود ہے۔ بعض مخصوص سیاسی مضامین کے مجموعے بھی مرتب ہوئے، جن میں خاص ضرورتوں کے تحت لکھے جانے والے مضامین بھی شامل ہوتے یا کسی مخصوص مصنف اور سیاسی رہنما کے مضامین مرتب کیے جاتے۔ اس طرح کا ایک مجموعہ لاہور سے انقلابی انگارے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اسے جی آر سہگل نے مرتب کیا تھا۔ اس میں مشہور کانگریسی رہنماؤں کے مضامین شامل تھے۔ ان میں سے گاندھی، نہرو، سبھاش چندر بوس وغیرہ امتیاز رکھتے ہیں۔ گاندھی کے متفرق مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔

۴- اُردو صحافت میں آزادی کی جدوجہد

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک اُردو صحافت کا لب و لہجہ نرم اور مصلحت وقت کے مطابق تھا اور زیادہ تر اخبارات کی توجہ سیاست کے بجائے مغربی علوم و فنون کی اشاعت پر مرکوز رہی۔ جب حکمراں طبقہ کے طرزِ عمل میں کچھ بہتری کے آثار نظر آنے لگے تو اخبارات ملکی مسائل پر دبی زبان میں رائے زنی کرنے لگے۔ ان میں وہ اخبارات بھی شامل ہیں جو ۱۸۵۷ء سے قبل جاری ہوئے تھے۔ ان میں ایک قابل ذکر کوہ نور تھا۔ اس میں مقامی خبریں نہایت باقاعدگی سے چھپتی تھیں۔ جرائم کے واقعات، اہم عدالتی فیصلے، افسروں کی نقل و حرکت اور پھر غیر ملکی خبریں بھی چھاپی جاتی تھیں

جن میں افغانستان اور ایران کی خبروں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی۔ اس اخبار کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ حکومت کا طرف دار تھا۔ لیکن ایسے مواقع بھی آئے کہ اس نے تلخ لہجہ میں حکومت کو بعض معاملات میں متنبہ کیا۔ نظم ونسق کی خرابیوں پر نکتہ چینی کی۔ اودھ پر قبضہ کے بارے میں جتنی خبریں شائع ہوئیں ان میں بار بار اشارہ کیا گیا کہ لوگ انگریزوں کے آنے سے خوش نہیں ہیں[1]

کوہ نور کا ایک حریف اخبار دریائے نور تھا۔ یہ اخبار سرکاری امداد سے محروم تھا۔ نظم ونسق کی خامیوں پر تنقید کرتا رہتا تھا۔ پولیس کی زیادتیوں پر ٹوکتا تھا۔ عام لوگوں میں مقبول تھا[2] ان کا ایک ہم عصر پنجابی اخبار تھا، جو اُردو ہی میں نکلتا تھا۔ اس میں نیم سیاسی مضامین مقامی اور غیر ملکی خبریں چھپتیں۔ اُردو گائیڈ کلکتہ سے روزانہ شائع ہوتا تھا۔ یہ اُردو کے علاوہ انگریزی اشاعت پر بھی مشتمل ہوتا۔ اس میں ملکی مسائل اور بین الاقوامی حالات کی خوب عکاسی کی جاتی تھی لیکن ابتداءً نکلنے والے اخبارات میں زیادہ اہم اودھ اخبار تھا۔ اسے اُردو زبان و ادب کے ایک عظیم محسن منشی نولکشور نے لکھنؤ سے ۱۸۵۹ء میں جاری کیا[3] اس کے اجرا کا مقصد ہندوستانی ادب کی خدمت کرنا، تباہ کن اور ضرر رساں رسم و رواج سے قوم کو بچانا، اصلاحی اور ادبی جماعتوں کے مقاصد کی اشاعت کرنا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اخبار اپنے عہد کی ادبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور حقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے[4] اس میں بلا جھجک حکومت کے اعمال اور اس کی حکمت پر تنقید کی جاتی تھی[5] اس کا یہ رویہ انگریزی عمل داری کی بدانتظامیوں کی حد تک ہی نہیں تھا بلکہ ریاستوں کی بدانتظامی اور غفلت شعاری کو بھی پیش کرتا تھا۔ اس میں جانثاران وطن اور شہدا کی قربانیوں کی داستانیں بھی پیش کی جاتی تھیں[6]

اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے بڑے بڑے ادیب، شاعر اور انشا پرداز، رتن ناتھ سرشار، شرر، سیّد امجد علی اشہری، مرزا حیرت دہلوی، مولانا جالب دہلوی، احمد حسن شوکت، غلام محمد خان تپش وغیرہ تھے۔ اس اخبار نے بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر مضامین شائع کیے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے حق میں مراسلات شائع کیے۔ اسلامی ممالک کی سیاست میں جہاں تک ہوسکا ہمدردانہ انداز میں مضامین لکھے۔ انگریزی حکومت کے اس خیال کی تردید میں کہ ''وہابی مسلمان حکومت برطانیہ کے دشمن ہیں'' کئی مضامین نہایت شدومد کے ساتھ شائع کیے[7] مسلمانوں کی جانب سے ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ برار کے مسئلہ الحاق پر ریاست حیدرآباد کی حمایت اور حکومت کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی۔ اس کے مطبع نے اسلام کی بحیثیت مجموعی نمایاں خدمت کی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہایت

کم یاب اسلامی کتابیں چھاپیں۔ جنگ روم و روس میں مطبع کی معرفت قسطنطنیہ اور عسا کر سلطانی کو ہندوستان سے خطیر چندہ بھیجا گیا۔

سیاسی خبروں کے لیے اخبار تاریخ بغاوت ہند بھی خاصا اہم تھا، جسے مکند لال نکالتے تھے۔ یہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات و حالات کے لیے وقف تھا۔ اس میں سلسلہ وار برّعظیم کے مختلف علاقوں اور شہروں کے جنگ آزادی کے واقعات شائع ہوتے تھے۔ اس موضوع کے علاوہ کوئی اور موضوع اس میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ اخبار مطبع مفید الخلائق سے شائع ہوتا تھا جس کے مالک منشی شیونرائن آرام، غالب کے شاگرد تھے۔[۸]

شمس الاخبار، جو مدراس سے ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا، ملکی حالات کے علاوہ غیر ملکی خبریں چھاپتا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جنگ روم و روس کے زمانہ میں اس اخبار نے ہندوستانی مسلمانوں کو حکومت ترکی کی امداد کی ترغیب دلائی۔ ہندوستان سے بھیجی جانے والی امدادی رقم میں اس اخبار کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اسی خدمت کے صلہ میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے اس اخبار کو ''تمغۂ مجیدیہ'' دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس اخبار نے ''تمغۂ مجیدیہ'' کو اپنا علامتی نشان قرار دیا اور یہ ہمیشہ سرورق پر شائع کیا جانے لگا۔[۹]

شعلہ طور میں عام طور پر معاشرتی اور سیاسی واقعات کے بارے میں خبریں ہوتی تھیں۔ یہ ۱۸۶۰ء سے جاری ہوا تھا۔ سیاسی خبروں میں اس کی وہ خبریں زیادہ اہم ہیں جو ہندوستانی انقلابیوں کے حالات و واقعات اور ان پر چلائے گئے مقدموں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ یہ اخبار ایسی خبروں کو خصوصیت سے جگہ دیتا تھا۔[۱۰] بعض شذرات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں انتظامی امور کے سلسلے میں حکومت کو مشورہ دیا جاتا اور بعض اوقات نکتہ چینی کی جاتی۔ اسی سال ایک اخبار خیر خواہ خلق جاری ہوا تھا۔ اس میں روزمرہ کی خبروں کے علاوہ اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایسے مضامین توہمانہ خیالات اور جبریہ تبدیلی مذہب کی مخالفت میں ہوتے۔ یہ حکومت کی بعض حامت عملیوں پر تنقید بھی کرتا تھا۔ مثلاً اس میں ہندوستانیوں کو اسلحہ سے محروم رکھنے پر حکومت پر تنقید کی گئی تھی۔ حکومت اس اخبار کی روش کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی چناں چہ اس اخبار کی اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی۔[۱۱]

اخبار عالم میرٹھ سے نکلتا تھا۔ اس کا سنہ اجرا ۱۸۶۱ء ہے۔ اس کے مدیر منشی عبدالحلیم تھے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ملکی خبریں نثر میں اور مقامی خبریں نظم میں شائع ہوتی تھیں۔ غیر ملکی خبریں بھی اس میں چھپتی تھیں۔ ملکی اور مقامی خبروں میں ایسی خبریں اہم ہیں جو یہ اخبار خصوصیت سے

مجاہدین وطن کے بارے میں شائع کرتا تھا۔ ۲۴؍نومبر ۱۸۶۴ء کی اشاعت میں مولوی احمد اللہ کی گرفتاری پر تبصرہ ہے۔ ۲۳؍نومبر ۱۸۶۴ء کے پرچہ میں وہابیوں کی باغیانہ نقل وحرکت کی خبریں شائع ہوئی ہیں۔ ۲۲؍جون ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں ایک معروف انقلابی کے کارنامے تحریر کیے گئے ہیں۔ ۳؍اگست ۱۸۶۵ء کے شمارہ میں ایک شخص کے باغیانہ منصوبہ کا ذکر ہے۔[۱۲]

اخبار عالمتاب ۱۸۶۱ء میں آگرہ سے نکلا تھا۔ اس میں خبروں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے حالات بھی شائع ہوتے تھے۔ آگرہ سے ۱۸۶۲ء میں آب حیات جاری ہوا۔ اس کے مدیر بنسی دھر ''انجمن حق'' کے صدر بھی تھے، جو ایک اصلاحی انجمن تھی۔ اس اخبار کا مقصد بھی ہندوستانیوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح تھی۔ بھارت اکھنڈ امرت ۱۸۶۴ء میں آگرہ سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ بھی ہندوؤں کی ایک معاشرتی اور مذہبی اصلاح کی ایک انجمن کے زیرِ اہتمام نکلتا تھا۔ اسی سلسلے میں رسالہ انجمن اسلامی بھی ہے جو کلکتہ سے ۱۸۶۳ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ ''مجلس مذاکرہ علمیہ اسلامیہ'' کلکتہ کا ترجمان تھا، جس کے صدر مشہور قومی رہنما نواب سیّد عبداللطیف خاں تھے۔ اس رسالے میں مجلس کی روداد شائع ہوتی تھی۔ اس مجلس کے قیام کا مقصد علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو متوجہ کرنا تھا۔ قومی ادبیات کو فروغ اور حُبّ الوطنی کو پیدا کرنا تھا۔ اس نے انگریزی تعلیم کے حصول پر بھی زور دیا تھا۔[۱۳] نواب سیّد عبداللطیف اور سیّد احمد خاں کے مقاصد اور کام میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ اس زمانہ میں مختلف انجمنوں کی جانب سے اپنے اپنے رسائل کا اجرا ہونے لگا تھا جو انجمنوں کے مقاصد کی تشریح اور تشہیر کرتے تھے۔ ان میں گو سیاسی مسائل اور عوام اور حکومت کے تعلقات کی نوعیت کو سیاسی پس منظر میں نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن یہ رسالے اس اعتبار سے اہم ہوتے تھے کہ ان کے ذریعہ ہندوستانیوں میں تعلیمی، قومی اور سیاسی شعور ضرور پیدا ہوتا تھا۔ اس تعلق سے رسالہ انجمن پنجاب بھی خصوصیت رکھتا ہے، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی صدارت میں بنائی جانے والی ''انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب'' کے زیرِ اہتمام نکلتا تھا۔ اس انجمن اور اس کے رسالے کے اجرا کا اہم مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ قدیم مشرقی علوم کا احیا دیسی زبانوں کے ذریعہ عام علمی ترقی، حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنا تھا۔ اس میں دیگر موضوعات کے علاوہ معاشرتی مسائل اور تاریخی واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں رسالہ کی جگہ انجمن ہی کے زیرِ اہتمام ہمائے پنجاب کے نام سے ہفت روزہ جاری ہوا۔ ایک سال بعد ہمائے پنجاب بند کرکے اس کی جگہ اخبار انجمن پنجاب نکلنے

لگا۔ اس میں اعلیٰ پائے کے علمی مضامین چھپتے تھے۔ خبریں بھی ہوتی تھیں اور غیر ملکی خبریں ترجمہ کی جاتیں۔ نیم سرکاری تھا لیکن کبھی کبھی نظم ونسق پر نکتہ چینی کرتا تھا اور بعض اوقات انگریزی عہد پر بڑے کھلے انداز میں تنقید بھی کر دیتا تھا۔

لارنس گزٹ اپنے مقاصد کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس کا اجرا میرٹھ سے ۱۸۶۴ء میں ہوا تھا۔ اسمٰعیل خاں اس کے مدیر تھے۔ اپنے حقوق کے حصول اور حفاظت کے لیے جدوجہد اس اخبار کی ترغیب خاص تھی۔ کارنامہ لکھنؤ سے ۱۸۶۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس میں ملکی حالات تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شائع ہوتے تھے اور گاہے گاہے حکومت کی سیاسی حکمت عملیوں پر تنقید بھی کی جاتی تھی۔ اکمل الاخبار سیّد فخرالدین دہلی سے نکالتے تھے۔ اس کا سنہ اجرا ۱۸۶۶ء ہے۔ اخبار نڈر اور بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے نہیں چوکتا تھا۔ حکومت کے غلط فیصلوں اور نظم ونسق کی خرابیوں پر عام طور سے نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔ سیاسی خبریں بالخصوص درج ہوتیں۔ جنگ آزادی کے مجاہدین کی گرفتاری اور ان پر چلائے جانے والے مقدمات کا ذکر بڑے ہمدردانہ لہجہ میں کرتا تھا۔[۱۴] ہر اعتبار سے یہ انتہائی سنجیدہ اور متین اخبار تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کا لب ولہجہ اور موضوعات تحریر عام طور پر اودھ اخبار کی ہمسری میں ہوتے۔ اس وقت جتنے اخبار اور رسائل شائع ہوتے تھے، وہ ان میں زیادہ مثالی تھے۔ ان کے بعد اُردو صحافت میں سیّد احمد خاں کا نام نمایاں اہمیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔

سیّد احمد خاں میں زبردست قوت عمل اور قومی خدمت کے لیے جذبۂ پُرسوز موجزن تھا۔ اس کے تحت اُنھوں نے اپنے لیے جو لائحہ عمل اختیار کیا تھا اس میں تعلیم کو خاصی اہمیت دی تھی۔ اوّلاً اُنھوں نے ''باشندگان ہند کی تعلیمی ترقی کے متعلق باشندگان ہند کے نام'' ایک پیغام جاری کیا، جس میں اس امر پر زور دیا کہ مغربی علوم کو اُردو تراجم کے ذریعہ برِّعظیم کے باشندوں میں مقبول عام بنایا جائے۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں، جہاں سیّد احمد خاں اس وقت مامور تھے، ''سائنٹی فک سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ اسی سال ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا اور سوسائٹی ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوئی۔ اس سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل اور مسلمانوں میں علوم وفنون جدیدہ کو ترقی دینے کے لیے اُنھوں نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ سے جاری کیا۔ بعد میں اس کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہوگیا۔ ۲۰ر مارچ ۱۸۶۶ء کو اس کا اجرا ہوا۔ ادارت کے فرائض، چند مختصر وقفوں سے قطع نظر، سیّد احمد خاں ۱۹ر مارچ ۱۸۹۸ء وفات سے نو دن پہلے تک انجام دیتے رہے۔ اس میں سیّد احمد خاں کا آخری

اداریہ اُردو کی حمایت میں ہے۔ یہ اخبار سیّد احمد خاں کی وفات کے بعد بھی نکلتا رہا۔ اس کے اجرا کا مقصد احوال و کوائف کے علاوہ ہندوستانیوں کو ''چھوٹی چھوٹی مختصر باتیں بتانا'' مقصود تھا، تاکہ ہندوستانیوں کے ذہن وفکر پر جو فرد عات کا غبار چھایا ہوا تھا، دور ہو جائے۔ یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اُردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ ایک طرف حکومت کو اور انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے خیالات اور احساسات سے آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ہندوستانیوں میں سیاسی ذوق پیدا کیا جائے اور انھیں انگریزی طرز حکومت سے آشنا کیا جائے۔ اس میں معاشرتی، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر قسم کے مضامین شامل ہوتے۔ اس میں ہندوستانیوں کو آزادی اور اطاعت دونوں باتیں سکھائی جاتی تھیں[۱۵] حکومت اور حکام کے نزدیک یہ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار مسلمانوں کے خیالات کا ترجمان تھا۔

عام طور پر اس کے اداریے سیّد احمد خاں ہی تحریر کرتے تھے۔ ان کے مضامین میں بظاہر انگریزوں کی طرف داری اور حمایت میں بہت کچھ ملتا ہے لیکن بسا اوقات خاص خاص واقعات و کوائف پر بڑی بے باکی سے نکتہ چینی اور تنقید کرتے۔ یہ تنقید حکومت پر بھی ہوتی اور افسران وعمال پر بھی۔ مثلاً ان کے یہ اداریے ان کے لب ولہجہ کی تلخی اور تنبیہ دونوں کو ظاہر کرتے ہیں: ''بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ہے''، ''ہندوستانیوں اور انگریزوں کی راہ و رسم'' اور تہذیب اور بے تہذیبی'' وغیرہ۔ اخبار کے معاونین میں حالی، ذکاء اللہ، آرنلڈ، دِیناناتھ گنگولی، وحیدالدین سلیم، کاشی ناتھ، سمیع اللہ خاں، حاجی محمد اسماعیل، منشی پیارے لال، تھیوڈر بک، غلام الثقلین، احمد علی شوق قدوائی، خوشی محمد ناظر جیسے ادیب اور رہنما تھے۔ ان افراد نے مختلف موضوعات کو منتخب کر کے مضامین تحریر کیے۔ تعلیم اور سائنس، سیاست، معیشت معاشرت، جمہوریت، اخلاقیات، مذہب، صنعت وحرفت، ملکی قوانین، بین الاقوامی حالات، اُردو زبان اور تہذیبی مسائل جیسے موضوعات پر ہندوستانیوں کے ذہن کو سوچنے پر راغب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے تمام شعبوں میں حرکت وعمل کی روح سرایت کر گئی اور سیاست و معاشرت میں جدید تصورات عام ہوئے۔ ساتھ ہی اس نے اُردو صحافت میں بھی ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس کے زیر اثر اچھی خاصی تعداد میں اخبارات کا اجرا ہوا۔ اخبار انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، اخبار الاخیار مظفر پور، مفید عام آگرہ، اخبار سوشل راجپوتانہ، اخبار انجمن، شاہ جہاں پور قابل ذکر

ہیں جو گزٹ کے خیالات و مقاصد کو پھیلانے میں کوشاں رہے۔ ان کے علاوہ اُردو گائیڈ کلکتہ، پنجابی اخبار لاہور اور پٹیالہ اخبار پہلے ہی سے سیّد احمد خاں کے خیالات کی اشاعت کرتے رہتے تھے۔ بیسویں صدی میں اس کے اثرات الہلال اور ہمدرد میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں کی صحافت کا مزاج بلند ہمتی اور قومی ہمدردی کا آئینہ ہے۔ متانت اور سنجیدگی ان کا خاصہ ہے۔ بعد میں حالات کے فرق کے ساتھ اظہارِ خیال میں جوش اور ہیجان کا اضافہ فطری امر تھا۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجرا تک سیّد احمد خاں کا سیاسی اور تہذیبی نقطۂ نظر محض مسلمانوں تک مخصوص نہیں تھا۔ اُردو ہندی کا جو لسانی تنازعہ واقع ہوا اس میں کھل کر ہندوؤں کا مطمحِ نظر ان کے سامنے آ گیا۔ یہ نتیجہ اُنھوں نے صحیح اخذ کیا تھا کہ وقت ان دونوں قوموں ہندو مسلمانوں کی درمیانی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دے گا۔ سیّد احمد خاں کی تحریریں، تقریریں اور ان کا کام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ایک قوم ہونے پر عقیدہ رکھتے تھے چناں چہ اب اُنھوں نے وقت کی مصلحت کے تحت جو تعلیمی، مذہبی، معاشرتی تحریک شروع کی، اس کا خطاب خاص طور پر مسلمانوں سے تھا۔ پھر اُنھوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ قوم کے اندازِ فکر کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس میں خبریں نہیں، ایسے مضامین چھپتے تھے جن سے قوم کا اندازِ فکر بدلنا مقصود تھا۔ مقصد کے اعتبار سے کہیں کہیں تہذیب الاخلاق اور گزٹ کی سرحدیں ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن گزٹ کا حاوی رجحان اخباریت کی طرف تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کا غالب میلان مجلّہ اور جریدہ کی جانب رہا۔ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے لیے اس کے سرورق کا نمونہ اور اس کے متن کا تصور سیّد احمد خاں انگلستان سے لائے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ چھ سال کی زندگی کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ تین سال بعد دوبارہ جاری ہوا لیکن دو سال پانچ ماہ بعد پھر بند ہو گیا۔ بارہ سال کے بعد ۱۸۹۴ میں اس کا تیسرا دور شروع ہوا جو تین سال بعد ختم ہوا اور یہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر دیا گیا۔[۱۲]

تہذیب الاخلاق اور گزٹ میں جو خیالات اور نظریات پیش کیے جاتے تھے وہ پہلے پہل عام مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں ان کا اثر پھیلتا گیا۔ لوگ متوجہ ہوئے۔ کچھ افراد نے اس کے زیرِ اثر اپنے طور پر بھی کام شروع کیا۔ مدارسِ اسلامیہ قائم ہوئے۔ جدید علم سے شغف پیدا ہوا، مسلمان اپنے ماضی سے واقف ہوئے۔ ان میں ترقی کا جذبہ

بیدار ہوا۔ عام مسلمانوں میں اعتماد اور اپنی مدد آپ کا احساس پیدا ہوا۔ بحیثیت مجموعی مسلمانوں میں قومی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں ان کا خاص حصہ ہے ان کے معاصر اخبارات نے ان کے زیر اثر قومی اور سیاسی رجحانات کو پیش کرنا شروع کیا۔ ان میں ایک آگرہ اخبار تھا۔ یہ ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر بوستان علی بے کے پیش نظر ''اخبار نویسی تو صرف بہانہ تھا'' ورنہ ان کا اصل مقصد ''ہندوستان میں آزادی کا پھیلانا تھا''۔[17] اس میں دوسرے اخبارات کے بھی آزادانہ اور بے باک مضامین نقل ہوتے تھے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ حکومت پر تنقید کی جاتی تھی۔ ہندوستانیوں کے جذبات کو حاکم و محکوم کا فرق دکھا کر مشتعل کرنا اس کا کام تھا۔[18]

خیر المواعظ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا پیش نظر مقصد اصول اسلام کی نشر و اشاعت اور عیسائیت کا رد تھا۔[19] اور اصل میں عیسائیوں کے رسالے مواعظ عقبی کے جواب میں نکلتا تھا۔ اسی طرح کے اخبارات بڑی تعداد میں نکلتے رہے، جن میں عیسائیت کا رد کیا جاتا تھا، ان کا ایک مختصر جائزہ گزشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔

دبدبۂ سکندری ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں، والیِ رام پور کی ایما سے جاری ہوا تھا۔[20] اس میں غیر ملکی خبریں زیادہ جگہ پاتی تھیں۔ انگریزی حکومت کے خلاف افغانستان میں جو بغاوتیں ہوتی رہیں، اس اخبار میں ان کی تفصیلات گاہے گاہے شائع ہوتی تھیں۔ روس کی سیاسی حکمت عملیوں کا مخالف تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے عزائم پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ ملکی مسائل پر بعض اوقات مناسب موقعوں پر حکومت کی غلط کارروائیوں پر ٹوکتا تھا۔ اس کی ایک اشاعت میں انگریزوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا حال درج کیا گیا تھا۔[21]

رسالہ دہلی سوسائٹی اپنی انجمن کا ترجمان تھا۔ یہ انجمن ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی تھی اور رسالہ اس کی روئداد کا مشتہر تھا۔ اس انجمن کو اپنے وقت کے اہم دانش وروں، شاعروں، ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔ ماسٹر رام چندر، غالب، حالی، پیارے لال، سداسکھ، سیف الحق ادیب، ذکا اللہ وغیرہ۔ اس میں حالات حاضرہ کے متعلق مضامین پڑھے جاتے، مذاکرے ہوتے، اسی طرح ''انجمن مناظرہ'' دہلی میں کام کرتی تھی، اس کا مقصد تعلیم کا فروغ، ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار خیال اور ہندوستانی تہذیب کا تحفظ تھا۔ یہ انجمن بھی ایک رسالہ نکالتی تھی جس میں تعلیم کو فروغ دینے کے سلسلے میں خاص طور پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ شہری زندگی کے مسائل اور اس کی تکالیف بھی اس میں

بیان ہوتی تھیں۔ دیگر اصلاحی اور معاشرتی انجمنیں بھی اپنے اپنے ملک کی تشہیر کے لیے اخبارات و رسائل نکالتی رہتی تھیں۔ ان کا واضح مقصد محض اپنے دائرہ کار کو زیادہ متاثر کرنا تھا۔[۲۲]

اخبار عام لاہور سے نکلتا تھا۔ پنڈت مکندلال نے اسے ۱۸۷۱ء میں جاری کیا تھا۔ دیسی ریاستوں کی خبریں، غیر ملکی اور فوجی معلومات اور کبھی کبھی مذہبی تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کی حکمت عملی انگریزوں کے خلاف نہیں تھی لیکن کبھی کبھی آزادی کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ حکومت پر نکتہ چینی کا انداز کہیں کہیں محسوس ہوتا تھا۔ غیر اخباری مضامین درج نہیں ہوتے تھے۔ سیاسی غزلیں اور نظمیں بالالتزام چھپتی تھیں۔ مغربی تہذیب اور تمدن کے خلاف اس نے متواتر مضامین شائع کیے۔ دیگر اسلامی ممالک میں انگریزوں کے ظلم و جبر اور حاکمیت کو نشانۂ تنقید بناتا رہتا تھا۔ مصریوں نے غلامی کے خلاف جو تحریک شروع کر رکھی تھی، اس اخبار نے اس کی حمایت میں کئی خبریں شائع کیں۔

نورالانوار کان پور سے نکلتا تھا۔ اس میں سیّد احمد خاں کے خیالات اور ان کی تحریک کا رد کیا جاتا تھا۔ سیاست میں اس کا مطمحِ نظر قدامت پرستانہ تھا۔ انگریزی عہد میں ہندوستانیوں کی محکومی اور تذلیل پر اس کا رویہ انگریزوں سے معاندانہ اور ہندوستانیوں سے ہمدردانہ رہا۔ اسلامی ممالک میں اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں کی تائید کرتا رہتا تھا۔ اس طرح کا اخبار منشور محمدی تھا جسے بنگلور سے منشی محمد قاسم غم ۱۸۷۲ء سے نکالتے تھے۔ اس کا واضح مقصد ردعیسائیت تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور اُن کی خود غرضیوں کا بے باکی کے ساتھ پردہ چاک کرتا تھا۔ ہندوستان کی محکومی اور مفلوک الحالی کا خاص طور پر تذکرہ کرتا۔ اس نے بین الاقوامی سیاسی منظر میں ہندوستان کو دیکھنے اور ہندوستانیوں کو آگاہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ روس کے عزائم کا پردہ چاک کرتا اور ترکوں کے بارے میں بکثرت خبریں دیا کرتا تھا۔ اسلامی ممالک میں انگریزوں کے خلاف جو تحریکیں جاری تھیں، ان کی پُر جوش حمایت اس کا نصب العین نظر آتا ہے۔ ناصر الاخبار کا بھی یہی طریقہ کار تھا۔ عیسائی مشنریوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا اور اسلامی ممالک کی تحریکات آزادی کی حمایت میں اپنی آواز بلند کرتا تھا۔

ریاض خیرآبادی ریاض الاخبار نکالتے تھے۔ اس میں ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ سیاسی اور معاشرتی معاملات پر مشتمل مضامین بھی شائع ہوتے۔ ان معاملات پر اس میں خاصے پیرایہ میں رائے زنی کی جاتی تھی۔ اس اخبار کی رائے قومی و ملکی معاملات میں موثر تھی۔[۲۳] حکومت کے انتظامی

اُمور پر تنقیدی تبصرے عام طور پر اس میں شامل ہوتے۔ اخبار محافظ بنگلور بنگلور سے ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ زمرہ احباب کا ترجمان تھا۔ قومی ہمدردی، حُبّ الوطنی اور صداقت کا اظہار اس کا شعار تھا۔ اس کے مندرجات عام استفادے اور خصوصاً ہندوستانیوں کے تمدن و معاشرت کی ترقی اور اصلاح کی نسبت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ضروری سیاسی معاملات پر بحث بھی اس کا مقصد تھا۔[۲۴] مرأۃ الہند لکھنؤ سے نیم سیاسی، سماجی اور علمی و ادبی مضامین کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۸۷۵ء سے جاری ہوا تھا۔ انگریزوں کے اقتصادی استحصال اور انتظامی بدعنوانیوں پر تنقید کرتا تھا۔ اقتصادی مسائل پر مضامین اس کا خاص حصہ تھے۔ ہندوستانی ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ حالات حاضرہ اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ اور متین انداز میں تبصرہ کرتا تھا۔ اس کے مدیر نے اسے سیاسی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کانگریس کا ترجمان تھا۔ قیصر الاخبار، الٰہ آباد سے سراج الدین خاں نکالتے تھے۔ زیادہ تر غیر ملکی خبریں ہوتی تھیں۔ اندرون ملک کے سیاسی مسائل پر طنزیہ اشارات میں تبصرے کیے جاتے تھے۔ الٰہ آباد ہی سے احسن الاخبار محمد کبیر الحق نکالتے تھے۔ اس کی خبروں میں اسلامی ممالک کی خبریں زیادہ ہوتی تھیں۔ جنگ روس و ترکی کے وقت ترکوں کی حمایت میں بھرپور کوششیں کیں، چندے کی تحریک کی۔ اس کے صلہ میں سلطان عبدالحمید کی جانب سے ''تمغۂ مجیدیہ'' عطا ہوا۔ اس نے ترکی کے معاملات پر رائے عامہ کو بڑا ہموار کیا تھا۔ ایسے ہی اور اخباروں میں شمس الاخبار اور جریدہ روزگار تھے۔ یہ ترکوں کے معاملات میں ہمدردانہ خبریں شائع کرنے میں دوسروں پر سبقت اور فوقیت رکھتے تھے۔ جنگ روس و ترکی میں برطانیہ کی حکمت عملی پر نکتہ چینی اور مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کرتے رہے۔

ہندوستانی کی طرح کانگریس کے حامی اخبارات میں زیادہ مقبول اور اہم اخبار اودھ پنچ تھا۔ اُنیسویں صدی ہی میں پنچ اخباروں میں متعدد اخبار جاری ہوئے[۲۵] ان میں اکثر شائستگی کی حدود سے دور تھے اور اُنھوں نے اپنے اجرا کا کوئی افادی مقصد بھی پیش نہیں کیا۔ ان تمام پنچ اخباروں میں جو مقام اور معیار اودھ پنچ کو حاصل ہوا۔ وہ منفرد اور مثالی ہے۔ یہ جنوری ۱۸۷۷ء میں اپنے زمانہ کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردِعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ منشی سجاد حسین کی ادارت میں کم و بیش ساٹھ سال تک نکلتا رہا۔ منشی سجاد حسین صوبہ میں کانگریس کے رکن تھے۔ لہٰذا اودھ پنچ بھی کانگریس اور اس کی تحریک کا مددگار اور مبلغ رہا۔ ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور حُبّ الوطنی کا مداح تھا۔ سجاد حسین نے اپنی

ذات کی طرح اسے بھی سیاسی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس وقت جو کام ہندوستانی کانگریس کے لیے کر رہا تھا، اودھ پنچ نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کام انجام دیا اور اس وقت کوئی قابل ذکر اخبار مسلمانوں کا ایسا نہیں تھا جو کانگریس کا حامی ہو۔ ہندوستانی، ایڈووکیٹ، اودھ پنچ ہی کانگریس کے بڑے حامی اور علی گڑھ تحریک کے اتنے ہی مخالف تھے۔ سیاست میں اس کا اپنا مخصوص کارنامہ ہے۔ ابتدا ہی سے عوامی رجحانات کا حامل رہا اور جس وقت کوئی سیاسی جماعت فعال نہیں تھی، عوام کے مسائل اور محسوسات کو بیان کرتا اور حکومت کو مشورہ دیا کرتا۔ اہم مسائل، جیسے الحاقِ اودھ، انکم ٹیکس کا نفاذ، البرٹ بل وغیرہ پر عوامی رائے کی نمایندگی کی اور اس سلسلے میں حکومت پر اپنے مخصوص انداز میں سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ جن باتوں کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا جاتا اور وہ تلخ محسوس ہوتیں، اودھ پنچ نے طنز اور ظرافت کی آڑ میں وہ سب بیان کر دیں۔ اس کا یہ طریقہ کہ جو سیاست کو ظرافت میں پیش کرتا تھا، نہایت مؤثر تھا۔ اس میں ہر اہم سیاسی اور قومی مسئلہ پر حکومت پر طنز و تشنیع کی جاتی۔ اس کے کارٹون حالات زمانہ کے بہترین عکاس ہوتے۔ ریاستی حکمرانوں کی غفلت، عیاشی اور نااہلی بھی اس کی تنقید کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔ اپنے مسلک کے اعتبار سے مغربی تہذیب کی مخالفت اور مشرقی اقدار کی علم برادری اس کا شعار رہا۔ اس کے خاص مضمون نگاروں میں منشی سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، اکبر الٰہ آبادی، احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف وغیرہ تھے۔

رفیقِ ہند لاہور سے ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر محرم علی چشتی تھے۔ اس کے اجرا کا مقصد آزادی سے اپنے حقوق کا اظہار تھا۔ حتیٰ المقدور قوم میں اتحاد کی اشاعت اور قوم پر کی جانے والی خلاف قانون زیادتیوں کو پیش کرنا اس کا وطیرہ تھا۔ یہ خاص طور پر مسلمانوں کے حقوق کا علم بردار تھا۔ ابتداءً سید احمد خان کی تحریک کا مؤید رہا لیکن مذہبی نظریات میں اختلاف رائے پیدا ہونے کے بعد اس کا مخالف بن گیا۔ میسور اخبار بنگلور سے ۱۸۷۴ء میں جاری ہوا تھا۔ آزادیِ صحافت کا علم بردار تھا۔ علمی اور قومی مضامین کے علاوہ اس کے اداریے پُر از معلومات ہوتے تھے۔ منشورِ الاسلام پہلے بمبئی سے پھر حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا۔ آزاد خیال تھا اور حکومت پر کڑی نکتہ چینی کرتا تھا۔ مشیر دکن بھی حیدرآباد دکن سے جاری ہوا تھا۔ بڑا معتدل نقطۂ نظر رکھتا تھا، اور بلحاظ مذہب ملک اور قوم کا ترجمان تھا۔ اس کے ادارتی مضامین میں ملک کی تعلیمی حالت، معاشرتی حالت اور اس

کی اصلاح کے ساتھ ساتھ حکومت کے اعمال اور ان کی بدعنوانیوں پر اظہار کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کے بعض اداریوں کے عنوانات ایسے تھے۔ ''آزادی''، ''مسلمان اور نیشنل کانگریس''، ''اعلیٰ عہدیداروں کا الاؤنس''، ''بیتیسی سکہ''، ''پولٹیکل گھنگھور گھٹا'' وغیرہ۔

اس دور میں پیسہ اخبار زیادہ جدید رجحانات کا علم بردار تھا۔ اور اسے اس وقت کی اُردو صحافت میں نمایاں اہمیت حاصل رہی۔ اس کے مدیر مولوی محبوب عالم، اس سے قبل اپنے مطبع خادم التعلیم، لاہور سے کلید امتحان، ہمت اور سکول ماسٹر نکالتے رہے تھے۔ ابتدا میں کانگریس کے زبردست حامی تھے لیکن جب کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ دیکھا اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کا اندازہ ہوا تو کانگریس کے مقاصد سے قطع تعلق کر کے مسلمانوں کی ترجمانی اور حمایت کو اپنا شعار بنالیا[۲۶] ویسے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمت کو پیسہ اخبار میں تبدیل کرایا تھا۔ اس کی قیمت صرف ایک پیسہ تھی۔ اپنی کم قیمت اور دل چسپ مضامین کی بدولت بہت جلد مقبول ہوگیا۔ آخر وقت تک مسلمانوں کی سیاست کانگریس ترجمان رہا۔ سودیشی تحریک کے زمانہ میں سلامت روی اور مستقل مزاجی سے مسلمانوں میں کام کرتا رہا۔ مسلمانوں کے حقوق کا علم بردار تھا۔ ان میں تعلیم کی اشاعت کے لیے کوشاں رہا۔ سیاست میں اعتدال پسند اور اسلامی تحریکوں کا حامی تھا۔ متانت اور سنجیدگی اس نے ہر موقع پر برقرار رکھی۔ اسی کے انداز اور طریقہ کا حامل ایک اور اخبار وکیل امرتسر سے نکلتا تھا۔ سنجیدگی، اعتدال اور متانت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق اور اسلامی سیاست کی ترجمانی میں اس کو انفرادیت حاصل رہی۔ سیاسی اور قومی مسائل پر پُر وقار انداز میں اپنی رائے دیتا تھا۔ اس اخبار سے مولانا ابوالکلام، مولانا عبداللہ العمادی جیسی شخصیات وابستہ رہیں۔ اپنے وقت میں تمام اُردو اخبارات میں سب سے زیادہ متین اور سنجیدہ اور قومی مسائل میں صاحبِ رائے اخبار تسلیم کیا جاتا تھا۔ ترکی اور مصر کے معاملات سے عام دل چسپی اس نے پیدا کی۔ اور اس بارے میں ہمیشہ آزادانہ آرا اس کے صفحات سے نکلیں۔ ایسا سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان میں ترکی کے مسائل پر آزادانہ رائے رکھنے والا صرف یہی ایک اخبار ہے۔ صلح کل نے بھی پیسہ اخبار اور وکیل جیسا رویہ اور لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔

اتحاد مدراس سے انجمن اسلامیہ کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی قومی اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ تھا۔ اس نام کا ایک اخبار عبدالحلیم شرر بھی نکالتے تھے۔ اس کا خاص مقصد

ہندو مسلمانوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا تھا۔ یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ اس کے صرف چند شمارے ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان شائع ہوئے۔ یہ صرف سیاست سے متعلق رہا اور دیگر مسائل و موضوعات کی طرف اس نے توجہ نہ دی۔ اس وقت کے اہم ادیب اور مصنفین اس سے وابستہ ہوئے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ شرر نے اس کے علاوہ محشر اور دلگداز میں بھی سیاسی اور قومی مسائل کو جگہ دی تھی۔ لیکن صحافت میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ مہذب ہے، جسے اُنھوں نے لکھنؤ سے اگست ۱۸۹۰ء میں جاری کیا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت میں اُنھوں نے اغراض و مقاصد کے ضمن میں جو کچھ تحریر کیا تھا وہ ان کے مطمحِ نظر کو ظاہر کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے تین اصول وضع کیے تھے۔ "پالیٹکس"، "سوسائٹی" اور "لٹریچر"۔[۲۷] سیاسی اعتبار سے شرر سیّد احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس سے دور رہیں۔ کانگریس کے قیام کو اُنھوں نے ہندو مسلمانوں میں تنازع کی ابتدا کا سبب قرار دیا۔ کانگریس اور اس کے قیام کے مقاصد پر اُنھوں نے بارہا تنقید کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ آریا سماج سبھا بھی ان کی نکتہ چینی کا نشانہ بنی۔ ان کے خیال میں متحدہ قومیت کا تصور ناممکن تھا۔ ۲۳ر اگست ۱۸۹۰ء کے شمارہ میں اُنھوں نے مسلمانوں کو علاحدہ قوم قرار دیا۔[۲۸] اس سے بھی بڑھ کر اُنھوں نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو علاحدہ علاحدہ قومیں اتحاد اور اتفاق سے نہیں رہ سکتیں۔ اُنھوں نے اس کا یہی حل تجویز کیا کہ ہندوستان کے اضلاع کو ہندو اور مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی اپنی آبادیاں علاحدہ کرلیں۔ اس لیے کہ ہندو مسلمانوں کو پُرسکون نہیں رہنے دینا چاہتے اور مسلمان بھی ہندوؤں سے تنگ آچکے ہیں۔[۲۹] فی الحقیقت یہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں سیاسی مسئلہ کا پہلا حل تجویز کیا گیا تھا۔ مہذب میں زیادہ تر شرر ہی لکھا کرتے تھے۔ اسے دراصل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا نقشِ ثانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تہذیب الاخلاق کا پرتو معارف میں نظر آتا ہے۔ معارف کے انداز میں الندوہ، ... گزٹ، صلائے عام وغیرہ بھی اسی زمانہ میں جاری ہوئے۔ ایسے جتنے بھی رسائل شائع ہوئے، ان کا زیادہ غالب رجحان ادب اور اصلاح کی طرف رہا۔

بیسویں صدی کی ابتدا تک اخبارات کی صحافت میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، اودھ اخبار، اودھ پنچ، اور پیسہ اخبار جاری رہے اور اپنی معاصر صحافت کو خاصا متاثر کرتے رہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو اخبارات قابلِ ذکر تھے، اُن میں ایک ... تھا۔ ... ت

مولوی ان شاء اللہ خان نے لاہور سے ۱۹۰۲ء میں جاری کیا تھا۔ اس کا انداز وکیل جیسا تھا۔ لیکن بعد میں سیاسی ہنگاموں اور تقاضوں سے مجبور ہو کر خالص سیاسی خطوط پر شائع ہونا شروع کیا۔ اس میں مختلف سیاسی، قومی اور ملکی مسائل پر خبریں، مضامین اور اداریے شائع ہوتے تھے۔ یہ میانہ روی سے اپنے زمانہ کی سیاسی صورتِ حال اور تحریکات کو پیش کرتا تھا۔ اس کے قریبی عرصہ میں نکلنے والے اخباروں میں ہمدم لکھنؤ، آزاد کان پور، اتحاد پٹنہ، اُردو سوراجیہ الٰہ آباد تھے۔ ان میں ہمدم اور اتحاد مسلمانوں کی علاحدہ سیاست کے ترجمان تھے اور باقی اخبار متحدہ قومیت کے علم بردار اور سیاست میں اسی رجحان کو پیش کرتے تھے۔

ابتدائی دور کا زیادہ اہم رسالہ اُردوئے معلیٰ تھا جسے حسرت موہانی نکالتے تھے۔ یہ ہر دور میں ہنگامی سیاست کا مظہر رہا۔ اس کے اجرا کے وقت حسرت تلک، آربندو گھوش اور پپن چندر پال کی سیاست کے حامی تھے۔ اور ان کی شخصیت اور نظریات سے متاثر ہو کر ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں میں شریک بھی رہے۔ وہ اُردوئے معلیٰ میں علمی، ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ ہنگامی سیاسی اور ملکی حالات پر بھی اپنے اور دیگر رہنماؤں کے مضامین شائع کرتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے اُردوئے معلیٰ پرجوش اور ہنگامی سیاست کا علم بردار بن گیا تھا۔ اس کے مضامین اور شذرات میں حسرت نے ہمیشہ غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنے نفرت انگیز خیالات پیش کیے۔ کامل آزادی کے علم بردار تھے اور ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں خیالات کو انھوں نے اُردوئے معلیٰ کے ذریعہ مشتہر کیا۔ ابتداءً کانگریس کی تائید کرتے رہے لیکن بہت جلد اس سے بددل ہو گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ احمد آباد یکم جنوری ۱۹۲۲ء کے خطبۂ صدارت میں ''کامل آزادی'' اور ''ہندوستانیوں کی متوازی حکومت'' کا مطالبہ کیا[۳۰] اور پھر مسلمانوں کی سیاست کے اہم کارکن بن کر قلم اور عمل کے ذریعہ جدوجہد کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون ''مصر میں انگریزی سیاست'' شائع کیا تھا جس میں مصر کے بارے میں برطانوی حکمت عملی پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ مضمون عربی سے ترجمہ کیا گیا تھا، حسرت نے مصنف اور مترجم کا نام ظاہر نہیں کیا۔ چناں چہ انھیں دو سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ گرفتار ہوتے رہے۔ اُردوئے معلیٰ ہر موقع پر ان کا ترجمان رہا۔ تحریکِ پاکستان کے دنوں میں پاکستان کے حامی رہے لیکن پاکستان ''ڈومینین'' کے بجائے پاکستان جمہوریت کو چاہتے تھے۔ اُردوئے معلیٰ میں ہندوؤں کے سیاسی مسئلہ کا حل بھی پیش کیا۔

بیسویں صدی کی صحافت کا لازمی مزاج سیاست تھا۔ متعدد سیاسی تحریکوں، ہل چل اور ہنگاموں میں اخبارات سیاسی ماحول کے تقاضوں سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ چناں چہ ہر اخبار کا اپنا سیاسی نقطہ نظر ہوتا تھا۔ سیاست کی طرح سے صحافت بھی اب دو مختلف راہوں پر گامزن تھی۔ ایک متحدہ قومیت کے نظریہ کے تحت اور دوسری علاحدہ مسلم قومیت کے تصور کے ساتھ۔ بعض اخبارات اس ذیل میں زیادہ مستعد اور ہنگامہ خیز رہے۔ اس دور کی مسلم صحافت میں وقت کی سیاسی ہل چل اور تحریکات کی شدت بخوبی ظاہر ہوتی رہی۔ اخبارات نے اپنے دور کے سیاسی ماحول کو ایک مثالی حد تک متاثر کیا۔ ان کا یہ انداز تقسیم ہند تک مستقل اور روز افزوں رہا۔ ایسے اخبارات میں زمیندار، الہلال، اور ہمدرد دورِ اول سے ہی تعلق رکھتے تھے۔

زمیندار کو پہلے پہل ظفر علی خان کے والد سراج الدین احمد خان لاہور سے نکالتے تھے۔ اس کا مقصد اس وقت یہ تھا کہ زمینداروں، کاشت کاروں، کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے۔ سراج الدین احمد خان کے انتقال کے بعد ظفر علی خان نے ۱۹۰۹ء میں اس کی ادارت سنبھالی۔ بہت جلد زمیندار مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ترجمان بن گیا۔ چوں کہ اس کا انداز خطیبانہ اور پُر جوش تھا اور لہجہ ترش اس لیے یہ جلد اپنے معاصرین، پیسہ اخبار اور وطن پر چھا گیا۔ یہاں تک کہ پورے برِ عظیم میں یہی اخبار مسلمانوں میں مقبول تھا۔ اس کے سیاسی اداریے، بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز اور بے باکی اس دور کی طوفانی سیاست کی غماز ہے۔ اس نے اتحادِ عالم اسلامی کے جذبات کو شدت سے بیدار کیا۔ عوام کے دلوں میں غیر ملکی حکومت کا خوف دور کیا۔ اور صداقت پر قائم رہ کر اپنی بات کہنے کا درس دیا۔ جب یہ پہلی مرتبہ بند ہوا تو اس کی مجلس ادارت سے متعلق افراد غلام حیدر خان، اختر علی خان، مولانا عبداللہ العمادی نے لمعات کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ پھر چودھری غلام حیدر خان نے ترجمان اور مولانا سیّد حبیب نے نقاش کے نام سے اخبار جاری کیے، تو یہ بھی جلد ہی بند ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا سید حبیب نے سیاست جاری کیا جو ۱۹۳۷ء تک سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتا رہا۔ حکومت نے زمیندار سے کئی مرتبہ ضمانتیں طلب کیں، مطبع ضبط کیا۔ دورانِ جنگ ظفر علی خاں بند ہوئے تو زمیندار بھی بند ہو گیا۔ رہائی کے بعد ظفر علی خان نے ستارۂ صبح کے نام سے غیر سیاسی ہفت روزہ نکالا، جس کا حاوی رجحان ادبی معاشرتی اور اقتصادی رہا۔ سیاسی مسائل کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ستارۂ صبح ۱۹۱۸ء میں بند ہو گیا تو ۱۹۲۱ء میں زمیندار کا اجیا

ہوا۔ لیکن چند ہی مہینوں کے بعد ظفر علی خان پانچ سال کے لیے قید ہو گئے اور پھر بعد میں سیاست میں اس طرح الجھے کہ صحافت ضمنی مشغلہ رہ گئی۔ یہ اخبار ۱۹۳۷ء تک قوم پرست اور کانگریسی نقطہ نظر کا حامل رہا۔ اس کا خیال تھا کہ کانگریس ملک کی متحدہ قومی جماعت ہے۔ اس کے زیرِ سایہ ہی ملکی آزادی کے لیے جدوجہد ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی قومی جماعتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں، کیوں کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کر سکیں گی۔ حصولِ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ اس مرحلہ پر اس نے مسلمانوں کی اس مہم کی مخالفت کی جو اُنھوں نے تصفیۂ حقوق کے لیے شروع کر رکھی تھی۔ سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں کانگریس کا ساتھ دیا۔ نہرو رپورٹ کی تائید و حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنجاب کے مسلمانوں کی تحریک چھپن فیصدی کا مخالف رہا۔ جب گاندھی نے ''نہرو رپورٹ'' منوانے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو زمیندار اس میں بھی شریک رہا۔ ہر اعتبار سے زمیندار کی حکمت عملی اس وقت تک قوم پرستانہ اور کانگریسی رہی۔ چناں چہ اسے پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہ رہی تھی۔ لیکن بعض مواقع ایسے بھی آئے جب اس نے اس حکمتِ عملی سے تجاوز کیا۔ مثلاً جب ''شدھی'' اور ''سنگھٹن'' کا زور ہوا تو زمیندار نے ''تنظیم'' اور ''تبلیغ'' کی تحریکوں کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۷ء سے زمیندار مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے سوائے چند مختصر وقفوں کے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا ساتھ دیا۔[۱۱] ہندو مسلم فسادات کے دوران مسلمانوں کے حق میں پے در پے مضامین ایسے شائع کیے کہ چند مرتبہ اخبار ضبط بھی کر لیا گیا۔ تحریکِ آزادیِ کشمیر، مسجد شہید گنج کی تحریک میں خاصا سرگرم رہا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اس نے اس تحریک کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس دوران اس کی اشاعت کو زبردست عروج حاصل ہوا۔

زمیندار نے اپنے دورِ اجرا میں عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اوّلاً یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لیے نہیں تھی۔ لیکن اس سے آنے والی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس میں طنزیہ اور سیاسی شاعری نے عروج پایا۔ اس کے ذریعہ ہی مزاحیہ شذرات کی ابتدا ہوئی جن میں طنز و مزاح کے پیرایہ میں قومی اور ملکی مسائل کو نمایاں کیا جانے لگا۔ اس سے بڑے بڑے صحافی وابستہ رہے۔ ان میں عبداللہ العمادی، نصراللہ خان عزیز، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضٰی احمد خان میکش، چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق وغیرہ ممتاز ہیں۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد اس وقت جاری کیا تھا جب زمیندار اپنے تمام معاصرین پر چھایا ہوا

تھا۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمدرد، زمیندار سے مختلف تھا۔ اس نے سنجیدہ متین اور مدلل صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ رائے عامہ کی ترجمانی ہی نہیں، اس کی رہنمائی بھی کی۔ تجارتی مقصد کو کبھی پیش نظر نہیں رکھا۔ اس سے سیّد ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سیّد جالب دہلوی، عبدالحلیم شرر اور میر محفوظ علی جیسے ادیب اور صحافی وابستہ تھے۔ جہاں تک مولانا محمد علی کی صحافت کا تعلق ہے، ان کا میدانِ خاص انگریزی صحافت تھا۔ انگریزی ہفت روزہ کامریڈ کے ذریعہ وہ ارکان حکومت تک اپنے خیالات پہنچانا چاہتے تھے۔ اور مسلمانانِ ہند کی خدمت کے لیے اُردو روزنامہ ہمدرد جاری کرنا چاہتے تھے۔ کامریڈ میں ان کے حریت پرور مضامین نے جہاں برِعظیم کے تعلیم یافتہ افراد میں اضطراب پیدا کر دیا تھا وہاں برطانوی استعماریت کو بھی مرتعش کر دیا۔ اتحاد اسلامی کے جذبات سے مغلوب ہو کر مولانا محمد علی نے کامریڈ کے ساتھ ساتھ ہمدرد کو بھی ترکوں کی ہمدردی کے لیے وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت سے بھی ان کا اختلاف شروع ہوا۔ کامریڈ میں ''ترکوں کا انتخاب'' لکھنے پر انھیں سزا برداشت کرنی پڑی۔ کامریڈ بند کر کے ہمدرد کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اس میں پرزور مضامین اور اداریے تحریر کیے۔ ہمدرد ان کے خیالات اور ان کے عزائم کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا۔

ہمدرد کا دورِ اوّل تحریکِ خلافت کی ابتدا سے قبل تک رہا۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے دوران مولانا محمد علی گرفتار ہوئے تو ہمدرد بند ہو گیا۔ اس کا دوسرا دور ۱۹۲۴ء میں شروع ہوا۔ لیکن اس وقت تک ان کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ برِعظیم کے بڑے قائدین میں شمار ہونے لگے تھے۔ اس ہنگامی اور مضطرب سیاسی دور میں بھی وہ اسی مدلل اور متین انداز میں ہمدرد کو چلاتے رہے، جو اَب عوام کے لیے زیادہ قابل قبول نہ رہا تھا۔ جب ۱۹۲۸ء میں علاج کی غرض سے یورپ جاتے ہوئے اسے بند کر دینا چاہتے تھے۔ اس کو چلانے کی ذمہ داری مولانا ظفر الملک اور مولانا عبدالماجد نے قبول کی اور بڑی محنت سے نکالتے رہے لیکن یہ ۱۹۲۹ء کے بعد چل نہ سکا۔

مولانا ابوالکلام اپنی ابتدائی عمر ہی میں صحافی کی حیثیت سے ممتاز درجہ پر پہنچ گئے تھے ۱۹۰۰ء میں المصباح نکالا اور اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ مگر یہ تین چار اشاعتوں سے زیادہ نہ نکلا۔ پھر انھوں نے کلکتہ کے احسن الاخبار اور تحفۂ محمدیہ اور لکھنؤ کے گلدستہ خدنگ نظر کی ادارت لی۔ خود اپنا صحیفہ لسان الصدق جاری کیا۔ اس وقت ابوالکلام سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے پرجوش اور سرگرم مؤید تھے۔ لسان الصدق میں اور مباحث کے علاوہ سید احمد خاں کے خیالات کی پرزور تائید اور ان

کے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیتے رہے۔ یہ صحیفہ کم وبیش تین سال چل کر ۱۹۰۴ء میں بند ہو گیا۔ اس سال ان کی ملاقات شبلی سے ہوئی۔ شبلی سے اُنھوں نے گہرا ذہنی اور سیاسی اثر قبول کیا۔ کچھ عرصہ وہ الندوہ کے مدیر بھی رہے۔ یہ سیّد احمد خاں سے ان کی مخالفت کی ابتدا تھی۔ بعد میں وہ سیّد احمد خاں کے شاید سب سے بڑے مخالف کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آیندہ چند سالوں میں وہ وکیل امرتسر اور دارالسلطنت کلکتہ کی ادارت کرتے رہے اور صحافت کے میدان میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کو عرب اور ترکی کی قوم پرور اور انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور اُنھوں نے طے کیا کہ ہندوستان واپس جا کر انھیں خطوط پر مسلمانوں میں انقلابی تحریک شروع کریں گے۔ ۱۹۱۲ء ابوالکلام کی زندگی میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال اُنھوں نے کلکتہ سے الہلال نکالا، جس نے نہ صرف مسلمانوں کی ادبی اور علمی زندگی میں ایک نئی روح پھونکی بلکہ اِن میں نئی مذہبی اور سیاسی بیداری بھی پیدا کر دی۔ الہلال کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے ایک طرف مذہبی طبقہ میں وقت کے اہم سیاسی مسائل کے احساس اور عمل کے ذوق کو ابھارا اور دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں مذہب کی اہمیت اور محبت پیدا کی۔

الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کو جو ولولہ انگیز دعوت دی گئی اس کا پہلا بڑا مقصد ان میں سچی مذہبی روح کو بیدار کرنا اور ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی از سرِ نو تعمیر کرنا اور دوسرا مقصد ان میں سیاسی آزادی کا جوش واحساس پیدا کرنا تھا اور انھیں کانگریس کی ''قومی تحریک'' میں شریک ہو کر حکومت خود اختیاری کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا۔ ابوالکلام اس سے قبل بنگال کے تخریب پسندوں کے ساتھ مل کر انقلاب لانے کی کوشش کے بارے میں بھی سوچتے تھے۔ مگر اس خیال کو ترک کر کے کانگریس کے جمہوری طریقہ کے قائل ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے مسلم لیگ کی ''فرقہ وارانہ سیاست'' پر زبردست تنقید کی، جو مسلسل جاری رہی۔

الہلال برِعظیم کے مسلمانوں کی مذہبی، ذہنی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ بھی ثابت ہوا۔ یہ مسلمانوں میں دینی اور تمدنی تحفظ اور استقامت کے نصب العین پر مبنی تھا ابوالکلام سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے قائل نہیں تھے۔ سیاست میں الہلال کے ذریعہ اُنھوں نے ابتدا میں یہ دعوت دی کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جائیے۔ صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے

کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہب کی خاطر چین نہ لیں۔[۳۲] الجہاد فی سبیل الحریتہ کے عنوان کے تحت مسلسل مقالات میں اُنھوں نے اپنے سیاسی نظریات اور عزائم کو بالتفصیل بیان کیا۔ تحریک اتحادِ اسلامی کے پرجوش حامی تھے۔ دنیائے اسلام کی سیاست کے بارے میں ان کا طرزِ فکر ظفر علی خاں، مولانا محمد علی سے قریب تھا۔ اس سلسلے میں ان کے دو مضامین ''حدیث الجنود'' اور ''سقوط انٹروپ'' قابل اعتراض قرار پائے۔ بلجیم کی ایک مطبوعہ تصویر بھی نا قابلِ اشاعت قرار دی گئی۔ اس کے کچھ شمارے ضبط ہوئے اور ''الہلال پریس'' کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ ۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال کا آخری شمارہ نکلا۔ اس پہلے دور میں اس کی دعوت کو عام کرنے والوں میں شبلی، سلیمان ندوی، اقبال، حسرت وغیرہ تھے۔ اگلے سال نومبر ۱۹۱۵ء میں ابوالکلام نے ایک خالص مذہبی ہفت روزہ البلاغ جاری کیا، جس میں الہلال ہی کی مذہبی دعوت تھی۔ اس میں ابوالکلام کے علاوہ اقبال، حسرت، سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی وغیرہ مختلف مستقل عنوانات کے تحت لکھتے رہتے تھے۔ صرف دو ایک ہی مضمون ''افسانہ زلف یا مسلم یونی ورسٹی'' اور ''مجوزہ شیعہ کالج'' ایسے تھے جن میں ابوالکلام نے واقعات حاضرہ پر بحث کی تھی۔ جب وہ ''قانون تحفظ ہند'' کے تحت ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے شہر بدر کر دیے گئے تو البلاغ بھی بند ہو گیا۔

البلاغ کے ساتھ ساتھ دیگر معاصر رسائل بھی قومی مسائل پر لکھتے رہے۔ الناظر کو ظفر الملک نے لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ یہ ادبی رسالہ تھا لیکن سیاسی اور قومی موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ زمانہ کان پور سے منشی دیا نرائن نگم نکالتے رہے۔ ادبی مضامین کے علاوہ اس میں قومی اور سیاسی مسائل پر بکثرت مضامین اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ اس دور کے اہم ادیب اور شاعر اس کے حلقۂ تحریر میں شامل تھے۔ بعض رہنما جیسے لالہ لاجپت رائے، اس کے مستقل مضمون نگار تھے۔ زمانہ کا سیاسی مسلک کانگریس کے قریب تھا۔ مخزن بھی کبھی کبھی سیاسی مسائل پر مضامین شائع کرتا تھا۔ اس کا حادی رجحان ادب اور قومیت کی طرف رہا۔ معارف دارالمصنفین کا ترجمان تھا۔ اس میں سیاست کا عنصر کم تھا لیکن حالات حاضرہ اور قومی مسائل پر مبنی مضامین اس کی تقریباً ہر اشاعت میں شامل رہتے۔ اپنے وقت کے عظیم ادیب اس میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی کی ترجمانی جامعہ کرتا تھا۔ اس میں علم سیاست اور بین الاقوامی مسائل پر مضامین نمایاں رہتے تھے۔ قومی تعلیم اور قومی مسائل پر مضامین اس کا خاص حصہ ہوتے تھے۔ ایک تحریکی ادارے کی جانب سے یہ ایک تحریکی رسالہ

تھا۔ اخبار النساء، تہذیب نسواں، عصمت علی الترتیب مولوی سیّد احمد، سیّد ممتاز علی، مولانا راشد الخیری نکالتے تھے۔ یہ رسالے خواتین میں صالح اقدار کو رواج دینے اور معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی شعور پیدا کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیتے تھے۔ بچوں کے لیے پھول اور پیسہ اخبار کا ماتحت رسالہ بچوں کا اخبار مؤثر اور ستھرے رسالے تھے۔ لیکن ان تمام رسالوں میں البلاغ کی حیثیت مثالی اور منفرد تھی۔ البلاغ کے بند ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی کلکتہ ہی سے ابوالکلام نے پیغام جاری کیا۔ اس کے مدیر خود ابوالکلام تھے۔ ان کی معاونت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کرتے تھے۔ اس نے ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں میں اپنی آواز بلند کی۔ اسی دور میں واحد یار خاں نے نئی روشنی جاری کیا جسے ابوالکلام نے کافی سراہا۔ قاضی عبدالغفار نے جمہور نکالا اور پھر بعد میں حکیم اجمل خاں کی سرپرستی میں دہلی سے صباح کی اشاعت کی۔ یہ تحریکِ خلافت کے دنوں میں کافی سرگرم رہا۔ اسی تحریک کے دوران الامان اور وحدت جاری ہوئے۔ ان دونوں اخبارات نے بعد میں مسلم لیگ کے زاویہ نگاہ کی ترجمانی میں بہت کام کیا۔ ہمدرد کے ایک نائب مدیر محمد جعفری نے ہمدرد بند ہونے کے بعد ملت کے نام سے اخبار نکالا، جو مسلمانوں کی علاحدگی کی سیاست کا علم بردار تھا۔ بمبئی سے خلافت کمیٹی نے اپنی تحریک کو مشتہر کرنے کے لیے خلافت جاری کیا، جو مسلم خلافت عالم اسلام کے واقعات اور ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے لیے وقف رہا۔ اسی دوران لکھنؤ سے ہمدم، حق، حقیقت، اور سرفراز نکلے۔ ہمدم سیّد جالب دہلوی نکالتے تھے۔ یہ اخبار مسلمانوں کے مسائل میں خصوصی دل چسپی لیتا تھا۔ بعد میں یہ مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا۔ حق اور حقیقت بھی اسی نقطہ نظر کے حامل تھے۔ سرفراز آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی طرف سے نکلتا تھا۔ یہ اخبار کانگریس کی سیاست کا ترجمان تھا۔ جب مسلم لیگ کا احیا ہوا تو خلافت نے بھی زور شور سے اس کی حمایت شروع کردی۔ اسلامی سیاست کے رجحانات کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔ اس اخبار نے مجموعی طور پر خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کو تقویت دینے اور حصولِ آزادی کے لیے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ اسے مولانا شوکت علی مرتب کرتے رہے۔ بمبئی ہی سے ہلال بھی جاری ہوا تھا، جس نے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ یہیں سے اجمل بھی نکلتا تھا جو کانگریسی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا تھا۔ تحریکِ خلافت کے دوران صوبہ سرحد سے حالات سرحد نامی رسالہ جاری ہوا جو بعد میں صرف سرحد کے نام سے نکلنے لگا اور صوبہ میں مسلم لیگ کا ترجمان ثابت ہوا۔ اسے اللہ بخش یوسفی نکالتے تھے۔ کلکتہ سے عصر جدید اور

ہند نمودار ہوئے اور لاہور سے انقلاب اور چند سال بعد احسان اور شہباز نکلنے لگے۔ پرانے اخباروں میں زمیندار اور سیاست جاری رہے۔

۱۹۲۷ء میں الہلال کا دوسرا مختصر دور شروع ہوا، لیکن اس وقت ابوالکلام عملی سیاست میں زیادہ فعال تھے، اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ چناں چہ چھ مہینے جاری رہ کر یہ بند ہوگیا۔ سیاست لاہور سے مولانا سیّد حبیب کی ادارت میں ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا تھا۔ مولانا حبیب اس سے قبل ۱۹۱۷ء میں کلکتہ سے ترمذی، رہبر اور نقاش نکال چکے تھے۔ ان دنوں پنجاب میں زیادہ تر اخبارات بند تھے۔ سیاست ۱۹۴۷ء تک نکلتا رہا۔ اپنے وقت کی مختلف تحریکوں میں شریک تھا اور دوسرے سیاسی مسائل میں بھی قومی اور ملی نقطہ نظر کی تبلیغ کرتا رہا۔ مولانا سیّد حبیب تحریکِ خلافت میں گرفتار ہوئے۔ اپنے دور کی ہر اسلامی تحریک میں وہ شامل رہتے تھے۔ کانگریس کے شدید مخالف تھے۔

انقلاب دراصل زمیندار کے بطن سے نکلا تھا۔ جب اقتصادی اعتبار سے ۱۹۲۷ء میں زمیندار کی حالت خاصی خستہ ہوگئی تو اس کے عملہ کے موقر صحافیوں عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے مل کر انقلاب کے نام سے ایک نیا اخبار جاری کیا۔ یہ اپنے خمیر، مزاج اور عزائم کے لحاظ سے بھی زمیندار سے ماخوذ تھا۔ ٹھوس اور مدلل اداریے، سنجیدہ اور پُراز معلومات شذرات، اعلیٰ معیار کے مضامین، بڑے بڑے شعرا کی نظمیں، طنزیہ کالم وغیرہ نے اسے اپنے دور کا بہترین اخبار بنادیا تھا۔ سالک، مہر، میکش اور چراغ حسن حسرت اس کے خاص لکھنے والے تھے۔ ان لوگوں نے اسے بڑی محنت سے مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے اجرا کے وقت ان کا سیاسی نقطہ نظر کانگریسی تھا۔ کانگریس کو متحدہ قومی جماعت سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر وطن کی آزادی کو ناممکن خیال کرتے تھے۔ اتحاد کی صورت ان کی نظر میں یہ تھی کہ آیندہ کے لیے مسلمانوں کے حقوق کا تعین ہونا چاہیے تاکہ مسلمان اقلیت مطمئن ہوکر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ وہ جداگانہ نیابت کے حامی تھے اور کانگریس سے اس کو منظور کرانا چاہتے تھے۔ انقلاب کی جدوجہد انھیں امور پر مرکوز رہی[۲۲] جب تصفیہ حقوق کے بارے میں کانگریس کی روش واضح ہوئی اور ''نہرو رپورٹ'' کے مضمرات سامنے آئے تو انقلاب نے کانگریس سے اختلاف کرکے اس کے خلاف محاذ بنالیا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اس نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سائمن کمیشن سے مقاطعہ میں اس کا رویہ بین بین رہا۔ ''جداگانہ انتخاب'' اس کا نعرہ ہوگیا تھا۔ پنجاب میں چھپن فیصدی تحریک انقلاب ہی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ اسی نے اس

تحریک کو مقبول بھی بنایا۔ کشمیر میں مسلمانوں سے انصاف کے مطالبہ میں بھی پیش پیش رہا اور اس لیے اسے بند ہی ہونا پڑا۔ اپنی بندش کے دوران ادارہ انقلاب نے کشمیری مسلمان کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ جب یہ بھی بند ہوگیا تو مظلوم کشمیر کے نام سے ایک اور اخبار جاری کیا، اور پھر اس کی بندش پر بھی مکتوبِ کشمیر کے نام سے اشتہار چھاپ کر بھیجے۔ جب انقلاب دوبارہ جاری ہوا تو اس نے اپنی پرانی روش برقرار رکھی۔

انقلاب کا ایک بہت بڑا کارنامہ ''مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن'' کا نعرہ تھا۔ اس نے یہ مطالبہ علامہ اقبال کے تاریخی خطبہ سے پہلے کیا تھا۔ ۱۹۲۸ میں مرتضیٰ احمد میکش نے ''ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن'' کے عنوان سے مقالات کا ایک سلسلہ انقلاب میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس مطالبہ کے بعد سے انقلاب کے سرورق پر ایک عبارت تحریر ہوتی کہ ''پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ممالک ہیں۔ ان میں اسلام کا علم بلند کرو۔''[۳۴] علامہ اقبال کے تاریخی خطبہ کے بعد اس کی جتنی مخالفت ہندو اخبارات نے کی، انقلاب نے ان کا جواب دیا۔ اس کی ہر دوسری تیسری اشاعت میں کوئی نہ کوئی مضمون اس موضوع پر شائع ہوتا کہ مسلمانوں کی علاحدہ سلطنت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔ انقلاب کی یہ روش قیامِ پاکستان تک برقرار رہی۔

عبدالمجید سالک اس کے ذمہ دار صحافی تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۱۴ء میں ایک ادبی ماہ نامہ فانوسِ خیال کے ذریعہ اپنی صحافت کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں مولوی سیّد ممتاز علی کے تہذیبِ نسواں اور پھول سے منسلک رہے۔ سیّد امتیاز علی تاج کے رسالہ کہکشاں کے مدیر بھی یہی تھے۔ بعد میں زمیندار کی مجلسِ ادارت میں شامل ہوئے اور پھر ظفر علی خان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ اس میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے اُردو صحافت میں مزاحیہ کالم لکھنے کی ابتدا کی۔ ایک مضمون کے سلسلے میں ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد غلام رسول مہر زمیندار کے مدیر مقرر ہوئے۔ ان کی بھی ایک تحریر پر زمیندار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ میکش بھی زمیندار کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جب تحریکِ ہجرت شروع ہوئی تو مہاجرین میں شامل ہو کر کابل چلے گئے۔ لیکن اس تحریک کی ناکامی کے بعد واپس آ کر دوبارہ زمیندار سے منسلک ہوگئے۔

انقلاب کا دور بڑے بڑے قومی مسائل کا حامل تھا۔ اس وقت اخبارات کا موقف تقریباً ایک ہی رہا۔ یہ سب غیر ملکی حکومت کے مخالف تھے۔ سب آزادی چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے اخبارات

دنیائے اسلام کا درد بھی رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے دور میں زمیندار والہلال برِّعظیم کی ساری اسلامی صحافت پر غالب رہے۔ اور اس وقت قوم پرستی، ملت پرستی اور علاحدگی کی سیاست ایک دوسرے سے خلط ملط رہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت اور انقلاب نے اسلامی صحافت کی نمایندگی کی۔ ان کے زیرِ اثر علاحدگی کی سیاست نمایاں ہوئی۔ مسلمانوں میں علاحدگی کے رجحانات کو فروغ دینے میں ہندو صحافت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ایسی صحافت پر وہ لوگ چھائے ہوئے تھے، جو فرقہ پرست تھے۔ لیکن اپنے آپ کو قوم پرست ظاہر کرتے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کی اور اس میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ مسلمان ہر اس بات کو پسند کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جس کی مخالفت ہندو اخبارات کرتے تھے۔ بندے ماترم کے علاوہ تمام ہندو اخبارات کٹر فرقہ پرست تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے۔ کانگریس کی آڑ میں مالوی جی اور شردھانند کی تعلیمات کو فروغ دیتے اور ''شدھی'' اور ''سنگھٹن'' کی تبلیغ کرتے۔

بندے ماترم کے بانی لالہ لاجپت رائے ایک اعتدال پسند قوم پرست تھے، اور مدلل اور سنجیدہ انداز میں بحث کرتے۔ متعدد مضامین اور کتابیں ان کے اس انداز کو پیش کرتی ہیں۔ ان کا یہ اخبار تعصب سے بالا ہو کر معیاری صحافت کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ پرتاب لاہور ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی ادارت مہاشے کرشن کرتے تھے۔ یہ آریہ سماجیوں کے رہنما تھے۔ اُنھوں نے نہایت مدلل اداریے لکھے۔ پرتاب قومی زاویہ نگاہ کو پیش کرتا تھا۔ مہاشے کرشن کی گرفتاری سے یہ بند ہو گیا۔ ربانی کے بعد پرتاب کے علاوہ لاہور ہی سے پرکاش جاری کیا۔ یہ بھی آریہ سماجی خیالات کا ترجمان تھا۔ ۱۹۲۱ء میں لالہ شام لال کپور نے کیسری نکالا۔ اس سے قبل وہ گرو گھنٹال نکالتے تھے۔ کیسری ترکِ موالات کا حامی تھا، اور ہندوؤں کے مخصوص مفادات کی ترجمانی کرتا رہا۔ ایک قابلِ اعتراض مضمون کی اشاعت پر بند کر دیا گیا۔ خوش حال چند خورشید نے ۱۹۲۳ء میں لاہور سے ملاپ جاری کیا۔ اس سے قبل یہ ا... گزٹ نکالتے تھے۔ آریہ سماجی رہنماؤں میں شامل تھے۔ تیج کو شردھانند نے جاری کیا تھا۔ یہ خالص ہندو فرقہ پرور اخبار تھا۔ شدھی اور سنگھٹن نے اجیت جاری کیا اور جاٹوں نے رہبر ہند نکالا۔ ہندو مہاسبھا نے صوبہ سرحد سے فرنٹیئر ایڈووکیٹ اُردو میں جاری کیا۔ بعد میں پربھات مقبول اخبار ثابت ہوا۔ اس کے مدیر لالہ نانک چند ناز تھے۔ ہندو مفاد کی نگہبانی اور کانگریس کی حمایت اس کا مقصد تھا۔ اخبار نیشنل کانگریس لاہور سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر ڈاکٹر ستیہ پال، صدر صوبہ کانگریس کمیٹی

تھے۔ یہ کانگریس کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے نکالا گیا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ بشارت لاہور سے ۱۹۲۸ء میں سناتن دھرمیوں کے نقطۂ نگاہ کو پیش کرنے کے لیے جاری کیا گیا۔ اس کے مالک گنیش دت پنڈت مالویہ کے عقیدت مند تھے۔ اس لیے یہ پنڈت مالویہ کے نظریات پیش کرتا رہا۔ بعد میں کانگریس اور مہاسبھا کی حمایت کرتا رہا۔ ہندو سبھائی رہنما بھائی پرمانند نے ہندو کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ یہ جون ۱۹۳۵ء میں روزانہ ہوا۔ یہ بھی ہندو فرقہ پرستی کے خیالات پیش کرتا تھا۔ ان تمام میں تیج دہلی، پرتاب، ملاپ، بندے ماترم زیادہ ہر دل عزیز اور موقر اخبارات رہے۔

مسلم صحافت میں اس دور کے آخری حصہ کا اہم ترین اخبار احسان تھا۔ جو لاہور سے ۱۹۳۴ء میں نکلا۔ اسے علامہ اقبال، میکش، چراغ حسن حسرت، باری جیسے نام وروں کا تعاون حاصل تھا۔ اس اخبار کو دو بڑی تحریکوں نے مقبول بنا دیا۔ اوّل مجلسِ احرار کی تحریک جو قادیانیوں کے خلاف شروع ہوئی تھی اور دوسری مسجد شہید گنج کی واگزاری کی تحریک۔ اس اخبار نے مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ پر ابتدا میں اس گروہ کا ساتھ دیا، جو اتحاد پارٹی کا مخالف تھا۔ علامہ اقبال، چراغ حسن حسرت، میکش اور باری اس میں عام طور پر لکھتے تھے۔ بعد میں اشرف عطا اس میں شامل ہوئے۔ ابتدائی دور میں اس کا نقطہ نظر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی طرف رہا۔ کچھ عرصہ بعد میکش نے احسان سے نکل کر شہباز جاری کیا۔ لیکن خاکسار تحریک نے اس کے مقاطعہ کی تحریک شروع کی تو یہ تبدیلیوں کے بعد وقار انبالوی کی ادارت میں نکلنے لگا۔ اس وقت اس کا نقطۂ نظر ''یونینسٹ'' اور قوم پرستانہ رہا۔ اس لیے اس نے مسلم لیگ اور اس کی تحریک کی مخالفت کی۔

تحریکِ کشمیر کو کامیاب بنانے کے لیے مجلسِ احرار نے احرار جاری کیا تھا۔ اس کے نگران چودھری افضل حق تھے جو سیاسی رہنما کے علاوہ ایک نام ور ادیب بھی تھے۔ ادارت چراغ حسن حسرت کرتے تھے۔ مخالفِ حکومت تحریروں کی وجہ سے اس کی ضمانتیں ضبط ہوئیں اور پھر بند ہونا پڑا۔ مجلسِ احرار ہی نے مجاہد اور آزاد بھی جاری کیے جو اس کی مختلف تحریکوں کے ترجمان رہے۔ نصر اللہ خان عزیز مشہور اور نام ور صحافی تھے۔ اُنھوں نے ابتداءً مدینہ بجنور کی ادارت کی تھی۔ کانگریسی اور قوم پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اس دور میں لاہور سے زمزم نکالا۔ یہ ایک معیاری اخبار تھا۔ بعد میں اس کی ادارت محمد عثمان فارقلیط نے کی۔ لاہور ہی سے نصر اللہ خان عزیز پاسبان بھی نکالتے تھے۔ یہ مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کے لیے نکالا گیا تھا۔ انھیں دنوں لاہور سے اور بھی

معمولی درجہ کے اخبارات جاری ہوئے۔ ڈاکٹر محمد عالم، تریاق نکالتے تھے جو اینٹی کمیونل مسلم لیگ کا ترجمان اور کانگریسی نظریات کو پیش کرتا تھا۔ انصاف، مساوات اور جمہور بھی اسی کے ساتھ جاری ہوئے۔
جمعیت العلمائے ہند دہلی سے الجمعیت نکالتی تھی۔ اس کے پہلے مدیر مولانا مودودی تھے۔ ان کے بعد محمد عثمان فارقلیط اور پھر ہلال احمد زبیری اس کی ادارت کرتے رہے۔ یہ اخبار اپنی جماعت کا ترجمان رہا۔ سیاسی اعتبار سے قوم پرستی کے نظریات اور کانگریس کی تحریکات کی حمایت کرتا تھا۔ قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد دکن سے پیام جاری کیا۔ اس اخبار نے قوم پرستانہ نقطہ نظر کو اختیار کیا۔ اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے معیاری سمجھا جاتا تھا۔ عصر جدید کلکتہ سے مولانا شائق احمد عثمانی نکالتے تھے۔ اس اخبار کے ذریعہ وہ ایک ممتاز اور معیاری صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ تمام عمر اسلامی سیاست کی ترجمانی کرتے رہے۔ عصر جدید نے بنگالی مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ تحریکِ پاکستان کے فروغ کے لیے بھی اس کا کام بڑا وقیع ہے۔ بنگالی مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں مولانا محمد اکرم خان کی شخصیت مثالی ہے۔ اُنھوں نے ایک اخبار زمانہ جاری کیا تھا، جو مسلمانوں کی علاحدہ سیاست اور مسلم لیگ کا مؤید تھا۔ مولانا محمد اکرم نے زیادہ تر بنگالی صحافت میں تحریکِ پاکستان کے لیے خدمات انجام دیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نام ور ادیب اور صحافی تھے۔ ابتداءً البیان عربی اور اُردو میں نکالتے تھے۔ جب ابوالکلام نے پیغام جاری کیا تو اس کے مدیر مقرر ہوئے اور پرنس آف ویلز کے مقاطعہ کی تحریک میں گرفتار ہوئے، تو پیغام جاری نہ رہ سکا۔ رہائی کے بعد ابوالکلام ہی کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ الجامعہ نکالا۔ یہ ایک انقلابی رسالہ تھا جو اسلامی دنیا میں کافی مقبول ہوا۔ بعد میں کلکتہ سے ہند جاری کیا۔ مولانا عبدالرزاق بنیادی طور پر انقلاب اور اشتراکیت پسند تھے۔ سامراج دشمنی میں کانگریس کی حمایت کرتے رہے۔ مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ ایک سیاسی ہفت روزہ الہلال بھی نکالتے تھے۔ حکومت نے ان کی تحریروں کے خلاف کئی مرتبہ کارروائی بھی کی۔ مشہور کانگریسی رہنما سید محمود کی ادارت میں نئی زندگی نکلتا تھا۔ اس کا نقطہ نظر متحدہ قومیت اور کانگریس کا نصب العین رہا۔ تحریکِ پاکستان کا مخالف تھا۔ ۱۹۴۶ء میں اس کی ایک مخصوص اشاعت ''پاکستان نمبر'' میں مختلف ہم خیال افراد نے پاکستان کی مخالفت میں مضامین تحریر کیے۔ خاص لکھنے والوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نام ور ادیب، عالم، فلسفی اور صحافی ہیں۔ اُنھوں نے صحافت میں ایک مثالی جریدہ سچ کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں دینی اور معاشرتی مسائل پر تحریریں شامل ہوتی تھیں۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاسی کوائف بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ سچ بعد میں صدق اور پھر صدقِ جدید کے نام سے نکلنے لگا۔ یہ لکھنؤ سے جاری ہوئے تھے۔ یہیں سے حیات اللہ انصاری نے پنڈت نہرو کی سرپرستی میں قومی آواز نکالا۔ اس کا مطمحِ نظر کانگریس کی تحریکات اور اس کی تشہیر اور قوم پرستانہ خیالات کی تبلیغ تھی۔ دیگر اخباروں میں، جو اس دور میں سیاسی مقاصد کے لیے نکالے گئے تھے کئی مشہور ہوئے۔ صدائے عام اور ساتھی پٹنہ سے نکلتے تھے۔ انھیں علی الترتیب نذیر حیدر اور سہیل عظیم آبادی مرتب کرتے تھے۔ ہندوستان ڈیلی اور انقلاب جدید بمبئی سے جاری ہوئے تھے۔ انھیں رضا سعید اور عبدالمجید انصاری نکالتے تھے۔ یہیں سے کمیونسٹ پارٹی نے سجاد ظہیر کی ادارت میں قومی جنگ جاری کیا جو بعد میں نیا زمانہ کے نام سے نکلتا رہا۔ اس نے تقسیم ملک اور پاکستان کے مطالبہ کی حمایت کی۔ سامراج دشمنی اس کا ایک اہم مقصد تھا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران کافی مقبول ہوا تھا۔ اسی عرصہ میں جنگ اور انجام جاری ہوئے۔ ان کا نقطۂ نظر پاکستان کی حمایت میں تھا۔ جنگ کو میر خلیل الرحمٰن اور انجام کو عمر فاروقی نکالتے تھے۔ نوائے وقت کو حمید نظامی نے ۱۹۴۴ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ تحریکِ پاکستان کے دوران بہت سرگرم اور فعال رہا۔ حمید نظامی مسلم لیگ کے پرخلوص کارکن تھے۔ اور اپنے اخبار کو بے لوث خدمت کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ اس اخبار کو خود مسلم لیگ کا تعاون حاصل رہا۔ اس وقت کے مشہور سیاسی رہنما بھی اس میں لکھتے رہتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں چوں کہ تحریکِ پاکستان کافی مقبول تھی، اس لیے اس اخبار کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور بہت جلد اپنے دیگر مسلم معاصرین سے زیادہ ممتاز ہوگیا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران، اس کی کامیابی کے لیے جو متعدد اخبارات جاری ہوئے تھے۔ ان میں ایمان تھا جو لاہور سے جاری ہوا تھا۔ اس کی ادارت عبدالمجید قریشی کرتے تھے۔ یہ صرف تحریک پاکستان کے لیے وقف تھا۔ اس کی اشاعت میں سرورق پر اخبار کے نام کے نیچے، انگریزی زبان میں ''تحریکِ پاکستان کی آواز'' تحریر ہوتا۔ اس نے اپنی عام اشاعتوں کے علاوہ ''پاکستان نمبر'' کے نام سے تین خصوصی اشاعتیں پیش کی تھیں۔ پہلا نمبر ۲۰ ر نومبر ۱۹۴۵ء کو دوسرا نمبر ۳۰ ر دسمبر ۱۹۴۵ء اور تیسرا نمبر ۱۵ ر جنوری ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا، پہلے دو نمبروں کے مندرجات پاکستان کے سیاسی اور تاریخی پس منظر

پر مبنی تھے۔ ان میں مسلمانوں کے مطالبہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مخالفین کا تذکرہ بھی ہے۔ تاریخی پس منظر میں پاکستان کے مطالبہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مخالفینِ پاکستان پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ اور انھیں قائل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اور ایسے مدلل مضامین بھی ہیں جو پاکستان کے قیام کا سیاسی تہذیبی جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ تنقید اور استدلال کے انداز میں متین اور سنجیدہ ہے۔ کہیں جذباتیت اور اشتعال نہیں۔ اس کا تیسرا نمبر محض ''مظالم کانگریس'' کو بیان کرتا ہے۔ اس میں مظالم کانگریس کو پیش کر کے اس کا حل صرف پاکستان میں تجویز کیا گیا ہے۔

خود مسلم لیگ نے خاص اپنی ترجمانی کے لیے دہلی سے منشور جاری کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں ڈان بھی نکالا گیا تھا۔ یہ اخبار قائداعظم محمد علی جناح کی سرپرستی میں نکلتے تھے۔ منشور کے مدیر سیّد حسن ریاض تھے۔ مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی حمایت میں اس وقت برِعظیم کے مختلف حصوں سے متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ ایسے اخباروں میں زیادہ تر اُردو اخبارات جاری ہوئے تھے۔ لکھنؤ سے چودھری خلیق الزمان نے مسلم لیگ اور اس کی تحریکات کو فروغ دینے کے لیے تنویر جاری کیا۔ پنجاب میں اس وقت احسان، زمیندار اور نوائے وقت سرگرم اور مقبولِ عام اخبارات تھے صوبہ سرحد میں پہلے پہل اللہ بخش یوسفی نے سرحد جاری کیا تھا۔ جو تحریکِ خلافت میں کافی سرگرم تھا۔ بعد میں اس نے مستقلاً مسلم لیگ کی حمایت اور ترجمانی ہی کی، مسلم لیگی رہنما سردار اورنگ زیب نے پشاور سے ۱۹۴۴ء میں ملت جاری کیا۔ یہ بھی تحریکِ پاکستان میں فعال رہا۔ اسی عرصہ میں دوست محمد اثر نے آزادی، رضا ہمدانی اور فارغ بخاری نے شباب نکالا۔ قاضی عبدالحلیم شرر نے انصاف اور رضا جعفری نے تعمیرِ نو جاری کیے۔[۳۵] بلوچستان سے نکلنے والے دو اخبار زیادہ اہم تھے۔ استقلال عبدالصمد اچکزئی نکالتے تھے۔ یہ اخبار قوم پرستی کے رجحانات کا حامل اور مسلم لیگ کا مخالف تھا۔ الاسلام قاضی محمد عیسٰی نے جاری کیا تھا، جو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس اخبار نے وہاں مسلم لیگ کی ترجمانی کی۔ غازی فضل احمد نے جمہور اور نسیم حجازی نے تنظیم جاری کیے۔ اور اخباروں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مسلم لیگ کی حمایت کی۔

اس دور میں بعض اُردو رسائل و جرائد نے بھی سیاسی ماحول کے اثرات اخذ کر کے رائے عامہ کی ترجمانی کی۔ ہمایوں میاں بشیر احمد نکالتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے نگار کا اجرا کیا۔ حافظ محمد عالم نے عالم گیر نکالنا شروع کیا تھا۔ حکیم یوسف حسن نیرنگ خیال نکالتے رہے۔ ادبی دنیا شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں نکلتا تھا، شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا اجرا کیا۔ ادب لطیف لاہور سے جاری ہوا۔ قدیم رسائل میں معارف اور جامعہ باقاعدگی سے نکلتے تھے۔ ترجمان القرآن مذہبی مقصد رکھتا

تھا۔ لیکن اس نے سیاسی مباحث کو بھی اہمیت دی۔ اُسے مولانا مودودی حیدرآباد دکن سے نکالتے تھے۔ یہ تمام رسائل اپنے عہد کے نمایندہ صحیفے تھے۔ ان میں ادب، فن، مذہب، تہذیب کے علاوہ سیاست پر بھی مضامین شامل ہوتے۔ ان رسائل نے روزمرہ کے سیاسی حالات، مسائل اور واقعات پر مستقل مضامین شذرات اور اداریے شائع کیے۔ اُنھوں نے ہنگامی واقعات پر اظہارِ خیال کیا۔ بین الاقوامی سیاسی منظر کو پیش کیا۔ اہم مسائل اور واقعات پر خصوصی نمبر بھی شائع کیے۔ سیاسی حال کے لیے اپنی تجاویز بھی پیش کیں۔ ہمایوں، عالم گیر، نیرنگِ خیال، ترجمان القرآن نے بالخصوص حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کیے اور مشاہیر کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔

ان تمام اخبارات اور رسائل و جرائد نے برِعظیم میں تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کی کامیابی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ تقریباً ہر بڑی سیاسی جماعت نے اپنی ترجمانی کے لیے اخبارات جاری کیے تھے۔ کئی اخبارات کانگریس اور مسلم لیگ کی سرپرستی میں نکلتے تھے۔ متعدد اخبارات نے اپنے طور پر ان میں سے کسی کی حمایت کی اور لاتعداد اخبارات ایسے تھے جنھوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچائی، رائے عامہ کو ہموار کیا اور حصولِ آزادی کو ممکن بنایا۔ جہاں تک تحریک پاکستان کا تعلق تھا، ہندو صحافت کے فرقہ وارانہ جذبات اور معاندانہ و مخالفانہ رویہ کے سبب مسلم لیگ کے نقطہ نظر کے حامی اخباروں نے پاکستان کے حق میں اپنی بھرپور تحریک شروع کی۔ اس وقت بجا طور پر مسلم لیگ کے حامی اخباروں کا لب و لہجہ اور حلقۂ اثر زیادہ فعال اور موثر رہا۔ اور مسلمانوں کے ایسے اخبارات جو قوم پرست تھے، اور کانگریس کے نقطہ نظر کو پیش کرتے تھے، مسلمانوں کے محدود حلقہ میں کہیں کہیں کامیاب رہے۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ کانگریس فی الحقیقت ہندو جماعت تھی اور اس کے حامی ہندو اخبارات مسلمانوں کے لیے جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے کثیر طبقہ نے نفسیاتی طور پر علاحدگی کے رجحانات رکھنے والے اخبارات میں تسکین محسوس کی۔

❁.....❁.....❁.....❁
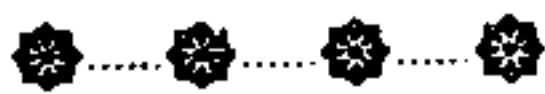
(۵) آزادی کی تحریکات پر تاریخی و سیاسی کتابیں

۱۸۵۷ء کے بعد کی سیاسی صورتِ حال میں مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور بیدار کرنے میں ان متعدد کتابوں کا بھی حصہ ہے، جو کسی تحریکِ آزادی یا جنگ آزادی کی تاریخ، واقعات، حالات، کوائف اور اس کے متعلقہ مجاہدین پر لکھی گئیں۔ ان کتابوں نے دراصل مسلمانوں پر ان کا شاندار ماضی، ان کی عظمت اور برتری کی داستانیں، جرأت و بہادری کے واقعات، آزادی کی اہمیت اور اس کو برقرار رکھنے یا اس کے حصول کی جدوجہد کو پیش کر کے مایوسی، محرومی اور شکست خوردگی کے احساس کو کم کیا۔ ان کتابوں نے ان میں جہاں قومی اور سیاسی شعور بیدار کیا، حصولِ آزادی اور جدوجہد آزادی کے لیے بھی تیار کیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل بھی مسلمانوں میں ایسی ہمہ گیر اور فعال تحریکات ابھرتی رہی ہیں، جن کا ذکر اس وقت کی مایوس اور غیر یقینی صورتِ حال میں طمانیت پہنچا سکتا تھا اور مسلمانوں کو جہدوعمل کا پیغام بھی دے سکتا تھا۔ اس عرصہ میں جو مستقل کتابیں تصنیف ہوئیں وہ زیادہ تر میسور کی جنگ آزادی، تحریکِ مجاہدین اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر ہیں۔

ایک استعماری طاقت ہونے کی وجہ سے حکومت برطانیہ کی ہندوستان میں یہ حکمت عملی رہی کہ ایسی تمام دستاویزات، تحریرات اور اسناد مجتمع کر کے انگلستان بھیج دیں جائیں جو حکومت برطانیہ کی سازشوں، ریشہ دوانیوں سے متعلق ہوں یا ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کرتی ہوں۔ ان سے ایک تو انگریزوں کے عزائم کا اندازہ ہوسکتا تھا اور دوسرے ہندوستانیوں میں اشتعال اور بیداری پیدا ہوسکتی تھی۔'' چناں چہ ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہندوستانی تو ایک طرف انگریز بھی کچھ نہ لکھ سکتے تھے۔ نصابی کتب میں تاریخ پر ایسی کتابیں تصنیف کرائی گئیں کہ ان سے سوائے چند جنگوں کے اور حالات معلوم نہ ہوسکیں۔ ان مرجہ تاریخ کی کتابوں کے ذریعے پڑھنے والوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ دیسی حکمرانوں کی حکومتیں ملک کے لیے عذاب تھیں اور انگریزوں نے ہندوستانیوں

کو اس عذاب سے نجات دلائی۔ ان تاریخوں کا یہ مقصد بھی تھا کہ ملک میں انقلاب اور تعصب بڑھایا جائے۔ اس حکمت عملی کے تحت یہ ممکن نہیں تھا کہ ہندوستانی اپنے مجاہدین آزادی کے کارنامے سے صحیح طور پر واقف ہوسکیں۔ لیکن ملک کی سیاسی اور قومی بیداری کا نتیجہ ایک یہ بھی نکلا کہ تاریخوں چھان بین شروع ہوئی۔ دور افتادہ گوشوں اور روشن پہلوؤں کی تلاش کی گئی اور قومی شعور کے ساتھ ساتھ ماضی کی عظمت و برتری کو مستقبل کی تعمیر کے نظریہ و احساس کے تحت اُجاگر کیا جانے لگا۔ جدوجہد آزادی کی تحریکوں اور مجاہدین پر کتابوں کی تصنیف قومی اور سیاسی مقاصد کے پس منظر میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ انگریز مؤرخین نے تاریخیں لکھتے وقت اپنی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا تھا۔ بعض ہندوستانی مؤرخوں نے بھی جلبِ منفعت اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پیروی کی۔ بیشتر انگریز مؤرخین کی نقل اپنے الفاظ میں کی بلکہ بہت سے ایسے روشن پہلوؤں کو بھی نظر انداز کر دیا جن کچھ نہ کچھ اشارہ انگریزوں کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ ایسی ناانصافیاں زیادہ تر محمد تغلق اور اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے ساتھ کی گئیں۔ مسلمانوں میں قومی شعور کی ابتدا ان تصانیف میں بھی نظر آتی ہے جو ایسی تاریخی ناانصافیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے اور زیادہ روشن پہلوؤں کو نمایاں اور اجاگر کرنے کے لیے لکھی گئیں۔

سراج الدولہ کی زندگی، کارنامے اور جدوجہد پر کچھ زیادہ کتابیں تصنیف نہیں ہوئیں نہ ہی جنگ پلاسی پر کوئی مفصل اور جامع مستقل کتاب اس دور میں اُردو میں لکھی گئی۔ صرف دو قابل ذکر کتابیں اس ذیل میں تحریر ہوئیں۔ صادق قریشی نے سراج الدولہ لکھی جس میں زندگی کے عام واقعات کے علاوہ بنگال کے سیاسی اور معاشرتی حالات اور جنگ پلاسی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ زیادہ تفصیلی کتاب اسی نام سے محمد عمر نور الٰہی نے تحریر کی۔ اس میں تمام مذکورہ باتیں تاریخ گوئی کے بہتر معیار پر لکھی گئیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ انگریزوں کی سامراجی ذہنیت، ان کی سازشیں اور سیاسی ریشہ دوانیاں اور لوٹ کھسوٹ کا احوال کتاب میں خصوصیت سے بیان ہوا ہے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے دس بارہ سال کے اندر جو کتابیں تصنیف کیں جن کی انگلستان کو اور ان مصنفین کو ضرورت تھی، ان میں ٹیپو سلطان کے کردار اور جدوجہد کے مقاصد کو مسخ کر کے دکھایا گیا[1] ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندوستانی مؤرخین نے فارسی اور اُردو میں تحریر کیں جن میں سے بعض نے تحقیق و تلاش کے بعد حقیقتوں کے اظہار کی کوشش کی۔ نشان حیدری میر علی

حسین کرمانی نے فارسی میں میجر فریزر کی فرمایش پر تصنیف کی تھی۔ اس سے قبل اُردو میں ایک مختصر اور ناکمل کتاب نامۂ حیدری کے نام سے تحریر ہوئی تھی۔ نشان حیدری میں سوائے چند روایات کے، جو انگریزوں کی ملازمت میں ہونے کی وجہ سے مصنف کو لکھنی پڑیں، باقی حالات بڑی حد تک درست ہیں۔ اس میں ان سازشوں کا حال بھی موجود ہے، جو ٹیپو سلطان کے خلاف امرا اور وزرا نے کیں۔ اس سے زیادہ تفصیلی کتاب مولوی عبدالرحیم نے کارنامۂ حیدری کے نام سے فارسی میں تحریر کی تھی۔ اسے ٹیپو سلطان کے چھوٹے بیٹے شہزادہ غلام محمد کے نام معنون کیا گیا تھا۔ شیخ احمد علی گوپامئوی نے اس کا اُردو ترجمہ حالات حیدری کے نام سے کیا۔ اس کے بعد اُردو ہی میں مولانا احمد اشہری نے دو جلدوں میں حیدر علی و ٹیپو سلطان لکھی۔ یہ کتاب دفتر وکیل امرتسر سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تصنیف میں مذکورہ بالا دونوں فارسی کتابوں سے خاصی مدد لی گئی تھی۔ عبدالحمید کی کتاب ارمغان حیدری ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اس میں ٹیپو سلطان کے ذاتی حالات زیادہ تفصیل سے پیش کیے گئے تھے۔ کتاب کا انداز جذباتی اور عقیدت مندانہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مُلا فیروز کا جارج نامہ اور لالہ کھیم نرائن کی کتابیں فارسی میں ہیں۔ کچھ کتابیں دکنی اُردو میں تحریر ہوئیں، جن میں سوائے جنگ کے حالات اور واقعات کے کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ آخری دور میں محمد عبداللہ بٹ نے لاہور سے ۱۹۴۵ء میں مضامین کا ایک مجموعہ ٹیپو سلطان مرتب کیا جن میں مختلف نام ور اہل قلم نے ٹیپو سلطان کی شخصیت، جدوجہد اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اس عہد کے دور آخر میں زیادہ قابل قدر کام محمود خاں محمود منگلوری کا ہے۔ اُنھوں نے زیادہ تر تصنیفی کام میسور اور ٹیپو سلطان پر ہی کیا۔ اس سلسلے میں ان کا زیادہ اہم کام ۱۹۳۵ء میں تاریخ سلطنت خداداد کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ساری کتاب تفصیلی ہے اور اس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے کارنامے اور انگریزوں کے خلاف ان کی جدوجہد ہر پہلو سے بالتفصیل بیان ہوئی ہے۔ تلاش و تحقیق کا انداز معیاری ہے۔ اس میں انگریز مؤرخین کی غلط بیانیوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب صحیفۂ ٹیپو سلطان ہے۔ اس میں اُنھوں نے زیادہ بہتر انداز سے ٹیپو سلطان کے روشن کارناموں کو دلائل اور اپنی نئی تحقیقات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب میں کرک پیٹرک کی مرتبہ کتاب منتخب مکاتیب سلطانی کا ترجمہ معہ تشریح پہلی مرتبہ شامل کی۔ کرک پیٹرک کی اس کتاب میں ٹیپو سلطان کے مکاتب اور فرامین تھے۔ ان کے ذریعہ ٹیپو کی شخصیت اور کارنامے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ کتاب

۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی تھی[۲] محمود منگلوری کی ایک مختصر کتاب ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے، اس میں ایسی جنگوں کا مختصر حال تحریر کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے لیے عروج و زوال کا باعث ہوئیں۔ ان میں آخری دو جنگیں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھیں۔ ایک جنگ پلاسی اور دوسری میسور کی جنگ آزادی۔ ان دونوں کے حالات و کوائف لکھتے وقت مصنف نے کھل کر انگریزوں کی ریشہ دوانیاں، سازشیں اور ان کے استعماری عزائم بیان کیے۔ مسلمانوں کی جرأت مندی و بہادری کا اظہار ان کے بیان کی خصوصیت ہے۔ مصنف نے اسے ایک قومی خدمت سمجھ کر تصنیف کیا تھا[۳]

ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی کے بعد آزادی کی اہم تحریک، تحریکِ مجاہدین ہے۔ اس کی فکری آب یاری شاہ ولی اللہ کے فکر اور فلسفہ نے کی تھی۔ جو فکری اور سیاسی تحریک شاہ ولی اللہ نے شروع کی، اس نے ڈیڑھ صدی تک برِعظیم کو فکری اور سیاسی نہج پر متاثر کیا تھا۔ اس عہد میں ان کی زندگی، ان کے کام اور ان کی فکر کو عام کرنے میں ان تصانیف کا بڑا ہاتھ ہے جو جدید تقاضوں کے مطابق تحریر کی گئیں۔ اس انداز کی اہم کتاب مولانا عبیداللہ سندھی کی شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ہے، جس میں مختلف ادوار کے تعین کے ساتھ شاہ ولی اللہ کی فکر اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں خصوصیت سے سیاسی طرزِ فکر اور اس فکر کے سیاسی اثر و نفوذ کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس تحریک کا پہلا دور خود شاہ ولی اللہ کے سیاسی فلسفہ اور ان کی سیاسی تحریک سے متعلق ہے۔ مولانا سندھی نے ایک اور کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ محض شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی تشریح میں لکھی۔

دیگر کتابوں میں ایک حیات ولی ہے جس کے مصنف مولانا محمد رحیم بخش دہلوی ہیں۔ یہ کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کے آبا و اجداد، اولاد اور اساتذہ کا تذکرہ ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ کی فکر اور اس کی تشریح اور ان کے کام بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مولانا رحیم بخش دہلوی نے رسالہ الفرقان بریلی کی ایک اشاعت ''شاہ ولی اللہ'' کے لیے مخصوص کی۔ اس میں شاہ ولی اللہ کی فکر اور ان کے کام کا ہمہ گیر پہلوؤں سے احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۴۱ء میں مرتب ہوا تھا۔ مولانا سیّد محمد میاں نے ایک تفصیلی کتاب علمائے ہند کا شاندار ماضی کی جلد دوم شاہ ولی اللہ کی تحریک کے لیے وقف کی۔ اس میں تفصیل سے ان کی زندگی کے حالات، ان کی فکر و حکمت اور ان کے کارناموں کو تحریر کیا۔

یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے اپنی دو کتابوں ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات اور تراجم علمائے حدیث میں شاہ ولی اللہ کی تحریک سے متعلقہ زعما کی سوانح اور ان کی علمی و سیاسی خدمات کا جائزہ لیا۔ یہ کتابیں علی الترتیب ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ شاہ ولی اللہ کی زندگی، ان کی فکر، ان کے کام اور اثرات پر زیادہ تفصیلی کتاب مناظر احسن گیلانی نے تذکرہ شاہ ولی اللہ تحریر کی۔ اس میں سیاسی اور معاشرتی پس منظر بھی ہے اور فکر کا تقابلی مطالعہ بھی۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء تک دو مرتبہ شائع ہوئی۔ شاہ ولی اللہ کی فکر اور ان کے کارناموں اور ان کے اثرات کا احاطہ کرنے کے لیے اور بھی قابل ذکر کتابیں تحریر ہوئیں۔ شیخ بشیر احمد لودھیانوی نے امام ولی اللہ دہلوی اور ان کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات لکھی۔ اس میں ان کے فلسفہ کے مطابق برطانوی ہند کے معاشی اور معاشرتی مسائل کا حل پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ محض فلسفۂ عمرانیات پر شمس الرحمٰن محسنی نے شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے تحریر کی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی تصنیف مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تجدید و احیائے دین، مولانا صدرالدین اصلاحی کی افادات حضرت شاہ ولی اللہ بھی اسی سلسلے کی کتابیں ہیں۔ ان مذکورہ کتابوں میں سے اکثر میں شاہ عبدالعزیز کا تذکرہ بھی مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے حالات اور کاموں پر مولانا رحیم بخش دہلوی کی حیات عزیزیہ قابل ذکر تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ کی فکر اور حکمت، تحریکِ مجاہدین کا پیش خیمہ تھی۔ اس تحریک کا حقیقی مقصد اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو غلامی اور ظلم سے آزاد کرانا تھا۔ یہ پہلی عوامی تحریک تھی جو سیاسی فرض کے شعور سے پیدا ہوئی تھی۔ اس تحریک کے پس منظر، اس کے فلسفہ اور مقصد، حالات و واقعات اور اس کے مجاہدین پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ تحریک کے دوران لکھی گئی کتابوں کا ذکر گزشتہ صحافت میں کیا جا چکا ہے۔ اس دور میں قابل ذکر کتابوں میں ایک سوانح احمدی ہے۔ اسے مولانا محمد جعفر تھانیسری نے تحریر کیا تھا۔ اس میں سیّد احمد شہید کے حالات زندگی، جہاد کی تفصیلات اور تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ مشہور خلفا کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور آخر میں سیّد احمد شہید کے مکتوبات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سیّد احمد شہید پر دوسری اہم کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیرۃ سیّد احمد شہید ہے جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بالتفصیل زندگی کے حالات اور سیرت کی تصویر پیش کی گئی ہے، اور جہاد کی غرض و غایت اور کوائف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا سیّد اسمٰعیل شہید پر مرزا حیرت دہلوی کی حیات طیبہ

ہے۔ اس میں عقیدت مندی کے ساتھ اسمٰعیل شہید کے حالات زندگی، تفصیلی کارنامے اور جہاد کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے حصہ دوم میں سیّد احمد شہید کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسمٰعیل شہید پر ایک اور قابل ذکر کتاب مقالات یوم اسمٰعیل شہید کا مجموعہ ہے۔ جسے ۱۹۴۳ء میں عبداللہ بٹ نے مرتب کیا تھا۔ اس میں تحریکِ مجاہدین اور سیّد احمد شہید کے تعلق سے اسمٰعیل شہید پر مختلف پہلوؤں سے مضامین شامل ہیں۔ پیش لفظ عبداللہ بٹ کا اور مقدمہ مولانا مودودی کا تحریر کیا ہوا ہے مضمون نگاروں میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز، غلام رسول مہر، یوسف سلیم چشتی، سیّد محمد میاں، خواجہ عبدالحمید ہیں۔ ایک نظم مولانا عبدالمجید سالک کی بھی شامل ہے۔

تحریکِ مجاہدین کے تمام پہلوؤں پر مبنی پہلی قابل قدر کتاب مسعود عالم ندوی نے تحریر کی۔ یہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کے نام سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس مختصر تصنیف میں تحریک جہاد کی تاریخ، مجاہدین کے کارناموں پر مختصر تبصرہ اور مخالفین کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشان دہی اور تردید شامل ہے۔ مولانا محمد میاں نے علمائے ہند کا شاندار ماضی کی تیسری جلد میں تحریکِ مجاہدین کا جائزہ لیا اور مجاہدین کے حالات و کارنامے تحریر کیے۔ مولانا سیّد طفیل احمد منگلوری نے اپنی اہم کتاب مسلمانوں کا روشن مستقبل میں جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی، تحریک جہاد کے مختصر حالات و واقعات تحریر کیے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں تحریک جہاد کا پس منظر اور اس کے حالات و واقعات تحریر کیے اور مجاہدین کا ذکر کیا۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے اپنی مذکورہ تصانیف میں شرکائے جہاد کے تصنیفی اور عملی کارناموں پر مختصر شذرات لکھے۔ بعد میں اس تحریک پر بڑا مفصل، دقیع اور قابل قدر کام مولانا غلام رسول مہر نے تین جلدوں سیّد احمد شہید، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین میں کیا۔

تحریکِ مجاہدین اپنا سیاسی مقصد حاصل نہ کر سکی۔ اس کی ناکامی ناگزیر بھی تھی۔ مگر رہے سہے مجاہدین اس کی ناکامی کے بعد بھی تقریباً تیس سال تک شمال مغربی ہند کے مختلف علاقوں میں جہاد کرتے رہے۔ انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے مالدہ، راج محل، انبالہ وغیرہ میں خصوصی عدالتیں قائم کیں، جہاں سے متعدد مجاہدین کو سزائے موت اور حبس دوام کی سزائیں دی گئیں اور لاتعداد جائدادیں ضبط کی گئیں۔ تحریک کے اس مرحلہ پر بھی کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خود اس وقت ان مظالم کا شکار ہونے والوں میں مولانا جعفر تھانیسری تھے۔ اُنھوں نے تواریخ عجیب المعروف

بہ کالاپانی تحریر کی۔ اس میں مصنف نے مقدمہ کی روداد اور ابتلا و آزمائش کی سرگزشت قلم بند کی ہے۔ تذکرۂ صادقہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری ہی نے تحریر کیا۔ یہ بھی تواریخ عجیب کے طرز پر لکھی گئی تھی۔ اور اس کا موضوع اور اس کے مندرجات بھی یکساں تھے۔ اس دور کے مقدمات، سازش کے پس منظر، اسباب و کوائف پر ولیم ہنٹر نے اپنی معروف کتاب OUR INDIAN MUSALMAN تحریر کی تھی۔ ڈاکٹر صادق حسین نے ۱۹۴۴ء میں اس کا ترجمہ کیا، مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں یہ کتاب خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اصل میں یہ انگریزوں کی جانب سے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی پر ایک نقطہ نظر بھی ہے۔ اس میں جو باتیں غلط اور نامناسب تھیں، سیّد احمد خاں نے ان پر تنقیدی تبصرہ کیا تھا۔ اس وقت ان کا یہ تبصرہ انگریزی میں PIONEER کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ ترجمہ کے ساتھ اخبار سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کی اشاعتوں ۲۴ر نومبر ۱۸۷۱ء تا ۲۲ر نومبر ۱۸۷۲ء میں شائع کیا گیا۔ حافظ احمد حسین بدایونی نے اسے اُردو میں ترجمہ کے ساتھ لندن میں، جہاں وہ اس وقت مقیم تھے، شائع کرایا[۴] یہ بعد میں لاہور سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اب اُردو میں قابل قدر اور وقیع کتابیں موجود ہیں لیکن ۱۹۴۷ء سے قبل اُردو زبان میں کوئی معیاری، جامع اور مفصل کتاب تحریر نہیں ہوئی۔ انگریزی میں متعدد کتابیں تھیں، لیکن انھیں انگریزوں نے اپنی مصلحتوں کے تحت تحریر کیا تھا۔ انگریزی میں صرف ایک ہندوستانی مصنف وی۔ڈی ساور کرنے INDIAN WAR OF INDEPENDENCE لکھی تھی۔ یہ لندن سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی لیکن حکومت نے اسے ضبط کرلیا۔ تقسیم ہند سے قبل دوسری مرتبہ چھپی مگر اس مرتبہ بھی ضبط ہوگئی۔ جنگ آزادی کے بارے میں پہلی اہم تصنیف سیّد احمد خاں کا رسالہ اسباب بغاوت ہند ہے جسے انھوں نے کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟ کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس کی پانچ سو جلدیں چھپوائیں اور پارلیمنٹ انگلستان کے ارکین اور معززین کو بھیج دیں۔ اس کی ایک جلد ''گورنمنٹ آف انڈیا'' کو بھی روانہ کی۔ اس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کا سارا الزام بڑی دلیری اور آزادی کے ساتھ انگریزوں پر ڈال دیا تھا۔ اسے حکام کی جانب سے ''نہایت باغیانہ مضمون'' قرار دیا گیا۔ انگلستان کے اخبارات نے بھی خوب شور مچایا۔ ہندوستان میں اس رسالہ کی عام اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ مگر الطاف حسین حالی نے اسے کہیں سے فراہم کرکے حیات جاوید کے ساتھ ۱۹۰۱ء میں بطور ضمیمہ شائع کیا۔ اس کے بعد اس کی متعدد اشاعتیں ہوئیں۔ اس موضوع پر

سیّد احمد خاں کی دوسری کتاب سر کشی ضلع بجنور محض بجنور میں جنگ آزادی کے دوران پیش آنے والے واقعات کے بیان پر مبنی ہے۔

جنگ آزادی پر اُردو میں ایک اور اہم کتاب پنڈت کنہیالال کی تاریخ بغاوت ہند محاربۂ عظیم ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ فی الحقیقت اسے بعض انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھا گیا تھا۔ اس کا اظہار خود مصنف نے پہلی اشاعت کے سرورق پر کیا ہے۔ اس لیے بڑی حد تک یہ انگریزوں کے نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعہ تحریک کے خدوخال کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ پھر بھی یہ ابتدائے ۱۸۵۷ء سے اسی سال کے آخر تک کی مختلف مقامات کے تفصیلی حالات و واقعات پیش کرتی ہے۔ ولیم ایڈوارڈس نے جنگِ آزادی کے دوران یکم جون ۱۸۵۷ء سے ۲۰ راگست ۱۸۵۷ء تک کے حالات روزنامچے کی صورت میں تحریر کیے تھے۔[۵] مولوی نذیر احمد نے اس روزنامچہ کا اُردو ترجمہ مصائب غدر کے نام سے کیا تھا۔ اپنے روزنامچہ میں ایڈوارڈس نے جن لوگوں کی خیرخواہی کو سراہا ہے، وہ سب ہندو تھے۔ وہ ایک دوراندیش اور ایک انصاف پسند حاکم بیان کیا جاتا ہے۔ روزنامچہ کی ابتدا میں ''غدر'' کے اسباب و محرکات بیان کیے گئے ہیں۔ مصائب غدر کی دوسری اشاعت ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند لکھی تھی۔ یہ بڑی تفصیلی کتاب ہے اور اس میں بڑی قیمتی معلومات یک جا ہیں۔ اس کی تصنیف میں کئی اور میلے سن کی کتاب HISTORY OF INDIAN MUTINY[۶] اور بازورتھ سمتھ کی کتاب LIFE OF LAWARENCE[۷] سے بڑی مدد لی گئی ہے اور ان کے ضروری اقتباسات دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دہلی سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اسی طرح کی ایک تصنیف بشیر الدین احمد کی واقعات دارالحکومت دہلی ہے۔ یہ دہلی کی بڑی مفصل تاریخ ہے اور اس میں جنگ آزادی کے دوران پیش آنے والے واقعات بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ آگرہ سے ۱۹۱۹ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے قریبی عرصہ میں دہلی کی بزم رفتہ کی یادگار میں کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مولانا راشد الخیری کی نوبت پنج روزہ، دہلی کی آخری بہار، داستان پارینہ، غدر کی ماری شہزادیاں، ناصر نذیر فراق کی لال قلعہ کی ایک جھلک، دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ، منشی فیض الدین دہلوی کی بزم آخر، مرزا فرحت اللہ بیگ کی دہلی کی آخری شمع اور پھول والوں کی سیر، باقر علی داستان گو کی مولا بخش ہاتھی عرش تیموری کی قلعہ معلی کی جھلکیاں وزیر حسن دہلوی کی دلی کا آخری

دیدار، خواجہ محمد شفیع کی دلی کا سنبھالا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کی تمام کتابیں، جو ۱۸۵۷ء کے متفرق واقعات یا اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہیں، تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کو خواجہ حسن نظامی نے انگریزی حکام سے اجازت لے کر شائع کیا تھا اس لیے ان میں ہر جگہ حقیقی مناظر کی عکاسی کم ہے۔ بیگمات کے آنسو کی وجہ سے انھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی اس سلسلے میں جتنی کتابیں ہیں وہ یا تو انگریزی یا فارسی تحریروں کے تراجم تھے یا مختلف مآخذ کے اقتباسات غدر کے فرمان کے نام سے TRIAL OF BAHADAR SHAH مرتبہ ایچ ایل او گیریٹ میں شامل فرامین کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے فرامین بیشتر اُردو میں تھے گیریٹ نے ان کا ترجمہ کر کے انھیں اپنی تصنیف میں شامل کیا تھا۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کی دیگر کاوشیں یہ ہیں: بہادر شاہ کا مقدمہ، مطبوعہ ۱۹۲۵ء دہلی کا آخری سانس مطبوعہ ۱۹۲۵ء بہادر شاہ کا روزنامچہ مطبوعہ ۱۹۲۴ء غدر کی صبح و شام مطبوعہ ۱۹۳۱ء گرفتار شدہ خطوط مطبوعہ ۱۹۲۳ء، محاصرہ دہلی کے خطوط مطبوعہ ۱۹۲۵ء، غدر کا نتیجہ مطبوعہ ۱۹۳۰ء۔ اسی طرح کا ایک مختصر سلسلہ کتب علامہ انتظام اللہ شہابی نے تحریر کیا تھا۔ یہ ان کی تحقیقی کتابیں تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ایسے علما کا تذکرہ تھا جو جنگ آزادی اور اس سے قبل انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ غدر کے چند علماء، ایسے علما پر تھی جو جنگ آزادی میں سرگرم اور فعال رہے علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایڈورڈ ٹامسن نے جنگ آزادی پر ایک کتاب THE OTHER SIDE OF THE MEDAL تحریر کی تھی۔ اس میں اس نے یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی باہمی منافرت دور ہو تاکہ آیندہ کے لیے ایسا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے قابل توجہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں انگریزوں کی زیادتیوں کا ذکر بھی کہیں کہیں اشارتاً کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بعض اہم اقتباسات کا اُردو ترجمہ الہلال کے دوسرے دور ۱۹۲۷ء کے دو نمبروں میں شائع ہوا لیکن وہ نامکمل ہی رہا۔ بعد میں پوری کتاب کا ترجمہ شیخ حسام الدین امرتسری نے اپنی ایام اسیری میں کیا۔ یہ ترجمہ فروری ۱۹۴۷ء تک دو مرتبہ شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ مشہور سیاسی اور اشتراکی رہنما مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے لکھا تھا۔ مقدمہ خاصا تفصیلی ہے اور انقلابی جذبہ کے تحت تحریر ہوا ہے۔ جنگ آزادی کے اسباب اور

عنوان ''واقعات کی تحقیق'' کے تحت کچھ ایسے واقعات تحریر کیے گئے ہیں جو انگریزوں کے ظلم وستم پر مبنی تھے۔ مقدمہ کے آخر میں ناکامی کے اسباب واثرات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ اسی انداز کی ایک اور کتاب کا اُردو ترجمہ ہوا۔ ایک فرانسیسی خاتون مسز ہارٹسٹٹ نے جنگِ آزادی کے ابتدائی حالات اور انگریزی حکومت کی بے سروسامانی کی عکاسی فرانسیسی زبان میں کی تھی۔ اسے ڈاکٹر فیلکس ڈڈنیارڈ نے مرتب کیا، جس کے پاس مسز ہارٹسٹٹ ہندوستان سے واپسی پر زیرِ علاج تھی۔ اس فرانسیسی کتاب کا ترجمہ پہلے فارسی زبان میں وزیرِ تعلیم ایران حسن ابن علی نے کیا جو مجلّہ ایران میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس فارسی ترجمہ سے پروفیسر ظفر تاباں نے اُردو ترجمہ کیا اور غدر کے مناظر کے نام سے نومبر ۱۹۳۵ء میں دہلی سے شائع کیا۔ اس کتاب میں جنگِ آزادی کے چشم دید واقعات وحالات ہیں۔ ان میں انگریزوں کا ظلم وستم اور ہندوستانیوں کی مظلومیت دردآگیں انداز میں پیش کی گئی ہے۔[۸]

جنگِ آزادی کے روزنامچوں اور چشم دید واقعات پر مبنی کچھ اور تحریریں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ داستان غدر ظہیر دہلوی کی خودنوشت ہے۔ یہ جنگِ آزادی کے واقعات کا اہم ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ ضمناً جنگِ آزادی کا مختصر حال لکھا ہے۔ انگریزی حکومت کے خوف سے اُنھوں نے اس میں حقیقت حال بیان نہیں کی۔ ویسے بہادر شاہ ظفر کا نام اور ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ کچھ فارسی میں بھی لکھی گئی تھیں سرگزشت ایام غدر منشی عنایت حسین کی فارسی تحریر ہے۔ یہ لکھنؤ سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے دو منظوم قصیدے فتنہ الہند اور ثورۃ الہندیہ عربی میں جنگِ آزادی کے حالات و واقعات میں تحریر کیے تھے۔ ان میں حالات کی حقیقی عکاسی ہے اور یہ کسی کے دباؤ کے ماتحت نہیں لکھے گئے۔ ان میں دہلی اور لکھنؤ کے حالات مختصراً لیکن جامع طور پر بیان ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے مکروفریب کا پردہ بڑی صداقت سے چاک کیا گیا ہے۔ فضل حق خیرآبادی نے ثورۃ الہندیہ کو جزیرہ انڈمان میں بحالت اسیری تحریر کیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ تھی، جسے محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے اُردو ترجمہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں شائع کرایا۔ اس میں مترجم نے ایک تفصیلی اور تحقیقی سوانح علامہ فضل حق خیرآبادی کی تحریر کی ہے۔ سوانح کے ساتھ ساتھ جنگِ آزادی کے حالات و واقعات اور شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام نے لکھا تھا۔

جنگِ آزادی کے تعلق سے ایسی کتابیں بھی خاص اہم ہیں، جو اس کے رہنماؤں اور مجاہدین پر

تصنیف ہوئیں۔ علما اور مجاہدین پر اہم کتابیں انتظام اللہ شہابی کی تھی۔ دیگر کتابوں میں بھی ان کے تذکرے موجود ہیں۔ مولانا سیّد محمد میاں نے اپنی ضخیم تصنیف علمائے حق کا شاندار ماضی کا چوتھا حصہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، علما اور مجاہدین کے لیے وقف کیا تھا۔ اس میں اسباب، واقعات اور کوائف کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ کچھ کتابیں بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور ان کے حالات جنگِ آزادی پر لکھی گئیں۔ خواجہ حسن نظامی کی کئی تصانیف میں ان کا مختلف حیثیتوں سے ذکر موجود ہے۔ امیر احمد علوی نے بہادر شاہ ظفر ایک تفصیلی کتاب تحریر کی جس میں سیاسی اور ادبی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔ مولانا عبداللہ فاروقی نے ظفر کا افسانہ غم کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ خود مرتب نے تحریر کا تھا۔ اس میں جنگِ آزادی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ پھر جنگِ آزادی کے حالات و واقعات، دہلی کی صورتِ حال اور انگریزوں کا قبضہ، بہادر شاہ ظفر کے احوال، قید کی زندگی اور کس مپرسی کی موت کے واقعات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ راشد الخیری کی غدر کی ماری شہزادیاں کی اشاعت پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بہ سلسلہ یادگار شہیدان غدر ۱۸۵۷ء اور مظلومین دہلی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا انتساب ''شہدائے ۱۸۵۷ء'' کے نام ہے۔ معمولی درجے کی کتابیں ایسی شخصیات پر لکھی گئیں، جو عوامی مقبولیت رکھتے تھے۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی اپنی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنے کے سبب عوام میں خاصی مقبول رہی۔ اس پر متعدد ناول اور سوانحی کتابیں تحریر ہوئیں۔

بعض ایسی کتابیں جو برِعظیم کی سیاسی تاریخ پر لکھی گئی تھیں، آزادی کی مختلف تحریکوں اور جنگوں کے حالات، اسباب و نتائج پر بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ایسی کتابوں میں جن میں واقعات و اسباب کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا تھا۔ ایک غلام باری کی کمپنی کی حکومت ہے۔ مصنف ایک سنجیدہ اشتراکی ادیب تھے۔ اُنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں انگریزی استعماریت کے عروج و ارتقا کی تاریخ بڑے جامع انداز سے مرتب کی تھی۔ کتاب کے کچھ ابواب انگریزوں کے معاشی استحصال کی تاریخ اور جنگہائے آزادی کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں کی زیادتیوں، لوٹ کھسوٹ اور ان کی سامراجی چالوں کو بہت اچھی طرح اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ جنگِ پلاسی، میسور کی جنگِ آزادی اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء پر اس کے ابواب مختصر ہیں لیکن جامع اور تنقیدی ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں اور تیسری مرتبہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔

(۲) اسلامی تحریکات پر نمایندہ کتابیں

تحریکِ اتحادِ اسلامی اور تحریکِ خلافت پر اُردو میں مستقل، جامع اور مفصل کتابیں اس دور میں تحریر نہیں ہوئیں۔ چند کتابیں وقتی اور ہنگامی مسائل اور ضرورتوں پر لکھی گئیں، جو تحریک کے اعتبار سے قابل ذکر نہیں۔ جو کتابیں برِ عظیم کی مختلف مذہبی، سیاسی تحریکوں پر یا ان کے تعلق سے کسی پہلو پر تحریر ہوئیں، ان میں سے بعض میں ان تحریکات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، جیسے سیّد محمد میاں نے علمائے ہند کا شاندار ماضی تحریر کی تھی۔ مجدد الف ثانی اور پھر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی سیاسی اور مجاہدانہ مساعی کے ذکر پر مبنی اس کتاب کے تین حصوں کو اُنھوں نے نئی اشاعت میں یک جا کر کے علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے اس کا نام رکھا۔ علمائے حق کی جلد سوم دو حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اوّل ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۹ء تک اور حصہ دوم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا حصہ اوّل تفصیلی طور پر تحریک اتحاد اسلامی، تحریک ریشمی رومال اور کسی حد تک تحریکِ خلافت کے واقعات اور اشخاص پر مشتمل ہے۔ ان تحریکات کا مذہبی اور سیاسی پس منظر بھی قدرے تفصیل سے بیان ہوا ہے، اور یہ بالخصوص تحریک دارالعلوم دیوبند سے متعلقہ علما کی سرگرمیوں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اسی انداز کا جائزہ اپنی اہم تصنیف شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مطبوعہ ۱۹۴۳ء میں لیا تھا۔ تحریک ولی اللّٰہی کے دوسرے دور کو اُنھوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی وفات پر ختم کیا تھا۔ اس دور میں اُنھوں نے شیخ الہند کی اتحاد اسلامی کی کوششوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کی تحریک کے تیسرے دور میں ''حزب ولی اللّٰہی کی سیاست میں مصطفیٰ کمال کا قومی انقلاب ایک جزو تھا''۔ اس مرحلہ پر تحریک ریشمی رومال اور تحریکِ خلافت سے اس تحریک کا رشتہ منسلک ہوتا ہے۔ چناں چہ ان تحریکات میں حزب ولی اللّٰہی کی شرکت کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف خود اس تحریک کا ایک کردار ہے اس لیے اس نے اپنے ذاتی احساسات اور مساعی پیش کی ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ ان کی دیگر مختلف موضوعات پر کتابوں میں بھی ان تحریکوں کا ذکر موجود ہے کابل میں سات سال، ذاتی ڈائری اس موضوع کو بھی بیان کرتی ہے۔

عبدالوحید خان نے مسلمان اور آزادی کی جنگ کے نام سے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا سرسری نقشہ کھینچا ہے۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہوئیں۔ ایک ۱۹۳۸ء میں اور دوسری ۱۹۴۴ء میں، دوسری اشاعت میں کچھ اضافے شامل ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے اتحاد اسلامی

اور خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کی جدوجہد کا تذکرہ کیا ہے اور ترکوں کی جانب سے حق وکالت ادا کیا ہے۔ اس دور میں ایسی جنگی کتابیں یا تاریخیں تصنیف ہوئیں، ان میں سے زیادہ تر کتابوں میں ترک مسلمانوں کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے والہانہ جذبات اور ترکوں کی حمایت میں ان کی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔ بعض کتابیں خاص ترکوں پر تصنیف ہوئیں۔ اس ضمن میں عبدالمجید عتیقی نے کئی کتابیں تحریر کیں۔ ان کی زیادہ اہم کتاب ترکانِ احرار ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اس کی چھ اشاعتیں منظرِ عام پر آئیں۔ کتاب میں نام ور اور مشہور مجاہدین ترکی کا تذکرہ ہے، جن کی جدوجہد نے ترکی کی خوابیدہ عظمتوں کو بیدار کیا اور عالمِ اسلام کو اتحاد، ترقی اور آزادی کے جذبہ سے سرشار کیا۔ اس کتاب کا مقدمہ سیّد سلیمان ندوی نے تحریر کیا تھا، عبدالمجید عتیقی نے ترکوں پر اور بھی کئی کتابیں تحریر کی تھیں۔ اوج کمال اور عروجِ ترکی مصطفیٰ کمال کی جدوجہد کی داستانیں ہیں۔ مجاہدین ترکی میں نام ور اور بہادر مجاہدین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خالدہ ادیب خانم اور محمود شوکت پاشا بھی ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔ خالدہ ادیب خانم نے ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں جو توسیعی خطبات دیے تھے، ان کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تحریر کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۸ء میں دو مرتبہ طبع ہوا۔ یہ خطبات عثمانی ترکوں کی تاریخ ان کا زوال، انقلابات اور ترکی کی جنگِ آزادی جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں ترکی کی موجودہ حالت اور مستقبل پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا۔ مصطفیٰ کمال پر ایک اور کتاب محمد مرزا دہلوی نے اتاترک لکھی تھی، جو دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے جذباتی انداز میں مبالغہ کی حد تک اتاترک کی جدوجہد، سیاسی اور شخصی کارنامے، اوصاف اور امتیازات بیان کیے تھے۔ ایسی ہی ایک تصنیف ترکی زبان میں استاد محمد رفیق کی تھی۔ اس کا اُردو میں ترجمہ محمد کرم الٰہی خاموش نے کیا تھا جو لاہور سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ [illegible] ترک نامی کتاب عبدالرب نے تحریر کی۔ یہ الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں انگورا کی تینوں لڑائیوں کے مفصل حالات کے ساتھ ساتھ ترکوں کی متعدد لڑائیوں کے مختصر واقعات درج کیے گئے ہیں۔ عیسائی قوتوں کا ترکوں کے خلاف اتحاد اور ان کی سازشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ روس اور ترکی کے مابین عداوت و عزیمت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ ترکوں کے پہلے رہنما طغرل سے لے کر مصطفیٰ کمال تک سب کے کارنامے اور ترکی کے مستقبل پر خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب مولانا محمد علی

کے نام ہے۔ یہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں خاصی اہم کتاب مکتوب ترکی ہے جو دو حصوں میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کے مصنف حاجی محمد زکریا بے آفندی ترکی تھے۔ اُنھوں نے اپنے مکتوب میں جو بالاقساط ترجمہ ہوکر اخبار احسان میں شائع ہوتا رہا۔ ترکی کے حالات و کوائف دولت عثمانیہ کا زوال، اماکن مقدسہ اور اقوام عرب اور دیگر اسلامی ممالک اور جنگ عظیم کے تمام حالات تحریر کیے تھے۔ اس کتاب کے ذریعہ اس زمانہ میں نہ صرف ترکی کے تمام مسائل سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ اس کے مسائل کو بین الاقوامی اور ممالک اسلامیہ کی سیاست کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ میں اُردو میں ترکی کے مسائل پر ایسی متعدد کتابیں بھی ترجمہ ہوئیں جنھیں حکومت نے اپنی کوششوں سے لکھوایا تھا۔ اس میں مسائل کو مذہبی اور قومی پس منظر میں دیکھنے کے بجائے ''انگریزوں'' کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا تھا جیسے ترکی و برطانوی جنگ کے اسباب کا انکشاف مطبوعہ ۱۹۱۵ء مصنف نامعلوم، ایک مثالی تصنیف ہے۔

مسئلہ خلافت اور ترکوں کے مسائل پر دیگر کتابوں میں سیّد سلیمان ندوی کی خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام اور خلافت اور ہندوستان نمایندہ تصانیف ہیں۔ ان تحریروں میں مسئلہ خلافت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ترکوں سے ہمدردی کے جذبات کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ اور ترکی اور خلافت کے مسائل کو ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال کے ساتھ منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تصانیف اعظم گڑھ سے دارالمصنفین کے تحت شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس تعلق سے لکھی جانے والی اہم کتاب ابوالکلام آزاد کی مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب تھی۔ یہ کلکتہ سے ۱۹۲۰ء تک دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس میں خلافت کی دینی تشریح اور اس کی اہمیت بیان کی گئی تھی۔ اور ولولہ انگیز طریق پر ہندوستانی مسلمانوں کو اس کے تحفظ کی دعوت دی گئی تھی۔ بعد میں اُنھوں نے ایک بسیط کتاب مسئلہ خلافت تصنیف کی جس میں خلافت پر اسلامی نقطہ نظر کی مؤثر ترین تشریح و تعبیر ہے۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی آزادی، عالم گیر برادری، جماعتی نظام، امامت کی ضرورت اور اسلام کے بین الاقوامی پیغام کے موضوعات پر سیر حاصل بحث ہے۔ یہ کتاب تقسیمِ ہند سے قبل کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بھی مسئلہ خلافت کی بحث میں حصہ لیا تھا۔ اُنھوں نے اس سلسلے میں رسالہ خلافت تحریر کی، جو امرتسر سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی، دیگر علما نے متعدد رسائل تحریر کیے۔ ان میں مولانا مودودی نے مسئلہ خلافت، سمرنا میں یونانی مظالم اور ترکی میں عیسائیوں کی حالت

ترجمہ کیے، جو دہلی سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئے اور برطانیہ اور ترکی، پیرس کانفرنس کی تجاویز وغیرہ تحریر کیے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ظفر علی خان وغیرہ کے خطبات اس تعلق سے بہترین تحریریں ہیں۔ ان تحریروں نے ایک طرف خلافت کی تحریک کے لیے دینی سند فراہم کی، دوسری طرف مسلمانوں کو اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کی دینی اہمیت سے روشناس کرایا اور تیسری طرف ان میں ایک عالم گیر اسلامی برادری کا احساس مضبوط کیا اور انھیں استعماری طاقتوں کا باغی بننے کے لیے تیار کیا۔

تحریکِ خلافت کے ساتھ ساتھ برِ عظیم میں ''تحریک عدمِ تعاون'' شروع ہوئی تھی، جو برطانوی حکومت سرکاری اداروں اور سرکاری سرپرستی سے مقاطعہ کے مقصد سے شروع ہوئی تھی۔ ترکِ موالات پر ایک جرأت آمیز کتاب کلمة الحق مولانا معین الدین اجمیری نے تحریر کی تھی۔ اس کے سرورق پر عنوان کے نیچے عربی زبان میں اور پھر اس کے ترجمہ اُردو زبان کے نیچے یہ عبارت تحریر تھی کہ ''ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے''۔ کتاب کا موضوع ترکِ موالات کے حق میں ہے اور اس میں مختلف پہلوؤں سے ترکِ موالات کے مسئلہ کا جائزہ لے کر اس تحریک کے خدوخال واضح کیے گئے ہیں۔ حکومت کے رویّہ اور سلوک پر اس کی مذمت کی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اس ضمن میں ایک رسالہ تحریك عدم تعاون اور احکام دین مبین لاہور سے شائع ہوا تھا۔

اسی تحریک کے دوران مسلمانوں نے تحریکِ ہجرت بھی شروع کی تھی۔ اس مسئلہ پر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مختلف مطبوعہ بیانات وارشادات وفتاویٰ کا مجموعہ رسالہ ہجرت و رسالہ قربانی گاؤ لکھنؤ سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس تحریک میں مصنف کی شخصیت اور ان کی تصنیف دونوں نمایندگی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۴) سیاسی مسائل اور آزادی پر نمایندہ کتابیں

(الف) ہندوستانی مسلمانوں کے قومی، سیاسی مسائل پر نمایندہ کتابیں

مسئلہ خلافت کے مباحث نے اسلامیت کے احساس کو خوب بیدار کر دیا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ اسلامی قومیت کا تصور تھا۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کا نظریہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے برِ عظیم کی سیاست میں جاری ہوا تھا۔ مگر اس کے دینی مضمرات پوری طرح واضح نہ تھے۔ تحریکِ خلافت اور اس کے بعد کے حالات نے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کے مقابلے میں اسلامی قومیت کے تصور کا نیا

احساس بیدار کیا اور یہ اس زمانے کا ایک علمی مسئلہ بن گیا۔ لیکن اس بحث میں علمائے دین کا ایک گروہ متحدہ قومیت کے حق میں گیا۔ تحریکِ خلافت میں کانگریس کی شرکت نے ''اتحاد'' کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اسے اس گروہ نے متحدہ قومیت کے تصور میں ضم کر لیا۔ مولانا ابوالکلام جو خلافت کے تصور کے بہترین شارح تھے، متحدہ قومیت کے نظریہ کے بھی علم بردار بنے اور اس تصور کی دینی تشریح کا کام مولانا حسین احمد مدنی نے انجام دیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں اور مولانا انور شاہ کشمیری نے بھی اسی موقف کی تائید کی اور یہی جمعیۃ العلمائے ہند کا سرکاری موقف بن گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس مسئلے پر ایک مختصر کتاب بعنوان متحدہ قومیت اور اسلام تحریر کی جب کہ ان کے حامیوں نے ان خیالات کو اپنے مضامین اور خطبات میں پیش کیا۔

متحدہ قومیت اور اسلام دیوبند سے کئی مرتبہ ترامیم کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس میں مولانا حسین احمد مدنی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں اور اس غیر ملکی قوم سے جو کہ وطن اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے حقوق حاصل کریں اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی حالت کو ختم کر لیں۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے۔

متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید اور ابطال کا کام علامہ اقبال اور اُس وقت کے مقتدر علمائے انجام دیا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنا اہم خطبہ ''مسلمان اور متحدہ قومیت'' مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی مذکورہ کتاب علامہ اقبال کے نظریۂ قومیت کے جواب میں تحریر کی تھی۔ یہ علامہ اقبال کے انتقال کے چھ ماہ بعد منظر عام پر آئی۔ علما کے ایک طبقے کی جانب سے اس کے متعدد جوابات دیے گئے۔ مولانا مودودی نے اپنی تصانیف مسئلہ قومیت اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل و دوم میں متحدہ قومیت کے نظریے کا مدلل رد کیا۔ اس ضمن میں یہ تصانیف تفصیلی بحث پر مبنی ہیں۔ ان میں دلائل بڑے قوی اور موثر دیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں دراصل ان کے شذرات، اداریوں، مضامین اور مباحث پر مشتمل ہیں، جو ان کے رسالہ ترجمان القرآن میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے عرصے میں شائع ہوئے۔ مسئلہ قومیت کتابی صورت میں کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس میں قومیت اور اسلام اور متحدہ قومیت اور اسلام، دو طویل

مقالے ہیں۔ پہلے مقالے میں اسلامی قومیت کا تعین کیا گیا ہے اور دوسرے مقالے میں متحدہ قومیت کے نظریے کی قرآنی اور عقلی دلائل کے ذریعے تردید کی گئی ہے۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش مختلف سیاسی مباحث پر مولانا مودودی کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض مستقل عنوانات کے تحت اُنھوں نے متحدہ قومیت، وطنی قومیت اور ''نیشنلزم'' جیسے نظریات کا ابطال کیا اور اسلامی تصورِ قومیت کے نقوش واضح کیے۔ یہ کتاب بھی ۱۹۴۷ء تک کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے مباحث اور دلائل سے یہ نکتہ واضح ہوا کہ اسلام ہی مسلمانوں کی قومیت ہے اور اس قومیت کے تقاضے اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں جب اسلامی نظام عملاً نافذ ہو، اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو اور وہ اس کے حصول کے ذریعے اسلامی حکومت قائم کریں۔

ادارہ طلوعِ اسلام کی جانب سے رازی نے مولانا حسین احمد مدنی کے نظریے کے رد میں ایک مفصل جواب شائع کیا۔ یہ رسالہ متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی کا مدلل اور مسکت جواب تھا۔ اس میں شرح و بسط کے ساتھ مولانا مدنی کے خیالات کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا تھا۔ یہ رسالہ دہلی سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں شبلان نے ''تاریخ وطنیت'' نظریہ وطنیت پر ایک علمی مقالہ تحریر کیا، جو کتابی صورت میں حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا انتساب ''شبانِ محاذ اتحادِ اسلامیہ'' کے نام ہے۔ اس میں وطنیت کا مفہوم، اس کی تاریخ، مختلف مذاہب میں اس کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کی بیداری، مسلمانوں اور ہندوؤں کے معاشرے کا فرق، علاحدہ اسلامی قومیت اور اتحادِ اسلامی کے ابواب تحریر ہیں۔ مجموعی طور پر اس میں وطنیت کا رد اور اسلامی قومیت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا مظہرالدین صدیقی نے ایک کتاب علمائے کرام کا مستقبل تحریر کی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے موجودہ مذہبی رہنماؤں کے علمی اور اخلاقی تنزل سے بحث کی تھی۔ یہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۴۶ء میں نئے اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ مستقبل کے لائحہ عمل کے ساتھ پیش ہوئی۔ اس ضمن میں اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ آیندہ مسلمانوں کا مذہبی اور دینی کام کن خطوط پر ہونا چاہیے۔ چوں کہ علما کی علمی اور اخلاقی بے مایگی اور ہندوستانی قوم پرستی اور وطنیت کے ساتھ ان کا غلامانہ تعاون ایک غیر اسلامی ردِعمل پر منتج ہوا ہے، اس لیے مسلمان اس وقت تک فلاح و نجات کی راہ نہیں پاسکتے جب تک کہ ان کی قیادت اپنے اندازِ فکر، طریقِ عمل اور روح و معنی کے لحاظ سے بنیادِ اسلام پر نہ قائم ہو۔

اس وقت جو متعدد تصانیف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر لکھی گئیں، ان میں سے زیادہ
میں متحدہ قومیت کے نظریے کا رد پیش کیا گیا تھا۔ راغب احسن نے اساسیات قومیت اسلامیہ
مذکورہ کتابوں کے طرز پر لکھی تھی۔ یہ کلکتے سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ انھیں کی اس سلسلے کی ایک اور
کتاب ہندوستان میں جداگانہ انتخاب تھی جو لاہور میں طبع ہوئی۔ سیّد اعجاز حسین نے ہندوستان
کی سیاست، اسلامی نقطۂ نگاہ سے تحریر کی، جس کی اشاعت حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔
عبدالوحید خان کی مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ بھی ان مباحث پر مبنی ہے۔ محمد امین
زبیری نے مسلمانانِ ہند کی سیاست پر سیاست ملیہ مطبوعہ آگرہ اور مسلمانانِ ہند کی
سیاست وطنی مطبوعہ آگرہ تحریر کیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور اہل اسلام کے مصنف ملا
عبدالقیوم نے قومیت کے سلسلے میں کانگریس کے نقطۂ نظر کی تردید کی اور اسلامی قومیت کا تصور واضح
کیا۔ یہ کتاب کان پور سے شائع ہوئی تھی۔ محمد بخش مسلم نے وحدت ملت مسلم لیگ کے نظریہ قومیت
کی تشریح میں لکھی جو مکتبہ لیگ بمبئی سے طبع ہوئی۔

نظریہ قومیت کے علاوہ اس دور میں ایسی متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں ہندوستانی
مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل پیش کیے گئے تھے۔ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی ان کتابوں کا
موضوع تھا۔ سیاست میں مسلمانوں کا خاص حصہ دکھانے کے لیے کچھ کتابیں بھی تحریر ہوئیں۔ اس قسم
کی کتابوں کی تصنیف کا دور اُنیسویں صدی کے آخر سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کچھ تو ایسی
کتابیں تصنیف کی گئیں جن کا مقصد مسلمانوں میں قومی شعور بیدار کرنا تھا اور کچھ ایسی کتابیں تحریر
ہوئیں جن میں اپنے وقت کے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی حالت پیش کی گئی تھی۔ ان کا مقصد
مسلمانوں کی حالت زار سے حکومت کو واقف کرانا اور خود مسلمانوں میں احساس محرومی پیدا کرنا تھا
تاکہ وہ اپنی زبوں حالی کو دور کرسکیں۔ بعض ایسی کتابیں بھی تحریر ہوئیں جو مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر
کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو بیان کرتی ہیں۔ ان میں مصنفین نے مستقبل کے لیے منصوبے اور خاکے
تجویز کیے۔ اس کی ابتدا سیّد احمد خان نے کی تھی۔ اُنھوں نے زیادہ تر مضامین اور کتابچے مسلمانوں کی
حالت دکھانے اور ان کی جانب سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے تحریر کیے۔ ایسی کوششیں اس
زمانے میں دیگر زعمانے بھی انجام دیں۔ ایسی ہی ایک کوشش اس وقت منشی خوندکار فضل ربی نے
حقیقت مسلمانان بنگالہ کے ذریعے کی تھی۔ لیکن ان کی یہ کوشش محض بنگال کے مسلمانوں کی معاشی

اور معاشرتی صورتِ حال بیان کرنے کی حد تک تھی۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں مرشدآباد سے شائع ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا دور جدید اور ہندوستان کے نام سے عبدالقیوم نے اوتھارپ اسٹورٹ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ امرت سر سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاست اور معاشرت میں مسلمان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ مسلمانوں کی مختلف تحریکات اہم سیاسی اور قومی رہنماؤں کا تذکرہ اور برطانوی حکومت کی جانب ان کا رویہ دکھایا گیا ہے۔ اسی انداز کی کتاب کاش البرنی کی مسلم انڈیا ہے۔ جو پہلے مصنف نے انگریزی میں تحریر کی تھی، بعد میں لاہور سے اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اور سیاست میں ہندوؤں سے ان کی مسابقت کی روداد بیان کی گئی ہے۔ حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کی جانب حکمت عملی اور ہندوؤں اور کانگریس کی مختلف تحریکوں، قوم پرست مسلمانوں کی کج فہمیوں پر تنقید اور پھر مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر انھیں اتحاد اور یگانگت کی تلقین کی ہے تاکہ وہ مسلم لیگ کے نصب العین کے تحت اپنا مقصد حاصل کرسکیں۔ اسی موضوع پر خان فضل کریم خان درانی نے ہمارا قومی نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ تحریر کی تھی۔ یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب میں مسلمانوں کے لیے ان کا قومی نصب العین پاکستان کے حصول میں تجویز کیا تھا۔ انھیں تلقین بھی کی تھی کہ اس کے حصول کے لیے جدوجہد کریں تاکہ تمام سیاسی، دینی اور معاشرتی مسائل حل ہوسکیں۔ اشفاق حسین نے خون کے آنسو تحریر کرکے مسلمانوں کی خامیاں ان پر اجاگر کرنے کی کوشش کی جو سیاسی اور معاشرتی ماحول میں پیدا ہوئیں۔ کتاب جذباتی انداز میں اور مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں میں اصلاحی جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس کا منتہائے نظر سیاسی ماحول کی تبدیلی ہے۔ یہ کتاب بجنور سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ محمد امین زبیری کی دونوں مذکورہ کتابیں سیاست ملیہ اور مسلمانانِ ہند کی سیاست وطنی مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور سیاسی جدوجہد کی داستان بیان کرتی ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی، تاریخ اور موجودہ حالت بیان کی گئی ہے۔ یہ مختلف تحریکات، ان سے متعلقہ شخصیات اور قوم کے رجحانات و جذبات کی تفصیلی تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور اہل اسلام میں ملا عبدالقیوم نے کانگریس اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش اور مسلمانوں کے مختلف سیاسی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ عبدالوحید خاں نے مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی، سیاسی تحریکات میں مسلمانوں کی جدوجہد، ان کی

مشکلات اور مصائب بیان کیے۔ اور جدوجہد آزادی میں مسلمانوں نے جس قدر حصہ لیا، اس کی داستان پیش کی گئی۔ اسی موضوع پر ایک اور کتاب محمد مرزا نے مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی تحریر کی تھی جس میں ایسے ہی موضوعات پر مصنف نے اظہار خیال کیا تھا۔ یہ کتاب دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۹۴۰ء کے آغاز میں اخبار مدینہ بجنور نے جو کانگریسی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرتا تھا، ۱۹۳۸ء/ ۱۹۳۹ء تک شائع شدہ ۵۳۵ سیاسی مضامین کا ایک مجموعہ ''مسلمان کیا کریں''؟ شائع کیا۔ اس میں مختلف اہل قلم، دانش ور اور سیاسی رہنماؤں نے موجودہ صورتِ حال مسلمانوں کے سیاسی اور علمی مسائل کے حل کی تجویزیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اس لحاظ سے قابل توجہ ہے، اوّل تو اس میں لیگ، کانگریس، احرار اور دیگر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ باوجود شدید باہمی مخالفت کے کانگریسی حکومتوں کے طرز عمل کی وجہ سے یہ سب کانگریس کی مہا سبھائی ذہنیت کے شاکی ہیں۔

میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں لاہور نے برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی پر ایک فکر انگیز کتاب مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل تحریر کی۔ یہ خطبہ اور مقالے کی صورت میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ تیسری مرتبہ لاہور سے ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی۔ کتاب مختصر ہے لیکن اپنے موضوع اور مندرجات کے لحاظ سے جامع ہے۔ اس میں پہلے اسلام اور اسلامی تہذیب کا تذکرہ ہے پھر مسلمانوں کا زوال، ہندوستان میں مسلمانوں کی مختصر تاریخ، ہندو مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی مسئلہ، مسلمانوں کی قومی بیداری جیسے موضوعات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے نصب العین کا تعین اور پاکستان کے لیے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور آخر میں مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی انداز کی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ہے جسے مولانا مودودی نے تحریر کیا تھا۔ اس میں بھی مسلمانوں کی مختلف حیثیتیں، سیاسی صورتِ حال، سیاسی مسائل کے مختلف حل اور ان کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے اسلامی قومیت کی بنیاد پر ایک نصب العین متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں مستقبل کے لیے مختلف تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

اس سلسلے میں زیادہ اہم کتاب سیّد طفیل احمد منگلوری کی مسلمانوں کا روشن مستقبل ہے۔ یہ بدایوں سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اپنے موضوع پر مثالی اور اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے

متعدد ابواب میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے ہر پہلو کا مصنف نے تاریخی جائزہ لیا ہے اور اس پر تبصرہ کیا ہے۔ تمہیدی باب میں بنیادی انسانی حقوق کا تعین کیا گیا ہے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں کارکردگی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کی جدوجہد اور اس کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم اور ملازمت میں پس ماندگی کا تذکرہ، تعلیمی اصلاح اور فروغ کی تحریکوں کا جائزہ اور علی گڑھ تحریک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے قومی اور سیاسی شعور کا ارتقا بھی دکھایا گیا ہے۔ مختلف سیاسی اور قومی جماعتوں، ان کا قیام، مقصد اور کارکردگی، قومی اور سیاسی رہنماؤں کی جدوجہد کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ان پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء تک کی صورتِ حال کے جائزے سے متعلق ہے۔ اس عرصے کے بعد کے حالات و واقعات مصنف نے روح روشن مستقبل میں شامل کیے ہیں۔ یہ دراصل ان کی پہلی مذکورہ کتاب کا خلاصہ ہے، جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۶ء تک کے حالات کا اضافہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ سیاست پر سیر حاصل تبصرہ اور آئندہ کی توقعات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ایک علاحدہ باب ''پاکستان'' تحریر کیا ہے، جس میں تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی و اقتصادی پہلوؤں سے پاکستان کی تحریک کا جائزہ لے کر اسے ناممکن قرار دیا ہے۔

(ب) ہندو مسلم تنازعات پر منتخب کتابیں

تحریکِ خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش و خروش نے برِّعظیم کی سیاسی سرگرمی میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی اور اس کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ کانگریس کو بھی اس تحریک سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا تھا لیکن بہت سے انتہا پسند ہندوؤں نے تحریک عدمِ تعاون اور تحریکِ خلافت کے دوران کانگریس سے حکمتِ عملی کے اختلاف کی وجہ سے بغاوت کر دی۔ ۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کے خلاف ان کی تحریکوں کا اجرا حقیقتاً اس امر کا نتیجہ تھا کہ برِّعظیم کی سیاست میں مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر اور تحریکِ خلافت کی تنظیم اور اس کے انضباط سے پیدا ہونے والی مسلم قوت ہندوؤں کو بہت ناگوار تھی۔ کانگریس کے خلاف یہ تمام ''ہندو قوم'' کی بغاوت تھی۔ ان ہندو انتہا پسندوں نے مختلف ذرائع اختیار کیے، شدت پسند اخبارات میں سلسلہ مضامین تحریر ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور ان کے خیالات کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی۔ اس میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ کھل کر اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کی تحریروں کا موضوع بحث اب یہ تھا کہ مسلمان برِّعظیم کے

ساتھ متعدد صوبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ہندوستان سے کامل یگانگت حاصل کر لینے پر آمادہ نہیں۔ انھیں اپنے اجنبی طریقے ختم کر دینے چاہییں۔ اپنے آپ کو ہندو کہنا چاہیے۔ اپنے نام ہندوانہ رکھنے چاہییں۔ ہندو تہواروں کو منانا چاہیے اور ہندوؤں کے قدیم افسانوی سورماؤں کا احترام کرنا چاہیے۔ الغرض مسلمان ہندومت کا ایک فرقہ بن جائیں اور اپنے آپ کو محمدیؐ ہندو کہیں ان خیالات کے تحت بکثرت ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جذبات کو بھڑکا سکتا تھا۔ انگریزی زبان میں یہ خیالات بڑے وسیع پیمانے پر پھیلائے گئے۔ اُردو میں جو کچھ تحریر کیا گیا اس کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ اس تحریک کو زیادہ تقویت ہریجن، ملاپ، تیج، پرتاب وغیرہ نے پہنچائی، جو کٹر فرقہ پرست اخبارات تھے۔ اس سلسلے میں موضوع زیرِ بحث کے تعلق سے جو کتابیں تحریر ہوئیں ان کا رُخ مسلم سیاست اور سیاسی اداروں کی جانب رہا۔ اور خصوصاً تحریک پاکستان کے دنوں میں زیادہ واضح ہوا۔ انتہا پسند ہندوؤں کی جانب سے جو فرقہ پرستانہ اور معاندانہ خیالات ظاہر ہو رہے تھے اور بطور خاص ان کی مسلم دشمن تحریکات نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق شدید اندیشے پیدا کر دیے۔ ان کے ارادوں کی تفصیل ان کے لیے ثقافتی موت اور مذہبی ارتداد کے مترادف تھی۔ اُنھوں نے اس قسم کے تمام ارادوں کی مزاحمت کا عزم کیا۔ ایک اوسط درجے کا مسلمان بھی مدافعت کے انداز میں غور کرنے پر مجبور ہوتا اور روز بروز ہندوؤں اور کانگریس سے زیادہ دُور ہوتا جا رہا تھا۔

اس ردِ عمل کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی جانب سے اُردو کے بجائے ہندی کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور پھر ایسی تقاریب کا انعقاد ہونے لگا جن کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری تھا۔ ان سب کا بانی اس وقت ہندو قوم پرست بال گنگا دھر تلک تھا۔ اس نے وہ ٹھوس بنیادیں قائم کر دیں جن پر آنے والے زمانے میں وقتاً فوقتاً شدتوں کی ہندو تحریکات تعمیر کی گئیں۔ بنکم چندر چٹرجی نے افسانوں اور گیتوں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف مخاصمت کے جذبات کو ابھارا۔ مسلمانوں کو اسی زمانے میں جو خطرات تھے ان کا جواز ایک ہندو تحریک سے مل گیا تھا۔ یہ ذبیحہ گاؤ کے خلاف ہندوؤں کی شورش تھی۔ ہندوؤں نے ''گایوں کے تحفظ'' کے لیے ایک جماعت کی تنظیم کی جس نے بہت جلد تمام برِعظیم میں اپنی شاخوں کا جال پھیلایا اور جلد ہی اس شورش نے بدنما وسعتیں حاصل کر لیں۔ ہندوؤں کی ان تحریکوں کے خلاف مسلمانوں نے اس وقت ردِ عمل کے طور پر بہت کچھ لکھا۔ سیّد احمد خان نے مضامین تحریر کیے۔ عبدالحلیم

شرر نے مہذب اور اتحاد میں شذرات اور اداریے لکھے اور دیگر مصنفین نے کتابیں تصنیف کیں۔ اس موقع پر ایک خاص کتاب بیہ موقع فریاد کیے مہذب جواب مولوی نصیرالدین حسن خان بریلوی نے تحریر کی۔ یہ ہندوؤں کی قومی تحریکات جو مسلمانوں کے خلاف تھیں اور ان کی ذبیحہ گاؤ کے خلاف تحریک کے جواب میں تھی۔ اس کے اصل مخاطب ہندو تھے۔ انھیں مخاطب کر کے مسلمانوں سے ہندوؤں کی زیادتیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس زمانے میں کاٹھیا وار اور بنارس وغیرہ میں جو فسادات ہوئے تھے ان میں ہندوؤں کی شورشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بریلی سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی۔

جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور اس نے حکومت کے نمائندہ اداروں کے قیام کا مطالبہ تسلیم کرانے کے لیے مسلمانوں کو دعوت دی تو پس ماندہ مسلم اقلیت کے سوال پر مسلمانوں کی جانب سے مختلف نوعیتوں سے اظہارِ خیال کیا گیا۔ سیّد احمد خان نے اپنی تقریروں میں یہ سوال اٹھایا۔ شیخ شمس الدین نے ۱۸۸۸ء میں ایک کتاب تحریر کی جو گورداس پور میں شائع ہوئی۔ اس کا نام آئندہ نیشنل کانگریس تھا۔ اس میں کانگریس کے فرقہ وارانہ مقاصد کی نشان دہی بھی تھی اور مسلمانوں کے قومی مسائل بھی پیش کیے گئے تھے۔

جب بیسویں صدی میں ہندو فرقہ پرستی نے عروج حاصل کیا اور مسلمانوں کے مذہب، ان کی تہذیب اور سیاست پر حملے کیے گئے تو مسلمانوں نے ان کے جواب میں ایک وقیع ادب تخلیق کیا۔ ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کیں تو مولوی ظفر علی خان اور مولانا محمد علی نے مضامین اور نظموں میں ان تحریکوں پر ہندوؤں اور کانگریس کی پُرزور مخالفت کی۔ اسلام اور ہندومت کے موازنے پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ سیاسی علاحدگی پسندی کے دور میں مقبول احمد نے اسلام اور آریہ سماج کی ترازو تحریر کی اور اس میں ہندوؤں کے عزائم، زیادتیوں اور اسلام دشمن منصوبوں کی مذمت کی۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ جذبات کی مذمت میں محمد داؤد حسین نے ہندے ماترم تصنیف کی۔ اس میں متحدہ قومیت کے نظریے کی تکذیب اور ہندوؤں کا مخالفِ اسلام رویہ زیرِ بحث آیا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

ہندو قوم پرستوں کے عزائم کا ایک نمایاں اظہار ان کے ان منصوبوں میں ہوتا ہے جو تعلیمی فروغ کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ واردھا سکیم گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ

اس کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس تک لازمی جبری تعلیم دی جائے گی۔ اس منصوبے کے تحت برِعظیم کی ساری آبادی کو ایک قوم فرض کیا گیا تھا۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یا ایک ہیئت اجتماعی بنایا جائے۔ ودیا مندر سکیم کا مقصد دیہات میں عمومی تعلیم کا فروغ تھا تاکہ گاؤں کے بچوں میں ''قومی نقطہ نظر'' پیدا کیا جائے۔ فی الحقیقت یہ منصوبہ ودیا مندروں کے ذریعے دیہات کی منتشر مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم کوشش تھی۔ ان منصوبوں پر مسلمانوں کی جانب سے مدلل جواب دیے گئے۔ واردھا سکیم پر مولانا مودودی نے اپنی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش میں تفصیلی بحث کی، مسئلے کا ہر پہلو سے تنقیدی جائزہ لیا اور مدلل مخالفت کی۔ دوسری کتاب واردھا کی تعلیمی سکیم اور مسلمان رازی نے تحریر کی تھی۔ ادارہ طلوع اسلام، دہلی سے یہ متعدد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس میں ہندو ذہنیت کا جائزہ لیا گیا۔ متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید کی گئی اور مذہب، زبان اور طرز معاشرت کے پہلوؤں سے اسے مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول قرار دیا گیا۔

اس دوران میں بعض کتابیں ایسی بھی تحریر ہوئیں جن میں ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ طرزِ عمل کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دی گئی تھی۔ سر اکبر حیدری نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات تصنیف کی۔ اس میں ہندو مسلمانوں کے درمیان کج روی دور کرنے اور یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کتاب حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مسئلہ اور کوشش اس دور میں لکھی جانے والی عام کتابوں میں موجود ہے۔ اس وقت اس کے بغیر حصولِ آزادی کو ناممکن سمجھا گیا تھا۔ اس لیے عام طور پر سیاسی مسائل کے حل کے لیے جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دیا گیا۔ سیاسی نوعیت سے ہندو مسلم اتحاد پر گفتگوئے مصالحت نمائندہ کتاب ہے۔ یہ دہلی سے طبع ہوئی تھی۔ اس میں قائداعظم محمد علی جناح، گاندھی، بوس اور نہرو کے درمیان اتحاد کے لیے ہونے والی بات چیت کی تفصیلات ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ان کے حل پر مولانا طفیل احمد منگلوری نے ایک خاص اہم کتاب حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل تصنیف کی تھی۔ یہ بدایوں سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق اس مسئلے کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا ہندوؤں سے مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر جو اختلاف رہا ہے، اس

پر متعدد کتابیں تحریر ہوئیں۔ مسلم قومیت پر تحریر ہونے والی کتابیں بھی اسی ذیل میں تھیں۔ جن کتابوں میں ہندوؤں کی سیاسی حکمت عملی، سیاسی مصلحتوں اور عزائم پر تنقید کی گئی، ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کتاب مولانا مودودی کی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ہے۔ اس میں تمام پہلوؤں سے تفصیل کے ساتھ کانگریس کی تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے متحدہ قومیت کے نظریے، قومی ریاست کی تشکیل کے منصوبے، اس کے ''سوراج'' کے مفہوم اور ''کامل آزادی'' کے تصورات پر کڑی نکتہ چینی اور تنقید کی گئی ہے۔ اس کے اصل عزائم مسلمانوں کے خلاف ہندو سبھا اور انگریزوں سے اس گٹھ جوڑ اور اس کی مسلمان دشمن حکمت عملیوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی انداز کی کتاب سوراجی اسلام کے نام سے رازی نے تحریر کی تھی جو ادارہ طلوع اسلام دہلی سے طبع ہوئی تھی۔ اس میں کانگریسی قائدین کے عزائم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگریسیوں کے متحدہ محاذ کی نشان دہی اور اس پر تنقید کی گئی ہے۔ ابوالکلام آزاد اور دیگر قوم پرست مسلمانوں کی مذمت کی گئی ہے۔ خصوصاً ابوالکلام کے دورِ اوّل کے خیالات اور اس دور میں ان کے خیالات کا موازنہ کیا گیا ہے۔

ہندوؤں کی سیاسی ذہنیت کا ایک تفصیلی اور تنقیدی جائزہ مہاشے فضل حسین نے ہندو سیاست کے داؤپیچ میں لیا تھا۔ یہ کتاب امرتسر سے شائع ہوئی تھی، اس کے تین حصے تھے۔ اس کا حصہ اوّل ''ہندو راج کے منصوبے'' تھا اور ''ہندو سیاست کے داؤ پیچ'' دو ابواب پر مشتمل تھا۔ حصہ اوّل میں ہندوؤں کے قومی، تہذیبی اور سیاسی عزائم بیان کیے گئے تھے۔ ان کی قوم پرستانہ حکمت عملی پر نکتہ چینی اور مسلمان دشمن تحریکوں کا جواب دیا گیا تھا۔ یہ کتاب قادیان سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہندو سیاست کے داؤپیچ ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے حقوق اور ہندوؤں کے ایسے منصوبے جو مسلمانوں کے حقوق کو غصب کرنے کے لیے تھے، بیان کیے گئے۔ حصہ اوّل ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ ہے اور دوسرا اور تیسرا حصہ ۱۹۴۶ء تک محیط ہے۔ ان میں ہندوؤں کی قومی اور سیاسی تحریکوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے اشتراکِ عمل کو نہ صرف مضر بلکہ مہلک قرار دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے ہندوؤں کی متعدد تحریروں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ بھی ہندو ذہنیت پر تنقید ہے۔ یہ قادیان سے شائع ہوئی تھی۔ نہرو رپورٹ کا ایک تنقیدی تبصرہ دہلی سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا

تھا۔ عبدالمجید کی کتاب کیا نیشنلسٹ مسلمان سوچیں گے؟ اس لحاظ سے مسلمانوں کو دعوت فکر دیتی ہے۔ یہ جالندھر سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ میاں بشیر احمد نے اپنی کتاب مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل میں ہندو مسلم مسئلے کا جائزہ لیا تھا۔ اور ہندوؤں کی سیاسی ذہنیت پر تنقید بھی کی، اخبار مدینہ بجنور نے ۱۹۴۰ء میں جو کتاب مسلمان کیا کریں؟ مرتب کی تھی اس میں مختلف الخیال افراد کے سیاسی مضامین شامل تھے۔ یہ مضمون نگار کانگریس، لیگ اور دیگر قوم پرست جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن تقریباً تمام ہی نے کانگریس اور ہندوؤں کی انتہا پسندی اور ان کی خلافِ اسلام تحریکوں سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

جب ۱۹۳۵ء کے دستور کی رو سے انتخابات ہوئے اور ان میں کانگریس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، صوبوں میں نمائندہ صوبائی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا تو کانگریس کے حوصلے بڑے بلند ہو گئے تھے۔ اس نے وقت سے خوب فائدہ اُٹھایا، اپنی حکمت عملی میں خاصی تبدیلی پیدا کر لی۔ اس نے مسلم لیگ کے ارکان سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں، جن کے ساتھ مل کر اسے حسب وعدہ مخلوط حکومت بنانی تھی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اس قسم کا مطالبہ مسلم لیگ کے وجود کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ جب کانگریس وزارتوں نے کام شروع کر دیا اور اس نے مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہ کیا تو ان ناانصافیوں اور زیادتیوں کو دکھانے کے لیے راجا محمد مہدی کے ذریعے پیر پور رپورٹ مرتب کرائی گئی جو دہلی سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اسی طرح سے ایس۔ ایم شریف نے شریف رپورٹ تیار کی۔ یہ پٹنہ سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اور پھر اے۔ کے فضل الحق کا اخباری بیان، کلکتے سے ۱۹۳۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ سب کتابیں انگریزی بان میں تحریر ہوئی تھیں۔ لیکن ان کے اُردو ترجمے ہوئے اور ان کی بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی۔ سب ہی کتابیں کانگریس کے مظالم کو مختلف پہلوؤں سے دکھاتی ہیں۔ اسی انداز کی ایک مفصل روئیداد حکیم اسرار احمد کریوی نے بھی مرتب کی تھی جو سی پی میں کانگریس راج کے عنوان سے ناگ پور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ خاص سی پی کے تعلق سے ہندوؤں اور کانگریس کی فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی کی مفصل روئداد پیش کرتی ہے۔

کانگریس کی تحریک کا ایک تنقیدی جائزہ مسائل کے ایک متعلم نے کیا کانگریس ناکام رہی؟ کے عنوان کے تحت لیا تھا۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا جائزہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۹ء تک محیط ہے۔ اس میں اس دوران رونما ہونے والے سیاسی امور، ملکی مسائل اور ان کے تعلق سے

کانگریس اور اس کے قائدین خصوصاً گاندھی کی سرگرمیوں کا حال بیان کیا گیا تھا۔ اور سیاسی صورتِ حال میں کانگریس کے طریق کار، مقاصد اور اس کی زیادتیوں پر تجزیاتی اور تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل پر جو کتابیں مسلم قومیت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں، تقریباً ان تمام میں سیاسی اور قومی مسائل کا حل علاحدگی کی صورت میں تجویز کیا گیا تھا۔ ایسی تصانیف میں یہ رائے ہندوؤں اور کانگریس کی قوم پرستانہ تحریکوں، معاندانہ عزائم اور خلافِ اسلام مساعی کی بنیاد پر ہی قائم کی گئی تھی۔ چناں چہ اس موضوع پر مبنی ہر تصنیف موضوع زیرِ بحث سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس سلسلے میں ایک خصوصیت ان مذہبی تحریروں کو حاصل ہے جو مسلمانوں کے مذہبی، قومی، سیاسی مسائل اور ان کے اسلامی حل پر مشتمل تھیں۔ بعض فتوے بھی کانگریس سے بیزاری اور ہندوؤں سے علاحدگی کو راسخ قرار دیتے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ، مفتی محمد شفیع نے مرتب کیا تھا جو دہلی سے ۱۳۵۵ھ میں طبع ہوا۔ یہ فتووں میں اس اعتبار سے نمایندہ ہے کہ اس میں تفصیل سے کانگریس اور اس کے عزائم ہندوؤں سے مسلمانوں کا اشتراک جیسے موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ دیا گیا تھا۔

(ج) انگریزی عہد کے مضمرات پر منتخب کتابیں

۱۸۵۷ء کے واقعات سے حکومت اور عوام کے درمیان جو خلیج پیدا ہوگئی تھی اس کی وجہ سے حکومت کو ہندوستانیوں پر اعتماد نہ رہا تھا اور عملاً اُنھوں نے ایسی حکمت عملی وضع کی جس کا بنیادی مقصد محض حکومت کا استحکام اور مفاد تھا۔ ہندوستانیوں کی مادی فلاح و بہبود اور روحانی ارتقا کا خاص خیال نہ رکھا گیا۔ حکومت کا مقصد محض امن و امان کی بحالی رہا۔ رعایا کی خوش حالی اور سکھ چین اس سے پیشِ نظر نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانیوں میں حکومت کے خلاف بے چینی اور اضطراب کا برقرار رہنا فطری تھا۔ اس پہلو سے اس دور میں ایسی متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں انگریزوں کی زیادتیوں اور ان کی ناانصافیوں کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا گیا بعض مفصل کتابیں جو دیگر موضوعات پر تصنیف ہوئی تھیں ایسے امور سے متعلق جائزے کی حامل بھی ہیں۔ خصوصاً تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں میں حکومت برطانیہ پر مختلف پہلوؤں سے تنقید عام طور پر ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال طفیل احمد منگلوری کی مسلمانوں کا روشن مستقبل ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ ہے جس کے بعض مندرجات انگریزوں کے اقتصادی اور معاشی لوٹ کھسوٹ کے ایک تفصیلی جائزے

کو پیش کرتے ہیں۔ اس کی ابتدائی تین فصلیں اسی موضوع پر ہیں۔ فصل اوّل کا عنوان ''تجارت کے ڈیڑھ سو سال ۱۶۰۸ء تا ۱۷۵۷ء'' ہے۔ فصل دوم ''تجارت اور حکومت کے پچھتر سال ۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۲ء'' ہے۔ اور تیسری فصل کا عنوان ''خالص حکومت کے پچپن سال ۱۸۳۲ء تا ۱۸۵۷ء'' ہے۔

برطانوی حکومت کی معاشی لوٹ کھسوٹ کا ایک بہتر جائزہ، رجنی پام دت نے اپنی مفصل انگریزی تصنیف میں لیا تھا۔ اس کا اُردو ترجمہ جسے سردار جعفری اور محمد کلیم اللہ نے کیا تھا، دو جلدوں میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بڑی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ برطانوی حکومت پر اس کے استحصال بالجبر کی وجہ سے ہندوستان کی مفلسی اور زبوں حالی کا الزام لگایا گیا ہے۔ تفصیلی جائزے اور گوشواروں کے ساتھ مختلف حوالوں سے اس کی لوٹ کھسوٹ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ برطانوی حکومت کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ، اس کی زیادتیاں اور ناانصافیاں اقتصادی اور صنعتی مسائل پر تحریر ہونے والی متعدد کتابوں میں ظاہر کی گئی ہیں۔ سیّد احمد مینائی کی معاشی ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل مولوی ناصر علی کی ہندوستان کے معاشی مسائل، انور اقبال قریشی کی ہندوستان کا نظام زر سعید احمد مینائی کی ہندوستان کے صنعتی مسائل، اقتصادی استحصال کی حالت کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ دیگر کتابوں میں ہندوستان کے زرعی مسائل، ہندوستان کی تجارت، ہندوستان کا مالی نظام، زرعی اجناس، ہندوستان کی قومی آمدنی وغیرہ اسی موضوع اور مسئلے پر تحریر ہوئی تھیں۔

برطانوی حکومت کی لوٹ کھسوٹ پر اشتراکی ادیبوں کی تحریر کردہ کتابیں خاصا شدید تنقیدی انداز پیش کرتی ہیں۔ کارل مارکس اور اینگلز نے بھی اس موضوع پر اپنی کتابوں میں ہندوستان کے تعلق سے بحث کی تھی۔ لیورنارڈ ام شوف نے ہندوستان کی موجودہ حالت پر ایک کتاب تحریر کی تھی جو تفصیل سے انگریزوں کے اقتصادی استحصال کو پیش کرتی تھی۔ اس کے دو ابواب راجا اور کسان کے نام سے دو ابواب صاحب اور مذہب کے نام سے اور باقی دو ابواب بابو اور مزدور کے نام سے علاحدہ علاحدہ کتابی صورت میں لاہور سے شائع ہوئے تھے۔ ان کا اُردو ترجمہ عبداللہ بٹ نے کیا تھا۔ راجا اور کسان کا مقدمہ جواہر لال نہرو نے تحریر کیا تھا۔

پینڈرل مون ہندوستان میں ایک برطانوی افسر تھا۔ اس نے اس دور میں ہندوستان کے اقتصادی، معاشرتی اور بالخصوص سیاسی مسائل پر دو کتابیں تحریر کی تھیں، جن کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ ایک کتاب ہندوستان کا مستقبل مختصر ہے لیکن جامعیت سے مسائل کو پیش کرتی ہے۔

اس کا ترجمہ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ پہلا باب چالیس کروڑ عوام کے مسائل کے تحت معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا ذکر کرتا ہے دوسرا باب سیاسی مسائل سے متعلق ہے اور تیسرے اور چوتھے باب میں اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز ہیں۔ یہ انگریز کی لکھی ہوئی کتاب ہے لیکن اس میں اس نے غیر جانب دار رہ کر مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور برطانوی حکومت کی زیادتیوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اس کی دوسری کتاب ہندوستان میں اجنبی راج ہے۔ یہ بھی ترجمہ ہو کر لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ موضوعات کے اعتبار سے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں حالات و مسائل پر تنقید و تبصرہ کی حامل ہے۔ اس میں غیر جانب داری سے حقائق اجاگر کیے گئے ہیں اور برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہی رویہ بعض اور انگریز مصنفین نے بھی پیش کیا تھا۔ سڈنی اروِن کی ایک کتاب کا ترجمہ ہندوستان کی بابت کے نام سے سیّد ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا جو حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۰ میں طبع ہوا۔ اس میں بھی مصنف نے کہیں کہیں حکومت کی زیادتیوں کو پیش کیا تھا۔ یہی طرز جی ایڈرسن نے بھی اپنی کتاب میں ظاہر کیا تھا جس کا ترجمہ محمد عبدالستار نے ہند کے سیاسی مسلک کا نشوونما کے نام سے کیا تھا جو حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

مولانا امداد صابری نے تاریخ جرم و سزا تین جلدوں میں بالتفصیل تحریر کی تھی۔ پہلی جلد کے حصہ اوّل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد تک جرم و سزا کے تعلق سے ظلم و زیادتی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں حکومت کے سیاسی جبر و استبداد اور پھر اس کے نتیجے میں سیاسی قیدیوں سے حکومت کے سفاکانہ اور ظالمانہ سلوک کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

دراصل برطانوی حکومت کی زیادتیوں اور ظلم و ستم پر نکتہ چینی اور تنقید ان کتابوں میں بکثرت ہے، جو سیاسی مسائل اور سیاسی تاریخ پر تصنیف ہوئیں۔ دیگر موضوعات اور اصناف کی حامل تحریروں میں بھی یہ انداز خاصا نمایاں ہے۔

(د) سیاسی مسائل پر نمایندہ کتابیں

فی الحقیقت ہندوستان کے سیاسی حالات اور مسائل پر پنڈت رل موہن کی مذکورہ کتابیں ہندوستان کا مستقبل اور ہندوستان میں اجنبی راج ہمدردانہ مطالعہ اور جائزہ پر مبنی تھیں۔ ہندوستان کا مستقبل مصنف کی فکر انگیز کتاب ہے۔ اس کا دوسرا باب ہندوستان کے سیاسی مسئلے سے متعلق ہے۔

سیاسی صورتِ حال کا مطالعہ کر کے مسائل کو اخذ کیا گیا ہے، اور ان مسائل کے اسباب وعلل کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں ''ہندوستان کو کیا کرنا چاہیے'' کے عنوان کے تحت سیاسی مسئلے کا واحد حل اقتصادی ترقی کو قرار دیا ہے۔ دیگر مختلف تجاویز بھی دی ہیں جو معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کا سبب ہوسکتی تھیں۔ چوتھے باب میں ''برطانیہ کو کیا کرنا چاہیے'' عنوان کے تحت حکومت کو مشورہ دیا گیا ہے کہ ملک کے امن و امان کے ٹوٹنے اور بدنظمی کے پھیلنے کا کم سے کم امکان پیدا ہو، اور ایسے فیصلے کیے جائیں جو ہندوستان کی آزادی کے حصول کو پُرامن بناسکیں۔ یہی مصنف اپنی دوسری کتاب ہندوستان میں اجنبی راج میں کئی ابواب کے تحت ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل کو پیش کرتا ہے۔ ریاستیں، فرقہ وارانہ مسئلے کا سیاسی پس منظر، جنگ اور سیاست، کمیونسٹ اور کانگریس اس کے چند موضوعاتِ بحث ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ایسی تھیں کہ جنھیں ہندوستانی رائے عامہ کی عکاسی کہا جاسکے، یہی سبب تھا کہ انھیں اُردو ترجمے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہونے والے سیاسی مسائل کو آفتاب احمد خاں کی کتاب کلید سیاست ہند میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ علی گڑھ سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مسلم سیاست کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا تھا۔ سیاست ہند مابعد غدر ڈاکٹر چنتامنی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جسے سیّد افضل حسین نے کیا ہے اور یہ لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے بعد کی سیاسی تاریخ ہے جس کا حاوی پہلو ہندو سیاست ہے۔ ہندو قوم پرستوں کا تذکرہ، فرقہ وارانہ انجمنوں کی تاریخ، ہندوؤں کی سیاسی سرگرمیاں اس کے موضوعات ہیں۔ یہ مجموعی طور پر ہندو سیاست کی ۱۸۵۷ء کے بعد کی مفصل تاریخ ہے جس میں ضمنی طور پر مسلمانوں کے سیاسی نقطۂ نظر اور قائدین کا ذکر آیا ہے۔ حکومت برطانیہ کی سیاسی حکمت عملی اور پھر آیندہ کے حالات پر توقعات بھی بیان ہوئی ہیں۔

رشبروک ولیم نے ہندوستانی سیاسی مسائل پر ایک تفصیلی کتاب *What about India* تحریر کی تھی۔ اس کے اہم مباحث کا خلاصہ اور اس کا اُردو ترجمہ ہندوستان کے نام سے آکسفورڈ سے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ اس میں مصنف نے ہندوستانی قومیت کا ارتقا اور ہندوؤں، مسلمانوں اور دیسی ریاستوں کے تہذیبی اور سیاسی نقطہ ہائے نظر کو واضح کیا ہے۔ اس نے ہندوستان کے دفاعی مسائل کی اہمیت پر بھی بحث کی ہے۔ اور سیاسی تکمیل کی ان مشکلات کو بھی بیان کیا ہے جو نسل، مذہبی عقائد اور زبان کے بے شمار اختلافات کے باعث پیدا ہوئی تھیں۔ ایچ-ایل بریلسفورڈ نے *Rebel*

India تحریر کی تھی۔ اس کا اُردو ترجمہ لاہور سے آئینہ ہندوستان کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں مصنف اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کی ایک صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے پہلی گول میز کانفرنس تک کے حالات پیش کیے ہیں۔ مصنف ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پیش کر کے ان کا حل محض حصولِ آزادی کو قرار دیتا ہے۔ اس نے بعض مقامات پر حکام پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اس سے زیادہ بہتر مشاہدہ بیورلی نکلس کا تھا۔ یہ ایک انگریز صحافی تھا جو اپنے اخبار کے نامہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں رہ کر اس نے ذاتی مشاہدات اور شخصی نقطۂ نظر کو Verdict on India کی صورت دی۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے اس کا اُردو ترجمہ فیصلہ ہندوستان کے نام سے کیا جو حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال کے بارے میں جو کچھ دیکھا تھا، بلاکم و کاست بیان کر دیا ہے۔ ایک صحیح صحافی کی صداقت بیانی ساری کتاب میں پائی جاتی ہے۔ ہندو مسلم مسئلے کے حقائق، ہندوؤں کا فرقہ وارانہ طرزِ فکر، سیاسی مسائل کے حل میں ہندوؤں کی جانب سے رکاوٹیں اور ان کے معاشرتی نظام کی خامیاں اس کے خاص مباحث ہیں۔ انگریزوں نے جس قدر کتابیں ہندوستانی مسائل پر برطانوی عہد کے آخری دور میں تحریر کیں، ان تمام میں یہ زیادہ زیرِ بحث رہی۔ ہندوؤں کے لیے اس کی اکثر باتیں قابلِ اعتراض تھیں۔

سر جان کمنگ نے ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر سیاسیات ہند میں پیش کیا تھا۔ یہ ان کی کتاب کا اُردو ترجمہ تھا، جو دہلی سے شائع ہوا۔ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلق اور ان کے تعلقات کے مستقبل پر ایک ترجمہ برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان تھا، جسے عبدالحمید عتیقی نے کیا اور اس کی اشاعت لاہور سے ہوئی۔ ایل-ایس ایمرے نے جو وزیرِ ہند تھا، ہندوستان کے سیاسی مسائل پر ایک کتاب تحریر کی تھی، جس میں اس کی کچھ تقاریر بھی شامل تھیں۔ اپنی کتاب میں اس نے ہندوستان کے سیاسی مسائل کے حل کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کے نقطۂ نظر کو پیش کیا جو مختلف مصلحتوں کے ماتحت خاصا مبہم تھا اور وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتا رہا۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ ہندوستان اور آزادی کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔

شہری آزادی کے مسئلے پر ایک مختصر کتاب ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے تحریر کی تھی۔ اس کا مقدمہ جواہر لال نہرو نے لکھا تھا، اور یہ دہلی سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے شہری

آزادی کا مفہوم، مغربی ممالک میں اس کی مقبولیت اور ہندوستان میں اس کے نہ ہونے کے اسباب اور اس کے حصول کے لیے ہندوستانیوں کو ترغیب دی ہے۔ حکومت نے شہری حقوق کو جس طرح پامال کیا، قانون میں جو خامیاں تھیں اور تمام ناانصافیوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد مصنف کے پیش نظر یہ تھا کہ یہ شہری آزادی کے حصول میں مدد دے سکے گی۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں گول میز کانفرنس کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تفصیلی روئیداد اس کے پس منظر اور اس کے عواقب پر ایک کتاب مولوی فیروز الدین نے مختصر تاریخ گول میز کانفرنس تحریر کی تھی۔ یہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے لیے قانون ۱۹۳۵ء جاری کیا تو اس کے مضمرات، پس منظر اور اثرات پر کئی کتابیں تحریر ہوئیں جو زیادہ تر انگریزی میں تھیں۔ اُردو میں بھی کچھ کتابیں قابل ذکر ہیں۔ کشن پرشاد کول نے ہندوستان کا نیا دستور تحریر کی۔ یہ الہ آباد سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے نئے دستور کا تجزیہ کیا گیا تھا، اس کی خوبیوں پر بھی نظر ڈالی تھی اور اس کی خامیوں کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے تاریخ دستور ہند تحریر کی جو انجمن ترقی اُردو دہلی سے شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں برطانوی ہند کے دستور و آئین کی مفصل تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی سے دستور ہند مجریہ ۱۹۳۵ء تک بحث کی۔ اس کا آخری باب دستور ہند ۱۹۳۵ء کے لیے وقف ہے۔ اس میں اس کا تفصیلی اور تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ''ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت'' کے عنوان کے تحت اس وقت کے سیاسی حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی دستور کا ایک مختصر تجزیہ ڈاکٹر زین العابدین احمد نے کیا تھا۔ ان کی کتاب جدید دستور ہند مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس مختصر کتاب میں مصنف نے دستور ہند کا تعارف کرانے کے بعد اس پر مدلل اور بے باکانہ تنقید کی تھی۔ اختتامی کلمات میں اسے ''ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے ایک نئی تدبیر'' اور ''سامراجی جبر و تشدد کا ایک نیا حربہ'' قرار دیا تھا۔

مرزا ابوالحسن جرنلسٹ نے حکومت برطانیہ اور ہندوستان اور موجودہ بے چینی پر خیالات تحریر کی تھیں۔ دونوں کتابوں کی اشاعت دہلی سے ہوئی تھی۔ حکومت برطانیہ اور ہندوستان میں برطانیہ اور ہندوستانیوں کے تعلقات پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ہندوستانیوں کی محکومی اور غلامی اور اسے دور کرنے میں ان کی کوششیں، برطانیہ کی جانب سے آزادی دیے جانے والی کوششوں کی خامیاں اور پھر سیاسی ہل چل اور اضطراب کی حالتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے حقوق کو جس طرح

غصب کیا گیا اور اقتصادی طور پر جو لوٹ کھسوٹ ہوئی اسے پیش کیا گیا ہے۔ تقریباً یہی موضوعات مصنف کی دوسری کتاب موجودہ بے چینی پر خیالات میں شامل ہیں۔

چودھری احمد علی نے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر ایک جامع تبصرہ مرتب کیا تھا جس میں ہندوستان کی مختلف اقوام کا بہ لحاظ مذہب تذکرہ کیا گیا ہے اور مختلف گوشواروں کی مدد سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ یہ تبصرہ ہندوؤں کے بہت سے الزامات کی تردید میں بھی تھا۔ اس کی اشاعت علی گڑھ سے ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء کے اوائل میں برطانوی حکومت نے برطانوی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس کو نئی تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا تھا۔ ان تجاویز میں یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان میں ایک دستور ساز مجلس قائم کی جائے گی، جس کی سفارشات کو حکومت برطانیہ منظور کرے گی اور نافذ کردے گی۔ اور اس طرح اختیاراتِ حکومت لازماً ہندوستان کی طرف منتقل ہوجائیں گے۔ اس تجویز میں تقسیم ہند کے امکانات کو تسلیم کیا گیا تھا، اس لیے کانگریس نے اسے مسترد کردیا، اور مسلم لیگ نے اس بنا پر کہ اس میں پاکستان کے قیام کو یقینی نہیں بنایا گیا تھا، رد کردیا۔ بعد میں اور دیگر مختلف وجوہات سے بھی امن وامان کی صورتِ حال بہت خراب ہوگئی اور مستقبل کے واضح نقوش موجود نہیں رہے۔ اس مسئلے پر اور بعد کی توقعات پر سر سیّد سلطان احمد نے اپنی کتاب معاہدۂ ہند و برطانیہ میں مدلل اور مفصل بحث کی۔ اُنھوں نے سنجیدگی سے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور مستقبل کے لیے اپنی تجاویز پیش کیں۔ اس کتاب کا اصل موضوع ہی ''مستقبل کا ہندوستان'' ہے۔ یہ کتاب بحیثیت مجموعی بڑی فکر انگیز تھی اور عام ہندوستانیوں کو مستقبل کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتی تھی۔ اس کی اشاعت دہلی سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی، ''کرپس مشن'' اس کے پس منظر اور اس کی تجاویز پر عبادت یار خاں نے اپنی تصنیف پاکستان میں بھی جائزہ لیا تھا۔ اس جائزے کو کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ یہ کتاب کان پور سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

عرش تیموری نے ''ویول پلان'' کے مضمرات پر ایک مختصر کتاب ویول پلان کے بعد تحریر کی تھی جو بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں ویول پلان اور لارڈ ویول کی شملہ میں بلائی اُس کانفرنس کا ذکر ہے جو ناکام ثابت ہوئی، کیوں کہ مجلس عاملہ کانگریس نے ایک کانگریسی مسلمان کو نامزد کرنے کے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ مسلم لیگ نے اسے تسلیم نہیں کیا اور وائسرائے کی یہ خواہش تھی کہ وہ پنجاب کی غیر مقبول

''یونینسٹ پارٹی'' کو ایک نشست مسلمانوں کے حصے میں سے دے دیں۔ عرش تیموری نے اپنی کتاب میں ویول پلان سے قبل اور بعد میں پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اس کی ناکامی پر مختلف افراد اور جماعتوں کی آرا پیش کی ہیں اور مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کیا ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب وزارتی مشن انیس الرحمٰن نے تحریر کی تھی، جو الٰہ آباد سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینہ نے تین ارکان پر مشتمل ایک وفد بھیجا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دستور کی تشکیل کا کوئی طریقہ سوچ کر نکالے۔ مختلف رہنماؤں کے ساتھ اس وفد کی طویل گفت گوئیں کسی اتفاق رائے پر منتج نہیں ہوئیں۔ اس لیے اُنھوں نے ایک منصوبہ پیش کیا جو ''وزارتی مشن کا منصوبہ'' کہلاتا ہے۔ اس کی تفصیلات اور اس کے مضمرات نیشنلسٹ نقطۂ نظر سے انیس الرحمٰن نے اپنی کتاب میں پیش کیے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک کتاب وزارتی مشن کا فیصلہ، مسلم لیگ اور کانگریس تھی۔ اس میں مذکورہ موضوع کے تعلق سے دونوں سیاسی جماعتوں کے ردِ عمل اور نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔

ہندوستان کے مستقبل پر ایک اور قابلِ ذکر کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ہندوستان کا سیاسی مستقبل لکھی تھی جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ اس میں اُس دور کے سیاسی حالات و مسائل کا مختلف پہلوؤں سے تجزیہ کر کے مستقبل کے لیے توقعات وابستہ کی گئی تھیں۔

کرپس مشن نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ہر اُس صوبہ یا اُن صوبوں کو جو کرپس مشن کا بنایا ہوا مسودۂ دستور قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ ایک علاحدہ وفاق بنالیں اور یہ کہ دیسی ریاستیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ دراصل صوبوں اور وفاق کا مسئلہ دستور ہند مجریہ ۱۹۳۵ء سے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس مسئلے پر متعدد کتابیں تحریر ہوئیں جو بعد میں پیش ہونے والی تجاویز کی حمایت یا مخالفت میں تھیں۔ اکثر ریاستوں نے الحاق اور وفاق کی تجاویز کو رد کر دیا۔ یہ رویہ عوامی تحریک کے نتیجے میں زیادہ تھا۔ آزاد حیدرآباد وفاقِ ہند سے علاحدگی کے مقصد کے تحت لکھی گئی تھی۔ یہ مختلف آرا کا مجموعہ تھی، جسے مرزا مظفر بیگ نے مرتب کیا تھا، اور یہ یومِ خود مختاری دکن ۲۹ رجب ۱۳۵۹ھ کو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا مقدمہ بہادر یار جنگ نے تحریر کیا تھا۔ یہی موضوع میر حسن الدین کی کتاب وفاق اور ریاستیں کا بھی تھا۔ اس میں دیگر ریاستوں کے مسائل اور سیاسی صورتِ حال بیان کی گئی تھی یہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ خواجہ معین الدین کی

تصنیف ہندوستانی ریاستوں کا مستقبل بھی انھیں کتابوں کے موضوعات کے مطابق تھی۔ یہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ وفاق ہند سیّد نجم الدین نے تحریر کی، جس میں دستور ہند مجریہ ۱۹۳۵ء پر اس مسئلے کی روشنی میں بحث کی۔ یہ دہلی سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں رونما ہونے والے مسائل کو زیر بحث لا کر محمد عزیز احمد نے وفاق ہند لکھی جو علی گڑھ سے ۱۹۴۵ء میں طبع ہوئی۔

اسی طرح سے اقلیتوں کا مسئلہ بھی سیاسی صورتِ حال کے لیے خاصا اہم تھا۔ یہ مسئلہ تحریکِ آزادی کے آخری مرحلے پر زیادہ قابل توجہ اور حل طلب تھا۔ اس مسئلے پر مولانا عبدالباری نے ایک جامع کتاب ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ تصنیف کی۔ یہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ اس میں اقلیتوں کا تعین، اس کی شرائط اور پھر ان کے حقوق کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔

اُس دور میں جو مختلف النوع سیاسی مسائل درپیش تھے وہ مختلف پہلوؤں سے کتابوں میں زیر بحث آتے رہے۔ بعض کتابیں خاص طور پر سیاسی مسائل پر لکھی گئیں اور بعض کتابیں کسی دوسرے موضوع کے ساتھ ساتھ وقت کے سیاسی مسائل کو بھی پیش کرنے کا سبب ہوئیں۔

(ہ) حصولِ آزادی پر منتخب کتابیں

تحریکِ آزادی کے دوران برصغیر کی آزادی پر متعدد کتابیں تحریر ہوئیں جن میں بعض خاصی اہم کتابیں بھی تھیں اور کم اہم بھی۔ جو کتابیں اس وقت کے مختلف مسائل کی نشان دہی اور ان کے حل کے لیے لکھی گئی تھیں اور جن میں مصنفین نے اپنا نقطۂ نظر اور مسائل کے حل کے لیے اپنی تجاویز پیش کی تھیں اور دراصل تحریکِ آزادی کے سلسلے ہی کی کڑیاں تھیں۔ ایسی تمام کتابیں حصولِ آزادی اور جدوجہد آزادی میں اپنے مصنفین کے جذبات اور ان کے کردار کو پیش کرتی ہیں۔ مختلف مسائل اور غلامی اور محکومی کے احساس کے ماتحت مصنفین نے کتابیں لکھ کر، مسائل کا حل پیش کر کے تحریکِ آزادی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ایسی متعدد کتابوں میں، جن میں ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے، دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر چنتامنی کی سیاسیاتِ ہند مابعد غدر اور طفیل احمد منگلوری کی مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ یہ کتابیں برطانوی ہند میں علی الترتیب ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ چنتامنی کی مذکورہ کتاب میں ہندوؤں کی قوم پرست شخصیات اور اداروں کا تذکرہ ہے اور تفصیل سے سیاسی صورتِ حال میں ان کی کارکردگیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ سیّد طفیل احمد منگلوری نے مسلمانوں کا روشن مستقبل میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی

تاریخ، ان کی اصلاحی و تعلیمی اور سیاسی تحریکوں کا تذکرہ اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ بیان کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا خلاصہ نئے واقعات و مسائل کے اضافوں کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس میں تحریکِ آزادی کے آخری مرحلے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا، اور مسلمانوں کے لیے تجاویز مرتب کیں۔

مطالبۂ آزادی یا حصولِ آزادی پر تصنیف ہونے والی کتابوں میں یہی دو نقطہ نظر ہیں کہ یا تو ہندوستان کو کامل آزادی حاصل ہو جائے یا پھر کامل آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کے اعتبار سے انھیں اپنی خواہش کے مطابق سیاسی حقوق حاصل ہو جائیں۔ اس دوران جس قدر کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں طرزِ فکر اور نصب العین کا یہ فرق موجود ہے لیکن ان کا مطمحِ نظر بہرحال برطانوی حکومت سے آزادی کا حصول ہے۔

تحریکِ آزادی کے سیاسی رہنماؤں نے جو کتابیں اس دوران تحریر کیں، وہ خاصی اہم تھیں۔ ان میں مصنفین، جو رہنما بھی ہیں، اپنی جدوجہد کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دوسرے ان کے ذریعے کسی نصب العین کے تعین کو ترغیب ملتی ہے۔ راج گوپال اچاری کانگریس کے ایک حقیقت پسند رہنما تھے، اُنھوں نے نجات کا راستہ تحریر کی تھی، اس میں اُنھوں نے ہندوستانیوں کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنی اور کانگریس کی جدوجہد بیان کی اور ہندوستانیوں کی نجات کے لیے آزادی کا نصب العین تجویز کیا۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی کانگریس کے سنجیدہ رہنما تھے، اُنھوں نے تعمیری پروگرام تصنیف کی جو لاہور سے طبع ہوئی۔ اس میں مستقبل کے لیے جدوجہد آزادی کی راہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں اٹھارہ مہینے تصنیف کی۔ یہ ان کے ذاتی مشاہدات اور تاثرات پر مبنی تھی، جو اُنھوں نے سیاسی جدوجہد کے میدان میں اخذ کیے تھے۔ یہ کتاب اُردو میں ترجمہ ہو کر لاہور سے شائع ہوئی تھی، ان کی خاصی اہم انگریزی تصنیف DISCOVERY OF INDIA تھی جو ہندوستان کی ایک ضخیم تہذیبی، فکری، معاشرتی اور سیاسی تاریخ ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ دہلی سے ۱۹۴۶ء میں دو جلدوں میں طبع ہوا۔ دوسری جلد تحریکِ آزادی ہند کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ گاندھی کی متعدد کتابیں اُردو میں منتقل ہوئیں۔ آزادی ہند جو لاہور سے شائع ہوئی، آزادی کے بارے میں گاندھی کے خیالات اور اس کے پیغامات پر مشتمل ہے۔

آزادی کے جذبات اور حصولِ آزادی کو اپنا مقصد اور نصب العین قرار دینے والے مصنفین

میں چھبیل داس نے ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں؟ تحریر کی۔ یہ لاہور سے شائع ہوئی، اس میں آزادی کے حصول کے لیے دلائل اور اسباب بیان کیے ہیں۔ کرشن چندر رائے سکسینہ نے سیاسی نصب العین تصنیف کی جو حیدرآباد دکن سے ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے کامل آزادی کو ہندوستانیوں کا نصب العین قرار دیا۔ رام اچھپال سنگھ نے پیغام آزادی تحریر کی جو اپنے نام کے مطابق موضوع پر مبنی تھی، یہ لاہور سے شائع ہوئی۔ ٹیکا رام سخن نے تحریکِ آزادی کے نام سے تحریکِ آزادی کی تاریخ پر کتاب لکھی۔ اس میں انگریزوں کی آمد کے بعد برِّعظیم میں جو انقلابات رونما ہوئے، یہاں کے باشندوں کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کی بغاوتوں کی روداد بیان کی ہے۔ برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے اُٹھنے والی تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ، قومی تحریکات، مجاہدین، قائدین اور جماعتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آزادی کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور انھیں دور کرنے ا... حاصل کرنے کی مختلف تدابیر پیش کی ہیں۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج بنائی تھی، اس پر بھی کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ منشی عبدالقدیر نے تاریخ آزاد ہند فوج تحریر کی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سبھاش چندر بوس کے سیاسی اور انقلابی کارناموں کی تفصیل بھی ہے اور آزاد ہند فوج کی تاریخ بھی۔ جگدیش سنگھ نے بھی تاریخ آزاد ہند فوج مرتب کی جو لاہور سے طبع ہوئی۔ مولانا امداد صابری بھی بوس اور اس کی انقلابی جدوجہد سے بہت متاثر تھے۔ اُنھوں نے بھی تاریخ آزاد ہند فوج تصنیف کی تھی۔ اس میں اُنھوں نے آزاد ہند فوج کا مقصد، اس کے قیام کے لیے بوس کی جدوجہد، بوس کے ساتھیوں کے کارنامے، آزاد ہند فوج کی جدوجہد، اس کے نعرے اور گیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ کے علاوہ امداد صابری نے مقدمہ آزاد ہند فوج بھی مرتب کی۔ اس میں کپتان شاہ نواز، سہگل ڈھلوں کے مقدمے میں سرکاری گواہوں نے جو بیانات دیے، آزاد ہند فوج کی کارکردگی بیان کی اور ان کے بیانات پر بھولا بھائی ڈیسائی نے جو جرح کی، اس کی تفصیلات پیش کیں۔ یہ کتاب دہلی سے طبع ہوئی تھی۔ اسی طرح اس مقدمے کی اور روداد یں بھی شائع ہوئی تھیں۔ تحریکِ خلافت اور تحریک عدمِ تعاون فی الحقیقت تحریکِ آزادی کامل کی شروعات تھیں۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں ان کے رہنما مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر رہنما قید

کر لیے گئے تھے اور ان پر کراچی میں تاریخی مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس مقدمے کی مفصل روداد، عدالت میں مسلم زعما کے دیے گئے بیانات کی نقول کے ساتھ مرکزی خلافت کمیٹی کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ اسی مقدمے کی ایک اور روداد رہنمایان ہند کے نام سے مرتب ہوکر بٹ خیل، مالاکنڈ صوبہ سرحد سے شائع ہوئی تھی۔

غلام حیدر خاں نے آزادی کی جنگ میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال اور آیندہ کے مسائل پر اظہار خیال کیا تھا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۳۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ مظفر شاہ خان نے ہندوستان اور آزادی میں آزادی کے مختلف مسائل، ہندو مسلم مناقشات اور عدم اتحاد کی روشنی میں برطانوی حکومت سے آزادی کے حصول میں مختلف رکاوٹوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ سیّد عابد حسین نے مکمل تحریکِ آزادی کا پہلا قدم تصنیف کی جو حیدرآباد دکن سے ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی۔ کاش البرنی نے مسلم انڈیا تحریر کی تھی۔ یہ پہلے انگریزی زبان میں تصنیف ہوئی تھی، اس کا اُردو ترجمہ لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں مصنف نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا جائزہ لیا اور ان مسائل کا حل آزادی کے حصول میں تجویز کیا۔ خان فضل کریم خان درانی نے ہمارا قومی نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ تحریر کی اور مسلمانوں کے لیے حصولِ آزادی کامل اور علاحدہ اسلامی ریاست کا قیام ضروری خیال کیا۔ یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں ان کی دوسری کتاب قوم کا احیاء بھی ہے، جو بمبئی سے طبع ہوئی۔

مذکورہ کتابوں میں عرش تیموری کی ویول پلان کے بعد، سر سلطان احمد کی معاہدہ ہند و برطانیہ، انیس الرحمٰن کی وزارتی مشن، یوسف حسین خان کی ہندوستان کا سیاسی مستقبل وغیرہ حصولِ آزادی کے لیے مختلف راہیں متعین کرتی ہیں۔ اس ذیل میں بعض کتابیں ایسی بھی تحریر ہوئیں جو تحریکِ آزادی کے کسی ایک واقعہ پر مبنی تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عوامی جدوجہد شروع کی گئی تھی۔ اس نے بغاوت کا روپ اختیار کرلیا تھا، جو بعض مقامات پر اتنی شدت اختیار کرگئی تھی کہ اس کے استیصال کے لیے حکومت نے جہازوں کے ذریعے گولیاں برسائیں دیگر سزائیں اور گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اس بغاوت کے اسباب، حالات و واقعات پر دھرم پال نے تحریک ۴۲ء کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو ۱۹۴۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

مسئلہ آزادی پر جو کتابیں تحریر ہوئیں، ان میں بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جو ریاستوں کی کامل

آزادی کے جذبات کے ماتحت لکھی گئی تھیں۔ اکثر ریاستوں نے کامل آزادی کی صورت سے اپنی علاحدہ اور خودمختار حیثیت برقرار رکھنے کو ترجیح دی تھی۔ ریاست حیدرآباد نے بھی یہی نصب العین متعین کیا تھا۔ مرزا مظفر بیگ کی مذکورہ کتاب آزاد حیدر آباد اسی مقصد اور خواہش کے اظہار پر مبنی تحریروں پر مشتمل تھی۔ اس کا مقدمہ بہادر یار جنگ نے تحریر کیا تھا اور نظام حیدرآباد نے دبے لفظوں میں خودمختاری کی خواہش کو جس تقریر میں بیان کیا تھا، اسے ابتدائیہ کی صورت میں شامل کیا گیا تھا۔ اسی تعلق سے ایک کتاب محمد منیر الدین نے وطن کی پکار کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس کی اشاعت حیدرآباد دکن سے ہوئی تھی۔ اسی مسئلے پر سیّد نجم الدین احمد نے وفاق ہند ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اس وقت دو سیاسی جماعتیں نمایندہ حیثیت رکھتی تھیں۔ متحدہ قومیت کے نظریے کے تحت حصولِ آزادی کانگریس کا مطمحِ نظر تھا، جب کہ مسلمانوں کے علاحدہ سیاسی حقوق کے حصول کے ساتھ آزادی مسلم لیگ کا مقصد تھا۔ یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے نصب العین کے لیے مستعد اور فعال رہیں۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ تحریکِ آزادی کی تاریخ ان ہی دونوں جماعتوں کی جدوجہد سے متعلق ہے۔

انگریزی زبان میں ان دونوں جماعتوں کی کئی تاریخیں تحریر ہوئی ہیں۔ ذاکر حسین فاروقی نے مسلم لیگ کیوں؟ میں مسلم لیگ کی جدوجہد اور پاکستان کے حق میں دلائل دیے تھے اور اس وقت کی تحریکِ آزادی کا جائزہ لیا تھا۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ مسلم لیگ ہی کی تائید و حمایت میں ایک کتاب پیغام رسول المعروف بہ موازنۂ لیگ و کانگریس لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی، اس میں ان جماعتوں کے اغراض و مقاصد، تحریکات اور جدوجہد کا مقابلہ کیا گیا تھا، اور پھر مسلم لیگ کی تائید کی گئی تھی۔ رئیس احمد جعفری کی تصنیف حیات محمد علی جناح بھی دراصل مسلم لیگ کی تاریخ تھی۔ اس کی اشاعت بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں مزید کتابوں میں مرزا قطب الدین کی کانگریس اور مسلم لیگ، عبداللہ مصری کی مسلم لیگ کی سیاست پر ایک نظر، ریاض کی مسلمان، کانگریس اور مسلم لیگ وغیرہ تھیں۔ مسلمانوں اور کانگریس کے تعلق سے عبداللہ مصری کی مسلمان اور کانگریس، جے بی کرپلانی کی انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے بڑے سوالات وغیرہ تھیں۔ اُردو میں مسلم لیگ کی تاریخ مظہر انصاری

نے لکھی، جو دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ پورن چند جوشی نے اختلاف رائے کی بنیاد پر کانگریس اور کمیونسٹ تصنیف کی۔ اس میں کانگریس کی تحریک بھی پیش کی، اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کیں، اور کمیونسٹ تحریک سے اس کا تعلق اور عدم تعلق دونوں نمایاں کیے۔ اصولی طور پر مصنف کو اشتراکی ہونے کی وجہ سے کانگریس سے جو اختلاف تھا، اسے بھی تحریر کیا۔ یہ بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ پورن چند جوشی، ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم رکن تھا۔ اس نے جماعت کی طرف سے ایک کتاب مرتب کی تھی آزادی کی آخری لڑائی کے لیے کمیونسٹ پارٹی کا پروگرام۔ یہ بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے ضمن میں کمیونسٹ رویہ کو ظاہر کیا گیا تھا۔ کانگریس کی تاریخ پر سیتا رامیا پٹا بھائی کی انگریزی تصنیف مفصل، مستند اور مؤقر ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہ صرف کانگریس کی جدوجہد کی تاریخ ہے بلکہ ہندوستان کی مفصل سیاسی تاریخ بھی ہے۔ خاکسار تحریک کے مقاصد اور جدوجہد پر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تصنیف قول فیصل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ چودھری افضل حق، مجلس احرار اسلام کے اہم رہنما تھے۔ اُنھوں نے مجلس احرار کے قیام کے مقاصد، اس کا نصب العین اور ہندوستان کی آزادی کے لیے اس کی کوشش کی تاریخ تحریر کی تھی۔ یہ تاریخ احرار کے نام سے لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

(۴) مطالبۂ پاکستان پر نمایندہ کتابیں

۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں وہ مشہور قرارداد منظور ہوئی جس میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک علاحدہ ریاست کے قیام اور تقسیم ملک کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کو مسلمانوں نے پاکستان کا نام دیا۔ اس قرارداد نے برِعظیم کے مسلمانوں میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ مسلمانوں نے جب بحیثیت ایک متعین مقصد کے اس نظریے کو اختیار کرلیا تو ان کی جدوجہد آزادی ایک نہایت اہم مرحلے میں داخل ہوگئی۔ ہندوؤں نے جتنی قوت سے اس کی مذمت کی، مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا یقین ہوتا گیا۔ کانگریس کی مخالفانہ مہم کے باوجود حصول پاکستان کی تحریک مسلمانوں کی زندگی کا مقصد بنتی چلی گئی۔ ان کا یہ مطالبہ کسی مادی منفعت، حصول دولت، وزارت اور عہدے کے لالچ کے لیے نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو بحیثیت مجموعی اسلام کا احیاء، سربلندی اور شریعت کا نفاذ عزیز رہا۔ ان کے یہ عزائم اور جذبات مختلف کتابوں کے ذریعے عام ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں متعدد کتابیں تحریر ہوئیں جنھوں نے تحریک پاکستان کو زیادہ قبولیت بخشی اور غلط فہمیوں ا

الزامات کو دور کرنے کا سبب ہوئیں۔

تحریک پاکستان کے دوران اس کے مقصد کو عام کرنے اور اس کے نصب العین کو مقبولیت دینے میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی کا تصنیفی کام بڑا وقیع اور قابل قدر ہے۔ اُنھوں نے اس ضمن میں کئی کتابیں تحریر کیں۔ تشریحات پاکستان تحریک پاکستان سے متعلق گراں قدر اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس میں مسئلہ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر اس تحریک سے متعلقہ زعما کے خیالات پیش کیے گئے۔ "پاکستان سے پہلے اور پاکستان کے بعد" عنوانات کے تحت مصنف نے پاکستان کی تاریخ اور اس کے پس منظر کا جائزہ لیا تھا۔ علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کے اقتباسات درج کیے گئے اور مختلف پہلوؤں سے پاکستان کا امکانی جائزہ لیا گیا۔ اس کے لیے چند خاکے، تجاویز اور خیالات جمع کیے گئے تھے۔ مختلف شبہات اور الزامات کی تردید مدلل اور مفصل طریقے پر کی گئی تھی۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان بھی مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف کی تھی۔ مسلمانوں کی علاحدہ قومیت اور مسلم حقوق کا جائزہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہر اعتبار سے حتیٰ کہ سیاسی جدوجہد کے لحاظ سے علاحدہ قومیں قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی ابتدا کو تحریک پاکستان کی ابتدا ثابت کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی ایک اور کتاب معاشیات پاکستان برطانوی ہند میں مسلمانوں کا حال، مطالبۂ پاکستان کا پس منظر اور مستقبل کے پاکستان کی متوقع معاشی صورتِ حال پر بحث و تمحیص سے متعلق ہے۔ دراصل یہ ایک مضمون تھا جسے زیادہ بسیط اور مدلل بنا کر مکمل کتاب کی صورت میں بڑھا دیا گیا ہے۔ اس میں مطالبہ پاکستان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، قیامِ پاکستان کی ضرورت جتائی گئی اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ انگریزوں نے اپنے انتظامی مصالح کے لیے برِعظیم کو ایک وحدانی حکومت کے ماتحت رکھا، جو کبھی ایک ملک نہ تھا اور نہ کبھی ایک حکومت کے ماتحت رہا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی و مغربی حصے جو خالص زراعتی حصے ہیں مرکز کی غلامی میں رہ کر مفلس ہوتے گئے۔ ان علاقوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی آبادی ہے جن کا مذہب، تہذیب، روایات، نظریۂ حیات دوسرے حصے کی کثیر آبادی سے مختلف ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کے مشرقی اور شمالی مغربی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے الگ اور بااختیار حکومتیں ہوں

جنھیں کسی مرکز کی غلامی پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی تھی۔

جداگانہ انتخاب سے پاکستان تک مظہر علی اظہر نے تحریر کی تھی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ برِعظیم کے مسلمانوں کی اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کو بیان کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو علاحدہ قوم تصور کیا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد ایک مرحلے پر جداگانہ انتخاب کے لیے اور پھر پاکستان کے حصول کے لیے کی ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پاکستان کی اہمیت اور ضرورت پر پاکستان اور مسلمان تحریر و ترجمہ کی۔ اس میں مذہبی و تہذیبی پہلوؤں سے ایک آزاد اسلامی ریاست کے مطالبے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ عبدالحمید پاک نے پاکستان، قومی تحریک تصنیف کی تھی۔ اس میں تحریک پاکستان کو مسلمانوں کی ملی اور مذہبی تحریک اور اس بنا پر مسلمانوں کے لیے اس میں شرکت اور جدوجہد فرض قرار دیا۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ انیس الدین رضوی نے تحریک پاکستان تحریر کی تھی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنف نے برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی مختصر تاریخ پیش کی۔ سیاسی حقوق اور اسلامی قومیت کے شعور و ارتقا کو اُنھوں نے تحریک پاکستان قرار دیا۔ پاکستان کے مفہوم، نظریے اور اس کے مطالبے کی وضاحت عبدالعزیز نے اپنی کتاب پاکستان میں کی، جو بمبئی سے طبع ہوئی تھی۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے پاکستان مخالفین کی نظر میں تصنیف کی جو حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب پاکستان کے معترضین کے جواب میں تحریر ہوئی تھی۔ تمام معترضین کے اعتراضات اور الزامات کو بالترتیب بیان کر کے مدلل اور مسکت جوابات دیے گئے۔ یہ کتاب مختصر تھی لیکن اہمیت اور ضرورت کی حامل تھی۔ فطرت حیدری نے پاکستان کیوں؟ تحریر کی تھی جو بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے قیام پاکستان کے اسباب، ضرورت اور اہمیت بیان کی تھی۔ محمد عبدالرحمٰن ناطق نے منزل پاکستان تحریر کی۔ یہ قراردادِ پاکستان کے بعد پاکستان کے لیے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، کانگریس اور ہندوؤں کے مخالفانہ رویوں سے بحث کرتی ہے۔ یہ بمبئی سے جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اسلامی حکومت کی عملی تشکیل اسی موضوع پر سعید حلیم پاشا نے تحریر کی تھی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ نعرۂ حق بھی اسی موضوع پر ایک تصنیف تھی جو

لاہور سے ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی، اسے ابوسعید انور نے تحریر کیا تھا۔ پاکستان کے مختلف تصورات پر مبنی ایک کتاب شاہین فاروقی نے تصوراتِ پاکستان مرتب کی تھی جس میں مختلف تصورات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ حاجی لق لق نے جناح اور پاکستان میں قائداعظم کی جدوجہد اور تحریک پاکستان پر بھی اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت لاہور سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ حلیف پاکستان بھی اسی موضوع پر امین کاشمیری کی تصنیف تھی جو لاہور سے شائع ہوئی۔

پاکستان پر کتابوں کے سلسلے میں ایک اہم اور مفید کتاب صرف پاکستان کے نام سے کسی گم نام مصنف ''ایک طیلسان'' (جامعہ عثمانیہ) نے تحریر کی تھی۔ یہ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن سے طبع ہوئی۔ مصنف نے اس میں تحریک پاکستان کے متعلق، اس ابتدائی دور ہی میں، ضروری معلومات سلیقے کے ساتھ یک جا کر دی تھیں۔ یہ کتاب پاکستان کے مفہوم، مطلب اور تشریح کے جملہ مسائل اور تمام اُمور پر حاوی ہے۔ اس میں صرف خیالات ہی پیش نہیں کیے گئے بلکہ ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی پاکستان پر دیگر لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلے میں یہ زیادہ سلیقے سے مرتب کی گئی تھی۔ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ باب اوّل میں مسلمانوں کے قومی وطن کی تحریک کو پیش کیا گیا ہے۔ قومی وطن، مسلمانوں کے مسائل کے حل اور تقسیم ہند کے لیے پیش کردہ تجاویز کا تنقیدی جائزہ دوسرے باب کا موضوع ہے۔ تیسرے باب میں قراردادِ پاکستان اور اس کے مضمرات پر بحث کی گئی ہے، باب چہارم میں اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اور باب پنجم دستوری صورتِ حال کی وضاحت کرتا ہے۔ اس میں مشورہ دیا گیا ہے کہ آیندہ دستور کو پاکستان کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔

اسی طرح پاکستان پر ایک جامع کتاب پاکستان عبادت یار خاں نے تحریر کی تھی جو کان پور سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں انتہائی تفصیل کے ساتھ پاکستان کا پس منظر، اس کی تحریک اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ پاکستان کے مطالبے کا مقصد اور مدعا سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر اس سلسلے میں مختلف تجاویز اور تصورات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، جو پاکستان اور مطالبہ پاکستان کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ تحریک کے زمانے میں جو مختلف شکوک اور شبہات اور سوالات ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے اور جو اندیشے مخالفین کی جانب سے ظاہر کیے جا رہے تھے، ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔ پاکستان کیونکر حاصل ہو سکتا؟ عنوان کے تحت مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں میں عزم اور عمل کا جذبہ پیدا کرنے اور انھیں حصول پاکستان کی جدوجہد پر آمادہ کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ بعض نقشہ جات اور خاکوں نے کتاب کو مفید اور معلومات افزا بنادیا ہے۔

پاکستان پر ایک مفصل اور جامع کتاب آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان ڈاکٹر شجاع احمد ناموس نے تحریر کی تھی۔ لاہور سے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں بڑی تفصیل، وضاحت اور دلائل کے ساتھ مختلف قومی، سیاسی اور مذہبی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ اوّلاً قوم اور قومیت کا مفہوم اور اس کے عناصر بیان کیے گئے ہیں۔ ہندو تہذیب اور اسلامی تہذیب کے اختلافات بیان کیے گئے اور ایک ہندوستانی قومیت کی تردید کی گئی ہے۔ قومیت کے عناصر کی بنا پر ہندوستان کی تقسیم کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی قومی تحریک کانگریس کے تحت اور مسلمانوں کی ملی تحریک، علی گڑھ تحریک اور مسلم لیگ کے تحت بیان کی گئی ہے۔ ان دونوں تحریکوں کے اختلافات قراردادِ پاکستان کے وقت تک دکھائے گئے ہیں۔ پھر کانگریس راج کی تاریخ، ہندوؤں کے مقاصد، سیاسی فریب کاریاں، اکھنڈ بھارت کے عزائم پیش کیے ہیں۔ آخر میں ملت کی ترقی کے اسباب اور پاکستان کی تشکیل کا نظریہ اور پھر آزاد ملک اور آزاد ملت ہونے کی حیثیت میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ مختلف نقشہ جات، اشکال اور جدول نے اس کتاب کو خاصا اہم اور مفید بنادیا ہے۔

دستور پاکستان محمد اسمٰعیل مسلم نے مرتب کیا تھا۔ یہ رباط اسلامی کلکتہ کے زیراہتمام ۱۳۶۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ دستور دراصل مسلمانوں کے لیے وہ منشور تھا، جس پر حصول پاکستان کے بعد انھیں عمل پیرا ہونا تھا۔ پاکستان کے بارے میں مرتب کا یہ ایک تصوراتی خاکہ تھا۔ اس میں مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور روحانی ترقی پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔

اشرف عطا کی کتاب عرب اور خلافت پاکستان اپنی نوعیت کی مثالی اور منفرد کتاب تھی۔ اس کی تصنیف کا پس منظر دراصل مسلم جمہوریت کا وہ خواب تھا، جسے جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا جس میں مرکزی ایشیا کی جمہوریتیں، افغانستان اور برِّعظیم کے شمال مغرب کی مسلم اکثریت والے علاقے شامل تھے۔ اس زمانے کے حالات میں اس تصور سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ اس تصور سے لے کر علامہ اقبال کے پیش کردہ آزاد اسلامی ریاست کے تصور تک کئی ملکی اور غیر ملکی، مسلم اور غیر مسلم افراد نے ایسے تصورات پیش کیے تھے۔ تحریک پاکستان کا پس منظر چوں کہ ملّی اور مذہبی تقاضوں پر مبنی تھا اس لیے اس دور میں اس تصور کا اعادہ تحریک خلافت کے نتیجے میں کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ اشرف عطا نے اپنی کتاب میں جو لاہور سے مئی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی، یہی تصور پیش کیا تھا۔ اس

تصور میں قیام پاکستان فی الحقیقت اخوت اسلامی کے سفر کی ابتدائی منزل تھی۔ اس کتاب میں مسلمانانِ ہند کی منزل مقصود جمال الدین افغانیؒ کے خواب کو قرار دیا گیا تھا۔ اس کی تصنیف کا مقصد لاہور کا سیاسی رشتہ کابل کے دامن سے استوار کرنا اور کراچی کے مفاد کا تعلق مکہ مکرمہ سے طہران اور انقرہ کے مفاد تک وسیع کرنا تھا۔ مصنف کے خیال میں پاکستان سے مراد وہ جمہوری حکمرانی ہوگی جو مسلمانانِ ہند کو آزاد اسلامی دُنیا سے ہم کنار کرنے کا باعث ہوگی۔ اس لحاظ سے پاکستان کے قیام کے بعد ہمارے حقیقی سفر کا آغاز ہوگا۔ یہ کتاب تحریک پاکستان کے آخری مرحلے میں طبع ہوئی تھی۔ اس وقت تک اسلامی دنیا کے اکابرین بھی پاکستان کی اسلامی، سیاسی اور عالم گیر حیثیت سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے، چناں چہ اس کتاب میں بعض نام ور اور سربرآوردہ اکابرین کے خیالات پاکستان کے بارے میں مجتمع کیے گئے تھے۔ مجموعی طور پر اپنے موضوع کی خصوصیت اور نوعیت کے لحاظ سے یہ مثالی کتاب تھی۔

تحریک پاکستان کے تعلق سے اُردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی متعدد کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ بعض اہم اور وقیع کتابوں کے تراجم اُردو میں بھی ہوئے تھے۔ آر ٹی ایم کے مخفف نام سے ایک مصنف نے انگریزی میں کئی کتابیں تحریر کی تھیں۔ جن میں سے ایک کا اُردو ترجمہ پاکستان اور مسلمان کے نام سے ظفر احمد انصاری نے کیا جو دہلی سے ۱۹۴٦ء میں شائع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان کی اہمیت اور ضرورت بیان کی تھی، اور پس منظر تفصیل سے پیش کیا تھا۔ ان کی لکھی ہوئی دو اور انگریزی کتابوں کے اُردو ترجمے دہلی سے شائع ہوئے تھے۔ ایک کتاب ہندوستان میں قومیت کا تصادم مضامین کا مجموعہ تھی۔ اس میں بحیثیت مجموعی نظریہ قومیت سے بحث کی گئی تھی۔ اور متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید کر کے مسلمانوں کی علاحدہ قومیت پر دلائل دیے گئے تھے۔ دوسری کتاب موضوع کے اعتبار سے زیادہ اہم تھی۔ اس کا ترجمہ پاکستان اور اسلامی ہند کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کا مقدمہ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریر کیا تھا۔ مصنف نے اس میں نہایت غیر جانب دارانہ طور پر متعدد ایسے عوامل کی توضیح کی ہے جن سے برِّعظیم کے آئینی مسائل کا واحد حل ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں نکلتا ہے، اور اس کی بہترین شکل یہی ہے کہ قراردادِ پاکستان کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قراردادِ پاکستان کی تائید کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مجوزہ ''پاکستانی ریاستوں'' کے مسائل، اقلیت، ان کے حدودِ اربعہ کی جدید ترتیب اور اقتصادی حالات سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں ان اعتراضات کا جواب دیا

گیا ہے جو راجندر پرشاد، سرتیج بہادر سپرو، رادھا کرشن اور آر-این سرکار کی جانب سے کیے گئے تھے۔
ڈاکٹر جی-ایم-ڈی صوفی کی اس سلسلے میں ایک کتاب کا اُردو میں ترجمہ تسکین علیگ نے پاکستان پر ایلک نظر کے نام سے کیا[1] جو بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے اس میں حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے پاکستان کے امکانی وجود کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کبھی کسی دور میں بھی ایک وحدت نہیں رہا۔ ہندوستان میں دو بڑی قومیں آباد ہیں، اس لیے اس کی تقسیم غیر فطری نہیں۔ بیورلی نکلسن کی مذکورہ اہم کتاب کا اُردو ترجمہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے کیا تھا، جو فیصلۂ ہندوستان کے نام سے حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں ایک غیر جانب دار اور غیر ملکی ادیب اور صحافی نے پاکستان کی حمایت اور تائید کی تھی۔ اس نے پاکستان کا پس منظر، اس کے لازمی اسباب اور اس کے امکان پر بحث کر کے اس کو جائز قرار دیا تھا۔

دیگر کتابیں جو برصغیر کے مسلمانوں کے مختلف قومی اور سیاسی مسائل پر لکھی گئی تھیں، ان میں سے اکثر کتابوں میں مسلمانوں کے ملی اور قومی مسائل کے حل کے لیے تقسیم ملک اور حصول پاکستان کو ناگزیر قرار دیا گیا تھا۔ یہ کتابیں دیگر مسائل کے حل پر تجاویز کے لیے لکھی گئی تھیں لیکن ان میں پاکستان کے حصول کی ضرورت اور اہمیت کو کسی نہ کسی پہلو سے تسلیم کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں دوسرے زعما نے بھی تقسیم ملک اور قیام پاکستان کو مسلمانوں کا نصب العین تجویز کیا۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ ان میں تقسیم ہند کے نظریے کو زیادہ وضاحت، تفصیل، پس منظر اور دلائل کے علاوہ مختلف تجاویز کے ساتھ پیش کیا۔

یہاں ضمنی طور پر ان کتابوں کا تذکرہ بھی کیا جاسکتا ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تحریر ہوئیں یا جن میں پاکستان پر مختلف پہلوؤں سے اعتراضات کیے گئے تھے۔ کانگریس کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لیے ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں تذبذب، تشکیک، خطرات اور مطالبے کی ''نامعقولیت'' کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے پاکستان لکھی۔ اس کا اُردو ترجمہ لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ وشن داس نے اُردو میں اکھنڈ بھارت تحریر کی تھی۔ اس کا مقدمہ مشہور انتہا پرست رہنما ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے لکھا تھا۔ دونوں مذکورہ کتابیں ہندو ذہنیت اور ان کے عزائم کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔ بعض مسلمانوں نے بھی شبہات اور خدشات کا اظہار کیا

تھا۔ جیسے طفیل احمد منگلوری نے روحِ روشن مستقبل کے ایک تفصیلی باب میں پاکستان کی تحریک اور اس کے مطالبے کا جائزہ لیا تھا۔ اُنھوں نے قیام پاکستان کو ناممکن اور مسلمانوں کے لیے اس کے حصول کی تحریک میں شمولیت کو ضرررساں قرار دیا تھا۔ چودھری افضل حق نے اپنی ایک انگریزی تصنیف میں اس امر پر زور دیا تھا کہ حصول پاکستان کی جدوجہد سے قبل ملک کی دولت کی مساوی تقسیم ہونی چاہیے۔ چھوت چھات کا خاتمہ ہو، ہر مذہب کا احترام اور شریعت کے مطابق رہنے کی مکمل آزادی ہو، آزادی کے حصول کے بعد اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوسکیں تو اس صورت میں پاکستان کا نعرہ بلند کرنا چاہیے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ پاکستان اور چھوت کے نام سے اکرام قمر نے کیا جو لاہور سے شائع ہوا۔ پاکستان کی زیادہ شدید مخالفت جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے ہوئی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی جمعیۃ کے طرزِ فکر کی نمایندگی کررہے تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران جمعیۃ کی جدوجہد کا سارا رُخ پاکستان کی مخالفت کی جانب رہا۔ اس کے رہنماؤں اور ان سے متاثرین نے اس ضمن میں متعدد کتابیں اور رسالے تحریر کیے۔ زیادہ تسلسل سے مولانا حسین احمد مدنی نے تصنیفی اور علمی کام کیا۔ ان کی اس سلسلے میں ہمارا ہندوستان دہلی سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ پاکستان کی مخالفت میں پاکستان کیا ہے؟ دہلی سے شائع ہوئی۔ قائداعظم کی مخالفت مسٹر جناح کا پُراسرار معمہ اور اس کا حل میں کی گئی۔ مسلم لیگ کی مخالفت مسلم لیگ کیا ہے؟ مطبوعہ دہلی ۱۹۴۵ء۔ شریعت بل اور لیگ مطبوعہ دہلی سول میرج اور لیگ مطبوعہ دہلی میں کی گئی۔

(۵) خودنوشت سوانح عمریاں، روزنامچے، سوانحی کتابیں

اس دور کی اُردو خودنوشت سوانح عمریوں میں سیاسی ماحول کی اثرپذیری اور عکاسی قدرے واضح اور مقصدی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو میں سیاسی رجحانات کے تحت آپ بیتی کے موضوع پر پہلی اہم تصنیف ابقاء المنن بالقاء المحن ہے جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف نواب صدیق حسن خان، سیّد احمد شہید کی تحریک سے متاثر بلکہ وابستہ تھے۔ کثیرالتصانیف مصنف اور بے مثل عالمِ دین تھے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری کا تعلق بھی سیّد احمد شہید کی تحریک سے تھا۔ وہ اس جدوجہد آزادی کے اہم کردار ہیں جو برِّعظیم میں انگریزوں کے خلاف ایک طویل عرصے تک لڑی گئی۔ کافی عرصہ قید و بند کے سلسلے میں کالا پانی میں گزار رہا ہوئے تھے۔ اپنے ایام اسیری کے حالات دیگر تفصیلات کے ساتھ اُنھوں نے تواریخ عجیب المعروف بہ کالاپانی میں آپ بیتی کے انداز میں بیان کیے

ہیں۔اس کتاب میں انگریزوں کے جبر واستبداد کی ایک ناقابل فراموش داستان بیان کی گئی ہے اسے پڑھ کر انگریز حاکموں کے ظلم وستم کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور دوسری طرف مجاہدین آزادی کی مظلومیت، بے کسی، ایثار اور استقلال کے مناظر بھی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہونے والی آپ بیتیوں میں ایک سوانح افسری نواب افسر الملک سپہ سالار افواج آصفیہ مملکت حیدرآباد کی آپ بیتی تھی۔ یہیں دوسری آپ بیتی نواب آغا مرزا سرور جنگ نے کارنامہ سروری تحریر کی۔ان دونوں خودنوشت سوانح عمریوں میں حیدرآباد دکن کی اندرونی سیاست اور باہمی خلفشار کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سوانح افسری کے مصنف افسر الملک کی شخصیت حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔آپ بیتی میں ۱۸۵۷ء کے وقت سے تمام واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ذاتی اور خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ دکن کے بہت سے سیاسی اور تاریخی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوئی تھی۔ کارنامہ سروری ریاست کی پرآشوب زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

۱۹۱۱ء میں ظہیر دہلوی کی داستان غدر شائع ہوئی۔مصنف نے اپنی زندگی کی روداد کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔اس آپ بیتی میں دہلی کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی متعدد جھلکیاں نظر آتی ہیں۔مصنف نے ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ الور، جے پور، ٹونک اور حیدرآباد میں گزارا۔ان ریاستوں کے حالات بھی اس میں جھلکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعات وحالات آپ بیتی کے انداز میں منشی عنایت حسین نے بھی تحریر کیے تھے۔ یہ آپ بیتی رسالہ الناظر میں جولائی سے دسمبر ۱۹۳۶ء تک شائع ہوتی رہی۔اور بعد میں کتابی صورت میں سرگزشت ایام غدر کے نام سے شائع ہوئی۔

ابوالکلام آزاد کی آپ بیتی کو فضل الدین احمد مرزا نے مرتب کیا تھا، تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔اس کا تقریباً تمام تر حصہ خاندانی، معاشرتی، سیاسی حالات اور مذہبی معاملات پر مشتمل ہے۔ آخر میں کچھ صفحات ذاتی حالات پر مبنی ہیں۔

حسرت موہانی بیسویں صدی میں پہلے سیاسی رہنما تھے جنھیں قید کی سزا ملی۔ یہ سزا انھیں اُردوئے معلیٰ میں ایک مضمون کی اشاعت پر ہوئی تھی جو مصر میں برطانوی حکومت کی حکمت عملی پر نکتہ چینی پر ایک طالب علم کے فرضی نام سے چھپا تھا۔مولانا حسرت موہانی نے جیل میں جو کچھ وارداتیں ان پر

گزریں رہائی کے بعد انھیں ''مشاہدات زنداں'' کے نام سے اُردوئے معلّی میں قسط وار لکھا۔ اپنی زندگی کے ان دو سالوں میں حکومت کے ظلم وستم کو اُنھوں نے جس طرح برداشت کیا اور جو زیادتیاں اور ناانصافیاں دیکھیں، پُر درد انداز میں بیان کی ہیں۔ ''مشاہدات زنداں'' قید فرنگ کے نام سے بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اسی طرح کے ''مشاہدات زنداں'' چودھری افضل حق نے بھی تحریر کیے تھے۔ یہ مجلس احرار کے ممتاز رہنما تھے۔ اُنھوں نے اپنی آپ بیتی میرا افسانہ تحریر کی تھی، جو لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے جہاں اپنی زندگی کے بہت سے دل چسپ اور پُر لطف واقعات بیان کیے وہاں اپنے ایامِ اسیری کے عبرت ناک واقعات اور تاثرات بھی تحریر کیے۔ اس آپ بیتی میں افضل حق نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات پیش کیے ہیں۔ کچھ بچپن کے واقعات، ملازمت کے زمانے کے حالات، سیاست میں حصہ لینے کا ذکر اور پھر تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں جیل جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ افضل حق نے ایک اور مختصر سی تصنیف دنیا میں دوزخ تحریر کی تھی، جس میں جیل اور قید سے متعلق کچھ واقعات اور حالات تحریر کیے تھے، لاہور سے طبع ہوئی تھی۔ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہونے والی قید و بند کی ایک اور داستان کالا پانی کے نام سے ہندو مہاسبھائی رہنما پرمانند نے تحریر کی تھی۔ اس میں مصنف نے جزائر انڈمان میں اپنی جلاوطنی اور ایامِ اسیری کے حالات تحریر کیے تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند سے فارغ التحصیل ایک انقلابی عالم تھے۔ چوبیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب انھیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی تو اس موقع پر ملک کے بعض اخبارات نے ان کے حالات زندگی شائع کیے۔ ان میں تحسین و توصیف کے سلسلے میں بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ چناں چہ مولانا سندھی نے مکہ معظمہ میں مختصراً اپنی زندگی کے حالات تحریر کیے اور روزنامہ انقلاب لاہور کو اشاعت کے لیے ارسال کیے۔ اس ''خودنوشتہ حالات زندگی'' کو محمد سرور نے مولانا عبیداللہ سندھی کے مجموعۂ خطبات اور مقالات میں شامل کیا، جو دہلی سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس مختصر خودنوشتہ میں مولانا سندھی نے اپنی زندگی اور اپنی سیاسی جدوجہد کی داستان بیان کی ہے جو اُنھوں نے ملک میں اور ملک سے باہر انجام دی اور آخر میں مستقبل کے لائحہ عمل کا تذکرہ بھی کیا۔

ایک مختصر آپ بیتی زندگی کے چند واقعات پر مبنی حکیم احمد شجاع نے خون بہا کے نام سے تحریر کی تھی۔ اس کے نصف حصے میں مصنف نے اپنے افکار نظم و نثر اور تفصیلات درج کیے اور پھر پچھلے

پچاس برس کے عنوان سے اپنے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔ اس میں علی گڑھ کا تعلیمی ماحول، اپ
عہد کی معاشرتی، ادبی اور مجلسی رجحانات اور سیاسی حالات و واقعات کے اثرات کی عکاسی دل چسپ
اور ادبی پیرایے میں کی ہے۔ یہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ یہی طرز اور ماحول سیّد ہمایوں مرزا کی
خودنوشت آپ بیتی میری کہانی، میری زبانی میں موجود ہے۔ مصنف نے ماحول کے واقعات
اور مناظر کو زیادہ اہمیت سے بیان کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا محمد علی سے اپنے تعلقات، مولانا محمد علی کی زندگی کے
واقعات، حالات، کارنامے اپنے تاثرات اور محسوسات کے ساتھ ساتھ اپنی تصنیف محمد علی کی
ذاتی ڈائری کے چند اوراق میں بیان کیے تھے۔ یہ کتاب علی گڑھ سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔
مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس میں مولانا محمد علی کے تعلق سے خود اپنی زندگی، ان کے ساتھ اپنے
روابط اور ماحول کے سیاسی واقعات و حالات کو پیش کیا ہے۔

زیادہ اہم خودنوشت اعمال نامہ سیّد رضا علی نے تصنیف کی تھی اور اس میں مختلف مسائل و
حالات پر اظہار خیال کے لیے کتاب کا بڑا حصہ وقف کیا۔ اس میں ''شعروادب، مذہب، ڈراما،
ناٹک، مسئلہ زبان اور اپنی زندگی کے ساٹھ سالہ دور سیاست اور اس کے ارتقا پر اپنی زیادہ توجہ صرف
کی۔ علی گڑھ تحریک کا تفصیلی تذکرہ، انگریزوں کا طرز حکومت، ہندو مسلم اختلافات، کانگریس کی فرقہ
پرستی کی مثالیں وغیرہ تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ اس کی نمایاں اہمیت اس کے سیاسی مباحث میں
ہے۔ ہندوستانی سیاست کی کش مکش اور خاص طور پر علی گڑھ یونی ورسٹی کے پس منظر میں مسلم لیگ کے
قیام اور اس کی تاریخ کی بہت سی باتیں اس میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کی تعلیمی اور سیاسی جدوجہد میں اور
کانگریس اور لیگ کی کش مکش میں وہ قریبی شاہد رہے ہیں۔ خود سیاسی اعتبار سے مسلم لیگ کے مؤید اور
کارکن تھے۔ فی الحقیقت اعمال نامہ اُردو کی مثالی خودنوشت ہے جو ایک بڑے آدمی کی داستان حیات
کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ہندوستان کے سیاسی تغیرات، انقلابات خصوصاً مسلمانوں کی بحیثیت قوم
سیاسی جدوجہد کا تذکرہ ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی تاریخ ہے بلکہ اس میں اس دور کی معاشرتی
اور مجلسی زندگی کی عکاسی بھی ہے۔ خانگی زندگی، قدیم و جدید اقدار کی آویزش اور تصادم ادبی اور سیاسی
مسائل سب پر اعمال نامہ روشنی ڈالتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مسلمانانِ برِعظیم کی سیاسی جدوجہد کی
داستان اور ادبی اور تہذیبی دستاویز ہے۔ اس کی اشاعت دہلی سے ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی۔

سیاسی رہنماؤں کی خودنوشت سوانح عمریوں میں گاندھی اور نہرو کی تصانیف انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔ گاندھی کی خودنوشت کا ترجمہ تلاش حق کے نام سے ڈاکٹر عابد حسین نے دو جلدوں میں کیا۔ یہ دہلی سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ گاندھی نے اس میں اپنی زندگی کے واقعات تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ سماجی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے اُنھوں نے ہندوستان آنے سے قبل اور ہندوستان میں رہتے ہوئے جو کچھ جدوجہد کی، اپنی شخصیت کو نمایاں رکھتے ہوئے بیان کی۔ اپنی جدوجہد کے علاوہ اس میں مصنف کی فکر اور نظریہ حیات بھی کہیں کہیں ضبط تحریر میں آئے ہیں۔ زندگی اور جدوجہد کی یہ داستان تحریک عدمِ تعاون تک بیان ہوئی ہے۔ میری زندگی کے نام سے بھی گاندھی کی خودنوشت کا ایک خلاصہ اُردو میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور ترجمہ حامد قریشی نے کیا تھا، یہ لاہور سے شائع ہوا۔ جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ دو جلدوں میں اُردو میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا۔ یہ دہلی سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں ذاتی حالات اور واقعات سے زیادہ ماحول کے سماجی اور سیاسی رجحانات و ہیجانات کو اہمیت دی ہے۔ اس نے سیاسی حالات و واقعات کو اپنی ذات کے رشتے سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اکثر مقامات پر خود اس کی شخصیت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ماحول کے عوامل چھا جاتے ہیں۔

خودنوشت سوانح عمریوں میں وہ ترجمے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جو دیگر ممالک کے استعماریت کے مخالف سیاسی قائدین نے اپنی جدوجہد کے اظہار میں تحریر کی تھیں۔ خصوصاً ہٹلر کی میری جدوجہد کا ترجمہ شانتی نرائن نے کیا جو ہٹلر کی شخصیت، تحریک، جدوجہد اور خیالات کے بے باکانہ اظہار کی ایک مثال ہے۔ دوسری خودنوشت سرگزشت مسولینی ہے جس کے مترجم کا نام درج نہیں۔ یہ دونوں ترجمے دراصل برطانوی اور اتحادی استعمار کے خلاف جدوجہد کی علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

روزنامچہ کی صنف میں اُردو ادب میں کوئی مثالی اور اہم کام انجام نہیں دیا گیا۔ سیاسی مندرجات کے لحاظ سے کچھ روزنامچے بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک سید مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ ہے جو رسالہ اُردو میں بالاقساط ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔[۱۰] اپنے دور کے اعتبار سے یہ تقریباً پینتالیس سال پر محیط ہے۔ اور یہ ہر قسم کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے۔ خاص طور پر اس میں ہندوستان کے اس وقت کے حالات کے شامل ہونے کی وجہ سے یہ اپنے عہد کا ایک تاریخی آئینہ بن گیا ہے، جس میں اس عہد کے ملکی اور غیر ملکی واقعات روز بروز باناغہ بیان ہوئے ہیں۔

ایک اور قابل ذکر روزنامچہ لکشمی بائی کا ہے۔ لکشمی بائی مدراس کے ایک وکیل سوامی ناتھن کی بیٹی تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہوئی۔ نجن دیاراؤ ایک ہواباز سے شادی کی، سنگاپور گئی اور وہاں جب سبھاش چندر بوس نے ''آزاد ہند فوج'' میں عورتوں کا ایک رسالہ قائم کیا تو اس کی سالار مقرر ہوئی۔ اس رسالے کا نام رانی آف جھانسی رکھا گیا۔ چناں چہ بعد میں لکشمی بائی جھانسی کی رانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سنگاپور میں گرفتار ہوئی اور ۱۹۴۵ء میں رہا کی گئی۔ ۵/نومبر ۱۹۴۵ء کو جس روز قلعہ دہلی میں ''آزاد ہند فوج'' کا مقدمہ شروع ہوا، لکشمی بائی نے رنگون میں مظاہرہ کیا۔ بعد میں ہندوستان واپس آئی۔ اس نے اپنی زندگی اور جدوجہد کے حالات مفصل روزنامچہ کی صورت میں دن بہ دن تحریر کیے تھے۔ یہ روزنامچہ باغی لڑکی کے نام سے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اسے عبدالباری ساقی نے مرتب کیا تھا۔

جہاں تک اُردو میں سوانح نگاری کا تعلق ہے یہ سیّد احمد خان کے رفقا کی رہین منت ہے۔ رفقائے سیّد احمد خان میں شبلی اور حالی کے علاوہ جن لوگوں نے سوانح عمریاں لکھیں، ان میں ذکاءاللہ، نذیر احمد، چراغ علی، عبدالحلیم شرر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ذکاءاللہ کا سارا سوانحی کام ملکہ وکٹوریہ کی سوانح تک محدود ہے۔ نذیر احمد اور چراغ علی کی سوانح عمریاں محض مناظرانہ ہیں۔ البتہ شرر کی سوانح عمریاں اور خاکے اور مرقع ایک مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ان کی دوسری تحریروں کی طرح سوانح نگاری میں بھی اس مقصد کا بنیادی جذبہ اسلام کے شان دار ماضی کا احیا اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی برتری ہے۔ بحیثیت مجموعی اس دور کی سوانح نگاری کا مقصد احیائے قومی ہے۔ چناں چہ زیادہ تر سوانح عمریاں بزرگوں اور نام وروں کی یادگار کے بجائے قوم کی ترقی کے خیال سے لکھی گئی ہیں۔ حالی نے یادگار غالب، حیات سعدی، اور حیات جاوید اس خیال کے تحت لکھیں کہ قوم میں زندہ دلی، شگفتگی، مقصدیت اور لگن پیدا ہو۔ شبلی کی تمام تر توجہ اسلاف کے قابل فخر کارناموں کی تاریخ پر مرکوز رہی۔ حالی اور شبلی کے رفقا اور پیرو بھی اسی اصول پر کاربند ہیں۔ ان کے زیر اثر یا ان کے جواب میں جو سوانح عمریاں تصنیف ہوئیں ان میں دارالمصنّفین کا سوانحی سلسلہ بڑا اہم ہے جو مقدس نام وروں، سیر صحابہ وغیرہ سے متعلق ہے۔ اس گروہ میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور مصنفین میں مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کان پوری ذکر کے قابل ہیں۔ ان پر حالی، شبلی کے اثرات نمایاں ہیں۔

ان سوانح نگاروں کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ ان کے پیش نظر سوانح عمری محض مقصود بالذات نہیں، سوانح نگاروں کا مقصد کچھ اور ہے۔ سوانح عمری کو اس مقصد کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بنایا گیا ہے۔ ان سب کی نظریں اشخاص پر اشخاص کی حیثیت سے کم پڑتی ہیں۔ ان کے دماغی کارناموں کے اس حصے پر زیادہ پڑتی ہیں جس سے احیائے قومی کے لیے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔[۲] لیکن اپنے دورِ سیاست کے رہنماؤں اور معاصر قائدین کی سوانح نگاری کے خاص سیاسی مقاصد تھے۔ اس سلسلے کی اہم سوانحی کتابوں میں حالی کی حیات جاوید مثالی سوانح ہے۔ یہ صرف سیّد احمد خان کی حیات قومی، تعلیمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کی سرگزشت نہیں بلکہ ایک قوم کے سیاسی اور قومی شعور کے آغاز کی داستان بھی ہے۔ اس سے سیّد احمد خاں کے سیاسی مقاصد، مطمح نظر اور نصب العین کو بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان اس وقت اس سرگزشت سے اپنے حال سے واقف ہو کر مستقبل کی فکر کر سکتے تھے۔

تذکرۂ سرسیّد مطبوعہ ۱۹۲۵ء میں نورالرحمٰن نے کانگریسی نقطۂ نظر سے سیّد احمد خاں کے کارناموں پر نقد ونظر کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے کی دیگر کڑیاں محمد امین زبیری کی تصنیف کردہ ہیں۔ حالی کی تصانیف کا مذکورہ مقصد محمد امین کی سوانحی تصانیف کے سلسلے میں موجود ہے۔ تذکرۂ وقارالملک علی گڑھ سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال آگرہ سے تذکرۂ حالی طبع ہوئی۔ اور تذکرۂ محسن کی اشاعت دہلی سے ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ تذکرۂ سیّد محمود، تذکرۂ حالی اور پھر ان کے بھائی محمد مہدی کی تذکرۂ نذیر احمد، تذکرۂ وقارالملک اور تذکرۂ شبلی۔ عبدالکریم کی تذکرۂ مولوی سمیع اللہ خان وغیرہ سوانح عمریاں سیّد احمد خان کے رفقا کے قومی اور سیاسی کارناموں اور مجموعی طور پر علی گڑھ تحریک کی تعلیمی اور قومی تاریخ کو بیان کرتی ہیں۔

محمد اکرام اللہ خان ندوی نے وقارِ حیات تصنیف کی جو علی گڑھ سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی دوسری اشاعت میں محمد امین زبیری نے اسے اپنی تصنیف قرار دیا۔ اس میں وقارالملک کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس دور کی تاریخ، حالات و واقعات اور علی گڑھ تحریک اور مسلم لیگ کا حال بیان ہوا ہے۔ قیام مسلم لیگ کا پس منظر، اس کی تحریک، مقاصد اور اس کے ارتقا پر یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ اسی انداز کی ایک اہم سوانح عمری حیات شبلی ہے جسے سیّد سلیمان ندوی نے تحریر کیا تھا۔ یہ اعظم گڑھ سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں شبلی کی سوانح ضمنی حیثیت رکھتی ہے اور مسلمانانِ برِعظیم کی نصف صدی کی سیاسی اور علمی تاریخ نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ شبلی کے تعلق سے بیسویں صدی

کے ہندوستان کے تمام سیاسی، قومی، مذہبی اور ادبی رجحانات، تحریکات اور اداروں کا ایک مفصل جائزہ ہے۔

مولانا محمد علی کی سوانح سیرت محمد علی رئیس احمد جعفری نے تحریر کی تھی۔ یہ دہلی سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تفصیل سے مولانا محمد علی کی سوانح حیات، ان کے دور اور ان کے دور کی سیاست اور پھر مولانا محمد علی کے سیاسی اور قومی کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک خاص تاثراتی اور جذباتی انداز سے یہ مفصل سوانح عمری اس وقت کی سیاسی صورتِ حال میں مولانا محمد علی کے منفرد کارناموں کا تذکرہ ہے۔ ایک اور کتاب محمد الدین ادیب نے محمد علی جوہر تحریر کی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت لاہور سے ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔

قائداعظم محمد علی جناح پر اس دور میں بکثرت کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر سوانح عمریاں تاثراتی اور جذباتی ہیں۔ فنی عناصر ان میں زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ لیکن ایک عظیم اور ممتاز رہنما کو مختلف حیثیتوں سے قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے، جو مقصدی بھی ہے اور افادی بھی۔ حیات محمد علی جناح رئیس احمد جعفری نے تحریر کی اور یہ بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ قائداعظم کی سوانح سے زیادہ اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اور کش مکش کا تذکرہ اور مسلم لیگ کی تاریخ ہے۔ اسی طرح کی ایک اور مفصل سوانح خالد اختر افغانی نے حالات قائد اعظم کے نام سے لکھی اور یہ بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ بھی سوانح سے زیادہ سیاسی حالات حاضرہ اور اس میں مسلمانوں بالخصوص مسلم لیگ اور قائداعظم کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ قائداعظم کی سوانح اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اس کے پس منظر میں بیسویں صدی کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ سمٹ آئی ہے۔ امیر پاکستان کے نام سے عارف بٹالوی نے بھی ایک سوانح تحریر کی ہے۔ یہ ایک مختصر سوانح ہے لیکن قائداعظم کے نظریات، تصورات اور اس زمانے کی سیاست کے بارے میں ان کے خیالات اور تحریکِ آزادی کی روداد بھی تحریر ہے۔ یہ بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت، محمد علی جناح کے نام سے محمد عبداللہ منہاس نے ایک مختصر سوانح تصنیف کی جو امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس مختصر کتاب میں قائداعظم کی ایک سیاسی اور قومی رہنما کی حیثیت سے انفرادیت اور عظمت بیان کی گئی ہے۔ جدوجہد آزادی کے لیے مسلمانوں کی کوششیں، ہندو جماعتوں اور تحریکوں کی جارحانہ عداوتیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس طرح کی اور سوانح عمریوں میں عبدالعزیز کی محمد علی جناح اور عبدالرحمٰن سعید کی قائداعظم ہیں، جو علی الترتیب بمبئی

اور حیدرآباد دکن سے شائع ہوئیں۔ قائداعظم کی حیات کے ایک ضمنی پہلو پر ایک کتاب اکبر پیر بھائی نے مرتب کی تھی۔ یہ قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کی روداد ہے۔ قائداعظم کے حملہ آور رفیق صابر مزنگوی کا مقدمہ برِعظیم کے تاریخی مقدمات میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں واقعہ کے تعارف کے بعد عدالت کی کارروائی پیش کی گئی ہے۔ مقدمے کی روداد اور گواہوں کے بیانات پوری تفصیل سے شامل کیے گئے ہیں۔ مختصر سوانح حیات بھی درج کی گئی ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا اُردو ترجمہ شریف الدین پیرزادہ نے قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کے نام سے کیا جو بمبئی سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔

مولانا نواب بہادر یار جنگ کی حیات اور ان کے کارناموں پر کئی کتابیں تحریر ہوئیں۔ غلام محمد نے قائدملت تصنیف کی۔ یہ تاثراتی سوانح تفصیلات کو پیش کرتی ہے۔ سوانح کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی حالات بھی اس میں موجود ہیں۔ بہادر یار جنگ کے قومی، مذہبی اور سیاسی شعور کا نشوونما دکھایا گیا ہے۔ مذہبی مشاغل، خاکسار تحریک میں شمولیت، مجلس اتحاد المسلمین کا قیام اور اس کی کارکردگی، حیدرآباد مسلم لیگ میں شرکت، قائداعظم سے خصوصی تعلقات اور مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے بہادر یار جنگ کی مساعی اور خطابت، ان کی انفرادیت، اس کے مخصوص موضوعات ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے تحریر کیا تھا۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایک مختصر سوانحی تاثر قائدملت شاہد حسین رزاقی نے تحریر کیا تھا۔ اس میں نواب بہادر یار جنگ کے کارناموں اور مشاغل کے بارے میں مصنف کے ذاتی تاثرات جذباتیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب گلبرگہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں کسی حد تک تفصیلی کتاب لسان الامت کے نام سے عبدالرحمٰن سعید صدیقی نے تصنیف کی۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں حالات زندگی مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے کام اور کارنامے وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ ہمارا قائد ملت کے نام سے محمد احمد خاں نے ایک مفصل کتاب نواب بہادر یار جنگ پر تحریر کی۔ اس میں ان کی سوانح، سیرت و خدمات پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔ ساتھ میں ریاست حیدرآباد دکن کے سیاسی حالات، مسلم لیگ اور مجلس اتحاد المسلمین کی جدوجہد کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔

متعدد کتابیں مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات اور ان کے افکار و سیاسی رجحانات پر بھی تصنیف

ہوئیں۔ پہلے پہل مولانا شائق احمد عثمانی نے امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد تصنیف کی، جو کلکتہ سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ابتدائی صفحات ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے خلاصے پر مشتمل ہیں۔ ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں اس کے بعد ۱۹۲۳ء تک کے حالات ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور صحافتی زندگی، علم وفضل اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی مسائل کی نسبت مولانا آزاد کی وہ مکمل تحریر بھی ہے جو اُنھوں نے ۱۹۲۲ء میں مرتب کو علی پور جیل میں سوالات کے جواب میں لکھ کر دی تھی۔ عبداللہ بٹ نے مولانا ابوالکلام آزاد پر انگریزی اور اُردو میں تین کتابیں مرتب کیں۔ ابوالکلام آزاد کے نام سے اُردو میں دو کتابیں ترتیب دیں۔ ایک کتاب لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی حیات، تصنیفات اور ان کے قومی، سیاسی کارناموں پر مصنف نے اپنے خیالات بیان کیے ہیں۔ دوسری کتاب جو مولانا آزاد پر مختلف افراد کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ لاہور سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ ابوالکلام آزاد کے نام سے روشن نے مولانا آزاد کے خاندانی حالات، سوانح حیات، علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے تعارف پر مبنی کتاب تحریر کی، یہ لاہور سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ عظمت اللہ ملیح آبادی نے حالات ابوالکلام آزاد تحریر کی جو دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے مفصل حالات، الہلال کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی اور خطبۂ صدارت شامل ہیں۔ منشی عبدالرحمٰن شیدا نے سوانح ابوالکلام آزاد تصنیف کی، یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کے ابتدائی حالات سے ۱۹۴۰ء تک کے حالات، علمی، مذہبی وسیاسی خدمات کا تذکرہ وتعارف کرایا گیا ہے۔ آصف علی نے سوانح ابوالکلام آزاد تحریر کی، یہ بھی مولانا آزاد کے علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آخر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس منعقدہ رام گڑھ کا خطبۂ صدارت بھی شامل ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ابوسعید بزمی نے مولانا ابوالکلام آزاد تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی علمی، مذہبی اور سیاسی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا۔

علامہ اقبال پر بھی کئی کتابیں تحریر ہوئی تھیں۔ ان میں سے احمد دین کی اقبال پر ایک نظر ان کے مقصد شاعری اور خیالات وافکار کے نشوونما سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ سیرت اقبال محمد طاہر فاروقی نے تحریر کی تھی۔ یہ ۱۹۳۹ء میں طبع ہوئی۔ اس میں سوانح کے

ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کے اسلامی پیغام کی تشریح اور تفصیلات زیادہ ہیں۔ عنایت اللہ نے حیات اقبال تحریر کی جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اقبال کی سوانح کے علاوہ ان کے تخیل و افکار کا ارتقا اور تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اقبال کے محض فلسفہ اور پیغام کی تشریح و توضیح میں مختلف کتابیں اور مضامین کے مجموعے شائع ہوئے۔

متعدد چھوٹے بڑے سیاسی رہنماؤں پر کئی سوانحی کتب تحریر ہوتی رہیں۔ ان میں سوانح کے علاوہ حالات حاضرہ کا جائزہ بھی عام بات تھی۔ محمد سرور نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر کی تھی جو دہلی سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے مولانا سندھی کے حالات زندگی، قومی اور سیاسی کارنامے، تصنیفات اور افکار پیش کیے۔ حیات سکندر سر سکندر حیات کی سوانح تھی۔ اسے مرزا محمد سعید بیگ نے تحریر کیا تھا اور یہ لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں موصوف کی سوانح حیات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کے تعلق سے اس دور کے سیاسی حالات اور مصالحانہ کوششوں کا ذکر ہے۔ اس ذیل میں حالات نظر بندان اسلام بھی اچھی کوششیں تھیں۔ اس سلسلے میں حسرت موہانی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن وغیرہ پر مختصر اور سرسری جائزے پر مبنی رسالے شائع ہوئے۔ اسی طرح کا ایک اور سلسلہ سیاسی قائدین کے حالات کا شروع ہوا تھا۔ اس میں بدرالدین طیب جی، مولانا محمد علی جوہر اور جمال الدین افغانی پر کئی کتابچے شائع ہوئے۔ مہادیو ڈیسائی نے خدائی خدمت گار تحریر کی تھی، جس کا اُردو ترجمہ محمود علی خان نے کیا تھا اور یہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں صوبہ سرحد کے خان برادران کی زندگی کے اہم واقعات، سیاسی اور مذہبی خیالات کو مکالموں کی شکل میں تحریر کیا گیا تھا۔

ایسی کتابوں کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جو علما اور قائدین کے تذکروں پر مبنی تھیں۔ ان میں علما و قائدین کی سوانح اور ان کے تصنیفی و علمی کارنامے مختصر تحریر کیے گئے تھے۔ یہ تصانیف مجموعی سوانح کے ذیل میں بیان ہوتی ہیں۔ ان میں سے اہم کتابوں میں محمد میاں کی علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ہے، جس کے دونوں حصے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک علما و قائدین سیاست و مذہب کے تذکروں، حالات اور کارناموں پر مشتمل ہیں۔ اس میں خاص طور پر رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کی سیاسی زندگی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور سیاسی حالات، آزادی کی جدوجہد اور قائدین کے سیاسی رجحانات و نظریات

بیان کیے گئے ہیں۔ محمد عنایت اللہ کی تذکرۂ علمائے فرنگی محل لکھنؤ سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں قدیم اور دور حاضر کے علما کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے وہ علما بھی موجود تھے جو اس وقت کی سیاسی جدوجہد اور تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے خاص طور پر مولانا عبدالباری فرنگی محلی اہمیت رکھتے ہیں تذکرۂ احرار اسلام اظہر دہلوی نے تحریر کی تھی۔ اس میں ان علما اور مجاہدین کا مختصر تذکرہ کیا گیا تھا جو برِ عظیم اور دیگر اسلامی ملکوں میں آزادی کی جدوجہد کرتے رہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

شخصی مرقعوں اور خاکوں کے مجموعوں میں مولوی عبدالحق کا چند ہم عصر نمایاں اہمیت رکھتا ہے اس میں مولوی عبدالحق نے ایک خاص عہد کو زندہ کرنے کے لیے اس زمانے کے بعض اکابرین کے وہ اہم کارنامے ہمارے سامنے رکھے ہیں جن کی حیثیت قومی اور اجتماعی تھی اور جن سے روشناس کرا کے ملت کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہی کچھ مولوی عبدالرزاق کان پوری کی یاد ایام کا مقصد ہے۔ جو حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سیّد احمد خان، شبلی، امیر علی، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی وغیرہ کا تذکرہ شامل تھا۔ رشید احمد صدیقی کی گنج ہائے گراں مایہ جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دور حاضر کے اکابرین کے خاکے تحریر تھے۔ اس میں جن شخصیتوں کو پیش کیا گیا تھا، وہ تمام کی تمام ایک خاص عہد اور ایک خاص معاشرت کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ایسی عکاسی مردم دیدہ میں بھی کی گئی تھی۔ اسے چراغ حسن حسرت نے تحریر کیا تھا اور لاہور سے ۱۹۳۹ء مین طبع ہوئی تھی۔

رہنماؤں اور قائدین پر بعض مجموعی سوانحی کتب ایسی بھی شائع ہوئیں، جن میں مختلف الخیال علما اور قائدین کا تذکرہ شامل تھا۔ یوسف مہر علی نے ہندوستان کے لیڈر تحریر کی جس میں کانگریس اور لیگ سے متعلق رہنماؤں کا مختصر تذکرہ تھا۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ عنایت اللہ خان نے محبان قوم و وطن میں قومی اور سیاسی رہنماؤں کا تذکرہ کیا جو مذہب اور نظریہ کے اعتبار سے اختلافات کے حامل تھے۔ یہ تذکرہ لاہور سے ۱۹۳۹ء میں طبع ہوا تھا۔ جگدیش سنگھ نے محبان وطن تحریر کی تھی اور اس میں ہندو رہنماؤں کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ بادشاہ حسین نے دو جلدوں میں مشاہیر ہند تحریر کی تھی۔ یہ حصے حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں مختلف نظریات و مذاہب کے حامل قومی اور سیاسی اکابرین کا ذکر کیا گیا تھا۔ باغی لیڈر

کے نام سے سولہ قوم پرست قائدین کے حالات زندگی مختلف اکابرین نے تحریر کیے تھے۔ لکھنے والوں میں اچاریہ کرپلانی، کے ایم منشی اور یوسف مہر علی شامل تھے۔ اس میں اس دور کے اہم اور نام ور قوم پرستوں کے مختصر حالات تحریر کیے گئے تھے۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

ہندو رہنماؤں پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خاص طور پر گاندھی، نہرو اور سبھاش چندر بوس پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ گاندھی نامہ خواجہ حسن نظامی کے اخبارات و رسائل میں گاندھی کی ذات وصفات کے متعلق مصنف کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ دہلی سے ۱۹۲۳ء میں طبع ہوا تھا۔ گاندھی جیون ظفر نیازی نے تحریر کیا تھا۔ اس میں تحریک عدمِ تعاون کے دور تک گاندھی کی زندگی کے حالات قلم بند کیے گئے تھے، یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ایک مختصر کتاب گاندھی گوپال متل نے تصنیف کی تھی، اس کی اشاعت لاہور سے ہوئی تھی۔ اس میں مصنف نے دوسری جنگ عظیم تک کے حالات وواقعات مختصر طور پر بیان کیے۔

نہرو پر تفصیلی کتاب جواہر لال کی کہانی کے نام سے محمد رحیم دہلوی نے تصنیف کی۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں بالتفصیل نہرو کی زندگی کے حالات، ہندوستان کے سیاسی واقعات اور ان میں نہرو کی شمولیت اور اس کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ کتاب کا تاثر کانگریسی نقطہ نظر کا حامل ہے۔ گوپال متل اور جگدیش سنگھ نے نہرو کی حیات اور سیاسی زندگی پر مختصر کتابیں تصنیف کیں، جو لاہور سے شائع ہوئیں۔ رگھوبنس سنگھ چوپڑہ نے حالات زندگی پنڈت جواہر لال نہرو تحریر کی تھی، جو امرتسر سے شائع ہوئی۔

سبھاش چندر بوس پر چمن لال آزاد نے نیتاجی کے نام سے ایک مفصل اور ضخیم کتاب تحریر کی۔ یہ پہلی مرتبہ مختصر کتاب کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن دوسری اشاعت میں جو لاہور سے ۱۹۴۶ء میں ہوئی، اس میں کافی ترمیم واضافہ کیا گیا تھا۔ کتاب میں بوس کی مفصل سوانح ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال، بوس کی انقلابی زندگی کے رجحانات ونظریات اور جدوجہد آزادی میں بوس کا مخصوص حصہ دکھایا گیا ہے۔ سبھاش بوس کے نام سے ایک سوانحی خاکہ گوپال متل نے تحریر کیا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مختصر سوانح اور کارنامے تحریر کیے گئے ہیں۔ ایک اور مختصر کتاب دھرم پال نے باغی سبھاش کے نام سے تحریر کی تھی جو لاہور سے طبع ہوئی تھی۔ اسی طرح مختصر کتاب اُتم چند نے تحریر کی جو بیرون ہند سبھاش بوس کی مصروفیات اور جاپان روانگی کی تفصیلات پیش

کرتی ہے۔ یہ سبھاش بابو جاپان کس طرح گئے؟ کے نام سے دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا امداد صابری نے آزاد ہند فوج کا البم مرتب کیا تھا۔ اس میں سبھاش بوس کی تیار کردہ "آزاد ہند فوج"، "آزاد ہند حکومت" اور "آزاد ہند لیگ" کے عہدے داران کی تصویریں اور مختصر تذکرہ شامل تھا۔ یہ البم دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اور کتاب مولانا امداد صابری نے سبھاش بابو کے ساتھی تحریر کی تھی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں سبھاش بوس کی جاپان میں مصروفیت، سردار سردول سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا تذکرہ، آزاد ہند فوج کے عہدے داران کے کارنامے اور دیگر ساتھیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ آزاد ہند فوج کے ایک اور بانی موہن سنگھ پر جرنیل موہن سنگھ دھرم پال نے تحریر کی تھی جو لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں موہن سنگھ کے حالات زندگی اور آزاد ہند فوج کے ذریعے آزادی کی جدوجہد میں موہن سنگھ کے کارنامے تحریر کیے گئے تھے۔

ہندو رہنماؤں پر مختصر کتابیں اور اس دور کے سیاسی قائدین کے حالات کا سلسلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں عام طور پر گاندھی، تلک، مالویہ، سروجنی نائیڈو، ٹیگور، سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، لاجپت رائے وغیرہ پر کتابیں لکھی گئیں یا ترجمہ کی گئیں۔
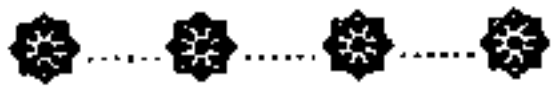
(۶) متفرقات

ادارے

تمام قومی، مذہبی، تعلیمی اداروں اور مکاتیب نے مسلم قومیت کے ارتقا اور تحریکات آزادی کے جذبات و رجحانات کو اپنے اپنے طور پر تقویت پہنچائی تھی۔ ایسے تمام ادارے ماحول میں موجزن شکست، نارسائی اور غلامی اور محکومی کے محسوسات اور حالات کو اپنی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے عمل میں آئے تھے۔ ہندوؤں نے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ایسے کئی سماجی ادارے تشکیل دیے تھے جن کے قیام میں انگریزوں کا تعاون شامل رہا تھا۔ انگریزوں کو آگے چل کر "انڈین نیشنل کانگریس" کے قیام سے ہندوستان کی سیاست میں قومی سیاست کے جذبات کو پیدا کرنا تھا۔ اب تک ہندوؤں میں قومی شعور کافی نشوونما پاچکا تھا اور وہ آئے دن اس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ کانگریس کی تشکیل سے قبل ہندوؤں نے انگریزوں ہی کے تعاون سے کئی اداروں کو قائم کیا تھا۔[۱] ہندوؤں کی ان کوششوں کے نتیجے میں ان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو بہت جلد تحریر و تقریر سے کام لینے لگا۔ اس عمل سے ہندو عوام نے قوت کا ایک نیا احساس حاصل کیا۔ اب یہ قدرتی امر تھا کہ اس نئی حاصل شدہ قوت کو بعض اوقات مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال کیا جائے۔ اس وقت انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی میں مسلمان اپنے لیے تحفظ نہیں دیکھتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال نازک اور خطرناک تھی۔ وہ دشمنوں کی معاندانہ سرگرمیوں اور اپنے سیاسی زوال اور معاشی ابتری کی وجہ سے ہر طرف سے خطرات اور مشکلات میں گھرے ہوئے تھے لیکن ان میں ان نامساعد حالات کے باوجود اپنی قومیت کا احساس اور آزادی کا جذبہ موجزن تھا۔ اسلام کی تعلیمات مسلمانوں کو محکومی پر آمادہ نہیں رکھتیں۔ چناں چہ وہ انگریزی عہد میں کبھی مطمئن نہ بیٹھ سکے۔ وہ مستقلاً اس فکر میں رہے کہ کسی طرح اپنے تاریک مستقبل کو روشن کریں لیکن ان کے پاس وسائل معدوم تھے۔ اس درماندگی کی حالت میں، ابتداءً بنگال میں ان کی رہنمائی نواب عبداللطیف نے کی۔ اُنھوں نے کلکتے میں ۱۸۶۳ء

میں ایک ''محمڈن لٹریری سوسائٹی'' قائم کی۔[۲] اس کا مقصد یہ تھا کہ اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مطالعے پر آمادہ کیا جائے تاکہ ان میں روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا ہو۔[۳] نواب عبداللطیف کی یہ تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے بھی محدود تھی اور اپنے دائرہ عمل کے لحاظ سے بھی۔ اسی قسم کی ایک اور کوشش سیّد امیر علی کی ''سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ'' تھی۔ یہ انجمن مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے علاوہ اس خیال سے تشکیل دی گئی تھی کہ مسلمان اپنے ماضی کی شان دار روایات سے اکتساب کرتے ہوئے زمانے کے ترقی پذیر رجحانات اور مغربی ثقافت کے پسندیدہ عناصر سے ہم آہنگی پیدا کریں۔[۴] لیکن یہ تحریکیں زیادہ مقبول نہ ہوسکیں۔ ایک تو ان کا رُخ محض اونچے طبقے کی جانب رہا اور دوسرے ان کا ذریعہ اظہار زیادہ تر انگریزی زبان تھا۔ جس سے اس وقت کے عام مسلمان گریز پائی کا جذبہ رکھتے تھے۔ مذہبی، تہذیبی، سیاسی اصلاح و ترقی کی ایک ہمہ گیر تحریک جس نے برِعظیم کے مسلمانوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنے حلقہ اثر میں لے کر ان میں ایک نیا ذہنی انقلاب پیدا کردیا، سیّد احمد خان کی تحریک تھی۔ اس کے مخاطب مسلمانوں کے تمام طبقات تھے اور اس نے سب کو متاثر کرنے کے لیے اُردو زبان کا سہارا لیا۔

سیّد احمد خان اپنی تحریک کے ابتدائی مراحل میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کو سنبھلنے اور ترقی کے لیے پہلے مغرب کے علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس لیے اُنھوں نے ''باشندگان ہند'' کی تعلیمی ترقی کے متعلق باشندگان ہند کے نام ایک پیغام جاری کیا، جس میں اس امر پر زور دیا کہ اُردو تراجم کے ذریعے مغربی علوم کو برِعظیم کے باشندوں میں مقبول عام بنایا جائے۔ ان کی قائم کردہ سائنٹی فک سوسائٹی کا بھی یہی مقصد تھا لیکن وہ تعلیمی میدان میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے، یہ سوسائٹی اس کا محض ایک جزو تھا۔ اُنھوں نے غازی پور میں ایک سکول قائم کیا جو علی گڑھ منتقل ہوکر کالج کے معیار تک پہنچا دیا گیا۔ ان کا خواب دراصل یہ تھا کہ ایک ایسی جامعہ قائم کی جائے جو برِعظیم کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو، جو مغربی علوم اور اسلامی اقدار کا گراں بہا امتزاج پیدا کرے۔ پھر اُنھوں نے ''مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک مجلس'' اور ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' قائم کیا۔ یہ ان کے خواب کی جزوی تعبیریں تھیں۔ اس کالج نے مسلم قومیت کی تعمیر میں ایسے وقت پر ایک اہم کردار ادا کیا جب وہ روبہ زوال تھی۔ اس نے ایسے مسلمانوں کی ایک نسل تیار کی جو اسلام کے ساتھ اپنی بنیادی وفاداری ختم کیے بغیر دنیا کے جدید حالات اور نظریات سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے برِعظیم

میں ایک سالم و متحد مسلم ملت کے نظریے کو زندہ رکھا۔ سیّد احمد خان نے اس سلسلے کی ایک اور کوشش ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کی تنظیم سے کی جو بعد میں نام بدل کر ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' ہوگئی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کو مقبولیت دی جائے اور قدیم تعلیم میں ملی ضروریات کے ساتھ زیادہ مطابقت پیدا کی جائے۔ چناں چہ جدید تعلیم کے طفیل مسلمانوں نے جدید مغربی نظریات سے واقفیت حاصل کی۔ سیاست میں بھی اُنھوں نے جدید رجحانات کو قبول کیا جن کے زیرِاثر برِعظیم کی سیاسی زندگی میں حیثیت و اہمیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر سرگرمیوں کا انتظام کیا۔ بعد میں شروع ہونے والی تحریکِ آزادی میں ایک نمایاں حصہ لیا۔ سیّد احمد خان کی حکمت عملی، اپنے نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں کے اور ہندوؤں کے خلاف مغربی تعلیم کے لیے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی تحریک تھی۔

سیّد احمد خان نے ملک بھر میں دورے کر کے مسلمانوں کو ایک منظم جدوجہد کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ان کی تحریک کے زیرِاثر ملک کے مختلف مقامات پر تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے ایسے اداروں میں ایک ''انجمن حمایت اسلام'' ہے۔ یہ لاہور میں ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ مولانا قاضی حمیدالدین اور مولوی غلام اللہ قصوری اس کے بانیوں میں تھے۔ ایک مدرسے کے قیام سے اس انجمن کا افتتاح ہوا۔ اس انجمن کے مقاصد میں مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو مذہبی اور عام تعلیم دینا، اسلام کی اشاعت اور مدافعت اور مناظروں اور مطبوعات کے ذریعے اسلام کے خلاف کوششوں کا رد کرنا تھا۔ اپنے مقصد کی اشاعت اور تکمیل کے لیے انجمن نے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کے لیے مدرسے اور تربیت گاہیں قائم کیں۔ اسلام پر کتابیں شائع کیں۔ اور ابتدائے قیام ہی سے ایک رسالہ انجمن حمایت اسلام جاری کیا۔ نصاب کی متعدد کتابیں مرتب کیں۔ ہر سال انجمن کے زیرِاہتمام مذاکرے اور اجلاس منعقد ہوتے جن میں اکابرین مدعو ہوتے اور وہ مختلف علمی، مذہبی، موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے اور شعرا اپنا قومی اور مذہبی کلام پیش کرتے۔ بہت جلد ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، جہاں اس کے زیرِاہتمام سکول اور کالج قائم ہوئے۔

سیّد احمد خان کے دوروں اور ان کی تحریک کی بازگشت سے ملک میں ہر طرف بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گجرات، جالندھر، امرتسر، بمبئی وغیرہ میں اسلامی انجمنیں قائم ہوئیں اور بلشتر شہروں میں اسلامیہ سکول اور کالج قائم ہوئے۔ اسلامیہ کالج پشاور، سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی، محمڈن عربک

سکول پٹنہ اور بدایوں، بریلی اور میرٹھ وغیرہ میں علی گڑھ تحریک کے حامی و مؤید مدارس تشکیل پائے۔

انجمن اسلام بمبئی، بدرالدین طیب جی نے قائم کی تھی جس نے بیش قیمت علمی، تعلیمی و تحقیقی خدمات انجام دیں۔ بدرالدین طیب جی سیّد احمد خان سے مختلف نظریات رکھتے تھے۔ اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے اُنھوں نے مسلمانوں کے تعلیمی فروغ کے لیے اس انجمن کے ذریعے بڑی جدوجہد کی تھی۔ ان کوششوں سے اپریل ۱۸۷۶ء میں انجمن اسلام سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی ترقی شامل تھی۔ لیکن بعد میں اسے صرف تعلیمی امور تک محدود کر دیا گیا[۱] اس نے سکول قائم کیے اور بعد میں ایک تحقیقی ادارہ اسلامی قائم کیا۔

اسلامیہ کالج اٹاوہ مولوی بشیرالدین نے قائم کیا تھا۔ یہ علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل اور سیّد احمد خان سے مستفیض تھے۔ اُنھوں نے علی گڑھ کالج سے قدرے اختلاف کی بنیاد پر سکول کے قیام سے اپنی کوششوں کی ابتدا کی اور اس کے معیار میں کردار و سیرت کی تعمیر کو خاصی اہمیت دی۔ اپنے اس مقصد اور تعلیمی فروغ کے میدان میں جدوجہد سے سکول نے اپنا ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا اور علی گڑھ کالج کے متوازی اس نے حبّ الوطنی اور اپنی قدیم اسلامی روایات پر فخر کرنا سکھایا۔ مولوی بشیرالدین ایک رسالہ البشیر بھی نکالتے تھے جو مذہبی، تعلیمی اور قومی مسائل پر مضامین کا حامل ہوتا تھا۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کا قیام بھی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر تھا۔ اس کے بانی حسن علی آفندی تھے جنھوں نے ۱۸۸۵ء میں یہ مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ نے سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مثالی خدمت انجام دی۔

برِعظیم کے دیگر مختلف حصوں میں سیّد احمد خاں کی تحریک کے زیر اثر تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔[۵]

ان اداروں کے ذریعے اس زمانے کی سب سے اہم خصوصیت قومی تعلیم اور تحریکات کا وجود ہے۔ سودیشی تحریک کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کا مقاطعہ اور آزاد قومی اداروں کے قیام کا رجحان رونما ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بیک وقت نئے قومی اداروں کو قائم کیا۔ بنگال ان سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سودیشی تحریک اور عدم تعاون کی تحریک نے اور زیادہ شدت اختیار کی تو یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ کانگریس نے ''نیشنل ایجوکیشن کونسلز'' کی پوری تائید کی اور مسلمانوں کی طرف سے قومی تعلیم کے لیے مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے لیے مصمم کوشش ہوئی۔ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے وقت طلبہ کی فکری رہنمائی علی گڑھ کالج کے علاوہ جن نمائندہ اداروں نے کی وہ دیوبند اور ندوہ تھے۔

دیوبند کا اصل مقصد دینی تعلیم کے ایک مرکز کا قیام تھا۔ اس وقت جب کہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت زوال پذیر تھی، قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کرنے میں دارالعلوم دیوبند کی حیثیت ایک مدرسہ کی نہیں ایک تحریک کی تھی۔ فی الحقیقت یہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی ایک کوشش تھی۔ اس کا یہ مقصد بعد کی تاریخ میں مولانا محمودالحسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کی سرگرمیوں کے ذریعے بہت نمایاں ہو کر اُبھرا۔ دیوبند کا دارالعلوم انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز رہا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اور اساتذہ نے ثمرۃ التربیۃ اور جمعیۃ الانصار کے نام سے انقلابی تحریکات شروع کیں، جن کا مقصد انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور دوسری مسلمان حکومتوں سے آزادی ہند کے لیے مدد حاصل کرنا تھا۔ ریشمی رومال کی تحریک، پھر ترکی کی مدد، تحریکِ خلافت، کانگریس کی جدوجہد آزادی اور پھر تحریک پاکستان میں دیوبند کے انقلابیوں نے سرفروشانہ حصہ لیا۔

علی گڑھ اور دیوبند کے جدید و قدیم کی کش مکش نے بہت سے ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ نئے دور میں ان دونوں میں سے ہر ایک حالات کا مقابلہ کرنے کے لے ناکامی ہے۔ اور قوت کی بہت بڑی ضرورت جدید و قدیم کا امتزاج ہے۔ ندوہ نے قدیم نظام تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے قیام کے بعد جلد ہی یہ ایک علمی مرکز بن گیا تھا۔ اس کے مقاصد کی اشاعت کے لیے ایک ماہ نامہ الندوہ بھی جاری ہوا۔ ندوہ نے اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان نہ کیا۔ اور انگریزوں کے معاملے میں اس کا رویہ بڑی حد تک آزادانہ رہا۔ بلکہ ایک دور تو ایسا بھی گزرا کہ جب وہ حکومت برطانیہ کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ عدم تعاون کی تحریک کے دوران ندوہ نے حکومت کی مالی امداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ندوہ کا سیاسی کردار بڑی حد تک آزادانہ اور ملی عزائم و توقعات سے ہم آہنگ تھا۔

سودیشی تحریک اور تحریک عدم تعاون نے ہندوستان میں قومی تعلیم کی تحریک کو فروغ دیا تھا۔ ابتداءً قومی تعلیم کی کوشش بڑی حد تک ہندوؤں کی زیر قیادت ہوئیں اور جن مسلمان طلبہ نے انگریزی تعلیمی اداروں کا مقاطعہ کیا وہ بھی ان ہی نئے قومی تعلیمی اداروں میں داخل ہوئے۔ لیکن چوں کہ مسلمان ذہن ایک غیر اسلامی نظام تعلیم سے کبھی بھی اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے اس لیے شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ قومی تعلیم کے مقابلے میں مسلمانوں کی ملی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ پُرجوش طلبہ نے جن کی

قیادت مولانا محمد علی کر رہے تھے اوّلاً علی گڑھ کالج سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری امداد کو واپس کر دے لیکن علی گڑھ کالج کے لیے ناممکن تھا، چناں چہ ان طلبہ نے علی گڑھ کالج چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں ایک تعلیمی ادارہ جامعہ ملیّہ اسلامیہ قائم کیا۔ اس کا سنگِ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھا اور یہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ جامعہ ملیّہ نے علوم اسلامی میں اختصاصی تعلیم کی گنجائش پیدا کی۔ اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ مسلمانوں کے پُرانے اور وسیع و ہمہ گیر تصورِ تعلیم کو از سرِ نو زندہ کیا جس کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ اس کے تعلیم یافتہ افراد برطانوی حکومت کے دست نگر نہ رہے اور ان میں آزادی پسندی کا جذبہ پروان چڑھا۔

اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں اوّلیت کا شرف جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کو حاصل ہے، جس نے ۱۹۱۸ء میں اُردو کو یہ حیثیت دے دی تھی۔ جامعہ عثمانیہ دراصل حیدرآباد دکن میں اس روایت کا عروجی نقطہ تھا جس نے جامعہ عثمانیہ کے قیام تک ہر اس تعلیمی، ثقافتی اور مذہبی تحریک کی اعانت کی، جس کا تعلق برِّعظیم کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی سے تھا۔ خصوصاً اُردو زبان کی توسیع و اشاعت میں حیدرآباد دکن ہمیشہ پیش پیش رہا۔ ۱۸۵۶ء میں یہاں مشہور درس گاہ دارالعلوم قائم ہوئی تھی، جس کے فارغ التحصیل ریاست کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں چھائے ہوئے تھے۔ ان میں علم کی لگن اور ملک کی خدمت کا جذبہ تھا۔ اس درس گاہ کے انداز پر حیدرآباد میں اور بہت سے ادارے اور مراکز قائم ہوئے۔ گو جامعہ عثمانیہ کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا تھا لیکن اسے یونی ورسٹی کا درجہ ۱۹۱۷ء میں حاصل ہوا۔ اس نے ایک طرف اُردو کو اعلیٰ ترین مدارج تک ذریعہ تعلیم بنایا اور دوسری طرف دینی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے تالیف و ترجمہ کے کام کو بڑے اہتمام کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے اساتذہ میں اس وقت کے نام ور اکابر اور علما و فضلا شامل تھے۔ بعض بین الاقوامی شہرت کے افراد یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے اس سے مستفیض طلبہ نے ہندوستان کی قومی اور سیاسی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا اور وقیع ادب تخلیق کیا۔

اورینٹل کالج لاہور، انجمن پنجاب اور اس کے علمی و تعلیمی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آیا تھا۔ اس کے مقاصد میں بعض قدیم مشرقی علوم کا احیاء، باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علومِ مفیدہ کی اشاعت علمی، ادبی، معاشرتی سیاسی مسائل پر بحث و نظر وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر، جو اس انجمن کے روحِ رواں تھے، ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے جس میں جدید اور قدیم علوم کا

امتزاج ہو اور جو یہاں کے باشندوں کی ذہنی و اخلاقی سطح کو بلند کر کے انھیں باشعور بنائے۔ یونی ورسٹی کے قیام کے اقدامات میں ایک اہم قدم مدرسہ علوم شرقیہ کے قیام کا تھا جو انجمن نے اپنی زندگی کے پہلے سال ۱۸۶۵ء میں ہی اُٹھایا۔ مختلف ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے اورینٹل کالج ۱۸۷۲ء میں قائم ہوا۔ اس نے بعض مفید اضافوں کے ساتھ انجمن پنجاب کے مقاصد کو بہر طور انجام دیا۔

ان تمام نمایندہ اداروں نے مسلم قومیت کے تصور کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان سے مستفید افراد نے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو تمام قومی تحریکات میں رُو بہ عمل اور مستعمل رکھا۔ ان اداروں کا قیام فی الحقیقت قومی سیاسی تحریکات کے لیے تقویت کا باعث ہوا تھا۔ ان میں اس وقت کی ضرورتوں کے مطابق مسلمانوں کو پسندیدہ ذہنی غذائیں کھلائی جاتی تھیں، جہاں سے قوت اور توانائی حاصل کر کے ماحول کی انقلابی قوتوں میں اضافہ کیا جاتا۔ ایسا ہر ادارہ اپنی جگہ ایک ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔

دیگر اداروں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق زیادہ ہمہ گیر اور وسیع مقاصد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام میں تھے۔ مسلمانوں کے لیے ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ'' کے قیام سے سیّد احمد خاں کے تعلیمی لائحہ عمل کا ایک اہم جزو پورا ہوتا تھا۔ مگر وہی سارا مطمحِ نظر نہیں تھا۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو مقبولِ عام بنانے اور قدیم تعلیم میں ملّی ضروریات کے ساتھ زیادہ مطابقت پیدا کرنے کے لیے ''محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس'' جو بعد میں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے معروف ہوئی، ۱۸۸۶ء میں قائم کی۔ مسلم لیگ کے قیام سے قبل مسلمانوں کی کوئی مستقل اور مضبوط سیاسی جماعت نہیں تھی۔ یہ کانفرنس مسلمانوں کی ایک مستقل جماعت بن گئی اور اس نے تعلیم کے متعلق مسلمانوں میں ایک نیا شعور پیدا کرنے کے علاوہ مسلم تعلیم کے بڑھتے ہوئے اور ہمیشہ بدلتے ہوئے مسائل پر تبادلۂ خیالات کا ایک ادارہ مہیا کرنے کا مفید مقصد بھی پورا کیا۔ کچھ عرصہ تک اس نے مسلمانوں کی قیادت کا فرض انجام دیا۔ اس کے سالانہ اجلاس میں اکابر قوم و ملت حالاتِ حاضرہ کے پیدا کیے ہوئے مختلف قومی، تعلیمی اور سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے۔ پورے ملک میں اس کے منعقدہ اجلاس اجتماعی شعور اور قومی احساس پیدا کرنے کا سبب ہوتے۔ ملک کے ہر علاقے اور ہر طبقے کے مشاہیر اہل الرائے، قائدین اور اربابِ علم و فضل نے اس کے جلسوں کی صدارت کی اور خطاب کیا۔ ان تمام کے پیشِ نظر مسلمانوں کے جملہ مسائل ہوتے۔ اس کے جلسوں میں تعلیمی، قومی، سیاسی مسائل پر نہ صرف مفید تجاویز منظور ہوئیں بلکہ ان مختلف گوشوں میں دیگر تعلیمی کانفرنسیں قائم ہوئیں۔

کانفرنس نے اپنے مقاصد اور نصب العین کی تکمیل کے لیے مطبوعات بھی شائع کیں۔ اس کے جلسوں میں پڑھے جانے والے خطبات اور مقالات خطبات عالیہ کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئے۔ آفتاب احمد نے اس کی تاریخ مختصر حالات آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے تحریر کی جو علی گڑھ سے ۱۹۰۸ء میں طبع ہوئی۔ اس کے سالانہ جلسوں کی رودادیں ہر سال شائع ہوتیں۔ ایک پنج سالہ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی علی گڑھ سے ۱۹۳۷ء میں طبع ہوئی۔ مرقع کانفرنس ۱۸۸۶ء تا ۱۹۳۶ء میں تمام منظور شدہ قراردادیں اور مقالات، اجلاس اور جلسوں کی عام کیفیتیں مندرج کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اہم تعلیمی مسائل پر جو وقتاً فوقتاً ملت کو پیش آتے رہے، تحقیقاتی رپورٹیں مثلاً کمال یار جنگ ایجوکیشنل کمیٹی رپورٹ اور طرح طرح کے کتابچے شائع ہوئے۔

کانفرنس کی سرگرمیوں میں اُردو کے تحفظ و بقا کے لیے ہر ممکن کوششیں شامل ہوتیں۔ سیّد احمد خان کے انتقال تک اُردو ہندی تنازعہ نے شدید اور افسوس ناک صورت اختیار کرلی تھی۔ ۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو لارڈ کرزن نے ہندی کو ثانوی زبان کا درجہ دے دیا تھا، جس سے مسلمانوں میں شدید ہیجان پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی شکایات کے اظہار کے لیے ۱۳/مئی ۱۹۰۰ء کو ''اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' قائم کی۔ پھر دسمبر ۱۹۰۲ء اور جنوری ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں کانفرنس کے شعبے تشکیل دیے گئے تو ایک شعبہ ''علمیہ'' بھی قائم ہوا، جس کے مقصد کی صراحت کے لیے ''انجمن ترقی اُردو'' نام رکھا گیا۔ اس کے پہلے صدر تھامس آرنلڈ اور مولانا شبلی سکریٹری منتخب ہوئے۔ شبلی کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی اور پھر مولوی عبدالحق اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ انجمن نے اُردو کے تحفظ، اس کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں۔ اس نے اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی لامتناہی کوششیں کیں۔ اُردو کو مسلمانوں کی تہذیب اور قومیت کی علامت بنادیا۔ اس نے مسلمانوں کی قومی اور سیاسی جدوجہد میں یہ احساس بھی پیدا کیا کہ اس کا تحفظ دیگر بنیادی حقوق کی طرح مسلمانوں کے لیے لازمی ہے۔

انجمن نے تحقیق اور تفتیش کی نئی راہیں تلاش کیں۔ اس کے ذخیرۂ ادب میں بے پناہ اضافہ کیا اور اُردو کو بحیثیت مجموعی اس قابل کیا کہ وہ خیالات کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ بھی سمجھی جانے لگی۔ یہ کام دیگر متعدد اداروں اور انجمنوں نے بھی کیا۔ ''ادارہ ادبیات اُردو'' حیدرآباد دکن ڈاکٹر محی الدین

قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، عبدالقادر سروری اور عبدالحمید صدیقی کی مساعی سے ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا۔ اُردو کے فروغ اور تحقیق کے علاوہ اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ملک کے تاریخی ادب و آثار کی حفاظت کی جائے۔

بعض مطابع اور تصنیف و تالیف کے اداروں نے اپنی مطبوعات و تالیفات میں اس وقت کے سیاسی اور قومی مسائل پر بکثرت اور ضروری کتابیں شائع کیں۔ یہ بات عام نہیں تھی۔ صحافت اور پریس پر اتنے سخت قوانین نافذ تھے کہ وہ ایسی کوششیں کھل کر نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن بعض مطابع اور ناشرین نے سیاسی اور قومی مسائل پر جرأت کا ثبوت دیا۔ اور سیاسی جدوجہد اور آزادی کی تحریک سے متعلق کئی کتابیں شائع کیں۔ جن میں بعض بہت اہم اور تاریخ ساز تصانیف بھی تھیں۔ ویسے تو بعض مطابع غیر معروف تھے، اور اُنھوں نے کبھی کبھی سیاسی معاملات سے متعلق کوئی کتاب شائع کر دی لیکن بعض مطابع نے مستقلاً اس سلسلے میں کئی کتابیں شائع کیں۔ اور اس طریقے سے اُنھوں نے آزادی کی جدوجہد کو وسعت اور مقبولیت پہنچائی۔ تحریکِ آزادی کے اہم مراحل پر جن مطابع نے زیادہ اشاعتی سرگرمی دکھائی ان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے مسلمانوں کے قومی اور تاریخی مسائل اور موضوعات کے لیے اپنی مطبوعات کو وقف کیا۔ اس کے تحت زیادہ تر فلسفہ، مذہب اور تاریخ پر کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن اس نے بعض کتابیں قومی، تعلیمی اور سیاسی مسائل پر بھی طبع کیں۔ مقالات شبلی، حیات شبلی، اس تعلق سے اہم مطبوعات ہیں۔ نظامی پریس بدایوں نے علمی اور ادبی تصانیف کے علاوہ وقت کے اہم قومی مسائل پر کتابیں شائع کیں۔ مسلمانوں کے قومی مسئلہ پر سیّد طفیل احمد منگلوری کی کتابیں مسلمانوں کا روشن مستقبل اور روشن مستقبل یہیں سے شائع ہوئیں۔ ادارے کے مالک نظامی بدایونی خود سیاسی اور قومی سرگرمیوں میں شریک رہتے تھے۔ کئی کتابوں کے مرتب اور مصنف تھے۔ رسالہ ذوالقرنین نکالتے تھے۔ رسالہ سودمند میں معاونت کرتے تھے۔ انقلاب دہلی، قومی حکومت کی کہانی، مسلم اوقاف کا قانون، سرمایہ داروں کی غلامی اور مسلمان ان کے مطبع سے شائع ہوئیں۔ سلطان حسین اینڈ سنز بمبئی نے تحریکِ آزادی پر متعدد چھوٹی بڑی کتابیں طبع کیں۔ ایک خصوصیت اس مطبع کی یہ بھی ہے کہ یہاں سے پاکستان اور تحریک پاکستان پر کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ''مسلم لیگ پریس'' دہلی نے مسلم لیگ کی رودادیں، قراردادیں، اس کے اشتہاری کتابچے، مسلم قائدین کی کتابیں اور خطبات و مکتوبات کے مجموعے اور

اخبارات شائع کیے۔ ''ادارہ اشاعت اُردو'' حیدرآباد دکن نے ادبی مطبوعات کے علاوہ حالات حاضرہ اور مختلف سیاسی مسائل اور تحریکِ آزادی پر کتابیں شائع کیں۔ مکتبہ اُردو لاہور ترقی پسند مصنفین کی کتابیں شائع کرتا تھا۔ اس نے ایسی کتابیں بھی شائع کیں جو استعماری طاقتوں کے خلاف اور معاشی استحصال کے احتجاج میں تھیں۔ ان کے علاوہ سیاسی رہنماؤں کی حیات اور کارناموں پر کئی کتابیں اور آزادی کے مختلف مسائل اور پہلوؤں پر کئی کتابیں طبع کیں۔ نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن نے ادبی اور مذہبی کتابوں کے علاوہ مختلف سیاسی رہنماؤں کی کتابیں اصل اور تراجم کی شکل میں شائع کیں۔ اس نے سیاسی مسائل، آزادی اور تحریک پاکستان پر بکثرت کتابیں شائع کیں۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی مذکورہ کتابیں جو آزادی اور پاکستان پر تصنیف ہوئی تھیں یہیں سے طبع ہوئیں۔ مولانا محمد علی کی تحریروں، خطبات اور مضامین کے تمام مجموعے اور سیاسی قائدین پر سوانحی کتب بھی نفیس اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن صرف سیاسی مسائل پر کتابوں کی اشاعت کے لیے مخصوص تھا۔ اور اس دارے سے جس قدر کتابیں طبع ہوئیں وہ یا تو سیاسی رہنماؤں کی حیات اور کارناموں سے متعلق تھیں یا آزادی کی تحریک پر لکھی گئی تھیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے سیاسی رہنماؤں اور سیاسی مسائل کی بعض اہم کتابیں شائع کیں۔ تحریکِ آزادی کے آخری مرحلے پر جے ہند پبلشرز لاہور، اُردو ہندوستان لاہور، لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور نرائن دت سہگل پبلشرز وغیرہ نے وقتی مسائل اور آزادی کی تحریک کے مختلف پہلوؤں پر کثیر تعداد میں کتابیں شائع کیں۔

(۲) سیاسی جماعتیں، ان کی روداد یں، قرارداد یں

ہندو قومیت کے فروغ کو برطانوی سرپرستی سے بڑی تقویت پہنچتی رہی۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں اس نے برطانوی حکومت کے زیرسایہ جدید صورت اختیار کی تھی۔ اے او ہیوم نے ۱۸۸۴ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر ملک کے سربرآوردہ افراد سال مین ایک مرتبہ ملتے رہیں اور معاشرتی معاملات پر اظہار خیال کرتے رہیں تو یہ امر ملک کے مفاد کا باعث ہوگا[1] ابتداءً ہیوم کا یہ مقصد نہ تھا کہ ان جلسوں میں سیاسی مسائل پر بحث ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ صوبوں کے گورنران جلسوں کی صدارت کریں لیکن وائسرائے لارڈ ڈفرن نے اس تجویز کو منظور نہ کیا تو ۱۸۸۵ء میں ہیوم نے وائسرائے کی رضامندی سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی[2] اس کے جلسوں کی صدارت مقتدر انگریز کرتے رہے۔ اس کے اجلاس میں پہلی قرارداد ہمیشہ حکومت برطانیہ سے اظہار وفاداری پر مبنی ہوتی[3] اس

امر سے انداز ہوتا ہے کہ اس کے قیام میں کیا انگریزی حکمت عملی پنہاں تھی۔ برطانیہ سے کامل وفاداری کو اس کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ اس کے قیام سے قبل ہندوؤں میں قومی وحدت کا تصور اس قدر شدید نہ تھا، جیسا کہ ظاہر ہوا۔ فی الحقیقت اس کے قیام و استحکام کے پس پشت ہندوؤں کے قومی احیا کا جذبہ موجزن تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے کانگریس کے ذریعے ہندو قومیت کے رجحانات و نظریات کو مختلف پہلوؤں اور خوب صورت ناموں کے ساتھ پیش کیا۔ اس کا قیام اُردو ہندی لسانی تنازعے کے دور میں ہوا تھا۔ چناں چہ اس نے اپنی ہندو قومیت کے جذبے سے مجبور ہو کر اُردو کی حمایت نہیں کی لیکن اس کے پیش نظر اس زبان کی اہمیت و حیثیت ضرور تھی۔ لہٰذا اس نے عوام تک انھیں کی زبان میں بات پہنچانے کے لیے اُردو زبان میں اپنے جلسوں کی رودادیں مرتب کیں اور انھیں شائع کیا۔ بعد میں اس کے اجلاس کی رودادیں ہر سال اُردو میں شائع ہوتی رہیں، بلکہ اس کے اجلاس کے خطبات بھی اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتے۔ بیشتر جلسوں میں کانگریس کی کارروائیاں، تقاریر، خطبات اور قراردادیں اُردو میں پیش کی جاتیں جن میں سے اکثر اُردو میں مطبوعہ ہیں۔ کانگریس کی ایک مفصل اور مستند تاریخ سیتارامیا پٹا بھائی نے دو جلدوں میں انگریزی زبان میں تحریر کی تھی اس کا بھی اُردو میں ترجمہ ہوا، جو دہلی سے شائع ہوا۔

کانگریس نے ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری دونوں اعتبار سے، اُردو کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ جب بّرِ عظیم میں سودیشی تحریک شروع ہوئی تو اس وقت انگریزی مقاطعہ کے جذبے کے تحت یہ سوچا جانے لگا کہ ملک کی قومی زبان کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو انگریزی کی جگہ لے سکے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد جب کانگریس میں بڑی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کی رہنمائی میں طبقہ امرا کے علاوہ کچھ متوسط طبقے کے افراد بھی شامل ہوئے تو اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے اقلیتوں کا یہ مطالبہ تسلیم کیا کہ ''اقلیتوں کی تہذیب، اخلاق، زبان و ادب وغیرہ کی حفاظت کی جائے گی''۔[۴] ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی کو ہونا چاہیے۔ اور اس سے مراد ایسی زبان لی گئی جس میں نہ عربی، فارسی الفاظ کی بہتات ہو اور نہ سنسکرت الفاظ کی کثرت، اور یہ حسب خواہش فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جا سکے گی۔ کانگریس کا تمام کاروبار ہندوستانی میں ہونا چاہیے۔[۵] پھر کانگریس حکومت نے صوبہ بہار کی عدالتوں میں ہندی کے ساتھ، جو وہاں پہلے نافذ تھی، اُردو حروف کے استعمال کی اجازت بھی دے دی۔[۶]

سیّد احمد خان، قیام کانگریس کے پس پشت، ہندوؤں اور انگریزوں کے عزائم کو سمجھ رہے تھے۔ چناں چہ جب کانگریس نے اپنا اجلاس منعقد کیا تو نہ وہ اس اجلاس میں شریک ہوئے اور نہ اُنھوں نے اسے اپنی شرکت کے قابل سمجھا۔ ہندو قوم پرستوں کی جانب سے ہونے والی کارروائیوں کے سبب آیندہ کے لیے وہ دونوں قوموں کے تعلقات میں کسی بہتری کی امید نہ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم قوم کو دم لینے کی کچھ مہلت مل جائے تاکہ وہ مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ذہنی قابلیتوں کی نمایاں کمی کو پورا کر سکے۔ اس کی حالت کسی طرح ایسی نہ تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک نئی کش مکش میں شریک ہو جاتی۔ اگر اس وقت مسلمان سیاست میں حصہ لینے لگتے تو ان تعلیمی سرگرمیوں کو جاری نہ رکھ سکتے جن کے بغیر دوسروں سے مقابلہ کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسی بنا پر وہ ہندوؤں سے بھی مزید عداوت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کانگریس کے اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کی تشکیل کی۔ لیکن یہ جماعت ہندوؤں کی قومیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک نہ سکی۔ انھیں دنوں ہندوؤں نے ''گایوں کے تحفظ'' کے لیے ایک جماعت کی تنظیم کی جس نے بہت جلد تمام برِعظیم میں وسعتیں اختیار کر لیں۔ سیّد احمد خان کو ہندوؤں میں اِحیائے ماضی کی تحریک پیدا ہونے سے جو خطرات تھے ان کا جواز اس تحریک سے بھی مل گیا۔ مسلمان اس وقت اس قسم کے دباؤ سے سمجھوتہ کر لیتے تو وہ دو قوتوں کے دست نگر ہو جاتے۔ چناں چہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سیّد احمد خان نے ایک خالص مسلم جماعت کی تنظیم ''محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا'' تشکیل دی۔ اُنھوں نے اپنی ان تشکیل دی گئی جماعتوں کے لائحہ عمل اور مقصد کو اپنے رسالوں اور مکتوبات میں بیان کیا۔ یہ خالص سیاسی جماعتیں نہیں تھیں۔ ان کا اصل مقصد مسلم قومیت اور تہذیب کا تحفظ تھا۔ سیّد احمد خان کے انتقال کے وقت تک ان کے علاوہ کسی اور نے ابھی کسی سیاسی جماعت کی تشکیل نہیں کی تھی۔ پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے مختلف جارحانہ افعال کے جواب میں اپنی شکایت کے اظہار کے لیے ''محمڈن پولٹیکل آرگنائزیشن'' کے نام سے ایک جماعت کا قیام ضروری سمجھا۔ اور پھر اس کے بعد کے حالات میں، تقسیم بنگال کے نتیجے میں ہندوؤں کی شدید مخالفت کے سبب نواب سلیم اللہ خان نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی تنظیم اور سیاسی اور معاشی امور میں ان کی ترجمانی کے لیے ایک انجمن کی تشکیل کی جائے۔ چناں چہ ''محمڈن پراونشل یونین'' قائم ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب حکومت آئینی اصلاحات کی ایک مزید قسط کے ذریعے مجلس قانون ساز اور انتخابات کو وسعت دینا

چاہتی تھی۔ مسلمانوں نے ''جداگانہ حق رائے دہی'' کا مطالبہ کیا۔ مطالبے کے اظہار کے وقت مسلمانوں کے قائدین کو اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک سیاسی جماعت ہو جو تمام مسلمانوں کی نمایندگی کر سکے۔ یہ ضرورت ۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر ڈھاکہ میں برِّعظیم کے مسلمانوں کے ایک نمایندہ اجلاس منعقدہ زیرِ اہتمام ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے قیام سے پوری ہوئی۔ لیگ تقسیم ہند اور حصول پاکستان کے مرحلے تک بخوبی مسلمانوں کے قومی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں مستعد رہی اور مسلمانوں کے جذبات اور نصب العین کی نمایندگی کرتی رہی۔ اس نے ابتدا ہی سے اُردو کی حمایت کی اور اسے اپنا ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک کا خطبہ صدارت اُردو میں تھا۔ بعد میں اس کے دیگر سالانہ جلسوں میں اُردو استعمال ہوتی رہی۔ مولانا حسرت موہانی، سر سکندر حیات، مولانا بہادر یار جنگ اور دیگر رہنما اُردو میں تقاریر کرتے۔ اس کے تمام عوامی جلسے اُردو میں منعقد ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ قائدِاعظم محمد علی جناح، جو اُردو سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتے تھے گاہے گاہے اُردو میں خطاب کرتے تھے۔ اس کے تیسرے اجلاس منعقدہ امرتسر ۱۹۰۸ء میں مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے اُردو کو پس پشت ڈالنے، ہندی کی حمایت اور اس کی سرپرستی پر حکومت کی مذمت کی۔[۷] چوتھے اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹۱۰ء کے خطبۂ صدارت میں حکیم اجمل خان نے اُردو کو ہندوستان کی لنگوا فرنکا قرار دیتے ہوئے اس کے فروغ اور استعمال پر زور دیا۔[۸] اسی اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں ہندوؤں کی اُردو کو نقصان پہنچانے کی کوششوں پر احتجاج کیا گیا۔ اس قرارداد کو پیش کرتے ہوئے سر شیخ عبدالقادر نے اُردو کے لنگوا فرنکا ہونے پر ایک مدلل تقریر کی۔ اسی طرح کی ایک قرارداد اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۷ء میں منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں اُردو کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے میں مطالبہ کیا گیا۔ اس میں ساتھ ہی مسلمانوں کو تلقین کی گئی تھی کہ اُردو کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کریں۔[۹] ۱۹۳۸ء میں جب کانگریس نے ہندی ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان تجویز کیا تو لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ ۱۹۳۸ء میں اس کی پُرزور مخالفت کی گئی۔[۱۰] اُردو کی حمایت اور مدافعت پر مسلم لیگ کے اکثر سالانہ اجلاس میں عام طور پر خطبات اور قراردادیں پیش کی جاتی تھیں۔ اس کے سالانہ جلسوں کی رودادیں، قراردادیں اور خطبات اُردو میں شائع کیے جاتے۔ جب ۱۹۳۷ء میں لیگ کا دورِ جدید شروع ہوا تو اس وقت باضابطہ اس کے ہر اجلاس کی کارروائیوں کی رودادیں اس کے

خطبات صدارت اور قراردادیں اُردو میں اصل یا ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔ ۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء سے اپریل ۱۹۴۰ء تک، اپریل ۱۹۴۰ء سے اپریل ۱۹۴۱ء تک اور اپریل ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک کی جملہ قراردادوں کے مجموعے اُردو میں مکتبہ لیگ دہلی سے شائع ہوئے۔ اس کے مقاصد اور نصب العین کی تشریح اور تشہیر پر مبنی کتابیں اس کے مطبع سے شائع ہوئیں۔ مسلم لیگ کے مقاصد کی صراحت پر پہلے پہل مولوی عزیز مرزا نے ایک کتاب لکھی تھی جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ۱۹۱۰ء کو شائع ہوئی۔[11] اُردو میں مسلم لیگ کی دیگر تاریخیں تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مرزا اختر حسین مطبوعہ مکتبہ لیگ بمبئی اور تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مظہر انصاری مطبوعہ دہلی ۱۹۴۰ء شائع ہوئیں۔ مسلم لیگ اپنے اُردو اخبار بھی شائع کرتی تھی۔

دیگر سیاسی جماعتوں میں سے جنھوں نے اپنے مقاصد اور نصب العین کی تکمیل اور اپنے خیالات و نظریات کی تشہیر کے لیے اُردو زبان کا سہارا لیا، ان میں مجلس خلافت، جمعیۃ العلمائے ہند، جمعیۃ العلمائے اسلام، آل پارٹیز کانفرنس، مجلس احرار اسلام، خدائی خدمتگار، شیعہ پولٹیکل کانفرنس اور خاکسار تحریک قابل ذکر ہیں۔

مجلس خلافت کا زیادہ تر کام اُردو میں ہوا۔ اس کے اجلاس کی تمام تر کارروائیاں عام طور پر اُردو میں ہوتی تھیں۔ اس کی جانب سے شائع ہونے والا تحریکی ادب عام استفادے کے خیال سے اُردو میں شائع کیا جاتا۔ اس نے اپنے مقاصد کی مقبولیت اور تشہیر کے لیے اُردو روزنامہ خلافت بھی جاری کیا جو تحریکِ خلافت کے دوران بہت مقبول تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں تک یہ جاری رہا۔ مجلس خلافت کا منشور اس کے کتابچے اور اسناد و دستاویزات اور خطبات و قراردادیں سب اُردو میں مطبوعہ ہیں۔ مسلم آل پارٹیز کانفرنس، قانون ساز جماعتوں کے مسلمان اراکین اور دیگر مسلم جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ یہ نہرو رپورٹ کے مضمرات اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو متعین کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس کا اجلاس دہلی میں ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس کی کارروائی، روداد اور سفارشات کا مجموعہ، رپورٹ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے دہلی سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ۱۹۳۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اور اس کا آخری اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ اس کے پہلے اجلاس میں حکومت

نوآبادیات کے لیے جدوجہد، معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب اور شیعوں کے لیے معیّن نشستوں کا مطالبہ نصب العین کے طور پر طے ہوا تھا۔ اس کا سیاسی رجحان اور نقطہ نظر کانگریس کی معیت میں رہا۔ اس کی کارکردگی بھی اُردو میں ہوتی تھی۔ خدائی خدمتگار جماعت نے کانگریس کے ساتھ نہ صرف اشتراک عمل بلکہ کامل اتحاد کیا تھا۔ اس جماعت نے تحریری صورت میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ لیکن اس کے جلسوں میں بھی اُردو میں تقریریں ہوتی تھیں۔ برِعظیم کے سرحدی علاقوں میں بھی اس کا کام اُردو میں ہوتا۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد، سرگرمیوں اور اس سے متعلقہ افراد کے تذکرے اور اس کی تاریخ پر مبنی ایک کتاب خان غازی کابلی نے تحریك خدائی خدمتگار تحریر کی تھی۔ اس میں تحریک اور سرگرمیوں کے علاوہ اس کے بانی خان عبدالغفار خان کے مضامین اور تقاریر بھی شامل کی گئی تھیں۔ یہ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی نے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس کا تحریکی ادب بھی دونوں زبانوں میں شائع ہوا، لیکن انگریزی کتابوں کے تراجم بھی کیے گئے۔ اس طرح اس جماعت نے بھی مجموعی طور پر اپنا اہم کام اُردو ہی میں کیا۔ اور جہاں تک جلسوں کا تعلق تھا اس کی کارروائیاں، اس میں تقاریر اور اس کی قراردادیں تمام تر اُردو ہی میں ہوتیں۔ اس جماعت نے اپنے مقاصد کی تکمیل اور اپنے نقطۂ نظر کی تشہیر کے لیے کثیر التعداد کتابیں تصنیف کیں اور ان کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی۔ خود علامہ مشرقی نے دیگر موضوعات اور مضامین کے علاوہ خاکسار تحریک پر کئی کتابیں اُردو میں تحریر کیں۔ خاکسار تحریک کے تعارف اور اس کے اغراض و مقاصد پر ان کی کتاب قول فیصل اُردو میں ہے۔ یہ پہلے اشارات کے نام سے ۱۹۳۱ء میں اور پھر قول فیصل کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ خاکسار تحریک پر مکمل کتاب ہے۔ خاکسار تحریک کی مخالفت پر اُردو میں ایک کتاب خاکسار فتنہ مجلس احرار کی جانب سے امرتسر سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں عنایت اللہ مشرقی کے مذہبی اور سیاسی نظریات پر اعتراضات اور خاکسار تحریک پر الزامات لگائے گئے تھے۔

جمعیۃ العلمائے ہند اور جمعیۃ العلمائے اسلام کو مختلف الخیال علما نے اپنے سیاسی نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے تشکیل دیا تھا۔ ان دونوں جمعیتوں کا تمام تر کام اُردو میں ہوا۔ ان کی کارروائی، ان میں کی جانے والی تقاریر اور خطبات صدارت سب اُردو میں انجام دیے جاتے۔ ان کی روداد یں اور خطبات اُردو میں مطبوعہ ہیں۔ جمعیۃ العلمائے ہند اپنا رسالہ الجمعیۃ بھی شائع کرتی تھی۔ جو مستقل

نکلتا رہا۔ اس میں سیاسی اور قومی مسائل پر جماعت کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا تھا۔ جمعیۃ العلمائے اسلام دو قومی نظریے کے حامل علما کی جماعت تھی۔ اس نے اپنے اجلاس منعقدہ کلکتہ ۱۹۴۵ء میں تحریک پاکستان اور مطالبہ پاکستان کی بھرپور حمایت کی تھی۔ اس سلسلے میں اس کے اجلاس کی قراردادوں پر مشتمل مجموعہ کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے دیگر جلسوں کی رودادیں اور ان میں پڑھے جانے والے خطبات بھی شائع ہوئے۔ مجلس احرار کا بھی تمام تر کام اُردو میں ہوتا تھا۔ اس کے رہنماؤں میں علما اور اُردو زبان کے بعض نام ور شاعر، ادیب اور خطیب شامل تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری مثالی خطیب تھے۔ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی مذہبی عالم تھے۔ ان سے متعدد تصانیف بھی منسوب ہیں۔ چودھری افضل حق عالم دین اور مصنف تھے۔ تاریخ احرار اور میرا افسانہ ان کی مجلس احرار کے بارے میں تصانیف ہیں۔ تاریخ احرار مجلس احرار کے اغراض و مقاصد، اس کی کارکردگی کی تاریخ اور سیاسی جدوجہد کی داستان کو پیش کرتی ہے۔ میرا افسانہ مصنف کی آپ بیتی ہے، جس میں مجلس احرار کے تعلق سے مصنف کی جدوجہد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ دیگر رہنماؤں میں شورش کاشمیری، ادیب و شاعر و صحافی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان بھی کچھ عرصہ اس سے وابستہ رہے۔ مولانا داؤد غزنوی اس کے رہنما اور ادیب و صحافی تھے۔ مجموعی طور پر مجلس احرار نے اُردو سے بہت زیادہ کام لیا۔ اس کے کام کو آگے بڑھانے اور اس کے مقاصد کو پورا کرنے میں اس جماعت کے ادیبوں، شاعروں اور خطیبوں ہی کا حصہ ہے۔

ایک اور جماعت جس نے تمام تر اُردو کو ذریعہ اظہار بنایا مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن تھی۔ یہ پہلے ادارہ اتحاد المسلمین کے نام سے قائم تھی۔ اس کا مقصد اس وقت مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی معاملات میں دل چسپی لینا تھا۔ بجائے کسی نئی سیاسی جماعت کے قیام کے ادارۂ اتحاد المسلمین کے اغراض و مقاصد میں ضروری ترمیمات کے بعد اس کو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی حیثیت دی گئی۔ مولانا بہادر یار جنگ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے جنھوں نے اپنی خطابت اور جوش عمل سے اسے بہت زیادہ منظم اور فعال بنایا۔ حیدرآباد دکن میں مسلمانوں کے زمانہ اقتدار میں کسی سیاسی جماعت یا اس کے صدر کو کبھی وہ عروج حاصل نہ ہوسکا جو آزادی حیدرآباد کی تحریک کے دنوں میں مجلس اتحاد المسلمین اور اس کے صدر بہادر یار جنگ کو حاصل ہوا۔ اس کی مقبولیت میں اس کے نصب العین کے ساتھ ساتھ بہادر یار جنگ کی شخصیت، خطابت، علمیت اور ابوالحسن سیّد علی، مظہر علی کامل، قاسم رضوی کی ان تھک محنت، تدبر اور فراست کو بڑا دخل ہے۔ اس مجلس نے دکن کے مسلمانوں میں جذبۂ

آزادی اور بے پناہ جوش عمل پیدا کیا۔ اس کے صدر اور اس میں شامل اراکین، نامور خطیب اور ادیب و عالم تھے۔ اُنھوں نے ہر مرحلے پر اُردو سے کام لیا۔ وہاں کے ماحول اور رواج کے مطابق وہ کسی اور زبان سے مدد بھی نہیں لے سکتے تھے۔ مجلس کے زیر اہتمام عام طور پر جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے اس کا اپنا ایک اشاعتی ادارہ ''دارالاشاعت سیاسیہ'' تھا جو محض مسلمانوں کے قومی، سیاسی مسائل اور حصولِ آزادی پر کتابیں شائع کرتا رہتا تھا۔ سارے برِعظیم میں خاص سیاسی مسائل پر بہت کم مطابع نے اس قدر کتابیں اُردو میں شائع کیں۔ اسی مطبع سے ۱۹۴۱ء میں تاریخ مجلس اتحاد المسلمین شائع ہوئی۔ بہادر یار جنگ پر ایک کتاب لسان الامت اور ان کے خطبات اور سیاسی تقاریر کے مجموعے یہیں سے اشاعت پذیر ہوئے۔

(۳) خطبات اور تقاریر

تحریکِ آزادی کے دوران تمام سیاسی اور قومی جماعتوں کا طریق کار جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے اپنے حلقہ خیال کی نمایندگی اور اس کے مقاصد اور نصب العین کا اظہار اور اس کی توسیع و اشاعت تھا۔ خطبات اور تقاریر رابطۂ عوام اور اظہار مقصد کا ایک بہتر ذریعہ اور اپنے مخاطب میں جوش عمل، جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے تھے۔ بعض جماعتوں کو مثالی خطیب اور مقرر میسر آئے، جنھوں نے اپنے زورِ خطابت اور جوش بیان سے ہیجان، اضطراب اور ولولہ پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ آزادی کا جذبہ اور جوش عمل بڑی حد تک خطابت کے ذریعے عام اور اثر پذیر ہوا۔ یعنی خطیبوں اور مقرروں نے سنجیدگی، متانت، تفکر اور تجزیہ سے مسائل کے حل کے لیے اپنا نقطۂ نظر یا جماعت کا مطمح نظر پیش کیا۔ خطبات یا تقاریر کی ادائیگی کے لیے کسی بھی جماعت یا تقریب کا انعقاد ناگزیر تھا۔ بعض جماعتیں محض سیاسی مقاصد رکھتی تھیں۔ بعض قومی اور تعلیمی اور مذہبی مسائل کے اظہار اور ان کے حل کو اہمیت دیتی تھیں۔ ان میں سے چند جماعتیں دیگر جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ فعال، نمایاں اور نمایندہ ہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے خاص مستقل سیاسی مقاصد تھے۔ دیگر چھوٹی بڑی قوم پرست اور فرقہ پرست جماعتیں بھی ان کے ساتھ روبہ عمل رہیں۔ مسلمانوں میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تعلیمی کے ساتھ ساتھ ضرورتاً قومی اور سیاسی مقاصد کی حامل بھی ہوئی تھی۔ مجلس خلافت، تحریکِ خلافت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی تھی۔ جمعیۃ العلمائے ہند اوّلاً

مسلمانوں کے عام مذہبی اور قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ بعد میں اس نے کانگریس کے ساتھ تعاون کیا اور قوم پرستانہ جذبات کے اظہار کا کام کیا۔ یہی طرز فکر خدائی خدمتگار، مجلس احرار، شیعہ پولٹیکل کانفرنس وغیرہ کا رہا۔ مسلم لیگ کے ساتھ جمعیۃ العلمائے اسلام اور مجلس اتحاد المسلمین سرگرم رہیں۔

برِعظیم کی تمام جماعتوں کے لیے ہر دور میں رابطہ عوام اپنے خیالات کے اظہار اور ان کی تشہیر و مقبولیت کے لیے اُردو زبان کا استعمال ناگزیر رہا ہے۔ اکثر جماعتوں نے محض جلسوں کے انعقاد کے علاوہ اپنے منعقدہ جلسوں میں دیے جانے والے خطبات کو مرتب شکل میں ہر سال یا گاہے گاہے شائع بھی کیا یا ان خطبات یا تقاریر کو مجموعوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً طبع کرایا۔ ایسے خطبات علاحدہ علاحدہ بھی شائع ہوتے رہے۔ مجموعوں میں بھی شامل کیے گئے اور دیگر روداددوں، قراردادوں اور تاریخوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ جو خطبات انگریزی زبان میں دیے گئے تھے، جماعتوں کے مذکورہ مقاصد کے تحت ان میں سے اکثر کے تراجم اُردو میں شائع کیے گئے۔

کانگریس کے اجلاس میں جو ہر سال منعقد ہوتے، ابتداءً صرف انگریزی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا گیا تھا۔ لیکن یہ امر صرف شروع کے چند سالوں تک مخصوص رہا۔ بعد میں ضرورتاً اور مہمان مقرروں کی مرضی اور خواہش پر اس کے خطبات اُردو میں بھی دیے جانے لگے۔ اس کے منتخب خطبات کا اُردو ترجمہ یا اصل اُردو خطبات خطبات کانگریس کے نام سے مرتب ہو کر اپریل ۱۹۴۷ء میں لاہور سے ایک ضخیم جلد میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ اسی کے منتخبہ خطبات کو سیتا رامیا پٹا بھائی نے اپنی مفصل اور مستند تاریخ کانگریس کی دو جلدوں میں شامل کیا تھا۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ لاہور سے طبع ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کانگریس کے اجلاس میں، جن میں وہ بحیثیت صدر شریک ہوئے اُردو میں خطبات دیے۔ مولانا ابوالکلام نے اجلاس خصوصی منعقدہ دہلی ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء اور اجلاس منعقدہ رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء کی صدارت کی اور خطبات دیے۔ ان کے یہ خطبات خطبات ابوالکلام اور خطبات کانگریس میں شامل ہیں۔ مولانا محمد علی نے کانگریس کے اجلاس منعقدہ کوکناڈا ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۳ء میں اپنا اہم خطبہ صدارت دیا تھا۔ ان کا یہ خطبہ انگریزی میں تھا۔ اس کا اُردو ترجمہ خطبات کانگریس میں شامل ہوا۔ اس اہم خطبے کا ایک اور ترجمہ شاہین فاروقی نے کتابی صورت میں ہندوستان کی سیاسی الجھنیں کے نام سے کیا۔ جو حیدرآباد دکن سے اپریل

۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کا مفصل مقدمہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے تحریر کیا تھا۔ مولانا محمد علی نے خطبۂ صدارت دینے کے علاوہ کانگریس کے مختلف جلسوں میں بھی تقریریں کیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک اہم تقریر اجلاس کانگریس منعقدہ امرتسر ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی یہ اجلاس امرتسر میں جلیاں والا باغ کے خونین سانحہ کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ اسی اجلاس میں مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی نے بھی ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ حکیم اجمل خان نے کانگریس کے اجلاس منعقدہ احمد آباد ۱۹۲۱ء کی صدارت کی تھی۔ ان کے خطبہ صدارت کا ترجمہ خطبات کانگریس میں شامل ہے۔ اسی اجلاس سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا فاخر الہ آبادی، عبدالرحمٰن خان، حسرت موہانی نے بھی خطاب کیا تھا مختار احمد انصاری کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس ۱۹۲۷ء کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا، اس کا اُردو ترجمہ خطبات کانگریس موجود ہے۔ یہ علاحدہ کتابی صورت میں بھی دہلی سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ دیگر صدور نے جو خطبات دیے وہ بھی علاحدہ علاحدہ کتابی صورتوں میں شائع ہوتے رہے۔ اور اگر خطبات انگریزی میں ہوتے تو اُن کے تراجم شائع کیے جاتے۔ خطبات کانگریس میں جن دیگر صدور کے خطبات شامل ہیں ان کے نام خاصے اہم ہیں مثلاً جے بی کرپلانی، سبھاش چندر بوس، جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، گاندھی، سی آر داس، دیش بندھو داس۔

کانگریسی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً کانگریس میں یا کسی اور جماعت کے جلسے میں انگریزی زبان میں جو خطبات دیے وہ اُردو میں ترجمہ ہوکر علاحدہ بھی شائع ہوئے اور مجموعوں کی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ گوپال کرشن گوکھلے نے مختلف مقامات پر سیاسی مسائل پر جو تقریریں کیں ان کا ترجمہ کشن پرشاد کول نے کیا اور یہ گوکھلے کی تحریریں کے نام سے لکھنؤ میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ تقاریر کا دیباچہ برج نارائن چکبست نے تحریر کیا تھا۔

گاندھی کی وہ تقریریں جو اس نے گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمایندگی میں کیں، انھیں گاندھی کے سفرلندن کے حالات کے ساتھ سی راج گوپال اچاریہ نے ترتیب دیا تھا۔ قوم کی آواز کے نام سے اس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا جو دہلی سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ انھیں تقاریر اور لندن میں گاندھی کے بیانات کا ایک اور مجموعہ عبداللہ بریلوی کے مقدمے اور کملا دیوی چٹوپادھیائے کے دیباچے کے ساتھ اُردو میں دہلی سے شائع ہوا۔ گاندھی نے کانگریس کے جلسوں میں جو خطبات

دیے، وہ علاحدہ علاحدہ اُردو ترجمہ ہوکر شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ خطبۂ صدارت اجلاس کانگریس منعقدہ بلگام ۱۹۲۴ء خطبات کانگریس میں شامل ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے خطبات صدارت کا مجموعہ اُردو میں ترجمہ ہوکر ہندوستان کا اتحاد کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ وقار عظیم نے کیا تھا اور یہ دہلی سے ۱۹۴۶ء میں طبع ہوا۔ اس میں شامل خطبات اور تقاریر مختلف جلسوں اور کانفرنسوں میں دی گئی تھیں۔ مختلف قومی اور سیاسی مسائل کو ان میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ نہرو نے دو مرتبہ کانگریس کے اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۲۹ء اور اجلاس منعقدہ فیض پور ۱۹۳۶ء کی صدارت کی تھی۔ ان کے خطبات صدارت خطبات کانگریس میں شامل ہیں۔

سبھاش چندر بوس نے مختلف اوقات میں جو تقریریں کیں ان کا مجموعہ اور ترجمہ سبھاش بابو کی تقریریں کے نام سے دہلی سے شائع ہوا۔ ان تقاریر میں بوس نے آزاد ہند فوج کے قیام اور اس کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ ان میں وہ تقاریر بھی شامل ہیں جو بوس نے جرمنی اور جاپان میں کیں۔ بوس نے کانگریس کے دو جلسوں کی صدارت کی تھی۔ اس کے اجلاس منعقدہ ہری پورہ فروری ۱۹۳۸ء اور اجلاس منعقدہ تری پورہ مارچ ۱۹۳۹ء کے خطبات، خطبات کانگریس میں شامل ہیں۔ اور یہ علاحدہ کتابی صورت میں بھی طبع ہوئی۔

مسلمانوں کی قومیت اور سیاست کے رجحانات و مسائل پیش کرنے والی جماعتوں میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" ابتدائی دور میں نمایاں اہمیت رکھتی تھی۔ سیّد احمد خان نے اسے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو مقبولیت دینے اور قدیم تعلیم میں ملی ضروریات کے ساتھ زیادہ مطابقت پیدا کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے حالات حاضرہ اور مسائل موجودہ پر اظہار خیال اور قومی و ملی تقاضوں کی تکمیل کی جدوجہد کے واسطے ایک ذریعہ فراہم کر دیا۔ اس کے اجلاس اس کے قیام ۱۸۸۸ء سے ہر سال منعقد ہونے لگے، جس میں اکابر قوم جمع ہوکر مسلم ملت کو درپیش مسائل اور ان کو حل کرنے کی تجاویز پر غور کرتے۔ یہ ادارہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی کوششوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے آل انڈیا کانگریس کا مدمقابل ثابت ہوا، بلکہ اس کے ہی ایک سالانہ اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل ہوئی جس کی جدوجہد کے نتیجے میں تحریکِ آزادی کامیاب اور تشکیل پاکستان ممکن ہوئی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس میں

افتتاحی تقریر کرتے ہوئے سیّد احمد خان نے اس کی تشکیل کا مقصد قومی تعلیم پر غور کرنا قرار دیا اور اس سلسلے میں ایک قرارداد پیش کی۔ اور پھر اس کی تشریح میں ایک مفصل تقریر کی[1] بعد میں اس کانفرنس کے اجلاس ہر سال مختلف شہروں میں منعقد ہونے لگے۔ اپنے دورِ حیات میں سیّد احمد خان جب بھی اس میں شریک ہوتے، اس سے خطاب کرتے، ان کے یہ خطبات مکمل مجموعہ لکچرز و سپیچز میں شامل ہیں۔ یہ ان کے تمام خطبات، بیانات، قراردادوں اور تقریروں کا مجموعہ ہے جو سیّد احمد خان نے مختلف مسائل، واقعات اور حالات حاضرہ پر ۱۸۶۲ء سے تاحیات کیں۔ یہ پہلے پہل ۱۸۹۲ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا جسے مزید اضافوں کے ساتھ سیّد احمد خان کے انتقال تک موجود تمام تقریروں کو مولوی امام الدین گجراتی نے مرتب کر کے ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔

سیّد احمد خان نے اپنے خطبات میں ہر مسئلے کو موضوع بحث بنایا تھا۔ ان کی تمام تحریکات اپنے پہلو کے ساتھ ان خطبات اور تقریروں میں بیان ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے تعلق سے ان کی وہ تقریریں انتہائی اہم ہیں جو اُنھوں نے ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں اور ۱۶ر مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں "ہماری قوم کو نسبت پولٹیکل امور سلطنت کے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے"؟ کے موضوع پر کیں[2] یہ تقریریں دراصل مستقبل کے برِّعظیم میں مسلمانوں کے لیے سیّد احمد خان کا تجویز کردہ ایک نصب العین پیش کرتی ہیں، جن میں اُنھوں نے اپنے دوقومی نظریے کو بالوضاحت پیش کیا، مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی تلقین اور ان پر کانگریس کے قوم پرستانہ عزائم اجاگر کیے۔ اس مجموعے کے علاوہ سیّد احمد خان کے خطبات اور تقاریر دیگر منتشر حالتوں میں بھی تھے۔ پنجاب میں اپنے سفر کے دوران اُنھوں نے جو تقریریں اپنے مقاصد کے تحت اور وہاں کی انجمنوں کے سپاس ناموں کے جواب میں کیں، انھیں مولوی سیّد اقبال علی نے سیّد احمد خان کا سفرنامہ پنجاب میں مرتب کیا تھا جو علی گڑھ سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سیّد احمد خان کے علاوہ شبلی، حالی، نذیر احمد، زیادہ فعال اور مستعد رہے۔ ان کے علاوہ مولوی سمیع اللہ خان، محسن الملک، وقار الملک بھی اس میں سرگرم رہے۔ شبلی پہلے اجلاس سے ہی ان کے شریک کار رہے۔ اس کے پہلے اجلاس میں جو مولوی سمیع اللہ خان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، شبلی نے شرکت کی اور اس میں پیش کی گئی قراردادوں کی تحریک و تائید کی۔ اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۸۸۷ء میں اُنھوں نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" پڑھا۔

اس کے چوتھے اجلاس منعقدہ علی گڑھ ۱۸۸۹ء میں شریک ہوئے اور ایک تقریر کی[۳] اس کے پانچویں اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے گزشتہ علوم کی ترقی کا جائزہ لینا چاہیے[۴] سیّد احمد خان کی وفات کے بعد بھی شبلی کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۹۹ء کے اجلاس کان پور میں فارسی زبان کی حمایت میں مدلل تقریر کی۔[۵] جنوری ۱۹۰۳ء کے اجلاس میں شبلی نے ''تعصب اور اسلام'' کے عنوان کے تحت خطبہ دیا۔ نواب سلیم اللہ خان اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھاکہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور تاریخ پر خطبہ دیا۔ بعد میں کانگریس سے ان (شبلی) کی دل چسپی بہت کم ہو گئی، اور اس کی جگہ ندوہ نے لے لی۔ ۱۹۱۳ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ''اسلام کی بہترین جمہوریت'' کے موضوع پر مدلل تقریر کی، اور اس میں اسلام کے سیاسی نظام کا جائزہ پیش کیا۔ اس سے قبل وہ مدرسۃ العلوم کی طلبہ یونین کی ایک تقریب میں جمہوری طرزِ حکومت کی تائید میں بھی تقریر کر چکے تھے۔[۶] اشاعت اسلام کی ضرورت پر اُنھوں نے ۱۹۱۰ء میں ایک تقریر کی تھی اور جو خیال اس ضمن میں پیش کیا تھا، اسے عملی شکل دینے کے لیے ''حفاظت و اشاعت اسلام'' کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد کی تجویز پیش کی اور ایک مختصر خاکہ تیار کیا، اور ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں اشاعت و حفاظت اسلام کی تدابیر پر تقریر کی۔ اس میں اسلام پر مخالف قوتوں کی جارحانہ کارروائیوں کی تاریخ پیش کر کے آریوں کی مخفی کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور مسلمانوں کی غفلت و لاپرواہی کی داستان بیان کی۔ ندوہ اور دیگر اداروں اور جماعتوں میں شبلی نے وقتاً فوقتاً علمی، قومی اور مذہبی و سیاسی مسائل اور موضوعات پر خطاب کیا۔ ان کے ایسے خطبات کا مجموعہ خطبات شبلی کے نام سے ۱۹۴۱ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

سیّد احمد خان کے ساتھیوں میں نذیر احمد کو زورِ بیان اور طلاقتِ لسانی کے اعتبار سے خطابت میں امتیاز اور انفرادیت حاصل تھی۔ سیّد احمد خان نے ۱۸۸۷ء میں کانگریس کی مخالفت میں پُر زور تقریر کی تھی۔ مولوی نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں ایک مفصل تقریر میں دل چسپ اور موثر پیرایے میں کانگریس کے عزائم اور اس کے مضر نتائج بیان کیے اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں اسی سال کے اجلاس میں اُنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر ایک تقریر کی۔ ان کی تقریریں عام طور پر کانفرنس، مدرسہ طیبہ اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں ہوئیں۔ ان کے خطبات کا پہلا مجموعہ میر کرامت اللہ نے مرتب کر کے لاہور سے ۱۸۹۰ء میں شائع کیا تھا۔

دوسرا مجموعہ افتخار عالم مارہروی نے دو جلدوں میں مرتب کیا۔ ان کے خطبات متفرق طور پر علاحدہ علاحدہ بھی شائع ہوئے۔ تقریروں اور خطبات کا مکمل مجموعہ بشیر الدین احمد نے دو جلدوں میں مرتب کر کے ۱۹۱۸ء میں آگرہ سے شائع کیا۔ اس میں شامل خطبات تعلیمی اور قومی مسائل پر تھے۔ اور ان کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کی ترقی اور زوال تھا۔

مولوی سمیع اللہ خان نے کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اس کے خطبۂ صدارت میں اُنھوں نے سیّد احمد خان کی پیش کردہ قرارداد کی پرزور حمایت کی۔ بعد کے جلسوں میں بھی اُنھوں نے وقتاً فوقتاً تقریریں کیں۔ نواب وقار الملک نے مختلف اجلاس سے خطاب کیا تھا، ان کی تقریریں مجموعہ کی صورت میں مطبوعہ نہیں ہیں۔ کانفرنس کے اس اہم اجلاس کی اُنھوں نے صدارت کی تھی جس کی قرارداد کے تحت مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ اس موقع پر اُنھوں نے ایک مفصل اور مدلل تقریر کی تھی جس میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور زبوں حالی کا جائزہ لے کر ان کی سیاسی ترقی اور سیاسی حقوق کے حصول کی جستجو پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس کے طویل اقتباسات ان کی مفصل سوانح عمری وقار حیات میں دیے گئے ہیں۔ دیگر جلسوں میں بھی اُنھوں نے جو تقریریں کیں، ان کا ذکر بھی ان کی سوانح میں مندرج ہے۔ نواب محسن الملک کانفرنس کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۳ء اور اجلاس منعقدہ شاہ جہاں پور ۱۸۹۵ء کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ان دونوں جلسوں میں مسلمانوں کے قومی اور تعلیمی مسائل پر تقریریں کیں جو ان کے خطبات کے مجموعے مجموعہ لیکچرز محسن الملک میں شامل ہیں۔ خطبات کا یہ مجموعہ دو جلدوں میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ قومی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی موضوعات اور مسائل پر محسن الملک نے یہ خطبات مختلف جلسوں میں دیے تھے۔ اس میں ان کی وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو اُنھوں نے مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۰۶ء میں کی تھیں۔

کانفرنس کے اجلاس ہر سال بّرِعظیم کے مختلف شہروں میں کسی تعطل کے بغیر منعقد ہوتے رہے۔ ان میں دیے گئے خطبات صدارت خطبات عالیہ کے نام سے تین جلدوں میں مرتب ہوکر شائع ہوئے۔ انھیں انوار الدین احمد زبیری نے مرتب کیا اور یہ علی گڑھ سے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے۔ خطبات عالیہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر خطبہ صدارت سے قبل صدور اجلاس کے حالات زندگی اور قومی کارنامے پیش کیے گئے تھے۔ ان مجموعوں کے علاوہ کانفرنس کے سالانہ خطبات صدارت اور خطبات استقبالیہ ہر سال علاحدہ بھی شائع ہوتے رہے۔

دیگر معروف ادیبوں اور شاعروں میں سے جنھوں نے کانفرنس کی صدارت کی یا خطبات پڑھے، ان میں حالی، سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولوی عبدالحق، سر شیخ عبدالقادر، راس مسعود، سیّد رضا علی وغیرہ تھے۔ ان میں سے حالی نے اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۰۷ء کی صدارت کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے محض تعلیمی مسائل کو زیرِ بحث رکھا۔ اُنھوں نے کانفرنس کے اجلاس جوبلی ۲۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو ''مسلمانوں کی ثانوی تعلیم'' کے موضوع پر خطبہ پڑھا تھا۔ اُنھوں نے اس خطبے کے علاوہ دیگر اداروں میں جو خطبات دیے وہ بھی زیادہ تر تعلیمی مسائل پر مبنی تھے۔ ان خطبات کا مجموعہ تعلیمی خطبات کے نام سے دہلی میں ۱۹۴۳ء کو شائع ہوا تھا۔ سلیمان ندوی نے کانفرنس کے اجلاس متعلقہ شعبہ اُردو میں دو خطبات دیے تھے۔ ایک منعقدہ پونا ۱۹۱۵ء کے اجلاس میں جو ''روداد کانفرنس'' بابت اجلاس ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا، اور دوسرا منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۹ء۔ یہ دونوں خطبات اُردو زبان و ادب سے متعلق تھے۔ اور ان میں اس وقت کے لسانی تنازعہ کی روشنی میں اُردو زبان کا تاریخی اور تہذیبی جائزہ لیا گیا تھا۔ لسانی مباحث پر سلیمان ندوی نے دیگر انجمنوں میں بھی تقریریں کی تھیں۔ مولوی عبدالحق نے کانفرنس کے اجلاس متعلق شعبہ اُردو میں ۱۴ر فروری ۱۹۴۱ء کو خطبہ صدارت دیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے اُردو کے خلاف اس وقت جو معاندانہ تحریکیں جاری تھیں ان کا ذکر کر کے اُردو کی اہمیت اور ضرورت پر اظہار خیال کیا تھا۔ ان کے دیگر متعدد خطبات جو مختلف اداروں اور انجمنوں میں دیے گئے لسانی مسئلے کے زیرِ اثر تھے اور اُردو زبان کے عروج و ترقی کے جذبات سے موجزن۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں عام طور پر اُردو میں خطبات اور تقاریر ہوتی تھیں۔ نواب وقار الملک نے اس کا افتتاحی خطبۂ صدارت اُردو میں پڑھا تھا۔ اس کے اسی افتتاحی اجلاس میں شبلی اور محسن الملک نے بھی اُردو میں خطاب کیا تھا۔ بعد میں جو خطبات صدارت اور تقاریر انگریزی زبان میں کی گئیں، ان کے اُردو ترجمے شائع ہوتے رہے، جو علاحدہ کتابی صورت میں یا سالانہ رودادوں کے ساتھ ہر سال مرتب کیے جاتے۔ اس کے سالانہ اجلاس میں حسرت موہانی، سر سکندر حیات، مولانا محمد علی، عبدالصمد اچکزئی، شبیر احمد عثمانی، بہادر یار جنگ اور ظفر علی خان عام طور پر اُردو میں خطاب کرتے۔ ان میں سے سر سکندر حیات، مولانا محمد علی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے خطبات صدارت کتابی صورتوں میں بھی شائع ہوئے۔ اے کے فضل الحق نے جو مسلم لیگ کے بنگالی رہنما تھے، ایک قرارداد کی حمایت میں، جو لکھنؤ کے اجلاس میں پیش کی گئی تھی، اُردو میں تقریر کی تھی۔ عبدالصمد اچکزئی نے اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۱۵ء میں مطالبہ کیا تھا کہ مسلم لیگ کی

کارکردگی اُردو میں ہونی چاہیے۔[۸] مولانا محمد علی نے لیگ کے اجلاس منعقدہ امرت سر ۱۹۱۹ء میں ایک پُرزور تقریر اُردو میں کی تھی۔ حسرت موہانی نے اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۱۵ء میں اُردو میں خطاب کیا تھا۔ سکندر حیات نے اجلاس خصوصی منعقدہ کلکتہ ۱۹۳۸ء میں اُردو میں تقریر کی تھی۔ مولانا بہادر یار جنگ نے اسلام اور جمہوریت کے موضوع پر قائداعظم کے زیر صدارت تاریخی اجلاس منعقدہ لاہور ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء میں پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی تھی، اور قراردادِ پاکستان کو برحق قرار دیا تھا۔ قائداعظم کے زیرِ صدارت ایک اور تقریر پر اُنھوں نے نظریۂ پاکستان کی تشریح میں لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۳ء میں کی تھی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کے اجلاس میرٹھ کا خطبۂ صدارت اُردو میں دیا تھا۔

مسلم لیگ کے دو عظیم رہنماؤں علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تمام تر خطبات انگریزی زبان میں تھے۔ لیکن تقریباً تمام انگریزی خطبات کے ترجمے اُردو میں ہوئے اور یا تو علاحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے یا رودادوں کے ساتھ شامل اشاعت ہوئے۔ علامہ اقبالؒ کا اہم تاریخ ساز خطبہ جس میں اُنھوں نے تصور پاکستان پیش کیا تھا، متعدد مرتبہ کتابی صورتوں میں اُردو میں ترجمہ ہوکر شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے مختلف جلسوں، پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے متعدد اجلاس کے علاوہ دیگر جماعتوں کے جلسوں سے خطاب کیا تھا جو زیادہ تر اُردو میں تھے۔ ان کے وہ بیانات بھی اہم ہیں جو مختلف قومی اور سیاسی مسائل کے سلسلے میں اُنھوں نے اخبارات میں دیے تھے۔ ان کے خطبات تقاریر اور بیانات کا ایک مجموعہ حرف اقبال کے نام سے لاہور سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اُردو کے علاوہ انگریزی خطبات و بیانات بھی اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیے گئے تھے۔ قائداعظم نے بعض جلسوں میں اُردو میں تقریریں کی تھیں۔ لیکن یہ بہت کم تھیں۔ ان کی تقریباً تمام انگریزی تقریروں اور خطبات صدارت کے اُردو ترجمے کئی مجموعوں میں شائع ہوئے۔ ان کا ترجمہ مسلم لیگ کی جانب سے بھی کئی مرتبہ شائع ہوا۔ جناح کی تقریریں کے نام سے عثمان صحرائی نے قائداعظم کی اہم تقریروں کا ترجمہ کیا تھا، اس میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کی منتخب تقریریں شامل تھیں۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ منشورات قائداعظم کے نام سے شیخ محمد یوسف نے قائداعظم کے خطبات، بیانات اور تقریروں کا ترجمہ کیا تھا، جو بمبئی سے مئی ۱۹۴۷ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کی تقریریں اور بیانات شامل تھے۔ ارشادات جناح کے نام سے

مفتی غلام جعفر نے قائداعظم کی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کی تقریروں کا ترجمہ کیا تھا، جو لاہور سے دو مرتبہ شائع ہوا۔ لاہور سے خطبات جناح کے نام سے بھی ایک مجموعہ خطبات شائع ہوا تھا۔ ان تمام مجموعوں میں جو تقاریر، بیانات اور خطبات ہیں ان کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی حقوق، ان کے لیے بہتر نصب العین اور پاکستان کو مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نقطہ نظر سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجلس خلافت کا زیادہ تر کام اُردو میں ہوا۔ اس کے اسناد، منشورات اور مطبوعات سب اُردو میں ہیں۔ جلسہ عام کا انعقاد اُردو میں ہوتا تھا اور ان سے مہمان اکابر اُردو میں خطاب کرتے تھے۔ مولانا محمد علی اس کے بڑے رہنما اور قائد تھے۔ مجلس کی جانب سے وہ ایک وفد لے کر انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں کی رائے عامہ اور حکام کے سامنے مسلمانانِ ہند کے جذبات پیش کریں۔ لیکن انھیں وہاں سے ناکام آنا پڑا۔ واپسی پر بمبئی میں ۶/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پہلی تقریر کی جس میں اپنے تاثرات بڑے پُر درد انداز میں قوم کے سامنے پیش کیے۔ اُن کی اسی سلسلے میں ایک اور تقریر ۲۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لاہور کے ایک بڑے جلسہ عام میں ہوئی تھی۔ ۲۵ فروری ۱۹۲۱ء کو لکھنؤ میں اُنھوں نے اودھ خلافت کانفرنس کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ایک پُر جوش فی البدیہہ تقریر کی تھی۔ یہ سب تقریریں اُردو میں تھیں، ان کے علاوہ اس تحریک کے دوران زیادہ پُر جوش اور ولولہ انگیز خطبات مولانا ابوالکلام آزاد نے دیے۔ اس سلسلے میں ان کا خطبہ اجلاس عام کلکتہ ۱۹۱۴ء اتحاد اسلامی کے موضوع پر ہے۔ صوبائی مجلس خلافت کے مختلف اجلاس میں اُنھوں نے خطبات صدارت دیے۔ اجلاس منعقدہ آگرہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں اُنھوں نے بڑا پُرزور اندازِ خطابت اختیار کیا تھا۔ اجلاس منعقدہ بنگال ۲۸/فروری ۱۹۲۰ء کے علاوہ دیگر صوبائی جلسوں میں اُنھوں نے خطبات صدارت پیش کیے۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کان پور ۲۹/دسمبر ۱۹۲۵ء کی صدارت بھی اُنھوں نے کی اور ایک موثر، مدلل اور پُر جوش خطبہ دیا۔ ان کے یہ خطبات خطبات ابوالکلام میں شامل ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے فروری ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس برہان پور کی صدارت کی تھی۔ اس میں اُنھوں نے خاصا اشتعال انگیز اور ولولہ خیز خطبہ دیا تھا۔ ان کا یہ خطبہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ خلافت کے مسئلے پر ایک مدلل اور پُر جوش خطبہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ۱۹۲۱ء میں دیا تھا۔ حکیم اجمل خان اور مختار احمد انصاری نے مجلس خلافت کے کئی جلسوں سے اُردو میں خطاب کیا تھا۔ اس کے جلسوں سے اس وقت کے تمام نام ور رہنماؤں نے خطاب کیا تھا۔ ان میں سے مولانا شوکت علی کی تقاریر بھی مطبوعہ ہیں۔ بیشتر مقررین فی البدیہہ تقریریں کیا کرتے تھے۔

تحریک عدمِ تعاون کے دوران برِّعظیم کے تمام علاقوں میں بڑا جوش وخروش تھا۔ اس کے زیادہ تر جلسوں میں اُردو میں فی البدیہہ تقریریں ہوتی تھیں۔ مقررین میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام اور مولانا ظفر علی خان زیادہ ممتاز رہے۔ کراچی میں خلافت کانفرنس ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کی ایک منظور کردہ قرارداد کے حق میں مولانا محمد علی اور دیگر رہنماؤں نے پُر جوش تقریریں کیں۔ اس قرارداد کے ذریعے برطانوی ہندوستانی افواج کے مسلم ملازمین کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ حکومت کی اس ملازمت کو ترک کر دیں جس کی وجہ سے انھیں دوسرے ممالک میں اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ علی برادران دیگر رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے اور ان پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے کے دوران مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد سندھی، مولانا نثار احمد کان پوری نے جو عدالتی بیانات دیے، وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی یہ عدالتی تقاریر ایک کتابی صورت میں کراچی کا تایخی مقدمہ کے نام سے اُردو میں دو حصوں میں شائع ہوئیں۔ اس مقدمہ کی ایک اور روداد منشی مشتاق احمد نے بھی مرتب کی تھی۔ یہ بھی اپنے مندرجات کے اعتبار سے خاصی مفصل ہے۔ اور اس میں رہنماؤں کے مکمل بیانات بھی شامل ہیں۔ یہ میرٹھ سے مقدمۂ کراچی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اسی انداز کا ایک اور مجموعہ روداد و بیانات، رہنمایان ہند کے نام سے مالاکنڈ سے شائع ہوا تھا۔ جس قرارداد کی تقریروں پر ''کراچی مقدمہ'' دائر کیا گیا تھا وہ قرارداد ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں تیار کی تھی اور پہلے پہل کلکتہ ہی کے ٹاؤن ہال میں منظور بھی ہوئی تھی۔[9] اس کے بعد دہلی میں جمعیۃ العلمائے ہند اور مجلس خلافت کے جلسے ہوئے۔ ان دونوں جلسوں میں مولانا ابوالکلام نے کراچی کی قرارداد کو زیادہ صاف اور واضح لفظوں میں پھر پیش کیا۔ اس کے نتیجے میں تمام ملک میں جلسوں کے انعقاد اور کراچی قرارداد کی توثیق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بمبئی، آگرہ، لاہور وغیرہ کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد ہی نے کی۔ ان کی اشتعال انگیز اور پُر جوش تقریروں کی بنا پر ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کے دوران اُنھوں نے جو عدالتی بیان دیا وہ مثالی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ قول فیصل کے نام سے اسی سال شائع ہوا اور بعد میں بھی متعدد مرتبہ اس کی اشاعت ہوتی رہی۔

جمعیۃ العلمائے ہند کے جلسوں کی تمام تقریریں اُردو میں ہوتی تھیں۔ اس کے بھی تمام خطبات صدارت کتابی صورتوں میں شائع ہوئے۔ اس کے افتتاحی اجلاس کے پہلے جلسے کی صدارت مولانا

عبدالباری فرنگی محلی اور دوسرے جلسے کی صدارت مفتی کفایت اللہ نے انجام دی تھی۔ تیسرے اور چوتھے اجلاس میں مولانا ابوالکلام، شیخ الہند مولانا محمودالحسن اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدور تھے۔ شیخ الہند مولانا محمودالحسن اس کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے جامعہ ملیّہ اسلامیہ دہلی کی رسم افتتاح بھی انجام دی تھی۔ اور اس موقع پر ایک تقریر بھی کی تھی، جس میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اسلامی جامعہ کے قیام کو سراہا اور مسلمانوں کو قومی محسوسات اور اسلامی فرائض کی ادائیگی کی نصیحت کی۔ جمعیۃ کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور جو خطبہ دیا وہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں اُنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریزوں کو قرار دیا۔ اور ترکِ موالات کی حمایت کی۔ جمعیت کے دیگر رہنماؤں میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید، مولانا نثار احمد، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد میاں اور مولانا عبیداللہ سندھی امتیاز رکھتے ہیں۔ حسین احمد مدنی نے جمعیۃ کے اجلاس منعقدہ کوکناڈا ۱۹۲۳ء لاہور ۱۹۴۲ء اور سہارن پور ۱۹۴۵ء کی صدارت کی تھی۔ ان جلسوں میں اُنھوں نے جو خطبات دیے وہ کتابی صورتوں میں شائع ہوئے۔ مولانا احمد سعید کی تقاریر کا مجموعہ تقاریر مولانا احمد سعید دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد پر علی برادران کے ساتھ کراچی میں مقدمہ چلا تھا۔ اُنھوں نے اس سلسلے میں جو عدالتی تقاریر کی تھیں وہ کراچی کا تاریخی مقدمہ میں شامل ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی نے کانگریس کے جلسوں سے بھی خطاب کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام نے جمعیۃ العلمائے ہند کے دو سالانہ جلسوں کی صدارت کی تھی۔ ۱۸؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کے اجلاس لاہور میں اُنھوں نے ایک نہایت مفصل خطبہ تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں پیش کیا تھا جس میں مسئلہ خلافت، ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال اور جمعیت کو موضوع بنایا۔ دوسرا خطبہ مارچ ۱۹۴۲ء کے اجلاس لاہور میں دیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ الہند اور مولانا محمودالحسن کے شاگرد تھے اور سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک طویل عرصے تک ہندوستان سے باہر رہے تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آ کر متعدد جلسوں سے خطاب کیا اور اپنا مذہبی اور سیاسی منشور عام کیا، جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ایک اسلامی، اشتراکی مملکت کے قیام پر مبنی تھا۔ ان کے یہ خطبات مجموعے کی صورت میں دہلی سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئے۔ مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا سیّد سلیمان ندوی، شاہ معین الدین اجمیری، وغیرہ نے اس کے مختلف جلسوں کی صدارت کی اور خطبات پڑھے۔

جمعیۃ العلمائے ہند کا سیاسی نقطۂ نظر کانگریس کے بڑا قریب تھا۔ اس نظریے سے اختلاف

رکھنے والے علما نے جمعیت سے علاحدگی اختیار کر کے جمعیۃ العلمائے اسلام تشکیل دی جس نے بہت جلد مسلم سیاست کے میدان میں اہمیت اور مقام حاصل کرلیا۔ یہ دوقومی نظریے پر ایمان رکھتی تھی۔ اس کا اشتراکِ عمل مسلم لیگ کے ساتھ تھا، اور تحریکِ پاکستان کے دوران اس تحریک اور مسلم لیگ کے مقاصد کو بڑی تقویت پہنچائی، بلکہ اس کی کوششوں کی وجہ سے نظریہ پاکستان کا مذہبی پہلو زیادہ اُجاگر ہوا۔ اس کے روح رواں مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ اور اسے مولانا اشرف علی تھانوی کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے متعدد جلسوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے خطبات پڑھے، تقاریر کیں۔ ان کا مثالی خطبۂ صدارت صوبہ پنجاب جمعیۃ العلمائے اسلام کانفرس منعقدہ لاہور ۱۹۴۶ء تھا جو ہمارا پاکستان کے نام سے شائع بھی ہوا۔ اس میں مولانا عثمانی نے مختلف پہلوؤں سے جمعیۃ اور مسلم لیگ کے تعلق پر نظر ڈالی ہے اور تحریکِ پاکستان اور اس کے مخالفین کے الزامات کا جائزہ لے کر تمام خدشات کا مدلل جواب دیا ہے۔ مولانا عثمانی کے خطبات کا مجموعہ خطبات عثمانی کے نام سے لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ہمارا پاکستان کے علاوہ خطبۂ صدارت اجلاس مسلم لیگ منعقدہ میرٹھ بھی ہے اور وہ مفصل پیغام بھی جو اُنھوں نے بنام کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام منعقدہ کلکتہ ۱۹۴۵ء بھیجا تھا۔ اس پیغام میں اُنھوں نے متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید اور پاکستان کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا تھا۔ خطباتِ عثمانی کے آخر میں ان کی وہ گفت گو بھی درج ہے جو اس وقت مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کے حل پر مولانا حسین احمد مدنی سے دیوبند میں ہوئی تھی۔

مجلس احرار اسلام ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلسل ہنگاموں اور تحریکوں میں الجھی رہی۔ یہ اس کی مقبولیت کا دور تھا۔ بحیثیت مجموعی تحریکِ آزادی اور پھر تحریکِ آزادی کشمیر میں اس نے سرگرم اور پُر جوش حصہ لیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق، ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی اور عطا اللہ شاہ بخاری اس کے ممتاز رہنما تھے۔ یہ سب اس کے مختلف ہنگامی سیاسی تحریکوں کے جلسوں میں شریک ہوکر خطاب کرتے۔ اپنی سرگرمیوں اور تقریروں کے طفیل اُنھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان میں مثالی خطیب بھی تھے جو اپنے جوشِ بیان اور زورِ خطابت کے ذریعے مشہور بھی ہوئے۔ اُنھوں نے مختلف جلسوں میں جو خطبات دیے ان کا مجموعہ مجلس کی جانب سے احرار اسلام کے خطبات اور قراردادیں مطبوعہ ہے۔ ان تمام رہنماؤں میں زورِ خطابت اور جوشِ بیان کے لحاظ سے عطا اللہ شاہ بخاری کو امتیازی اور مثالی مقام حاصل ہے۔ برِ عظیم کے خطیبوں میں چند ہی رہنما ان

کے ہمسر ہیں جنھوں نے تحریکِ آزادی میں اپنی خطابت کے ذریعے سے ہل چل اور ہیجان پیدا کیا۔

خدائی خدمت گار جماعت کے تقریباً تمام تر جلسے بھی اُردو میں منعقد ہوتے رہے۔ سوائے ان جلسوں کے جن کا انعقاد صوبہ سرحد کے دور دراز دیہاتوں میں ہوتا رہا۔ لیکن ایسے جلسوں میں بھی اُردو میں تقریریں ہوتی تھیں۔ خاکسار تحریک کے رہنما علامہ مشرقی بھی پُر زور خطابت کے سبب خاصے نمایاں ہیں۔ مولانا بہادر یار جنگ بھی کچھ عرصے تک اس تحریک سے وابستہ رہے اور اس کے تحت منعقدہ جلسوں سے خطاب بھی کیا۔ ۱۸/اگست ۱۹۴۰ء کو خاکسار کیمپ حیدرآباد دکن میں اُنھوں نے خالص اسلامی تحریک کے عنوان کے تحت ایک پُر زور تقریر بھی کی۔

دیگر سیاسی جماعتوں کے جلسوں کے لیے بھی اُردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ چناں چہ ان تمام منعقدہ جلسوں میں اس زبان میں خطبات دیے جاتے تھے۔ بعض جماعتیں جو انگریزی کو بھی ذریعہ اظہار بناتی تھیں ان کے جلسوں میں بھی اُردو میں تقاریر کی جاتیں اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ بعض جلسے محض دینی ضرورتوں کے تحت منعقد ہوتے تھے۔ ان میں اُردو ہی کو عام طور پر ذریعہ اظہار بنایا جاتا تھا۔ سندھ مسلم پولٹیکل کانفرنس کا ایک اجلاس ۷؍جولائی ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا تھا اس کی صدارت ڈاکٹر شیخ محمد عالم نے کی تھی۔ اپنے اُردو خطبے میں اُنھوں نے تفصیل سے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا جائزہ لیا اور محکومی اور غلامی کا احساس دلا کر آزادی کے حصول کی جدوجہد میں شریک ہونے کی تلقین کی ہے یہ خطبۂ صدارت اسی سال شائع ہوا تھا۔ جماعت اسلامی احیائے اسلام کے جذبے کے تحت ۱۹۴۱ء میں تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حال مذہبی احیا میں دیکھتے تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے جماعت کے منعقدہ جلسوں اور دیگر مقامات پر جو خطبات دیے وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں خصوصاً سیاسی پہلو کی تشریح پر بھی مبنی تھے۔ یہ سب رسالوں کی صورت میں پٹھان کوٹ اور لاہور سے شائع ہوئے تھے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۹ء کے اجلاس میں بعض مقررین نے اُردو میں تقریریں کی تھیں مولانا محمد علی نے علمائے ہند کی ایک کانفرنس منعقدہ کان پور دسمبر ۱۹۲۹ء کی صدارت کی تھی۔ یہ خطبہ صدارت اُردو میں تھا، جو اسی سال کتابی صورت میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا محمد علی نے نظام اسلام کے عنوان کے تحت مسلمانوں کی اس وقت کی حالت اور ان کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

جمعیۃ الانصار، انجمن خدام کعبہ، انجمن نظر بندان اسلام کے جو اجلاس منعقد ہوئے ان تمام میں

دیے جانے والے خطبات اُردو زبان میں تھے۔

ان تمام مقررین میں، جنھوں نے تحریکِ آزادی کے دوران مختلف جماعتوں، تحریکوں اور اداروں کے تحت خطاب کیا، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا بہادر یار جنگ اور مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کو اپنے زورِ بیان اور جوشِ خطابت کے اثرات کے اعتبار سے جو امتیاز اور مقام حاصل ہوا، وہ کسی اور کو حاصل نہ ہوگا۔

مولانا ابوالکلام تحریکِ آزادی کی تاریخ میں ایک مثالی خطیب کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ابتداءً ان کی تقریریں محض مذہبی موضوعات کی حامل ہوتی تھیں۔ لیکن جب وہ اتحادِ اسلامی کے جذبات اور بنگال کی قومی انقلابی تحریک سے متاثر ہوئے تو اپنی تقریروں میں قومی اور سیاسی مسائل کو جگہ دینے لگے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدمِ تعاون کے دوران ان کے فنِ خطابت نے بڑا عروج حاصل کیا۔ ان تحریکوں میں گو علی برادران زیادہ فعال اور مستعد تھے لیکن حقیقتاً مسلمانانِ ہند میں بیداری اور جوش وولولہ پیدا کرنے میں مولانا آزاد کی خطابت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ الہلال میں مولانا نے ایک نیا اُسلوبِ تحریر اختیار کیا اور تحریر کو تقریر بنا دیا تھا۔ ان کے مضامین میں زورِ خطابت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی ولولہ انگیز اور پُر جوش خطابت سے مسلمانوں میں نہ صرف جوش اور ہیجان پیدا ہوا بلکہ ان کے اندر اپنی قوت کا احساس اور جوشِ جہاد بھی پیدا ہو گیا۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں نے روشن خیال مسلم طبقہ پر گہرا اثر ڈالا۔ برِّعظیم کی ہر اجتماعی، سیاسی و قومی تحریک ان کی خطابت سے متاثر ہوئی۔ کانگریس، مجلسِ خطابت، جمعیۃ العلمائے ہند میں جو خطبات مولانا نے دیے وہ اہم قومی اور سیاسی مسائل پر ہیں۔ مختلف سیاسی، قومی جماعتوں میں اُنھوں نے جو خطبات دیے وہ علاحدہ بھی کتابی صورتوں میں شائع ہوئے اور ان جماعتوں کی سالانہ روئدادوں میں درج ہوئے۔ مولانا کے تمام اہم خطبات کا مجموعہ خطباتِ ابوالکلام آزاد کے نام سے شائع ہوا تھا۔

مولانا محمد علی بھی تحریر اور تقریر میں اپنے جوش اور ولولہ کی وجہ سے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے طالب علمی کے دور میں ہی سیاسی آزادی کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کرنے لگے تھے۔ اجنبی حکومت کو دوام بخشنے سے انھیں کبھی سروکار نہ تھا۔ اس لیے اُنھوں نے خیال کیا تھا کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کی باعزت مصالحت ہونی چاہیے مگر یہ ان کی ملت کے حقوق کی ضامن ہو تاکہ ملت کو ایک اور غلامی سے، جو اس مرتبہ خود اس کے ہم وطنوں کے ماتحت ہوگی، محفوظ رکھ سکے۔ ان کی ساری

جدوجہد اسی نقطہ کے محور پر گھومتی رہی۔ انھیں تحریر و تقریر دونوں میں بے پناہ قوت حاصل تھی۔ وہ اپنے جوشِ بیان اور زورِ خطابت کے ذریعے یہی خیال ظاہر کرتے رہے کہ وہ مسلم ملت کی جداگانہ ہستی کو اُبھرتی ہوئی ہندوستانی قوم میں ضم کردینے کے لیے تیار نہیں، اور یہ کہ اجنبی حکومت کو وہ اب تک اس ملک میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے۔ ان کے خیالات اور موضوعاتِ بحث ہیجانی اور خطیبانہ تھے۔ ان کے زورِ خطابت نے مسلم ملت کے ان جذبات کو اُبھارا جو کبھی خوابیدہ نہیں تھے۔ ان کی تقریروں نے مسلمانوں میں ایک مرتبہ پھر اعتماد پیدا کردیا۔ مسلم لیگ، کانگریس، مجلس خلافت، گول میز کانفرنس اور دیگر جلسوں میں ان کے خطبات ان کی شخصیت اور ان کے نظریے اور طرزِ فکر کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے تمام خطبات مطبوعہ ہیں۔ علاحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوتے رہے اور مجموعوں کی صورت میں بھی۔ جماعتوں اور اداروں کی سالانہ رودادوں میں بھی ان کے خطبات درج ہیں۔ ''پہلی تقریر جلسہ عام مسلم لیگ'' منعقدہ امرتسر جوجلیاں والا باغ کے سانحہ کے سلسلے میں تھی، لکھنؤ سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اور اسی دوران کانگریس کا جو اجلاس امرتسر میں ہوا اس میں کی گئی تقریر بھی علاحدہ طور پر شائع ہوئی۔ آخری تقریر گول میز کانفرنس بھی کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ کوکناڑا کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۲۳ء کا خطبۂ صدارت ترجمہ ہوکر حیدرآباد دکن سے اپریل ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی سیاسی اُلجھنیں کے نام سے شائع ہوا۔ یہ پہلے بھی اُردو میں ترجمہ ہوکر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوچکا تھا۔ ''کراچی کے تاریخی مقدمہ'' میں جو اہم بیان دیا وہ کراچی کا تاریخی مقدمہ، رہنمایان ہند اور مقدمہ کراچی نامی مذکورہ کتابوں میں شامل اشاعت ہوا۔ الٰہ آباد کانفرنس میں ۱۱رمئی ۱۹۲۱ء کا خطبۂ صدارت دہلی اور میواڑ پولیٹیکل کانفرنس منعقدہ ۲۳رنومبر ۱۹۲۰ء کا خطبہ صدارت، ان کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ علمائے ہند کی کانفرنس منعقدہ کان پور ۱۹۲۹ء کا خطبۂ صدارت کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مولانا بہادر یار جنگ لسان الامت کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ ان کی تقریروں کا اصلی میدان مسلم لیگ کے اجلاس اور خاکسار تحریک اور مجلس اتحاد المسلمین کے جلسے تھے۔ ان کی تقریر میں فصاحت، بلاغت اور بدائع تینوں جوہر ہوتے تھے۔ ان کی تمام تر تقریروں کا موضوع اسلام کی حقانیت اور فوقیت کے ساتھ عام مسلمانوں کو یہ یاد دلانا تھا کہ یہ ملک تمہارا مفتوحہ ہے اور تم بحیثیت قوم اس کے کشور کشا اور فاتح ہو۔ تمھیں سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیے اور اپنے مذہب کی تعلیمات سے

مطابق شریعت اور اسلام کا سیاسی نظام نافذ کرنا چاہیے۔ اگر تمھیں اس ملک میں رہتے ہوئے یہ ناممکن نظر آتا ہے تو تمھیں چاہیے کہ ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی کوششوں میں مستعد ہو جاؤ، جو مسلم لیگ کر رہی ہے اور جو قائداعظم چاہتے ہیں۔ بہادر یار جنگ نے تحریر سے زیادہ تقریر اور خطبات ہی سے کام لیا تھا۔ سارے برِعظیم میں اُنھوں نے مختلف مقامات پر تقریریں کیں اور اپنے زورِ بیان سے مسلمانوں میں ہیجان اور اضطراب پیدا کر دیا تھا، اور ان میں جدوجہد کے لیے اعتماد کا اضافہ کر دیا۔ خاص طور پر قائداعظم نے ان کے زورِ خطابت سے مسلم لیگ کے مقصد کو خوب فائدہ پہنچایا تھا۔ بہادر یار جنگ مسلم لیگ کے مختلف جلسوں میں شریک ہو کر تقریریں کرتے۔ قراردادِ پاکستان کی حمایت میں ان کی تقریر مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء مدلل اور پُر جوش تھی۔ قائداعظم کے زیرِ صدارت مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۳ء میں آخری مرتبہ ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا اور نظریۂ پاکستان کی تشریح و توضیح کی تھی۔ یہ بلاشبہ ان کی نہایت کامیاب سیاسی تقریر تھی۔

بہادر یار جنگ کی تقریروں کے عام اثرات کی داستانیں اور حکایتیں عام ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تقریروں کی حفاظت کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ان کے خطبات کے دو مختصر مجموعے ہیں۔ ایک خطبات قائد ملت حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا اسے شاہد حسین رزاقی نے مرتب کیا تھا۔ اور دوسرا مجموعہ سیاسی تقاریر بہادر یار جنگ کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری بہت معروف اور مقبول مقرر تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ دور افتادہ علاقوں میں بھی اُردو کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں میں تقریر کرتے تھے۔ اپنی تقریروں میں خصوصیت سے برطانوی حکومت کے خلاف جذبات استوار کرتے۔ مجموعی طور پر اپنی خطابت کے ذریعے اُنھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں اجتماعی نظام کی راہ پیدا کی۔ مجلس احرار اسلام کے ممتاز رہنما تھے۔ چناں چہ اپنی خطابت کے ذریعے مجلس کو بہت مقبول اور موثر بنا دیا تھا۔ اس کی مختلف تحریکوں میں یہ اس کے شریک رہے، اپنی خطابت کے طفیل کئی مرتبہ قید و بند کی سزائیں بھی برداشت کیں، ان کی تقریریں منتشر حالتوں میں مطبوعہ ملتی ہیں۔ کوئی نمایندہ یا مکمل مجموعہ ان کی تقاریر کا مرتب نہیں ہوا۔

دیگر مقررین میں جنھوں نے اپنی خطابت کے ذریعے جلسوں کو ان کے مقصد کے لحاظ سے کامیاب بنایا۔ مختلف قومی اور سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کو آگے بڑھایا، ظفر علی خان اور حسرت موہانی کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے دوسرے اوصاف کے مقابلے میں یہ امتیازی وصف نہیں ہے۔

(۴) مکتوبات

خط بنیادی طور پر ایک شخصی اور نجی تحریر ہے۔ ماسوا اس صورت کے کہ کوئی شخص کسی مجموعہ افراد کو خط کے ذریعہ خطاب کرے۔ اس لیے اصولاً اس کا افادہ اور اثر نہایت محدود ہوتا ہے۔ مگر عملاً جب خط منظر عام پر آ کر مطالعہ کا موضوع بن جاتے ہیں تو ادب اور معاشرہ کا قیمتی ذخیرہ بن جاتے ہیں۔ تمام خط اپنے موضوعات کے اعتبار سے اپنی جگہ اپنا ایک مقصد رکھتے ہیں۔ ان سے علمی اور معلوماتی فوائد بھی حاصل ہوسکتے ہیں مگر پرانے خطوط کی اہمیت کی ایک بڑی بنیاد وہ تاریخی، معاشرتی اور سوانحی مواد ہے جو ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر خط کا موضوع اور مقصد اجتماعی ماحول اور اس کے مسائل ہیں تو یہ اس تعلق سے مکتوب نگار کی شخصیت کے رجحان اور طرز فکر کا مظہر ہوتا ہے اور جب وہ اپنے ماحول کے مسائل اور رجحانات کو پیش کرتا ہے تو اس طرح اس کی حیثیت ایک خطاب کی ہوتی ہے جو اظہار خیال کے لیے تحریر کی کسی صنف میں بھی ہوسکتا ہے اور تقریر میں بھی۔ چناں چہ ماحول کے مسائل اور اس کے انقلابات کو پیش کرنے والے خطوط اور اگر ان کا مخاطب ایک اجتماعی ماحول ہے تو یہ اپنی جگہ متاثر کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

غالب کے خطوط کی اشاعت نے ہر بڑے ادیب و شاعر اور رہنما کے خطوط کی ترتیب اور اشاعت کی روایت ڈال دی تھی۔ عظیم شخصیتوں کے خطوط اپنے مقاصد اور مباحث کے اعتبار سے علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیّد احمد خاں جس طرح اپنے افعال و اعمال اور تحریر و تقریر میں مدعا اور مقصد کے داعی ہیں اسی طرح سے ان کے مکاتیب بھی ان کی زندگی کے مقاصد کے آلۂ کار رہی ہیں۔ ان کے خطوط بھی ان کی جگہ دیگر تحریروں کی طرح پیغام کی حدود سے متجاوز ہوکر تبلیغ اور خطابت کی حد تک جا پہنچے ہیں۔ سیّد احمد خاں کے خطوط ان کی شخصیت اور ان کے کاموں کے تعین میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم سیّد احمد خاں کی سیاسی، تہذیبی اور علمی سرگرمیوں کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ ان میں شخصی معاملات زندگی کو بہت کم دخل ہے۔ زیادہ تر خطوط میں مدرسۃ العلوم، تہذیب الاخلاق، سائنٹی فک سوسائٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور اسی قسم کے دوسرے تعلیمی و تہذیبی کاموں اور مقاصد کا ذکر ہے۔

سیّد احمد خاں کے کچھ خطوط کو، جنھیں حالی نے حیات جاوید کے لیے جمع کیا تھا، مولوی وحید الدین سلیم نے اپنے رسالہ معارف میں بالاقساط شائع کیا۔ سیّد راس مسعود نے کچھ مزید خطوط سیّد احمد خاں

کے ملنے والوں سے فراہم کر کے خطوط سرسیّد کے نام سے ایک مجموعہ بدایوں سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ اس کا مقدمہ مولوی عبداللہ خاں نے تحریر کیا تھا، جس میں اُنھوں نے سیّد احمد خاں کے زمانے کی عام حالت، ان کی جدوجہد اور تالیف و تصنیف کا حال لکھا ہے۔ بعد میں ان کے خطوط کے دیگر مجموعے مولانا اسمٰعیل پانی پتی اور مشتاق حسین نے مرتب کیے۔

سیّد احمد خاں کے دور کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں خطوط سرسیّد کے علاوہ محسن الملک کے مکاتبات الخُلاّن ہیں جو فی الحقیقت سیّد احمد خاں کے مذہبی عقائد اور خیالات کی تائید و تشریح میں ہیں۔ یہ آٹھ خطوط کا مجموعہ ہے جس میں وہ تین خط بھی شامل ہیں جو اُنھوں نے سیّد احمد خاں کی تائید میں اپنے ایک دوست کی تحریر کے جواب میں لکھے تھے۔ یہ مجموعہ علی گڑھ سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خطوط کا مجموعہ مکاتیب مولوی امین زبیری نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ بالخصوص علی گڑھ اور حیدرآباد کے واقعات و حالات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

حالی کے مکاتیب میں حقیقت کی پُرخلوص سادہ بیانی ہے اور ان کے خط ان کی ذات سے زیادہ ان کے مکتوب الیہ کے حالات اور ذہنی کوائف پر روشنی ڈالتے ہیں ان میں مکتوب الیہ کے لیے اطمینان بخش پیغام تو ملتا ہے مگر دل میں جوش پیدا کرنے والے عناصر نہیں۔ مدرسۃ العلوم سیّد احمد خاں کی تحریک کی ناقدری اور مسلمانوں کی عام حالت پر جو خطوط اُنھوں نے تحریر کیے تھے، وہ بہت پُردرد ہیں۔ اکثر خطوط قوم کی ناقدری کا مرقع ہیں۔ علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کا ذکر اپنے خطوط میں جابجا کرتے ہیں ان کے مکاتیب کا ایک ضخیم مجموعہ اسمٰعیل پانی پتی سے ۱۹۲۴ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔

شبلی کے خطوط کا مجموعہ مکاتیب شبلی کے نام سے سیّد سلیمان ندوی نے دو جلدوں میں مرتب کر کے ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک کے خطوط شامل ہیں۔ شبلی کی زندگی کا یہ سارا حصہ مختلف مذہبی اور قومی خدمات اور مسلسل مصروفیات میں گزرا تھا۔ ان خطوط میں ملکی، قومی، مذہبی، علمی اور اصلاحی خیالات اور مسائل کے علاوہ شبلی کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ خطوط کے موضوعات ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں قومی ہمدردی، جذبۂ ایثار، اصلاح پسندی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔

مولوی نذیر احمد کے خطوط کی انفرادیت یہ تھی کہ اُنھوں نے اسے نصیحت اور ہدایت کا ذریعہ بنایا

تھا۔ یہ خطوط اُنھوں نے اعظم گڑھ، حیدر آباد اور دہلی سے اپنے بیٹے بشیرالدین احمد خاں کو لکھے تھے۔ ان کا مقصود بیٹے کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ہدایت تھا۔ بیشتر خطوط درسی مسائل اور تعمیر و اصلاح کردار سے متعلق ہیں اور کچھ اپنے مشاغل، مقامی سیاست کی الجھنوں اور خانگی زندگی کے سنجیدہ مسئلوں پر مبنی ہیں بعض خطوط میں قومی زندگی کے اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں اور چند خطوط میں انگریزی زبان اور انگریزی تمدن کی تمام خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ہے۔ اس دور میں ان خطوط کے مجموعہ موعظۂ حسنہ کی چھ اشاعتیں ہوئیں۔ پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۸۸۷ء میں اور چھٹی مرتبہ دہلی سے شائع ہوا۔

سیّد احمد خاں کے زمانہ سے تحریکِ خلافت کی شروعات تک کئی اکابر کے مکتوبات کے مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں داغ، امیر مینائی، شوق قدوائی، ریاض خیرآبادی، اکبرالہ آبادی، سیّد ناصر علی اپنے مخصوص ماحول اور ذاتی دلچسپیوں کے رنگ میں خطوط لکھتے رہے۔ اس کے بعد کے دور میں علامہ اقبال کے خطوط، ان کے خیالات اور نظریات کا آئینہ ہیں۔ ان میں علامہ اقبال کے مشاغل اور مصروفیات کا حال ہے۔ اپنے دوستوں، اکابرین اور سیاسی رہنماؤں کے نام ان کے کثیر خطوط میں زندگی، ماحول، مذہب اور سیاست کے بےشمار مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ اس وقت کے سیاسی مسائل اور ان پر علامہ کے تاثرات ان کے خطوط میں جابجا بیان ہوئے ہیں۔ اسلام، مسلمان اور قومیت پر ان کے نظریات، ان کے خطوط میں بھی زیادہ وضاحت اور تشریح سے عام ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی اور سیاسی مسائل پر اُنھوں نے اپنے مخصوص نظریے کے ساتھ مختلف خطوط میں اظہار خیال کیا ہے۔ متحدہ قومیت کے نظریہ کی تردید میں مضامین کے علاوہ اُنھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے خطوط ہی کو ذریعہ بنایا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام لکھے ہوئے خطوط ترجمے کے ساتھ اس زمانہ میں متعدد مرتبہ شائع ہوئے جن میں اُنھوں نے قائداعظم کو دوبارہ سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ کرلیا تھا۔ جب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کے مستقبل سے مایوس ہوکر انگلستان چلے گئے تھے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے اس دور میں شائع ہوئے تھے۔ اقبال نامہ دو حصوں میں لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا اور شاد اقبال کے نام سے ڈاکٹر محی الدین قادری نے اُردو خطوط کا ایک اور مجموعہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا تھا۔ یہ علامہ اقبال نے کشن پرشاد کو تحریر کیے تھے۔

علی برادران کے زیادہ خطوط سیاسی اور قومی مسائل پر تحریر ہوئے تھے۔ ان دونوں کی زندگی کا

بیشتر حصہ قومی اور سیاسی تحریکوں میں صرف ہوا تھا۔ چناں چہ جن جن تحریکوں میں وہ شریک رہے، قوم اور ملک کے لیے جو کوششیں اُنھوں نے کیں اور جوان کے عزائم تھے۔ یہ سب معاملات اور حالات، ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ مولانا شوکت علی کے زیادہ تر خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ کچھ اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا محمد علی کے خطوط بھی بڑی تعداد میں غیر مطبوعہ ہیں۔ کچھ مختلف اخبارات اور رسائل میں طبع ہوئے۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ عبدالقادر سروری نے مرتب کر کے دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔ علی برادران کے خطوط بلاشبہ برِّعظیم کی ہنگامی سیاست کے انقلابات اور اس کے عروج وارتقا کی داستان پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح کے خطوط مولانا عبدالباری فرنگی محلّی کے ہیں جو غیر مطبوعہ حالت میں کسی طرح ضبط ہونے سے رہ گئے تھے[1] ان خطوط کے ذریعہ جو مختلف مشاہیر کو لکھے گئے، ان کی سیاسی اور قومی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان سے انجمن خدام کعبہ کی تحریک اور تحریکِ خلافت کی تاریخ کی ترتیب کی جاسکتی ہے۔ اس دور کے بیشتر اکابرین نے بھی اپنے خطوط میں اپنے زمانہ کی تحریکات کے جذبات و ہیجانات کو قلم بند کیا۔ حکیم اجمل خاں مولانا ظفر علی خان، مشیر حسین قدوائی، مفتی کفایت اللہ، مختار احمد انصاری، شعیب قریشی، مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حسرت موہانی، سیّد جالب دہلوی، مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سیّد رضا علی، مولانا بہادر یار جنگ، قومی اور سیاسی رہنما ہیں جن کے خطوط عام ہوئے۔ ان اکابرین نے برِعظیم کی قومی اور سیاسی تحریکوں کو مجموعی طور پر انفرادی طور پر بڑا متاثر کیا تھا اُنھوں نے مختلف تحریکوں میں جس حیثیت سے شرکت کی اور اسے اپنے طور پر متاثر کیا، اسے ان کے خطوط میں بھی دیکھا جاسکتا ہے لیکن ان میں سے اکثر کے خطوط بہت بعد میں منظر عام پر آئے۔ ان میں سے بعض رہنماؤں کے خطوط منتشر حالتوں میں کہیں کہیں شائع ہوئے۔

اہم قومی رہنماؤں میں سے مولانا ابوالکلام اور سیّد سلیمان ندوی کے خطوط بھی اسی ذیل میں ہیں۔ غبار خاطر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام مولانا ابوالکلام کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مکاتیب قلعہ احمد نگر میں ایام اسیری کے دوران لکھے گئے تھے۔ ان کے مضامین علمی موضوعات اور فلسفیانہ مباحث سے متعلق ہیں۔ بعض مکاتیب میں مولانا نے اپنی گرفتاری، قلعہ احمد نگر کی زندگی، وہاں کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا آزاد نے غبار خاطر کا دوسرا حصہ سیاسی مکاتیب پر مشتمل مرتب کیا تھا لیکن یہ طبع نہ ہوسکا۔ مولانا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ

کاروانِ خیال تھا جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا آزاد اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مابین تحریر ہونے والے خطوط ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے بہت سے تاریخی واقعات کا علم ہوتا ہے اور ادب و سیاست پر ضمنی اشارات بھی ملتے ہیں۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی کے وہ خطوط نہایت اہمیت رکھتے ہیں جو اُنھوں نے وفدِ خلافت کے ساتھ یورپی ممالک کے سفر کے دوران تحریر کیے تھے۔ ان میں خلافت کا مسئلہ وفدِ خلافت کی مجموعی جدوجہد، ترکی کے حالات، واقعات و مسائل اور دیگر قومی اور سیاسی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں تفصیل اور تجزیہ کے ساتھ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے یورپ، ہندوستان اور دنیائے اسلام کی سیاست کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ ان کے خطوط مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، وغیرہ کے نام تھے۔ یہ خطوط زیادہ تر رسالہ ہمدم اور پھر زمیندار، خلافت، وکیل میں شائع ہوئے تھے۔

برِّ عظیم کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے لکھے جانے والے خاص خطوط میں زیادہ تر، ضرورتاً انگریزی زبان میں تحریر ہوئے لیکن اس سلسلے میں ایک اہم اُردو خط لازمی تذکرہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں ایک شخص محمد عبدالقدیر بلگرامی نے بدایوں کے اخبار ذوالقرنین میں گاندھی کے نام ایک کھلا خط شائع کرایا تھا جس میں اس امر پر زور دیا کہ برِّ عظیم کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اُنھوں نے صوبوں کی ایک فہرست بھی دی اور تقسیم ہند کا نظریہ تفصیلی پس منظر کے ساتھ پیش کیا۔ بعد میں یہ خط کتابی صورت میں بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں اور پھر ۱۹۲۵ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا گیا۔

جو خطوط برِّ عظیم کے سیاسی مسئلہ کے حل پر اکابرینِ سیاست کے مابین انگریزی میں تحریر ہوئے، ان میں سے اہم اور مفید خطوط کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں وہ مراسلت زیادہ اہم تھی، جو گاندھی اور قائداعظم کے مابین، راج گوپال اچاریہ کی کوششوں سے ہونے والی سمجھوتہ کی گفت گو کے دوران ہوئی۔ اس مراسلت کو لیاقت علی خاں نے مرتب کیا اور یہ دہلی سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُردو میں اس کے کئی ترجمے شائع ہوئے۔ مسلم لیگ کی جانب سے اس کا اُردو ترجمہ دہلی سے ۱۹۴۴ء میں طبع ہوا۔ ایک ترجمہ مسلم ضیائی نے کیا تھا، جو گاندھی جناح مراسلت کے نام سے حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ ایک اور ترجمہ سیّد عاشق علی مدیر اخبار الامان اور وحدت دہلی کے اہتمام سے جناح

گاندھی مراسلت کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے آخر میں مسلم لیگ کی وہ قرارداد بھی درج ہے جو راج گوپال اچاریہ کے ''راجاجی فارمولا'' کے بعد موضوع بحث بنی تھی۔

اسی طرح ایک اور مراسلت گاندھی، نہرو، بوس اور قائداعظم کے مابین ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ اس مسئلہ پر تھی کہ ۱۹۳۵ء کے آئین کی رو سے ہونے والے انتخابات کے بعد لیگ اور کانگریس مل کر ایک مخلوط حکومت بنائیں گے۔ مگر جب کانگریس بڑی تعداد میں منتخب ہوگئی تو اس نے اپنی حکمت عملی بدل دی اور لیگ کے ارکان سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں اور اپنے پارلیمانی نظام کو ختم کردیں اور یہ وعدہ کریں کہ آئندہ لیگ کے تحت کوئی امیدوار کھڑا نہیں کریں گے۔ اس پیش کش کو لازماً مسترد کردیا گیا۔ یہ ساری مراسلت انھیں مباحثوں پر مشتمل تھی۔ اس کے مجموعہ کا ایک اُردو ترجمہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ ایک اور اُردو ترجمہ قائدین کے خطوط جناح کے نام عبدالرحمٰن سعید نے کیا تھا، جو حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی مراسلت کا ایک اور اُردو ترجمہ گفتگوئے مصالحت کے نام سے دو حصوں میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے پہلے حصہ میں قائداعظم اور جواہر لال نہرو کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا ترجمہ شامل ہے اور دوسرے حصہ میں قائداعظم اور گاندھی کے مابین ہونے والی خط و کتابت کا ترجمہ درج ہے۔ ناشر نے شروع میں ایک دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں ملک کی صورتِ حال کے تذکرے کے بعد مسلمانوں کو ہندوؤں کے عزائم و مقاصد سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں باہمی تنظیم، اتفاق و اتحاد کی ضرورت کا احساس دلا کر انھیں کانگریس کی تحریک کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ علامہ اقبال نے جو خطوط قائداعظم کو ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے تھے، ان کا مجموعہ قائداعظم نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ یہ خطوط مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کی نسبت علامہ اقبال کے خیالات کی کامل وضاحت اور ترجمانی کرتے ہیں اور قائداعظم کو جو اس وقت مسلم ہندوستان کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ عزم و عمل کی دعوت دیتے تھے۔ ان خطوط کا ترجمہ عبدالرحمٰن سعید نے کیا تھا، جو حیدرآباد دکن سے تین مرتبہ شائع ہوا۔

گاندھی اور اشتراکی رہنما پی سی جوشی کے درمیان کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے مابین تعلقات اور ان کی وضاحت کے لیے خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں کمیونسٹ پارٹی کے رجحانات اور کانگریس کے بارے میں اس کے رویہ کا علم ہوتا ہے۔

یہ مراسلت ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ اس کا اُردو ترجمہ گاندھی جوشی خط و کتابت کے نام سے بمبئی سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب میں چودہ خطوط ہیں۔ اس کے بعد ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی ایک سیاسی تجویز دی گئی ہے جو اتحاد کے ضمن میں ہے۔ دوسرا ضمیمہ گاندھی کی رہائی کے سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی کے مطالبہ پر مبنی ہے۔ تیسرا ضمیمہ ''اپنے ملک کو جاپانی حملہ آوروں سے بچاؤ'' کے عنوان کے تحت ہے۔ چوتھے ضمیمے میں گاندھی کی رہائی پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۵) سفرنامے

سفرنامہ اس اعتبار سے ادبیات کی ایک مفید صنف ہے کہ اس سے معاشرے کے تاریخی و جغرافیائی، مذہبی و تہذیبی اور معاشرتی و سیاسی حالات کا علم ہوتا ہے۔ ان سے اکثر تاریخیں مرتب ہوئی ہیں اور جغرافیہ کے بہت سے نقشے دست یاب ہوئے ہیں۔ اچھے سفرناموں میں انسانی علوم کے مطالعے کے وافر امکانات پائے گئے ہیں۔ کسی ملک کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا اندازہ سفرناموں سے خوبی کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ افراد کے جذبات کی تشکیل اور ان کے ذوق اصلاح پذیری کو تیز کرنے میں مدد بھی دیتے ہیں۔

عجائبات فرنگ اُردو کا پہلا اہم سفرنامہ شمار کیا جاتا ہے جسے یوسف کمبل پوش نے تحریر کیا تھا۔ یہ سفرنامہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مسافر کے تاثراتِ یورپ اس طرح بیان ہوئے تھے کہ اس سے یورپ اور ہندوستان کی معاشرت کا نمایاں فرق سامنے آتا ہے۔ مصنف اپنے تاثرات کے لحاظ سے وہاں کی معاشرت پر دل برداشتہ محسوس ہوتا ہے۔ سفیر اودھ مولوی مسیح الدین خاں کا سفرنامہ تھا۔ مصنف کو واجد علی شاہ نے اپنی حکومت اودھ سے معزولی پر اپنی والدہ اور بھائی کے ہمراہ سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں مسیح الدین نے اس سفرنامہ کے حالات تحریر کیے تھے۔ یہ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔

سیّد احمد ۱۸۶۹ء میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں اور سر ولیم میور کی تصنیف کے جواب میں کتاب تحریر کرنے انگلستان گئے تھے۔ اس سفر کے متعلق ان کے تاثرات رسالہ تہذیب الاخلاق میں بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ اپنے سفر کے دوران سیّد احمد خاں نے مغربی تہذیب، تمدن اور اہلِ مغرب کی معاشرت کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لیا تھا، وہاں کی تمام خوبیاں ان کی نظروں میں محفوظ تھیں۔ سفرنامہ میں ہر مقام پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی میں مبتلا ہے۔ وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے وطن کی بھلائی کے ان کے دل میں گزرے ان کو ہر موقع پر

ظاہر کیا ہے اور جابجا ہندوستان اور یورپ کی معاشرتی اور اخلاقی حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس سفرنامے سے سیّد احمد خاں کی انگلستان میں تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں کا علم بھی ہوتا ہے۔

شبلی کا سفرنامۂ روم، مصر و شام ۱۸۹۴ء میں آگرہ سے شائع ہوا۔ اس کا بھی ایک مقصد ہندوستان کے لیے ایک بہتر نظام تعلیم کی تلاش تھی۔ ان کے سفرنامہ میں سیاسی حالات ضمنی طور پر بیان ہوئے ہیں بلکہ اسلامی مزاج کو سمجھنے اور اسلامی ممالک میں نئی نسل کے آثارِ حیات تلاش کرنے کی ایک کوشش بھی اس میں ملتی ہے۔ ترکوں سے شبلی کی بے پناہ محبت کے نقوش جابجا اس میں موجود ہیں۔ یہ ہندوستان اور ترکی کے درمیان اُنیسویں صدی کے آخر میں تعلقات کی ایک اہم کڑی تھی اور اس طرح شبلی اسلامی ہند کے پہلے سفیر تھے جو ترکی گئے۔ قسطنطنیہ کے زمانہ قیام میں انھیں تمغۂ مجیدیہ دیا گیا تھا۔ اس لیے جب وہ واپس آئے تو بعض سیاسی مصالح کے سبب سفرنامہ محض علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا۔ ۱۸۹۳ء میں نواب حامد علی خاں والیِ ریاست رام پور انگلستان گئے تھے۔ اُنھوں نے اس زمانہ کے انگلستان کے حالات اپنے ضخیم سفرنامہ میں پیش کیے۔ ۱۸۹۸ء میں حافظ عبدالرحمن امرتسری کا سفرنامہ بلادِ اسلامیہ شائع ہوا۔ جو شبلی کے سفرنامہ کے موضوعات اور مقامات سے قریب ہے۔ اس میں مصر، روم اور شام کی علمی اور تہذیبی صورتِ حال کا تعارف کرایا گیا تھا۔ مولوی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار ۱۹۰۰ء میں مختلف ممالک کے سفر پر گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنا سفرنامہ سفرنامۂ یورپ و بلادِ روم و شام تحریر کیا، جس میں مغربی ممالک اور اسلامی ممالک کی معاشرت کے نمایاں فرق کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں مراد آباد سے مرزا علی رضا محزوں مراد آبادی نے مرزا ابوطالب خاں کے اہم سفرنامہ مسیر طالبی فی بلاد افرنجی کا ترجمہ کیا۔ ابو طالب خاں دربار اودھ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ۱۷۹۹ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان یورپ کا سفر کیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے سفر کے حالات میں مغربی تہذیب کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ فی الحقیقت یہ جدید مغربی تہذیب کا پہلا تعارف تھا، جسے کسی مسلمان نے تحریر کیا۔ اس فارسی سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۱۰ء-۱۸۱۴ء میں چارلس اسٹیوارٹ نے شائع کیا تھا۔ اس کا اصل فارسی متن مصنف کے لڑکے مرزا حسین علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۲ء میں طبع کرایا۔[1]

اس زمانہ میں کثرت سے سفرنامے تحریر ہوئے لیکن یہ زیادہ تر یورپ، حجاز اور مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں تھے۔ ان میں سیاسی واقعات و حالات یا پس منظر نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس وقت

مسلمانوں کے لیے بلاد اسلامی میں سے روم وترکی اور جزیرۃ العرب کے حالات سیاسی اور قومی اعتبار سے اہم ہو سکتے تھے۔ چناں چہ ایسے سفرنامے جو ان ممالک کے سیاسی معاشرتی حالات پیش کرتے، زیادہ مؤثر ہو سکتے تھے۔ یورپ اور بلاد اسلامیہ کے سفرناموں میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا سفرنامہ سیاحت سلطانی ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں لندن، پیرس اور ترکی کے حالات ہیں۔ اسی سال خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ روزنامچۂ سیاحت شائع ہوا۔ اس کی بنیاد عراق، عرب، ایران، روس، ترکی اور بیروت کے حالاتِ سفر پر تھی۔ نواب بہادر یار جنگ کے دو سفرنامے سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ اور بلاد اسلامیہ کی سیر مذہبی اور تہذیبی مقاصد سامنے رکھ کر حجاز، عراق، شام، فلسطین، قسطنطنیہ، انگورہ، وسط ایشیا، ایران، ترکی و افغانستان کے حالات کو گہری نظر سے دیکھنے کی کوششیں ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۶ء میں ترکی کی سیاحت کی تھی۔ ان کا سفرنامہ پہلے مخزن میں اور پھر کتابی صورت میں مقام خلافت کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ نقش فرنگ تحریکِ خلافت کے دوران ہندوستان، ترکی اور یورپ کے سیاسی اور مذہبی حالات و جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں وفد خلافت کی مصروفیات کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی اس وفد میں موجود تھے جو مسئلہ خلافت پر ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے یورپ گیا تھا۔ اُنھوں نے انگلستان اور دیگر ممالک سے اپنی مصروفیات اور حالات سفر کے بارے میں اپنے دوستوں کو خطوط تحریر کیے تھے جو مختلف رسالوں میں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ ان خطوط میں سفرنامہ کی تمام خوبیاں منتشر حالتوں میں ملتی ہیں۔ تحریکِ خلافت کے دوران جو دیگر سفرنامے تحریر ہوئے ان میں مولانا محمد علی کے سفر یورپ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ دیگر سفرناموں کے مقابلہ میں سیاسی کش مکش کا ایک نمائندہ مرقع ہے۔ ان میں مولانا محمد علی کی ان کوششوں کی تفصیلات بھی موجود ہیں جو اُنھوں نے تحریکِ خلافت اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے یورپ میں کیں۔ اُنھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد اور مختلف تحریکوں کے سلسلہ میں جو سفر کیے ان کے تاثرات اور حالات ہر مرتبہ تحریر کیے۔ ان کے ایسے تاثرات مجموعی صورت میں محمد علی کے یورپ کے سفر کے نام سے شائع ہوئے۔

اس وقت کی دیگر اسلامی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں اور مجاہدین کے سفرنامے بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اپنی مخصوص انقلابی جدوجہد کے تحت حجاز کا سفر

کیا تھا۔ اس سفر کے دوران ان کی تحریک اور سیاسی مقاصد کے لیے ان کی جدوجہد بھی جاری تھی۔ ان کی تمام مصروفیات کے تذکرہ پر مبنی ایک سفرنامہ مولانا حسین احمد مدنی نے سفرنامۂ شیخ الہند کے نام سے مرتب کیا تھا جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں جہاں شیخ الہند کی انقلابی اور سیاسی جدوجہد کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں ان کے تعلق سے حسین احمد مدنی اور ان کے دیگر رفقا کی مصروفیات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں ان کی تحریک سے متعلق ایک اور مجاہد رہنما مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان اور پھر روس، ترکی اور حجاز کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کے ابتدائی سات سالوں کی روداد اُنھوں نے سفرنامہ کے طور پر تحریر کی جس میں افغانستان کے سیاسی حالات، وہاں مقیم ہندوستانیوں کی سیاسی جدوجہد افغانستان کی در پردہ سیاسی اور انقلابی جماعتوں اور بین الاقوامی جوڑ توڑ کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ ان کا یہ سفرنامہ کابل میں سات سال کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ اس زمانہ میں افغانستان کی سیاست برِعظیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ وہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر مزید اہم سفرنامے تحریر ہوئے۔ ایک قابلِ ذکر سفرنامہ سیرِ افغانستان ہے جسے سیّد سلیمان ندوی نے تحریر کیا تھا۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ علامہ اقبال اور راس مسعود بھی تھے۔ ان تینوں اکابرین کے سفر کا مقصد حکومت افغانستان کو تعلیمی امور میں مفید مشورے دینا تھا۔ ان کے سفر کے حالات کے ساتھ اس سفرنامہ میں افغانستان کی معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی صورتِ حال کا منظر بھی نظروں کے سامنے آتا ہے۔ یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا تھا۔ افغانستان کی معاشرتی اور سیاسی تصویریں شمس الدین کے سیاحت افغانستان اور خواجہ حسن نظامی اور نادر شاہ کے دو سفرنامے میں بھی نظر آتی ہیں۔

کچھ سفرناموں میں مغربی ممالک کے سیاسی رجحانات کا مطالعہ بھی موجود ہے۔ سیاحت روس پنڈت جواہر لال نہرو کے سفرنامہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ یورپ جنگ سے پہلے ہارون خاں شیروانی کا سفرنامہ ہے، جس میں ایک مورخ اور ادیب نے تاریخ، سیاست اور ادب پر فکر انگیز بحث کی ہے۔ لندن سے آداب غرض آغا محمد اشرف کے ذاتی تاثرات ہیں، جو اُنھوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران وہاں محسوس کیے۔ ان میں خاص طور پر سیاسی رجحانات اور نظم و نسق کا جائزہ سیاحت روس میں لیا گیا تھا، جو ایک سیاسی رہنما کے مشاہدہ پر مبنی تھا۔ اور کہیں کہیں اس میں روس اور ہندوستان کے سیاسی نظام کے فرق کی نشان دہی نظر آتی ہے۔

برِعظیم کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ ان سفرناموں کے ذریعہ لیا جا سکتا ہے، جو برِعظیم میں یا اس

کے بارے میں تحریر ہوئے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری پر جماعت مجاہدین سے تعلق کی بنا پر بغاوت کے الزام میں انگریزی حکومت کی جانب سے مقدمہ چلایا گیا تھا اور انھیں کالا پانی کی سزا دی گئی تھی۔ مولانا تھانیسری جب رہا ہوئے تو اُنھوں نے ۱۸۷۹ء میں اس مقدمۂ بغاوت کے واقعات اور سفر کی مکمل داستان اپنی کتاب تواریخ عجیب میں تحریر کی۔ یہ کتاب متعدد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس سے نہ صرف مصنف کی کالا پانی میں مصروفیات و مشغولیات کا علم ہوتا ہے بلکہ ہندوستان کی سیاسی حالت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ سیّد احمد خاں نے مختلف قومی اور تعلیمی مقاصد کے تحت چار مرتبہ پنجاب کا سفر اختیار کیا تھا۔ ان کے سفر کی تفصیلات مختلف اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن ان کے دوسرے سفر کے حالات مولوی سیّد اقبال علی نے بڑی تفصیل سے تحریر کیے۔ یہ سفر سیّد احمد خاں نے ۱۸۸۴ء میں کیا تھا۔ سفرنامۂ پنجاب محض سفر کے حالات و واقعات پر مشتمل نہیں۔ سیّد احمد خاں کی مصروفیات ان کے کام اور مقاصد و نصب العین کی ایک دستاویز بھی ہے۔ اس کا مقدمہ شبلی نے تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب علی گڑھ سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفر بمبئی، سومنات، کاٹھیاواڑ اور گجرات کے حالات روزنامچہ ۱۹۰۷ء میں تحریر کیے تھے۔ علامہ راشد الخیری نے سیاحت ہند میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا حال تحریر کیا۔ حکیم سیّد عبدالحیٔ نے دہلی اور اس کے اطراف، اُنیسویں صدی کے آخر میں تحریر کیا۔ یہ سفرنامہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ لالہ جنیدا رام نے اپنے سفرنامہ میں کلکتہ، بنارس، الٰہ آباد اور رام پور کے حالات تحریر کیے۔ عبدالرحمٰن امرتسری نے سیاحت ہند تصنیف کیا۔ نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن کا سفر شاہانہ دہلی، رام پور، لکھنؤ کے حالات پر مشتمل ہے۔ منشی لال سنگھ نے ہندوستان کے حالات پر ایک چینی سیاح کے خیالات مرتب کیا، جو اصل میں ترجمہ تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے دیگر سفرنامے بھی ترجمہ ہوئے، جو ہندوستان کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر دیمری برنیئر، تھیونو اور ابن بطوطہ اور البیرونی کے سفرناموں کا اُردو میں ترجمہ ہوا۔

ترجموں کے سلسلے کا اہم سفرنامہ مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کا ہے جو اندرون ہند کے نام سے دہلی سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ سیّد ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا۔ خالدہ ادیب خانم ۱۹۳۵ء میں ہندوستان آئی تھیں۔ اُنھوں نے اس سفر کے حالات میں ہندوستان کی سیاسی، علمی، تہذیبی صورتِ حال کا مفصل تجزیہ کیا اور اس دور کے اکابرین اور سیاسی اور قومی رہنماؤں کا تذکرہ اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔

بعض سفرنامے اس دور میں ایسے بھی لکھے گئے جن میں برِعظیم کے بہت سارے قومی، تہذیبی اور سیاسی مسائل آ گئے ہیں۔ کرشن چندر کا پودے اس قسم کا نمایندہ سفرنامہ ہے۔ خالص سیاسی سفرناموں میں گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں قابل ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا تھا۔ اس میں گاندھی کے نظریات، ہندو مسلم اتحاد پر اس کے خیالات زیادہ نمایاں کیے گئے ہیں۔

(۶) فتاوے

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ نے یہ خیال کیا کہ مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کے حصول پر آمادہ کیا جائے تاکہ ان میں روشن خیالی اور وسعت نظر پیدا ہو، وہ انگریزوں سے قریب ہوں، انگریزی حکومت کی ملازمت اور ان آزاد پیشوں میں حصہ لے سکیں جن کے لیے اب انگریزی تعلیم ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کم از کم وقتی طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حکومت کا وفادار بنایا جائے اور حکومت کو ان کی وفاداری کا یقین دلایا جائے۔ اس طبقہ خیال کے ایک رہنما نواب سیّد عبداللطیف نے برِعظیم اور حجاز کے بعد علما سے جن میں تحریکِ مجاہدین کے ایک رکن مولوی کرامت علی بھی تھے، یہ فتوے حاصل کیے کہ انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب نہیں ہے، اور ان کے خلاف جہاد کرنا جائز نہیں ہے[۱] تحریکِ مجاہدین اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا اثر یہ تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی حیثیت پر اب بھی شبہ تھا۔ چناں چہ مولانا سعیدالدین کشمیری اور مولانا امان اللہ کشمیری نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق مولانا رشید احمد گنگوہی سے استفتا کیا، جس کے جواب میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے مولانا گنگوہی نے نہایت مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر کیا، جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں کے قائم ہونے سے قبل تک ناممکن رہی۔ ایک اور فتویٰ میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے دنیاوی معاملات میں مسلمانوں کا ہندوؤں سے اشتراکِ عمل مباح اور ناجائز قرار دیا۔ یہ فتویٰ قیام کانگریس کے دور کا تھا، جب سیّد احمد خاں نے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ مولانا گنگوہی نے استفتا کے مطابق جواب دیتے ہوئے سیّد احمد خاں کے نظریہ اور کاموں کی مخالفت کی۔ کانگریس کی حمایت کی لیکن اس میں شرکت کو مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں سمجھا[۲] اسی دور میں ایک اہم فتویٰ نصرۃ الابرار شائع کیا۔ اس میں کئی فتوے شامل کیے گئے تھے۔ ان فتووں پر، جن میں بیان کیا گیا تھا کہ دنیوی امور میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل ہو سکتا ہے۔ دستخط کرنے والوں میں اس زمانہ کے تمام علما شامل تھے۔ نصرۃ الابرار کی اشاعت ۱۸۸۸ء میں ہوئی تھی۔[۳]

ہندوستان کے دارالحرب ہونے پر پہلا اہم فتویٰ شاہ عبدالعزیز نے دیا تھا۔ اس کے بعد اسی موضوع پر متعدد فتوے جاری ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس سلسلے کے اہم فتووں میں سے ایک علمائے سندھ کا فتویٰ تھا۔ ان علما نے شاہ عبدالعزیز کے فتوے کے حوالے سے دیا۔ سندھ کو بھی دارالحرب قرار دیا ہے۔ یہ فتویٰ اُردو میں نقل ہوا تھا۔[۴]

برِعظیم کے ہنگامی سیاسی دور میں تحریک عدمِ تعاون کے دوران علما کے کئی فتوے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک اہم فتویٰ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے طلبائے علی گڑھ کے استفتا پر ترکِ موالات کی حمایت میں دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔[۵] اسی دوران علما کا مشہور متفقہ فتویٰ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ علما نے جمعیۃ العلمائے ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی ۱۸ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء میں یہ فتویٰ جاری کیا تھا اور اس پر چار سو پچیس علما کے دستخط تھے اور اسے حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔[۶] اس ضبطی کے خلاف سول نافرمانی کی گئی۔ تیسرا اجلاس ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء کو بمقام لاہور ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں علما کے فتویٰ کی ضبطی پر حکومت سے ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور قرار پایا کہ فتوے کو دہرایا جائے۔[۷] چناں چہ مطبوعہ شکل میں اسے دیگر علما کے پاس بھیجا گیا جس پر مزید چار سو ستر دستخط ہوئے۔ اس فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ سرکاری کونسلوں میں ممبر ہونا ناجائز ہے۔ انگریزی عدالت میں وکالت کرنا ناجائز ہے۔ سرکاری یا نیم سرکاری مدرسوں میں پڑھنا ناجائز ہے۔ اعزازی عہدے اور حکومت کے دیے ہوئے خطابات رکھنا ناجائز ہے۔ حکومت کی نوکریاں، جن سے سرکار کی مدد ہوتی ہے، حرام ہیں، خاص کر پولیس اور فوج کی نوکری کرنا بہت سخت گناہ ہیں کیوں کہ ان کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔[۸] اس وقت یہ فتویٰ ضبط کر لیا گیا تھا، دوبارہ اس کی اشاعت ہوئی۔ اسے کراچی کے تاریخی مقدمہ میں، ملزمان کے خلاف دستاویزی ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔ فتوے کے آخر میں مفتی کفایت اللہ کی ''ایک دل گداز عرضداشت، جملہ اہلِ اسلام کی خدمت میں'' مندرج تھی۔ یہ فتویٰ تیسری مرتبہ کراچی کا تاریخی مقدمہ مرتبہ محمد اجمل کے حصہ اوّل میں شامل اشاعت ہوا۔

تحریک عدمِ تعاون کے دوران جمعیۃ العلما کے فتوے کے جواب میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانوی نے تحریک موالات کے خلاف علاحدہ علاحدہ اُردو میں فتوے جاری کیے۔ مولانا بریلوی نے اپنے فتوے میں بعض مشروط حالات میں کافروں سے معاملت جائز قرار دی اور ایک دوسرے فتوے میں ہندوؤں سے اتحاد کی مخالفت کی۔ ان کے یہ فتاویٰ مجموعہ کی شکل میں بریلی

سے شائع ہوئے۔ مولانا تھانوی نے اپنے فتوے میں ہندو مسلم اتحاد کو ناجائز قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ کانگریس کی تحریک سول نافرمانی وغیرہ مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی زندگی کے لیے سخت خطرناک ہے اور مسلمانوں کی اس میں شرکت شرعاً حرام و ناجائز ہے۔ یہ فتویٰ متفقہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اسی دوران ایک اور قابلِ ذکر فتویٰ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے جاری کیا تھا کہ جو لوگ دشمنان اسلام کی حکومت میں رہنا پسند نہ کریں وہ آزاد اسلامی ممالک میں ہجرت کر جائیں۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد حکومت برطانیہ کی وعدہ خلافی کے حوالہ سے اُنھوں نے کہا کہ وہ ایسی حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے جس نے ان کے ساتھ اتنی بڑی غداری کی ہے۔ چوں کہ اجنبی حکمرانوں کو باہر نکال دینے کی استطاعت مسلمانوں میں نہیں ہے اس لیے صرف ایک عمل ایسا ہے جسے وہ عزت و آبرو کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اس اسلامی حکم کے مطابق بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے آپ کو سخت بے انصافی کے مقابلہ میں مجبور پاتا ہے اور اس کو روک نہیں سکتا تو ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہیے جہاں وہ اس مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔[9] امیر امان اللہ خاں نے کابل میں ایک تقریر کے دوران مظلوم مسلمانانِ ہندوستان کو افغانستان آنے کی دعوت دی تھی۔ چناں چہ ہجرت کا فتویٰ شائع ہوتے ہی تقریباً اٹھارہ ہزار ہندوستانی مسلمان ترک وطن کر کے افغانستان چلے گئے۔ ابتدا میں ہجرت کی تحریک نے ایسا اثر پیدا کیا کہ عدم تعاون کی تحریک بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔[10] ہجرت ہی کے تعلق سے ایک اور فتویٰ مولانا ابوالکلام سے منسوب ہے۔ اخبار اہلِ حدیث، امرتسر کی اشاعت مورخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۲۰ء میں اس کا متن شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی کہا گیا تھا کہ مسلمانانِ برِعظیم کے لیے بجز ہجرت اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس ہندوستان میں اسلامی عمل انجام دینا چاہیں، ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں اور جو لوگ ہجرت نہیں کر سکتے وہ مہاجرین کی خدمت و اعانت اس طرح انجام دیں گویا وہ خود ہجرت کر رہے ہیں۔[11] فتوے کے آخر میں اسی موضوع پر ایک رسالۂ ہجرت کا اعلان کیا گیا تھا۔

تحریک پاکستان کے دوران مولانا اشرف علی تھانوی کی ایما پر مفتی محمد شفیع نے کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ کی حمایت میں فتویٰ مرتب کیا تھا۔ اس فتوے کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اس میں بالتفصیل ہندوؤں اور کانگریس کے عزائم پس منظر اور اسلامی سیاسی نظام اس کے شرعی پہلو پھر اسلامی قومیت اور شعائر کی روشنی میں ان کے نفاذ کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد کو فرض قرار دیا گیا

تھا۔ یہ پہلی مرتبہ کتابی صورت میں بمبئی سے محرم ۱۳۶۵ھ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں دیگر علما کی تصدیقات بھی تھیں۔ ان علما میں شبیر احمد عثمانی، ظفر احمد تھانوی اور سیّد سلیمان ندوی کے نام شامل ہیں۔[۱۲] اس کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ سے علاحدہ ہونے اور دور رہنے کی تلقین کی تھی۔

(۷) اُردو میں تقسیم ہند کی تجویزیں

برِعظیم میں مسلمانوں کی جانب سے تقسیم ہند کا مطالبہ کسی فوری احساس کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے مطالبہ کے پس منظر میں برِعظیم کے مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا اہم کردار تھا۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت، جو مطالبۂ پاکستان کی ایک اساس بھی قرار پائی، ایک مسلسل تاریخی عمل کا نتیجہ ہے جس میں صوفیائے کرام کی تبلیغی جدوجہد اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اپنی اقدار کے تحفظ کا احساس ایک اہم اور فعال عنصر ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے لے کر اورنگ زیب کے عہد تک مسلمانوں کی تہذیب فنونِ لطیفہ کے بعض پہلوؤں میں اخذ و امتزاج کے عمل سے ضرور دوچار رہی۔ مشترکہ تہذیبی اور مذہبی اساس کی جستجو کا رویہ بھی ہماری جدوجہد آزادی کے عرصہ میں ایک نہایت محدود اور مختصر مدت کے لیے ابھرا لیکن عام معاشرتی زندگی میں ہندوؤں کے طرزِ عمل کی وجہ سے الگ قومی تشخص کا احساس ہمیشہ قوی رہا کہ مسلمانوں اپنی تہذیبی روایات کے لحاظ سے برِعظیم کی دوسری اقوام سے مختلف ہیں۔ فی الحقیقت مسلمانوں میں ملی تشخص کا شدید احساس بعض صورتوں میں غالب ہندو اکثریت کے متضاد رویوں کے سبب ہے جس کے طفیل مسلمانوں کے لیے اپنے لیے علاحدہ ملک کا مطالبہ ناگزیر ہوگیا۔

اورنگزیب کے بعد دورِ زوال میں یہ احساس دو قومی نظریہ کی صورت میں زیادہ شدید ہوا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں، برِعظیم ہے۔ یہاں ایک قوم نہیں، کئی قومیں آباد ہیں۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اس دورِ زوال میں اپنی تہذیب کے تحفظ اور اپنے وجود کی بقا کے لیے جہاں ایک طرف انگریزوں کے مقابلہ پر آنا پڑا، دوسری طرف مسلمان ہندو ذہنیت کا نشانہ بھی بنے۔ گویا اب مسلمانوں کا مقابلہ دو قوموں سے تھا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر کے مادی ترقی کی دوڑ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں انھیں خاصا مضبوط کر دیا۔ سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کو سیاسی معاملات سے دور رہنے کی تلقین کی اور انھیں سماجی اور تعلیمی سطح پر مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی کا شکار سب سے زیادہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی

کوشش تھی کہ انگریزوں کے مقابلے کا محاذ بند کر کے مفاہمت کا طریق کار اختیار کر لیا جائے۔ ہندو جیسے جیسے مادی سطح پر منظم ہوتے گئے مغرب کا قومیت کا تصور کانگریس کا مطمحِ نظر بنتا چلا گیا۔ اب ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ تھا کہ ہر ملک کو جمہوری قدریں اپنانے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان کے سارے باشندے جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ قومیت کا یہ تصور ہندوؤں کے حق میں جاتا تھا کیوں کہ اگر اکثریت کی بنیاد جمہوری قدروں کی بحالی پر ہوتی تو اس میں فائدہ صرف ہندوؤں کا تھا۔ سیّد احمد خاں اپنی عمر کے آخری مرحلہ پر اس صورتِ حال کو بھانپ گئے تھے۔ اُردو ہندی کے تنازعے میں ہندوؤں کے رویہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب انگریزوں کے بارے میں بھی وہ دبے دبے لفظوں میں تلخی کا اظہار کر لیتے تھے لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں اور ہندوستان کے ایک ملک ہونے کے بارے میں ان کے خیالات میں خاصی شدت پیدا ہو گئی تھی۔

"ہندوستان براعظم ہے...... اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں، جن کے تمدنی اور اخلاقی اور سوشل اور پولٹیکل اور مذہبی اور طبیعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں۔ اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا"۔[1]

سیّد احمد خاں نے علاحدگی کا کوئی باقاعدہ نقشہ تیار نہیں کیا۔ لیکن اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے کہ وہ ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی اصل بنیاد مذہب پر ہوگی۔

دوستو۔ ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونی ورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔[2]

درحقیقت اُردو ہندی لسانی تنازعے کے بعد سیّد احمد خاں کو ہندوؤں پر اعتماد نہیں رہا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس خالصتاً ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی شمولیت کانگریس کی مخالفت کی۔ ہندوؤں کی فرقہ پرستانہ کوششوں کو دیکھ کر سیّد احمد خاں کا یقین راسخ ہوتا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کا مذہب، تمدن، اور نظریۂ حیات جدا ہے۔ اس لیے یہ دونوں قومیں مل کر زیادہ دیر تک متحد نہیں رہ سکتیں۔ ایک خط میں نواب محسن الملک لکھتے ہیں

ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ

مسلمان علاحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے
علاحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمان کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ [۳]

ہندو جمہوریت کے نام پر سیاسی غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں جذب کر کے متحدہ قومیت کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ ان کی اس ذہنیت نے دو قومی نظریہ کو ایک نئے اور شدید احساس سے روشناس کیا پھر مسلمانوں کا قانونی تحفظ کا مطالبہ اور جداگانہ انتخاب کے لیے جدوجہد ہندوؤں میں انتہا پسندی کا سبب بنی اور اُنھوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ ان حالات میں مولانا عبدالحلیم شرر نے پہلی مرتبہ تقسیم ملک کا خیال پیش کیا۔ اپنے رسالہ مہذب کی ایک اشاعت ۲۳ راگست ۱۸۹۰ء میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر فسادات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ جو لوگ یہاں کی قوموں کو ایک بتاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اور

...... ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسم بغیر ایک دوسرے کی توہین و دل شکنی کیے نہیں پوری ہوتی اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی آبادی علاحدہ کر لیں۔ [۴]

بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوؤں میں اکثریتی فرقہ کے انتہا پسندانہ خیالات کا تسلط ہو گیا تھا۔ ہندو مغرب کے تصورِ قومیت کو پورے طور پر اپنا چکے تھے۔ میثاق لکھنؤ ہندو مسلم اشتراک کی عارضی اور آخری کوشش تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ کانگریس کی قیادت دراصل ہندو اکثریت کی قیادت ہے۔ جب مسلمان تحریکِ خلافت، تحریک عدمِ تعاون اور تحریک ہجرت میں سیاسی اور سماجی اعتبار سے منتشر ہو گئے تو گاندھی کی سیاسی ریشہ دوانی نے مسلمانوں کو بری طرح متزلزل کر دیا اور بعض تعلیم یافتہ مسلمان اپنے آپ کو کانگریس میں جذب کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب سیاسی کش مکش میں قوم پرستانہ خیالات کو زیادہ عروج حاصل ہوا۔ لیکن یہ صرف ایک لہر تھی اور محض تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود رہی۔ دوسری لہر جو مسلمانوں کی تمدنی اور مذہبی زندگی میں عوامی سطح پر کارفرما رہی وہ قومیت کے مغربی تصور کی نفی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا ایک حصہ ہندوؤں سے اشتراک کے بارے میں مدت تک پُر امید رہا تاہم مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں ہندوؤں سے کوئی باعزت سمجھوتہ جیسے جیسے ناممکن ہوتا گیا، اس ضمن میں برِّعظیم کے مسلمانوں کے لیے وہ افکار بھی محرک ثابت ہوئے جو عالم اسلام میں دیگر مفکرین اسلام پیش کر رہے تھے۔ جمال الدین افغانی نے ایک مسلم جمہوریہ کا خواب

دیکھا تھا جس میں مرکزی ایشیا کی اشتراکی جمہوریتیں، افغانستان اور برِعظیم کے شمال مغرب کے مسلم اکثریت والے علاقے شامل تھے۔

برِعظیم میں متعدد مسلمانوں نے ایک علاحدہ ملک اور آزاد اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا۔ ایسے تصورات وقتاً فوقتاً تقسیم ہند تک پیش کیے جاتے رہے۔[۵] بعض اہم تصورات اُردو میں بھی پیش کیے گئے۔ مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں اخبار ذوالقرنین بدایوں میں محمد عبدالقدیر بلگرامی نے ''ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام'' شائع کرایا۔ پھر اس کو رسالہ کی صورت میں ترتیب دے کر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔[۶] اس رسالہ میں بلگرامی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برِعظیم کی تقسیم کی وکالت کی اور اضلاع کی ایک فہرست بھی دی جو بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی تشکیل شدہ سرحدوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔[۷]

مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی تقسیم ہند کا ایک واضح خاکہ پیش کیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے کابل کے زمانۂ قیام میں ایک سیاسی تنظیم، ''مہابھارت سرِوراجیہ پارٹی'' ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد کے لیے تشکیل دی تھی۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے گئے جس کے تحت پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت پیدا کرنے کی کوشش کو اساسِ آزادی مانے گی۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی حصوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک قسم کے ایک ہی رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے آباد ہوں۔[۸] مولانا سندھی کا یہ منصوبہ قسطنطنیہ سے اُردو اور انگریزی میں شائع ہوا تھا۔

اخبار انقلاب لاہور میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے ۱۹۲۸ء میں مقالات کا ایک سلسلہ تحریر کیا تھا، جس میں ''ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن'' کے عنوان سے مختلف دلائل کے ساتھ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ کیا۔ اس ضمن میں انقلاب کے صفحہ اول پر ایک مستطیل میں یہ عبارت شائع ہوتی تھی کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں۔ ان میں اسلام کا علم بلند کرو۔[۹]

علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی کے سامنے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی مگر یہ اس وقت زیادہ اہمیت حاصل نہ کرسکی۔ اسی طرح کی ایک تجویز نواب ذوالفقار علی خاں نے خلافت کانفرنس منعقدہ

دسمبر ۱۹۲۹ء کے خطبہ صدارت میں، مسلمانوں کے لیے علاحدہ ملک کی صورت میں پیش کی تھی۔ علامہ اقبال نے اپنا تاریخ ساز خطبہ مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۳۰ء میں پڑھا تھا۔ اس میں اُنھوں نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا اس کے باہر، مجھے ایک متحد شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کا، کم از کم شمال مغرب کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتی ہے۔[۱۰] ان کا یہ خطبہ مستقبل کی ایک امکانی صورت کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسہ میں اُنھوں نے الگ ملک کے مطالبہ کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا۔ علامہ اقبال کا اوّل الذکر خطبہ اُردو میں متعدد مرتبہ شائع ہوا۔ مئی اور جون ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے مابین جو مراسلت ہوئی اس میں علامہ اقبال نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب باضابطہ طور پر الگ ملک کے لیے مطالبہ کا وقت آ گیا ہے۔ یہ مراسلت اُردو میں ترجمہ ہو کر کئی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں صوبائی مسلم لیگ کی کانفرنس منعقدہ کراچی نے آل انڈیا مسلم لیگ سے کہا تھا کہ ''ایک ایسے دستور کا خاکہ تیار کیا جائے جس کے تحت مسلمان مکمل آزادی حاصل کر سکیں''۔ یہ قرارداد روداد کے ساتھ اور مسلم لیگ کی قراردادوں کے ساتھ اُردو میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔

اس دوران متعدد مصنّفین کے لکھے ہوئے ایسے رسالے شائع ہوئے جن میں ہندوستان سے سیاسی روابط بالکل منقطع کرنے پر تو زور نہیں دیا گیا تھا مگر ایک ڈھیلے ڈھیلے وفاق یا محض آزاد ریاستوں کے مقصدی اتحاد کی خواہش ضرور کی گئی تھی۔ یہ تجاویز دراصل ۱۹۳۵ء کے آئین کی سفارشات کے جواب میں مرتب ہوئی تھیں۔ اس قسم کی پانچ تجاویز مسلم لیگ کی مجلس دستور ساز کو پیش کی گئی تھیں۔ ایک تجویز ڈاکٹر سیّد عبداللطیف نے مرتب کی تھی۔ دوسری کے مصنف ''ایک پنجابی'' (میاں کفایت علی) تھے۔ تیسری چودھری رحمت علی کی تجویز تھی۔ چوتھی کے مصنف ڈاکٹر سیّد ظفرالحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری تھے اور پانچویں سر سکندر حیات نے پیش کی تھی۔[۱۱] ان تجاویز میں جو چیز مشترک تھی وہ یہ تھی کہ مسلم اکثریت کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے قطعی طور پر علاحدہ نہیں ہونا چاہیے، کسی نہ کسی قسم کی آل انڈیا کنفیڈریشن کا وجود ضروری ہے۔ ان تمام تجاویز کا ترجمہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے تشریحات پاکستان میں شامل کیا۔

''مسلمان کیا کریں'' کے نام سے اخبار مدینہ میں شائع ہونے والے مختلف الخیال افراد کے

مضامین کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا، اس میں خصوصیت سے دو مضامین زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون اور دوسرا بے باک کا مقالہ۔ ان میں تقسیم ہند کے لیے تجاویز دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف کی اوّل الذکر تجویز کا ترجمہ اخبار مدینہ کی اشاعت ۵/ اپریل ۱۹۳۹ء میں بھی شائع ہوا۔

مولانا مودودی نے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں ترجمان القرآن میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں ایک تو کانگریس کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کی مخالفت اور متحدہ قومیت کے نظریہ کا ابطال کیا اور دوسرے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل تجویز کیا۔ ان کی تجاویز تین متبادل صورتوں کی حامل تھیں:

(الف)　ایک وفاق بین الاقوام، جو وفاق شدہ اقوام کی ایک ریاست ہوگا۔ جہاں ہر قوم مقتدر ہوگی اور اپنی ثقافتی آزادی و خود مختاری کی حامل ہوگی۔

(ب)　مشرقی بنگال، حیدرآباد، بھوپال، جوناگڑھ، چندرا، ٹونک، اجمیر، دہلی، اودھ، شمال مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان، مسلمانوں کو دیے جائیں۔

(ج)　اگر یہ دونوں متبادل صورتیں انجام نہ دی جائیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو علاحدہ علاحدہ قومی وفاقی ریاستیں ایک بین الوفاق کی صورت میں ہونی ضروری ہیں۔ ان دونوں وفاقوں کے درمیان دفاع، مواصلات اور تجارت کی حد تک ایک معاہدے یا عہد نامے کا ہونا ضروری ہے۔[۱۲]

قراردادِ پاکستان برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا ایک ایسا نقطۂ آغاز ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ آزاد ملک کا اور مسلمانوں کی ایک الگ قومیت کا برملا اظہار کیا۔ اس سے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد ایک نصب العین سے دوچار ہوئی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں الگ ہیں اور بعض علاقوں میں ان کی ناقابل تردید اکثریت ہے اس لیے مسلمانوں کو اقلیت قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں الگ ملک کا مطالبہ قراردادِ پاکستان کا بنیادی مقصد ہے۔ اس قرارداد کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی خوب شاعت کی گئی۔ اُردو میں ترجمہ کرکے بڑے پیمانے پر اس کو پھیلایا گیا۔ متعدد اخبارات و رسائل نے کئی مرتبہ اسے شاملِ اشاعت کیا۔

معروف تجاویز کے علاوہ اُردو کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور عالموں نے دیگر اہم اور غیر اہم متفرق تجاویز پیش کیں۔ مولانا آزاد سبحانی نے "حکومت ربانی" کا تصور پیش کیا۔ چودھری افضل

حق نے ''حکومتِ الٰہیہ'' کا خیال بیان کیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی ایک تجویز مسلم لیگ کی مجلسہ عاملہ کو بھیجی تھی۔ اس تجویز کے اہم اصول یہ تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق رقبہ ملے اور برِعظیم میں دو ایسی حکومتیں قائم ہوں جن کے مابین طاقت کا توازن قائم رہے۔[۱۳]

حسرت موہانی ابتدا ہی سے کامل آزادی کے زبردست حامی تھے۔ پاکستان کے بھی مؤید تھے اور اس میں ڈومینین کے بجائے جمہوریت چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل یہ تھا کہ ہندوؤں میں پانچ جمہوریہ قائم ہونے چاہییں (۱) مشرقی پاکستان، (۲) مغربی پاکستان (۳) مرکزی ہندوستان (۴) جنوب مغربی ہندوستان (۵) حیدرآباد دکن۔ ان سب کو وفاقی اتحاد ریاستہائے ہندوستان کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے۔ اس کی مکمل تشریح اُنھوں نے اُردوئے معلیٰ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۲ء میں کی۔

دیگر تجاویز میں سے، جو قراردادِ پاکستان کے بعد منظر عام پر آئیں، سر فیروز خاں نون، سی آر فارمولا، سر اردشیر دلال اور سیّد اسد اللہ کے خیالات کا اُردو ترجمہ تشریحات پاکستان میں شامل ہوا۔ بعض دیگر اہم کتابیں، جو مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے حل پر تحریر ہوئی تھیں، ان میں بھی ایسی تجاویز ملتی ہیں۔ ایسی بعض کتابیں، جو انگریزی میں تصنیف ہوئیں، اُردو میں ترجمہ کی گئیں لیکن ان میں سے اکثر تجاویز کو شہرت و اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ تشریحات پاکستان کی طرح ایک اور کتاب تصورات پاکستان تھی جسے شاہین فاروقی نے مرتب کیا تھا یہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مصنف نے مختلف تصورات کا تذکرہ کیا تھا جو اس ضمن میں پیش کیے گئے تھے۔

باب ششم

ماحصل

برِعظیم میں جس قدر سیاسی تحریکات اُبھریں ان میں مسلمانوں کا حصہ نمایاں ہے۔ بعض مسلمان حکمرانوں کی فکری، اعتقادی، سیاسی و مذہبی حکمت عملیوں پر جو تحریکات ان کی مخالفت میں شروع کی گئیں وہ زیادہ تر علما کی جانب سے یا ان کی تحریک پر شروع کی گئی تھیں۔ بعض ہندو مصلحین کی مذہبی، اصلاحی تحریکوں کے علاوہ تمام تر فعال اور مؤثر تحریکیں مسلمانوں کے دم قدم سے تھیں۔ ان کا مقصد فی الواقع احیائے اسلام اور اللہ کی حاکمیت کا حصول تھا۔ ایسی تحریکوں میں اپنے وسیع اور راسخ مقاصد کے اعتبار سے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سیّد احمد شہید کی تحریکات مثالی تھیں۔ انھوں نے اپنی جدوجہد سے، جس کی آب یاری راسخ فکر اور راست عمل سے ہو رہی تھی، برِعظیم کے تمام مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے متاثر کیا۔ برِعظیم کی اسلامی زندگی کے ہر پہلو میں ان کے اثرات سرایت کرتے رہے۔ ان کے زیرِ اثر متعدد تحریکیں رونما ہوئیں، جو ان کے ساتھ ساتھ یا ان کے مقاصد اور نصب العین کے تحت احیائے اسلام اور حاکمیتِ الٰہی کے حصول کے لیے مستقل جدوجہد کرتی رہیں۔ بظاہر یہ مذہبی تحریکات تھیں۔ لیکن فی الحقیقت ان کے تمام تر مقاصد سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کو خدا کے سپرد کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے بعد انھیں متعلقہ ضمنی مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ ان میں سے بعض تحریکوں نے مثلاً تحریکِ مجاہدین نے اپنے اصل مقصد کو کھل کر واضح نہیں کیا۔ جن حالات میں یہ تحریکیں شروع ہوئی تھیں، انھیں ایسی آزادی حاصل نہیں تھی کہ وہ براہ راست اور اپنے اصل مقصد کے اعلانیہ اظہار کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ سے ٹکرا سکتیں۔

سلطنت مغلیہ کا دورِ زوال اصل میں غیر ملکی استعمار کی ابتدا کا دور تھا۔ جہاں جہاں برِعظیم میں برطانوی اقتدار قائم ہوتا گیا، تحریکات اسلامی کا ایک خاص مقصد اس غیر ملکی اقتدار سے آزادی کا حصول بھی قرار پایا۔ یہ جدوجہد سیاسی سطح پر مختلف علاقوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق ہوتی رہی۔ پلاسی کی جنگ اور میسور کی جنگِ آزادی برِعظیم میں اسلامی حکومت کو سہارا دینے کی کوششیں تھیں۔ ان

جنگوں میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ انھیں بڑی زبردست مشکلات کا سامنا تھا۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان نے اپنی جیسی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنی قلم رو کے دفاع اور مستقبل کی آزادی کے لیے مردانہ وار لڑتے ہوئے جان دی۔ اس وقت برِعظیم میں نہ صرف مغربی بلکہ غیر مسلم قومیں بھی مسلمانوں کے مقابلہ پر آ گئی تھیں۔ ابتدا میں ان غیر مسلم قوموں کی مسلح بغاوتیں زیادہ سخت خطرہ نظر آ رہی تھیں مگر بہت جلد مغرب نے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا تختہ الٹ دیا۔ غیر مسلم قومیں بھی خواہ وہ جنگ جو تھیں، یا غیر عسکری سب انگریزوں کے زیرِ تسلط آ گئیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مختلف قومیں تھک ہار کر بیٹھ گئیں تاکہ ان پُر امن مشاغل ہی کو جاری رکھ سکیں جن کے دروازے اب بھی ان پر کھلے ہوئے تھے۔ اس کلیہ سے صرف شمال مغربی سرحد کے مجاہدین اور ان کے حامیوں کی جدوجہد مستثنیٰ تھی۔ بعد میں تحریک عدمِ تعاون میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بلکہ اس تحریک کے تحت ان کی قربانیاں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تھیں۔ اس تحریک کے دوران ہندوستان کے مسلمان آزادی کے خیال سے جوش میں آئے۔ مگر تحریکِ خلافت اصلاً دوسروں کے لیے ان کے ایثارِ نفس کی قسمت آزما جدوجہد تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کو یورپ کی غلامی سے بچایا جائے۔ اگرچہ اس وقت ان کو یہ معلوم نہ تھا مگر ان کی قربانیاں ان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ انھی قربانیوں نے انھیں بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کو منظم کرنے کے طریق کار کی تعلیم دی اور سارے برِعظیم میں سیاسی بیداری عام کر دی۔ اب مسلمانوں نے اس خیال کو ترک کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا برطانیہ کے بھروسے ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اب وہ مقابلہ کے لیے تیسرے فریق کی حیثیت سے سیاسی جدوجہد کے میدان میں شامل ہوئے۔ تحریکِ خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش و خروش نے برِعظیم کی سیاسی زندگی میں ایک نئی سرگرمی پیدا کر دی تھی اور اس کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ کانگریس کو بھی جو ہندوؤں کی نمایندہ جماعت تھی اس تحریک کی حمایت سے فائدہ پہنچا تھا۔ اب اس کی طاقت اور اس کا اثر حقیقتاً ہندوؤں کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے طفیل تھا۔

ان تحریکات کے حلقۂ اثر میں سارا برِعظیم اور بالخصوص تمام مسلمان تھے۔ مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کا تبلیغی مقصد یہی تھا کہ اسلامی تعلیمات کو ہندومت کے ساتھ اشتراک مقصد سے روکیں۔ مسلمانوں کی ملت اور اسلامی تعلیمات کی خالص پاکیزگی اسی طرح برقرار رہ سکتی تھی کہ ان کی جداگانہ

ہستی اور انفرادیت پر اصرار کیا جائے۔ مجددؒ کا اثر ان کے بعد بھی اپنا نقش مرتسم کرتا رہا۔ اور ان کی فکر نے بعد کی تحریکات کے لیے بھی آب یاری کی۔ شاہ ولی اللہ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان بّرِعظیم کے عام ماحول کا ایک جزو بن کر رہ جائیں۔ وہ مسلمانوں کی علاحدہ ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کی رائے میں مسلم معاشرے کی صحت کا تقاضا یہ تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھا جائے اور انھیں خارجی اثرات سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔ شاہ ولی اللہ کے پیروؤں نے قوم کے ساتھ اپنے روابط کو خاصی وسعت دی۔ اس کی متعدد صورتیں تھیں۔ شاہ صاحب کے افکار کے مطابق تعلیمات اسلامی کی اشاعت کے لیے عام جلسے منعقد کیے اور ان کی تعلیمات کو اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا جو اصطلاحی کم اور عام فہم زیادہ تھی۔ اس کام میں شاہ صاحب کے صاحبزادوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اُنھوں نے اپنی تمام زندگی باپ کے بلند اصولوں اور افکار و آرا کی نشر و اشاعت میں گزار دی۔ متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ان کی زبان ایسی تھی کہ انھیں اوسط درجے کی تعلیم کا آدمی بھی بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز ہفتے میں دو مرتبہ بڑے بڑے اجتماعات میں وعظ کرتے تھے۔ ان کے بھائیوں نے اُردو میں قرآن کے ترجمے کیے۔ یہ اُردو میں مقصدی ادب کی تخلیق کا ابتدائی دور تھا۔ مجدد الف ثانیؒ کی تحریک سے شاہ ولی اللہؒ کی تحریک تک اُردو کو ایک مقصدی رجحان بھی حاصل ہوا۔ وہ اس قابل ہوئی کہ تمام موضوعات کو سمیٹ سکے۔ اور دوسرے اس زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کی متقاضی تھی کہ فارسی کے بجائے، جو اب طبقہ امرا اور تعلیم یافتہ افراد کی زبان تھی، اُردو کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے۔ مجددؒ کے پیروؤں نے بھی اس ضرورت کا احساس کر لیا تھا اور شاہ ولی اللہ کے معتقدین نے بھی اس کو اپنانے کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ان دو ابتدائی تحریکوں کے بعد کا دور اُردو زبان کے عروج اور ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر تحریک کے لیے اب اس زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانا ناگزیر تھا۔ سید احمد شہید کی تحریک اور اس کے بعد اُٹھنے والی ایسی تمام تحریکات جو عام مسلمانوں کی طرف رجوع کرتی تھیں، دوسری کسی زبان کے مقابلہ میں زیادہ تر اُردو ہی میں اپنی سرگرمیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اظہار و بیان کے تمام ذرائع اور وسائل اس زبان میں مخصوص کیے گئے۔ تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں اس زبان کا سہارا سارے بّرِعظیم کے لیے کافی تھا۔ اسلامی تحریکوں کے علاوہ دیگر قوموں کی تحریکیں بھی اُردو کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اُنیسویں صدی کے ابتدا تک یہ زبان اپنے زیادہ وسیع اور بسیط

ماحول میں واحد ''لنگوافرنکا'' کا درجہ رکھتی تھی۔ یہاں کی تمام قوتوں کی اپنی اپنی مختلف تحریکوں کے علاوہ غیر ملکیوں کے لیے بھی، ان کے اپنے مشاغل اور تمام مساعی میں یہی زبان مستعمل رہی۔ عیسائیوں کا تمام تبلیغی کام زیادہ تر اُردو میں ہوا۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں اس زبان کے استعمال پر ہندوؤں کی جانب سے مخالفت شروع ہوئی۔ اپنی قومی اور اصلاحی تحریکوں کے طفیل اس دور میں ہندو، ہندوقومیت کے جذبہ سے سرشار ہو چکے تھے۔ اب انھیں ایسی ہر چیز سے نفرت ہورہی تھی، جو انھیں ان کے ماضی کی یاد دلاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے سب ہندو مسلمان، اُردو کو اپنی ''لنگوافرنکا'' سمجھتے تھے۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' لسانی اعتبار سے اُردو ہندی تنازع کی شکل میں نظر آتی ہے[1] اس حکمت عملی کے تحت ایسی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو ہندوؤں میں ہندوقومیت کا احساس پیدا کرنے کا سبب ہوسکتی تھیں اس کے ردِ عمل کے طور پر ہندی اُردو کا قضیہ شروع ہوا اور ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کا رجحان شدید ہوتا گیا۔ اور پھر جیسے جیسے ہندو مسلم مناقشات بڑھتے گئے ہندی میں سنسکرت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اس بنا پر اُردو اور ہندی دونوں کا ارتقا متضاد سمتوں میں ہونے لگا۔

برِعظیم میں آنے کے بعد مسلمان جہاں جہاں آباد ہوئے اُنھوں نے وہیں کی زبان کو اپنایا اور اسے فارسی رسم الخط میں تحریر کیا۔ اس میں دخیل الفاظ کا استعمال کچھ تو اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی جس کے کثیر التعداد الفاظ عوام کی زبانوں پر عادی ہو چکے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی ہوا کہ فارسی اس زمانہ کی عام علمی اور تہذیبی زبان بھی بنی ہوئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے علوم و معارف کا واحد مخزن یہی زبان تھی۔ اُردو میں فارسی الفاظ کو داخل کرنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا تھا۔ اور اس سے ان کا مقصد اپنے مسلمان آقاؤں کو خوش کرنا تھا[2] مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس زبان کو غیر مسلموں نے پرورش کیا تھا اور مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی غیر مسلموں کے شاندار کارنامے اس کا نمایاں حصہ ہیں۔ فی الحقیقت یہ زبان تمام قوموں کی متفقہ کوششوں سے پروان چڑھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا تھا۔ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے

بّرِعظیم کی متعدد زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اسے اپنی پوری متاع سپرد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔ یہ تو اس زبان کی اپنی خصوصیات اور خوبیاں ہیں کہ اس نے بہت جلد ''لنگوافرنکا'' کا درجہ حاصل کیا اور دوسری قوموں کے لیے بھی جہاں اُنھیں عوام سے مخاطب ہونا پڑتا، اس زبان کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے اُردو کو ہر موقع پر استعمال کیا۔ برِعظیم میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے کے لیے اسلام کے بعد بلاشبہ اُردو ہی اہم ذریعہ ہے[۳] یہ زبان مسلمانانِ برِعظیم کی حیات اجتماعی کی مظہر اور ایک ایسا مجلّا اور مصفا آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی اور تہذیب کے خدوخال پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کی ہر تحریک اس زبان سے بارآور ہوئی۔ حتیٰ کہ برِعظیم کے وہ علاقے جہاں اُردو عام بول چال کی زبان نہیں تھی وہاں اُٹھنے والی اسلامی تحریکات بھی کبھی کبھی اُردو کو ذریعہ اظہار بناتی رہیں۔ اگر اُنیسویں صدی میں برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے کہ یہی زبان تھی جس نے انھیں سیاست میں سرگرم کیا۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں اُردو ہندی تنازعہ زبان کے مسئلہ سے ہٹ کر مذہبی اور تہذیبی مسئلہ بن گیا تھا۔ سیاسی اور قومی احساس کے ارتقا نے شروع شروع میں ایک فرقہ وارانہ شکل اختیار کی اور اس کا نتیجہ زبانوں کی علاحدگی اور رسم الخط کے جھگڑوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب انگریزوں نے سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر اُردو، ہندی یا ہندوستانی سے قطع نظر انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تب بھی ہندو مایوس نہ ہوئے اور اُنھوں نے ہندی کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنی قومی تر حریف اُردو کی مخالفت کو بھی اپنا قومی شعار بنایا۔ چناں چہ ۱۸۶۷ء سے اب تک مختلف طریقوں سے ہندی پرچار اور اُردو دشمنی کی گئی[۴] اور پھر ساتھ ہی ہندوستانی کے نام سے اُردو کو ہندی میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں نے ہندو ذہنیت کے اس لائحہ عمل کو بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اُردو یا اپنی تہذیب کے تحفظ یا اس کے نشوونما کے لیے ایک علاحدہ راستے کی ضرورت محسوس کی جس پر وہ اپنی تہذیب اور نظریۂ حیات کو گامزن رکھ سکیں۔

برِعظیم کی اسلامی تاریخ ہمیشہ ایسی دینی تحریکات کے اثرات کی منت پذیر رہی ہے جن کا مقصد اسلام کا احیا اور برِعظیم میں اس کا نفاذ تھا تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست وجود میں آئے۔ ہر دور میں اسلامی مفکرین اور مجاہدین کے فکروعمل کے نتیجہ میں برابر ایسی تحریکیں اٹھتی رہی ہیں

جن کی بدولت مسلمانوں میں آزاد اسلامی ریاست کا تصور جلا پاتا رہا۔ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان اسی سلسلے کی انتہائی کڑیاں تھیں۔ اس ضمن میں جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے برِعظیم کے مسلمانوں کی مختلف مذہبی، تہذیبی اقدار کے علاوہ اُردو نے بھی مسلمانوں کی توجہ ان کی علاحدہ اور منفرد قومیت کی تشکیل اور اس کے تحفظ و استحکام کی جانب منعطف کرائی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برِعظیم کے مسلمانوں کی قومی و سیاسی تحریکات کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ اُردو ہی کے طفیل مسلمانوں کی قومی زندگی میں وحدت خیال و عمل پیدا ہوئی اور مشترک مقاصد کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُردو کی جانب ہندوؤں کی معاندانہ تحریکوں کے نتیجہ میں مسلمان اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کے تحفظ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان میں دو قومی نظریہ کا احساس جو ابتدا ہی سے ان میں موجود تھا لیکن یہ عام مسلمانوں میں خوابیدہ تھا، اب زیادہ قوی اور شدید ہو گیا۔ اس مرحلہ پر سیّد احمد خاں نے جو دو قومی نظریہ کو اُردو دشمنی کے نتیجہ میں پیش کرتے ہیں، مستقبل میں ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن قرار دیا۔ ہندوؤں کی اُردو دشمنی اور لسانی تنازع نے مسلمانوں کو اسلام کی اجتماعی روح سے آشنا کیا اور ہزار سال کے خوابیدہ ملّی شعور کو بیدار کیا۔ برِعظیم کے مسلمانوں کو وطنیت، علاقائیت اور نسلی تعصبات سے بالاتر رکھ کر ان کو احساسات ملّی اور ملّی مفادات کے زیر اثر رکھا۔ اس زبان کے ذریعہ اس کے ادیبوں، شاعروں صحافیوں، عالموں اور قائدین اور جماعتوں اور اداروں نے مسلمانانِ برِعظیم کی ساری قومی اور اجتماعی کوششوں کو بارآور کیا۔ ان کی تمام قومی اور سیاسی تحریکیں اسی زبان کے سہارے روبہ عمل رہیں اور قبولیت و کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ یہاں اس امر کا اظہار حیرت کا باعث نہیں ہے کہ ہندو جو مسلسل اُردو دشمنی کا اظہار کرتے رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی تحریک آزادی کی مخالفت میں ان کی مستقل تحریکیں جاری رہیں، اپنی تحریکوں کی کامیابی کے لیے اُردو کو استعمال کرنے پر مجبور رہے۔

فی الحقیقت جیسا کہ گزشتہ ابواب میں جائزہ لیا گیا ہے اُردو زبان نے مسلمانوں کی ملی تحریکات کے فروغ اور مسلمانوں میں ملی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، ہر تحریک اس کو اپنے ذریعۂ اظہار کی ضرورت کے طور پر اپناتی رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تمام تحریکات اور بالخصوص تحریک آزادیِ ہند نے اس کے طفیل ہی قبولیت عام حاصل کی۔ ہندوؤں نے ہندی کو بھی اختیار کیا تھا لیکن تمام ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے، انھیں اپنے قوم پرستانہ اور متحدہ قومیت کے خیالات کا حامی بنانے کے لیے اُردو زبان استعمال کرنی پڑی۔ اسے بعض

دوسرے نام بھی دیے گئے لیکن تحریر و تقریر دونوں میں عام طور پر اُردو زبان ہی استعمال کی گئی۔ پھر برِعظیم کے مسلمانوں کے لیے اس کی حیثیت زیادہ اہم تھی۔ اُردو ہی کے سبب ان کے دوقومی نظریہ کے احساس میں شدت پیدا ہوئی جس کی بنیاد پر علاحدگی کی سیاست کا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی علاحدہ اور منفرد قومیت کے تحفظ اور اپنی تہذیب کے احیا کے لیے آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کی۔ اس جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے، قومیت کے احساس کو بیدار کرنے، آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت کے ابلاغ میں اُردو ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوئی۔

❁ ❁ ❁

حواشی

(ذیل میں تمام حوالے جدید سائنٹی فک اصولوں کے مطابق نہایت اختصار سے درج ہیں،
متعلقہ تمام تفصیلات آخر میں ''فہرستِ اسنادِ محولہ'' کے تحت موجود ہیں۔)

باب اوّل

اُردو میں حُبّ ِوطن کی روایت

(۱) حب وطن پر مبنی قدیم ادب

۱- عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، ص ۲۰۰ و نیز ڈاکٹر مسعود حسن ادیب، شہر آشوب، ص ۶

۲- تفصیلات کے لیے ایضاً ص ۱۱-۱۵

۳- عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، ص ۲۱۳

۴- ایضاً

۵- مرزا، وحید، ص ۲۴۵

۶- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۳۱۲-۳۱۳

۷- ایضاً، ص ۲۶۳ و بعدہ، و نیز قریشی، اشتیاق حسین، *Administration*، ص ۱۵

۸- ایضاً، و نیز انصاری، رشید احمد، مقدمے کے متعلقہ حصے۔

۹- تفصیلات کے لیے مرزا، وحید، ص ۲۵۴ و بعدہ۔

۱۰- قریشی، اشتیاق حسین، *Administration*، ص ۱۶

۱۱- ایضاً، تفصیلات کے یو شع۔

۱۲- حسن، ڈاکٹر محمد، ص ۳۰-۳۱

۱۳- ایضاً، ص ۲۳ و تفصیلات کے لیے ص ۳۴ و بعدہ۔

۱۴- قریشی، اشتیاق حسین، *Administration*، ص ۱۷، پدماوت کے تاریخی پہلو کے جائزے کے لیے کلب مصطفی، ص ۱۰۰-۱۲۸

(۲) دکنی ادب میں حُبّ ِوطن اور فکرِ وطن کا اظہار

۱- اس قسم کی بیشتر مثنویاں اب مطبوعہ ہیں۔ و نیز ذوالفقار، ص ۱۲۵

۲- ''فتح نامۂ نظام شاہ'' کو جمیل جالبی نے اُردو (کراچی، جلد ۴۶، شمارہ ۲-۳) میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس ترتیب کے مطابق یہ مثنوی ۱۶۲۰ اشعار پر مبنی ہے۔

۳- احمد، بشیر الدین، ص ۲۹۶

۴- ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ رام راج نے نظام شاہ کو بہت زچ کیا تھا اور عادل

شاہیوں سے مل کر اس کے سارے ملک کو تباہ و برباد کر کے اسے احمد نگر میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے انتقام کی آگ نے اسے بڑا پُر جوش بنا دیا تھا۔ پھر حسین نظام شاہ میدان جنگ کے قلب میں موجود تھا۔ دوسرے رام راج کو اسی کے سپاہیوں نے گرفتار کر کے قتل کر دیا تھا لہٰذا فتح کا سہرا نظام شاہ کے سر رہا۔ حسن شوقی، ص ۵۴۳

۵- فتح نامہ نظام شاہ، ص ۷۴

۶- ایضاً، ص ۷۵ و بعدہ۔

۷- جالبی، ص ۱۵، ۲۳

۸- عبدالحق، مولوی، نصرتی، ص ۸۲

۹- ایضاً، ص ۱۰۶

۱۰- ذوالفقار، ص ۱۳۸

۱۱- عبدالحق، مولوی، نصرتی، ص ۲۲۰

۱۲- فرمان فتح پوری، ص ۱۰۵-۱۰۷

۱۳- روکو، ص ۳۲ و نیز تفصیلات کے لیے ص ۳۱-۳۲ و بعدہ۔

۱۴- صدیقی، عبدالحمید، ص ۱۴۴

۱۵- زور، ڈاکٹر، داستان ادب حیدر آباد، ص ۴۲

۱۶- تفصیلات کے لیے فرشتہ، جلد اول، متعلقہ ابواب۔

۱۷- زور، ڈاکٹر، داستان ادب حیدر آباد، ص ۴۳

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً، جیسے ''کتب خانہ انجمن ترقی اُردو'' کراچی میں۔ ملاحظہ فرمایئے ۹۱۰،۸۷۷

۲۰- زور، ڈاکٹر، داستان ادب حیدر آباد، ص ۴۴-۴۵

۲۱- ذوالفقار، ص ۱۳۹

۲۲- اروِن، جلد دوم، ص ۲۷

۲۳- زور، ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۱۳۰

۲۴- ایضاً، ص ۱۲۹

(۳) فارسی ادب میں حُبّ وطن اور فکرِ وطن کا اظہار

۱- ان کا ایک مفصل جائزہ اس ضمن میں صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی تالیف ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں میں لیا ہے۔

۲- تفصیلات کے لیے عبدالرحمٰن، صباح الدین ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی مدح، بالخصوص کشمیر کے تعلق سے راشدی، حسام الدین، ص۱۸۲۶-۱۸۸۴ و نیز فرمان فتح پوری کشمیر ایرانی شعرا کی نظر میں، ص۳۹-۵۱، فوق محمد دین۔ مزار الشعرائے کشمیر، ص۱۱۶-۱۷۰، قریشی محمد عبداللہ، کشمیر کی فارسی شاعری، ص۵۵-۱۱۱ وغیرہ

۳- تفصیلی جائزے کے لیے اختر جونا گڑھی، آشوب نامۂ ہندوستان مشمولہ تصنیف مذکور

۴- عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، ص۲۱۴

۵- عبدالرحمٰن، صباح الدین، بزمِ تیموریہ، ص۲۶۵

۶- ادیب، مسعود حسن، شہر آشوب، ص۱۴-۱۵

۷- ایضاً، ص۱۵

۸- عبدالغنی، ڈاکٹر، ص۸

۹- ایضاً، ص۱۰

۱۰- عبدالرحمٰن، صباح الدین، بزم تیموریہ، ص۳۰۴-۳۰۵

۱۱- قلمی نسخہ، انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ، بحوالہ نظامی، خلیق احمد تاریخ مشائخ چشت، ص۳۲۲

۱۲- مشمولہ، مہر، غلام رسول، ہماری قومی شاعری کا پہلا دور

۱۳- ایضاً، ص۹۹

۱۴- عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، ص۲۱۵

۱۵- ایضاً، ص۲۱۶

(۴) شمالی ہند کا پہلا دور- ۱۷۵۷ء تک

۱- چاند، شیخ، سودا، ص۴۵

۲- جس کے کلیات کی موجودگی میں خود مسعود حسن رضوی ادیب کو فائز کے شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے پر زیادہ یقین نہیں ہے۔ شمالی ہند کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر، ص۸

۳- جیسے قائم، ص۱۳، شوق، قدرت اللہ، ص۱۹

۴- جعفر زٹلی، ص۲۶-۲۷

۵- ایضاً، ص۲۶

۶- جعفر زٹلی، ص۲۱

۷- ایضاً، ص۴

۸- خصوصاً ص۸۱، ۸۴-۸۶

۹- ص۴۳

(۳) شہر آشوب

۱- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، جرأت، عہد اور شاعری، ص ۴۱-۴۳

۲- ص ۴۲

۳- ادیب، مسعود حسن، شہر آشوب، ص ۱۶

۴- آسی، ص ۲۴-۳۴

۵- ان میں سے ایک کو ڈاکٹر محمد عمر نے ''شہر آشوب حاتم دہلوی'' کے عنوان سے نقوش (لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء) میں شائع کیا ہے۔ اس کے باقی تین بندوں کو مسعود حسن ادیب نے اپنے مقالے بعنوان شہر آشوب میں شائع کیا ہے۔ ص ۱۷

(۴) مثنوی

۱- آبرو نے متعدد مثنویاں عشقیہ موضوعات پر لکھی تھیں۔ مصحفی تذکرہ مصحفی، ص ۷۔ شیفتہ نے ساقی کا ذکر کیا ہے، جس نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا جو وقائع ایام خلافت تک پہنچ کر نا تمام رہ گیا تھا۔ ص ۲۲۹

۲- سودا سے قبل شمالی ہند میں کسی باقاعدہ قصیدہ گو کا ذکر نہیں ملتا۔ ندوی، عبدالسلام، جلد ۲ ص ۱۱۱

۳- ذوالفقار، ص ۲۰۲

۴- ایضاً، ص ۲۲۴

(۵) تحریک احیائے دین اور اُردو ادب

۱- اکرام، شیخ محمد، رود کوثر، ص ۶۳۴، تفصیلات کے لیے اصلح، ص ۳۴۱-۳۴۹

۲- بدرالدین سرہندی، ص ۲۲۰، اخلاص، ص ۲۶۰ و نیز خوشگو

۳- ان کے متعدد اشعار بدرالدین سرہندی نے ان کے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔

۴- ایضاً، ص ۳۳۷-۳۳۸ و بعدہٗ۔

۵- ایضاً، ص ۳۷۷-۳۸۱

۶- اعظم، خواجہ، ص ۱۸۲

۷- آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۱۲۹، خزانۂ عامرہ، ص ۳۲۸

۸- حاکم لاہوری، ص ۲۱۵

۹- اخلاص، ص ۲۶۰، اصلح ص ۵۲۹، قدرت اللہ گوپاموی، ص ۴۵۷

۱۰- انفاس العارفین میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ص ۱۲۳-۱۲۶، ۲۰۱ وغیرہ اور شاہ ولی اللہ نے ان کے بعض مکاتیب بھی درج کیے ہیں۔ ص ۲۶۱، ۲۸۳، ۳۰۳ وغیرہ

۱۱- ان کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کے لیے غلام علی، شاہ، ۹-۱۰، سرور، غلام، ص ۲۹۴

۱۲- شاہ ولی اللہ کے درسِ حدیث کے لیے رحمان علی، ترجمہ ص ۴۱۹ اور مرزا مظہر کے درسِ حدیث کے لیے خان، عبدالقادر، جلد اوّل، ص ۲۲۸ ح، غلام علی شاہ، ص ۲۸

۱۳- اخلاص، ص ۲۱۳، ہندی، بھگوان داس، ص ۱۷۷

۱۴- آزاد بلگرامی، سروِ آزاد، ص ۱۹۹ "یہ تخلص مرزا بیدل نے دیا تھا" صبا۔

۱۵- ایک لاکھ اشعار پر مشتمل دیوان ان سے منسوب ہے۔ نظامی بدایونی قاموس المشاہیر، جلد دوم، ص ۱۶۳

۱۶- ولی اللہ شاہ، انفاس العارفین، ص ۲۰۳-۲۰۴

۱۷- میخانہ درد میں دو لاکھ اشعار کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اکرام، رود کوثر، ص ۶۳۵

۱۸- لطف، ص ۱۸۳

۱۹- جتلا، ص ۲۶۵

۲۰- قائم، ص ۱۰، میر، نکات الشعرا، ص ۹۰، عبدالحیٔ، گل رعنا، ص ۷۹-۸۰، امراللہ الہ آبادی، ص ۲۵۰

۲۱- حسن، میر، ص ۱۸۴

۲۲- قائم، ص ۱۸، اخلاص، امراللہ الہ آبادی، ص ۴۱-۴۲، ہاشمی سندیلوی، ص ۲۵۸

۲۳- عبدالغنی، مرزا، ص ۱۴، لطیف، ص ۳۳-۳۴

۲۴- صبا

۲۵- ناصر جلد اوّل، ص ۱۷۹-۱۸۰، شوق رام پوری، ص ۳۵۶، الف و نیز صبا

۲۶- صابر دہلوی، ص ۵۲۹-۵۳۰

۲۷- شفیق، گل رعنا، ص ۹۲۵

۲۸- خوش گو، ص ۲۰۷

۲۹- آزاد بلگرامی، سروِ آزاد، ص ۲۳۴

۳۰- اکرام، رود کوثر، ص ۶۳۷، غلام نبی، شاہ، ص ۱۰-۱۱، ۲۴ وغیرہ۔ تفصیلات کے لیے قریشی، عبدالرزاق، مرزا مظہر جان جاناں، ص ۵۶-۵۹

۳۱- گردیزی، ص ۱۴۶، امراللہ الہ آبادی، ص ۲۵۸، قاسم، جلد دوم، ص ۱۹۸

۳۲- ایضاً، میر، نکات الشعرا، ص ۵

۳۳- خویشگی، ص ۸۸، آزردہ، ص ۲۷، قاسم جلد اوّل، ص ۱۱۴

۳۴- ایضاً، جلد دوم، ص ۲۶۷، خویشگی، ص ۳۴۲

۳۵- مصحفی، عقد ثریا، ص ۲۵، قاسم، جلد دوم، ص ۱۹۸ و نیز تفصیل کے لیے چاند، شیخ ساقی نامہ درد مند، ص ۵۷۴-۵۷۶

۳۶- شیفتہ، ص ۹۴، آزردہ، ص ۲۸

۳۷- لطف، ص ۱۱۱
۳۸- مصحفی، تذکرہ ہندی، ص ۸۱، کریم الدین، ص ۱۲۲
۳۹- یزدانی، ص ۱۶۵
۴۰- اکرام، رود کوثر، ص ۶۴۲
۴۱- خان، عبدالقادر، جلد اوّل، ص ۱۷۲-۱۷۳
۴۲- سیّد احمد خاں، آثار الصنادید، ص ۲۰۹-۲۱۱، ان کا ایک اُردو مکتوب حال ہی میں دست یاب ہوا ہے۔
۴۳- اکرام، رود کوثر، ص ۶۴۳
۴۴- حالی، حیات جاوید، جلد اوّل، ص ۱۶
۴۵- امیر مینائی، جلد دوم، ص ۱۴۴، رحمان علی، ص ۶۶، شوق، احمد علی، ص ۱۴۳
۴۶- امیر مینائی، جلد دوم، ص ۱۴۴
۴۷- مالک رام، ص ۱۰۳
۴۸- ایضاً، ص ۱۰۳-۱۰۴، صابری، امداد تذکرہ شعرائے حجاز، ص ۲۱۵
۴۹- سیّد احمد خاں، آثار الصنادید، ص ۲۱۶، عبدالحیؒ، ص ۲۷۲

❁ ❁ ❁ ❁

باب دوم

۱- اُردو شاعری، ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

(الف) غزل

۱- میر، نکات الشعرا، ص۳ و نیز شوق، قدرت اللہ، ص۶۴

۲- آزاد، آب حیات، ص۱۳۹

۳- ص۶۶، ۶۸ وغیرہ

(ب) شہر آشوب

۱- آزاد، آب حیات، ص۱۵

۲- عرشی، امتیاز علی خاں، مکتوب بنام ادیب، مسعود حسن، شہر آشوب، ص۲۹

۳- عمر، ڈاکٹر محمد، حسرت کا شہر آشوب، ص۲۴۴-۲۴۵، اس کی تردید ادیب، شہر آشوب ص۲۸-۲۹ میں ہے۔

۴- مشمولہ: اُردو، (اکتوبر، ۱۹۵۷ء)، ص۳۱۷-۳۲۱

۵- جس کو اقتدا حسن نے ادبی دنیا (لاہور، دور پنجم، شمارہ نہم) ص۸۱-۹۶ اور فاروقی، نثار احمد نے نقوش (لاہور، اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص۹۵-۱۰۰ میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

۶- تفصیلات کے لیے حسن، اقتدا، شہر آشوب قائم چاند پوری، ص۶۷-۶۹ فاروقی، نثار احمد، شہر آشوب قائم چاند پوری، ص۱۰۰، ذوالفقار، ص۲۲۲، صدیقی، ڈاکٹر افتخار احمد، شہر آشوب قائم چاند پوری، ص۱۸۱-۱۸۲

۷- سرکار، جلد سوم، ص۴۸، ۴۹ و نیز *Imperial Gazetteer of India*، جلد۱۲، ص۱۵۶

۸- مقدمہ چمنستان شعرا، ص۲۳-۲۴

۹- نظیر کا ذکر اگلے دور میں کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن بعد میں محض ان شعرا کا ذکر کیا جائے گا جو دہلی سے نقل مکانی کر کے لکھنؤ گئے تھے یا لکھنؤ ہی سے تعلق رکھتے تھے یا پھر دہلی کے دور آخر کے شعرا تھے۔ نظیر کا ذکر اس دور کے آخر کے تحت بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ شہر آشوب، جو اس کے کلیات میں شامل ہے، مذکورہ دیگر شہر آشوبوں کی طرح نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہل دہلی کی بدحالی کے اثر سے وجود میں آیا ہے۔ بعینہٖ یہی امر جرأت اور شاہ کمال الدین کمال کے ساتھ بھی ہے۔ اس لیے ان کے شہر آشوبوں کا ذکر بھی

یہیں کیا جا رہا ہے۔

١٠- اس شہر آشوب کو مقام حسین جعفری نے فنون (لاہور، مارچ ١٩٧٠ء) ص ٤٧-٥٦ میں متعارف کرایا ہے۔

١١- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، نظیر ان کا عہد اور ان کی شاعری، ص ٩

(د) قطعہ

١- بحوالہ ہاشمی، نصیرالدین، ٹیپو سلطان کی علمی اور سماجی خدمات، ص ٣١٤

٢- شوستری، زین العابدین، ص ٢٢٠ و بعدہ

٣- ایضاً، ص ١٩٤-١٩٦، ٢٢٠-٢٢٣

(ہ) مثنوی

١- جامعی، اکمل یزدانی، ص ٣٨٠-٣٨٢، جنگ کے اسباب، واقعات اور نتائج کے لیے طباطبائی، جلد دوم، ص ٢١٣-٢٧٩۔ طباطبائی خود بھی جنگ میں شریک تھا۔

٢- شورش عظیم آبادی، ص ٧٩، عشقی، ص ٨٠

٣- قادری، محمد ایوب، علم و عمل، ص ٥٦ ج

٤- ہاشمی، نصیرالدین، ٹیپو سلطان کی علمی اور سماجی خدمات، ص ٣١٥

٥- چغتائی، محمد عبداللہ، ص ٣٥٧

(١) شعرا کا ماتم دہلی (١٨٠٣ء تک)

١- تفصیل کے لیے قلی خاں، متعلقہ صفحات۔ اور بقول آنند رام مخلص اپنی اصلی حالت پر دوبارہ آنے کے لیے اسے ایک مدت دراز درکار ہوگی۔ آتش زدگی کی وجہ سے اب شہر خاک سیاہ ہو گیا ہے

دل سیہ کارش برنگ رنگ داغ افتادہ است
ہمچو دہلی شہر خوبی بے چراغ افتادہ است

تصنیف مذکور، ص ٨٠

٢- میر، ذکر میر، ص ٩٢، ١٠٠-١٠٢، ١٠٤، ١٠٥، ١٠٧، ١٠٩-١١٣۔ مظہر، ص ٥٤ اور سیاسی نتائج سے اقتباس

واز ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کنند

قاسم، جلد اول، ص ٢٦٠، جلد دوم، ص ٢٠، ٤١

٣- اس صورت حال میں ان کی آپ بیتی شاہد ہے کہ وہ کس قدر ملول تھے۔ ص ٩٢، ١٠٢، ١٠٤، ١٠٩-١١٣

(٢) دبستان لکھنؤ

١- تفصیلات کے لیے، صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، لکھنؤ کا دبستان شاعری، باب چہارم

٢- ایضاً، ص ٦٧

۳- خویشگی، ص۳۳۴، شیفتہ، ص۳۲۸
۴- شرر، مقدمہ مثنوی حزن اختر، ص۹
۵- سکینہ، ص۲۹۷
۶- رضوی، ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنؤ کا عروج و زوال، ص۲۳۰
۷- تفصیلات کے لیے شرر، مقدمہ، مثنوی حزن اختر، صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص۶۸ و بعدہ۔

(۳) شعرا کا ماتم لکھنؤ

۱- ادیب، مسعود حسن، شہر آشوب، ص۳۷-۳۸
۲- مشمولہ: جعفری، قمقام حسین، تحقیقی نوادر، ص۱۶-۲۶
۳- ایضاً، ص۳۹-۴۷

(۴) دورِ آخر، ۱۸۵۷ء

۱- ظہیر دہلوی، ص۴۶

(۵) شعرا کا ماتم دہلی، ۱۸۵۷ء

۱- تفصیلات کے لیے رضوی، خورشید مصطفیٰ، ص۳۹۰-۵۷۵ و نیز باب اوّل، مقالہ ہذا۔
۲- اس موضوع پر مبنی مرثیوں، نوحوں، شہر آشوبوں کے دو شعری مجموعے مرتب ہوئے۔ ایک فغانِ دہلی جسے تفضّل حسین کوکب نے ۱۲۷۹ھ میں ترتیب دیا (مطبوعہ دہلی، ۱۲۸۰ھ) اس میں چند نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے انقلابِ دہلی معروف بہ فریاد دہلی شائع کیا (مطبوعہ بدایون، ۱۹۳۱ء) ان نظموں کے تجزیے اور جائزے کے لیے، عبداللہ، ڈاکٹر سیّد، مباحث، ص۲۳۱-۲۷۵
۳- سیّد احمد خاں کی آثار الصنادید میں ان عمارات کی تصویریں ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اشاعت مذکور۔
۴- جعفری، رئیس احمد، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص۱۰۱
۵- تفصیلات کے لیے ظہیر دہلوی، ص۱۱۵-۱۱۶
۶- اجمل خاں، قومی ترانے اور نظمیں، ص۱۴

(۶) تحریک شاہ ولی اللہ

۱- ان کا منتخب کلام، مظہر ص۱۹۱-۱۹۳ اور رحیم بخش دہلوی، ص۵۰۶-۵۱۱ میں ہے۔
۲- عبدالحیٔ، نزہتہ الخواطر، ص ششم، ص۴۱۰
۳- رحمان علی، ص۶۶
۴- آزاد، محمد حسین، دیوانِ ذوق، مرتبہ ص۱۷۱، تنہا، مراۃ الشعراء، ص۴۰۴، علوی، تنویر احمد، ص۵۷، شاہ نصیر

سے اختلاف کے لیے آزاد، آب حیات، ص۴۳۰، و نیز علوی' تنویر احمد، ص۵۰-۶۴۔ ہر جمعہ کو ذوق شاہ عبدالعزیز کے وعظ میں جاتے تھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا: ''مولانا عبدالعزیز اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی گفت گو کو سنتا ہوں اور اُردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں۔'' فراق' ناصر نذیر، ص۶۳ و نیز تفصیلات کے لیے لطفی اور شہابی، ص۱۰-۱۲

۵- صابر دہلوی، جلد اوّل، ص۳۳۳، شیفتہ ص۱۰۰، خویشگی ص۹۴، قاسم جلد اوّل ص۱۳۷

۶- خان' عبدالقادر، جلد دوم، ص۲۰۰-۲۰۱، نجم الغنی، ص۱۳۰، عرشی، دستور الفصاحت، ص۹۱ ح

۷- مصحفی، عقد ثریا، ص۳۷، خویشگی، ص۳۰۰، شیفتہ، ص۵۳۳، قاسم، جلد دوم، ص۲۱۵

۸- نظامی خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، ص۳۸۶ مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت پر منت نے عاشق حمید، امانت شہید سے تاریخ نکالی تھی۔ قادری' محمد ایوب، علم و عمل، جلد اوّل، ص۲۲۸ ح

۹- شیفتہ، ص۶۴۸، قاسم، جلد دوم، ص۳۵۳، سرور، ص۸۳۰

۱۰- صابر، جلد دوم، ص۳۷۸، ناصر، جلد اوّل، ص۱۶۷، خویشگی، ص۲۹۲، سیّد احمد خاں، تذکرہ اہل دہلی، ص۱۶۳

۱۱- قاسم، جلد اوّل، ص۱۶۸، خویشگی، ص۱۰۹، سرور، ص۱۸۱

۱۲- صابر جلد اوّل ص۳۷۳، ناصر، جلد اوّل، ص۱۷۵ ابتلا لکھنوی نے میر شمس الدین احسان کو بھی ان کا بیٹا قرار دیا ہے، ص۶۶

۱۳- قاسم، جلد دوم، ص۱۲۳، سرور، ص۴۹۳، خویشگی، ص۲۵۷

۱۴- سرور، ص۴۹۴، قاسم، جلد دوم، ص۱۲۳۔ منت بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ عرشی، دستور الفصاحت، ص۹۱ ح

۱۵- قاسم، جلد دوم، ص۷۶-۷۷

۱۶- ایضاً، ص۱۲۳

۱۷- مرتبہ محمد ایوب قادری، مشمولہ ولی اللہ شاہ، مجموعہ و صایا اربعہ۔

۱۸- ص۲۰، ۲۶، ۳۵، ۵۳، ۷۰

۱۹- نورالحسن خاں' سید، ص۳۰، مصحفی، ریاض الفصحا، ص۱۰۶

۲۰- رحمان علی، ص۶۷

۲۱- شیفتہ، ص۲۰۷

۲۲- مصحفی، ریاض الفصحا، ص۱۰۶، سرور، ص۲۹۷، خویشگی، ص۱۵۴

۲۳- اشپرنگر، ص۲۰۹

۲۴- مالک رام، ص۲۸۷

۲۵- ایضاً، ص۵۳

۲۶- خویشگی، ص ۲۵۶

۲۷- قاسم، جلد اوّل، ص ۱۱۸، عشقی، ص ۹۲

۲۸- ایضاً، ص ۱۲۴

۲۹- خویشگی، ص ۱۳۸، شیفتہ، ص ۱۷۴، سرور، ص ۲۶۳، قاسم، جلد اوّل، ص ۲۵۴

۳۰- ایضاً، ص ۱۰۶، مصحفی، تذکرہ ہندی، ص ۴۷، سرور، ص ۱۴۷

۳۱- ایضاً، ص ۱۸۱، قاسم، جلد اوّل، ص ۱۶۱

۳۲- ایضاً، ص ۲۷۱، سرور، ص ۲۹۴

۳۳- ایضاً، ص ۲۹۹، قاسم، جلد اوّل، ص ۲۷۲

۳۴- ایضاً، ص ۳۳۴، سرور، ص ۳۵۸

۳۵- ایضاً، ص ۳۷۸، شیفتہ، ص ۲۶۶، قاسم، جلد اوّل، ص ۲۴۲

۳۶- ایضاً، ص ۳۶۳، سرور، ص ۳۹۶، شیفتہ، ص ۳۱۲

۳۷- ایضاً، ص ۳۶۷، قاسم، جلد دوم، ص ۳۴

۳۸- ایضاً، ص ۴۵، شیفتہ، ص ۳۸۸

۳۹- قاسم، جلد دوم، ص ۱۹۵

۴۰- ایضاً، ص ۲۰۰، سیّد مظفر علی خاں، شیفتہ، ص ۵۰۳

۴۱- قاسم، جلد دوم، ص ۲۰۵

۴۲- ایضاً، ص ۲۲۸

۴۳- نساخ، ص ۳۱

۴۴- یکتا، ص ۹۲، ۱۱۹

۴۵- قاسم، جلد اوّل، ص ۱۳۹، محسن لکھنوی، ص ۲۸، حسین خان محمد، ص ۶۱

۴۶- سرور، ص ۷۷۵

۴۷- قاسم، جلد اوّل، ص ۷۷

۴۸- مصحفی، ریاض الفصحا، ص ۲۱۳، ناصر، جلد اوّل، ص ۴۲۴

۴۹- شیفتہ، ص ۶۳۸، سرور، ص ۸۰۸

۵۰- ایضاً، ص ۴۵۹، شیفتہ، ص ۳۹۰

۵۱- عشقی، ص ۳۶۶

۵۲- شیفتہ، ص ۵۱۲

۵۳- ناصر، جلد دوم، ص ۵۹۸

۵۴- جلد اوّل، ص ۱۰۵

۵۵- سیّد احمد خاں، تذکرۂ اہل دہلی، ص ۲۱۶، مالک رام ۱۷۹

۵۶- عبدالحیٔ، گل رعنا، ص ۲۷۲

۵۷- سیّد احمد خاں، تذکرہ اہلِ دہلی، ص ۶۵

۵۸- آزاد، آبِ حیات، ص ۴۱۲، ان کے انتقال پر مومن نے تاریخ کہی تھی:

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ-۱۸۲۴ء

رحمان علی، ص ۱۲۲

۵۹- آزاد، آبِ حیات، ص ۴۱۳

۶۰- رحمان علی، ص ۹۳، صدیق حسن خاں، ص ۷۰

۶۱- مالک رام، ص ۲۸۸

۶۲- شوق احمد علی، ص ۲۸۴-۲۸۷، مینائی، ص ۱۵۱-۱۵۳ و نیز ناصر، جلد اوّل، ص ۳۱

۶۳- شوق قدرت اللہ، ص ۶۱۶

۶۴- ایضاً، ص ۵۴۶

۶۵- قاسم، جلد دوم، ص ۲۲۷، ناصر، جلد اوّل، ص ۱۶۴، مصحفی، تذکرۂ ہندی، ص ۲۲۷

۶۶- محسن لکھنوی ص ۱۹، شورش عظیم آبادی ص ۲۷، عشقی، ص ۳۶

۶۷- ہندی، بھگوان داس ص ۸۰

۶۸- ایضاً، ص ۱۳۴

۶۹- ایضاً، ص ۲۴۰

۷۰- صابر، جلد اوّل، ص ۴۰۰

۷۱- ایضاً، جلد دوم، ص ۴۳۱-۴۳۲

۷۲- خویشگی ص ۳۲۵۔ یہ وہی نعمت ہیں جن کا ذکر اشپرنگر نے شاہ عبدالعزیز کے تعلق سے کیا ہے۔ ص ۲۰۹

۷۳- شیفتہ، ص ۳۱۸، خویشگی ۳۱۶

۷۴- بے نظیر شاہ غلام حسین حریف، امام الدین طالب کے تعلق سے بھی یہی بات کہی جاتی ہے۔ نجم الاسلام اُردو ادب پر تحریکات اسلامی کے اثرات، ص ۲۶۶

(۷) تحریکِ مجاہدین

۱- سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۵۸

۲- مہر، جماعت مجاہدین، ص۲۷۶
۳- ایضاً، سیّد احمد شہید، جلد دوم، ص۴۷۸
۴- ایضاً، جماعت مجاہدین، ص۱۲۹
۵- ایضاً، ص۲۷۶ و نیز سیّد احمد شہید، جلد دوم، ص۲۴۲
۶- مشمولہ، ایضاً، ص۲۵۸
۷- ایضاً، جماعت مجاہدین، ص۲۷۶-۲۷۷
۸- جسے مہر نے سر گزشت مجاہدین ص۲۱۰ میں نقل کیا ہے۔
۹- ندوی، مسعود عالم، ص۱۸۴-۱۸۵، احمد، قیام الدین، ص۲۸۷
۱۰- مشمولہ: مہر، سیّد احمد شہید، ص۲۴۲-۲۴۳
۱۱- ایضاً، ص۲۶
۱۲- ایضاً، سر گزشت مجاہدین، ص۲۷۳، ۴۳۲، احمد، قیام الدین، ص۳۶۷
۱۳- مہر، سر گزشت مجاہدین، ص۳۷۴، ۴۳۳-۴۳۵، ندوی، مسعود عالم، ص۱۰۶، ۱۰۷، ۱۳۷، ۱۳۸
۱۴- قادری، محمد ایوب، تواریخ عجیب، مرتبہ، ص۲۳۸-۲۴۰، احمد، قیام الدین، ص۳۷۸
۱۵- مہر، سیّد احمد شہید، جلد اوّل، ص۲۶
۱۶- صابر، جلد اوّل، ص۳۲۴
۱۷- ایضاً، جلد دوم، ص۲۹۴-۲۹۵، خویشگی، ص۲۵۶
۱۸- مہر، جماعت مجاہدین، ص۳۱۷-۳۲۱
۱۹- احمد، قیام الدین، ص۳۸۷
۲۰- نجم الاسلام، اُردو ادب پر تحریکاتِ اسلامی کے اثرات، ص۲۶۹
۲۱- ثناء الحق، مرتبہ، ص۳۱
۲۲- ان کا دیوان مطبوعہ ہے۔ لاہور، ۱۹۴۵ء
۲۳- جیسے وحدت الوجود و الشہود ص۱۳۹، ۱۴۹ میں۔
۲۴- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص۱۹۵
۲۵- ایضاً، ص۲۰۰-۲۰۲، ۲۰۵، ۲۰۶
۲۶- گیلانی، جلد اوّل، انور شیر کوٹی، انوار قاسمی، ص۶۷، ۶۸، ۷۷، قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص۲۰۹
۲۷- ایضاً، ۲۳۸، ۲۳۹ و نیز قاسم نانوتوی، ص۳۱-۷
۲۸- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص۱۱۴
۲۹- ایضاً، ص۱۱۹

۳۰- ایضاً، ص ۱۳۵-۱۳۸

۳۱- مہر، جماعت مجاہدین، ص ۲۹۵

۳۲- نساخ، ص ۳۳۴، صابر، جلد دوم، ص ۲۲۷، صابر نے زیادہ اشعار درج کیے ہیں۔

۳۳- مہر، جماعت مجاہدین، ص ۲۶۲ تفصیلات کے لیے مالک رام، ص ۲۳۱، ۲۳۲

۳۴- مہر، جماعت مجاہدین، ص ۲۶۱-۲۶۳ ان ہی کے دوسرے صاحبزادے نواب صدیق حسن خاں نثر میں کثیر التصانیف عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ فارسی میں توفیق اور اُردو میں نواب تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں مطبوعہ دیوان موجود ہیں۔

۳۵- ایضاً، ۱۰۱، ۱۰۲

۳۶- ایضاً، ص ۱۰۲، ۱۰۳، یہاں انتخاب منقول ہے۔

۳۷- تفصیلات کے لیے، فائق، ص ۴۶

۳۸- آزاد، آبِ حیات، ص ۴۱۳

۳۹- ایضاً، ص ۴۱۲، ۴۱۳

۴۰- فائق، ص ۱۶

۴۱- عبدالحیٔ، گلِ رعنا، ص ۲۵۰، مہر، جماعت مجاہدین، ص ۲۹۶

۴۲- رحمان علی، ص ۱۲۲، رحیم بخش، ص ۱۲۵

۴۳- دتاسی، خطبات، ص ۹۰، ۹۱

۴۴- عبدالرشید خواجہ، ص ۲۷۸

(۸) جنگِ آزادی

۱- ''اُردو شاعری اور سپہ گری میں عدم تعلق کبھی نہیں رہا''۔ میر، نکات الشعراء، ص ۴۵، ۶، ۷، ۱۲۵

۲- نادرات شاہی اس کا مطبوعہ دیوان ہے۔ اس کی شاعری کے جائزے کے لیے عرشی امتیاز علی خاں، مقدمہ نادرات شاہی عبدالرحمٰن صباح الدین، بزم تیموریہ ص ۳۱۸-۳۲۰ و نیز متعدد تذکرے۔

۳- دیوان جہاں دار مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ میں شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

۴- شوق قدرت اللہ، ص ۴۰۱، ناصر، جلد اول، ص ۲۱۶، ۲۱۷، سرور، ص ۵

۵- شوق قدرت اللہ، ص ۴۰۲

۶- ایضاً، ص ۴۰۴

۷- ایضاً، ص ۳۹۵

۸- شیفتہ، ص ۲۷۰، شوق قدرت اللہ، ص ۳۹۸

۹- ایضاً، ص ۴۰۰

۱۰- سری رام، جلد اوّل، ص۵۲۲

۱۱- خان، عبدالقادر، علم و عمل، ترجمہ جلد اوّل، ص۱۴۳

۱۲- سیّد احمد خاں، تذکرۂ اہل دہلی، ص۵۷-۵۸

۱۳- نظامی، خواجہ حسن، غدر کی صبح وشام، ص۱۸۸

۱۴- جہاد کا فتویٰ، مشمولہ: رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص۵۶۸-۵۶۹

۱۵- تفصیل کے لیے صابری، ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء، ص۲۷۹-۲۸۷

۱۶- نظامی، خواجہ حسن، دہلی کی جان کنی، ص۶۵

۱۷- تفصیلات کے لیے ذکا اللہ، تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ص۷۰۶، ظہیر دہلوی ص۱۲۸، نظامی، خواجہ حسن، غدر کی صبح و شام، ص۸۷، راشد الخیری، ص۷۸، ۷۹

۱۸- شہابی، غدر کیے چند علما، ص۵۵ و نیز مشاہیر جنگِ آزادی، ص۱۱۱

۱۹- مالک رام، ص۱۸۱

۲۰- ایضاً، ص۱۸۳

۲۱- نظامی، خواجہ حسن، غدر کی صبح وشام، ص۱۹۷

۲۲- یہ قطعہ صادق الاخبار دہلی، مؤرخہ ۱۲/ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ کے صفحہ اوّل پر چھپا تھا۔ عکس، قریشی، عبدالرزاق نوائے آزادی ص۶ پر ہے۔

۲۳- مور، ولیم *Indian Mutiny*، جلد اوّل، ص۴۵۴، مور نے یہ شعر اس خط سے نقل کیا ہے جو اسے ایچ ایچ گر۔تھڈ (H.H.Greathed) نے لکھا تھا۔ ایسے اشعار میں سے ممکن ہے بہت سے بہادر شاہ نے کہے ہوں۔ یہ بہادر شاہ سے منسوب کر کے جنگِ آزادی کے دوران تقسیم کیے جاتے تھے۔

۲۴- مطبوعہ صادق الاخبار، دہلی مؤرخہ ۱۲/ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ، صفحہ اوّل، عکس، قریشی، عبدالرزاق نوائے آزادی، ص۶ پر ہے۔

۲۵- *The Indian war of independence*، ص۴۸۷

۲۶- مشمولہ: ساورکر، ص۴۸۷

۲۷- مالک رام، ص۲۱۲

۲۸- ایضاً، ص۱۰۲

۲۹- علوی، منشی امیر احمد، ص۱۳۴، مالک رام ص۱۰۳

۳۰- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص۴۶۹

۳۱- شہابی، مشاہیر جنگِ آزادی، ص۱۲۶

۳۲- ایضاً، غدر کے علما، ص۶۵

۳۳- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۴۶۹

۳۴- سلیمان بدایونی، ص ۹۷

۳۵- قادری، محمد ایوب، جزائر انڈومان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات، ص ۷۱

۳۶- ایضاً، ص ۷۲، ۷۳، مینائی ص ۱۳۸

۳۷- سیّد احمد خان، تذکرۂ اہل دہلی، ص ۱۷۱

۳۸- صابر، جلد اوّل، ص ۲۳۶، ۲۳۷

۳۹- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۰۵

۴۰- نساخ ص ۳۱، صابر، جلد اوّل، ص ۲۷۱

۴۱- سری رام، جلد اوّل، ص ۳۲۰

۴۲- صابر، جلد اوّل، ص ۲۵۷

۴۳- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۰۵

۴۴- صابر، جلد اوّل، ص ۳۶۷

۴۵- تفصیلات کے لیے صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۱۳-۲۱۵

۴۶- صابر، جلد اوّل، ص ۲۹۲

۴۷- راشد الخیری، ص ۷۹

۴۸- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۲۸

۴۹- تفصیلات کے لیے قادری محمد ایوب، مولانا فیض احمد بدایونی، ص ۱۸ و بعدہ، صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۳۳، ۲۳۶ و بعدہ

۵۰- صابر، جلد اوّل، ص ۵۰۱

۵۱- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۴۵

۵۲- صابر، جلد اوّل، ص ۵۱۶

۵۳- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۵۱

۵۴- صابر، جلد دوم، ص ۱۲

۵۵- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۵۳

۵۶- صابر نے ان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور بہت سا کلام درج کیا ہے، جلد دوم، ص ۲۱-۴۰

۵۷- ایضاً، ص ۵۱

۵۸- صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۵۶

۵۹- صابر، جلد دوم، ص ۸۴

۶۰- صابری، مجاہد شعراء، ص۲۸۹

۶۱- ایضاً، ص۲۹۰

۶۲- سری رام، جلد سوم، ص۵۴۳

۶۳- صابری، مجاہد شعراء، ص۳۰۲

۶۴- ایضاً، ص۳۰۴

۶۵- ایضاً، ص۳۰۴

۶۶- ایضاً، ص۳۰۸

۶۷- ایضاً، ص۳۱۶

۶۸- ایضاً، ص۳۱۵

۶۹- اشپرنگر، بحوالہ ایضاً

۷۰- جنگِ آزادی میں شرکت کی تفصیلات کے لیے: قادری محمد ایوب، مولانا کفایت علی اورصابری، مجاہد شعراء، ص۳۱۹، ۳۳۰ میں ہیں۔

۷۱- ایضاً، ص۳۳۰

۷۲- ایضاً، ص۳۳۷

۷۳- تفصیلی حالات کے لیے: ایضاً ص۳۳۷-۳۶۰ و نیز مصطفےٰ علی بریلوی، خان بہادر شہید، متعلقہ صفحات

۷۴- نساخ، ص۳۶۱

۷۵- صابر، جلد دوم، ص۴۳۱

۷۶- صابری، مجاہد شعراء، ص۳۷۱-۳۸۱

۷۷- ایضاً، ص۳۹۲

۷۸- ایضاً، ص۳۹۳

۷۹- صابر، جلد دوم، ص۴۴۶

۸۰- ایضاً، ص۴۳۳

۸۱- ایضاً، جلد اوّل، ص۴۲۹

۸۲- صابری، مجاہد شعراء، ص۴۰۴-۴۰۵

۸۳- ایضاً، ص۴۰۵

۸۴- کنہیا لال، ص۱۹۹

۸۵- مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص۲۱۶

❁....❁....❁....❁

باب سوم

۲- اُردو نثر: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

(ا) افسانوی ادب میں آزادی کا رجحان

۱- گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۸۹
۲- دتا سی، خطبات، ص ۳۴۹
۳- ایضاً ص ۳۵۰، اس تعلق سے باغ و بہار سے مختلف مثالوں کو دتا سی نے ص ۳۵۰، ۳۵۱ میں اور گیان چند نے ص ۱۹۲ میں نقل کیا ہے۔
۴- دتا سی، خطبات، ص ۴۲
۵- ایضاً، ص ۴۳
۶- ایضاً،
۷- گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۱۹۲
۸- عظیم وقار، ہماری داستانیں، ص ۳۵۷
۹- رضوی نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور، ص ۱۰۶
۱۰- عظیم وقار، رجب علی بیگ سرور، ص ۱۰۶
۱۱- ایضاً، ہماری داستانیں، ص ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۳۱
۱۲- ایضاً، ص ۳۸۸، ۳۹۲، ۳۹۳
۱۳- ایضاً، ص ۳۹۳
۱۴- گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۹۰
۱۵- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۳۷۹-۳۸۸
۱۶- ایضاً، ص ۳۹۳
۱۷- ایضاً، ص ۹۰
۱۸- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۴۷۳-۴۷۵
۱۹- احمد کلیم الدین، فن داستان گوئی، ص ۳۹، ۴۰
۲۰- ایضاً، ص ۳۶-۴۷

۲۱- ایضاً، ص ۶۰

۲۲- گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۶۱

(۲) تحریک شاہ ولی اللہ کا نثری ادب

۱- سندھی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۹۱

۲- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۴۹

۳- اشاعت جدید، مشمولہ: ولی اللہ شاہ، مجموعہ وصایا اربعہ، ص ۱۰۵!

۴- رحمان علی، ص ۱۱۵

۵- نجم الاسلام، اُردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات، ص ۲۶۷

۶- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۴۷

۷- علم و عمل، جلد اوّل، ص ۲۰۶، یہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ قادری، محمد ایوب، علم و عمل، ص ۲۰۶

۸- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کی اشاعتوں کے لیے قادری، محمد ایوب۔ مقدمہ مشمولہ: ولی اللہ شاہ، مجموعہ وصایا اربعہ، ص ۲۲، ۲۴ وبعدہ۔

۹- نجم الاسلام، اُردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات، ص ۲۶۷

۱۰- ایضاً

۱۱- سندھی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۸۸، قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۵۰، قادری، حامد حسن، ص ۵۴، یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں ہوا۔ احمد، بشیر الدین، واقعات دارالحکومت ہند، جلد ۳، ص ۵۸۸

۱۲- ایضاً، ص ۵۵، قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۵۰

۱۳- تفصیلات کے لیے شفیع، مولوی محمد، ص ۲۱۴

۱۴- ایضاً، یہ ترجمہ بمبئی سے ۱۲۹۴ھ میں طبع ہوا۔

۱۵- قادری، حامد حسن، ص ۱۴۰

۱۶- دتا کی، خطبات، ص ۹۰، ۹۱

۱۷- سندھی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۹۰

۱۸- قادری، محمد ایوب، مولانا احسن نانوتوی، ص ۴۸

۱۹- سندھی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۸۹

۲۰- ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۵

۲۱- ایضاً، ص ۲۵۵

۲۲- عبدالحق، مولوی، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۵۱

۲۳- ایضاً، ص ۱۵۲

۲۴- مالک رام، ص ۵۴

۲۵- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۳۱

۲۶- ایضاً، ص ۴۲

۲۷- ایضاً، ص ۱۴۳

۲۸- ایضاً، ص ۱۴۴-۱۴۸

(۳) تحریکِ مجاہدین کا نثری ادب

۱- جیسے سکینہ، ص ۳۳،۳۴

- ہنٹر، ص ۱۰۳،۱۰۴

- ہدایت اللہ، ص ۱۵۲،۱۵۳

- حیرت دہلوی، ص ۴۴۴

ہدایت اللہ، ص ۱۵۲

ایضاً

ہنٹر، ص ۴۵

۸ قادری، حامد حسن، ص ۱۹۳

۹ دتاسی، خطبات، ص ۹۰

۱۰ ایضاً، ص ۹۰،۹۱

۱۱ سکینہ، ص ۳۵، تفصیلات کے لیے مہر، جماعت مجاہدین، ص ۳۰۵-۳۰۹

قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۷۶

۱۳- رحمان علی، ص ۵۵

۱۴- ایضاً، ص ۱۷۶، ۱۷۷، یہاں چوالیس کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ نیز یوسف علی، علامہ عبداللہ *Karamat Ali*، ص ۷۵۲-۷۵۴

۱۵- ایضاً، ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۱۹۹

۱۶- تفصیلات کے لیے اختر اور ینوی، ص ۳۹۵-۴۰۵

۱۷- ایضاً، ص ۴۰۶

۱۸- تفصیلات کے لیے احمد، قیام الدین، ص ۳۸۵ وبعدہ

۱۹- ایضاً

۲۰- ایضاً

۲۱- ایضاً

۲۲- ایضاً

۲۳- سعید اللہ، ص ۲۸، امام خاں نوشہروی، تراجم علمائے حدیث، ص ۲۳۰، ۲۳۱

۲۴- ایضاً، ص ۲۳۲

۲۵- سعید اللہ، ص ۲۴۴، ان کے تفصیلی مطالعے کے لیے سعید اللہ۔ تصانیف کی تعداد کے لیے ص ۸۳، ۸۴، ح وبعدہ

۲۶- امام خاں نوشہروی، تراجم علمائے حدیث، ص ۲۵۱-۲۶۱، اس میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے سعید اللہ ص ۱۹۲-۱۹۵ بالخصوص ۱۹۵-۱۹۸، پھر بیشتر تصانیف بھی جو دفتر تاریخ بھوپال سے متعلقہ بعض علما کی تحریر کردہ تھیں، نواب صدیق حسن خاں اور ان کے صاحبزادوں نواب نور الحسن خاں اور نواب علی حسن خاں کے نام سے منسوب ہو کر شہرت کا باعث ہوئیں۔ تفصیلات کے لیے: نادم سیتاپوری خیابانِ غالب، ص ۲۴۳، ۲۴۴

۲۷- مالک رام، ص ۲۳۲

۲۸- ایضاً، ص ۲۳۲

۲۹- ندوی، مسعود عالم، ص ۲۱۴

۳۰- مہر، جماعتِ مجاہدین، ص ۳۱۳

۳۱- سیّد احمد خان، تذکرۂ اہل دہلی، ص ۴۲

۳۲- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۲۱

۳۳- ایضاً، ص ۳۱، ۳۲، ۱۴۳، ۱۴۴

۳۴- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۷۰-۷۹

۳۵- امام خاں نوشہروی، تراجم علمائے حدیث، ص ۳۹۶

۳۶- ایضاً، علمائے اہلِ حدیث کی علمی خدمات، ص ۴۷

۳۷- ایضاً، تراجم علمائے حدیث، ص ۳۹۶

۳۸- مہر، جماعتِ مجاہدین، ص ۳۰۵-۳۰۹

۳۹- ایضاً، سرگزشت مجاہدین، ص ۲۲۹

۴۰- نجم الاسلام، اُردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات، ص ۲۶۹

۴۱- ندوی، مسعود عالم، ص ۲۱۴

۴۲- احمد، قیام الدین، ص ۳۸۶، ۳۸۷ و نیز اختر اورینوی، ص ۴۱۱-۴۱۳

۴۳- مہر، سرگزشت مجاہدین، ص ۶۶۰، ۶۶۲ وبعدہ

۴۴- ان کی کثیر اُردو تصانیف کی فہرست کے لیے امام خاں نوشہروی، تراجم علمائے حدیث، علمائے اہل حدیث کی علمی خدمات۔

(۴) تحریک ردعیسائیت اور اُردو: دورِ اوّل

۱- مارش مین، جلد اوّل، ص ۳۴۲، تفصیلات کے لیے ہیبر اور لارڈ کی تصانیف مذکور جدید مطالعے اور جائزے پر مبنی ہیں۔

۲- ایک اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۵۲ء تک برِّعظیم میں ۲۲ مشنری سوسائٹیاں، ۳۱۳ تبلیغی مراکز، ۴۴۳ تبلیغی ادارے، ۶۹۸ مقامی واعظین، ۳۳۱ کلیسا جن میں ۱۸۴۱ مقامی پادری تھے۔ مقامی عیسائیوں کی تعداد ۱۲۱۹۱ ہو گئی تھی۔ مقامی زبانوں میں تعلیم دینے والے ۱۳۴۷ سکول اور ۱۱۹۳ اقامتی سکول اور مقامی طلبا کے لیے ۱۲۶ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے سکول تھے۔ لڑکیوں کے لیے ۳۴۷ سکول اور ۱۰۲ اقامتی سکول قائم کیے گئے تھے۔ مجموعی طور پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ۲۵ پریس کام کرتے تھے۔ مالیسن

۳- سلیمن ۱۰، ۱۲، فلپس East India Company، ص ۱۹۱

۴- ساورکر، ص ۵۶

۵- سیّد احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، ص ۲۷ تفصیلات کے لیے صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۷ و بعدہ اور ثبوت کے لیے کلارک، ص ۴-۹، ۱۶۲-۱۶۴، ص ۱۳۷، ۱۳۸ و نیز امبری، ص ۱۴۱-۱۵۲ و بعدہ۔

۶- آنند چنی لال، ص ۱۱۱، سیّد احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، ص ۳۱، چٹوپادھیا، ص ۳۱

۷- اینگر، ص xi، آنند چنی لال، ص ۲۶

۸- سیّد احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، ص ۲۷ و نیز ڈار، ص ۲۳

۹- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۹۳

۱۰- تفصیلات کے لیے صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۱، ۲۳، ۲۶، ۳۰، ۳۲، ۹۶، ۱۱۷ و بعدہ، سیّد احمد خان، اسباب بغاوت ہند، ص ۱۴ مہر علی، ص ۲۰۳-۲۰۵ اس ضمن میں عیسائی مبلغین کے خلاف ہندوستانیوں کے مشتعل ہونے اور تشدد پر مجبور ہونے کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایضاً ص ۱۳۷-۱۵۷

۱۱- اہم دست یاب کتابوں کی فہرستوں کے لیے دتاسی، خطبات، ص ۲۸، ۳۶ وغیرہ، عبدالحق 'مولوی، قاموس الکتب، ص ۱۰۸۹ و بعدہ، صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۹۵-۱۴۴، احمد عزیز ص ۲۶۲ و بعدہ۔ عہد نامہ جدید کا ترجمہ اُردو میں پہلے پہل شولز نے ۱۷۴۵ء میں کر دیا تھا (ہو پر، ص ۴۶) اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک انجیل کے متعدد ترجمے ہوئے (تفصیلات کے لیے، ہو پر ص ۴۷-۵۲)

۱۲- دہیری، ص ۱۶۰، ۱۶۱ و نیز موئر سرولیم The Mohammadan Controversy بحوالہ معین الحق ۱۸۵۷ء، ص ۴۳

۱۳- مہر علی، ص ۲۰۳

۱۴- ایضاً، ص ۲۰۴

۱۵- ایضاً، ص ۲۰۵

۱۶- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۳۷، ۲۲۵، ۲۲۶

۱۷- ایضاً، ص۱۴۰

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً، ص۲۴۱

۲۰- مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص۲۴۰

۲۱- فنڈر کے ساتھ مولانا آل حسن، رحمت اللہ کیرانوی کے مناظروں کی تفصیلات کے لیے مہر علی ص ۲۰۳ ح ونیز صابری، فرنگیوں کا جال، ص۱۵۰، ۲۳۲-۲۳۳

۲۲- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص۱۵۰-۱۵۴

۲۳- شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، ص۳۰، مشاہیر جنگِ آزادی، ص۱۳۹

۲۴- صابری، فرنگیوں کا جال، ص۲۴۳، مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص۲۴۱، دونوں نے عیسائیت کے متعلق اکثر ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ ایضاً، ص۲۳۹

۲۵- ایضاً، ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء، ص۲۳۳-۲۳۴، قادری محمد ایوب، فیض احمد بدایونی، ص۱۳

۲۶- ایضاً، ص۱۶، مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص۲۴۱، ۳۰۸

۲۷- صابری، فرنگیوں کا جال، ص۱۲۵

۲۸- ایضاً، ص۱۲۶

۲۹- ایضاً، ص۱۲۷

۳۰- ایضاً، ص۱۲۸، ۱۲۹

۳۱- ایضاً، ص۱۳۰

۳۲- عبدالحق، مولوی، قاموس الکتب، ص۸۲۴

۳۳- ایضاً، ص۸۰۸

۳۴- ایضاً، ص۸۰۰

۳۵- ایضاً، ص۸۰۳

۳۶- ایضاً، ص۸۰۶

۳۷- ایضاً، ص۸۲۲

۳۸- ایضاً

۳۹- ایضاً، ص۸۰۷

۴۰- پیغامِ محمدی، ص۳۰۱ بحوالہ ایضاً

۴۱- ایضاً

۴۲- ایضاً، ص۸۰۸

۴۳- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۳۳
۴۴- معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۴۵
۴۵- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۴۳
۴۶- پیغامِ محمدی، ص ۳۰۲ بحوالہ عبدالحق 'مولوی، قاموس الکتب، ص ۸۲۷
۴۷- ایضاً، ص ۸۲۷
۴۸- ایضاً، ص ۸۰۳
۴۹- ایضاً، ص ۸۰۴
۵۰- صابری، تاریخ اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۱۱۱، ۱۱۲ و نیز فرنگیوں کا جال، ص ۲۱۰
۵۱- ایضاً، ص ۲۱۰ و نیز تاریخ اُردو صحافت، ص ۲۵۵
۵۲- دتا سی، خطبات، ص ۳۳، صابری، تاریخ اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۲۲۶، فرنگیوں کا جال، ص ۲۱۰
۵۳- ایضاً و نیز، تاریخ اُردو صحافت، ص ۲۱۷
۵۴- ایضاً، فرنگیوں کا جال، ص ۲۱۰

(۵) جنگِ آزادی اور اُردو ادب

۱- یہ خیال کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں "وہابیوں" نے حصہ نہیں لیا تھا۔ (مجمدار *The Sepoy Mutiny*، ص ۳۷) غلط ثابت ہوتا ہے۔ مہر، سرگزشت مجاہدین، ص ۲۹۱-۲۹۵، احمد، قیام الدین، ص ۲۶۰، ۲۶۱، رضوی 'خورشید مصطفےٰ، تحریک ۱۸۵۷ء کا ایک ماخذ، ص ۱۲-۲۶، نظامی 'خلیق احمد، ۱۸۵۷ء کا ایک تاریخی جائزہ، ص ۱۴۴، ۱۴۵، قریشی، *Ulema....*، ص ۱۹۹ وغیرہ
۲- گیریٹ، جلد دوم، ص ۲۸۲
۳- قریشی، *Ulema.....*، ص ۱۹۹
۴- گیریٹ، جلد دوم، ص ۲۸۲
۵- فاطمہ، ص ۴۳
۶- گیریٹ، جلد دوم، ص ۲۸۲
۷- قریشی، *Ulema....*، ص ۱۹۸، معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۱۹۴
۸- مہر، سیّد احمد شہید، ص ۲۵۸-۲۹۰
۹- کنہیا لال، ص ۱۹۹، مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۰۶
۱۰- ایضاً، سرگزشت مجاہدین، ص ۲۹۱-۲۹۳
۱۱- احمد 'قیام الدین، ص ۳۸۶، درّانی، ص ۱۸۵
۱۲- معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۳۸۶

۱۳- ایضاً، ص ۳۸۶ ح، رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص ۴۶۹-۴۷۰

۱۴- انور شیر کوٹی، انوارِ قاسمی، ص ۳۹

۱۵- ایضاً، معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۴۶ ح، ۳۷۸، ۳۷۹

۱۶- ایضاً، ص ۴۶ ح

۱۷- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۵۴

۱۸- معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۴۶ ح، ۲۷۹، انور شیر کوٹی، انوارِ قاسمی، ص ۲۶۳، عاشق الٰہی، حصہ اول، ص ۴۷، محمد میاں، علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم، ص ۲۵۲

۱۹- رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص ۴۶۹

۲۰- گیلانی، جلد دوم، ص ۱۲۸-۱۳۱ و بعدہ، انور شیر کوٹی، انوارِ قاسمی، ص ۳۱۱، ۳۱۲ و بعدہ

۲۱- عاشق الٰہی، حصہ اوّل ص ۴۷، مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۴۲، ۴۳

۲۲- تفصیلات کے لیے مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۵۰-۲۵۷، رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص ۴۵۸-۴۶۱، عاشق الٰہی، حصہ اوّل، ص ۱۷، ۲۷، ۴۷ و بعدہ، معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۳۷۷-۳۸۰، صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۸، ۹، ۲۶۷، ۲۶۸، قریشی، Ulema....، ص ۲۰۱، ۲۰۲

۲۳- مہر، سرگزشت مجاہدین، ص ۴۷۴

۲۴- شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص ۳۰، رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص ۴۷۰، ۴۷۱

۲۵- عبداللطیف، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۴۶

۲۶- سندھی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، ص ۱۴۵

۲۷- ہنٹر، ص ۱۳۸

۲۸- مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین، ص ۱۰۸، شہابی، سیّد احمد اللہ شاہ، متعلقہ صفحات

۲۹- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۸۰

۳۰- ص ۳۵۵-۳۶۰

۳۱- شیروانی، محمد شاہد خاں، مقدمہ، ص ۱۵۴

۳۲- ایک رائے کے مطابق یہ فتویٰ خود مولانا فضل حق کا تجویز کردہ تھا۔ مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۰۶

۳۳- شیروانی، محمد شاہد خاں، مقدمہ، ص ۱۶۸

۳۴- تفصیلات کے لیے صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۳۳ و بعدہ۔

۳۵- مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۴۳

۳۶- فتویٰ مشمولہ: رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص ۵۶۸

۳۷- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۳۸

۳۸- ایضاً، ص ۲۴۳

۳۹- ایضاً

۴۰- ایضاً

۴۱- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۲۴۴ و بعدہ۔ صوبہ دار بنائے جانے کے سلسلے میں متضاد آرا ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہادر شاہ نے اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ (گیرٹ، جلد دوم، ص ۲۷۰) دوسرے انھیں آگرے کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا (مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۴۷)

۴۲- قادری، محمد ایوب، مولانا فیض احمد بدایونی، ص ۱۴، ۱۵، ۲۰ و بعدہ۔

۴۳- ایضاً، ص ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۳۰، صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۳۳ و بعدہ۔

۴۴- قادری، محمد ایوب، فیض احمد بدایونی، ص ۳۹، ۴۰، صابری، مجاہد شعراء، ص ۲۴۲، مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۱۰

۴۵- شہابی، مشاہیر جنگِ آزادی، ص ۳۲

۴۶- صابری، مجاہد شعراء، ص ۳۲۰-۳۲۲

۴۷- ایضاً، ص ۳۳۳

۴۸- ساورکر، ص ۱۵

۴۹- لطف اللہ، ص ۲۴

۵۰- شہابی، کمپنی اور باغی علماء، ص ۱۳۷، شہابی کا بیان ہے کہ بیدار بخت نے یہ اخبار نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں کے مشورے سے جاری کیا تھا۔

۵۱- ایضاً، مشاہیر جنگِ آزادی، ص ۲۶۴

۵۲- ایضاً، ص ۴۷، ۴۸

۵۳- ایضاً، ص ۴۹

۵۴- رضوی، خورشید مصطفیٰ، ص ۴۶۳

۵۵- جنگِ آزادی کے بارے میں غالب کے متنازعہ رویے کے لیے نارنگ، ص ۷۶، ۸۱، ۸۸، معین الرحمن ص د ۱ و بعدہ۔ آزاد، ابوالکلام، غالب اور ابوالکلام، ص ۱۵۱-۱۵۳ و بعدہ۔

۵۶- تفصیلی حالات کے لیے غالب، دستنبو، ص ۳۹۸، ۴۰۴، ۴۰۵، مہر، غالب، ص ۲۴۱-۲۸۰، اکرام، غالب نامہ، ص ۱۲۸-۱۳۶، رسل، رالف، ص ۱۳۲-۱۵۵

۵۷- غالب، دستنبو، ص ۳۹۷، ۳۹۸

۵۸- اسے بعد میں مالک رام اور عبدالستار صدیقی نے متعارف کرایا۔ تفصیلات کے لیے معین الرحمن ص ۲۰۰، نیز نقل کے لیے ص ۲۰۱-۲۰۳

۵۹- جیسے، دستنبو، ص۳۸۴، ۳۸۹، ۳۹۵، ۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۰-۴۰۳ وبعدہ۔

۶۰- اس ضمن میں غالب کے خطوط کا ایک بہتر انتخاب معین الرحمٰن ص ۱۲۰-۱۷۰ میں ہے۔

۶۱- اُردوئے معلیٰ، ص۵۸

۶۲- ایضاً، ص۱۰۴

۶۳- خطوط غالب، ص۲۷۰

۶۴- ایضاً

۶۵- ایضاً

۶۶- ایضاً

۶۷- ایضاً

۶۸- ایضاً

۶۹- ایضاً، ص۱۴۵

۷۰- گیان چند، ۱۸۵۷ء اور اُردو شعرا، قسط نمبر۳، ص۳۶

۷۱- خطوط غالب، ص۲۸۵

۷۲- ایضاً، ص۲۹۳

۷۳- ایضاً، ص۷۰

۷۴- ایضاً، ص۲۷۳

۷۵- ایضاً، ص۲۶۶

۷۶- بحوالہ مہر، غالب، ص۲۷۴

۷۷- صابری، مجاہد شعراء، ص۲۷۵ وغیرہ

۷۸- دتا کی، خطبات، ص۹۴

۷۹- ایضاً، ص۹۵

۸۰- ایضاً، ص۱۶۴

۸۱- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص۴۷۱

۸۲- صابری، مجاہد شعراء، ص۳۸۴

۸۳- ایضاً، ص۳۹۳

۸۴- فتویٰ، مشمولہ: رضوی، خورشید مصطفےٰ، ص۵۶۹

(۶) جنگِ آزادی اور اُردو زبان

۱۔ صدیقی' ڈاکٹر ابواللیث، بہادر شاہ ظفر کے فرامین، ص ۶۱، گیریٹ نے ان کا ترجمہ اپنی تصنیف مذکور میں کیا تھا۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی نے غدر کے فرامین کے نام سے ان کا ترجمہ کیا تھا۔ اب یہ اصل فرامین دست یاب نہیں۔ کچھ فرامین کا انگریزی سے اُردو میں ایک اور ترجمہ رضوی' خورشید مصطفےٰ ص ۵۶۱، ۵۶۲ میں ہے۔ ایسے فرامین کا ایک اور ترجمہ رضوی' خورشید مصطفےٰ، ص ۵۶۱، ۵۶۲ میں ہے۔ ایسے فرامین کا ایک اور مجموعہ صدیقی' محمد عتیق اٹھارہ سو ستاون، ص ۲۷۷-۳۳۳ میں ہے۔

۲۔ اس کی بجنسہٖ نقل کے لیے رضوی' خورشید مصطفےٰ ص ۵۵۶، ۵۵۷

۳۔ ایضاً

۴۔ قریشی' عبدالرزاق، نوائے آزادی، ص ج

۵۔ رضوی' خورشید مصطفےٰ، ص ۷

۶۔ ایضاً، ص ح

۷۔ مشمولہ: ایضاً، ص ۵۵۴، ۵۵۵

۸۔ ایضاً، ص ۵۵۴

۹۔ بحوالہ قادری' محمد ایوب، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، باب ششم۔

۱۰۔ ذکاءاللہ، تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ص ۶۷۵ معین الحق، ۱۸۵۷ء، ص ۱۹۴، ۱۹۵

۱۱۔ گیان چند، جنگِ آزادی اور اُردو شعراء، ص ۳۴

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ مشمولہ:، رضوی' خورشید مصطفےٰ، ص ۵۶۸

۱۴۔ مشمولہ: کنہیالال، ص ۳۰۰-۳۰۳، مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۱۶، ۲۱۷

۱۵۔ رضوی' خورشید مصطفےٰ ص ۵۵۳، اس ضمن میں جو اشتہارات نانا صاحب نے جاری کیے تھے وہ صدیقی' محمد عتیق اٹھارہ سو ستاون، ص ۳۳۷-۳۴۰ میں منقول ہیں۔

۱۶۔ مشمولہ: رضوی' خورشید مصطفےٰ، ص ۵۵۲، ۵۵۳

۱۷۔ قریشی' عبدالرزاق، نوائے آزادی، ص ب

۱۸۔ مشمولہ: ایضاً، ص س

۱۹۔ مشمولہ: ایضاً، ص ع، اسی مضمون کا ایک اور عوامی اشتہار حیدرآباد میں مشتہر ہوا تھا۔ مشمولہ صدیقی' عتیق، اٹھارہ سو ستاون، ص ۳۷۷، ۳۷۸

۲۰۔ قریشی' عبدالرزاق، نوائے آزادی، ص ب

۲۱۔ ایضاً، ص ل

۳-صحافت

(ا) ۱۸۵۷ء سے قبل کی سیاسی صحافت

۱- صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۱۶۰، صابری، تاریخ اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۵۲، خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۳۵
۲- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۱۶۰ تفصیل کے لیے صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۵۲، ۵۳
۳- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۱۵۵
۴- صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۵۵
۵- خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۳۹
۶- صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۶۵، ۶۶
۷- ایضاً، ص ۶۶، ۶۷
۸- صدیقی، عتیق، صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۳۱ و نیز خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۱۵۳
۹- تفصیلات کے لیے صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۹۴، ۹۵ و بعدہ۔
۱۰- کیفی، ص ۱۸۷
۱۱- ایضاً، ص ۱۶۲، صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۱۹۷
۱۲- دتاسی، خطبات، ص ۳۱
۱۳- صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۱۰۸، ۱۰۹
۱۴- ایضاً، ص ۱۱۱
۱۵- ایضاً، ص ۱۱۲، ۱۱۳ و بعدہ۔
۱۶- ایضاً، ص ۱۳۳-۱۳۵
۱۷- ایضاً، ص ۱۳۶، ۱۳۷
۱۸- ایضاً، ص ۱۳۷
۱۹- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۳۴
۲۰- ایضاً، ص ۳۳۵
۲۱- ایضاً، ص ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۴۰ و نیز صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۲۰۳
۲۲- ایضاً، ص ۲۶۷
۲۳- انصاری، مفتی محمد رضا، ص ۱۱۳-۱۲۷

۲۴- صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۱۲

۲۵- صرف اس تاریخ تک کی جلدیں ''عبدالباری اکادمی'' فرنگی محل لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ انصاری، مفتی محمد رضا، ص ۱۱۳

۲۶- بحوالہ منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۸۴، صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۱۴

۲۷- ایضاً، ص ۲۱۶

۲۸- سحر سامری، ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۶ء بحوالہ ایضاً

۲۹- ایضاً، صوبہ شمالی مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۳۲، ۱۳۱

۳۰- خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان وہند میں، ص ۱۵۴

۳۱- صابری نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، فرنگیوں کا جال، ص ۲۱۰-۲۱۳

(۲) جنگِ آزادی اور اُردو صحافت

۱- بحوالہ، صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۲۶۳، ۲۶۴

۲- اس اشتہار کا تذکرہ صادق الاخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۹ر مارچ ۱۸۵۷ء میں کیا ہے۔ ایضاً، ص ۳۶۶

۳- اشاعت مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۸۵۷ء بحوالہ ایضاً، ص ۳۶۵

۴- صادق الاخبار، مورخہ ۱۹ر مارچ ۱۸۵۷ء بحوالہ ایضاً ص ۳۶۶، صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۲۷۳

۵- صادق الاخبار، مورخہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء، مشمولہ: نظامی، خواجہ حسن، غدر کے اخبار، ص ۱۵

۶- مشمولہ: ایضاً، ص ۱۲، ۱۴

۷- صادق الاخبار، مورخہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء بحوالہ ایضاً، ص ۱۴

۸- صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۲۹۴

۹- صادق الاخبار، مورخہ ۲۳ر اگست ۱۸۵۷ء بحوالہ نظامی، خواجہ حسن، غدر کے اخبار، ص ۲۱

۱۰- صادق الاخبار، مورخہ ۱۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء، بحوالہ ایضاً، ص ۲۲

۱۱- بہادر شاہ کے مقدمے میں چونی کا بیان۔ گیریٹ، جلد دوم، ص ۱۳۱

۱۲- ایضاً، ص ۱۳۱، ۱۳۲

۱۳- کیننگ بحوالہ صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۵۷۔ گارساں دتاسی نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا ذمہ دار اخبارات ہی کو ٹھہرایا ہے۔ خطبات، ص ۲۱۸

۱۴- گیریٹ، جلد دوم، ص ۱۳۱

۱۵- ایضاً

۱۶- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۲۸۵، صابری، اُردو صحافت، حصہ اوّل، ص ۲۹۶
۱۷- ایضاً
۱۸- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۲۵۷
۱۹- یوسف علی، ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص ۲۵۳
۲۰- گیریٹ، جلد دوم، ص ۱۲۸-۱۳۱
۲۱- صادق الاخبار، مورخہ ۲/اپریل ۱۸۵۷ء، بحوالہ صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۶۸، ۳۶۹
۲۲- چپاتیوں کی تقسیم مجاہدین کے مابین پیغام رسانی کے مقصد کے تحت کی جاتی تھی۔ تفصیلات باب اوّل مقالہ ہذا کے متعلقہ صفحات میں موجود ہیں۔
۲۳- دہلی اُردو اخبار، مورخہ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء، بحوالہ صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۶۹
۲۴- اس کی مثالوں کے لیے ایضاً، ص ۳۶۹-۳۷۲
۲۵- دہلی اُردو اخبار، مورخہ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء، بحوالہ ایضاً، ص ۳۷۲
۲۶- جیسے سراج الاخبار مورخہ ۱۱/مئی ۱۸۵۷ء مشمولہ: ایضاً، ص ۳۷۲-۳۷۴
۲۷- مشمولہ: ایضاً، ص ۳۷۴-۳۸۱
۲۸- ایضاً، ص ۳۸۲، ۳۸۳
۲۹- ایضاً، ص ۳۸۳، ۳۸۴ و نیز گیان چند، جنگِ آزادی اور اُردو شعرا، قسط دوم، ص ۴۱
۳۰- بحوالہ صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۹۵، ۳۹۶
۳۱- یہ قطعات گزشتہ اوراق میں تحریر ہوئے ہیں۔
۳۲- بحوالہ صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۹۵، ۳۹۶
۳۳- اخبار الظفر، مورخہ ۱۲/جولائی ۱۸۵۷ء، بحوالہ ایضاً، ص ۳۹۶
۳۴- اخبار الظفر، مورخہ ۱۲/جولائی ۱۸۵۷ء، بحوالہ ایضاً، ص ۳۹۷
۳۵- گیان چند، جنگِ آزادی اور اُردو شعرا، قسط دوم، ص ۳۳
۳۶- ایضاً، و نیز فاروقی، خواجہ احمد، ص ۲۰۳
۳۷- ایضاً
۳۸- مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص ۲۲۵
۳۹- لطف اللہ، ص ۲۴
۴۰- قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۵۱
۴۱- ایضاً، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، باب نہم
۴۲- ایضاً

۴۳- تفصیلات کے لیے صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۴۰۶-۴۰۸
۴۴- خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۱۷۷، اس قسم کی مثالوں کے لیے ص ۱۶۳، ۱۶۴
۴۵- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۳۹۸
۴۶- ایضاً
۴۷- نٹ راجن، ص ۶۸
۴۸- ایضاً
۴۹- عبدالقادر، شیخ، *Famous*....، ص ۱۴۹، و نیز باقر، ص ۹
۵۰- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۴۰۱، خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۱۷۶
۵۱- باقر، ص ۱۰
۵۲- صدیقی، عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، ص ۴۰۳

۴- متفرقات

سیاسی اور قومی موضوعات پر مشتمل ادب

۱- نجم الاسلام، تین نثری نوادر، ص ۱۵۳، یہ قلمی نسخہ ان ہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ایک دوسرا قلمی نسخہ مرقومہ ۱۱۹۶ھ ''کتب خانہ انجمن ترقی اُردو'' کراچی میں ہے۔ افسر امروہوی، ص ۴۶۰
۲- نجم الاسلام، تین نثری نوادر، ص ۱۵۴
۳- ایضاً، ص ۱۶۱
۴- ایضاً
۵- ایضاً، ص ۱۶۲
۶- ہاشمی، نصیر الدین، دکن میں اُردو
۷- نجم الاسلام، تین نثری نوادر، ص ۱۵۴ ح
۸- ایضاً
۹- ایضاً
۱۰- صدیقی، عتیق، صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۵۳
۱۱- ایضاً، ص ۱۵۵
۱۲- ایضاً، ص ۱۸۱
۱۳- ہاشمی، نصیر الدین، دکن میں اُردو، ص ۱۵۳

۱۴- ایضاً

۱۵- رنگین، ص ۷۸

۱۶- معین الحق، مقدمہ، اخبار رنگین، ص ۲۹

۱۷- خان، صابر علی، ص ۲۴۱

۱۸- رنگین، ص ۷۳

۱۹- ص ۶۸

۲۰- گیان چند، جنگِ آزادی اور اُردو شعراء، قسط سوم، ص ۱۲

۲۱- صابری، مجاہد شعراء، ص ۵۸، ۵۹

۲۲- صدیقی، عتیق، صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۸۷

۲۳- ایضاً، ص ۱۹۸
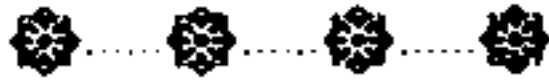
باب چہارم

اُردو شاعری، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

۱۔علی گڑھ تحریک، اس کے متعلقین اور اس کا ادب

۱۔ ''جس تحریک کو علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ بھی ہو علی گڑھ ہی کی زمین میں ہو، بلکہ علی گڑھ تحریک میں ہر ایک وہ کام شامل ہے جو حقیقی و کامل و اکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں مفید ہو، خواہ کسی صوبے کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہو۔'' نواب وقار الملک، بحوالہ ندوی، اکرام اللہ خاں، ص ۶۳۰، و نیز علی گڑھ تحریک کا حقیقی کام وہ نہیں جو علی گڑھ تحریک کے علم بردار سرسید اور ان کے رفقا نے انجام دیا۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، سرسید اور ان کے رفقا، ص ۵۷

۲۔ تفصیلات کے لیے تھامکر، ص ۵۶، بسنت، ص ۱۵۸، ۱۵۹ تلک ص ۴۸-۵۱، ۸۲، بارنو، ص ۸۱

۳۔ حالی، حیات جاوید، جلد اول، ص ۱۱۲ و نیز لسانی تازدہ کے لیے احمد عزیز، *Studies....*، ص ۲۵۶-۲۶۲، ہاشمی فرید آبادی، مقالہ مشمولہ تصنیف مذکور ص ۳۵۰-۳۷۶ گوپال رام، *Indian Muslims*، ص ۳۰-۴۳، عزیز کے کے *Making....*، ص ۱۲۵-۱۲۹، عقیل، تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر۔

۴۔ یہ بیانات اُنھوں نے لکھنؤ میں ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو اور میرٹھ میں ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو دیے تھے۔ مشمولہ مکمل مجموعہ لکچرز و سپیچز، ص ۳۴۵، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۷۶

۵۔ قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۱۶

۶۔ ''لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے۔ علمی مضامین پر سوسائٹی میں لیکچر دیے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو، انگریزی زبانوں میں شائع ہوا کرے۔'' حالی، حیات جاوید، ص ۳۹۷، و نیز عبدالحق، مولوی، سرسید احمد خاں، ص ۱۳۶-۱۳۹۔ یہ سوسائٹی اپنے مقاصد کے لیے ''علی گڑھ تحریک'' کے ابتدائی دور ۱۸۶۳ء سے ۱۹۰۰ء تک کوشاں رہی۔ تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔ ایضاً ص ۱۴۰، اس کا اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اپنے بلند پایہ علمی و سیاسی مضامین کے ذریعے معاشرتی اصلاح اور ذہنی تربیت کا بہت بڑا وسیلہ بنا رہا۔ سوسائٹی اور اس کے اخبار کے اثر سے شمالی ہند کے طول و عرض میں جا بجا فکر و عمل کے سوتے اُبل پڑے۔ متعدد علمی انجمنیں قائم ہوئیں اور اخباروں میں علمی و اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۷- بالجن، ص ۳۳، حالی نے تاریخ نہیں دی۔

۸- سیّد احمد خاں پر مغربی اثرات کے لیے سفر نامہ لندن ص ۱۶۷-۱۹۰، احمد عزیز، ....Islamic Modernism، ص ۳۴، ۳۵

۹- حالی، حیاتِ جاوید، ص ۳۴۱ ''جو تاریخ اسلام میں پہلی جدید درس گاہ تھی'' گب، Mohammadanism، ص ۱۳۸۔ علی گڑھ کالج اور اس کی تحریک کے لیے بھٹناگر، و نیز نظامی' خلیق احمد، مقدمہ، مشمولہ ایضاً۔

۱۰- جہاں، بقول خود ''ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی...... ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج سر پر۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ہم کو خچر بنا دیتی ہے۔ بحوالہ حالی، حیاتِ جاوید، ص ۲۴۶

۱۱- ایضاً، ص ۳۰۱

۱۲- اکرام' شیخ محمد، موج کوثر، ص ۸۲

۱۳- مقاصد اور جدوجہد کی تفصیلات کے لیے، عبدالحق، سرسیّد احمد خاں، ص ۹۸-۱۳۳، آغا خاں، ص ۱۴۵-۱۴۷، اس ضمن میں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کی کوششوں کے لیے عبداللطیف' سیّد، Muslim Universty Movement، ص ۲۳۲-۲۳۵

۱۴- اپنے اس مقصد کی بنا پر سیّد احمد خاں ایک تجربہ کار انگریز کے خیال میں ''ایک چالاک باغی'' تھے۔ مولانا محمد علی نے کوکناڈا میں کانگریس کے منعقدہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس انگریز کا خیال دہرایا ہے کہ ''اگر سرسیّد علی گڑھ کالج قائم نہ کرتے تو برِّعظیم میں اس قدر سیاسی ہل چل نہ پیدا ہوتی۔ نہ سرسیّد علی گڑھ کالج قائم کرتے نہ نوجوانوں کی ایک پر جوش نسل نکلتی اور نہ برِّعظیم میں تحریکِ آزادی اس قدر زور پکڑتی اور نہ برطانوی حکومت کے دن گنے چنے ہوتے''۔ محمد علی، ...Writings and Speeches، ص ۲۵۳

۱۵- سائمنڈ، ص ۳۲

۱۶- مجیب، ص ۴۴۸

۱۷- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۱۹

۱۸- حالی، حیات جاوید، ص ۲۷۵

۱۹- ے، ص ۸۷

۲۰- ایضاً، ص ۴۷

۲۱- بالجن، ص ۱۲۳، ذار، ص ۱۵۰

۲۲- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۱۸، احمد عزیز، Modern Islam، ص ۵۴ و بعدہ۔ بالجن ص ۱۲۴، ۱۲۵ و بعدہ، رہبر، ص ۱۰۵، سمتھ ...Modern Islam، ص ۱۲۸ و بعدہ۔

۲۳- ے، ص ۷۷، گراہم، ص ۳۱۹

۲۴- ذیل میں محض ایسے افراد کا ذکر ہے، جو اپنی مستقل تصانیف رکھتے ہیں۔ ایسے افراد جن کے ساتھ ادب کی کوئی اور صنف منسوب ہے، اس کا ذکر مختلف اصناف کے تحت آئندہ ابواب میں موجود ہے۔
۲۵- اتنے قریبی کہ سیّد احمد خاں انھیں کبھی کبھی لحمك لحمی اور ''محبّ'' اور ''محبوب'' وغیرہ کہا کرتے تھے۔ زبیری، حیاتِ محسن، ص۲۱۳، ۲۱۴۔ ان کا اصل نام ''سیّد مہدی علی خاں'' تھا۔ لیکن وہ نظام حیدرآباد کے عطا کردہ خطاب ''محسن الملک'' سے زیادہ مشہور ہیں۔
۲۶- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص۶۸
۲۷- سیّد احمد خاں، سرسیّد کے رفقا خود ان کی نظر میں، ص۳۴۷
۲۸- شہابی، سرسیّد احمد خاں کے رفقاء، ص۳۵۱
۲۹- سمتھ، *Modern Islam....*، ص۴۸
۳۰- ایضاً
۳۱- جنھیں زبیری، حیاتِ محسن، اکرام، موجِ کوثر، ص۹۳-۹۶، ۱۰۳، ۱۰۴، منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۲۰۷-۲۱۸، بھٹناگر، ص۸۱، ۸۲ میں پیش کیا گیا ہے۔
۳۲- آغا خاں، ص۳۵، ۷۶، ۹۵، قریشی، ملت اسلامیہ، ص۳۱۱ ح، اکرام، موجِ کوثر، ص۱۱۷
۳۳- آغا خاں، ص۷۶
۳۴- محسن الملک، مکاتیب، ص۴۵
۳۵- ملاحظہ فرمایئے فہرست شرکائے وفد، مشمولہ: احمد جمیل الدین، *Barly Phase*، ضمیمہ، ص۱۵۹
۳۶- اکرام، موجِ کوثر، ص۱۰۸
۳۷- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۲۱۴
۳۸- اسباب اور تفصیلات کے لیے زبیری، تذکرہ محسن، ص۱۰۶، ۱۰۷
۳۹- مسلم یونی ورسٹی کی تحریک کے عبداللطیف، سید *Muslim University Movement.*، حلیم اے بی اے، احمد جمیل الدین، *Barly Phase*، ص۱۲۱-۱۳۹
۴۰- زبیری، تذکرہ وقار، ص۱۶۹ تا ۱۷۰، اکرام، *Muslim India*، ص۱۱۳-۱۱۶، ے، ص۹۸
۴۱- ایضاً، ص۱۰۰
۴۲- تفصیلات کے لیے اکرام، موجِ کوثر، ص۱۲۷-۱۳۰، مذہبی نظریات کے لیے، ے، ص۱۰۰، ۱۰۱
۴۳- ملاحظہ فرمایئے فہرست شرکائے وفد، مشمولہ: احمد جمیل الدین *Barly Phase*، ص۱۶۰
۴۴- ندوی 'اکرام اللہ خاں' ص۱۶۴
۴۵- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص۱۶۴-۱۷۰، احمد جمیل الدین، ص۳۵-۳۹
۴۶- ایضاً، ص۳۸

۴۷- اکرام، موجِ کوثر، ص۱۳۵
۴۸- ''جو ۱۸۷۱ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوا''۔ قادری، حامد حسن، ص۳۶۹
۴۹- اکرام، موجِ کوثر، ص۱۲۶
۵۰- غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، ص۲۱ ح
۵۱- ایک ابتدائی تاثر مقدمہ مسدس ص۵ میں ہے۔
۵۲- انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۱ء و نیز مشمولہ: مقالاتِ حالی، حصہ اول، ص۵-۹
۵۳- ''ہم نہیں یقین کر سکتے کہ سوائے خطبہ بشارت کے اور ہماری کسی تحریر پر وہ یقین کرتے ہیں'' سیّد احمد خاں، سرسیّد کے رفقا خود ان کی نظر میں، ص۲۴۸
۵۴- جلد دوم، ص۱۱۸، ۱۱۹، ۲۲۴-۲۲۶ و بعدہ۔
۵۵- بعد میں جس کا اظہار اُنھوں نے مقدمہ مسدس ص۶ میں بھی کیا ہے۔
۵۶- اس کی تصنیف میں سیّد احمد خاں کا جو ہاتھ تھا، اس کی کافی روایتیں موجود ہیں، جیسے قریشی، صادق، ص۱۳
۵۷- اکرام، موجِ کوثر، ص۱۲۰، سیاسی پہلو سے اس کا تجزیہ پیرزادہ پاکستان منزل بہ منزل ص۷۹-۸۲ میں ہے۔
۵۸- تفصیلات کے لیے غلام مصطفےٰ خاں، سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، ص۹۸، ۹۹۔ قریشی، وحید، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ ص۶۸-۷۰، ۳۱۲-۳۱۵، ۳۵۲-۳۵۴
۵۹- مقدمہ شعر و شاعری، میں سیّد احمد خاں کے اثرات کے مفصل جائزے کے لیے غلام مصطفےٰ خاں، سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، ص۹۸ و بعدہ۔
۶۰- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص۹۱
۶۱- ایضاً، ص۹۳
۶۲- جن کی طرف ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے اشارہ کیا ہے، سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، ص۹۷
۶۳- حالی، مقدمہ مسدس، ص۱، ۲ و بعدہ۔
۶۴- مقالاتِ حالی، حصہ دوم، ص۹۱
۶۵- ایضاً، حصہ اوّل، ص۱۸۱، تفصیلات کے لیے جذبی، ص۱۶۴-۱۸۲
۶۶- مقالاتِ حالی، حصہ اوّل، ص۱۱۰-۱۱۲، ۱۸۷، ۱۹۰
۶۷- ایضاً، حصہ دوم، ص۱، ۱۳۷، ۱۴۸، ۱۸۷، ۱۹۲، ۲۷۱، ۲۷۵ سیاست میں ان کے نقطۂ نظر کے لیے، جذبی، ص۱۸۳-۲۳۶
۶۸- تفصیلات کے لیے صالحہ عابد حسین، ص۱۴۷-۱۵۲
۶۹- اکرام، یادگار شبلی، ص۶۳

۷۰- ایضاً، ص ۸۴

۷۱- ندوی، سیّد سلیمان، حیاتِ شبلی، ص ۱۱۸-۱۲۰

۷۲- شبلی، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۴۰

۷۳- اکرام، یادگار شبلی، ص ۱۰۱

۷۴- تفصیلات کے لیے ندوی، سیّد سلیمان، حیاتِ شبلی، ص ۷۳، ۷۹ و بعدہ۔ اکرام، یادگار شبلی، ص ۳۳-۶۱

۷۵- شبلی، مکاتیب، حصہ اوّل، ص ۵۶

۷۶- اکرام، یادگار شبلی، ص ۸۴

۷۷- شبلی، مکاتیب، حصہ اوّل، ص ۴۵

۷۸- جو اس وقت ڈگری کالج ہے، عبدالرحمٰن صباح الدین، مولانا شبلی نعمانی، ص ۲۰

۷۹- ملاحظہ فرمایئے ان کی تقریر کے اقتباسات، مشمولہ: اکرام، یادگار شبلی، ص ۹۳، ۹۴، شبلی کے دل میں سیّد احمد خاں کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ صبحِ اُمید، فارسی کی متعدد نظموں، مکاتیب اور مقالات کے ضمنی اشاروں کے علاوہ اس مضمون سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے سیّد احمد خاں کی وفات کے بعد "سر سیّد اور اُردو لٹریچر" کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔

۸۰- جیسے شرر، مضامین شرر، جلد سوم، ص ۲۵۹ اور عبدالرزاق کانپوری، ص ۷۷، سیّد احمد خاں کے انتقال کے بعد جب شبلی نے الکلام اور علم الکلام لکھیں تو ان میں سیّد احمد خاں کے بنیادی زاویہ نگاہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اکرام، یادگار شبلی، ص ۹۹، ۱۰۰

۸۱- ندوی، سیّد سلیمان، حیات شبلی، ص ۴۶، ۴۷

۸۲- اکرام، یادگار شبلی، ص ۱۵۱

۸۳- ایضاً، ص ۱۵۳

۸۴- ندوی، سلیمان، حیات شبلی، ص ۳۵۲

۸۵- اکرام، یادگار شبلی، ص ۱۵۴

۸۶- ندوی، سلیمان، حیات شبلی، ص ۵۳۲ و نیز تفصیلات کے لیے اکرام، یادگار شبلی، ص ۱۵۵-۱۵۷

۸۷- شبلی کے فلسفہ تاریخ کے بہتر تجزیہ کے لیے احمد، عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۷۸-۸۱

۸۸- رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ترجمہ، ص ۴۵۸

۸۹- شروانی، محمد مقتدا خاں، مقالات یوم شبلی، ص ۹۱، اکرام، یادگار شبلی، ص ۹۲، ۹۳

۹۰- شبلی، الکلام، ص ۱۰

۹۱- ے، ص ۱۰۲

۹۲- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقا، ص۷۷ مزید تفصیلات کے لیے احمد عزیز، *Islamic Modernism*، ص۸۳-۸۵

۹۳- ے، ص۱۰۳، ۱۰۵، اکرام، موجِ کوثر، ص۲۵۳ و بعدہ۔

۹۴- نذیر احمد، مولوی، لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، ص۴۱۴، ۴۱۶، ۴۱۷

۹۵- یہ اسی کالج کی تعلیم تھی جس نے معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علی البصیرۃ، جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں، میرے دل و دماغ میں بھر دیے۔ بحوالہ عالم، افتخار، ص۳۴، ورنہ۔ "اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں میں کیا ہوتا؟ مولوی ہوتا تنگ خیال متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس برخود غلط مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔" لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، ص۴۱۹

۹۶- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص۲۰۷

۹۷- نذیر احمد، لکچروں کا مجموعہ، ص۴۱۹

۹۸- صدیقی، افتخار احمد، ص۹۰، ۱۰۹، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۵۴-۲۰۰ و بعدہ۔

۹۹- ایضاً، ص۱۳۸

۱۰۰- نذیر احمد، لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، ص۲۵۵، ۲۵۶

۱۰۱- ان کے اس قسم کے خیالات، لکچروں کے مجموعہ، جلد اوّل، ص۲۶، ۳۴۲، ۴۸۹، ۴۹۳، جلد دوم، ص۲۱۶، ۲۲۰-۲۲۲ وغیرہ۔

۱۰۲- لکچروں کا مجموعہ، جلد اوّل، ص۲۳، ۴۹۱، ۴۹۴، ۵۴۱ وغیرہ

۱۰۳- حالی، حیاتِ جاوید، ص۸۲۹، میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس بنوایا، دو کنویں ہیں، دونوں میں چندہ دیا۔ اپنے سارے خاندان کے نام کی جالیاں احاطۂ مدرسہ میں نصب کرائیں۔ یعنی مدرسۃ العلوم کو مسلمانوں کے لیے مفید اور اس کی تائید کو داخل مثنویات سمجھا۔ موعظہ حسنہ، ص۱۹۹

۱۰۴- نہ صرف علی گڑھ کالج بلکہ دوسرے تعلیمی ادارے اور طلبا بھی نذیر احمد سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ تفصیلات کے لیے صدیقی، افتخار احمد، ص۱۱۹، ۱۲۰

۱۰۵- جلد اوّل، ص۳۰

۱۰۶- ایضاً، ص۷۰، ۱۲۷، ۲۳۰، جلد دوم، ص۵۳، ۵۹

۱۰۷- صدیقی، افتخار احمد، ص۱۷۳ و نیز ان کے مذہبی نظریات کے لیے مجیب، ص۴۱۰-۴۱۲

۱۰۸- صدیقی، افتخار احمد، ص۱۷۹، افراط ہر ایک چیز میں مذموم ہے۔ پس میرے نزدیک سیّد احمد خاں میں عیب ہے تو یہ ہے۔ لکچروں کا مجموعہ، جلد اوّل، ص۲۷۷

۱۰۹- صدیقی، افتخار احمد، ص۳۰۱

۱۱۰- قادیانی، مرزا غلام احمد، مکاتیب بنام مولوی چراغ علی، بعض مکتوب تنہا، ص۱۱۹-۱۲۲ میں منقول

ہیں۔ ونیز عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص ۶۸

۱۱۱- عبدالحق، مولوی، مقدمہ، اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام، ص ۳۴

۱۱۲- ایضاً، ص ۳۵

۱۱۳- یہ انگریزی کے علاوہ کئی یورپی زبانیں سیکھ چکے تھے۔ عبرانی، یونانی، سریانی سے واقف تھے۔ سیّد احمد خاں، سرسیّد کے رفقا خود ان کی نظر میں، ص ۳۴۷ اور کچھ فرانسیسی بھی سیکھ لی تھی۔ احمد، عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۵۷

۱۱۴- قادری، حامد حسن، ص ۳۷۵ ونیز تنہا، ص ۱۳۲ وبعدہ۔

۱۱۵- سیّد احمد خاں اور مولوی چراغ علی میں مذہبی نظریات کی جو یک جہتی تھی، اس کے لیے احمد، عزیز *Islamic Modernism*، ص ۴۸، ۵۲، ۵۷، ۶۴ وبعدہ۔

۱۱۶- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص ۷۱، ان کے مذہبی نظریات کے تجزیے کے لیے احمد، عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۵۸-۶۴، ے، ص ۸۸-۹۰، سمتھ *Modern Islam*، ص ۲۷، ۲۸

۱۱۷- قدوائی، ص ۲۶

۱۱۸- حالی، حیاتِ جاوید، ص ۱۱۶، ۱۲۰

۱۱۹- صدیقی، افتخار احمد، ص ۱۳۸

۱۲۰- اینڈریوز، ص ۱۵۷، ۱۶۳

۱۲۱- اور وہ چاہتے تھے کہ اسے دور کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کردینی چاہیے اینڈریوز، ص ۱۵۷

۱۲۲- ایضاً، ص ۱۲۸، سیّد احمد خاں سے ان کی عقیدت کا ذکر، ایضاً، ص ۱۳۹ میں ہے۔

۱۲۳- ایضاً، ص ۱۴۱

۱۲۴- ایضاً، ص ۱۲۹

۱۲۵- حالی، حیات جاوید، جلد اول، ص ۱۱۷، اُردو زبان کی اہمیت کے سلسلے میں ان کے خیالات کے لیے۔ اینڈریوز، ص ۱۱۳، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵ وغیرہ

۱۲۶- قادری، حامد حسن، ص ۴۵۰، تنہا، ص ۲۰۶

۱۲۷- حالی، حیاتِ جاوید، جلد اول، ص ۱۹۵، جلد دوم، ص ۴۴۵

۱۲۸- اینڈریوز، ص ۱۳۹، ۱۴۰

۱۲۹- تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص ۱۴۰، ۱۴۱

۱۳۰- ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سیّد محمود کو۔ حالی، حیات جاوید، جلد دوم، ص ۴۴۵

۱۳۱- نواب عماد الملک نے سیّد احمد خاں کی دعوت کے جلسے میں جو ''نظام کلب حیدرآباد'' میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا، کہا تھا کہ ''کاش مسلمانوں میں سیّد احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی نام وری اور

شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے مفید کام دکھائے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔"

بحوالہ ایضاً، جلد دوم، ص۴۶۲

۱۳۲- عبدالحق، مولوی، عماد الملک، ص۴۷

۱۳۳- محسن الملک، مکاتیب، ص۴۵

۱۳۴- پیرزادہ، Foundations، جلد اوّل، ص۴۶، ۸۸

۱۳۵- آزاد، مولوی فضل حق، لیکن عبدالحق، مولوی، عماد الملک، ص۴۳-۴۷ میں اجلاس منعقدہ میرٹھ ۱۸۹۵ء کی صدارت کا ذکر ہے۔

۱۳۶- اس تعلق سے ایضاً، ص۳۹-۴۷،۴۰ میں ایک خطبۂ صدارت، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۷ء کے اقتباسات ہیں۔

۱۳۷- تفصیلات کے لیے ایضاً و نیز ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، ص۳۳-۳۴

۱۳۸- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص۱۹۹

۱۳۹- شرر، زمانہ (کان پور)، جنوری ۱۹۱۰ء، تنہا، ص۵۸۵، ۵۸۶ میں شرر کی سیّد احمد خاں سے ملاقات کا ذکر ہے۔

۱۴۰- شرر، زمانہ (کان پور)، جنوری ۱۹۱۰ء

۱۴۱- ممالک متحدہ پنجاب ہی نہیں، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک شخص نے تباہی سے بچالیا اور وہ شخص سرسیّد تھا۔ شرر، سرسیّد احمد خاں کی دینی برکتیں، مشمولہ: دکن ریویو، مئی ۱۹۰۸ء بحوالہ عظیم، وقار، عبدالحلیم شرر، ص۳۷۶

۱۴۲- سکینہ، ص۱۳۳

۱۴۳- اداریہ، مہذب (لکھنؤ)، ۲۳/اگست ۱۸۹۰ء، بحوالہ خورشید، عبدالسلام، کاروانِ صحافت، ص۶۷

۱۴۴- بحوالہ عظیم، وقار، عبدالحلیم شرر، ص۳۷۷

۱۴۵- عبدالقادر، شیخ، ص۷۸

۱۴۶- سمتھ، Modern Islam، ص۹۸

۱۴۷- سکینہ، ص۸۵

۱۴۸- ندوی، سیّد سلیمان، یاد رفتگاں، ص۹۳، درد بریلوی، وحید الدین سلیم، مشمولہ: زمانہ (کان پور) بحوالہ امیر، محمد، سلیم، ص۲، ۱۸

۱۴۹- سکینہ، ص۸۵، تنہا، ص۳۶۴ ح

۱۵۰- ندوی، سیّد سلیمان، یاد رفتگاں، ص۹۳

۱۵۱- بہت سی اعلیٰ اور عمدہ کتابوں کے بھی مصنف، مولف اور مترجم تھے، لیکن وہ سب ناپید اور نایاب ہیں۔ اسمٰعیل پانی پتی، ادیب اور مصنف، ص۹۳۱

۱۵۲- احمد، قمر الدین، حصہ اوّل، ص ۱۰۵-۱۳۴، زمانہ طالب علمی کے حالات کے لیے

۱۵۳- ایضاً، حصہ دوم، ص ۵۳

۱۵۴- ایضاً، ص ۵۵

۱۵۵- ایضاً، ۵۵-۶۱

۱۵۶- عبدالحق، مولوی، چند ہم عصر، ص ۶۶

۱۵۷- ایضاً، ص ۶۹، احمد، قمر الدین، حصہ دوم، ص ۶۳، مسلم لیگ کے تعلق سے ان کی کارکردگی کے لیے، ایضاً، ص ۸۳-۸۵ و نیز پیرزادہ، *Foundations*، جلد اوّل، ص ۱۲۹، ۱۳۶-۱۳۸، ۱۵۳ و بعدہ۔

۱۵۸- احمد، قمر الدین، حصہ دوم، ص ۶۴

۱۵۹- ایضاً، ص ۹۱

۱۶۰- اس کی تمہید میں عزیز مرزا نے کہا تھا کہ محمود گاواں کی سیرت اور اخلاق کے نمونے اصلاحِ احوال کی بہترین ترغیب دیتے ہیں۔ ص ۱

۱۶۱- یامین، ص ۵۵۷

۱۶۲- یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی قومی جلسہ مسلمانوں کا ایسا نہ ہوتا جس میں مولانا شریک نہ ہوں۔ ولایت حسین، میر، ص ۲۳

۱۶۳- بشیر الدین، مولوی، مقدمہ، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱-۲

۱۶۴- قریشی، اشتیاق حسین، *Ulema....*، ص ۳۲۷، ۳۲۸

۱۶۵- ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، ص ۱۳

۱۶۶- ایضاً، ص ۱۸

۱۶۷- ایضاً، ص ۲۰

۱۶۸- تفصیلات کے لیے، عبدالحق، خطبات عبدالحق، جابجا۔

۱۶۹- اُردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا مطالعہ متعدد تاریخ و تنقید کی کتابوں میں موجود ہے۔ بالخصوص صدیقی، رشید احمد، آشفتہ بیانی میری، ص ۱۰۴-۱۱۱، ۱۵۴-۱۷۵، صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، *Modern Trends*، ص ۲۶۸-۲۸۹، عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، ص ۲۸۱-۲۸۶ اور سرسید اور ان کے رفقا، جابجا۔

۲- علی گڑھ تحریک کی معاصر تحریکات

(۱) ندوۃ العلما

۱- مجیب، ص ۴۰۹ و نیز حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص ۵۴، ۲۴۷

۲- عبدالرزاق کان پوری، ص ۱۰۴

۳- ایضاً، ص ۱۰۲، ۱۰۳

۴- اکرام، موجِ کوثر، ص۲۰۵

۵- فارقوہر، ص۳۵۰ ونیز حالی، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص۲۶۳ ح

۶- تفصیلات کے لیے شہابی، چودہ سو سالہ مرقع، ص۱۵۲-۱۵۳

۷- ے، ص۱۲۶ ح

۸- فارقوہر، ص۳۵۰

۹- تفصیل کے لیے صوفی، ص۱۴۰، ۱۴۱، شہابی، چودہ سو سالہ مرقع، ص۱۵۴-۱۵۶

۱۰- ندوی، سیّد سلیمان، حیات شبلی، ص۴۱۷

۱۱- مجیب، ص۴۰۹

۱۲- سیّد احمد خاں نے مولانا محمد علی کانپوری کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ ''ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے۔ اس کو چلنے دینا چاہیے۔ خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے...... اگرچہ مجھ کو توقع نہیں ہے کہ باہم علما کے اتفاق ہو۔ الا کوشش ضرور ہو۔'' مشمولہ: مکتوبات سرسیّد، ص۶۵۱

۱۳- محسن الملک، تقریر، اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء، ص۴-۷ و نیز احمد، عزیز: *Islamic Modernism...*، ص۱۱۱

۱۴- تفصیلات کے لیے، اکرام، یادگار شبلی، ص۲۸۹ و بعدہ۔

۱۵- عبدالغفار، قاضی، حیاتِ اجمل، ص۱۴۰-۱۴۲

۱۶- اکرام، یادگار شبلی، ص۳۰۰

۱۷- تفصیلات کے لیے شبلی، حفاظت و اشاعت اسلام، ص۷-۱۲

۱۸- اکرام، یادگار شبلی، ص۳۴۹

۱۹- ندوی، ابوالحسن علی، *Muslims in India*، ص۹۲، ۹۳ میں ایک مناسب فہرست ہے۔

۲۰- آزاد، ابوالکلام، ابوالکلام کی کہانی، ص۳۰۲، ۳۰۷

۲۱- ایضاً، ص۳۰۶

۲۲- عبدالغفار، قاضی، حیاتِ اجمل، ص۸۰

۲۳- اصلاحی، ضیاالدین، ص۱۳

۲۴- مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ ناگپور، دسمبر ۱۹۲۰ء میں اس فعل کا خیر مقدم کیا۔ انصاری، ڈاکٹر مختار احمد، ص۵۴۸، ونیز قرارداد، ایضاً، ص۵۵۵

۲۵- اصلاحی، ضیاالدین، ص۱۳

۲۶- اس سلسلے کی اہم کتابیں یہ ہیں۔ عبدالسلام ندوی، اسوۂ صحابہ، ابن خلدون، القضاۃ فی الاسلام، اسوۂ صحابیات، اسلام کا قانون فوجداری، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، حکمائے اسلام، ابوالحسن علی

ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، اسلام کے عروج و زوال کا اثر انسانی دنیا پر، حاجی معین الدین ندوی، خلفائے راشدین، سہاجرین، مولانا سعید انصاری، سیرۃ الصحابیات، سیرۃ الانصار، تفسیر کبیر رازی، حمید الدین فراہی کے متفرق رسائل اور تفسیر الاسلام اصفہانی مولانا ابوظفر ندوی، تبع تابعین، تاریخ سندھ، تاریخ گجرات، گجرات کی تمدنی تاریخ، نجیب اشرف ندوی مقدمہ رقعات عالم گیر، ریاست علی ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، صباح الدین عبدالرحمٰن کی ہندوستان کی تہذیب و سیاسی پہلوؤں پر متعدد کتابیں جیسے بابر، بزمِ صوفیہ، بزمِ مملوکیہ، بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں، ہندوستان عربوں کی نظر میں، امیر خسرو اور ہندوستان، سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے تمدنی کارنامے، ہندوستان کے عہد وسطی کے تمدنی جلوے وغیرہ ان کے علاوہ مختلف علما کے کیے گئے متعدد تراجم جیسے ابن خلدون، ابن رشد، امام رازی، اسلام اور عربی تمدن، طبقات الامم وغیرہ۔

(۴) دیوبند

۱- سندھی عبیداللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۵۰

۲- ایضاً، ص ۱۴۹-۱۵۰، تفصیلی نصاب کے لیے، صوفی ص ۱۲۸-۱۳۳ و نیز رضوی محبوب، ص ۱۰۴-۱۰۷، گیلانی، جلد دوم، ص ۲۸۶

۳- قادری محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۱۵۷-۱۶۰

۴- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۴۸، ۱۴۹ح

۵- مثلاً یہ علما مولانا محمد قاسم نانوتوی کی صحبت میں امام ولی اللہ کی حکمت سے آشنا ہو سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی رفاقت میں سیاسی اصول سمجھ سکتے تھے۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔ دارالعلوم کے اصول و مقاصد کے لیے محمد میاں، علما حق، جلد اول، ص ۵۴-۵۹، تفصیلی معلومات کے لیے القاسم، دارالعلوم نمبر، ۱۳۴۷ھ۔ دارالعلوم کے ضمن میں ایک غیر ملکی مبصر کی رائے یوں ہے۔ ''ہندوستان کے تمام مسلم اداروں سے زیادہ راسخ العقیدہ''، فارقوہر، ص ۳۵۱

۶- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۵۱، اکرام، موج کوثر، ص ۲۲۷

۷- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۸۸

۸- رشید احمد گنگوہی تو قرونِ وسطیٰ کے عقلی علوم کو بھی نصاب میں شامل کرنے کے خلاف رہے۔ مکاتیب رشیدی، ص ۲۷

۹- مناظر احسن گیلانی کے ایک سوال کے جواب میں مولانا محمود الحسن نے کہا تھا کہ ''۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے اس مدرسہ کو جو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ اس کی

غرض کچھ اور تھی (یعنی مجاہد پیدا کرنا اور انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ روح پھونکنا)، گیلانی، جلد اوّل، ص ۲۷۹ح۔ ''مولانا قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلے میں کھولا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے۔ یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبا کو قواعد جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کے لیے کابل کو تیار کر رہا ہے۔'' ''رپورٹ''، مشمولہ: ارواح ثلاثہ، ص ۲۵۱ بحوالہ انوار الحسن، انوارِ قاسمی، ص ۳۹۷

۱۰- احمد عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۱۰۶، محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۹۸-۱۰۰، ملک حفیظ، *Muslim Nationalism*، ص ۱۹۶

۱۱- مدنی، نقشِ حیات، جلد اوّل، ص ۷۱

۱۲- یہ رسالہ اس استفتا اور اس کے جوابات کا مجموعہ ہے جو اس زمانے میں طبع ہوا تھا۔ اس کے کچھ اقتباسات محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۳ میں ہیں۔ و نیز تفصیلات کے لیے ایضاً ص ۹۴-۱۰۷۔ اس کے برعکس سیّد احمد خاں دیوبند اور اس کے مقصد کو سراہتے تھے۔ مقالات سرسیّد، جلد ہفتم، ص ۲۰۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۷ وغیرہ و نیز بحوالہ اکرام، موجِ کوثر، ص ۲۱۲ح

۱۳- قریشی، *Ulema....*، ص ۲۲۸

۱۴- تفصیلات کے لیے ایضاً *Hindu*،

۱۵- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۵۲

۱۶- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۳۲

۱۷- مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۵۷، اکرام، موجِ کوثر، ص ۲۳۴

۱۸- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۳

۱۹- مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۰۷

۲۰- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۵۳

۲۱- قصوری، ص ۴۳، ۸۹، ۹۲-۱۰۸ و بعدہ

۲۲- ایضاً ص ۴۳ و بعدہ

۲۳- مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۰۰، ۲۰۱

۲۴- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۳۹

۲۵- مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۶۷-۲۳۵ میں تفصیلات ہیں۔

۲۶- خطبۂ صدارت، جمعیۃ العلمائے ہند، جلد اوّل، ص ۱۹۱-۱۹۲

۲۷- عابد حسین 'ڈاکٹر سیّد، ص ۱۲۲

۲۸- بلکہ ''کانگریس میں شامل ہو گئے''۔ سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۵۶

۲۹- مشمولہ: مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۵۳-۲۵۵
۳۰- اکرام، موجِ کوثر، ص ۲۲۵
۳۱- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۳۶، ۲۳۱
۳۲- سندھی، کابل میں سات سال، ص ۲۰۷-۲۰۹
۳۳- مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۰۷-۲۰۹
۳۴- سندھی، کابل میں سات سال، ص ۴۲
۳۵- مہر، سرگذشت مجاہدین، ص ۵۵۷
۳۶- سندھی، خطبات و مقالات، ص ۶۸، ۶۹
۳۷- ایضاً، ص ۶۹، ۷۰ و بعدہ
۳۸- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۲۴۰
۳۹- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۴۰
۴۰- مدنی، نقش حیات، جلد اوّل، ص ۱۲۹
۴۱- ایضاً، ص ۲۳۳
۴۲- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۹۰
۴۳- فتویٰ مشمولہ اجمل و نیز دستخط، ص ۲۸، اسی تصنیف میں تقریر بھی منقول ہے۔
۴۴- شہابی، مشاہیر جنگِ آزادی، ص ۳۴۳
۴۵- مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۵، ۶، ۳۸، ۴۴-۵۱، ۶۷ وغیرہ
۴۶- مشمولہ اجمل، ص ۲۸
۴۷- شہابی، مشاہیر، ص ۳۴۷
۴۸- قریشی، *Ulema....*، ص ۳۴۹
۴۹- عبدالغفار قاضی، حیاتِ اجمل، ص ۲۷۹، جعفری رئیس احمد، علی برادران، ص ۲۳۳
۵۰- مشمولہ اجمل، ص ۴۸
۵۱- جعفری رئیس احمد، سیرت محمد علی، ص ۴۸۷-۴۹۱
۵۲- یامین، ص ۴۴۲
۵۳- تفصیلات کے لیے قریشی، *Ulema....*، ص ۳۵۸
۵۴- شہابی، مشاہیر، ص ۳۴۵
۵۵- خلیق الزماں، ص ۷۷، ۷۸
۵۶- مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۱۸۹-۱۹۱

۵۷- تفصیلات کے لیے محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۲۳۷، ۲۳۸

۵۸- ندوی، سیّد سلیمان، یاد رفتگان، ص ۱۷۰

۵۹- احمد، عزیز، Islamic Modernism، ص ۱۹۰

۶۰- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۲۴۸، ۲۴۹

۶۱- طیب، ص ۸۰، شہابی، مشاہیر، ص ۳۵۰

۶۲- پیرزادہ، Foundations، جلد اوّل، ص ۴۷۳، ۵۳۸

۶۳- ایضاً، ص ۵۰۲

۶۴- فتویٰ متفقہ، ص ۴۴، ۴۱

۶۵- اشرف علی تھانوی، الافادات الایومیہ، جلد اوّل، ص ۸۷، ۸۸

۶۶- ایضاً، جلد چہارم، ص ۳۲۹

۶۷- عبدالماجد دریابادی، حکیم الامت، ص ۴۷۳

۶۸- اشرف علی تھانوی، ملفوظات اشرفیہ، ص ۶۴-۶۶، و نیز ان کی جدوجہد آزادی کے تفصیلی مطالعہ کے لیے سعید احمد؛ مسلم لیگ سے سوالات اور اس کے جوابات کے لیے ص ۱۰۲-۱۱۸

۶۹- ''تقریباً آٹھ سو کتابوں اور کتابچوں کے مصنف تھے'' ندوی، سیّد سلیمان، یاد رفتگان، ص ۲۸۵، ان کے سیاسی رجحانات بالخصوص ان کی تصانیف حیات المسلمین اور صیانت المسلمین میں ہیں۔

۷۰- قریشی، ....Ulema، ص ۲۵۷

۷۱- انوارالحسن، تجلیاتِ عثمانی، ص ۶۳۳، ۶۳۴

۷۲- ایضاً، ص ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۵۲-۶۶۲

۷۳- ایضاً، ص ۶۶۲-۶۶۳ .

۷۴- قریشی، ....Ulema، ص ۳۵۹، ۳۶۰

۷۵- انوارالحسن، تجلیاتِ عثمانی، ص ۶۷۱-۶۷۳

۷۶- قریشی، ....Ulema، ص ۳۶۱

۷۷- ندوی، سیّد سلیمان، یاد رفتگان، ص ۴۴۹

۷۸- قریشی، ....Ulema، ص ۳۶۲

۷۹- خود نوشت، ص ۶۷-۶۹

۸۰- ایضاً، ص ۳۸

۸۱- ایضاً، ص ۵۹

۸۲- ایضاً، ص ۶۲

۸۳- قریشی، *Ulema....*، ص ۳۶۲

۸۴- ایضاً، ص ۲۸۸، ۳۵۷، طیب، ص ۸۵

۳- مذہبی، سیاسی تحریکات اور اُردو ادب، علما کا حصہ

(۱) تحریک ردِ عیسائیت - دورِ دوم

۱- حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۱۱۸

۲- ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹، اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۶۲، ۱۶۳

۳- سیّد احمد خاں، رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص ۲۵-۳۱

۴- اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۶۴

۵- باجن، ص ۱۰۱، ۱۰۲

۶- حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۱۱۹، عیسائیت پر سیّد احمد خاں کے اعتراضات کے لیے، ڈار، ص ۸۷-۱۲۸

۷- حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۱۷۲ ح، قادری محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص ۱۴۱

۸- حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۱۷۲

۹- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۶۰

۱۰- دتاسی، خطبات، جلد دوم، ص ۴۶، حالی، ترجمۂ حالی، ص ۷

۱۱- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۷۹

۱۲- غلام مصطفےٰ خاں، حالی کا ذہنی ارتقا، ص ۳۲

۱۳- عبدالحق، مولوی، قاموس الکتب، ص ۸۰۴

۱۴- عبداللہ، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص ۶۸

۱۵- عبدالحق، مولوی، مقدمہ اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام، ص ۲۰۱

۱۶- ایضاً، قاموس الکتب، ص ۸۰۵، شیخ محمد اسماعیل نے ہدایت المسلمین کو تحقیق الایمان قرار دیا ہے، تذکرۂ حالی، ص ۱۱۹

۱۷- دتاسی، مقالات، ص ۳۳۴، ۳۳۵

۱۸- ان کے مکاتیب کے کچھ اقتباسات، تنہا، ص ۱۱۹-۱۲۲ میں ہیں۔

۱۹- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۷۷

۲۰- ایضاً، ص ۱۳۱

۲۱- ایضاً

۲۲- عبدالحق، مولوی، قاموس الکتب، ص ۸۰۲

۲۳- رحمان علی، ص۲۱۰، ۲۱۱، تفصیل کے لیے صابری، فرنگیوں کا حال، ص۱۶۱-۱۶۶، انوار الحسن، انوارِ قاسمی، ص۵۰۰-۵۲۵ وغیرہ

۲۴- رحمان علی، ص۲۱۱

۲۵- عزیز الحسن، ص۲۹

۲۶- عبدالحق، مولوی، قاموس الکتب، ص۸۰۲

۲۷- صابری، فرنگیوں کا جال، ص۲۹۲

۲۸- تفصیلات کے لیے ایضاً ۲۹۸، ۲۹۹، ۔ ص۱۳۸، ۱۷۶، ۱۷۸

۲۹- صابری، فرنگیوں کا جال، ص۲۶۰

۳۰- ایضاً، ص۲۴۸، ۲۵۲ و بعدہ

۳۱- ایضاً، ص۲۵۹

۳۲- دتاسی، مقالات، جلد دوم، ص۲۹۷

۳۳- ایضاً، ص۵۲

۳۴- تفصیلات کے لیے صابری، فرنگیوں کا جال، ص۲۶۴، ۲۶۵

۳۵- ایضاً، ص۲۸۳

۳۶- ایضاً، ص۲۸۴، قادری، محمد ایوب، احسن نانوتوی، ص۷۸

۳۷- ایضاً، ص۷۳

۳۸- صابری، فرنگیوں کا جال، ص۲۸۵

۳۹- ایضاً، ص۲۹۶

۴۰- ایضاً، ص۱۷۰-۲۰۹ میں تفصیلات دی گئی ہیں۔

۴۱- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص۲۱۱-۲۲۰ دہلی کے ایک مطبع کے مالک مہدی حسن نے لدھیانہ کے ایک عیسائی اخبار نور افشاں میں اعلان شائع کرایا تھا کہ رقیمۃ الوداد، لحن داؤدی، استقلال، جو علی الترتیب پادری عماد الدین کی کتاب نیاز نامہ، پادری رام چندر کی کتاب، نغمہ طنبوری اور پادری صفدر علی کی کتاب دجال مسیح کے جواب میں لکھی گئی تھیں ان کے جواب دینے والے کو دو دو سو روپے انعام دیے جائیں گے۔ دتاسی، مقالات، جلد دوم، ص۱۹۱

۴۲- اس کی کچھ تفصیلات، دتاسی، مقالات، جلد اوّل، ص۳۹۲-۳۹۴، جلد دوم، ص۳۴۴، ۳۴۵ وغیرہ۔ صابری، فرنگیوں کا جال، ادارہ، تاریخ ادبیات مسلمانان، نویں جلد، ص۵۹۳-۶۲۲، عبدالحق، مولوی، قاموس الکتب، ص۸۰۰-۸۲۸ میں ہیں۔

(۲) تحریک اتحاد اسلامی

۱- قریشی، اشتیاق حسین، Administration، ص ۲۳-۲۵ و نیز تفصیلات کے لیے احمد، عزیز، Studies، ص ۳-۵۵

۲- ایضاً، ص ۵۳، قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۵۲ و نیز شریف الحسن۔

۳- سمتھ، Islam in Modern History، ص ۸۸، ۸۹

۴- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۸۳

۵- عبدالغفار، قاضی، آثار جمال الدین افغانی، ص ۲۷۶، ایڈمز، ص ۱۸، ۲۴

۶- آزاد، مسئلہ خلافت، ص ۱۲۳

۷- سندھی، سیاسی تحریک، ص ۱۳۷

۸- ایضاً، ص ۱۳۴

۹- ایضاً، ص ۱۳۶

۱۰- احمد، عزیز، Islamic Modernism، ص ۱۲۴

۱۱- صابری، تاریخ صحافت اُردو، جلد دوم، سوم، جابجا۔

۱۲- ان کی مثال صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۸۲، سیّد احمد خاں، مقالات سرسیّد، جلد سیزدہم، ص ۴۵۸-۴۶۳ میں ہے۔

۱۳- صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۸۲

۱۴- ''...... وہ کہا کرتا تھا کہ عصائے سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے اور اس کو یہ خوف تھا کہ مبادا مسلمان بھی پولٹیکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی ہے'' تھیوڈور ماریسن بحوالہ حالی، حیات جاوید، جلد دوم، ص ۲۲

۱۵- گراہم، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۱۶- خطوط سرسیّد، ص ۲۶

۱۷- تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص ۲۷۶-۲۸۳

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً، ص ۴۷۹

۲۰- خصوصاً مشمولہ مقالات سرسیّد، جلد سیزدہم، ص ۴۳۰، ۴۳۴، ۴۴۱، ۴۵۸، ۴۶۱ وغیرہ

۲۱- حالی، حیات جاوید، جلد دوم، ص ۸۰

۲۲- ''میری فرصت اور کاموں کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جو دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں۔ نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو دست دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام ملتوی رہ جاتے ہیں۔''

مکمل مجموعہ لکچرز و سپیچز، ص ۳۱۲

۲۳- مقالات سرسیّد، جلد سیزدہم، ص ۴۲۶-۴۲۹۔ ''ہم ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ایسے پولیٹیکل اُمور میں جو دوسری سلطنتوں سے متعلق ہیں، بلا اجازت اور مرضی گورنمنٹ ہندوستان کے، مسلمان کوئی کارروائی کریں۔'' ایضاً، ص ۴۲۸

۲۴- آسمتھ، *Modern Islam*، ص ۲۰

۲۵- احمد، عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۱۲۶

۲۶- سیّد احمد خاں اور جمال الدین افغانی کے نظریات و مقاصد کے مشترکات و تضادات کا اچھا جائزہ، ایضاً *Studies*، ص ۵۵-۶۲ اور نظامی، خلیق احمد، سیّد احمد خاں اور جمال الدین افغانی، ص ۱۱۳-۱۳۳ میں ہے۔

۲۷- جیسا کہ سیّد احمد خاں نے اپنا یہی خیال ظاہر کیا تھا، آخری مضامین، ص ۳۲، ۳۳

۲۸- مقالات شبلی، جلد اوّل، خصوصاً، ص ۱۸۲-۱۸۷

۲۹- ایڈمز، ص ۱۲، ۶۷ و بعدہ

۳۰- خاص طور پر خلیفۃ المسلمین کی زیارت کا تأثر اثر انگیز ہے، ص ۱۱۶

۳۱- مثلاً ان کی ایک نظم کے یہ شعر:

مراکش جاچکا فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

کہاں تک ہم سے لو گے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

زوال دولت عثمان زوال شرع ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

۳۲- اکرام، موج کوثر، ص ۱۳۰

۳۳- احمد، عزیز، *Islamic Modernism*، ص ۱۲۰

۳۴- ایضاً

۳۵- آزاد، ابوالکلام کی کہانی، ص ۲۷۳

۳۶- ایضاً، ص ۳۸۴، ۳۸۵

۳۷- ایضاً، ہماری آزادی، ص ۱۹، ۲۰

۳۸- ایضاً، خطبات ابوالکلام، ص ۲۳، ۲۴

۳۹- ایضاً، اتحاد اسلامی، ص ۲۳، ۲۴

۴۰- ان کے ایسے خیالات کے لیے، ے، ص ۱۹۱-۱۹۴

۴۱- تفصیلی جائزے کے لیے ایضاً، ص ۲۰۰، ۲۰۱

۴۲- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۴۹، تفصیلات کے لیے اقبال اَفضل ص ۶۱-۶۵

۴۳- محمد علی، *My Life*، ص ۵۱، ۵۲ و بعدہ، و نیز معین الحق، *Khilafat Movement*، ص ۲۰۹

۴۴- جیسے ان کا یہ شعر:

نیست از روم و عرب پیوند ما نیست پابند نسب پیوند ما

۴۵- اقبال، *Reconstruction*، ص ۱۴۵، ۱۵۴

۴۶- عبدالحکیم خلیفہ، ص ۵۷، ۵۸

(الف) تحریک ریشمی رومال

۱- قصوری، ص ۲۹، ۳۱ وغیرہ، مہر، سر گذشت مجاہدین، ص ۵۱۱-۵۱۴ و بعدہ

۲- قصوری، ص ۳۲

۳- ایضاً، ص ۳۳، سندھی، کابل میں سات سال، ص ۶۱

۴- تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۵۲، ۵۳، قصوری، ص ۳۵

۵- مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۱۴، ۲۱۵

۶- ایضاً، سفر نامہ شیخ الہند، ص ۸

۷- ایضاً، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۱۴، ۲۱۵

۸- ایضاً، ص ۲۲۰

۹- مشمولہ: محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۷۰ و نیز مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۱۸۹، ۱۹۰

۱۰- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۶۶

۱۱- اجمل خاں حکیم، ذاتی یادداشت، بحوالہ عبدالغفار قاضی، حیات اجمل، ص ۲۲۳، ۲۲۴ و نیز تفصیلات کے لیے زبیری، سیاست ملیہ، ص ۱۰۹-۱۱۴

(۳) تحریکِ خلافت

۱- اور سلے، ص ۳۱۴، ۳۱۷-۳۲۲، خانم، ص ۱۵۰، ۱۵۱ و نیز تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص ۹۴-۹۶، ۱۰۵-۱۱۳، ۱۱۲-۱۳۴، ۱۴۱-۱۵۱

۲- حکومت برطانیہ کے وعدے اور ایفائے عہد کی تفصیلات آزاد مسئلہ خلافت ضمیمہ (۲) ص ۲۰۳-۲۰۷ میں ہیں۔

۳- معین الحق، *Khilafat Movement*، ص ۲۰۹

۴- عبدالباری مولانا، انجمن خدام کعبہ، ص ۲۲۰-۲۲۲

۵- ریاض ص ۸۵، تفصیل کے لیے عبدالغفار قاضی، حیاتِ اجمل، ص ۲۱۰، عنایت اللہ، ص ۲۴، ۲۵
۶- قریشی، *Struggle*، ص ۳۹
۷- محمد علی، *My Life*، ص ۶۳
۸- شرکائے وفد کے لیے عزیز کے، *Indian Khilafat*، ص ۶۹، ۷۰
۹- ایضاً، ص ۱۱۴ وغیرہ
۱۰- ندوی سید سلیمان، وفد خلافت کی روداد، (۲) ص ۹۵ و نیز اقبال افضل، ص ۱۹۱-۲۲۱
۱۱- ریاض، ۹۱
۱۲- سیتا راسیا، جلد اوّل، ص ۱۹۸، تفصیلات کے لیے *Indian Annual Register*، (۱۹۲۲ء)، جلد اوّل، ص ۲۳۸، ۲۳۹
۱۳- بعد میں یہ تعداد ۹۰۰ تک پہنچ گئی، مشمولہ: اجمل
۱۴- منگلوری، روشن مستقبل، ص ۵۲۸
۱۵- نہرو، *Autobiography*، ص ۸۰
۱۶- عزیز کے، *Indian Khilafat*، ص ۷۰
۱۷- آزاد، ہماری آزادی، ص ۲۶
۱۸- ریاض، ص ۱۰۳
۱۹- آزاد، ہماری آزادی، ص ۲۷۱
۲۰- عزیز کے، *Indian Khilafat*، ص ۲۷۱
۲۱- ایضاً، ص ۲۸۵، ۲۸۶
۲۲- ایضاً، ص ۳۰۸
۲۳- آزاد، خطبات ابوالکلام، ص ۳۵، ۱۳۹
۲۴- عبدالباری مولانا، انجمن خدام کعبہ، ص ۲۲۲
۲۵- ایضاً، ص ۲۲۱
۲۶- خلیق الزمان، ص ۴۶
۲۷- عبدالغفار قاضی، حیاتِ اجمل، ص ۲۱۰
۲۸- آزاد، ہماری، ص ۲۴، ۲۵
۲۹- عبدالماجد دریابادی، محمد علی - ذاتی ڈائری، جلد اوّل، ص ۵۸، دونوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ عبدالغفار قاضی، حیاتِ اجمل، ص ۱۲۹
۳۰- ایضاً، ص ۲۰۹

۳۱- تفصیلات کے لیے، عنایت اللہ، ص ۲۳
۳۲- ریاض، ص ۸۷، ۸۸
۳۳- زبیری، سیاست ملیہ، ص ۱۵۵
۳۴- عزیز، کے کے، Indian Khilafat، ص ۷۰
۳۵- ایضاً، ص ۸۲، ۹۵
۳۶- اس وفد کی روداد خود سیّد سلیمان ندوی نے تفصیل کے ساتھ تحریر کی تھی، وفد خلافت کی روداد، مطبوعہ معارف، (اعظم گڑھ، جنوری، فروری ۱۹۶۸ء)
۳۷- جعفری، رئیس احمد، سیرت محمد علی، ص ۳۹۷، عبدالغفار، قاضی، حیات اجمل، ص ۳۱۴
۳۸- مطبوعہ، معارف (اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۰ء تا اکتوبر ۱۹۲۱ء)
۳۹- ایضاً (نومبر ۱۹۲۱ء تا مارچ ۱۹۲۲ء)
۴۰- ایضاً (مارچ ۱۹۲۱ء)
۴۱- ایضاً (جون ۱۹۲۲ء)
۴۲- ریاض، ص ۱۰۳
۴۳- ہندی، ص ۷۵۷، ۷۵۸
۴۴- شوکت علی، مولانا، ص ۲۷۴ و نیز قرارداد ''خلافت کانفرنس'' منعقدہ گیا، دسمبر ۱۹۲۲ء، مشمولہ: عزیز، کے کے، Indian Khilafat، ص ۲۳۸
۴۵- ایضاً، ص ۱۹۳
۴۶- قریشی، ....Ulema، ص ۲۴۴
۴۷- سالک، سرگزشت، ص ۱۲۲
۴۸- ایضاً، ص ۱۲۳، عطا، ص ۴۷
۴۹- عبدالغفار، قاضی، حیاتِ اجمل، ص ۳۸۹، ۴۰۸
۵۰- عطا، ص ۴۸، ۵۶
۵۱- عزیز، کے کے، Indian Khilafat، ص ۳۵۱
۵۲- خطبۂ صدارت، مشمولہ: محمد علی، ذاتی ڈائری۔
۵۳- خلیق الزماں، ص ۵۰، ریاض، ص ۸۸
۵۴- ایضاً، ص ۱۰۳، شہابی، مشاہیر، ص ۲۸۴
۵۵- ان کی روانگی کے وقت نواب وقار الملک نے ہمدرد میں ایک جذباتی مضمون لکھا تھا۔ مشمولہ: جعفری، رئیس احمد، علی برادران۔

۵۶- خطبۂ صدارت، ص۵۰۲-۵۳۴

۵۷- ایضاً، ص۵۴۵-۵۵۲

۵۸- عزیز، کے کے، *Indian Khilafat*، ص۷۰

۵۹- مطبوعہ، امرتسر، ۱۹۳۱ء

۶۰- فتویٰ، مشمولہ: اجمل

۶۱- الافادات الیومیہ، جلد ششم، ص۲۷۷

۶۲- مطبوعہ دہلی، تاریخ ندارد

۶۳- اس محرک کے لیے۔ ندوی، سید سلیمان، ''ارض حرم اور اس کے احکام و مصالح قرآن مجید کی نظر میں'' مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۲۳ء)

۶۴- تفصیلات کے لیے، جعفری، سیرت محمد علی، ص۳۸۲-۳۸۹، عبدالماجد دریابادی، محمد علی، ذاتی ڈائری، جلد اوّل، ص۲۵۳

۶۵- گب، *Whither Islam*، ص۲۳۴

۶۶- اس تحریک میں ہندوؤں کی شمولیت اور کردار کے لیے۔ سیتا راسیا، جلد اوّل و نیز گوپال *Indian Muslims*، ص۱۳۶-۱۵۱، راگھوانشی، ص۱۶۰-۱۷۴، کانگریس نے تحریکِ خلافت کی جو تائید کی اس کا اثر اس کے مستقبل پر بہت گہرا پڑا۔ کانگریس کو حقیقتاً عظیم اور طاقت ور بنانے والے ہندو نہیں مسلمان تھے۔ ابید کر بہ حوالہ راجپوت، *Muslim League*، ص۵۳

۶۷- ''یہاں تک کہ لفظ ''خلافت'' بغاوت کے مترادف ہوگیا۔ دیہی علاقوں کے عوام یہ سمجھتے تھے کہ ''خلافت'' لفظ ''خلاف'' کا مشتق ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے اس کے معنی ''حکومت کی مخالفت'' کے لیے۔ نہرو، *Autobiography*، ص۶۹

(۴) تحریکِ آزادی

۱- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۴۸۴، و نیز جمعیۃ العلمائے ہند کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے لیے فاروقی، ضیا الحسن، ص۶۷-۹۱، محمد میاں، جمعیۃ العلما کیا ہے۔

۲- ایضاً، علمائے حق، جلد اوّل، ص۲۰۷

۳- ایضاً، ص۲۱۵

۴- خصوصاً گاندھی کا حسرت موہانی کی کامل آزادی کے مطالبے کی قرارداد کو کانگریس سے نامنظور کرا دینا۔ ریاض، ص۱۱۸-۱۲۱ اور پھر سول نافرمانی کی تحریک کو دفعتاً ختم کر دینا جب کہ اس نے انگریزوں کے قدم متزلزل کر دیے تھے۔ قریشی، ملت اسلامیہ، ص۳۶۰

۵- خلیق الزماں، ص۱۵۹

۶- احمد، جمیل الدین، *Congress*، ص۹ و بعدہ

۷- واقعہ یہ تھا کہ یو پی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جو جمعیۃ العلمائے ہند کے ممتاز رہنما تھے، ان کے برادر نسبتی حافظ محمد ابراہیم وزارت کے اُمیدوار بنے۔ کانگریس نے چاہا تھا کہ اپنے منتخب کیے ہوئے مسلم اراکین کو کابینہ میں شامل کرے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے رفقا نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حافظ محمد ابراہیم کے وزارت میں لیے جانے کی حمایت کریں اور لیگ کی تائید سے دست کش ہو جائیں۔ نتیجتاً یہی ہوا، تفصیلات کے لیے قریشی، *Ulema....*، ص ۳۴۸-۳۵۰

۸- ہارڈی، ص ۱۹۴

۹- اس تعلق سے ابوالکلام آزاد کے لیے ایبوٹ، ص ۱۶۷-۱۶۹، کریگ، ص ۱۲۵-۱۲۹

۱۰- آزاد، ہماری آزادی، ص ۵۸

۱۱- ایضاً، ص ۲۸۷، ۲۹۵

۱۲- چندر، کیلاش، ص ۲۳۳

۱۳- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۸۶

۱۴- ایضاً، ص ۴۹۱

۱۵- ایضاً، ص ۴۹۲، ۴۹۳

۱۶- ایضاً، ص ۴۹۴

۱۷- ایضاً، ص ۴۹۸

۱۸- فاروقی، ضیاالحسن، ص ۲۷

۱۹- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۹۴-۴۹۸

۲۰- ایضاً، ص ۴۹۸

۲۱- وحیدالزماں، ص ۱۸۰

۲۲- ہارڈی، ص ۲۴۵

۲۳- ہندوستان ہر اس نسل اور مذہب کے لیے ہے جو اس میں موجود ہے قومی نقطۂ نظر سے ہر مسلمان ایک ہندوستانی ہے۔ بحوالہ فاروقی، ضیاالحسن، ص ۹۷

۲۴- محمد میاں، "جمعیۃ العلما" کیا ہے، جلد دوم، ص ۲۷۳، ۲۷۴

۲۵- تفصیل کے لیے ان کا خطبہ مشمولہ: خطبات و مقالات، ص ۹۲-۹۸، کانگریس سے ان کی توقعات کے لیے، ایضاً، ص ۸۸، ۱۲۲، ۱۳۳-۱۳۵ وغیرہ

۲۶- تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص ۱۶۶-۱۷۳، ۱۸۲-۱۹۳

۲۷- مشمولہ: سندھی، خطبات و مقالات، ص ۲۴۱-۲۸۵

۲۸- مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۳۵، ملک فیض، *Muslim Nationalism*، ص ۱۴۴، مقاصد کے لیے

افضل حق، تاریخ احرار۔

۲۹- ہارڈی، ص۲۱۶

۳۰- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۰۴، وحید الزماں، ص۱۸۸

۳۱- سالک، سر گزشت، ص۴۷۵

۳۲- شورش، ص۱۳۹

۳۳- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۰۴، ۵۰۵، وحید الزماں، ص۱۸۹

۳۴- اسپین، ص۱۷۳، قریشی، *Ulema....*، ص۳۲۹، وحید الزماں، ص۱۸۴، ۱۸۵

۳۵- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۰۷، ہارڈی، ص۲۱۷، جماعت اور اس کی تحریک اور خان عبدالغفار خاں کی جدوجہد کے لیے اسپین، ص۱۶۵-۱۶۹، ۱۷۱-۱۷۳، ۱۹۵، ۱۹۸-۲۰۰

۳۶- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۱۲

۳۷- ایضاً، ص۵۱۲

۳۸- عابد حسین' ڈاکٹر، ص۱۸۱

۳۹- مسلم لیگ اور پاکستان پر مولانا حسین احمد مدنی کے خیالات کے لیے دیگر مذکورہ تصانیف کے علاوہ: ابوالحسن علی ندوی، حصہ اوّل، ص۱۰۶، ۱۱۲، ۱۱۳ حصہ دوّم، ص۱۷۷-۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۸-۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۴ وغیرہ۔ قوم پرست مسلم جماعتوں میں سے جمعیۃ العلمائے ہند کے لیے: فاروقی' ضیا الحسن۔ مجلس احرار کے لیے: افضل حق، تاریخ احرار، خدائی خدمات گار کے لیے غازی مفصل ہیں۔

۴۰- ہارڈی، ص۲۴۳-۲۴۶

(۵) تحریک پاکستان

۱- قریشی، *Ulema....*، ص۳۶۰

۲- *Writings and Speeches*، ص۲۰۴-۲۱۶

۳- مشمولہ: نیرنگِ خیال، (لاہور، فروری ۱۹۳۸ء)، ص۹

۴- ان کا مشہور تاریخ ساز خطبۂ صدارت اجلاس مسلم لیگ منعقدہ الٰہ آباد، دسمبر ۱۹۳۰ء مسلمان اور متحدہ قومیت اس ضمن میں مفصل تردید دلائل پر مبنی ہے۔

۵- قریشی، *Ulema....*، ص۳۵۱، ۳۵۲

۶- عزیز' کے کے، *Making of Pakistan*، ص۱۰۵، پیرزادہ، پاکستان منزل بہ منزل، ص۲۴۲

۷- عابد حسین' ڈاکٹر سید، ص۱۸۱

۸- ایضاً، ص۱۸۳ و نیز تقسیم ہند کے متعلق ان کے خیالات کے لیے مسلمان اور موجود سیاسی کشمکش، حصہ دوم، ص۳۱۲-۳۱۸، پیرزادہ، پاکستان منزل بہ منزل، ص۲۴۲، ۲۴۳

۹- عبدالماجد دریابادی، مقدمہ، اسلام کا سیاسی نظام۔
۱۰- پیرزادہ، Foundations، جلد دوم، ص ۴۸۵، ۴۸۶
۱۱- انصاری، ظفر احمد، ص ۲۳۵
۱۲- قریشی، ....Ulema، ص ۳۵۹
۱۳- ایضاً، ص ۳۶۱، ہارڈی، ص ۲۴۲
۱۴- قریشی، ....Ulema، ص ۳۶۰
۱۵- مسعود احمد، محمد، ص ۴۵
۱۶- نعیمی، ص ۱۸۳
۱۷- سینتھ، ص ۱۰۳-۱۰۶
۱۸- مشرقی، قول فیصل، ص ۱۰۶-۱۰۷
۱۹- سمتھ، Modern Islam، ص ۲۸۰
۲۰- مشرقی، مولوی کا غلط مذہب، ص ۱۴، سینتھ، ص ۴۵
۲۱- یامین، جلد دوم، ص ۸۶۶
۲۲- ہارڈی، ص ۲۱۷
۲۳- جعفری، دید و شنید، ص ۱۴۸
۲۴- ایضاً، ص ۵۸
۲۵- قریشی، ....Ulema، ص ۳۶۷
۲۶- Indian Annual Register، (۱۹۲۲ء) جلد اول، ضمیمہ، ص ۷۸، Indian Quarterly Register، (۱۹۲۸ء) جلد دوم، ص ۴۰۳
۲۷- جعفری، دید و شنید، ص ۳۵۳
۲۸- ایضاً، ۵۱۵

۴- جدوجہد آزادی کے شعرا

(۱) علی گڑھ تحریک

۱- صادق، Azad، ص ۳۱
۲- ''انجمن پنجاب'' کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں کا یہی مقصد تھا کہ عشق و محبت کے موضوعات اور کسی حکمران کی تعریف پر مشتمل شاعری سے قطع نظر نظمیں کہنے اور ان کے ترجمے کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ترجمہ، انورؔ اشفاق، ص۸٦، و نیز تفصیلات کے لیے، ص۷۸-۹٦

۳- دتاسی، خطبات، ص٦۸۵

۴- فرخی، ص۲۳۲

۵- مشمولہ: آزادؔ محمد حسین، نظم آزاد، ص۱۰-۲۰

٦- ایضاً، ص۲۱-۳۱

۷- اُنھوں نے اپنے ہم وطن شعرا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمھیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمھیں درد نہیں آتا۔ میرے اہلِ وطن آؤ، آؤ، برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو اُٹھو، وطن اور اہلِ وطن کی قدیمی نام وری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کو آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ اے خاک ہندوستان، اگر تجھ میں امرؤالقیس اور لبید نہیں تو کوئی کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحراؤ، فردوسی اور سعدی نہیں تو والمیک ہی پیدا کر دو، خطبہ، مشمولہ: نظم آزاد، ص۲۵، ۲۸، ۳۱

۸- حالی، ترجمۂ حالی، ص۷

۹- ایضاً، مقدمہ شعر و شاعری، ص۱۰۰

۱۰- ''دنیا میں انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے...... عشق و عاشقی کی ترکیبیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا نہیں۔ اب وہ وقت گیا، عشق و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔'' مقدمہ شعر و شاعری، ص۲۲۰

۱۱- ایضاً، مکتوباتِ حالی، جلد اوّل، ص۱۴۱

۱۲- ایضاً

۱۳- تفصیلات کے لیے غلام مصطفیٰ خاں، سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، ص۹۷-۱۱۱ و نیز قریشیؔ وحید، مقدمہ و تعلیقات مقدمہ شعر و شاعری۔

۱۴- سیفی، ص۱۲۹

۱۵- عبداللہؔ ڈاکٹر سیّد، مباحث، ص۲۸۳

۱٦- یہ موضوعات کے تقاضے ہی تھے جنھوں نے سیّد احمد خاں کو شاعری میں غزل کے مقابلے میں نظم کو اہمیت دینے پر مجبور کیا۔ اُنھوں نے ''یونین کلب'' اور کالج کی دیگر تقریبات میں غزل گوئی اور غزل سرائی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ ناظر، ص۱۰

(الف) الطاف حسین حالی

۱- حالی، ترجمۂ حالی، ص۷

۲- غلام مصطفیٰ خان، حالی کا ذہنی ارتقا، ص۴۴

۳- حالی، حیات جاوید، دیباچہ، ص۵

۴- غلام مصطفےٰ خان، حالی کا ذہنی ارتقا، ص ۵۵
۵- ایضاً، ص ۶۷
۶- حالی، مسدس مد و جزر اسلام، مقدمہ، ص ۷-۹، ''بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے......اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں۔'' سیّد احمد خان، مکتوبات سرسیّد، ص ۲۱۲
۷- ''قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آ کر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔'' حالی، مسدس، مقدمہ، ص ۱۰، مسدس کے عام اثر کے لیے عبدالقادر، سر شیخ، ص ۲۳، ۲۴
۸- سعید، خالد بن، ص ۵۰۴
۹- اسمتھ، Modern Islam، ص ۳۸
۱۰- ایضاً، ص ۳۸، ۳۹، احمد، عزیز، Islamic Modernism، ص ۹۷، ہارڈی، ص ۱۲۰

(ب) شبلی نعمانی

۱- اکرام، یادگار شبلی، ص ۵۸، ۶۰، ۷۲
۲- ایضاً، ص ۵۵ و بعدہ
۳- ایضاً، ص ۷۳
۴- ایضاً، ص ۷۴
۵- ایضاً، ص ۷۷
۶- ایضاً، ص ۶۲، ۶۴
۷- ندوی، سلیمان، حیات شبلی، ص ۱۱۸، قصیدہ کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے، ص ۱۱۸، ۱۱۹
۸- ایضاً، ص ۱۳۲
۹- ''ہر ہفتے پیش آنے والے واقعات پر ایک ایسا شاعرانہ اظہار خیال کرتے تھے کہ اس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے۔ ایضاً، مولانا شبلی اردو شعر کے لباس میں، ص ۴۱
۱۰- ایضاً، ص ۴۲
۱۱- ایضاً
۱۲- ایضاً، حیات شبلی، ص ۶۳۵، یہاں مولانا اقبال احمد سہیل کی روایت نقل کی گئی ہے۔
۱۳- ''لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اس کو یہ کہ کر شائع کیا گیا کہ بنگال گورنمنٹ نے مولانا کی نظمیں خلاف قانون قرار دیں اور ضبط کر لیں۔'' ایضاً، ص ۶۳۲

(ج) مولوی نذیر احمد

۱- بعد میں یہ نظم ''اتمام حجت'' کے نام سے علاحدہ بھی شائع ہوئی۔

۲- یہ منظوم خطبہ بھی اپنی فنی دل کشی اور شاعر کے مسحور کن انداز شعر خوانی کی بدولت بے حد موثر ثابت ہوا۔ صدیقی' افتخار احمد، ص ۲۵۴

۳- لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، ص ۲۴۴

۴- مطبوعہ ایٹہ، ۱۹۰۹ء

(د) محمد حسین آزاد

۱- فرخی، ص ۵۱

۲- مکتوب، مشمولہ: زبیری، تذکرۂ سرسیّد، ص ۳۱۲، ۳۱۳

۳- عبدالرزاق کانپوری، ص ۳۰۱، آزاد سیّد احمد خان کے دوستوں میں تھے۔ صادق ص ۸۱، لیکن ان سے پورے طور پر متفق نہیں تھے۔ ایضاً، *History*، ص ۲۸۸

(ہ) اسمٰعیل میرٹھی

۱- مشمولہ: حیات و کلیات، ص ۲۴۹

۲- سیفی، ص ۸۲

۳- ایضاً، ص ۱۰۰

۴- ایضاً، ص ۱۰۰، ۱۰۱

(و) عبدالحلیم شرر

۱- مضامین شرر، جلد اوّل، ص ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۱۲، جلد چہارم، ص ۲۵۶-۲۵۸ وغیرہ

۲- شرر، سرسیّد احمد خان کی دینی برکتیں، ص ۳۷۶

۳- تفصیلات کے لیے خورشید، کاروانِ صحافت، ص ۶۳-۷۳

۴- سروری، ص ۱۲۹

(۲) علی گڑھ تحریک کے اثرات:

۱- شعرا کے سیاسی رجحانات، ۱۹۱۱ء تک

۱- اُردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے اثرات کا جائزہ، صدیقی' رشید احمد، آشفتہ بیانی میری، صدیقی' ابواللیث، *Literary Trends*، اور عبداللہ' ڈاکٹر سیّد، سرسیّد اور ان کے رفقاء، میں لیا گیا ہے۔

۲- مشمولہ: پیمانۂ سرور، ص ۲۵-۲۷

۳- برنی، ص ۴۹۱

(الف) سودیشی تحریک

۱- ندوی' سلیمان، یاد رفتگان، ص ۴۸۲

۲- حالی کے لیے، مقالاتِ حالی، جلد اوّل، ص ۳۰۸-۳۱۰، اقبال کے لیے، انوارِ اقبال، ص ۲۵-۳۳

(۳) تحریکِ اتحادِ اسلامی

۱- ''خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے۔'' ندوی' سلیمان، حیاتِ شبلی، ص ۵۹۲

۲- ایضاً، ص ۵۹۵

۳- عبدالحکیم' خلیفہ، ص ۵۷، ۸۸

۴- جسے اُنھوں نے نالۂ جرس کے نام سے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا تھا۔

(الف) ہوم رول کی تحریک

۱- مسانی، ص ۱۱۰، ۱۱۱، نہرو، *Autobiography*، ص ۳۲ و بعدہ۔ بولیتھو، ص ۵۰، ۵۱

۲- ایضاً، ص ۲۶

۳- نہرو، *Autobiography*، ص ۳۱، ۳۲، بنرجی' سر سریندر ناتھ، ص ۲۲۷، ۲۳۸

۴- نہرو، *Autobiography*، ص ۳۱

۵- رابرٹس، ص ۵۸۰، ۵۸۱

۶- چکبست نے یہ نظم لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں سنائی تھی۔ چکبست، صبحِ وطن، ص ۵۳ ح

(۴) تحریکِ خلافت

۱- عبدالماجد دریابادی، مقالاتِ ماجد، ص ۵۲

(الف) تحریکِ ترکِ موالات

۱- مسانی، ص ۱۱۸، ۱۱۹

۲- نہرو، *Autobiography*، ص ۴۰

۳- گاندھی، ص ۳۶۲-۳۶۷

۴- پانڈے، ص ۱۱۳ و بعدہ

۵- ایضاً و نیز سیتا رامیا، جلد اوّل، ص ۲۰۲

۶- پانڈے، ص ۱۱۳، ۱۱۴

۷- فتویٰ مشمولہ: اجمل

۸- سیتا رامیا، جلد اوّل، ص ۲۳۶

۹- عبدالماجد دریابادی، مقالاتِ ماجد، ص ۴۳

(۵) تحریکِ آزادی

(الف) اکبر، چکبست کا دور

۱- عبدالماجد دریابادی، مقالاتِ ماجد، ص۴۷ ''زمیندار نے اندھیر کر دیا، دو تین اشعار میں مجھ پر یہ بدگمانی ہے کہ پنشن کے لالچ سے چپ ہوں۔ میں تو چپ نہیں ہوں، پولیٹیکل کبھی نہیں رہا۔ فلاسوفیکل صوفیانہ طرز ہے۔'' اکبر، ص۲۶۹

۲- احتشام حسین، سید، ص۱۲۵

۳- محمد علی، خطبۂ صدارت، مشمولہ: جعفری، اوراقِ گم گشتہ، ص۹۶

(ب) اقبال، ظفر علی خاں، جوش کا دور

۱- اقبال کے نظریۂ قومیت کے لیے پولنسکایا، ص۱۰۸-۱۳۵

۲- زبیری، سیاست ملیہ، ص۵۹

۳- تفصیل کے لیے، اقبال، انوارِ اقبال، ص۲۵-۳۱

۴- زورؔ محی الدین قادری، مکاتیب شاد و اقبال، ص۱۷۳

۵- اقبال کی سیاسی جدوجہد کے لیے، ملک حفیظ *The Man of Thought*، ص۶۹-۱۰۷

۶- جیسا کہ خود کہا ہے۔ ص۱۶۸

(ج) ترقی پسند شاعروں کا دور

۱- ممتاز حسین، ص۱۴۸

۲- ظہیرؔ سجاد، روشنائی، ص۱۳

۳- جعفری سردار، ص۱۸۱

۴- ظہیرؔ سجاد، روشنائی، ص۱۲۵-۱۲۸، سبط حسن، ص۳۳

۵- ایضاً، ص۳۱

۶- ایضاً، ص۳۳

۷- ممتاز حسین، ص۱۴۸، ترقی پسندوں کا نظریہ یہی تھا کہ ترقی کے معنی اشتراکیت کی طرف بڑھنا ہے۔ احمد علی، ص۷ و بعدہ۔

۸- ظہیرؔ سجاد، روشنائی، ص۴۸

۹- ندیم قاسمی احمد، ص۲۶۰

۱۰- کمیونزم نے ہمارا سب سے بڑا فرض یہ بتایا ہے کہ پہلے وطن کو آزاد کراؤ، اس کے بعد اشتراکیت قائم ہو سکے گی۔ جوشؔ، کانگریس اور کمیونسٹ، ص۷

۱۱- ایضاً، ص ۱۲

۱۲- ایضاً، ۱۲، ۱۳، ۲۲-۲۴

۱۳- ان کی کوششوں کا اندازہ قومی جنگ کے اداریہ مورخہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۴ء سے بھی ہوتا ہے۔ *Making of Pakistan*

۱۴- جوشی، کانگریس اور کمیونسٹ، ص ۱۲

۱۵- اس تعلق سے ان کے افکار و اعمال کے لیے *Autobiography*، ص ۲۵۳، ۵۲۳، *Discovery*، ص ۴۵۵، ۴۶۱ وغیرہ

۱۶- سبط حسن، ص ۳۲، ۳۳

۱۷- ساحر لدھیانوی، ص ۳۳

(۲) تحریک پاکستان

۱- اقبال، خطبۂ صدارت، اجلاس منعقدہ مسلم لیگ، منعقدہ الٰہ آباد، ۱۹۳۰ء، مشمولہ *Writings and Speeches*، ص ۱۲

۲- تفصیل کے لیے پیرزادہ، *Foundations*، جلد دوم، ص ۳۹۰، ۳۹۱

۳- حسرت موہانی، اُردوئے معلی، جنوری ۱۹۴۲ء و نیز تفصیلات کے لیے عبدالشکور، ص ۲۸، ۲۹

۴- پیرزادہ، *Foundations*، جلد دوم، ص ۱۳۶

۵- جوشی، کانگریس اور کمیونسٹ، ص ۱۲ وغیرہ

۶- جیسے اس کا ایک اداریہ، مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۴ء

۷- جوشی، *Freedom Program*، ص ۲۷

۸- ایضاً، کانگریس اور کمیونسٹ، ص ۱۲، ۱۳

۹- ہم لیگ کے چھ صوبوں کی غیر منصفانہ حد بندی کی حمایت نہیں کرتے اور نہ اس مطالبے کی تائید کرتے ہیں کہ ملک کی تقسیم ہی مسلم اکثریتی علاقوں کے اقتدار اعلیٰ کی ضمانت ہے۔ ایضاً، *Freedom Program*، ص ۲۷

باب پنجم

اُردو نثر: ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

۱- افسانوی ادب میں آزادی کا جذبہ

(ا) ناول

(الف) نذیر احمد سے پریم چند تک

۱- صدیقی، محمد عتیق، صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات، جلد اوّل، ص۱۵۶، ۱۵۷۔
دتاسی نے آخرالذکر کو اخلاقی ناول قرار دیا ہے۔ خطبات، ص۱۸۸

۲- ایضاً، ص۴۳۳-۴۳۵

۳- ایضاً، ص۴۳۴

۴- زخمی، ڈاکٹر محمود الٰہی، ص۳۵

۵- تفصیلات کے لیے صدیقی، افتخار احمد، ص۳۲۳، ۳۲۴

۶- حالی، حیات جاوید، ص۳۹۸

۷- دتاسی، خطبات، ص۸۰۷

۸- ایضاً، ص۸۵۷

۹- ایضاً، مقالات، جلد اوّل، ص۴۰، مولوی نذیر احمد نے مرأۃ العروس کے دیباچے میں یہ کہا ہے کہ کتاب کا ابتدائی حصہ اُنھوں نے اپنی بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں تین سال قبل ۱۸۶۶ء میں لکھا تھا۔ ص۳۴

۱۰- صدیقی، افتخار احمد، ص۳۸۲

۱۱- ایضاً، ص۲۳۱

۱۲- بنات النعش، ص۱۸۲

۱۳- صدیقی، افتخار احمد، ص۳۸۲

۱۴- فاروقی، ڈاکٹر احسن، ص۴۵

۱۵- ابن الوقت، ص۱۱۱-۱۲۳

۱۶- صدیقی، افتخار احمد، ص۴۰۲

۱۷- ابن الوقت، ص۲۸۱

۱۸- تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص۱۵۴-۱۵۷

۱۹- ایضاً، ۱۷۰-۱۷۷

۲۰- عبداللہ، ڈاکٹر سیّد، سرسیّد اور ان کے رفقاء، ص۱۱۷

۲۱- ابن الوقت، ص۲۸۱

۲۲- چکبست، مضامین چکبست، ص۳۲

۲۳- تفصیلات کے لیے ادیب، لطیف حسین، باب ہشتم۔

۲۴- فسانۂ آزاد، جلد اوّل، ص۳۷، ۳۸، ۵۰، ۵۱

۲۵- سیر کہسار، جلد دوم، ص۱۷۹

۲۶- ایضاً، ص۱۸۱

۲۷- سکینہ، (انگریزی اشاعت)، ص۲۳۵

۲۸- فاروقی، ڈاکٹر احسن، ص۱۲۸

۲۹- حسینی، علی عباس، ص۲۷

۳۰- تفصیلات: خورشید، عبدالسلام، کاروان صحافت، ص۶۳-۷۳

۳۱- عظیم، وقار، عبدالحلیم شرر، ص۳۷۷، اپنے ناول، ملک العزیز ورجینا کے خاتمے پر شرر نے لکھا:
''اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو ازسرنو زندہ کر سکتے ہیں ... اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنھوں نے شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رہا ہوگا اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے ...'' ص۲۹۳

۳۲- اس کے اس نوع کے ناول یہ ہیں: بابک خرمی، زوال بغداد، الفانسو، قیس لبنی، مقدس نازنین، العبت چین، جویائے حق، أمۃ الکبری۔

۳۳- تفصیلات کے لیے: رفعت، مبارز الدین، ص۴۸، اقتدار عالم خاں، ص۲۵۰

۳۴- عظیم، وقار، داستان سے افسانے تک، ص۹۷

۳۵- میمونہ بیگم انصاری، ص۲۳۲، ۲۳۳

۳۶- ایضاً، ص۲۸۴

۳۷- عظیم، وقار، داستان سے افسانے تک، ص۱۰۲، ۱۰۳

۳۸- ایضاً، ص۱۰۵

۳۹- جعفری، سردار، ص۱۲۷

۴۰- نگم، دیا نرائن، ص۱۰۵

(۲) افسانہ

(الف) پریم چند کا دور

۱- عظیمؔ وقار، داستان سے افسانہ تک، ص۱۴
۲- ایضاً، ص۱۵
۳- اس کی تفصیلات پریم چند نے بیان کی ہیں: *Two Autobiographical Sketches*، مشمولہ: روبن، ص۱۰۹-۲۱۰
۴- ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبّ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں، پریم چند، دیباچہ سوزِ وطن، بحوالہ عظیمؔ وقار، داستان سے افسانے تک، ایضاً، ص۲۶۳
۵- گوپال، مدن، ص۲۹۳، ۲۹۴
۶- ایضاً، ص۱۶۴
۷- تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص۲۱۴، ۲۱۵
۸- ایضاً، ص۲۱۰
۹- ایضاً، ص۱۶۳
۱۰- ایضاً، ص۲۵۹
۱۱- ایضاً، ص۱۷۸
۱۲- ایضاً، ص۲۹۰
۱۳- ایضاً، ص۳۰۸، ۳۰۹
۱۴- ایضاً، ص۱۷۲
۱۵- پریم چند نے ۱۹۳۰ء میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ ''اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔ بحوالہ، رہبر، ہنس راج، ص۲۰۹
۱۶- آشیاں برباد، ص۵۶، ۵۷
۱۷- ایضاً، ص۵۸
۱۸- عظیمؔ وقار، داستان سے افسانے تک، ص۲۰۵

(ب) ترقی پسند افسانہ نگاروں کا دور

۱- مشمولہ: قریشیؔ عبدالرزاق، نوائے آزادی، ص۳۰۰
۲- ایضاً، ص۳۰۶
۳- ایضاً، ص۳۰۷

(۳) ڈراما

(الف) اُردو ڈراموں میں آزادی کا جذبہ

۱- اس کی مثال پریم چند کا ڈراما کربلا ہے۔ مسلمانوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ یہاں تک کہ پریم چند کی کتابیں پھاڑ ڈالیں کربلا نذر آتش کر دیا، پریم چند کی لکھی ہوئی کہانی پر مبنی فلم مل کا مقاطعہ کیا۔ نامی، جلد اوّل، ص ۲۸۳ تفصیلات کے لیے گوپال، مدن، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۳۴-۲۳۸

۲- نامی، جلد دوم، ص ۲۸۷

۳- ایضاً، ص ۲۰۸

۴- رحمانی 'عشرت، ص ۲۰۸

۵- نامی، جلد دوم، ص ۳۰۰

۶- ایضاً، جلد سوم، ص ۲۳

۷- اظہر دہلوی، ص ۱۹۵

۸- ایضاً، ص ۶

۹- ایضاً، ص ۲

(ب) اُردو ڈراموں میں مطالبۂ پاکستان

۱- ص ۲

۲- ص ۳

۳- ص ۵

۴- ص ۱۱

۵- ص ۱۳

۶- ص ۱۸

۷- ص ۲۳

۸- ص ۳۳، ۳۴

۹- ص ۵۹

۱۰- ص ۳

۱۱- ص ۴

۴- طنز و مزاح میں آزادی کا جذبہ

۱- آغا 'وزیر، ص ۱۵۹

۲- کول، کشن پرشاد، ص۶۳

۳- ایضاً، ص۶۰

۴- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۲۹۷

۵- ایضاً، ص۲۹۹

۶- ایضاً، ص۲۱۰

۷- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۶۱

۸- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۲۳۰

۹- آغا، وزیر، ص۱۶۵

۱۰- نئی ڈکشنری، ص۱۱-۱۶

۱۱- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۴۰-۴۴ ڈکشنری کے عنوانات کے تحت تحریروں میں سیاسی موضوعات پر طنزیہ خیالات ملتے ہیں۔

۱۲- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب، ص۳۶۹

۱۳- الپنچ، ص۵۵، ۵۶

۱۴- ایضاً، ص۵۷

۱۵- ایضاً، ص۵۸

۱۶- آغا، وزیر، ص۱۷۲ میں اس دوسرے دَور کو "عبوری دور" قرار دیا گیا ہے۔

۱۷- ایضاً، ص۱۸۳

۱۸- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب، ص۳۷۳

۱۹- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۱۹۶

۲۰- آغا، وزیر، ص۱۷۸

۲۱- الہلال، ۱۷ دسمبر ۱۹۲۳ء، بحوالہ آغا، وزیر، ص۳۴۵

۲۲- مشمولہ: افاداتِ محمد علی، ص۱۳۳

۲۳- ایضاً، ص۱۴۷

۲۴- بحوالہ، آغا، وزیر، ص۱۸۹

۲۵- بحوالہ احمد، کلیم الدین، اُردو ادب میں طنز و ظرافت، ص۷۹

۲۶- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص۱۶۶

۲۷- ایضاً، ص۱۸۱

۲۸- ایضاً، ص۱۶۹

۲۹- ایضاً، ص ۲۱۶
۳۰- ایضاً، ص ۲۳۵
۳۱- مضامین فلک پیما، ص ۱۲۹
۳۲- ایضاً، ص ۱۷۸
۳۳- ایضاً، ص ۲۶۱
۳۴- ایضاً، ص ۲۱۱
۳۵- مشمولہ: نقوش، ص ۸۸۶
۳۶- مشمولہ: آغا وزیر، ص ۳۵۴
۳۷- مشمولہ: چنگ و رباب، ص ۴۴
۳۸- ایضاً، ص ۵۱
۳۹- ایضاً، شیشہ و تیشہ، ص ۲۳، ۲۴
۴۰- ایضاً، مضامین رشید، ص ۵۵
۴۱- ایضاً
۴۲- ایضاً، ص ۱۵۱
۴۳- مشمولہ: مضامین رشید، ص ۲۴۹
۴۴- ایضاً، ص ۲۶۲
۴۵- ایضاً، ص ۲۶۳
۴۶- ایضاً، ص ۲۶۳، ۲۶۴
۴۷- صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب، ص ۳۷۸
۴۸- مضامین رشید، ص ۱۵، ۱۶

۳- مضامین و مقالات میں آزادی کا جذبہ

۱- عبداللہ، ڈاکٹر سیّد، سرسیّد اور ان کے رفقا، ص ۵۱
۲- سیّد احمد خاں، مقالات سرسیّد، حصۂ دہم، ص ۳۸
۳- ایضاً، ص ۳۵
۴- عبداللہ، ڈاکٹر سیّد، تہذیب الاخلاق کی اہمیت، ص ۱۹
۵- سیّد احمد خاں، مقالات سرسیّد، حصہ دوم، ص ۵۲۵، ۵۲۶
۶- ایضاً، ص ۵۸۱
۷- ایضاً، حصہ نہم، ص ۳۵، ۳۷

۸- مقالات حالی، حصہ اوّل، ص ۳۹
۹- ایضاً، ص ۱۳۷
۱۰- ایضاً، ص ۱۸۷
۱۱- ایضاً، ص ۱۷۳
۱۲- ایضاً، ص ۴۴
۱۳- ایضاً، ص ۳، علاحدہ قومیت کے تصور کے لیے حصہ دوم، ص ۱، ۳۷، ۱۴۸، ۱۸۷، ۱۹۲، ۲۷۱، ۲۷۵ وغیرہ
۱۴- مقالات حالی، حصہ اوّل، ص ۱۹۱
۱۵- مقالات حالی، حصہ اوّل، ص ۱۰، ۱۷۱، ۱۷۶
۱۶- ایضاً، ص ۱۴۶
۱۷- ایضاً، ص ۳۰۸-۳۱۰
۱۸- ایضاً، ص ۳۰۸، ۳۰۹
۱۹- مشمولہ: مقالات شبلی، جلد ہشتم، ص ۱۵۰، ۱۵۱
۲۰- ایضاً، ص ۱۶۱
۲۱- ایضاً، ص ۱۶۴، ۱۶۵ و بعدہ
۲۲- ایضاً، ص ۱۶۶
۲۳- ایضاً، ص ۱۷۱ و بعدہ
۲۴- ایضاً، ص ۱۸۶
۲۵- ایضاً، مسلمان، نیشنل کانگریس اور پولٹیکل ایجیٹیشن، ص ۸۲
۲۶- بحوالہ خورشید عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۳۴۲، ۳۴۳
۲۷- مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کی حقیقت، ص ۹۵
۲۸- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص ۱۵۵
۲۹- ایضاً، ص ۲۱۳
۳۰- صدیقی ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب، ص ۳۹۴
۳۱- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص ۱۱۹-۱۲۳
۳۲- صدیقی ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب، ص ۳۸۹
۳۳- مطبوعہ زمانہ مئی و اپریل ۱۹۰۷ء
۳۴- حالی کا مضمون اپریل ۱۹۰۶ء میں اور اقبال کا مضمون مئی ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔
۳۵- یہ دو قسطوں میں: مارچ اپریل اور مئی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔

۳۶- مطبوعہ، فروری ۱۹۰۷ء

۳۷- مطبوعہ، مارچ ۱۹۰۷ء

۳۸- مطبوعہ، مارچ ۱۹۰۷ء

۳۹- قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۳۷

۴۰- الہلال، ۱۹/ اکتوبر ۱۹۱۲ء

۴۱- ایضاً، ۱۰/ جنوری ۱۹۱۲ء

۴۲- ایضاً، ۱۸/ دسمبر ۱۹۱۲ء

۴۳- مشمولہ: تصنیف مذکور، ص ۱۱۲

۴۴- ایضاً، ص ۱۹۱، ۱۹۲

۴۵- ایضاً، ص ۳۳۹

۴۶- قریشی، عبدالرزاق، نوائے آزادی، ص ۳۱۱

۴۷- مشمولہ: انوار اقبال، ص ۲۷۸، ۲۷۹

۴۸- مشمولہ: معینی، ص ۲۲۱-۲۳۸

۴- اُردو صحافت میں آزادی کی جدوجہد

۱- خورشید، عبدالسلام، اُردو صحافت، ص ۸۴۰، ۸۴۱

۲- ایضاً، ص ۸۴۳

۳- یہ سال اشاعت حالیہ تحقیق کے مطابق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۵۸

۴- ایضاً، ص ۶۰

۵- اس نوع کی مثالیں صابری نے دی ہیں، ایضاً، ص ۶۱-۶۲

۶- مثلاً ایضاً، ص ۷۲-۸۰

۷- خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۱۸۸، ۱۸۹

۸- صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۱۱۹، مثالوں کے لیے، ص ۱۲۰-۱۲۷، نیز مالک رام، ص ۲۳

۹- خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۲۸۴

۱۰- کچھ خبریں صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۱۳۸-۱۴۶ میں ہیں۔

۱۱- دتا سی، خطبات، ص ۲۷۴

۱۲- یہ خبریں صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۱۶۴-۱۷۱ میں درج ہیں۔

۱۳- عبداللطیف، نواب سید، ص ۱۹۵، ۱۹۶

۱۴- صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۲۲۳-۲۲۵

۱۵- حالی، حیاتِ جاوید، جلد اوّل، ص ۱۱۴

۱۶- اکرام، موجِ کوثر، ص ۸۷

۱۷- بحوالہ صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۲۸۱

۱۸- اس کی ایک مثال، ایضاً ص ۲۸۲ میں ہے۔

۱۹- دتاسی، خطبات، ص ۹۷۷

۲۰- صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۲۵۷

۲۱- تفصیل کے لیے، ایضاً، ص ۲۶۲، ۲۶۳

۲۲- ایسی انجمنوں کے اخبارات و رسائل کی فہرست، اختر شہنشاہی کے حوالے سے، خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۲۶۷-۲۶۹ میں دی گئی ہیں۔

۲۳- صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۵۲۱

۲۴- ایضاً، ص ۵۴۳

۲۵- ان کے ناموں کے لیے خورشید، صحافتِ پاکستان و ہند میں، ص ۲۴۸ اور نادم سیتا پوری، اودھ پنچ، ص ۷۱

۲۶- قریشی، محمد عبداللہ، ص ۲

۲۷- خورشید، کاروانِ صحافت، ص ۱۴

۲۸- ایضاً، ص ۶۷

۲۹- ایضاً

۳۰- *Indian Annual Register*، (۱۹۲۲ء) جلد اوّل، ضمیمہ، ص ۷۰

۳۱- خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۴۳۹

۳۲- الہلال، ۸/ستمبر ۱۹۱۲ء

۳۳- سالک، سرگزشت، ص ۲۳۶

۳۴- خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۴۵۱

۳۵- ان کی ایک فہرست یوسفی نے ص ۳۹۴، ۳۹۵ میں دی ہے۔ و نیز تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۳۹۱-۳۹۶

۵- تحریکِ آزادی کا ادب

(ا) آزادی کی تحریکات پر تاریخی و سیاسی کتابیں

۱- ان کتابوں کے جائزے کے لیے منگلوری، محمود، صحیفہ ٹیپو سلطان، ص ۲۷-۳۰

۲- تقسیم ہند کے بعد ان کے اس سلسلے کی تیسری کتاب ٹیپو سلطان کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔

۳- مقدمہ، ص ۱۱

۴- حالی، حیات جاوید، ص ۲۳۲

۵- اس کا نام *Personal Adventure during the Indian Rebellion in Rohelkhund, Futtehghur and Oudh* تھا، جو لندن سے ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

۶- *A History of the Indian Mutiny*

۷- *Life of Lawrance*

۸- کتاب کے آخر میں ناشر کا ایک شذرہ ہے جس میں اس نے اس سلسلے کے تحت آئندہ شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ یہیں اس نے اس سلسلے کی اشاعت کا سبب بتایا ہے کہ

''...... اگر چہ ملک کی موجودہ بد مذاقی ہمارے حوصلوں کو پست کیے دیتی ہیں۔ تاہم ملکی جمود کا عالم ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ ہمارے خیال میں دنیا میں صرف وہ قوم دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے، جس کو اپنی شکست پر انفعال اور پشیمانی باقی ہو اور یہ ولولہ واقعات کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ...... '' ص ۱۱۹

(۳) سیاسی مسائل اور آزادی پر نمائندہ کتابیں

(الف) ہندوستانی مسلمانوں کے قومی، سیاسی مسائل پر نمائندہ کتابیں

۱- ص ۵۱

(۴) مطالعۂ پاکستان پر نمائندہ کتابیں

۱- *Common Sense on Pakistan*

(۵) خودنوشت سوانح عمریاں، روزنامچے، سوانحی کتابیں

۱- اس کا ایک خلاصہ نورالحسن ہاشمی نے بعد میں مرتب کر کے اُردو میں ایک نادر روزنامچہ (یادگار ظفر ی) کے نام سے ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔

۲- یہ مقصد تاریخی اور قومی سوانح عمریوں میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، جن کا ایک سرسری جائزہ شامل ص ۲۷۲-۲۷۶ میں ہے۔

۶- متفرقات

(ا) ادارے

۱- چنتامنی، ص ۶-۸ وبعدہ؛ قریشی اشتیاق حسین، Hindu، ان اداروں کے جائزے پر مشتمل ہے۔

۲- عبداللطیف، نواب سیّد، ص ۱۴۳

۳- ایضاً، ص۱۶۸

۴- رزاقی، شاہد حسین، ص۸۹، ۹۰ و نیز تفصیلات کے لیے عزیز، کے کے

۵- اعظمی، عبدالمنان، ص۱۳۷

۶- ان میں سے جنوبی ہند کے اداروں کا ایک مختصر اور جامع تذکرہ شریف المجاہد، ص۴۳۰-۴۴۴ میں ہے۔

(۲) سیاسی جماعتیں، ان کی رودادیں، قراردادیں

۱- بسنٹ، ص۱۵۶

۲- چنتامنی، ص۲۰ و بعدہ

۳- سیتارامیا، جلد اوّل، ص۶۱ اور یہ قراردادیں الفنسٹن کالج کے پرنسپل ورڈزورتھ کے گھر میں مرتب ہوتیں۔
چنتامنی، ص۲۱

۴- بحوالہ منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۵۲

۵- بحوالہ، سمپورآنند، ص۸۹

۶- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص۵۵۲

۷- تقریر مشمولہ: پیرزادہ، *Foundation*، جلد اوّل، ص۷۴

۸- ایضاً، ص۱۰۷، ۱۰۸

۹- ایضاً، جلد دوم، ص۲۷۹

۱۰- ایضاً، ص۳۰۵

۱۱- احمد، قمرالدین، حصہ دوم، ص۹۱

(۳) خطبات، تقاریر

۱- مشمولہ: مکمل لکچرز و سپیچیز، ص۳۲۴، ۳۲۸-۳۳۰

۲- ایضاً، ص۳۴۵-۳۷۶

۳- مشمولہ: باقیات شبلی، ص۳۸-۴۰

۴- تقریر مشمولہ: روداد کانفرنس، ص۱۹۱

۵- مشمولہ: باقیات شبلی، ص۴۶-۵۲

۶- ندوی، سلیمان، حیات شبلی، ص۱۶۰

۷- پیرزادہ، *Foundation*، جلد اوّل، ص۳۸۰

۸- ایضاً، ص۳۵۰

۹- آزاد، قول فیصل، ص۱۰

(۴) مکتوبات

۱- بعد میں یہ خطوط مولانا جمال الدین میاں فرنگی محلی کے ذخیرے سے نقوش (لاہور) ''خطوط نمبر'' میں شائع ہوئے۔ نقوش کے ''خطوط نمبر'' اور ''مکاتیب نمبر'' میں اس دور کے اکثر اکابرین قوم و سیاست کے غیر مطبوعہ خطوط شائع ہوئے۔

(۵) سفرنامے

۱- تفصیلات کے لیے احمدؔ عزیز *Islamic Modernism*، ص ۸ و بعدہ، و نیز چغتائی' محمد اکرام، ص ۱۵۴، ۱۵۵

(۶) فتاوے

۱- نواب سیّد عبداللطیف نے ان فتووں کو یک جا کر کے لکھنؤ سے ۱۸۷۰ء میں شائع کرایا تھا۔
۲- محمد میاں، علمائے حق، جلد اوّل، ص ۱۰۱، ۱۰۲
۳- و نیز تفصیلات کے لیے جامعی' عزیز الرحمٰن، ص ۲۷-۳۶
۴- جنھیں جعفری' رئیس احمد، اوراق گم گشتہ، ص ۱۹۸-۲۰۱ میں نقل کیا گیا ہے۔
۵- مشمولہ: مدنی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۵۳-۲۵۵
۶- منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۸۶
۷- ایضاً، ص ۴۸۷
۸- مشمولہ: اجمل
۹- عبدالغفار' قاضی، حیات اجمل، ص ۲۲۱
۱۰- ایضاً، ص ۲۲۲ و نیز اقبال' افضل، ص ۲۴۳، ۲۸۷
۱۱- مشمولہ: آزاد، تبرکاتِ آزاد، ص ۲۰۳
۱۲- ص ۴۸

(۷) اُردو میں تقسیم ہند کی تجویزیں

۱- آخری مضامین، ص ۴۶
۲- بحوالہ حالی، حیات جاوید، ص ۲۴۶
۳- مکتوبات سرسیّد، ص ۱۰۳، ۱۰۴
۴- بحوالہ خورشید، کاروان صحافت، ص ۶۷
۵- ان کے جائزے کے لیے پیرزادہ، پاکستان منزل بہ منزل، قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۳۸۳-۳۸۷، ہاشمی' عبدالقدوس، ص ۲۴۸-۲۷۰، عاشق بٹالوی، ہماری قومی جدوجہد، ص ۱۴۴-۱۵۷، قریشی' وحید، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، ص ۱۱۷، ۱۱۸-۱۲۰، وغیرہ

۶- یہ دراصل محمد عبدالقدیر بلگرامی کے برادر بزرگ قاضی عزیز الدین بلگرامی نے تصنیف کیا تھا۔ وہ چوں کہ ڈپٹی کلکٹر تھے اور سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اسے اپنے بھائی کے نام سے شائع کیا۔ ملاحظہ فرمایئے مہتمم اشاعت محمد اقتدا خاں شروانی کا مکتوب، مشمولہ: بلگرامی، ضمیمہ اوّل۔

۷- تفصیلات کے لیے، ایضاً ص ۵۹-۶۱ میں ہیں۔ اس رسالے پر نظر ثانی محمد مقتدا خاں شروانی نے کی تھی۔ تفصیلات کے لیے قادری، محمد ایوب، تصورِ پاکستان کی ایک گمشدہ کڑی، ص ۲۵۳

۸- تفصیلات کے لیے سندھی، مولانا سندھی کا منصوبہ، ص ۲۶، ۲۷ ایک تاریخی، سیاسی منشور، ص ۲۴۱-۲۸۵ و نیز ایبک، جلد اوّل، ص ۱۰۵، ۱۰۶

۹- بحوالہ خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۴۵۱

۱۰- اقبال، *Writings and Speeches*، ص ۱۲

۱۱- ان کی تفصیلات عاشق بٹالوی، ہماری قومی جدوجہد، ص ۱۴۴-۱۵۵ میں ہیں۔

۱۲- تفصیلات کے لیے ترجمان القرآن جلد ۱۳، عدد ۲، ۳، ۴، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء

۱۳- تفصیلات کے لیے راشدی، پیر علی محمد، ص ۱۰

باب ششم

ماحصل

۱- تفصیلات کے لیے مصطفےٰ بریلوی، ونیز عقیل، تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر، ص ۸۱-۸۳

۲- گرھیرسن، ص ۲۷۹

۳- فیرر، ص ۱۸۲

۴- تفصیلات کے لیے: عقیل، تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر، احمد عزیز، *Studies*، ص ۲۵۹-۲۶۲، ہاشمی فرید آبادی، *Language Controversy*، ص ۳۵۰-۳۷۶، عزیز کے *Making of Pakistan*، ص ۱۲۵-۱۲۹، گوپال رام، *Indian Muslims*، ص ۳۰-۳۳، سیل انیل، ص ۳۲۵-۳۳۶، آنند سمپور، ص ۸۷-۹۴، ہارڈی، ص ۱۰۲، ۱۴۲-۱۴۴ وغیرہ میں بالخصوص اس مسئلے کی تاریخ، اس کے اسباب اور محرکات پر بحث ہے۔ ونیز اس موضوع کے تفصیلی مطالعے کے لیے گپتا' جے ڈی اور دیا کوف۔

❁ ❁ ❁

فہرست اسناد محولہ

آرچبولڈ ڈبلیو-اے-جے، *Outlines of Indian Constitutional History* (لندن، ۱۹۷۳ء)

آزاد مولانا ابوالکلام، ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق کانپوری (لاہور، ۱۹۶۰ء)

........، تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور، ۱۹۵۷ء)

........، خطبات ابوالکلام آزاد (لاہور، تاریخ ندارد)

........، ہماری آزادی ترجمہ *India Wins Freedom*، از محمد مجیب (بمبئی، ۱۹۶۱ء)

........، قول فیصل (لاہور، تاریخ ندارد)

........، مسئلہ خلافت (لاہور تاریخ ندارد)

........، غالب اور ابوالکلام، مرتبہ محمد عتیق صدیقی (دہلی، ۱۹۶۹ء)

........، اتحاد اسلامی، مشمولہ: خطبات ابوالکلام (لاہور، تاریخ ندارد)

........، آخری منزل اور ہمارا فرض، مشمولہ: نوائے آزادی مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)

........، الجہاد، الجہاد فی سبیل الحریۃ، مشمولہ: الہلال (۱۸/ستمبر ۱۹۱۲ء)

........، صاف اور سادہ سوال، مشمولہ: نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)

........، الہلال (۱۹/اکتوبر ۱۹۱۲ء)

........، ہندوستان کی آزادی اور مسلمان، مشمولہ: نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)

........، الہلال (۶/نومبر ۱۹۱۲ء)

........، الہلال (۱۰/جنوری ۱۹۱۳ء)

........، الہلال (۱۷/ستمبر ۱۹۱۳ء)

آزاد نواب سید محمد، لوکل سیلف گورنمنٹ کی نئی چلتی ڈکشنری، مشمولہ خیالات آزاد، از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (لاہور، ۱۹۶۷ء)

........، نئی ڈکشنری، مشمولہ: خیالات آزاد، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (لاہور، ۱۹۶۷ء)

آزاد مولوی فضل حق، روداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (رامپور، ۱۹۰۰ء)

آزاد محمد حسین، آب حیات (لاہور، ۱۹۵۷ء)

........، نظم آزاد (لاہور، تاریخ ندارد)

..............، دیوان ذوق، مرتبہ (لاہور، تاریخ ندارد)
آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانۂ عامرہ (کانپور، ۱۸۷۱ء)
..............، سرو آزاد (حیدرآباد دکن، ۱۹۱۳ء)
آزردہ، صدرالدین، تذکرۂ آزردہ (کراچی، ۱۹۷۴ء)
آسی، عبدالباری، دو نایاب بیاض (الٰہ آباد، ۱۹۴۲ء)
آغا، ڈاکٹر وزیر، اُردو ادب میں طنز و مزاح (لاہور، ۱۹۵۸ء)
آغا خان ملاحظہ فرمائیے: خان، آغا
آنند، چنی لال، The Government of India (لاہور، ۱۹۳۶ء)
آنند، سمپور، Memoirs and Reflections (لندن، ۱۹۶۲ء)
ابوالحسن بارہ بنکوی، ملفوظات شیخ الاسلام، دو حصص (دیوبند، تاریخ ندارد)
ابوالحسن علی ندوی ملاحظہ فرمائیے: ندوی، ابوالحسن علی
ابوالفضل، اکبر نامہ (کلکتہ، ۱۸۷۳ء)
..............، آئین اکبری، انگریزی ترجمہ بلاخ مین (کلکتہ، ۱۸۷۳ء)
اجمل، محمد، کراچی کا تاریخی مقدمہ (بمبئی، تاریخ ندارد)
احتشام حسین، سید ملاحظہ فرمائیے: حسین، سید احتشام
احمد، بشیرالدین، تاریخ وجے نگر (حیدرآباد دکن، ۱۳۳۹ھ)
..............، واقعات دارالحکومت دہلی (آگرہ ۱۹۱۹ء)
احمد، جمیل الدین، Muslim Political Movement, Early Phase (کراچی، تاریخ ندارد)
..............، Historic Documents of Muslim Freedom Movement (لاہور، ۱۹۷۰ء)
..............، Foundation of Muslim League مشمولہ: A History of the Free Movement، جلد سوم، حصہ اوّل (کراچی، ۱۹۶۰ء)
..............، Congress in Office مشمولہ A History of the Free Movement، جلد چہارم کراچی، ۱۹۷۰ء)
..............، Muslims and the Partition of Bengal مشمولہ: A History of the Free Movement، جلد سوم، حصہ اوّل (کراچی، ۱۹۶۰ء)
احمد، صفی، British Agression in Oudh مرتبہ (لکھنؤ، ۱۹۶۴ء، سائیکلوسٹائل)
احمد، عزیز، اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصّہ (علی گڑھ، ۱۹۵۵ء)
احمد، عزیز، Studies in Islamic Culture in Indian Enviroment (آکسفورڈ، ۱۹۶۶ء)
..............، Islamic Moderism in India and Pakistan (آکسفورڈ، ۱۹۶۷ء)

احمد، قمرالدین، محفل عزیز (حیدرآباد دکن، ۱۹۶۲ء)
احمد، قیام الدین، ہندوستان میں وہابی تحریک (کراچی، ۱۹۷۲ء)
احمد، کلیم الدین، دو تذکرے جلد اوّل (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)
.................، فن داستان گوئی (پٹنہ، تاریخ ندارد)
.................، اُردو ادب میں طنز و ظرافت، مشمولہ: نقوش (لاہور، طنز و مزاح نمبر)
احمد، محمد مسعود، فاضل بریلوی اور ترک موالات (لاہور، ۱۹۷۱ء)
احمد، مولوی نذیر، بنات النعش (دہلی، ۱۹۵۱ء)
.................، لکچروں کا مجموعہ دو جلدیں (دہلی، ۱۹۱۸ء)
.................، مرأۃ العروس (کراچی، ۱۹۶۱ء)
.................، موعظۂ حسنہ (لاہور، ۱۹۶۳ء)
احمد علی ملاحظہ فرمایئے: علی، احمد
اختر جونا گڑھی، قاضی احمد میاں، مضامین اختر (کراچی، ۱۹۷۲ء)
اخلاص، کشن چند، تذکرہ ہمیشہ بہار (کراچی، ۱۹۷۳ء)
ادارۂ مطبوعات پاکستان، ۱۸۵۷ء کوائف و صحائف (کراچی، ۱۹۵۷ء)
ادیب، لطیف حسین، سرشار کی ناول نگاری (کراچی، ۱۹۶۱ء)
ادیب، مسعود حسین رضوی، شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر، فائز دہلوی (لکھنؤ، ۱۹۵۱ء)
.................، شہر آشوب، مشمولہ: نقوش (لاہور، مئی ۱۹۶۵ء)
ارون، ولیم، The Later Moghals جلد اوّل (کلکتہ، ۱۹۲۱ء)
.................، The Later Moghals جلد دوم (کلکتہ، ۱۹۲۲ء)
اسپیئر، پرسیول، Twilight of the Moghals (کیمبرج، ۱۹۵۱ء)
اسپیئر، ٹی - جی - پی، The Nabobs (لندن، ۱۹۳۲ء)
اسپین، جیمز ڈبلیو، The Pathan Border Land (ہیگ، ۱۹۶۲ء)
اسٹرنگ، ہربرٹ، Great Fight for India (لندن، تاریخ ندارد)
اسلم، محمد، دین الٰہی اور اس کا پس منظر (لاہور، ۱۹۷۰ء)
اسمٰعیل شہید، شاہ، صراط مستقیم (لاہور، تاریخ ندارد)
اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد، تذکرۂ حالی (دہلی، ۱۹۲۵ء)
.................، ادیب اور مصنف، مشمولہ: نقوش (لاہور، لاہور نمبر)
اسمٰعیل میرٹھی، حیات و کلیات مرتبہ محمد اسلم سیفی (دہلی، ۱۹۳۹ء)

اشرف علی تھانوی، مولانا ملاحظہ فرمایئے: تھانوی، مولانا اشرف علی
اصلاحی، ضیاء الدین، تحریک آزادی میں دارالمصنفین کا حصہ، مشمولہ: قومی زبان (کراچی، اگست ۱۹۷۱ء)
اظہر دہلوی، بیداری، مشمولہ: نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
اعظم، خواجہ، تاریخ اعظمی (لاہور، تاریخ ندارد)
اعظمی، عبدالمنان، جسٹس بدر الدین طیب جی اور انجمن اسلام بمبئی، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، جلد ۱۰۲، شمارہ ۲۵)
افسر امروہوی، مخطوطات انجمن ترقی اُردو، کراچی جلد اوّل (کراچی، ۱۹۶۵ء)
افضل حق، چودھری، تاریخ احرار (لاہور، ۱۹۷۳ء)
اقبال، جاوید، مئے لالہ فام (لاہور، ۱۹۶۶ء)
اقبال، افضل، *Life and Times of Mohammad Ali* (لاہور، ۱۹۷۴ء)
اقبال، علامہ شیخ محمد، انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (کراچی، ۱۹۶۷ء)
.................، *Reconstruction of Religous Thought in Islam* (لندن، ۱۹۳۴ء)
.................، *Speeches and Statements of Iqbal* (لاہور، ۱۹۴۸ء)
.................، قطعہ، مشمولہ: نیرنگِ خیال (لاہور، فروری ۱۹۳۸ء)
.................، مسلمانوں کا امتحان، مشمولہ: انوارِ اقبال (کراچی، ۱۹۶۷ء)
اکبر الٰہ آبادی، ذاتی ڈائری، حضرت اکبر کے شب و روز مرتبہ رحیم دہلوی (کراچی، تاریخ ندارد)
اکرام، شیخ محمد، رود کوثر (لاہور، ۱۹۵۸ء)
.................، غالب نامہ (بمبئی، چوتھی اشاعت)
.................، موج کوثر (لاہور، ۱۹۵۸ء)
.................، یادگار شبلی (لاہور، ۱۹۷۱ء)
.................، *Modern Muslim India and the birth of Pakistan* (لاہور، ۱۹۶۵ء)
اکرام اللہ خان ندوی ملاحظہ فرمایئے: ندوی، اکرام اللہ خان
الانہ، جی، *Our Freedom Fighters* (کراچی، ۱۹۶۹ء)
الپنچ، مشمولہ: نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
القاسم، دارالعلوم نمبر (دیوبند، ۱۹۴۷ء)
الیگزینڈر ہیورس، *India since Crips* (نیویارک، ۱۹۴۴ء)
امام خان نوشہروی، ابو یحییٰ، تراجم علمائے حدیث (لاہور، ۱۳۹۱ھ)
.................، علمائے اہل حدیث کی علمی خدمات (لاہور، ۱۳۹۱ھ)

امبری' اے-ٹی، *Charles Grant and British Rule in India* (لندن،۱۹۶۲ء)

امبیڈکر' بی-آر، *Thoughts on Pakistan* (بمبئی،۱۹۴۱ء)

..................، *Pakistan or the Partition of India* (بمبئی،۱۹۴۶ء)

امپیرل گزٹیئر آف انڈیا، *Imperial Gazzetteer of India* جلد۱۱،۱۲،۲۴ (آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء)

امداداللہ' حاجی، کلیات امدادیہ (لاہور،۱۹۴۵ء)

امراللہ الٰہ آبادی' ابوالحسن امیرالدین، تذکرہ مسرت افزا ترجمہ ڈاکٹر مجید قریشی (دہلی،۱۹۶۸ء)

امیر علی' جسٹس ملاحظہ فرمایئے: علی' جسٹس امیر

امیر مینائی ملاحظہ فرمایئے: مینائی' امیر

اندرار و تھر منڈ، Nationalism and the Provincial Response مشمولہ: *South Asia* (آسٹریلیا، شمارہ اوّل، اگست ۱۹۷۱ء)

انڈین اسٹیچوری رپورٹ، *Indian Statutary Commission Report* (لندن،۱۹۳۰ء)

انڈین اینول رجسٹر، *Indian Annual Register* ۱۹۲۲ء جلد اوّل (کلکتہ ۱۹۲۳ء)، ۱۹۲۹ء (کلکتہ،۱۹۳۰ء)، ۱۹۴۰ء (مدراس،۱۹۴۱ء)

انڈین کوارٹرلی رجسٹر، *Indian Quarterly Register* ۱۹۲۸ء، جلد دوم (کلکتہ،۱۹۲۸ء)

انس' جے-میکلوڈ، *Sepoy Revolt, a Critical Narrative* (لندن،۱۸۹۷ء)

انسائکلوپیڈیا برٹینکا، *Encyclopaedia Britannica* جلد۱۲ (لندن)

انصاری' رشید احمد، مقدمہ مشمولہ دولرانی خضر خان از امیر خسرو (علی گڑھ،۱۹۱۸ء)

انصاری' ظفر احمد، پاکستان، ماضی، حال، مستقبل، مشمولہ: چراغ راہ (کراچی، نظریۂ پاکستان نمبر)

..................، نظریۂ پاکستان اور علما مشمولہ: چراغ راہ (کراچی، نظریۂ پاکستان نمبر)

انصاری' مفتی محمد رضا، جان عالم کا سو گوار لکھنؤ، مشمولہ: نقوش (لاہور، دسمبر ۱۹۷۰ء)

انصاری' ڈاکٹر مختار احمد، خطبۂ صدارت (اجلاس مسلم لیگ منعقدہ ناگپور دسمبر ۱۹۲۰ء) مشمولہ: *Foundation of Pakistan* جلد اوّل، مرتبہ شریف الدین پیرزادہ (کراچی،۱۹۶۹ء)

انور' اشفاق، انجمن پنجاب اغراض و مقاصد، مشمولہ: صحیفہ (لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء)

انور شیر کوٹی' انوارالحسن، انوارِ قاسمی (لاہور،۱۹۶۹ء)

..................، تجلیاتِ عثمانی (ملتان،۱۹۵۷ء)

انیس فاطمہ بریلوی ملاحظہ فرمایئے: فاطمہ' انیس

اوڈوائر' مائیکل، *India As I Knew it* (لندن،۱۹۲۵ء)

اوکینلے' جیمز، Wahabi Movement مشمولہ: *Calcutta Review* (کلکتہ، جلد ۵۱، جولائی ۱۹۷۰ء)

ایبک، ظفر حسن، آپ بیتی (لاہور، ۱۹۵۴ء)
ایبوٹ، فری لینڈ، Islam and Pakistan (نیویارک، ۱۹۶۸ء)
ایڈمز، چارلس سی، اسلام اور تحریک تجدد مصر میں ترجمہ عبدالمجید سالک (لاہور، ۱۹۶۲ء)
ایڈوارڈز، ایس ایم، Rise of Bombay (بمبئی، ۱۹۰۲ء)
ایڈوارڈز، مائیکل، The King of the World (لندن، ۱۹۷۰ء)
.................، Battles of Indian Mutiny (لندن، ۱۹۶۳ء)
.................، Plassy, Founding of an Empire (لندن، ۱۹۶۹ء)
.................، The Battle of Plassy (لندن، ۱۹۶۳ء)
.................، The Defence of the Lucknow Residency (لندن، ۱۹۷۴ء)
.................، The Red Year, 1857 (لندن، ۱۹۷۳ء)
.................، The necessary Hell (لندن، ۱۹۵۸ء)
.................، Ralph Fitch (لندن، ۱۹۷۲ء)
ایڈوارڈز، ولیم، Personal Adventures during the Indian Rebellion in Rohelkhund, Futtehghur and Oudh (لندن، ۱۸۵۸ء)
ایڈی، جے پی اور لاوٹن، ایف ایچ، India's New Constitution (لندن، ۱۹۳۵ء)
اینڈریوز، سی ایف، مولوی ذکاء اللہ دہلوی ترجمہ ضیاالدین احمد برنی (کراچی، تاریخ ندارد)
اینگر، اے۔آر، The Indian Constituions (مدراس، ۱۹۲۳ء)
ایورسلے، لارڈ، Turkish Empire (لاہور، ۱۹۵۲ء)
بارنو، وکٹر، Changing Character of a Hindu Festival مشمولہ: American Anthropologist (وسکونسن، فروری ۱۹۶۴ء)
باری، کمپنی کی حکومت (لاہور، ۱۹۶۹ء)
باسو، بی ڈی، Rise of Christian Power in India (کلکتہ، ۱۹۳۱ء)
بال، چارلس، The History of Indian Mutiny (لندن، تاریخ ندارد)
بالجن، جے ایم ایس، Reforms and Religious Thoughts of Sir Syed Ahmed Khan (لاہور، ۱۹۵۸ء)
بٹالوی، عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال (کراچی، ۱۹۶۱ء)
.................، ہماری قومی جدوجہد، ۱۹۳۹ء (لاہور، ۱۹۷۰ء)
بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ (کلکتہ، ۱۸۶۹ء) ترجمہ اُردو (لاہور، ۱۹۶۲ء)
بدرالدین سرہندی، حضرات قدس (لاہور، ۱۹۷۱ء)

بڈویل شیلفورڈ، Swards for Hire (لندن، ۱۹۷۱ء)

برقؔ پنڈت جوالا پرشاد، البرٹ بل مشمولہ: نقوش (لاہور، طنز و مزاح نمبر)

برنی ضیاالدین احمد، عظمت رفتہ (کراچی، ۱۹۶۱ء)

بروم فیلڈ، Forgotten Majority, The Bengal Muslims، مشمولہ: Soundings in Modern South Asian History مرتبہ ڈی اے لو (لندن، ۱۹۶۸ء)

بسنٹ اینی، India, Bond or Free (لندن، ۱۹۲۶ء)

بشیر الدین مولوی، مقدمہ، مسلمانوں کا روشن مستقبل مصنفہ سیّد طفیل احمد منگلوری (بدایوں، ۱۹۳۸ء)

بلگرامی محمد عبدالقدیر، ہندو مسلم اتحاد پر ایک کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام مرتبہ، محمد ضیا الاسلام (کراچی، ۱۹۷۰ء)

بلوم ہارٹ جے ایف، AHMED (Syed) باب مشمولہ: Encyolopaedia of Islam (لندن، ۱۹۶۰ء)

بلہوری خرم علی، نصیحۃ المسلمین قلمی، مکتوبہ ۱۲۴۱ھ مملوکہ معین الدین عقیل۔

بنرجی اے سی، Indian Constitutional Documents دو جلدیں (کلکتہ، ۱۹۴۸ء)

بنرجی سریندر ناتھ، A Nation in Making (لندن، ۱۹۲۵ء)

بولیتھو ہیکٹر، Jinnah, the Creator of Pakistan (نیو یارک، ۱۹۵۵ء)

بنرجی ڈبلیو سی، Introduction to Indian Politics (لندن، ۱۸۹۸ء)

بھٹناگر ایس کے، History of M.A.O College, Aligarg (بمبئی، ۱۹۶۹ء)

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، A History of the freedom Movement چار جلدیں (کراچی، ۵۷-۱۹۷۰ء)

پامر جے اے بی، Mutiny Outbreak at Meerut, 1857 (کیمرج، ۱۹۶۶ء)

پانڈے بی این، Breakup of British India (لندن، ۱۹۶۹ء)

پانیکر کے ایم، A Survey of Indian History (لندن، ۱۹۴۸ء)

پٹا بھائی سیتا رامیا، History of Indian National Congress جلد اوّل (مدراس، ۱۹۳۵ء)، جلد دوم (بمبئی، ۱۹۴۷ء)

پریم چند، آشیان برباد، مشمولہ: زاد راہ (لاہور، ۱۹۶۳ء)

.........، Two Autobiographical Sketches مشمولہ: The World of Prem Chand ترجمہ ڈیوڈ روبن (لندن، ۱۹۶۹ء)

پنجاب یونی ورسٹی لاہور، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت، چھٹی تا دسویں جلد (لاہور، ۱۹۷۱-۱۹۷۲ء)

پنجابی اے، Confedracy of India (لاہور، ۱۹۳۹ء)

پولنسکایا گورڈن، Idealogy of Muslim Nationalism مشمولہ: Iqbal مرتبہ حفیظ ملک (نیو یارک، ۱۹۷۱ء)

پیرزادہ' شریف الدین، پاکستان منزل بہ منزل (کراچی، ۱۹۶۶ء)
.................، Foundations of Pakistan جلد اوّل (کراچی، ۱۹۶۹ء)، جلد دوم (کراچی، ۱۹۷۰ء)
.................، Pakistan Resolution and Historic Lahore Session (کراچی، ۱۹۶۸ء)
تابان' ظفر، غدر کے مناظر ترجمہ (دہلی، ۱۹۳۵ء)
تلک' بال گنگا دھر، Writings and Speeches (مدراس، ۱۹۱۹ء)
تنہا' یحییٰ، سیر المصنّفین جلد دوم (دہلی، ۱۹۲۸ء)
...........، مراۃ الشعرا (لاہور، تاریخ ندارد)
تھامنکر' ڈی وی، Lokamanya Tilak (لندن، ۱۹۵۶ء)
تھامسن' ایڈورڈ، Enlist India for Freedom (لندن، ۱۹۶۰ء)
تھامسن' اور گیریٹ' جی ٹی، Rise and Fulfilment of British Rule in India (لندن، ۱۹۳۴ء)
تھانوی' مولانا اشرف علی، الاضافات الایومیہ جلد ششم (تھانہ بھون، تاریخ ندارد)
.....................، فتویٰ متفقہ (دہلی، تاریخ)
.....................، ملفوظات اشرفیہ (تھانہ بھون، تاریخ ندارد)
تھانوی' شیخ محمد، وحدت الوجود والشہود (کراچی، ۱۹۶۳ء)
تھانیسری' سید محمد جعفر، سوانح احمدی (پنڈی بہاؤ الدین، تاریخ ندارد)
.....................، حیات سیّد احمد شہید (کراچی، ۱۹۶۸ء)
.....................، تاریخ عجیبہ (لاہور، ۱۸۹۰ء)
.....................، تواریخ عجیب مرتبہ محمد ایوب قادری (کراچی، ۱۹۶۴ء)
ٹائن بی' آرنلڈ جے، مطالعۂ تاریخ ترجمہ A Study of History مترجم غلام رسول مہر، جلد دوم (لاہور، ۱۹۶۳ء)
ٹمپل' رچرڈ، Men nad Events of My Time in India (لندن، ۱۸۵۷ء)
ٹنکر' ہیوگ، South Asia, a Short History (لندن، ۱۹۶۶ء)
ثناالحق، وحدت الوجود والشہود مصنفہ شیخ محمد تھانوی (کراچی، ۱۹۶۳ء)
ثناء اللہ امرتسری، رسالۂ خلافت (امرتسر، ۱۹۳۱ء)
جالبی' جمیل، مقدمہ دیوان حسن شوقی مشمولہ: اُردو (کراچی، جلد ۴۶، شمارہ ۲۵)
جامعی' عزیز الرحمٰن، حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی (دہلی، ۱۹۶۱ء)
جانسن' گورڈن، Chitpavan Brahmins and Politics in Western India مشمولہ: Elites in South Asia مرتبہ ایڈمنڈ لیچ اور ایس این مکرجی (کیمرج، ۱۹۷۰ء)
جذبی' معین احسن، حالی کا سیاسی شعور (لاہور، ۱۹۶۳ء)

جعفر زٹلی مرزا، کلیات جعفر زٹلی (دہلی، ۱۲۸۹ھ)
جعفری رئیس احمد، اوراق گم گشتہ (کراچی، ۱۹۶۸ء)
............، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد (لاہور، ۱۹۵۵ء)
............، دید و شنید (لاہور، ۱۹۵۰ء)
............، سیرت محمد علی (لاہور، ۱۹۵۰ء)
............، علی برادران (کراچی، ۱۹۶۳ء)
جعفری سردار، ترقی پسند ادب (علی گڑھ، ۱۹۵۱ء)
جعفری سید تقام حسین، تحقیقی نوادر (کراچی، ۱۹۷۴ء)
جناح محمد علی، *Some Recent Speeches and Writings of Mohammad Ali Jinnah* مرتبہ جمیل الدین احمد (علی گڑھ، ۱۹۴۴ء)
جوشی پورن چند، کانگریس اور کمیونسٹ (بمبئی، ۱۹۴۶ء)
............، *Freedom Programm of Indian Communists* (بمبئی، ۱۹۴۵ء)
............، *Rebellion- A Symposium* (دہلی، ۱۹۵۷ء)
چاند شیخ، سودا (کراچی، ۱۹۶۳ء)
............، ساقی نامۂ درد مند مشمولہ: اُردو (اورنگ آباد، جولائی ۱۹۳۸ء)
چٹر جی بنکم چندر، آنند مٹھ (کلکتہ، ۱۹۶۰ء)
چٹر جی تپن موہن، *Road to Plassy* (کلکتہ، ۱۹۶۰ء)
چٹوپادھیا ایچ، *The Sepoy Mutiny 1857* (کلکتہ، ۱۹۵۷ء)
چغتائی محمد اکرام، شاہان اودھ کے کتب خانے (کراچی، ۱۹۷۳ء)
چغتائی محمد عبداللہ، عروس المجالس مشمولہ: بصائر (کراچی، ٹیپو سلطان نمبر)
چک این-اے، *Annals of the Indian Mutiny* (لندن، ۱۹۷۴ء)
چکبست برج نرائن، صبح وطن (الہ آباد، ۱۹۲۸ء)
............، مضامین چکبست (الہ آباد، ۱۹۴۶ء)
چنامنی ڈاکٹر، سیاست ہند مابعد غدر ترجمہ *Indian Politics Since Mutiny* مترجمہ فضل حسین (لکھنؤ، تاریخ ندارد)
چندر کیلاش، *Tragedy of Mr. Jinnah* (لاہور، ۱۹۴۵ء)
چودھری نرادسی، *Autobiography of an Unknown Indian* (نیویارک، ۱۹۵۱ء)
حاتم شاہ ظہور الدین، کلیات، مشمولہ: شاہ حاتم، حالات و کلام مرتبہ غلام حسین ذوالفقار (لاہور، ۱۹۶۴ء)

حاکم لاہوری، عبدالحکیم، تذکرہ مردم دیدہ (لاہور، ۱۹۶۲ء)
حالی، الطاف حسین، مقالات حالی دو جلدیں (دہلی، ۱۹۳۴ء)
..................، مقالات حالی جلد اوّل (کراچی، ۱۹۵۵ء)
..................، مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی (لاہور، ۱۹۵۳ء)
..................، ترجمۂ حالی مشمولہ: ارمغانِ حالی، مرتبہ حمید احمد خان (لاہور، ۱۹۷۱ء)
..................، حیاتِ جاوید (دہلی، ۱۹۳۹ء)
..................، مقدمہ، مسدس مد و جزر اسلام (کانپور، ۱۹۰۹ء)
..................، مکتوباتِ حالی جلد اوّل (پانی پت، ۱۹۲۵ء)
حسرت، جعفر علی خان، مخمس در احوال شاہ جہاں آباد، مشمولہ: اُردو (کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء)
حسرت، بکرماجیت، *Dara Shikoh, Life and Works* (کلکتہ، ۱۹۵۳ء)
حسرت، فضل الحسن، اُردوئے معلیٰ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۲ء
..................، مسٹر مارلے کی مجوزہ اصلاحوں کی حقیقت، مشمولہ: نوائے آزادی مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
حسن، ڈاکٹر اقتدا، شہر آشوب قائم چاند پوری، مشمولہ: ادبی دنیا (لاہور، دور پنجم، شمارہ نہم)
حسن، خواجہ سرور، *The Transfer of Power* (کراچی، ۱۹۶۶ء)
حسن، ڈاکٹر محمد، ہندی ادب کی تاریخ (علی گڑھ، ۱۹۶۵ء)
حسن، میر، تذکرہ شعرائے اُردو (دہلی، ۱۹۴۰ء)
حسین، منشی سجاد، انڈے بچے والی چیل چہاڑ، مشمولہ: نقوش (لاہور، طنز و مزاح نمبر)
..................، مکتوب بنام لارڈ لینڈائون مشمولہ: نوائے آزادی مرتب عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
حسین، سیّد احتشام، تنقیدی جائزے (الٰہ آباد، ۱۹۵۱ء)
حسین، ڈاکٹر سیّد عابد، ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں (دہلی، ۱۹۶۵ء)
حسین، ڈاکٹر محمود، Tipu Sultan، مشمولہ: *A History of the Freedom Movement* جلد اوّل (کراچی، ۱۹۵۷ء)
حسین، پروفیسر ممتاز، متحدہ محاذ، مشمولہ: سویرا (لاہور، شمارہ ۱۰-۱۱)
حسین، میر ولایت، ذاتی ڈائری کے چند اوراق، مشمولہ: علی گڑھ میگزین (علی گڑھ، علی گڑھ نمبر)
حسینی، سیّد محمد علی، تاریخ راحت افزا (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء)
حسینی، علی عباس، اُردو ناول — تاریخ اور تنقید (لاہور، ۱۹۵۸ء)
حفیظ جالندھری، تلخابۂ شیریں (لاہور، ۱۹۸۵ء)

حلیم، اے بی اے، Aligarh Muslim Universty، مشمولہ: A History of the Freedom Movement، جلد چہارم (کراچی، ۱۹۷۰ء)
حیدری، حیدر بخش، تذکرہ حیدری (کراچی، ۱۹۶۸ء)
حیرت دہلوی، مرزا، حیات طیبہ (دہلی، ۱۸۹۵ء)
خافی خان ملاحظہ فرمایئے: خان، خافی، محمد ہاشم
خان، آغا، India in Transition (لندن، ۱۹۱۸ء)
.........، Memoirs of Agha Khan (لندن، ۱۹۵۴ء)
خان، اکرام اللہ ندوی، وقار حیات (علی گڑھ، ۱۹۲۵ء)
خان، اقتدار عالم، اُردو میں ناول نگاری کی ابتدا، مشمولہ: نقوش (لاہور)
خان، خافی، محمد ہاشم، منتخب اللباب (کلکتہ، ۱۸۶۹ء)
خان، درگاہ قلی، مرقعٔ دہلی (حیدرآباد دکن، تاریخ ندارد)
خان، سید احمد، آثار الصنادید مرتبہ ڈاکٹر معین الحق (کراچی، ۱۹۶۶ء)
.........، آخری مضامین (لاہور، تاریخ ندارد)
.........، تذکرۂ اہل دہلی مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (کراچی، اشاعت اول)
.........، تہذیب الاخلاق جلد دوم (لاہور، ۱۸۹۶ء)
.........، رسالہ اسباب بغاوت ہند، مشمولہ: حیات جاوید مصنفہ الطاف حسین حالی (دہلی، ۱۹۳۹ء)
.........، خطوط سرسیّد مرتبہ راس مسعود (بدایوں، ۱۹۳۱ء)
.........، مکتوبات سرسیّد مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی (لاہور، ۱۹۵۹ء)
.........، مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز (لاہور، ۱۹۰۰ء)
.........، مسافران لندن (لاہور، ۱۹۶۱ء)
.........، سرسیّد کے رفقا خود ان کی نظر میں، مشمولہ: برگ گل (کراچی، ۱۹۶۸ء)
.........، مقالات سرسیّد جلد ہفتم (لاہور، ۱۹۶۲ء)، جلد نہم (لاہور، ۱۹۶۲ء)، جلد دہم (لاہور، ۱۹۶۲ء)، جلد سیزدہم (لاہور، ۱۹۶۳ء)
خان، سید نور الحسن، تذکرہ نگارستان سخن (بھوپال، ۱۲۹۳ھ)
خان، صابر علی، سعادت یار خان رنگین (کراچی، ۱۹۵۶ء)
خان، صدیق حسن، شمع انجمن (بھوپال، ۱۸۹۳ء)
خان، عبدالقادر، علم و عمل وقائع، عبدالقادر خانی ترجمہ معین الدین افضل گڑھی، حواشی محمد ایوب قادری، جلد اول (کراچی، ۱۹۶۰ء)

خان، عبدالمجید، Transition in Bengal (کیمبرج، ۱۹۶۹ء)
خان، عظمت اللہ، ڈیڑھ اینٹ، مشمولہ: مضامینِ عظمت (کراچی، ۱۹۶۵ء)
خان، عنایت اللہ مشرقی، قولِ فیصل (لاہور، اشاعت اوّل)
.... ، مولوی کا غلط مذہب (لاہور، تاریخ ندارد)
خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ، حالی کا ذہنی ارتقا (لاہور، ۱۹۶۶ء)
.... ، سرسیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، مشمولہ: برگِ گل (کراچی، ۱۹۶۸ء)
خان، حکیم محمد اجمل، خطبہ صدارت، مشمولہ: Foundations of Pakistan جلد اوّل مرتبہ شریف الدین پیرزادہ (کراچی، ۱۹۶۹ء)
خان، محمد اجمل، قومی ترانے اور نظمیں (لاہور، ۱۹۴۵ء)
خان، محمد حسین، تذکرہ ریاض الفردوس (لاہور، ۱۹۶۸ء)
خان، معین الدین احمد، History of Faraidi Movement (کراچی، ۱۹۶۵ء)
خان، مہدی علی، مکاتیب محسن الملک (علی گڑھ، تاریخ ندارد)
.... ، تقریر، اجلاس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۸۹۴ء (آگرہ، ۱۸۹۵ء)
خانم، خالدہ ادیب، ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین (دہلی، ۱۹۳۵ء)
خرم علی بلہوری ملاحظہ فرمایئے: بلہوری، خرم علی
خلافت کانفرنس، قرارداد، خلافت کانفرنس۔ منعقدہ "گیا" دسمبر ۱۹۲۲ء مشمولہ: The Indian Khilafat Movement مرتبہ کے کے عزیز (کراچی، ۱۹۷۲ء)
خلیق الزماں، چودھری، Pathway to Pakistan (لاہور، ۱۹۶۱ء)
خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں (لاہور، ۱۹۶۳ء)
.... ، کاروانِ صحافت (کراچی، ۱۹۶۴ء)
.... ، اُردو صحافت، مشمولہ: نقوش (لاہور، لاہور نمبر)
خوشونت سنگھ، Ranjit Singh (لندن، ۱۹۶۲ء)
خویشگی، نصر اللہ خان، گلشنِ ہمیشہ بہار (کراچی، ۱۹۶۷ء)
داراشکوہ، مجمع البحرین (کلکتہ، ۱۹۲۹ء)
داس، ایم این، India Under Morley and Minto (لندن، ۱۹۶۴ء)
دتا، بھوپندر ناتھ، Studies in Indian Social Polity (کلکتہ، ۱۹۴۴ء)
دتاسی، گارساں، خطباتِ گارساں دتاسی (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)
.... ، مقالاتِ گارساں دتاسی جلد اوّل (دہلی، ۱۹۴۳ء)، جلد دوم (کراچی، ۱۹۶۴ء)

درانی' ایف کے خان، Meaning of Pakistan (لاہور، ۱۹۴۴ء)
دردائی' معین الدین، صوفیائے بہار اور اُردو (کراچی، ۱۹۷۲ء)
دیاکوف' اے ایم، The National Problem in India Today (ماسکو، ۱۹۶۶ء)
ڈوبن' کرشنائین، Basic Documents in the Development of Modern India and Pakistan (لندن ۱۹۷۰ء)
.................، Urban Leadership in Eastern India (لندن، ۱۹۷۲ء)
ڈوڈویل' ہنری، Duplex and Clive (لندن، ۱۹۶۷ء)
ذکاءاللہ دہلوی' مولوی، تاریخ عروج عہد انگلشیہ ہند (دہلی، ۱۹۰۴ء)
.................، تاریخ ہندوستان جلد ہشتم (دہلی، تاریخ ندارد)
ذوالفقار' ڈاکٹر غلام حسین، اُردو شاعری کا تہذیب و سیاسی پس منظر (لاہور، ۱۹۶۶ء)
رابرٹس' پی ایف، History of British India (لندن، ۱۹۵۸ء)
راجپوت' اے بی، Muslim League- Yesterday and Today (لاہور، ۱۹۴۸ء)
.................، Cabnet Mission (لاہور، ۱۹۴۷ء)
راجن' نٹ، History of Indian Journalism حصہ دوم (کلکتہ، ۱۹۵۵ء)
راشد الخیری' علامہ، دہلی کی آخری بہار (دہلی، تاریخ ندارد)
راشدی' پیر علی محمد، مولانا غلام رسول مہر، مشمولہ: روزنامہ جنگ (کراچی، ۲۷ر مارچ ۱۹۷۲ء)
راشدی' حسام الدین، تذکرہ شعرائے کشمیر تکملہ جلد چہارم (کراچی، ۱۹۶۹ء)
راگھوانشی' وی پی ایس، Indian Nationalist Movement (آگرہ، ۱۹۵۱ء)
رالنسن' ایچ جی، British Beginings in Western India (آکسفورڈ، ۱۹۲۰ء)
رائے' راجا رام موہن، English Works of Ram Mohan Roy (الٰہ آباد، ۱۹۰۶ء)
رائے' لالہ راجپت، ہماری موجودہ پولٹیکل حیثیت، مشمولہ: زمانہ (کانپور، اپریل رمئی ۱۹۰۷ء)
رچرڈ' آر، India (لندن، ۱۸۲۹-۱۸۳۲ء)
رحمان علی ملاحظہ فرمایئے: علی' رحمان
رحمانی' عشرت، ڈراما، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت دسویں جلد (لاہور، ۱۹۷۲ء)
رحمت علی' چودھری ملاحظہ فرمایئے: علی' چودھری رحمت
رحیم بخش دہلوی، حیات ولی (لاہور، تاریخ ندارد)
رزاقی' شاہد حسین، سید امیر علی (لاہور، ۱۹۷۰ء)
رسل' رالف اور خورشید الاسلام، Ghalib (لندن، ۱۹۶۹ء)

رسل، ولیم ہاورڈ، My Indian Mutiny Diary (لندن، ۱۹۵۷ء)

رشید احمد گنگوہی ملاحظہ فرمایئے: گنگوہی، رشید احمد

رضوی، خورشید مصطفیٰ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (دہلی، ۱۹۵۹ء)

.............، تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک ماخذ مشمولہ: نگار (لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

رضوی، محبوب، تاریخ دیوبند (دیوبند، ۱۹۵۴ء)

رضوی، ڈاکٹر نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور (الٰہ آباد، ۱۹۶۷ء)

.............، لکھنؤ کا عروج و زوال، مشمولہ: نقوش (لاہور، شمارہ ۱۰۴)

رفعت، مبارز الدین، اُردو کا ایک اچھوتا ناول، مشمولہ: نقوش (لاہور)

رنگین، سعادت یار خان، اخبار رنگین (کراچی، ۱۹۶۲ء)

روبن، ڈیوڈ، The World of Prem Chand (لندن، ۱۹۶۹ء)

روحی، بیاض قلمی، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، کراچی

......، مجموعۂ مراثی قدیم، قلمی، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، کراچی

روکو شا، Qutub Shahs (لاہور، ۱۹۲۰ء)

رہبر، داؤد، Sir Syed Ahmed Khan's Principles of Exegesis ترجمہ تحریر فی اصول التفسیر مصنفہ سرسیّد احمد خان، مشمولہ (ہارٹفورڈ، اپریل ۱۹۵۶ء)

رہبر، ہنس راج، پریم چند (دہلی، ۱۹۵۰ء)

رئیس، قمر، پریم چند (رامپور، ۱۹۶۲ء)

ریاض، حسن، پاکستان ناگزیر تھا (کراچی، ۱۹۶۷ء)

ریچرڈ، ج، A History of Mission in India ترجمہ ایچ مور (لندن، ۱۹۰۸ء)

رینکورٹ، اے ڈی، The Soul of India (لندن، ۱۹۶۱ء)

زبیری، محمد امین، تذکرۂ سرسیّد (لاہور، تاریخ ندارد)

.............، تذکرۂ محسن (دہلی، ۱۹۳۵ء)

.............، تذکرۂ وقار (علی گڑھ، ۱۹۲۵ء)

.............، سیاست ملیہ (آگرہ، تاریخ ندارد)

زخمی، ڈاکٹر محمود الٰہی، مقدمہ خط تقدیر مصنفہ مولوی کریم الدین (لکھنؤ، ۱۹۶۵ء)

زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، اُردو شہ پارے (حیدر آباد دکن، ۱۹۲۹ء)

.............، داستان ادب حیدر آباد (حیدر آباد دکن، ۱۹۵۲ء)

.............، دکنی ادب کی تاریخ (کراچی، ۱۹۶۲ء)

..........، مکاتیب شاد و اقبال مرتبہ (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ء)

ساحر لدھیانوی، جنگ اور نظم، مشمولہ: نیا ادب (لکھنؤ، نمبر ۶-۱۹۴۲ء)

سالک، عبدالمجید، سرگزشت (لاہور، ۱۹۶۲ء)

..........، افکار و حوادث، مشمولہ: اُردو ادب میں طنز و مزاح مصنفہ ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور، ۱۹۵۹ء)

..........، افکار و حوادث، مشمولہ: نقوش (لاہور، طنز و مزاح نمبر)

ساورکر، وی ڈی، *The Indian War of Independence* (لندن، ۱۹۰۹ء)

..........، *Speech at the Calcutta Session of Hindu Mahasabha, 1939* (کلکتہ، ۱۹۳۹ء)

سائمنڈز، رچرڈ، *Making of Pakistan* (لندن، اشاعت اوّل)

سبطِ حسن، شہر نگاراں (کراچی، ۱۹۶۶ء)

سجاد حسین، منشی ملاحظہ فرمایئے: حسین، منشی سجاد

سرشار، پنڈت رتن ناتھ، سیر کہسار جلد دوم (لکھنؤ، تاریخ ندارد)

..........، فسانۂ آزاد (لکھنؤ، طبع ہشتم)

سرکار، سر جادو ناتھ، *Fall of the Moghal Empire* جلد اوّل (کلکتہ، ۱۹۳۲ء)، جلد سوم (کلکتہ، ۱۹۳۴ء)

..........، *History of Aurangzeb* (کلکتہ، ۱۹۲۱-۱۹۲۴ء)

سرور، غلام، خزینۃ الاصفیا جلد اوّل (لکھنؤ، ۱۸۷۳ء)

سرور، میر محمد خان، عمدہ منتخبہ (دہلی، ۱۹۶۱ء)

سرور جہاں آبادی، پیمانہ سرور (دہلی، تاریخ ندارد)

سروری، عبدالقادر، جدید اُردو شاعری (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء)

سرہندی، شیخ احمد، مکتوبات امام ربانی (لکھنؤ، ۱۹۱۳ء)

سری رام، لالہ، خمخانۂ جاوید جلد اوّل، جلد سوم (لاہور، ۱۹۱۱ء)

سعید، خالد بن، *Pakistan, the Formative Phase* (آکسفورڈ، ۱۹۶۹ء)

سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو (لکھنؤ، ۱۹۵۱ء)

..........، *History of Urdu Literature* (الہ آباد، ۱۹۴۰ء)

سلیمان بدایونی، بدایوں ۱۸۵۷ء میں (کراچی، ۱۹۶۱ء)

سلیمان ندوی، سیّد ملاحظہ فرمایئے: ندوی، سیّد سلیمان

سمتھ، بازورتھ، *Life of Lord Lawrance* (لندن، ۱۸۸۵ء)

سمتھ، ڈبلیو سی، *Islam in Modern History* (نیویارک، ۱۹۵۹ء)

..........، *Modern Islam in India* (لاہور، ۱۹۶۹ء)

................، Ulama in Indian Politics مشمولہ: Politics and Society in India مرتبہ سی-ایچ-فلپس (لندن، ۱۹۶۳ء)

سندھی، مولانا عبید اللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (لاہور، ۱۹۷۰ء)

................، خطبات و مقالات (لاہور، ۱۹۷۰ء)

................، کابل میں سات سال (لاہور، ۱۹۵۵ء)

................، ایک تاریخی سیاسی منشور، مشمولہ: خطبات و مقالات (لاہور، ۱۹۷۰ء)

................، مولانا سندھی کا منصوبہ مرتبہ عزیز احمد، مشمولہ: تاریخ و سیاست (کراچی، ۱۹۵۴ء)

سندیلوی، سیّد مظہر علی، اُردو کا ایک نادر روزنامچہ مرتبہ نور الحسن ہاشمی (لکھنؤ، ۱۹۵۴ء)

سیتارامیا ملاحظہ فرمائیے: پٹا بھائی، سیتارامیا

سیٹن، مالکم-سی-سی، India Office (لندن، ۱۹۲۶ء)

سیٹھ، ہیرالال، The Khaksar Movement (لاہور، ۱۹۴۶ء)

سیّد، مطلوب الحسن، Mohammad Ali Jinnah a Political History (لاہور، ۱۹۴۵ء)

سیّد احمد خان ملاحظہ فرمائیے: خان، سیّد احمد

سیفی، محمد اسلم، حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی-مقدمہ (دہلی، ۱۹۳۹ء)

سیل، انیل، Emergence of Indian Nationalism (کیمبرج، ۱۹۷۱ء)

سین، امیت، Bengal Renaissance (بمبئی، ۱۹۴۶ء)

سین، سریندر ناتھ، Eighteen Fifty Seven (دہلی، ۱۹۵۷ء)

شاستری، ایس، History of Brahmo Samaj (کلکتہ، ۱۹۱۲ء)

شاہ علی ملاحظہ فرمائیے: علی، شاہ-ڈاکٹر

شبلی نعمانی، الکلام (لاہور، ۱۹۵۲ء)

................، باقیاتِ شبلی (لاہور، ۱۹۶۵ء)

................، سفرنامہ روم، مصر و شام (علی گڑھ، طبع دوم)

................، مقالاتِ شبلی جلد اوّل (اعظم گڑھ، ۱۹۳۱ء)، جلد ہشتم (اعظم گڑھ، ۱۹۳۲ء)

................، مکاتیبِ شبلی (اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء)

................، حفاظت و اشاعتِ اسلام، مشمولہ: مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم (اعظم گڑھ، ۱۹۳۲ء)

................، تقریر، مشمولہ: روداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (الٰہ آباد، ۱۹۰۰ء)

................، مسلمان کی پولیٹکل کروٹ، مشمولہ: مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم (اعظم گڑھ، ۱۹۳۲ء)

شپرنگر، یادگار شعرا ترجمہ طفیل احمد (الٰہ آباد، ۱۹۴۳ء)

شرر، عبدالحلیم، مضامین شرر جلد اوّل، جلد سوم، جلد چہارم (لکھنؤ، تاریخ ندارد)
..........، ملک العزیز ورجینا (لکھنؤ، تاریخ ندارد)
..........، سرسیّد احمد خان کی دینی برکتیں، بحوالہ عبدالحلیم شرر مصنفہ وقار عظیم مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت، جلد نہم (لاہور، ۱۹۷۲ء)
..........، مقدمہ مثنوی حزن اختر مصنفہ واجد علی شاہ (لاہور، ۱۹۵۲ء)
شروانی، محمد عبدالستار خان، مقدمہ باغی ہندوستان ترجمہ الثورۃ الہندیہ مصنفہ فضل حق خیر آبادی (بجنور، ۱۹۴۶ء)
شروانی، محمد مقتدا خان، مقالات یوم شبلی (لاہور، ۱۹۵۹ء)
شریف، ایس ایم، *Sharif Report* (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)
شریف المجاہد، *Indian Secularism* (کراچی، ۱۹۷۰ء)
..........، Communal Riots، مشمولہ: *A History of the Freedom Movement*، جلد چہارم (کراچی، ۱۹۷۰ء)
..........، Muslim Education in South، مشمولہ: *A History of the Freedom Movement*، جلد سوم، حصہ دوم (کراچی، ۱۹۶۳ء)
شفیع، مفتی محمد، کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ (بمبئی، ۱۹۶۵ء)
شفیع، مولوی محمد، مقالات مولوی محمد شفیع جلد چہارم (لاہور، تاریخ ندارد)
شفیع، میاں محمد، خطبۂ صدارت، مشمولہ: *Foundations of Pakistan* مرتبہ شریف الدین پیرزادہ، جلد اوّل (کراچی، ۱۹۶۹ء)
شفیق، پچھمی نرائن، چمنستان شعرا (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)
..........، گل رعنا جلد دوم، قلمی، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو۔ کراچی
شورش عظیم آبادی، تذکرۂ شورش، مشمولہ: دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)
شورش کاشمیری، سیاسی تحریکیں، مشمولہ: نقوش (لاہور، لاہور نمبر)
شوستری، زین العابدین، فتح المجاہدین (کراچی، ۱۹۵۰ء)
شوستری، میر عبداللطیف، حدیقۃ العالم (حیدرآباد دکن، ۱۸۵۰ء)
شوق، احمد علی خان، تذکرہ کاملان رامپور (دہلی، ۱۹۲۹ء)
شوق، قدرت اللہ، طبقات الشعرا (لاہور، ۱۹۶۸ء)
شوق رامپوری، جام جہاں نما قلمی، بحوالہ دستور الفصاحت مرتبہ امتیاز علی خان عرشی ص ۲۶ ن (رامپور، ۱۹۴۳ء)
شوقی، حسن، دیوان حسن شوقی، مشمولہ: اُردو (کراچی، جلد ۴۶، شمارہ ۲۔۳)

شوکت علی، مولانا ملاحظہ فرمایئے: علی، مولانا شوکت
شہابی، انتظام اللہ، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما (دہلی، ۱۹۴۶ء)
..............، غدر کے چند علما (دہلی، تاریخ ندارد)
..............، علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں (دہلی، تاریخ ندارد)
..............، مشاہیر جنگ آزادی (کراچی، ۱۳۷۶ھ)
..............، چودہ سو سالہ مرقع (کراچی، ۱۹۶۶ء)
..............، سیّد احمد اللہ شاہ (کراچی، تاریخ ندارد)
..............، سرسیّد احمد خان کے رفقاء، مشمولہ: برگِ گل (کراچی، ۱۹۶۸ء)
شیخ محمد تھانوی ملاحظہ فرمایئے: تھانوی، شیخ محمد
شیروانی، لطیف احمد خان، *Pakistan Resolution to Pakistan* (کراچی، ۱۹۶۹ء)
شیفتہ، مصطفےٰ خان، گلشن بے خار (لاہور، ۱۹۷۳ء)
صابر، مرزا قادر بخش، گلستان سخن دو جلدیں (لاہور، ۱۹۶۶ء)
صابری، امداد، تاریخ اُردو صحافت جلد اوّل (دہلی، ۱۹۴۹ء)، جلد دوم (دہلی، ۱۹۵۳ء)، جلد سوم (دہلی، ۱۹۵۳ء)
..............، تذکرۂ شعرائے حجاز (دہلی، ۱۹۶۹ء)
..............، فرنگیوں کا جال (دہلی، ۱۹۴۹ء)
..............، ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا (دہلی، ۱۹۵۹ء)
صادق، ڈاکٹر محمد، *A History of Urdu Literature* (لندن، ۱۹۶۴ء)
..............، *Mohammad Husain Azad* (لاہور، ۱۹۶۵ء)
صالحہ عابد حسین، حالی کا تعلق سرسیّد اور علی گڑھ سے، مشمولہ: علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر
صبا، محمد مظفر حسین، تذکرۂ روز روشن (بھوپال، ۱۲۹۷ھ)
صباح الدین عبدالرحمٰن ملاحظہ فرمایئے: عبدالرحمٰن، صباح الدین
صدیق حسن خان ملاحظہ فرمایئے: خان، صدیق حسن
صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، آج کا اُردو ادب (لاہور، ۱۹۷۰ء)
..............، جرأت ان کا عہد اور شاعری (لاہور، ۱۹۵۳ء)
..............، لکھنؤ کا دبستان شاعری (لاہور، ۱۹۶۷ء)
..............، نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری (کراچی، ۱۹۵۷ء)
..............، بہادر شاہ ظفر کے فرامین، مشمولہ: ۱۸۵۷ء، اخبارات و صحائف، مرتبہ ادارۂ مطبوعات پاکستان (کراچی، ۱۹۵۷ء)

..................،مقدمہ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سید احمد خان (کراچی، ۱۹۵۷ء)
..................، Literary Trends جزو اوّل، مشمولہ: A History of the Freedom Movements، جلد سوم حصہ دوم (کراچی، ۱۹۶۳ء)
صدیقی، افتخار احمد، مولوی نذیر احمد (لاہور، ۱۹۷۱ء)
..................، قائم چاند پوری، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و بھارت ساتویں جلد- مرتبہ پنجاب یونی ورسٹی (لاہور، ۱۹۷۲ء)
صدیقی، رشید احمد، آشفتہ بیانی میری (علی گڑھ، ۱۹۵۸ء)
..................، مضامین رشید (دہلی، بار اول)
صدیقی، عبدالحمید، تاریخ گول کنڈہ (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء)
صدیقی، محمد عتیق، اٹھارہ سو ستاون، اخبار اور دستاویزیں (دہلی، ۱۹۶۶ء)
..................، صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات (علی گڑھ، ۱۹۶۲ء)
..................، غالب اور ابوالکلام مرتبہ (دہلی، ۱۹۶۹ء)
..................، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں (علی گڑھ، ۱۹۵۷ء)
صوفی، جی ایم ڈی، Al Minhaj (لاہور، ۱۹۴۱ء)
ضیا سرحدی، پاکستان (بمبئی، تاریخ ندارد)
ضیائی، مسلم، ٹیپو سلطان اور اس کے خواب (کراچی، ۱۹۶۱ء)
طباطبائی، غلام حسین، سیر المتاخرین (لکھنؤ، ۱۸۹۲ء)
طفیل احمد منگلوری ملاحظہ فرمایئے: منگلوری، طفیل احمد
طیب، مولانا محمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند (کراچی، ۱۹۷۳ء)
ظہیر، سجاد، روشنائی (لاہور، تاریخ ندارد)
..................، اداریہ قومی جنگ (بمبئی، ۱۷، دسمبر ۱۹۴۴ء)
ظہیر دہلوی، داستان غدر (لاہور، ۱۹۵۵ء)
عابد حسین، ڈاکٹر سید ملاحظہ فرمایئے: حسین، ڈاکٹر سید عابد
عاشق الٰہی، مولوی، تذکرۃ الرشید حصہ اوّل (دہلی، تاریخ ندارد)
عاشق حسین بٹالوی ملاحظہ فرمایئے: بٹالوی، عاشق حسین
عالم، افتخار، حیات النذیر (دہلی، ۱۹۱۲ء)
عبدالباری، Farazi Movement، مشمولہ: A History of the Freedom Movement، جلد اول (کراچی، ۱۹۵۷ء)

عبدالباری فرنگی محلی، مولانا، انجمن خدام کعبہ مشمولہ: علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری (کراچی، ۱۹۶۲ء)
عبدالحق، مولوی، سرسیّد احمد خان (کراچی، ۱۹۵۹ء)
.........، خطبات عبدالحق (کراچی، ۱۹۵۱ء)
.........، چند ہم عصر (کراچی، ۱۹۵۳ء)
.........، قاموس الکتب مرتبہ انتظام اللہ شہابی (کراچی، ۱۹۶۱ء)
.........، نصرتی (کراچی، ۱۹۶۱ء)
.........، مرحوم دہلی کالج (دہلی، ۱۹۴۱ء)
.........، حسن شوقی، مشمولہ: اُردو (اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۹ء)
.........، عماد الملک، مشمولہ: نقوش (لاہور، شخصیات نمبر، حصہ دوم)
.........، مقدمہ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مصنفہ مولوی چراغ علی (حیدرآباد، ۱۹۱۲ء)
.........، مقدمہ چمنستان شعرا مصنفہ لچھمی نرائن شفیق (اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء)
عبدالحکیم، خلیفہ، فکر اقبال (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء)
عبدالحئی، حکیم سیّد، نزہۃ الخواطر جلد ششم (حیدرآباد دکن، ۱۹۵۷ء)
.........، گل رعنا (لاہور، ۱۹۶۴ء)
عبدالرحمٰن، صباح الدین، بزمِ تیموریہ (اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء)
.........، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء)
.........، مولانا شبلی نعمانی، مشمولہ: نقوش (لاہور، شخصیات نمبر، حصہ اوّل)
.........، ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی مدح، مشمولہ: آج کل (دہلی، جنوری ۱۹۶۵ء)
عبدالرزاق کان پوری، یادِ ایام (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء)
عبدالرشید، خواجہ، تذکرہ شعرائے پنجاب (کراچی، ۱۹۶۷ء)
عبدالشکور، حسرت موہانی (آگرہ، ۱۹۴۶ء)
عبدالعزیز، شاہ، فتاویٰ عزیزیہ (دہلی، ۱۳۲۲ھ)
عبدالعزیز، میاں، فلک پیما، مضامین فلک پیما (لاہور، ۱۹۶۴ء)
عبدالغفار، قاضی، آثار جمال الدین افغانی (دہلی، ۱۹۴۰ء)
.........، حیات اجمل (علی گڑھ، تاریخ ندارد)
عبدالغنی، ڈاکٹر، مرزا بیدل کا ایک غیر مطبوعہ رقعہ، مشمولہ: اُردو (کراچی، جلد ۴۶، شمارہ ۳-۴)
عبدالقادر، سر شیخ، *The New School of Urdu Literature* (دہلی، ۱۹۲۱ء)
.........، *Famous Urdu Poets and Writers* (لاہور، ۱۹۴۷ء)

عبدالکریم، *Murshid Quli Khan and his Times* (ڈھاکہ، ۱۹۶۳ء)
عبداللطیف، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی (دہلی، ۱۹۵۸ء)
عبداللطیف، ڈاکٹر سید، *The Muslim Problem in India* (بمبئی، ۱۹۳۹ء)
عبداللطیف، سید، The Muslim University Movement، مشمولہ: *The Indian Review* (مدراس، مئی ۱۹۱۶ء)
عبداللطیف، نواب سید، *Abdul Latif, His Writing and Related Documents* مرتبہ انعام الحق (ڈھاکہ، ۱۹۶۸ء)
عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث (لاہور، ۱۹۶۳ء)
..........، سرسیّد اور ان کے رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ (لاہور، ۱۹۶۰ء)
..........، تہذیب الاخلاق کی اہمیت، مشمولہ: برگِ گل (کراچی، ۱۹۶۸ء
عبدالماجد دریابادی، مولانا، مولانا محمد علی، ذاتی ڈائری (حیدر آباد دکن، ۱۹۴۳ء)
..........، حکیم الامت (لکھنؤ، ۱۹۵۰ء)
..........، مقالات ماجد (بمبئی، طبع اوّل)
..........، مقدمہ اسلام کا سیاسی نظام مصنفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء)
عثمانی، مولانا ظفر احمد، خودنوشت (کراچی، ۱۹۶۵ء)
عرشی، امتیاز علی خان، دستور الفصاحت مرتبہ (رامپور، ۱۹۴۰ء)
..........، مقدمہ نادرات شاہی مصنفہ شاہ عالم آفتاب (رامپور، ۱۹۴۴ء)
عزیز، ڈاکٹر محمد، اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصہ (علی گڑھ، ۱۹۵۵ء)
عزیز، اے، *Discovery of Pakistan* (لاہور، ۱۹۵۷ء)
عزیز، کے، *All India Muslim Conference* (کراچی، ۱۹۷۲ء)
..........، *Ameer Ali, Life and Works* (لاہور، ۱۹۶۸ء)
..........، *Britain and Muslim India* (لندن، ۱۹۶۳ء)
..........، *The Indian Khilafat Movement* (کراچی، ۱۹۷۲ء)
..........، *The Making of Pakistan* (لندن، ۱۹۶۷ء)
عزیز الحسن، اشرف السوانح حصہ اوّل (دہلی، ۱۳۵۴ھ)
عزیز الحق، کمال یار جنگ، *Kamal Yar Jang Education Committee Report* (دہلی، ۱۹۴۲ء)
عزیز لکھنوی، نالۂ جرس (لکھنؤ، ۱۹۲۶ء)
عشقی، شیخ محمد وجیہ الدین، تذکرۂ عشقی، مشمولہ: دو تذکرے حصہ اوّل، مرتبہ کلیم الدین احمد (پٹنہ، ۱۹۵۹ء)

عطا، محمد اشرف، کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشان تذکرے (لاہور، ۱۹۶۶ء)
عظیم، وقار، داستان سے افسانے تک (لاہور، ۱۹۶۰ء)
.........، ہماری داستانیں (لاہور، اشاعت دوم)
.........، عبدالحلیم شرر، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت نویں جلد (لاہور، ۱۹۷۲ء)
.........، رجب علی بیگ سرور، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت آٹھویں جلد (لاہور، ۱۹۷۲ء)
عقیل، معین الدین، تحریک پاکستان کا لسانی پس منظر، مقالہ شعبۂ اُردو جامعہ کراچی (۱۹۶۹ء)
علوی، منشی امیر احمد، بہادر شاہ ظفر (کراچی، ۱۹۶۱ء)
علوی، تنویر احمد، ذوق، سوانح اور انتقاد (لاہور، ۱۹۶۳ء)
علی، احمد، ترقی اور ترقی پسندی، مشمولہ: نیا دور (شمارہ ۳، اپریل ۱۹۴۵ء)
علی، امیر، Memoirs، مشمولہ: *Ameer Ali, Life and Works* مرتبہ کے کے عزیز (لاہور، ۱۹۶۸ء)
علی، چودھری رحمت، *Pakistan* (کیمرج، ۱۹۴۷ء)
علی، چودھری محمد، *The Emergence of Pakistan* (لاہور، ۱۹۷۳ء)
علی، رحمان، تذکرہ علمائے ہند (لکھنؤ، ۱۹۱۴ء)
.........، ترجمہ و ترتیب، محمد ایوب قادری (کراچی، ۱۹۶۱ء)
علی، سید مصطفےٰ بریلوی، انگریزوں کی لسانی پالیسی (کراچی، ۱۹۷۰ء)
.........، خان بہادر خان (کراچی، ۱۹۶۶ء)
علی، ڈاکٹر شاہ، اُردو میں سوانح نگاری (کراچی، ۱۹۶۱ء)
علی، شاہ غلام، مقامات مظہری (دہلی، ۱۳۰۹ھ)
علی، مولانا شوکت، خطبۂ صدارت، خلافت کانفرنس منعقدہ کوکناڈا، دسمبر ۱۹۲۳ء، مشمولہ: *Indian Khilafat Movement* مرتبہ کے کے عزیز (کراچی، ۱۹۷۲ء)
علی، علامہ عبداللہ یوسف، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ (کراچی، ۱۹۶۷ء)
.........، Karamat Ali، مشمولہ: *Encyclopaedia of Islam* جلد ۲ (لیڈن)
علی، محفوظ بدایونی، بلبلان اسیر کی رہائی، مشمولہ: مضامین محفوظ علی (کراچی، ۱۹۵۶ء)
علی، مولانا محمد، *Writings and Speeches of Mohammad Ali* (لاہور، ۱۹۶۳ء)
.........، *My Life- a Fragment* (لاہور، ۱۹۴۲ء)
.........، امپریلزم کی روح، مشمولہ: نوائے آزادی مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
.........، سائمن کمیشن، مشمولہ: افادات محمد علی مرتبہ رئیس احمد جعفری (حیدرآباد دکن، تاریخ ندارد)

..........، قفل بے کلید، مشمولہ: نوائے آزادی مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
..........، سائمن کمیشن اور ہندوستان، مشمولہ: افادات محمد علی مرتبہ رئیس احمد جعفری (حیدر آباد دکن، تاریخ ندارد)
علی، مہر، *Bengali Reaction to Christian Missionary Activities* (چٹا گانگ، ۱۹۶۵ء)
عمر، ڈاکٹر محمد، حسرت کا شہر آشوب، مشمولہ: نقوش (لاہور، اکتوبر ۱۹۶۲ء)
..........، میر کا سیاسی و سماجی ماحول، مشمولہ: برہان (دہلی، جولائی ۱۹۶۳ء)
..........، شہر آشوب حاتم دہلوی، مشمولہ: نقوش (لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء)
عنایت اللہ، مولوی، آپ بیتی، مشمولہ: نقوش (لاہور، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم)
عنایت اللہ، مولوی محمد، تذکرہ علمائے فرنگی محل (لکھنؤ، ۱۹۳۰ء)
غازی کابلی، خان، تحریک خدائی خدمت گار (لاہور، تاریخ ندارد)
غالب، اسد اللہ خان، اُردوئے معلیٰ (لاہور، ۱۹۲۲ء)
..........، کلیات نثر غالب (کانپور، ۱۲۸۷ھ)
..........، دستنبو، مشمولہ: کلیات نثر اقبال (کانپور، ۱۲۸۷ھ)
غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر ملاحظہ فرمائیے: خان، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ
غلام علی، شاہ ملاحظہ فرمائیے: علی، شاہ غلام
فارقوہر، جے این، *Modern Religious Movements in India* (لندن، ۱۹۲۴ء)
فاروقی، ڈاکٹر احسن، اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ (لاہور، ۱۹۶۷ء)
فاروقی، خواجہ احمد، غدر کی ادبی تاریخ کا ایک ورق، مشمولہ: نقوش (لاہور، شمارہ ۱۹-۲۰)
فاروقی، ضیاالحسن، *Deoband School and Demand for Pakistan* (بمبئی، ۱۹۶۳ء)
فاروقی، نثار احمد، شہر آشوب قائم چاند پوری، مشمولہ: نقوش (لاہور، اکتوبر ۱۹۶۱ء)
فاطمہ، انیس، ۱۸۵۷ء کے ہیرو (کراچی، ۱۹۵۷ء)
فائق، کلب علی خان، مومن (لاہور، ۱۹۶۱ء)
فراق، ناصر نذیر، لال قلعہ کی ایک جھلک (دہلی، تاریخ ندارد)
فرخی، ڈاکٹر اسلم، محمد حسین آزاد جلد اول (کراچی، تاریخ ندارد)
فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ جلد اول، جلد سوم (حیدر آباد دکن، ۱۹۳۲ء)
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی منظوم داستانیں (کراچی، ۱۹۷۱ء)
..........، کشمیر ایرانی شعرا کی نظر میں، مشمولہ: ایران کبیر و ایران صغیر مرتبہ محمد یعقوب ہاشمی (مظفر آباد، ۱۹۷۱ء)

فریزر جیمز، Nadar Shah (ناقص الطرفین مملوکہ راقم)
.........، دنیز ترجمہ حسن عابدی (کراچی، ۱۹۵۱ء)
فضل الحق، اے کے، Muslim Sufferings under Congress Rule (کلکتہ، ۱۹۳۹ء)
فضل حق خیرآبادی، الثورة الهندیه (بجنور، ۱۹۴۶ء)
فطرت حیدری، پاکستان کیوں؟ (بمبئی، تاریخ ندارد)
فلپس، سی ایچ، The Evolutions of India and Pakistan (لندن، ۱۹۶۲ء)
.........، The East India Company (لندن، ۱۹۶۱ء)
.........، Politics and Society in India (لندن، ۱۹۶۳ء)
فورسٹ، ڈینس، Tiger of Mysore (لندن، ۱۹۷۰ء)
فورسٹر، ولیم، English Factories in India (لندن، ۱۹۰۶-۱۹۲۳ء)
فوق، محمد الدین، مزار الشعرائے کشمیر، مشمولہ: ایران کبیر و ایران صغیر مرتبہ محمد یعقوب ہاشمی (مظفرآباد، ۱۹۷۱ء)
فیرز، ایم ایل، India- Whither Islam (لندن، ۱۹۳۱ء)
قادری، حامد حسن، داستان تاریخ اُردو (آگرہ، ۱۹۵۸ء)
قادری، محمد ایوب، مولانا محمد احسن نانوتوی (کراچی، ۱۹۶۶ء)
.........، مولانا فیض احمد بدایونی (کراچی، ۱۹۵۷ء)
.........، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (کراچی، زیر طبع)
.........، تواریخ عجیب مرتبہ (کراچی، ۱۹۶۲ء)
.........، علم و عمل: وقائع عبدالقادر خانی، ترتیب و حواشی - جلد اوّل (کراچی، ۱۹۶۰ء)، جلد دوم (کراچی، ۱۹۶۱ء)
.........، مولانا کفایت علی، مشمولہ: العلم (کراچی، جنگ آزادی نمبر ۱۹۵۷ء)
.........، مقدمہ مجموعۂ وصایا اربعہ مصنفہ شاہ ولی اللہ (حیدرآباد، ۱۹۶۴ء)
.........، تحریک پاکستان کی ایک گم شدہ کڑی، مشمولہ: الزبیر (بہاولپور، تحریک آزادی نمبر)
.........، جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات، مشمولہ: اُردو (کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء)
.........، تصنیف رنگین، مرتبہ مشمولہ: مجموعۂ وصایا اربعہ مصنفہ شاہ ولی اللہ (حیدرآباد، ۱۹۶۴ء)
قادیانی، مرزا غلام احمد، مکاتیب (قادیان، تاریخ ندارد)
قاسم، قدرت اللہ، مجموعۂ نغز (لاہور، ۱۹۳۳ء)
قاسم نانوتوی، مولانا محمد، حمائل شریف (دہلی، ۱۳۳۰ھ)
قاسمی، احمد ندیم، ادارہ ادب لطیف جواب دے، مشمولہ: سویرا (لاہور، شمارہ ۷-۸)

قائم چاند پوری، قیام الدین، تذکرہ مخزن نکات (حیدرآباد دکن، تاریخ ندارد)

قدوائی، صدیق الرحمٰن، ماسٹر رام چند (دہلی، ۱۹۶۱ء)

قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ (کراچی، ۱۹۶۷ء)

...................، *Struggle for Pakistan* (کراچی، ۱۹۶۵ء)

...................، *Ulema in Politics* (کراچی، ۱۹۷۲ء)

...................، *Administration of the Sultanate of Delhi* (کراچی، ۱۹۵۸ء)

...................، Hindu Communal Movements، مشمولہ: *A History of the Freedom Movement* جلد سوم، حصہ اول (کراچی، ۱۹۶۰ء)

قریشی، صادق، ذکر حالی (لکھنؤ، ۱۹۴۹ء)

قریشی، عبدالرزاق، نوائے آزادی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)

...................، مرزا مظہر جان جاناں (بمبئی، ۱۹۶۱ء)

قریشی، فضل حق، ایڈر (دہلی، ۱۹۴۰ء)

قریشی، محمد عبداللہ، مولوی محبوب عالم اور اقبال، مشمولہ: اقبال ریویو (کراچی، جنوری ۱۹۶۳ء)

...................، کشمیر کی فارسی شاعری، مشمولہ: ایران کبیر و ایران صغیر مرتبہ محمد یعقوب ہاشمی (مظفرآباد، ۱۹۷۱ء)

قریشی، ڈاکٹر وحید، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں (لاہور، ۱۹۷۳ء)

...................، مقدمہ دیوان جہان دار (لاہور، ۱۹۶۶ء)

...................، مقدمہ شعر و شاعری، مقدمہ و تعلیقات (لاہور، ۱۹۵۳ء)

قصوری، محمد علی، مشاہدات کابل و یاغستان (کراچی، تاریخ ندارد)

کاشغری، روحی اویغور، ٹیپو سلطان کی سلاطین عثمنی سے خط و کتابت اور اس کی اہمیت، مشمولہ نقوش (کراچی، ٹیپو سلطان نمبر)

کپور، کنہیا لال، چنگ و رباب (لاہور، ۱۹۶۳ء)

...................، شیشہ و تیشہ (لاہور، ۱۹۶۲ء)

کرمانی، میر حسین علی، نشان حیدری ترجمہ محمود فاروقی (لاہور، تاریخ ندارد)

کرندیکار، ایم، *Islam in India's Transition to Modernity* (کراچی، تاریخ ندارد)

کرن سنگھ، *Prophet of Indian Nationlism* (لندن، ۱۹۶۳ء)

کریگ، کینتھ، *Councels in Contemporary Islam* (ایڈنبرا، ۱۹۶۵ء)

کریم الدین، مولوی، طبقات الشعرائے ہند (دہلی، ۱۹۴۸ء)

کلارک، آر، The Punjab and Sindh Mission (لندن، ۱۸۸۵ء)
کلب مصطفیٰ، سیّد، ملک محمد جائسی (دہلی، ۱۹۴۱ء)
کماتھ، ایم ایس، The Home Rule League (مدراس، ۱۹۱۸ء)
کمال یار جنگ ملاحظہ فرمایئے: عزیز الحق، کمال یار جنگ
کنہیال لال، محاربۂ عظیم (لکھنؤ، ۱۸۶۱ء)
کوپ لینڈ، آر، The Indian Problem (آکسفورڈ، ۱۹۶۸ء)
.................، India- a Restatement (آکسفورڈ، ۱۹۴۵ء)
کوکب، تفضل حسین، فغان دہلی (دہلی، ۱۲۸۰ھ)
کول، کشن پرشاد، اُودھ پنچ کے نورتن، مشمولہ: ادبی اور قومی تذکرے جلد دوم (دہلی، ۱۹۵۵ء)
کئی اور مارلیسن History of Sepoy War in India، (لندن، ۱۸۸۹ء)
کیتھ، اے بی، A Constitutional History of India (آکسفورڈ، ۱۹۳۷ء)
کیفی، برجموہن دتاتریا، اب سے آدھی صدی پہلے کے اُردو اخبار، مشمولہ: اُردو (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، (Cambriga History of India) جلد پنجم (کیمرج، ۱۹۲۸ء)
گاندھی، ایم کے، My Experiment with Truth (لنڈن، ۱۹۴۹ء)
.................، قوم کی آواز ترجمہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین (دہلی، ۱۹۴۳ء)
گب، ایچ اے آر، Mohammadanism (نیویارک، ۱۹۵۸ء)
.................، Whither Islam (لندن، ۱۹۳۲ء)
گپتا، پی سی، Nana Sahib and the Rising at Cawnpur (آکسفورڈ، ۱۹۶۳ء)
گپتا، جے ڈی، Language Conflict and National Development (برکلے، ۱۹۷۰ء)
گراہم، جی ایف آئی، Life and Works of Sir Syed Ahmed Khan (لندن ۱۸۸۵ء)
گردیزی، سیّد فتح علی حسینی، تذکرۂ ریختہ گویان (اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء)
گروزر، سر جارج ہنری، سفرنامہ مقدمہ، جلد دوم، بحوالہ میر کا سیاسی اور سماجی ماحول مصنفہ ڈاکٹر محمد عمر، مشمولہ: برہان (دہلی، جولائی ۱۹۶۳ء)
گریرسن، سر جارج، Hindi، مشمولہ: Encylcopaedia Britannica جلد ۱۳ گیارہویں اشاعت
گنگوہی، رشید احمد، مکاتیب رشیدی (دہلی، تاریخ ندارد)
گنگوہی، شیخ عبدالقدوس، مکتوبات قدوسیہ (دہلی، ۱۸۷۰ء)
گوپال، ایس، British Policy in India (کیمبرج، ۱۹۶۵ء)
گوپال، رام، Indian Muslims, Political History (بمبئی، ۱۹۵۹ء)

.........How India Struggled for Freedom (بمبئی، ۱۹۶۷ء)

گوپال مدن، Munshi Prem Chand (نیویارک، ۱۹۶۴ء)

گیان چند ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں (کراچی، ۱۹۶۸ء)

.................، ۱۸۵۷ء اور اُردو شعرا تین قسطیں مشمولہ: نگار (لکھنؤ، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۵۷ء)

گیریٹ ایچ ایل او، The Trial of Bahadur Shah (لاہور، ۱۹۳۲ء)

گیلانی مناظر احسن، سوانح قاسمی دو جلدیں (دیوبند، ۱۳۷۳ھ)

لاجپت رائے لالہ ملاحظہ فرمایئے: رائے لالہ لاجپت

لارڈ ایم اے، Missionaries and Education in Bengal (آکسفورڈ، ۱۹۷۲ء)

.................، مقدمہ Bishop Heber in Northern India مصنفہ بشپ ہیبر (کیمبرج، ۱۹۷۱ء)

لطف، مرزا علی، گلشن ہند (حیدرآباد دکن، ۱۹۰۶ء)

لطف اللہ، سید، Man behind War of Independence (کراچی، اشاعت اوّل)

لووٹ سرورنی، A History of the Indian Nationlist Movement (لندن، ۱۹۶۸ء)

لیسی پیٹرک، Fascist India (لندن، ۱۹۴۶ء)

مارٹن آر ایم، Correspondence of Wellesley (لندن، ۱۸۳۷-۱۸۳۸ء)

مارشل پی جے، Britian and India (لندن، ۱۹۶۸ء)

مارش مین جان کلارک، Abridgment of History of India (سری رام پور، ۱۸۷۳ء)

مالک رام، تلامذۂ غالب (نکودر، ۱۹۵۷ء)

مالیسن جی بی، لارڈ کلائیو ترجمہ ابن حسن (حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء)

مائلز ڈبلیو، History of Tipu Sultan (لاہور، ۱۹۷۴ء)

مبتلا مردان علی خان، گلشن سخن (لکھنؤ، ۱۹۶۵ء)

مٹکاف تھامس آر، The After Math of Revolt (پرنسٹن، ۱۹۶۵ء)

مٹکاف ٹی، Two Native Narratives of the Mutiny in Dehli (ویسٹمنسٹر، ۱۸۹۸ء)

مجدد الف ثانی ملاحظہ فرمایئے: سرہندی شیخ احمد

مجمدار آر سی، The Sepoy Mutiny 1857 (کلکتہ، ۱۹۵۷ء)

.................، A History of the Freedom Movement جلد سوم (کلکتہ، ۱۹۶۳ء)

مجیب محمد، Indian Muslims (کیمبرج، ۱۹۶۳ء)

محب الحسن، History of Tipu Sultan (کلکتہ، ۱۹۵۱ء)

محسن الملک نواب ملاحظہ فرمایئے: خان مہدی علی

محسن لکھنوی، تذکرہ سراپا سخن مرتبہ ڈاکٹر اقتدا احسن (لاہور،۱۹۷۰ء)
محفوظ علی بدایونی ملاحظہ فرمایئے: علی، محفوظ بدایونی
محمد علی، چودھری ملاحظہ فرمایئے: علی، چودھری محمد
محمد علی، مولانا ملاحظہ فرمایئے: علی، مولانا محمد
محمد علی الحسینی، سیّد ملاحظہ فرمایئے: حسینی، سیّد محمد علی
محمد میاں، مولانا ملاحظہ فرمایئے: میاں، مولانا محمد
محمود الحسن، شیخ الہند مولانا، خطبۂ صدارت، جمعیۃ العلمائے ہند (دہلی،۱۹۲۰ء)
محمود منگلوری، محمود خان ملاحظہ فرمایئے: منگلوری، محمود خان محمود
مخلص، آنندرام، بدائع وقائع، اقتباس، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین (لاہور،۱۹۴۱ء)
مدنی، مولانا حسین احمد، متحدہ قومیت اور اسلام (دیوبند،۱۹۳۸ء)
..................، نقش حیات دو جلدیں (دیوبند ۱۹۵۴ء)
مرزا، عزیز، سیرۃ المحمود (بدایوں،۱۹۲۷ء)
مرزا، ڈاکٹر وحید، امیر خسرو (الہ آباد،۱۹۴۹ء)
مسانی، آر پی، Britian in India (آکسفورڈ،۱۹۶۲ء)
مسعود احمد، محمد ملاحظہ فرمایئے: احمد، محمد مسعود
مشرقی، علامہ ملاحظہ فرمایئے: خان، عنایت اللہ مشرقی
مصحفی، غلام ہمدانی، ریاض الفصحاء (دہلی،۱۹۳۴ء)
..................، تذکرۂ ہندی (دہلی،۱۹۳۳ء)
..................، عقد ثریا (اورنگ آباد دکن،۱۹۳۴ء)
مصطفےٰ علی بریلوی، سیّد ملاحظہ فرمایئے: علی، سیّد مصطفےٰ بریلوی
مظہر جان جاناں، مرزا، کلمات طیبات (دہلی،۱۳۰۹ھ)
مظہر علی سندیلوی ملاحظہ فرمایئے: سندیلوی، مظہر علی
معین الحق، ڈاکٹر، 1857 (کراچی،۱۹۶۸ء)
..................، The Khilafat Movement، مشمولہ: A History of the Freedom Movement جلد سوم، حصہ اوّل (کراچی،۱۹۶۰ء)
..................، مقدمہ اخبار رنگین مصنفہ سعادت یار خان رنگین (کراچی،۱۹۶۲ء)
معین الرحمٰن، سیّد، غالب اور انقلاب ستاون (لاہور،۱۹۷۴ء)
معینی، سیّد عبدالواحد، مقالاتِ اقبال (لاہور،۱۹۶۳ء)

مکرجی' ایس این، Class, Caste and Politics in Calcutta، مشمولہ: Elites in South Asia مرتبہ ایڈمنڈ لیچ اور ایس این مکرجی (کیمبرج، ۱۹۷۰ء)

ملک' اے آر، British Policy and the Muslims of Bengal (ڈھاکہ، ۱۹۶۱ء)

ملک' حفیظ، Muslim Nationalism in India and Pakistan (واشنگٹن، ۱۹۶۳ء)

.........، Iqbal مرتبہ (نیو یارک، ۱۹۷۱ء)

.........، The Man of Thought and the Man of Action، مشمولہ: Iqbal (نیو یارک، ۱۹۷۱ء)

ملک' عبداللہ، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (لاہور، ۱۹۶۷ء)

.........، پنجاب کی سیاسی تحریک (لاہور، ۱۹۷۱ء)

ممتاز حسین ملاحظہ فرمایئے: حسین' ممتاز

منگلوری' سیّد طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل (بدایوں، ۱۹۳۸ء)

.........، روح روشن مستقبل (بدایوں، ۱۹۴۶ء)

منگلوری' محمود خان محمود، صحیفۂ ٹیپو سلطان (لاہور، ۱۹۴۷ء)

.........، ٹیپو سلطان (لاہور، ۱۹۵۹ء)

.........، ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں (لاہور، ۱۹۴۹ء)

مودودی' سیّد ابوالاعلیٰ، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (پٹھان کوٹ، ۱۹۳۸ء)

.........، اداریے ترجمان القرآن (پٹھان کوٹ، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء)

.........، تحریک آزادی ہند اور مسلمان (لاہور، ۱۹۶۴ء)

.........، مسئلہ قومیت (لاہور، ۱۳۵۲ھ)

مور' آر جے، Liberalism and Indian Politics (لندن، ۱۹۶۶ء)

موز' رامزے، The Making of British Raj (مانچسٹر، ۱۹۱۷ء)

موئر' سر ولیم، The Mohammadan Controversy (ایڈنبرا، ۱۸۹۷ء)

مورلینڈ' ڈبلیو ایچ، India at the death of Akbar (لندن، ۱۹۲۰ء)

موسلے' لیونارڈ، The Last days of British Raj (نیو یارک، ۱۹۶۲ء)

مولن' جوزف، Thoughts on Mission to India (سری رام پور، ۱۹۲۵ء)

مہدی' راجا سیّد محمد، Pirpur Report (دہلی، ۱۹۳۸ء)

مہر' غلام رسول، سیّد احمد شہید (لاہور، تاریخ ندارد)

.........، جماعت مجاہدین (لاہور، تاریخ ندارد)

.........، سرگزشت مجاہدین (لاہور، ۱۹۵۶ء)

..............، ۱۸۵۷ء (لاہور، ۱۹۵۷ء)
..............، ۱۸۵۷ء کے مجاہد (لاہور، ۱۹۷۱ء)
..............، غالب (لاہور، ۱۹۳۸ء)
..............، ہماری قومی شاعری کا پہلا دور، مشمولہ: اقبال (کراچی، اکتوبر ۱۹۵۲ء)
مہر علی ملاحظہ فرمایئے: علی مہر
مہروترا، ایس آر، India and Common Wealth (لندن، ۱۹۶۵ء)
مے، ایل ایس، Evolution of Indo-Muslim Thought (لاہور، ۱۹۷۰ء)
میاں، مولانا محمود، علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم (دہلی، ۱۹۶۳ء)
..............، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے دو جلدیں (مراد آباد، ۱۹۴۶ء)
..............، جمعیۃ العلما کیا ہے؟ (دہلی، تاریخ ندارد)
میچل، ولیم فوربس، The Relief of Lucknow (لندن، ۱۹۶۲ء)
میر، میر تقی، نکات الشعرا (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)
..............، ذکر میر (اورنگ آباد، ۱۹۲۵ء)
میکالے، لارڈ، Critical and Historical Essays (لندن ۱۸۹۲ء)
میکلا گان، سر ایڈورڈ، The Jesuits and The Great Moghal (لندن، ۱۹۳۲ء)
میکلا گان، مائیکل، Clamency, Canning (لندن، ۱۹۶۲ء)
مینائی، امیر، انتخاب یادگار (رامپور، ۱۲۹۰ھ)
مینن، وی پی، Transfer of Power in India (کلکتہ، ۱۹۵۷ء)
مینی، آر جے، Clive of India (لندن، ۱۹۳۴ء)
نادم سیتاپوری، خیابان غالب (کراچی، ۱۹۷۰ء)
..............، اودھ پنچ، مشمولہ: اُردو نامہ (کراچی، شمارہ ۱۸)
نارنگ، گوپی چند، ہنگامۂ سن ستاون اور غالب کا جذبۂ حب الوطنی، مشمولہ: صحیفہ (لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء)
ناصر، سعادت خان، تذکرۂ خوش معرکہ زیبا جلد اوّل (لاہور، ۱۹۷۰ء)، جلد دوم (لاہور، ۱۹۷۲ء)
ناظر، خوشی محمد، نغمۂ فردوس جلد اوّل، طبع اوّل
نامی، ڈاکٹر عبدالعلیم، اُردو تھیٹر جلد اوّل، دوم، سوم (کراچی، ۱۹۶۲ء)
نٹ راجن ملاحظہ فرمایئے: راجن، نٹ
نجم الغنی، حکیم، تاریخ اودھ جلد سوم (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء)
نجم الاسلام، اُردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات، مشمولہ: چراغِ راہ (کراچی، تحریک اسلامی نمبر)

..........، تین نثری نوادر، مشمولہ: نقوش (لاہور، شمارہ ۱۱۵)
ندوی، مولانا ابوالحسن علی، سیرۃ سیّد احمد شہید (لکھنؤ، ۱۹۴۱ء)
..........، مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا (لکھنؤ، ۱۹۵۸ء)
..........، *Muslims in India* انگریزی ترجمہ آصف علی قدوائی (لکھنؤ، تاریخ ندارد)
ندوی، سیّد سلیمان، حیات شبلی (اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء)
..........، یاد رفتگان (کراچی، ۱۹۵۵ء)
..........، عرب اور ہند کے تعلقات (الٰہ آباد، ۱۹۵۰ء)
..........، عربوں کی جہاز رانی (اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء)
..........، خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۲۱ء تا مارچ ۱۹۲۲ء)
..........، خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، جون ۱۹۲۲ء)
..........، خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۲۱ء)
..........، ارض حرم کے احکام و مصالح، قرآن مجید کی نظر میں، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۲۳ء)
..........، خلافت اور ہندوستان، مشمولہ: معارف (اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۲۰ء تا اکتوبر ۱۹۲۱ء)
..........، وفد خلافت کی روداد، مشمولہ معارف (اعظم گڑھ، جنوری، فروری ۱۹۶۸ء)
..........، مشہد اکبر، مشمولہ: نوائے آزادی مرتبہ عبدالرزاق قریشی (بمبئی، ۱۹۵۷ء)
..........، مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں، مشمولہ: العلم (کراچی، اکتوبر ۱۹۷۰ء)
ندوی، عبدالسلام، شعر الہند دو جلدیں (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء)
ندوی، مسعود عالم، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک (حیدرآباد دکن، تیسری اشاعت)
ندیم قاسمی، احمد ملاحظہ فرمائیے: قاسمی، احمد ندیم
نذیر احمد، مولوی ملاحظہ فرمائیے: احمد، مولوی نذیر
نساخ، عبدالغفور، سخن شعرا (لکھنؤ، ۱۸۷۴ء)
نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت (دہلی، ۱۹۵۳ء)
..........، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (دہلی، ۱۹۵۸ء)
..........، ۱۸۵۷ء کا ایک تاریخی جائزہ، مشمولہ چراغ راہ (کراچی، آزادی نمبر)
..........، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ (علی گڑھ، ۱۹۵۰ء)
..........، سرسیّد احمد خان اور جمال الدین افغانی، مشمولہ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر)
..........، مقدمہ *History of M.A.O College* مصنفہ ایس کے بھٹناگر (بمبئی، ۱۹۶۹ء)
..........، Shah Waliullah، مشمولہ: *A History of the Freedom Movement* جلد اوّل (کراچی،

۱۹۵۷ء)

............، Shah Waliullah and Indian Politics، مشمولہ: Islamic Cultures (حیدر آباد، شمارہ ۲۵، ۱۹۵۱ء)

نظامی، خواجہ حسن، غدر کے اخبار (دہلی، ۱۹۴۰ء)

............، غدر کی صبح و شام (دہلی، تاریخ ندارد)

............، غدر کے فراسین (دہلی، تاریخ ندارد)

............، دہلی کی جان کنی (دہلی، تاریخ ندارد)

نظامی بدایونی، انقلاب دہلی (بدایون، ۱۹۳۱ء)

............، قاموس المشاہیر جلد دوم (بدایون، ۱۹۲۶ء)

نعمان، محمد، Muslim India (الٰہ آباد، ۱۹۴۲ء)

نعیمی، غلام معین الدین، تذکرہ المعروف بہ حیات صدر الافاضل (لاہور، دوسری اشاعت)

نکلسن، بیورلی، فیصلۂ ہندوستان ترجمہ Verdict on India مترجم عبدالقدوس ہاشمی (حیدر آباد دکن، ۱۹۴۵ء)

نگم، دیانرائن، پریم چند کے تصورات، مشمولہ: پریم چند مرتبہ قمر رئیس (رام پور، ۱۹۶۲ء)

نوروجی، دادا بھائی، Speeches and Writings of Dada Bhai Naoroji (مدراس)

نہرو، جواہر لال، An Autobiography (لندن، ۱۹۵۳ء)

............، Discovery of India (کلکتہ، ۱۹۴۶ء)

والپینک، ٹی والٹر، A Short History of India and Pakistan (نیویارک، ۱۹۶۳ء)

وائے راناپلے، ایم ایس، Nationalities in Indian Politics (لاہور، ۹۴۶ء)

وحید الزمان، Towards Pakistan (لاہور، ۱۹۶۴ء)

وڈرف، فلپ، Morley and India (لندن، ۱۹۶۵ء)

ولایت حسین، میر ملاحظہ فرمائیے: حسین، میر ولایت

ولپرٹ، سٹینلے، Morley and India (کیلیفورنیا، ۱۹۶۷ء)

ولی اللہ، شاہ، انسان العارفین ترجمہ (لاہور ۱۳۹۴ھ)

............، ازالۃ الخفاء (بریلی، ۱۸۶۹ء)

............، البلاغ المبین ترجمہ (لاہور، ۱۹۵۵ء)

............، حجۃ اللہ البالغہ ترجمہ (لاہور، ۹۵۳ء)

............، تفہیمات الٰہیہ (ڈابھیل، ۱۹۳۶ء)

............، وصیت نامہ (لکھنؤ، ۱۲۹۰ھ)

..........،مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محمد ایوب قادری (حیدرآباد، ۱۹۶۴ء)
..........،شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی (علی گڑھ، ۱۹۵۰ء)
وہیری' ای ایم، Islam and Christianity in India and Far East (نیو یارک، ۱۹۰۷ء)
ویلز' ایچ جی، The Outline of History چار جلدیں (نیو یارک، ۱۹۲۴ء)
ویلیز' ای، Akber's Religious Thought Reflected in Moghal Paintings (لندن، ۱۹۵۲ء)
ویول' لارڈ، The Viceroy's Journal (آکسفورڈ، ۱۹۷۴ء)
ہارڈی' پی، The Muslims of British India (کراچی، ۱۹۷۳ء)
ہاسکنس' ایچ ایل، British Routes to India (لندن، ۱۹۶۶ء)
ہاشمی' عبدالقدوس، تشریحات پاکستان (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۶ء)
ہاشمی' محمد یعقوب، ایران کبیر و ایران صغیر مرتبہ (مظفر آباد، ۱۹۷۱ء)
ہاشمی' نصیرالدین، دکن میں اُردو (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۶ء)
..........، ٹیپو سلطان کی علمی اور سماجی خدمات، مشمولہ بصائر (کراچی، ٹیپو سلطان نمبر)
ہاشمی سندیلوی' شیخ احمد علی، مخزن الغرائب جلد اول (لاہور ۱۹۶۸ء)
ہاشمی فرید آبادی، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو (کراچی، ۱۹۵۳ء)
..........، Urdu Hindi Controversy، مشمولہ: A History of the Freedom Movement، جلد سوم، حصہ دوم (کراچی، ۱۹۶۳ء)
ہچنس' فرانس، British Imperialism in India (پرنسٹن، ۱۹۶۷ء)
ہچنسن' لیسٹر، European Freebooters in Moghal India (لندن، ۱۹۶۴ء)
ہدایت اللہ، Syed Ahmed (لاہور، ۱۹۷۰ء)
ہڈسن' ایچ وی، The Great Divide (لندن، ۱۹۶۹ء)
ہنٹر' ڈبلیو ڈبلیو، Our Indian Musalamans (کلکتہ، ۱۹۴۵ء)
..........، ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر محمد صادق (لاہور، تاریخ ندارد)
ہندی' بھگوان داس، سفینۂ ہندی (پٹنہ، ۱۹۵۸ء)
ہندی' عزیز، ان کہی کہانی، مشمولہ اوراق گم گشتہ، مرتبہ رئیس احمد جعفری (لاہور، ۱۹۶۸ء)
ہوپر' جے ایس ایم، Bible Translations (آکسفورڈ، ۱۹۶۳ء)
ہورانی' جارج فیلڈو، Arab Seafaring in the Indian Ocean (پرنسٹن، ۱۹۵۱ء)
ہیبر' بشپ، Bishop Heber in Nothern India (کیمبرج، ۱۹۷۱ء)
ہیسٹنگز' مارکوئیس، The Private Journal (الہ آباد، ۱۹۰۷ء)

ہے وٹ، جیمز، Eye Witness to the Indian Mutiny (لندن، ۱۹۷۲ء)

یامین، سر محمد، نامۂ اعمال دو جلدیں (لاہور، ۱۹۷۰ء)

یزدانی، راز، خان آرزو، مشمولہ: نقوش (لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء)

یکتا، سید احمد علی، دستور الفصاحت مرتبہ امتیاز علی خان عرشی (رام پور، ۱۹۴۰ء)

یوسف علی، علامہ عبداللہ ملاحظہ فرمایئے: علی، عبداللہ یوسف

یوشع، سید، مقدمہ فتوح السلاطین مصنفہ عصامی (مدراس، ۱۹۴۸ء)

❁……❁……❁

اشاریہ

مرتب: عبداللہ شاہ ہاشمی

اشخاص، کتب و رسائل، اماکن، انجمنوں، اداروں اور تحاریک کے اس اشاریے میں حرفِ آغاز، پیش لفظ اور حواشی کو شامل نہیں کیا گیا۔ (مرتب)

اشخاص

❀......❀......❀

اماکن

❁ ❁ ❁

کتب و رسائل

❀ ❀ ❀

ادارے اور انجمنیں

تحریکیں

❁……❁……❁